جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

12

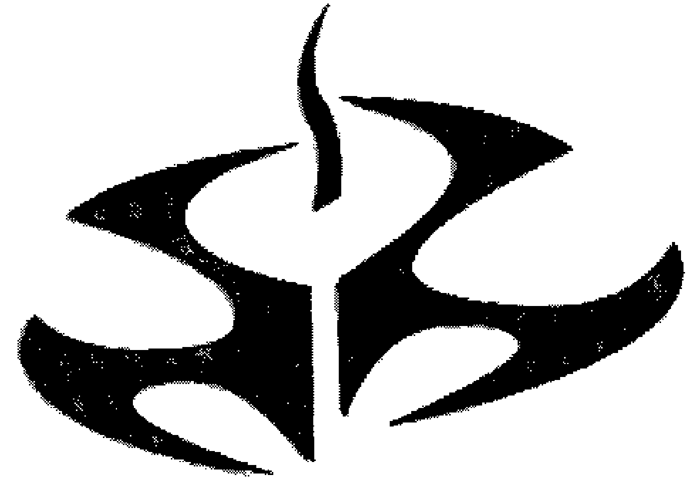
وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

بارہواں حصہ

احمد اقبال

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴



بار اوّل ـــــــــ ۲۰۰۴ء
مطبع ـــــــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ـــــــــ صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ـــــــــ ۶۰ روپے



اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکا نے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں" اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کا پھکڑ پن کی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

اس حق گوئی پر ٹیکسی ڈرائیور جاتے جاتے مجھے بہت سنا گیا تھا۔ ٹیکسی کی آواز سنتے ہی ایک مستعد گارڈ باہر آگیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اب مجھے نیند آرہی تھی لہٰذا میں جاتے ہی بستر پر گر کر سو گیا۔ اگلی صبح خاصی تاخیر سے آنکھ کھلی۔ جب نہا دھو کر میں کمرے سے نکلا تو بانو خالہ نے اطلاع دی کہ نیلم شوٹنگ کے لیے جا چکی ہے۔ میں نے بارہ بجے ناشتا کیا اور نیلم ہاؤس کے کار پورچ میں کھڑی ایک نئی نویلی کرا سلے کر نکل گیا۔ میرا رخ اس بینک کی طرف تھا جس میں دلاور شاہ نے لاکر لے رکھا تھا۔ لاکر کی چابی اور اجازت نامہ میرے پاس تھا۔ میں سیدھا بینک منیجر کے کمرے میں گیا۔ میرے قیمتی سوٹ اور پُر اعتماد انداز سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔

"جی فرمایئے مسٹر نصر بیگ! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" (میں نے اپنا نام نصر بیگ بتایا تھا)

میں نے خاموشی سے اجازت نامہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اجازت نامہ پڑھا اور بولا "مجھے آپ کا کام کر کے خوشی ہوتی لیکن بدقسمتی سے لاکر پر مامور افسر بیماری کی وجہ سے..."

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے" میں نے اس کی بات کاٹی "وہ افسر چابیاں اپنے ساتھ نہیں لے گیا ہوگا۔ آپ لاکر کھولنے کے مجاز ہیں۔"

"سر رول اینڈ ریگولیشن۔" اس نے کہنا چاہا میں نے پھر اس کی بات کاٹی۔

"وہ تو اس کی اجازت بھی نہیں دیتے" میں نے اجازت نامے کی طرف اشارہ کیا "لیکن یہ معاملہ ایک بڑے پولیس افسر کا ہے۔"

"میں اخبار میں ان کی وفات کی خبر دیکھ چکا ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہمیں اس میں دلچسپی ہے کہ دلاور شاہ نے اس لاکر میں کیا رکھا تھا؟" میں نے لہجہ بدل لیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟"

میں مسکرایا "یہ بتانے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ ایک راشی پولیس افسر کے اکاؤنٹ میں کون لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں۔ آج کل احتساب کا شور ہے۔"

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا "دیکھیے شاہ صاحب اس لاکر میں کیا رکھتے تھے۔ یہ ہمیں کس طرح معلوم ہو سکتا تھا۔ ہمارا کام تو لاکر دینا ہے۔"

"جی میں جانتا ہوں کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن جب یہ خبر لیک آؤٹ ہو کر اخبار میں آئے گی تو بینک کی بدنامی ہوگی اور آپ خواہ مخواہ بینک کے اعلیٰ افسران

ے عتاب کا شکار ہوں گے۔ اسی وجہ سے میں خاموشی سے آیا۔ ہم اس معاملے کو خاموشی سے نمٹانا چاہتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ تعاون کریں۔"

اس کی قوت مزاحمت پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ میری بات مکمل ہونے سے قبل وہ اٹھ کھڑا ہوا "مجھے آپ سے تعاون کر کے خوشی ہوگی سر۔ آیئے میں آپ کو لاکر روم میں لے چلتا ہوں۔"

لاکر روم اس کے کمرے کے عقب میں اسٹرانگ روم کے برابر میں تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود ڈپلی کیٹ چابیوں سے دلاور شاہ کا لاکر کھولا اور باہر چلا گیا۔ میں نے دوسری چابی لگائی جو دلاور شاہ کے بٹوے سے ملی تھی۔ لاکر کھل گیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے کھولا تھا۔ اندر کئی عدد بکس رکھے تھے۔ وقت نہیں تھا کہ میں ان کا معائنہ کرتا میں نے انہیں اپنے۔ ساتھ لائے بڑے سے کاغذی بیگ میں ڈال لیا۔ جب میں بکس نکال رہا تھا تو ان کے عقب میں مجھے ایک پتلی سی فائل بھی رکھی نظر آئی۔ فائل کی بیگ میں جگہ نہیں تھی لہٰذا اسے میں نے موڑ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ لاکر بند کر کے چابی گھمائی اور منیجر کو آواز دی۔ اس نے آکر لاکر میں اپنی چابی لگائی اور ہم باہر نکل آئے۔ وہ کن انکھیوں سے میرے بیگ کو دیکھ رہا تھا۔ غالباً اسے شبہ تھا کہ میں نے لاکر سے کچھ نکال کر اس میں رکھا ہے۔ میں اس بار اس کے کیبن تک نہیں گیا۔

"شکریہ مسٹر منیجر۔ میں آپ کے اس تعاون کو یاد رکھوں گا اور میری کوشش ہوگی کہ آپ پر کوئی آنچ نہ آئے۔"

"تھینک یو سر۔" اس نے نیازمندی سے کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ ہوں اور اب خفیہ ایجنسی عوام کے لیے ایک خوفناک نام بن چکا تھا۔ جس کی آڑ میں ماورائے قانون اقدامات ہوتے تھے اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں ہے۔ لوگوں کو ان کے گھروں، دفتروں، حتیٰ کہ راہ چلتے اٹھا لیا جاتا ہے لیکن کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ اٹھائے جانے والے غائب ہو جاتے ہیں اور حکومت بھی ان کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ان کا خوف اتنا بڑھ چکا ہے کہ ایک نجی بینک کا منیجر بھی اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ مجھ سے کسی قسم کی شناخت طلب کر سکتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کی کسی کوشش کا انجام عبرت ناک بھی نکل سکتا ہے۔

مجھے حیرت تھی کہ کسی نے اب تک دلاور شاہ کے اس لاکر کو کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ورثا تھے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ دلاور شاہ نے اس لاکر کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا بلکہ سب سے چھپایا تھا۔ فرید کا گھر راستے میں ہی پڑتا تھا لہٰذا میں نے اس کے پاس چکر لگانے کا سوچا۔ فرید تو اس وقت عدالت میں ہوگا لیکن رخشی گھر پر ہی ہوگی۔ ہاں وہ شام کو فرید کے دفتر جایا کرتی تھی۔ وہ اس کی سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فرید نے گھر کی حفاظت کے لیے بہتر انتظامات کر لیے تھے۔ چار دیواری اونچی کروا کے اس کے اوپر نکیلے شیشے لگوا لیے تھے مرکزی دروازہ بھی خاصا مضبوط تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو رخشی نے انٹرکام پر نام پوچھا۔

"ایک غریب، لاوارث، مسکین بلکہ یتیم بھی۔ ایک وقت کے کھانے کا سوال ہے بابا۔" میں نے آواز میں رقت سمو کر کہا۔ اس کے باوجود رخشی نے پہچان لیا۔ وہ ہنسی۔

"ارے باز۔ ابھی آئی۔"

"اللہ خیر کرے۔" میں نے کہا۔ رخشی تیزی سے آئی تھی۔ وہ غالباً ابھی نہا کر نکلی تھی۔ سر پر تولیہ بندھا تھا اور چہرے پر پانی کے قطرے شفاف موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں چند لمحے کو سحرزدہ رہ گیا تھا۔ رخشی کے حسن میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ شاہ عالم جیسے حسن پرست بھوترے کا انتخاب تھی۔ میری نظر محسوس کر کے وہ شرمائی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ اندر آؤ ناں!"

"فی الوقت تو فرید کی تقدیر پر رشک کر رہا ہوں۔ ہاں ممکن ہے تمہارے ہاتھ کا کھانا کھا کر میرے خیالات کچھ بدل جائیں۔" میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔ سٹنگ روم میں آکر میں نے جوتے موزے اتارے اور پھیل کر بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے فرید نے کوئی بڑا مرغا پھانس لیا ہے۔ بڑا شاندار فرنیچر ہے۔" میں نے ارد گرد دیکھا۔

"سب سے بڑے کلائنٹ تو تم ہو۔ تم نے آج تک کیا دیا؟"

میں شرمندہ ہوا تو وہ بوکھلا گئی "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ فرید اتنی جاں فشانی سے میرے مقدمات ڈیل کر رہا ہے۔ خطرہ بھی مول لے رہا ہے اور میں نے اسے کچھ نہیں دیا۔"

"میرے خدا' ایک مذاق میں کہی بات پر اتنے سیریس ہو جاؤ گے۔" رخشی یک دم روہانسی ہو گئی تھی۔

اس کا موڈ دیکھ کر میں نے کہا "سوری بھئی میں مذاق کے جواب میں مذاق کر رہا تھا۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ کس کے اوپر قیامت ڈھانے کی تیاری ہے؟"

میری بات سن کر وہ شرمائی "ابھی تو میں فرید کے دفتر

جاؤں گی۔ شام کو اسلام آباد کے لیے ہماری فلائٹ ہے۔"

"گڈ۔ تم نے فوری طور پر اپنے پلان پر عمل شروع کر دیا۔ ممکن ہے کہ واپس آؤ تو ہم یہاں نہ ہوں۔ چندا بھی میرے ساتھ انگلینڈ جائے گی۔"

"یعنی میں اور فرید اکیلے رہ جائیں گے۔" وہ اداس ہو گئی "ہمارا تم لوگوں کے سوا اور ہے ہی کون؟"

"مجبوری ہے ڈیئر۔" میں نے نرمی سے کہا "اب میرا وجود تم لوگوں کے لیے خطرہ بن گیا ہے۔ میں جتنا تم لوگوں سے دور رہوں گا۔ اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ویسے یہاں پر کمال اور قمر ہوں گے۔ باقی سب لوگ بھی آتے جاتے رہیں گے تم لوگ بھی سال میں ایک آدھ بار چکر لگاتے رہو گے اور جہاں تک تنہائی کا تعلق ہے تو تین چار سال بعد بچوں میں گھر کر تمہیں شاید ناصر کا خیال بھی نہ آئے۔"

بچوں کے ذکر پر وہ پھر شرمائی "ابھی ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ کھانا لگاؤں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" میں نے کہا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب واپس آیا تو رخشی کی نو عمر ملازمہ وہیں چھوٹی میز پر کھانا سجا رہی تھی۔ سادہ دال چاول کے ساتھ کباب تھے اور چپاتی کے ساتھ کوفتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر کھانا لذیذ تھا۔ مجھے یاد ہے شاہ عالم کے محل نما گھر میں رخشی پانی بھی نہیں پیا کرتی تھی۔ کھانا بنانا تو دور کی بات تھی لگتا تھا وقت کے ساتھ ساتھ اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اگرچہ دولت کے اعتبار سے وہ کسی طرح ارب پتی سے کم نہیں تھی۔ شاہ عالم کے سارے اثاثے میں نے اس کے حوالے کر دیئے تھے لیکن فرید کی محبت میں اس نے خود کو اس کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ وہ اس معمولی سے دو سو گز کے گھر میں رہ رہی تھی اور اس کے پاس صرف ایک ملازمہ تھی گھر کے کاموں کے ساتھ اسے فرید کے دفتر میں بھی کام کرنا ہوتا تھا۔ میں نے کھانے کی تعریف کی تو وہ کھل اٹھی تھی۔ کھانے کے بعد میں واش روم ہاتھ دھونے گیا۔ اتنے میں کال بیل بجی۔ میں کلی کر رہا تھا کہ باہر سے کسی کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی مزاحمت کر رہا ہو۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے پانی بند کر دیا۔ اب باہر مکمل سناٹا تھا پھر کسی نے بھاری مردانہ آواز میں کہا۔

"کتیا۔ آج جب تیرا خصم آئے گا۔ تو تیری ننگی ہوئی لاش دیکھ کر اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ بڑا وکیل کی اولاد بنا پھرتا ہے۔"

رخشی نے گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا اور میرے کانوں نے کپڑا پھٹنے کی آواز سنی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ رخشی کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ طاقت اور مردانگی کے نشے میں چور کوئی مرد اکیلی عورت سمجھ کر اس کے ساتھ زیادتی پر اتر آیا تھا۔ عام حالات میں ممکن ہے کہ میں آگ بگولہ ہو کر باہر نکلتا اور اس شخص سے بھڑ جاتا لیکن حالات نے مجھے دماغ کا استعمال سکھا دیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں خالی ہاتھ تھا اور کسی کے گھر میں اس طرح دن دھاڑے گھس آنے والا یقیناً مسلح ہوتا۔ اگر میں جذباتی ہو کر رخشی کی مدد کرنے جاتا تو سب سے پہلے خود مارا جاتا اور آنے والا دو شکار کر کے جاتا۔

یہ سب سوچ کر میں نے فوری طور پر باہر نکلنے سے گریز کیا۔ رخشی کی گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی تھیں۔ غالباً اس کا منہ دبا دیا گیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ باتھ روم میں ایسی کوئی شے نہیں تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ سوائے ایک وائپر کے۔ اس کا المونیم کا پائپ اتنا ہلکا تھا کہ اس سے کسی بچے کی مرمت بھی نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ میں لیونگ روم میں آیا۔ یہاں ایک کام کی شے نظر آئی۔ یہ کوئی دو فٹ اونچا تانبے کا بنا عورت کا مجسمہ تھا اس کے دونوں پیر ملے ہوئے تھے اور نیچے پیتل کا ہی گول اسٹینڈ تھا اسے گرپ کرنا آسان تھا۔ دوسری شے بلور کا ایک نازک شو پیس تھا۔ میں نے اسے بھی اٹھا لیا۔ آوازیں ڈرائنگ روم سے آ رہی تھیں۔ اچانک رخشی کی گھٹی گھٹی آوازیں آنا بھی بند ہو گئی تھیں۔ اس کی جگہ اس مرد نے آہستہ سے ہنستے ہوئے ایک نہایت فحش بات کی تھی۔ جواب میں کسی دوسرے شخص نے قہقہہ لگایا۔

"ابے دیکھ اندر کوئی اور نہ ہو۔"

"کوئی نہیں استاد۔ بس یہ دونوں ہیں۔" اس کے لہجے میں خباثت نمایاں تھی۔

میں نے شکر ادا کیا کہ میں نے دھوپ کی وجہ سے کار ذرا فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑی کی تھی۔ ورنہ مجھے بھی بے خبری میں چھاپ لیتے۔ اب مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ دو افراد ہیں۔ غالباً انہوں نے پہلے رخشی کی نو عمر ملازمہ مینا کو قابو کیا اور پھر اندر گھس کر رخشی کو بھی قابو کر لیا۔ وہ دونوں پیشہ ور بدمعاش لگتے تھے لیکن رخشی کے حسن نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا تھا اور انہوں نے باقی گھر کو دیکھنے کے بجائے وہ کام کرنا ضروری سمجھا جس کے لیے وہ آئے تھے۔ مینا خاصی خوبصورت سی پندرہ سالہ لڑکی تھی۔ ان کے لیے گویا ایک تیر سے دو شکار کرنے والی بات ہو گئی تھی۔ میں نے احتیاط سے دروازے کی ہلکی سی جھری سے جھانکا۔

لیونگ روم اور ڈرائنگ روم کا درمیانی دروازہ دوپٹ والا تھا۔ اس لیے مجھے ڈرائنگ روم کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ رخشی قالین پر پڑی مچل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ساتھ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ مینا بے سدھ سی ایک صوفے پر پڑی تھی اس کے پاؤں نیچے لٹک رہے تھے اور دوسرا شیطان اس پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے توبہ استغفار پڑھی۔ جو مسلح تھا اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ان دونوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ مارے خوف کے رخشی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اچانک استاد مینا پر جھکے شخص پر دھاڑا۔

”حرامی تجھ سے کیا کہا تھا۔ پہلے دوسرے کمرے دیکھ۔ اپنی اس اماں کے ساتھ پھر جو چاہے کرتے رہنا۔“

وہ بے غیرتی سے ہنسا۔ ”استاد تم نے مزہ کرکرا کر دیا۔ قسم سے کچی کیری ہے یہ۔“

استاد نے کچی کیری کے حوالے سے ایک اور بیہودہ بات کی اور اسے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ اس کی آمد سے پہلے ہی میں رخشی کے بیڈ روم میں داخل ہو چکا تھا۔ لیونگ روم ساتھ ہی تھا اور اس میں ہونے والی ہنگامہ آرائی استاد کو فوراً متوجہ کرتی اور مجھے فوراً ہی اس سے نمٹنا پڑتا۔ بیڈ روم میں میں ذرا آرام سے شاگرد سے نمٹ سکتا تھا۔

احمق شاگرد کے حواس پر کچی کیری کا نشہ طاری تھا۔ اس نے اس یقین کے ساتھ بیڈ روم میں قدم رکھا کہ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے پیتل کے مجسمے سے اس کا سر بجایا۔ مجسمہ اتفاق سے ایک عورت کا ہی تھا لہٰذا اس کا نشہ دوگنا ہو گیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔ وہ لہرا کر فرش پر گرا۔ میں بے فکر تھا کہ دبیز قالین کی وجہ سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوگی لیکن میں نے چلّا کر کہا ”ہائے استاد۔“

استاد کا چونکنا فطری تھا۔ شاگرد نہتا ہی تھا یعنی مسلح صرف استاد ہی تھا۔ اس نے جواباً چلا کر کہا ”کیا ہوا؟“

”میرا پاؤں۔“ میں نے گویا نزع کے عالم میں آواز نکالی۔ میری کوشش تھی کہ استاد کو آواز کا فرق محسوس نہ ہو لیکن وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ اس نے اندر آنے کے بجائے پہلے لیونگ روم میں تاک جھانک کی۔ کئی بار اس نے شاگرد کو غلط ولدیت سے منسوب کرتے ہوئے پکارا مگر شاگرد وہاں تھا جہاں اسے اپنی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ استاد کو کیا جواب دیتا۔ استاد کی استادی دیکھ کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا میں خاموش رہ کر اس سے زیادہ آسانی سے نمٹ سکتا تھا۔ استاد آہستہ آہستہ بیڈ روم کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور وہ اسی احتیاط سے اندر آتا کہ میرے لیے اس پر قابو پانا ناممکن ہی ہو جاتا۔ اس نے اپنا پستول تان رکھا تھا اور گولی چلانے کے لیے تیار تھا۔ معاً میری نگاہ بیڈ روم میں ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ رکھے لیمپ شیڈ پر پڑی۔ اس میں سنگ مرمر کا ڈنڈا لگا ہوا تھا۔ قریباً ڈھائی فٹ کا یہ ماربل پائپ خاصا مؤثر ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا بہ شرطیکہ استاد معظم اسے اپنے سر پر آزمانے کی اجازت دیتا۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں اسے قضائے ناگہانی کی طرح آتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرا پیر کسی شے سے ٹکرایا میں نے چونک کر دیکھا۔ ننھی سی تپائی پر فون رکھا تھا۔ یہ دراصل ایکس ٹینشن تھا۔ اس کا ایک وائرڈ ڈرائنگ روم میں رکھے فون میں بھی تھا۔ استاد کی توجہ ہٹانے کی ترکیب کسی الہام کی طرح میرے ذہن میں آئی تھی۔ چند سیکنڈز میں میں نے لیمپ شیڈ کا ڈنڈا نکال لیا۔ یہ وزن میں ہلکا اور زیادہ موزوں تھا۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ فون پر ڈبل ون ٹو ڈائل کر کے ریسیور رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے سریلی سی بیل بجی لیکن ڈرائنگ روم میں رکھے فون کی بیل زیادہ کرخت تھی۔ سناٹے میں صور اسرافیل کی طرح گونجی۔ میں استاد کا ردعمل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو بیڈ روم کے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ لیکن ایک نفسیاتی نکتے کی بنیاد پر میں اللہ کا نام لے کر بیڈ روم سے نکلا۔ حسب توقع استاد کی توجہ ڈرائنگ روم کی طرف تھی مگر بیڈ روم کا دروازہ کھلتے ہی وہ چیتے کی طرح پلٹا اور اس سے پہلے وہ گولی چلاتا میں نے ڈنڈا گھما کر اس کے پستول والے ہاتھ پر مارا۔ اس نے چلا کر گالی دی۔ ضرب کے باوجود پستول اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا لیکن چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ پستول استعمال کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے دوسری ضرب لگائی۔ اس بار پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر اس نے حیرت انگیز پھرتی سے مجھے لات ماری۔ میں دروازے سے ٹکرایا اور اسپرنگ کی طرح اس کی طرف آیا۔ جگہ اتنی کم تھی کہ مارشل آرٹ کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس بار خبیث نے میرے منہ پر سر سے ٹکر ماری۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لیے تو اندھیرا آ گیا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ پستول کی طرف لپکا۔ خطرے کا احساس کر کے میرا دماغ فوراً مستعد ہو گیا تھا۔ میں نے اندازے سے ہاتھ گھمایا۔ ڈنڈا کسی شے پر لگا۔ اسی کے ساتھ ہی میں منہ کے بل صوفے پر جا گرا۔

استاد کا سر کسی ڈبے کی طرح مضبوط تھا۔ اس کی ٹکر نے

میرے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں عارضی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے تیزی سے ہوش آیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے کہ استاد اگر پستول حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ سب سے پہلے میرے سر میں سوراخ کرتا۔ ہوش میں آتے ہی میں ڈگمگاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی تک استاد نے کچھ نہیں کیا تھا جب میری نظر صاف ہو گئی تو میں نے اسے اوندھے فرش پر پڑے پایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ منہ کے بل لیٹ کر کیا کر رہا ہے۔ وہ ساکت تھا ورنہ میں سوچتا کہ وہ پستول تلاش کر رہا ہے۔ وہ بے ہوش لگتا تھا اور ظاہر ہے یہ بے ہوشی رضاکارانہ نہیں تھی۔ میں نے ذرا تفتیش کی تو یہ بات سامنے آئی کہ سنگ مرمر کا ڈنڈا اس کی سخت کھوپڑی سے ٹکرایا تھا اور غالباً دونوں ہی چیزیں ٹوٹ گئی تھیں۔ کم سے کم ڈنڈا تو یقینی طور پر ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ خبیث بے ہوش تھا مرا نہیں تھا۔ میں نے اس کا پستول تلاش کیا جو ایک تپائی تلے مجھے مل گیا پھر میں ڈرائنگ روم میں آیا۔ رخشی مجھے دیکھ کر چونکی پھر اس کے چہرے پر بے پناہ خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

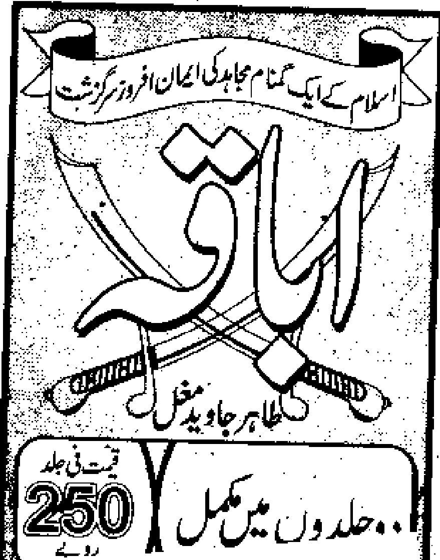
”ناصر تمہاری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔“

تب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میری ناک بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی بندشیں کھولتے ہوئے میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے رخشی کے کپڑے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم چینج کر کے آؤ میں اسے دیکھتا ہوں۔“ میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن۔۔۔ وہ دونوں۔۔۔“

”وہ بے ہوش ہیں زندہ نہیں، بے فکر ہو کر جاؤ اور ان میں سے کوئی ہلے بھی تو مجھے آواز دے لینا۔“

وہ سرخ چہرے کے ساتھ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ رخشی کا جسم میرے لیے کوئی اجنبی شے نہیں تھی۔ جس زمانے میں میں شام عالم بنا ہوا تھا تو اس نے مجھے اپنا شوہر سمجھتے ہوئے رجھانے کی کوشش کی تھی۔ خدا نے مجھے ثابت قدم رکھا اور آج میں اس سے آنکھ ملا کر بات کر سکتا تھا۔ اس وقت اور اس وقت کی رخشی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اب وہ میرے لیے ایک اچھے دوست کی بیوی تھی اور میرے لیے اتنی ہی محترم تھی جتنی کہ میری بہن یا بھابی ہوتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ملازمہ مینا کو دیکھا۔ وہ بے ہوش تھی اس کے سر پر کچھ مارا گیا تھا۔ جس سے گومڑ سا بن گیا تھا لیکن وار خطرناک نہیں تھا۔ وہ بڑی پیاری اور نازک



سی لڑکی تھی۔ جس کا لباس شاگرد کی دست درازی کی وجہ سے بے ترتیب ہو رہا تھا۔ جیسے ہی رخشی قمیص بدل کر آئی۔ میں نے کہا۔

"اس کا لباس درست کرو اور اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا بلاوجہ ایک خلش بیٹھ جائے گی اس کے ذہن میں۔"

"پہلے تمہاری ناک دیکھوں۔" اس نے تشویش سے کہا "یہ سوجنے لگی ہے۔"

"پہلے اسے دیکھو اور اس کا لباس درست کرو۔ میں ابھی آیا۔" میں نے کہا اور لیونگ روم میں آکر استاد کا معائنہ کیا۔ وہ بدستور بے ہوش تھا۔ اسے میں نے کھینچ کر بیڈ روم میں کر دیا پھر باتھ روم میں جا کر ٹھنڈے پانی سے ناک دھوئی۔ ذرا سی دیر میں ناک میں خون جم گیا تھا اور مجھے سخت تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔ پانی سے دھو کر کچھ سکون محسوس ہوا تھا۔ باہر آکر میں نے ان دونوں کا معائنہ کیا۔ ان کے ہوش میں آنے کے امکانات تو نہیں تھے مگر احتیاطاً میں نے ان کے ہاتھ پیر ان کی قمیص پھاڑ کر باندھ دیے۔ میڈیکل باکس میں میڈیکو ٹیپ رکھا تھا۔ وہ ان کے منہ پر چپکا دیا۔ تاکہ ہوش میں آجائیں تو شور بھی نہ مچا سکیں پھر میں نے عباسی کے دفتر فون ملایا۔ "عباسی فوراً گھر آجا۔ ایک ایمرجنسی ہے۔" میں نے رابطہ کرتے ہی کہا۔

"کیا ہوا رخشی تو خیریت سے ہے ناں؟" وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"رخشی ٹھیک ہے۔ اب تو دیر مت کر ابھی کئی مسائل سے نمٹنا ہے۔" میں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ڈرائنگ روم میں رخشی ملازمہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تقریباً ہوش میں آچکی تھی۔ میں نے رخشی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور بلند آواز میں بولا "اچھا ہوا بھاگ گئے ورنہ میرے ہاتھ مارے جاتے۔" مینا اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی' میری بات سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ رخشی نے اس کا لباس درست کر دیا تھا۔ لہٰذا اسے پتا نہیں چل سکا کہ اس کے ساتھ دست درازی کی گئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے ان بدمعاشوں کی یہاں موجودگی کا علم ہو۔ میں نے اسے کہا۔

"مجھے دیکھ کر بھاگ گئے شاید چوری کرنے آئے تھے۔"

"میرے سر پر انہوں نے پتا نہیں کیا مارا تھا۔ اب تک درد ہو رہا ہے۔" اس نے سر دبایا۔

"کچھ ہو گا۔" میں نے اسے تسلی دی "رخشی اسے چین کلر دے دو اور تم ایسا کرو کہ گھر جا کر آرام کرو تمہارا گھر یہاں سے دور تو نہیں ہے۔"

"نہیں جی پاس ہی ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔" اس نے کہا۔ وہ خاصی متوحش نظر آرہی تھی اسے دوائی دے کر اور اس بات کو کسی کو نہ بتانے کی ہدایت کر کے رخشی نے رخصت کر دیا۔ اسی دوران میں' میں نے رئیس کو بھی بلا لیا تھا۔ رخشی ان دونوں بدمعاشوں کو دیکھ رہی تھی پھر اسے یاد آیا کہ استاد نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس نے مارے غصے کے بے ہوش استاد کو کئی ٹھوکریں ماریں۔ میں نے کہا۔

"اپنے نازک پیروں کو مت تھکاؤ۔ اس کی کھال بہت موٹی ہے۔"

"کمینے ذلیل۔۔۔ بدمعاش۔" رخشی نے اسے زنانہ لغت کی گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا "تم امر اسے چھوڑنا مت۔" پھر اس نے میری ناک دیکھی اور تشویش سے بولی۔ "تمہاری ناک تو اوپر سے بھی زخمی ہے۔ ٹھہرو میں فرسٹ ایڈ باکس لاتی ہوں۔"

اس نے باکس لا کر پہلے ڈیٹول سے زخم صاف کیا۔ میں اچھل پڑا پھر اس نے چپک جانے والی پٹی ناک پر لگا دی۔ اس نے اتنی دل جمعی سے میری مرہم پٹی کی کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "تھینک یو میڈم۔ اب کسی پین کلر کے ساتھ کافی بھی مل جائے تو۔"

"ابھی لاتی ہوں۔" اس نے کہا۔

جس وقت رخشی کچن میں کافی بنا رہی تھی' کال بیل بجی۔ میں نے پوچھ کر دروازہ کھولا تو عباسی آندھی کی طرح اندر آیا تھا۔ "رخشی تو ٹھیک ہے نا اور یہ تیری ناک کو کیا ہوا؟"

"میں نے بیل سے کہا تھا۔ آ بیل مجھے مار۔" میں نے جواب دیا "رخشی کچن میں ہے۔"

وہ کچن کی طرف بھاگا۔ اسی لمحے دوبارہ کال بیل بجی۔ اس بار رئیس تھا۔ اس نے بھی مجھ سے تقریباً عباسی جیسے سوال کیے۔ اتنے میں عباسی مطمئن ہو کر واپس آیا لیکن اس کے چہرے کی سرخی بتا رہی تھی کہ رخشی نے اسے اپنے ساتھ کی جانے والی دست درازی کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

"یہ حرامی کون ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم۔ مجھے ان سے انٹرویو کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔" میں نے زخمی ناک دباتے ہوئے کہا۔ میری آواز زکام زدہ مریض کی ہو رہی تھی۔

رئیس نے اندر جا کر ان کا معائنہ کیا اور واپس آکر انکشاف کیا۔ "میں ان میں سے ایک کو جانتا ہوں۔ یہ حرامی استاد بنا پھرتا ہے۔ جس زمانے میں' میں مندرال کے لیے کام کر رہا تھا تو کئی بار اسے بھی کرائے پر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب یہ استادی کرنے لگا ہے۔"

میں نے تفصیل سے انہیں پیش آنے والے واقعات سنائے البتہ کچھ واقعات میں سنسر کر گیا۔ خاص طور پر رخشی اور اس کی ملازمہ کے ساتھ جو ہوا تھا لیکن سیاق و سباق سے ان کے لیے اصل بات سمجھ لینا مشکل نہ تھا۔ عباسی کا غصہ سے برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے روانی سے اپنے پولیس کی نوکری کے زمانے کی زبان استعمال کی۔

"میں ابھی ڈی ایس پی سے بات کرتا ہوں۔ بلکہ بار کونسل کے صدر سے۔ وہ فوراً معاملہ سنبھال لے گا۔ کل تک ان کی ماں۔۔۔"

"یہ اصل چہرے نہیں ہیں۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "تیری ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ انہیں کسی نے بھیجا ہے۔ پولیس تو سارا ملبا ان پر ڈال کر خود کو بچا لے گی۔"

"ہاں یار ہم خود معلوم کرلیں گے۔" رئیس نے کہا۔ رخشی کافی لے آئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہم سے آنکھیں چرا رہی تھی اور اس کے چہرے پر شرمندگی سی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔

"یار تم لوگ اپنا پروگرام خراب نہ کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ رئیس ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم خود ان سے نمٹ لیں گے۔ پولیس میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ فلائٹ کا ٹائم بھی قریب ہے۔"

کسی قدر بحث کے بعد رخشی اور عباسی جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ رخشی نے سوٹ کیس تیار کر لیے تھے جو انہوں نے اٹھا کر گاڑی میں رکھے اور چلے گئے۔ عباسی نے لانسر لے رکھی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں اور رئیس چھوٹی دروازہ بند کر کے اندر آگئے۔ رئیس بولا "اس کا نام تو جبران ہے لیکن جیو کے نام سے مشہور ہے۔ استاد بنتا ہے لیکن اندر سے۔۔۔ ہے۔" رئیس نے ایک ناقابل اشاعت لفظ استعمال کیا۔ "صرف عورتوں اور کمزوروں پر رعب جما سکتا ہے۔ پہلے بھی مجرمانہ حملوں کے کئی مقدمات میں ملوث ہے۔"

وہ دونوں اب ہوش میں آرہے تھے اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ "رئیس۔۔۔ ان پر ہماری شناخت ظاہر نہ ہو۔ اب نام مت لینا۔"

میں نے عباسی کی وارڈ روب سے دو نائلون کے موزے نکالے۔ کاٹ کر ان میں سوراخ کیے اور ایک ایک ہم نے اپنے سروں پر چڑھا لیا تھا۔ انہوں نے ہمارے خدوخال چھپا لیے تھے۔ جب ہم واپس لیونگ روم میں آئے تو استاد کو ہوش آچکا تھا اور شاگرد کسی بے قرار کیڑے کی طرح کلبلا رہا تھا۔ ماربل کے پائپ کا اثر زیادہ سخت تھا اگر اس کی کھوپڑی مضبوط نہ ہوتی تو یہ تین سو دو کا کیس بھی بن سکتا تھا۔ میں نے جاتے ہی استاد کی رانوں کے درمیان پاؤں کی ایڑی ماری۔ ضرب زیادہ زوردار نہیں تھی۔ استاد زیادہ تیزی سے اپنے حواسوں میں آیا تھا۔

اس نے کراہ کر کروٹ لی۔ میرے اشارے پر رئیس نے اس کے منہ سے کپڑا اتار دیا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں ہوش آگیا ہے؟"

"کیا۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے کراہ کر کہا۔

"وہ نہیں چاہتے جس کے لیے تم آئے تھے لیکن میں اس سے بھی زیادہ برا سلوک تم سے کر سکتا ہوں۔" میں نے اس کے پیر پر ٹھوکر ماری۔ "کس نے بھیجا تھا تمہیں۔"

"کسی نے نہیں۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا "ہم چوری کرنے آئے تھے۔ تم نے پکڑ لیا۔ اب پولیس کے حوالے کر دو۔"

"تاکہ تم چھوڑ دیے جاؤ۔" میں نے طنز کیا "یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کس کے بل پر تم اتنا اکڑ رہے ہو۔" بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر جوتے کی ایڑی رکھ دی۔ وہ تڑپنے اور گالیاں دینے لگا اس پر رئیس نے اس کے منہ پر لات ماری۔

"بھونک مت کتے۔ ورنہ سارے دانت حلق میں گرا دوں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ یہ اتنی آسانی سے زبان کھولنے والے لوگ نہیں تھے اور عباسی کے مکان میں زیادہ دیر رکنا بھی درست نہیں تھا۔ جن لوگوں نے انہیں بھیجا تھا' وہ تفتیش حال کے لیے دوسری ٹیم بھی روانہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا میں نے یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب ہم انہیں تیار کر کے نکل رہے تھے تو عباسی نے ائرپورٹ سے فون کر کے اپنی خیریت سے روانگی کی اطلاع دی۔ میں نے مشورہ دیا کہ وہ احتیاطاً دو تین ہفتے باہر ہی رہے۔ ان دونوں میں سے ایک کو کار کی ڈکی میں بند کیا۔ یہ اعزاز استاد کے حصے میں آیا۔ شاگرد کو میں نے پچھلی نشست کے آگے والے خلا میں ڈال دیا تھا۔ احتیاطاً ان کے منہ کے ساتھ آنکھوں پر بھی میڈیکو ٹیپ لگا دیے تھے۔ تاکہ وہ ہماری صورتیں نہ دیکھ سکیں۔ رئیس نے انہیں بھی جیرا بلیڈ کے ٹھکانے پر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہم مغرب کے بعد وہاں پہنچے۔ رئیس نے جا کر چیرا بلیڈ کو ساری بات سمجھا دی وہ آ کر ان دونوں کو لے گیا تھا۔ اس موقع پر ہم گاڑی سے ذرا دور چلے گئے تھے۔ رئیس نے کہا "اب گھر کی طرف چل' نیلم آ گئی ہو گی۔"

لیکن جانے سے پہلے میں نے ایک پی سی او سے سبحان شاہ سے بات کی۔ وہ پروفیسر ہاشم رضا کے بارے میں جان کر بے حد خوش ہوا۔ "پایا اس نے تو رب نواز کے بارے میں بہت کچھ اگلا ہے۔"

"شاہ صاحب کوشش کریں کہ یہ کسی طرح ان عورتوں کے بارے میں بتا دے جن پر تجربات کیے جا رہے ہیں۔"

"بتا دے گا ضرور بتا دے گا۔ ابھی تو اس نے کسی شرماجی کے بارے میں اگلا ہے۔ یہ بھارتی سائنس داں ہے اور رب نواز سے اس کے رابطے ہیں۔ ہاشم رضا کا خیال ہے کہ وہ اس کے کام اور اس کے تخلیق کیے حیوان نما انسانوں کا سودا بھارتی حکومت سے کر رہا ہے۔"

"یعنی وہ اس زمین کا غدار بھی ہے۔"

سبحان شاہ ہنسا "اس زمین کا وفادار ہے ہی کون؟"

میں نے بحث سے گریز کیا "شاہ صاحب اگر واقعی رب نواز کے بھارتیوں سے رابطے ہیں تو یہ بات اسے تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔"

"اتنا آسان نہ سمجھو۔ ہمارے ہاں تو نہ جانے کون کون بھارتیوں کا ایجنٹ بن کر بیٹھا ہے۔ مگر بہرحال رب نواز کی گردن پھنسائی جا سکتی ہے۔"

"یہی میں کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے خوش ہو کر کہا "امید ہے آپ کا میری طرف سے دل صاف ہو گیا ہو گا۔ میں بہت جلد ملک سے باہر جا رہا ہوں۔"

سبحان شاہ خاموش ہو گیا۔ اس نے چند لمحے بعد کہا "شاہ عالم کیا تم میرے ساتھ پارٹنر شپ نہیں کر سکتے۔"

"سوری شاہ صاحب! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ان سارے معاملات سے اکتا گیا ہوں اور اب سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ رہا آپ کے رب نواز والے معاملے کا تعلق تو اکیلا پروفیسر ہاشم رضا ہی سارے نقصانات کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود میں کوشش کر رہا ہوں کہ لندن میں نوادرات کا سراغ لگا سکوں۔ وہاں میرے رابطے ہیں۔"

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں شاہ عالم۔" وہ بولا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ماضی کے سارے ناتے توڑ رہا ہوں۔ صرف رب نواز کی کمینگی نے مجھے یہاں رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ میں یہاں سے جا چکا ہوتا۔"

میں فون کر کے باہر آیا۔ رب نواز کے خلاف مجھے ایک نشان اور مل گیا تھا شرماجی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہاشم رضا نے مجھ سے بہت ساری باتیں چھپائی تھیں۔ راستے میں میں نے رئیس کو سبحان شاہ سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور اس سے کہا "تو کسی آدمی کو بھیج کر سبحان شاہ کی لاہور والی کوٹھی سے کیٹلاگ منگوا لے۔ اب اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"یہ کام ہو جائے گا۔" رئیس بولا پھر اس نے کاغذی ہینڈ بیگ کی طرف دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"خاصی چیزیں ہیں گھر چل کر دیکھیں گے۔ دلاور شاہ کے لاکر سے نکلی ہیں۔"

نیلم ہاؤس اب میرے لیے ایک سایۂ عافیت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ سارے زمانے کے سرد و گرم جھیل کر جب میں یہاں آتا تھا تو مجھے وہی سکون ملتا تھا جو سارا دن محنت مشقت کرنے والے مزدور کو شام کو گھر آ کر ملا کرتا تھا۔ نیلم حسب معمول لان میں ٹہل رہی تھی۔ آج اس نے اہتمام سے سیاہ ساڑی پہن رکھی تھی جو اس کے سرخ و سفید اور متناسب جسم پر بے حد سج رہی تھی۔ کھلے بالوں میں سفید گلاب کا پھول ٹکا تھا۔ سارے دن کی شوٹنگ کے بعد بھی اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ رئیس تو خیر تھا ہی جہنم رسیدہ۔ تھوڑی دیر کو تو میں بھی دم بہ خود رہ گیا تھا۔ وہ شرما کر ہنسی۔ "کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔ یوں آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔"

"قسم اللہ کی آج تو نگاہ نہیں ٹک رہی ہے۔" رئیس بولا۔

"کس پر قیامت ڈھانے کی تیاری ہے۔" میں نے کہا۔

"تم دونوں کو تو یاد نہیں ہو گا۔ میں نے سوچا میں ہی سرپرائز دے دوں۔"

"آج تمہاری سالگرہ ہے۔" رئیس بولا تو نیلم کے ساتھ میں بھی حیران رہ گیا۔

"تجھے کیسے پتا چلا؟"

"میں نیلم کے بارے میں سب جانتا ہوں۔" رئیس بولا تو نیلم کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ محبوب اس کی ذرا ذرا سی بات کو یاد رکھے' عورت کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

"کیک کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اندر تیار ہے۔" وہ بولی "لیکن میرا تحفہ۔"

"میری طرف سے تو تیار ہے۔" رئیس نے جیب میں ہاتھ مارا۔

"میری طرف سے اسے قبول کرلو۔" میں نے ہینڈ بیگ اس کی طرف بڑھایا تو وہ خوشی سے کھل گئی تھی۔

"ابھی نہیں کیک کٹنے کے بعد دینا۔ اندر آؤ۔"

خالہ بانو نے کمرے کے وسط میں لگی میز پر کیک کے ساتھ دوسرا سامان بھی سجا دیا تھا۔ نیلم نے کیک کاٹا۔ ہم تالیاں بجا کر ہیپی برتھ ڈے گانے لگے۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف عینی تھی اسے بھی نیلم کی سالگرہ کا دن یاد تھا اس نے مبارک باد دی۔ نیلم نے اس سے آنے والے مہمان کی خیریت دریافت کی۔ بہ مشکل نیلم نے جان چھوڑی تو میری باری آئی۔ "چڑیل تو کیسی ہے؟"

"بھیا میں چڑیل ہوں۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"اور وہ تیرا بھتنا کہاں ہے۔"

"پاس ہی بیٹھے ہیں۔ میری تو سنتے نہیں۔" اس نے فون عاقل کو دے دیا۔

"سلام عرض کرتا ہوں قائم مقام سسر صاحب۔" اس نے کہا "کیا حال ہیں۔"

"فی الوقت تو اچھے نہیں ہیں لیکن امید ہے کہ کچھ دن میں اچھے ہو جائیں گے۔"

"اور یہ کچھ دن کبھی نہیں آئیں گے۔" وہ ہنسا۔

"آپ بک بک فرمانے کے بجائے یہ بتائیں کہ نوادرات والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"میں نے وزارتِ ثقافت کے اس افسر کے ساتھ مل کر ایک چکر تو چلایا ہے۔ ممکن ہے اس مہینے کے آخر تک نوادرات واپس پاکستان آ جائیں۔ میں نے اسے مکمل کیٹلاگ فراہم کر دی۔ اس کی بنیاد پر حکومتِ برطانیہ سے نوادرات کی واپسی کا مطالبہ کر دیا گیا ہے۔ مناسب وقت پر ان نوادرات کو بازیاب کرا کے پاکستان روانہ کر دیا جائے گا۔"

"گڈ تم نے میرے سر سے ایک بوجھ اتار دیا ہے برخوردار۔ تم نے قائم مقام داماد ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اچھا خوش خبری یہ ہے کہ ایک مہینے کے اندر ہم سب لندن میں تمہارے غریب خانے میں ہوں گے' ہمارے استقبال کی تیاریاں رکھو۔"

"ہرگز نہیں! میں نے عینی سے صرف اس وجہ سے شادی کی تھی کہ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ سسرال کے چکروں اور خاطر تواضع سے بچا رہوں گا۔ پہلے آپ زبردستی کے سسر بن گئے اور اب وہ اداکارہ بی بی ساس بن کر آ رہی ہیں۔ ایک پہلے ہی بھگت رہا ہوں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" عینی نے اس سے فون چھین لیا "بھیا سچ مچ آ رہے ہیں نا اور جلدی آیئے۔ میں آپ سب کے بغیر اداس ہوں۔"

"میری بہنا۔ بس کچھ دن کی اور بات ہے پھر ہم سب ایک ساتھ ہی ہوں گے اور اس داماد کو تو میں آ کر دیکھ لوں گا۔"

وہ ہنسی "ان کی فکر نہ کریں۔ انہیں تو میں سیدھا کر دوں گی۔"

فون سے فارغ ہو کر میں نے دیکھا کہ رئیس اور نیلم غائب تھے۔ وہ یقیناً کہیں اور اپنی خوشیاں منا رہے تھے۔ میں نے ان کی تنہائی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا اور بیگ میں رکھے ہوئے باکس باہر نکالے۔ یہ لکڑی کے چار منقش بکس تھے جو عام طور سے قیمتی اشیا اور زیورات رکھنے کے کام آتے ہیں۔ ان سب پر تالے لگے تھے جن کے ساتھ ہی ڈوری سے ان کی چابی بھی لٹکی ہوئی تھی۔ باکس کا سائز چھ ضرب چار انچ تھا اور یہ چار انچ ہی اونچا تھا۔ میں نے پہلا باکس کھولا اور دم بہ خود رہ گیا۔ باکس میں جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ ہیرے' زمرد' نیلم' فیروزہ۔ اور یاقوت' بہت سارے پتھروں کے تو مجھے نام بھی نہیں آتے تھے اور نہ ہی مجھے ان کی مالیت کا علم تھا لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ ان کی مالیت کروڑوں سے کم نہیں ہے۔ روشنی پڑتے ہی پتھر جگمگانے لگے اور ان کا انعکاس اردگرد کی چیزوں پر پڑ رہا تھا۔ میں نے دوسرا باکس کھولا اس میں بھی جواہرات تھے لیکن ناتراشیدہ۔ تیسرے میں ڈالرز کی گڈیاں رکھی تھیں۔ یہ سو ڈالر والے نوٹ تھے اور ہر باکس میں دس گڈیاں تھیں۔ ہر گڈی میں دس ہزار ڈالرز تھے گویا ان کی مالیت ایک لاکھ ڈالر تھی۔ ایک راشی ڈی ایس پی کے پاس بس اتنی مالیت کے نوٹ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن اس نے اپنا اثاثہ ڈالرز سے زیادہ مالیت کی شے یعنی جواہرات میں رکھا تھا۔ چوتھے باکس میں دس ہزار مالیت کے بونڈز تھے اور یہ پورے گڈیوں کی صورت میں تھے۔ ان کی مالیت کسی طرح پچاس لاکھ سے کم نہیں تھی پھر مجھے فائل کا خیال آیا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے فائل نکالی اس کے اندر کچھ دستاویزات اور ایک لفافہ تھا جو کلپ سے پھنسا ہوا تھا۔ میں نے پہلے کاغذات دیکھے حسب توقع ان میں رب نواز کے خلاف کچھ ایسے ثبوت تھے جن کی مدد سے اسے مقدمات میں ملوث کیا جا سکتا تھا۔

ایک واقعہ نظام پورہ کا تھا۔ وہاں سے ایک طالبہ کا اغوا ہوا۔ بعد میں اس کی لاش جھاڑیوں میں پڑی ملی تھی۔ اسے آبروریزی کی کوشش میں ناکامی کے بعد گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا اور اس کے گلے پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات ملک رب نواز کے تھے۔ بعد میں پولیس نے اس کیس کو دبا دیا لیکن دلاور شاہ نے کسی طرح وہ رپورٹ حاصل کر لی جس میں رب نواز کے فنگر پرنٹ مجرم کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کاغذات میں ایک ملزم کا حلفیہ بیان تھا۔ جو اس نے ایک مجسٹریٹ کے سامنے خود لکھا تھا۔ اس پر اس کے دستخط موجود تھے۔ بعد میں یہ ملزم حوالات میں مردہ پایا گیا۔ بہ قول پولیس کے اس نے اپنی شلوار کے ازاربند سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔ اس طرح رب نواز کے خلاف کچھ اور ثبوت بھی تھے۔ میں نے لفافہ کلپ سے الگ کیا۔ اس میں سے چند تصویریں نکلیں۔ میں نے پہلی ہی تصویر اٹھائی تھی کہ اچھل پڑا۔ اس میں ایک آدمی کی لاش تھی۔ اس کے سرہانے ملک رب نواز پستول ہاتھ میں لیے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ پس منظر سے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی گودام نما جگہ ہے۔ مجھے شاہدرہ میں ملک رب نواز کا وہ گودام یاد آ گیا جہاں میں نے سونی کے ہمراہ چھاپا مار کارروائی کی تھی۔ یہ وہی جگہ لگ رہی تھی۔ دوسری تصویر میں رب نواز اس پر گولی چلا رہا تھا۔ تیسری میں وہ الٹ کر گر رہا تھا۔ دوسری میں وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا اور رب نواز سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ پہلی تصویر میں دو افراد اسے بازوؤں سے پکڑ کر لا رہے تھے۔ ترتیب الٹی تھی لیکن یہ تصویریں ایک قتل کی کہانی سنا رہی تھیں اور رب نواز کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی تھیں۔ میرے اندر جوش بھرنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ دلاور شاہ اتنے اہم ثبوت دبائے بیٹھا تھا اور ان سے کوئی کام نہیں لے رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ رب نواز معمولی ہستی نہیں تھا۔ ایسے ثبوتوں کے باوجود اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں خاصی دشواری پیش آ سکتی تھی لیکن وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ پہلے شرابی نامی بھارتی کا معاملہ سامنے آیا اور اب رب نواز کے خلاف اتنے اہم ثبوت ہاتھ آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ قدرت بھی اس کے گرد شکنجہ کسنے میں میری مدد کر رہی تھی۔

نیلم اور رئیس ہنستے ہوئے اندر آئے اور پھر دنگ رہ گئے "میرے خدا۔" خاصی دیر بعد نیلم کے منہ سے نکلا تھا "یہ سب کیا ہے؟"

"ہاتھ کا میل جسے عرفِ عام میں دولت کہتے ہیں۔ مرحوم دلاور شاہ کے خزانے سے بس یہی کچھ نکلا۔" "ہائے کیا غربت کی موت مرے مرحوم۔" میں نے سرد آہ بھری۔

"اور جو کمایا تھا وہ یہیں چھوڑ گئے۔" رئیس نے لقمہ دیا۔ نیلم جواہرات دیکھ رہی تھی۔ وہ عورت تھی اور پھر فلمی اداکارہ بھی۔ اسے جواہرات کا شوق بھی تھا اور ان کی پہچان بھی تھی۔ اس نے انہیں ہاتھوں میں لے کر کہا "یہ بہت قیمتی ہیں ان کی مجموعی مالیت کروڑوں میں ہو گی۔"

"دلاور شاہ نے اپنا اثاثہ بین الاقوامی کرنسی میں رکھا تھا۔ ہیرے کسی جگہ بھی بک جاتے ہیں۔ دولت مند ملکوں میں اس کی کہیں زیادہ قیمت ملتی ہے اور چھوٹی سی جگہ میں اس سے زیادہ مالیت کی کوئی اور شے آ ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک لاکھ ڈالرز اور پونڈز بھی اس نے نقدی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے رکھے ہوں گے ان پر کوئی انعام نکل آئے تو یہ بونس ہو گا لیکن اصل خزانہ یہ ہے۔" میں نے فائل ان کے سامنے رکھ دی۔ نیلم نے فائل اٹھا کر اس کے کاغذات دیکھے اور رئیس تصویریں دیکھنے لگا۔ دونوں کا ردِعمل یکساں تھا۔

"وہ مارا۔" رئیس چلایا "اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ ملک رب نواز کیسے بچتا ہے۔"

"وہ پھانسی کے پھندے تک ضرور جائے گا۔" نیلم نے کہا۔

"میرا خیال ذرا مختلف ہے۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا "واضح ثبوت ہونے کے باوجود بچ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کے عدالتی نظام کو تو تم جانتی ہو۔ ورنہ وہ مقدمات کو اتنا طول ضرور دے دے گا کہ اس کی طبعی عمر ہی پوری ہو جائے گی۔"

"پھر کیا کریں؟" رئیس بولا۔

"ان چیزوں کی مدد سے ہم اسے اپنے دباؤ میں رکھ سکتے ہیں اور اس سے اپنے کام نکلوا سکتے ہیں۔"

"مثلاً۔" نیلم نے دلچسپی سے کہا۔

"مثلاً ہم اسے استاد موج دین کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ کینہ پرور آدمی نیلم اور رئیس کے ہاتھوں اپنی بے عزتی بھولا نہیں ہو گا۔ رب نواز اس کا دماغ درست کر سکتا ہے۔"

"لیکن ہم رب نواز کو اپنے تنازعے میں کیسے کھینچ سکتے ہیں۔" رئیس نے اعتراض کیا "اس طرح تو نیلم اس کی نگاہ میں آ جائے گی۔"

"ہم اسے نیلم کے بارے میں کیوں بتائیں گے۔ رب نواز کے لیے ہمارا حکم ہی کافی ہو گا۔ وہ موج دین کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"گڈ آئیڈیا اور موج دین کو رب نواز کے خلاف بھڑکائیں گے۔ دونوں کتوں کی طرح آپس میں لڑیں گے اور موج دین کی ہماری طرف سے توجہ ہٹ جائے گی۔"

"رائٹ" "اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے کہا "رئیس تو فوراً ان سب کی کاپیاں بنوا اور رب نواز کے پتے پر کوریئر کر دے۔"

"دستاویزات کی تو خیر ہے لیکن تصاویر۔" رئیس متفکر ہو گیا۔

"پولورائیڈ کیمرا کس لیے ہوتا ہے۔" نیلم بولی "میں ابھی لائی۔"

نیلم نے کیمرا لا کر تصویروں کی تصویر لی کئی کوششوں کے بعد وہ مناسب تصویریں لینے میں کامیاب رہی تھی۔ یہ اتنی صاف تھیں کہ رب نواز اور مارے جانے والے کے خدوخال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ تصویریں اور دستاویزات لے کر رئیس چلا گیا۔ سالگرہ کے لوازمات اتنے تھے کہ اب کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اور نیلم باہر لان میں نکل آئے۔ نیلم نے اپنے مکان کی طرف دیکھا اور اداسی سے بولی۔

"کیا میں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاؤں گی۔"

"نہیں بلکہ عارضی طور پر۔ مجھے یقین ہے کہ تین چار سال بعد ایسا وقت ضرور آئے گا جب ہم اپنے وطن واپس آ سکیں گے پھر اسی لاہور کی فضائیں ہوں گی اور ہم ہوں گے۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "ناصر مجھے یہاں کے معاملات سمٹتے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"بہ ظاہر ایسا ہی ہے لیکن تم دیکھنا دلاور شاہ کے اس تحفے کی مدد سے ہم رب نواز کے کس بل نکال دیں گے۔ اس کے بعد سارے مراحل آسان ہو جائیں گے۔ رب نواز کی مدد سے ہم موج دین کی استادی بھی نکال دیں گے اور جواب میں موج دین بھی اسے نقصان ضرور پہنچائے گا۔ تیسری طرف پیر سبحان شاہ رب نواز کے خلاف حرکت میں آئے گا۔ رب نواز بری طرح پھنس جائے گا۔"

"اس کا ہمیں فائدہ۔" نیلم سنجیدگی سے بولی "کیا تمہارے اوپر سے شاہ عالم کا ٹھپا ہٹ جائے گا۔ بلکہ آج کے اخباروں میں جو آیا ہے کہ اس کے بعد شاہ عالم کا نام ایک بار سب کے سامنے آ گیا ہے۔ اس کی صورت بھی لوگ نہیں بھولے ہیں۔ تم بلاوجہ لوگوں کی نظروں میں آؤ گے۔"

"فائدہ وقت کے ساتھ خود سامنے آئے گا۔" میں نے نرمی سے کہا "یہ بتاؤ کہ تمہاری شوٹنگز کا کیا ہوا؟"

"تقریباً مکمل ہیں۔ تھوڑا سا ڈبنگ کا کام رہ گیا ہے۔ وہ بھی ایک دو دن میں مکمل ہو جائے گا۔"

"تم نے سیٹس بک کرا لی ہیں؟"

"سیٹس سب کی ساتھ ہی ہوں گی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"نیلم میں چاہتا ہوں کہ تم اور رئیس یہاں سے چلے جاؤ۔ جب تک تم دونوں یہاں رہو گے میں فکرمند رہوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم چلے جائیں اور تم خطروں سے کھیلتے رہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"میں جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کرتا۔"

"اچھا ان دونوں بدمعاشوں کو اپنے ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں پولیس کے حوالے بھی کیا جا سکتا تھا۔"

"پولیس انہیں چھوڑ دیتی۔ زیادہ سے زیادہ ان پر چوری کا کیس بنتا اور دوسرے ہی دن وہ ضمانت پر رہا ہو جاتے۔" میں نے جواب دیا "اب ان خبیثوں کو بتانا ہو گا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ عباسی کے گھر انہیں کس نے بھیجا تھا۔"

"بات وہی ہے۔ معاملات سے معاملات نکلتے جائیں گے اور تم ان میں الجھتے جاؤ گے۔"

"اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔"

"ہے لیکن تم ماننے کو تیار ہی نہیں ہو۔" اس نے تیز لہجے میں کہا "ناصر ہم یہاں سے چلے جائیں تو یہ سب کچھ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔"

میں نیلم کو خودغرضی کا الزام نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی بھی عورت سب سے پہلے اپنے گھر اور اپنے پیاروں کو دیکھتی ہے جب کہ میں اس سارے معاملے کو دوسری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ رب نواز جیسے فرعون کے آگے سے ہٹ کر فرار ہو جانا میرے نزدیک پرلے درجے کی بزدلی کے ساتھ حق سے انکار کر کے باطل کو تسلیم کرنا تھا۔ میرے نبیؐ نے فرمایا کہ باطل جانے کی چیز ہے اور مجھے اس پر پورا یقین تھا۔ محض ظاہری طاقت دیکھ کر رب نواز کو من مانی کرنے کی چھوٹ نہیں دی جا سکتی تھی۔ بے شک اکثریت رب نواز جیسے لوگوں سے ڈرتی ہے لیکن افراد کا ایک گروہ ہر دور میں ہوتا ہے جو باطل کو باطل کہنے سے نہیں ہچکچاتا اور ظلم کے خلاف اٹھ جاتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میرا شمار بھی اسی گروہ میں ہو۔ یہ بات میں نیلم کو نہیں سمجھا سکتا تھا وہ سمجھنے کے لیے تیار ہی

ہیں ہوتی۔ ہم ٹہلتے رہے اور رئیس کا انتظار کرتے رہے وہ بارہ بجے کے قریب آیا اور آتے ہی کرسی پر پڑ گیا۔

"کوئی چائے پانی پوچھ لیا کرو۔" اس نے نیلم سے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

"سوری۔ میں ابھی کہتی ہوں۔" رئیس کے انداز پر نیلم نے جلدی سے معذرت کرلی۔ تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد رئیس نے کہا "معاف کرنا یار' ذرا اسے ٹہلا رہا تھا۔ میں کیٹلاگ بھی لے آیا ہوں۔ اس حرامی سبحان شاہ کے آدمی پیچھے لگ گئے تھے بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا ہے۔" اس نے ایک فولڈر میری طرف بڑھایا۔ اس کے اندر ان نوادرات کے کمپیوٹر پرنٹ آؤٹس تھے جنہیں میں لندن چھوڑ آیا تھا۔

"یہ تو نے نیک کام کیا۔" میں نے خوش ہو کر کہا "اور دوسرے کام کا کیا بنا؟"

"کوریئر کر آیا ہوں۔ امید ہے کہ کل کسی وقت رب نواز کو دل کا دورہ پڑے گا۔"

میں ہنسا "وہ بھی بیٹے کے برابر میں اسپتال میں جا لیٹے گا۔"

"اس پر یاد آیا۔" رئیس چونک کر بولا "ڈاکٹروں نے دلنواز کا داہنا پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا ہے۔ اس میں زہر پھیل گیا تھا۔"

"گویا رب نواز کو تھوڑی سی سزا یونہی مل گئی۔" میں نے کہا پھر رئیس کو سمجھانے لگا "اسے اور نیلم کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" اس نے میری بات سے اتفاق کیا اور بولا۔

"مگر یار مسئلہ یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ نیلم ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"اس کے ساتھ ترکیب نمبر دو اختیار کرو۔" میں نے کہا "جو ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔"

"کیا طے کر چکے ہو۔" نیلم اچانک ہی آ کر بولی۔ وہ خود چائے لے آئی تھی۔

"یہی کہ اب ہمیں لندن چلے جانا چاہیے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "رئیس سے میری اس پر بات ہو رہی تھی۔" اس نے چائے بنا کر مجھے اور رئیس کو دی۔ "یہ بات تو میں کب سے کہہ رہی ہوں لیکن تم سمجھ ہی نہیں رہے تھے۔"

"میں بھی اب سوچ رہا ہوں۔ میری وجہ سے تم لوگ بھی بلاوجہ خطرے میں ہو۔"

"یعنی تم چلنے کو تیار ہو۔" نیلم خوش ہو گئی۔

"ہاں بھائی' رئیس تو جلد از جلد سیٹیں بک کرا لے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ کام تو ابھی ہو جائے گا۔" نیلم بولی۔ اس نے اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ملایا "معین احمد' میں نیلم بات کر رہی ہوں۔ ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے ۔۔۔ تین سیٹیں چاہئیں۔۔۔ ایز سون ایز پاسیبل۔۔۔ لندن کی۔ کب ایک ہفتے بعد ۔۔۔ نہیں جلد از جلد کوشش کرو۔۔۔ کسی بھی ائرلائن کی مل جائیں۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ آپ یہ کام کر کے مجھے انفارم کریں' اوکے۔۔۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"تین دن بعد کی سیٹیں ملنے کا امکان ہے۔" نیلم نے ہماری طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ بھئی اور اس کے آنے والے بچے کے لیے بھی بہت ساری شاپنگ کرنی ہے۔"

"خدا کے واسطے نیلم۔" میں نے سر پکڑ لیا "مجھے تم صبح سے شام تک لیکچر دیتی رہتی ہو اور شاپنگ کرنے کی بات کر رہی ہو۔ ہم عام حالات میں ملک چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں بلکہ اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے فرار ہو رہے ہیں۔ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی غیر ضروری قدم ہمیں پریشانی میں ڈال سکتا ہے۔"

"تاصر درست کہہ رہا ہے۔ اگر تمہاری شوٹنگ کا کام مکمل ہو گیا ہے بلکہ نہیں بھی ہوا تب بھی فکر کی بات نہیں ہے۔ تم بیماری کا کہہ کر مت جاؤ اور ہم خاموشی سے یہاں سے چلیں جائیں گے۔" رئیس نے میری تائید کی۔

"بابا جیسی تم لوگوں کی مرضی۔" اس نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔

"چل یار ان استاد شاگرد کو بھی دیکھ آئیں۔" میں نے رئیس سے کہا۔

خلافِ توقع نیلم نے مزاحمت نہیں کی البتہ اتنا کہا۔ "جلدی آ جانا ورنہ میں فکر مند رہوں گی۔"

نیلم کے جانے کے بعد میں نے کہا "رئیس اندر سے میرا بریٹا پستول اور رائفل بھی لے آ۔ آج کل دشمن کچھ زیادہ سرگرم ہو رہا ہے۔"

جانے کے لیے میں نے وہی جیپ منتخب کی جو رئیس کی کار کے بدلے لی تھی۔ اس کے سیاہ شیشوں کے پیچھے ہماری صورتیں نہ نظر آتیں۔ کسی نے راستے میں تعاقب کرنے کی زحمت نہیں کی۔ بھاٹی گیٹ کی گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جیپ ہم نے گلی کے کنارے پر روک دی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر چاچا بھوت سامنے آیا تھا۔ جیرا بلیڈ بھی جاگ رہا تھا۔ اس

نے بہ ظاہر مسکرا کر اور گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا لیکن میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے انداز میں ایک ڈھکی چھپی بے زاری تھی۔ رئیس نے اس سے کہا۔

"ان حرامیوں نے کچھ اگلا۔"

"اگلتے کیسے نہیں۔" نذیر احمد نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "آپ پوچھ کر دیکھیں کیسا فرفر جواب دیں گے۔"

دونوں اس تہ خانے میں دیوار کے ساتھ زنجیروں سے بندھے کھڑے تھے بلکہ جھول رہے تھے ان کے جسموں پر صرف زیرِ جامے باقی رہ گئے تھے اور پورے جسم پر جابہ جا تشدد کے نشانات تھے۔ نذیر احمد نے اس کی خاصی خاطر تواضع کی تھی مگر اس سے زیادہ مسلسل کھڑے رہنے سے ان کی حالت خراب تھی۔ ان کے ہاتھ سروں سے اوپر دیوار میں گڑے کڑوں میں بندھے تھے۔ وہ سیدھے کھڑے رہنے پر مجبور تھے۔ احتیاطاً میں نے اور رئیس نے ان کے سامنے آنے سے پہلے اپنے چہرے چھپا لیے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی رونے گڑگڑانے لگے۔

"خدا کے لیے ہمیں کھول دو۔ جو پوچھو گے بتائیں گے۔"

"فرید عباسی کے گھر تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

"ہم اس کا نام نہیں جانتے۔ اس نے سامنے آئے بغیر پچاس ہزار روپے دیے تھے اور بقیہ کام کرنے کے بعد دینے کو کہا تھا۔"

"کام کیا تھا؟"

استاد ذرا دیر کے لیے ہچکچایا "ہمیں کہا گیا تھا کہ گھر میں موجود خوبصورت سی عورت کے ساتھ زیادتی کر کے اسے قتل کرنا ہے۔"

میں نے پوری طاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ "بڑا مردوں والا کام کرنا تھا۔" میں نے طنز کیا "اور یہ کیا بکواس ہے۔ تم اپنے باپ پر اعتبار نہ کرو۔ کسی نامعلوم شخص پر کیسے اعتبار کرو گے۔ تم اس کے بارے میں جانتے ہو۔" میں نے اس کے بال جکڑ لیے۔

"مم۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔" وہ کراہنے لگا۔

"معلوم ہے۔" میں نے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری۔ میں نے دوبارہ سر دیوار پر مارا۔ میرے دل میں اس کے لیے قطعی رحم نہیں تھا۔ اس نے رخشی کے ساتھ دست درازی کی تھی۔ بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے۔۔۔ کہ اس نے مجھے وسیلہ بنا کر بھیج دیا ورنہ یہ ذلیل شخص رخشی کو بے آبرو کر کے مار چکا ہوتا۔ میں ایک جنون کے عالم میں اس کا سر دیوار سے ٹکرانے لگا۔ "بول حرام زادے۔۔۔ کس نے بھیجا تھا تجھے؟"

رئیس نے مجھے پیچھے کھینچا۔ "کیا مارے گا اسے۔"

اتنی دیر میں اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ کر اس کے شانے تک آ رہا تھا۔ لیکن وہ سخت جان شخص تھا۔ ہوش میں تھا اور ہتھکڑی سے بندھا ہوا جھول رہا تھا۔ شاگرد اتنا دہشت زدہ تھا کہ اس کی نیکر گیلی ہو گئی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ گڑگڑانے لگا "خدا کی قسم مجھے کچھ نہیں معلوم۔ یہ حرامی ساتھ لایا تھا مجھے۔"

"تو اس کا پلا ہے۔" میں نے اس کے سینے پر لات رسید کی۔ اس کی پسلی ٹوٹ گئی۔ مجھے رخشی کی نوعمر ملازمہ کے بارے میں اس کا تبصرہ یاد تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان دونوں نامردوں کو اس قابل ہی نہ چھوڑوں کہ یہ عورتوں پر ظلم کر سکیں۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے جیرا بلیڈ سے کہا۔ "کوئی کٹر پلاس ہے تو لے کر آؤ۔"

"ابھی لایا۔" وہ اوپر چلا گیا۔

"تم جیسے زنخے اپنی مردانگی کے زعم میں کمزور عورتوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ میں تمہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا کہ آئندہ کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکو۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔

استاد اور شاگرد کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ وہ میرا مقصد اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر رونا' گڑگڑانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ چاچا بھوت کو آواز دی اور جب وہ نیچے آیا تو میں نے اسے ان کے انڈرویئرز بھی اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور واپس چلا گیا۔ اب انہیں یقین آ گیا تھا کہ میں اپنے عزائم میں سنجیدہ ہوں۔ ان کے رونے چلانے میں شدت آ گئی تھی۔ جیسے ہی جیرا بلیڈ نے کٹر پلاس کے ہمراہ نیچے قدم رکھا ان کی ہمت جواب دے گئی۔ استاد نے کہا۔

"خدا کے لیے میں بتاتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔"

میں سفاکانہ انداز میں ہنسا "میں تمہارا جو آپریشن کرنے جا رہا ہوں اس کے بعد تم واقعی کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔" میں نے جیرا بلیڈ کے ہاتھ سے کٹر پلاس لیا تو شاگرد کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ بے ہوش ہو کر جھول گیا۔

"مم۔۔۔ مجھے ۔۔۔ مجھے ملک رب نواز نے بھیجا تھا۔"

استاد صاحب باقاعدہ کانپ رہے تھے۔

"بکواس مت کرو۔ تم جیسے لوگوں کو ملک رب نواز منہ بھی نہیں لگاتا۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"مجھے تو جابی نے حکم دیا تھا۔ وہ رب نواز کا خاص بندہ ہے۔" استاد جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ جیسے اسے خطرہ ہو کہ اس نے جواب دینے میں ایک لمحے کی تاخیر کی تو میں آپریشن شروع کر دوں گا۔"

گویا رب نواز اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا۔ "تمہیں خاص طور پر عباسی کے گھر کیوں بھیجا گیا۔ اس سے یا اس کی بیوی سے رب نواز کی کیا دشمنی ہے؟"

"اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ فرید عباسی شاہ عالم کا وکیل ہے اور رب نواز نے اسے سزا دینے کے لیے مجھے بھیجا تھا۔"

"اس نے نہیں تمہاری شامتِ اعمال نے تمہیں بھیجا تھا۔" میں نے کہا اور رئیس کو اشارہ کرکے باہر آگیا۔

"یہ دونوں ہمارے لیے بے کار ہیں۔ اب ان کا کیا کرنا چاہیے۔" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے انہیں چھوڑ دو۔ فرید پہلے ہی اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پولیس میں رپورٹ بھی نہیں کروائی تو پھر انہیں رکھ کر کیا اچار ڈالنا ہے۔"

"ٹھیک ہے انہیں کہیں پھینک دو۔"

رئیس نے جیرا بلیڈ کی مدد سے انہیں جیپ تک پہنچایا اور ہم نے انہیں ایک پارک کے کنارے جیپ سے باہر دھکا دے دیا۔ ان کے ہاتھ پیر بندھے تھے اور آنکھوں پر کپڑا چڑھا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

"اپنے باپ سے کہہ دینا کہ بہت جلد اس کا سارا دم خم نکل جائے گا اور وہ شاہ عالم کے تلوے چاٹنے کے لیے تیار ہو گا۔"

رات کے تین بج رہے تھے سارے دن کی بھاگ دوڑ جسم پر اثر کر رہی تھی۔ مجھے شدت سے نیند آ رہی تھی۔ میں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اونگ گیا تھا۔ حتیٰ کہ نیلم ہاؤس آگیا۔ میں بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح رئیس نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ "کیا ہوا خیریت تو ہے؟" میں نے جماہی لی۔

"خیریت نہیں ہے۔ کل رات نو بجے کچھ لوگوں نے فرید اور رخشی کے گھر پر حملہ کرکے اسے آتش گیر بموں سے آگ لگا دی تھی۔" اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں فرید عباسی کے جلے ہوئے گھر کی تصویر تھی۔ کل تک یہ ایک خوبصورت مکان تھا جو اب جلے ہوئے ملبے کا ٹوٹا پھوٹا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا۔ میں چند لمحے کے لیے گم صم رہ گیا تھا۔ بے شک معمولی سا سہی لیکن رخشی اور عباسی نے کتنے چاؤ سے اس گھر کو آباد کیا تھا۔ اس کو خوبصورت بنایا تھا اور سجایا سنوارا تھا۔ بے شمار چیزیں لائے تھے۔ وہ گھر ان کی محبتوں اور قربتوں کا امین تھا۔ ان کے لیے سایہ تھا اور چند ہوس پرستوں نے اسے لمحوں میں راکھ بنا دیا تھا۔ اشتعال کی شدید لہر نے مجھے لرزا دیا تھا۔ ہماری زندگی رب نواز کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جب چاہتا اور جو چاہتا کر گزرتا تھا اور کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔ ہم لوگ جواب دینے کا سوچ کر رہ جاتے تھے اور کبھی اسے جواب نہ دے سکے۔ بس اپنا دفاع ہی کرتے رہے۔ میں نے اخبار بستر پر دے مارا۔

"رئیس بہت ہو گئی اب پانی سر سے اوپر ہوتا جا رہا ہے۔"

"صبر میرے یار۔ ترپ کا پتا ابھی ہمارے ہاتھ میں ہے تو دیکھنا کہ رب نواز کیسے گھٹنے ٹیکے گا۔"

"پر یار' اس سے رخشی اور عباسی کو ان کا گھر تو نہیں مل جائے گا۔ انہوں نے کتنی محبتوں سے یہ آشیانہ بنایا تھا۔"

"یار مکان دوبارہ بن جاتے ہیں۔ شکر کرو کہ رخشی اور عباسی گھر پر نہیں تھے' یہ مکان تو رب نواز پھر سے بنوا کر دے گا۔ بلکہ اس سے دوگنا ہرجانہ وصول کیا جائے گا۔"

"تو نے اچھا یاد دلایا۔ رب نواز جیسے لوگوں کی طاقت ان کی دولت ہوتی ہے۔ میں اس سے یہ دولت چھیننا شروع کر دیتا ہوں میرے جانے کے بعد یہ کام کوئی اور جاری رکھے گا۔ حتیٰ کہ رب نواز کنگال ہو جائے گا۔"

"احمقانہ باتیں نہ سوچ یار۔ ہمیں بس اپنا کام نکالنا ہے۔" رئیس بولا "چل اٹھ کر ناشتا کر لے۔ رخشی اور عباسی کو واپسی پر پتا چلے گا۔ یہ خبر اخبار کے مقامی صفحے پر شائع ہوئی ہے۔"

نیلم اور رئیس ناشتا کر چکے تھے اور وہ اپنے مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ نیلم کا خیال تھا کہ وہ کوئی ڈراما پروڈیوس کرے گی۔ اس نے برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور وہ ان کے مسائل پر ایک سیریل بنانا چاہتی تھی۔ وہ رئیس سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کر رہی تھی۔ میرے خیال میں یہ بعد کی باتیں تھیں لیکن وقت گزاری کے لیے اس پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ناشتے کے دوران میں رب نواز کے جرائم پر غور کر رہا تھا۔ وہ اخلاقی اور فوجداری مجرم تو تھا ہی۔ اب وہ وطن دشمن بھی نکل آیا تھا۔ اس کے بھارتیوں سے روابط تھے اور

وہ بھی پروفیسر ہاشم رضا کی تحقیقات کے معاملے میں۔ صاف ظاہر تھا کہ رب نواز بھارتیوں کے ہاتھوں اس انوکھی ایجاد کو بیچنا چاہتا تھا۔ بھارت ایک مسلّمہ طور پر جنگ پسند ملک تھا جس کی بہت بڑی فوج اس کے بجٹ پر بہت بڑا بوجھ بھی تھی۔ اگر اسے پروفیسر ہاشم رضا کی تحقیقات کی مدد سے لالی اور جبو جیسے نیم انسان اور نیم حیوان فوجی مل جاتے تو اس کی جنگی قوت بے پناہ بڑھ جاتی۔ یہ فوجی کم خرچ ہوتے کیوں کہ یہ نہ تو تنخواہیں مانگتے اور نہ ہی انہیں پنشن دینا پڑتی تھی۔ ممکن ہے کہ ساری فوج نہ سہی لیکن اسپیشل دستے ایسے ہی نیم انسان و نیم حیوان مخلوق کے بنائے جا سکتے جو خاص حالات میں خدمات انجام دیتے۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جو انسان کی برداشت سے باہر ہوں۔ جیسے سیاچن جیسے خطے جہاں کی بے پناہ سردی برداشت کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف مضبوط قوتِ برداشت رکھنے والے انسان ہی ان حالات کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لالی اور جبو جیسی حیوانی طاقتیں رکھنے والی مخلوقات یقیناً انسان سے کہیں زیادہ طاقت اور قوتِ برداشت رکھتی تھیں۔ ایسے فوجی جن کی زندگی کی کسی کو پروا نہیں ہو گی اور جنہیں بلا جھجک خطرناک سے خطرناک مشن پر بھیجا جائے کسی بھی ملک کے لیے قیمتی ہو سکتے ہیں اور ہر جنگجو ملک ان کے لیے منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہو جائے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ رب نواز نے اس مقصد کے لیے بھارتیوں سے کیوں سودا کیا تھا۔ اسے جو رقم امریکا یا اسرائیل دے سکتا تھا' وہ رقم بھارتی بنیے نہیں دے سکتے تھے۔ پھر رب نواز گھاٹے کا سودا کیوں کر رہا تھا۔ میں فی الوقت یہ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن رب نواز کے بھارتیوں سے روابط میرے وطن کے لیے ایک بڑے خطرے سے کم نہیں تھے۔ ایسی تباہ کن شے ان دشمنوں کے ہاتھ نہیں لگنی چاہیے تھی جو روزِ اول سے اس ملک کے درپے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔

مجھے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں رب نواز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ان تصویروں اور دوسرے ثبوتوں کے بل پر بھی اسے سزا نہیں دلوا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ملک سے ہی فرار ہو جاتا۔ ظاہر ہے قانون اس کے جرائم کی سزا اس کے بھائیوں اور اولاد کو تو نہیں دے سکتا تھا۔ ملک خاندان اسی طرح اس سرزمین اور اس کے لوگوں پر فرعون بن کر حکومت کرتا رہتا۔ جب کہ مجھے یقین تھا کہ اس وطن فروشی میں رب نواز اور اس کے خاندان کے ساتھ کئی اور دوسرے لوگ بھی ملوث تھے جو کھاتے تو اس دھرتی کا اگا اناج تھے لیکن وہ اس کے ساتھ ماں کا نہیں بلکہ طوائف کا سا سلوک کرتے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو یار۔" رئیس میرے پاس آ بیٹھا۔ "کیا عباسی کا گھر جلنے کا صدمہ ہے اب تک؟"

"نہیں یار۔" میں نے کہا پھر اسے اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ وہ بھی متفکر نظر آنے لگا تھا۔

"پر یار ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم تو اس ملک کے بہت عام سے شہری ہیں۔ ہمارے اختیار سے یہ معاملہ باہر ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جن کو اس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے۔"

"کام کی تنخواہ۔" میرے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ "ان کو اپنے ہی شہریوں کے گھروں میں رات کی تاریکی میں چھاپے مارنے سے فرصت ملے تو کچھ اور کریں بھی۔ پر بھائی ہماری بھی کچھ ذمے داری بنتی ہے۔ اگر ایسا معاملہ سامنے آتا ہے تو اس سے نظر چرا کر گزرنا عملاً وطن فروشوں کا ساتھ دینے کے مترادف ہے اور میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"پھر تو کیا کرے گا؟" رئیس نے تلخی سے کہا "رب نواز کی کوٹھی پر توپ سے حملہ کر دے گا اور اسے مع اس کے حواریوں کے اڑا دے گا۔"

"کام کرنے کے بے شمار راستے ہیں۔ ابھی تو پہلے رب نواز سے بات کرتے ہیں۔ اس وقت تک اس معاملے میں بھی کوئی نہ کوئی تدبیر ذہن میں آ ہی جائے گی۔ اب میرا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔"

"ناصر! ان چکروں میں مت پڑ میرا مشورہ ہے کہ جن کا کام ہے انہیں بتا دے۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ اس معاملے میں کیا کرتے ہیں۔"

رئیس کی بات بھی قابلِ غور تھی مگر فی الوقت میں رات والے پارسل پر ملک رب نواز کا ردِ عمل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے موبائل پر رب نواز کی کوٹھی کا ایک نمبر ملایا۔ فون کسی ملازم نے اٹھایا۔ میں نے شاہ عالم کا حوالہ دے کر رب نواز سے بات کرنے کو کہا۔ ایک منٹ بعد رب نواز کے بجائے اس کی بیوی لائن پر تھی۔ اس سے میں پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ وہ پڑھی لکھی عورت تھی اور غالباً کسی کالج میں پڑھاتی رہی تھی۔ اسے ملک رب نواز کی دوسری بیوی ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اور فی الوقت رب نواز اس کے ساتھ رہ رہا تھا اس کی باقی تین بیویاں اور بھی تھیں..... اس کی آبائی حویلی میں۔ ملکانی کا نام شاید شائستہ تھا۔ وہ تقریباً چالیس برس کی خوبصورت اور گداز بدن کی عورت تھی جس نے اب بھی اپنی جوانی کو سنبھال کر رکھا تھا۔

"شاہ عالم تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے بلا تمہید کہا۔
میں نے مذاق میں جواب دیا "تمہیں' میں تمہارے پیچھے پاگل ہو رہا ہوں۔ رب نواز تو یونہی درمیان میں آ جاتا ہے۔"
"شاہ عالم میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ رب نواز اس وقت اسپتال میں ہے۔ تم نے جو بھیجا تھا اسے دیکھ کر اس کو دل کا دورہ پڑا تھا۔"
"دوسرا دورہ۔" میں ہنسا "شائستہ یہ شخص تو گیا اب بہتر ہو گا تم اگلے شوہر کی تلاش شروع کر دو۔"
"اگلا شوہر۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "شاہ عالم جب میں اس کوٹھی میں آئی تھی تو باہر کی دنیا سے میرے سارے رشتے منقطع ہو گئے تھے اب مجھے تادم مرگ اس حویلی میں رہنا ہے۔ چاہے رب نواز زندہ رہے یا نہ رہے۔"
"یہ تو تمہارے حسن و جوانی کے ساتھ زیادتی ہو گی۔" اس بار میں نے سنجیدگی سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے رب نواز جیسے شخص سے شادی کیوں کی جب کہ تمہیں اس سے کہیں بہتر مل سکتے تھے؟"
"یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا "یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ اگر تم مجھے چاہتے ہو تو میں تمہارے پاس آنے کے لیے تیار ہوں۔"
مجھے شاک لگا تھا۔ میری ایک مذاق میں کہی بات کو وہ اتنی آسانی سے ماننے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ وہ اتنی بچی نہیں تھی کہ میری بات کا مطلب نہ سمجھتی۔ اس کا خیال تھا کہ میں شاید سچ مچ اس کے چکر میں ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عمر میں وہ حسن و شباب کا شاہ کار تھی اور اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ نوجوانی میں وہ کیا قیامت رہی ہو گی۔ ملک رب نواز نے ایسے ہی اسے اپنی چوتھی بیوی نہیں بنایا ہو گا۔
"اب کے تم مذاق کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔
"نہیں میں سنجیدہ ہوں۔ اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے اس پر بھی تیار ہوں۔ تم جہاں کہو گے میں چلی آؤں گی۔"
"معاف کرنا۔ میں صورت سے شاید بے وقوف نظر آتا ہوں ــــ میں نہیں جانتا کہ رب نواز سے تمہاری شادی ایک جبر کے تحت ہوئی تھی۔ ایسے شخص کی گلو خلاصی کے لیے تم اپنی آبرو کی قربانی دو۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی۔ اصولاً تو تمہیں خوش ہونا چاہیے تھا اور دعا کرنی چاہیے کہ رب نواز گھر واپس نہ آئے اسپتال ہی سے قبرستان کی طرف روانہ ہو جائے۔"
"کاش کے میں یہ دعا کر سکتی۔ شاہ عالم میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ انہیں بڑا ہونے اور اپنا حق حاصل کرنے کی عمر تک پہنچنے کے لیے ابھی باپ کے سائے کی ضرورت ہے۔"
اس کے لہجے میں حسرت تھی۔
"میں نہیں مان سکتا۔" میں نے ایمان داری سے کہا۔ "تمہاری اس پیش کش کے پیچھے کوئی چکر ہے کوئی بھی عورت اتنی آسانی سے اپنی آبرو......"
"اس کوٹھی میں آ کر میں لفظ آبرو کا مفہوم بھول چکی ہوں۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا "تم آؤ بات کرو۔ میں شام چار بجے شیزان میں تمہارا انتظار کروں گی۔ کسی فیملی کیبن میں کاؤنٹر سے میرا نام لے کر پوچھ لینا۔"
اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر فون بند کر دیا۔ رئیس پاس ہی کھڑا میری باتیں سن رہا تھا اس نے کہا۔
"تو ملک کی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ یہ کیا چکر چلا رہی ہے۔"
میں نے رئیس کو تفصیل سے ساری گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے فوراً کہا "تا صر یہ بہت حرافہ عورت ہے۔ اس نے تیرے لیے کوئی جال بچھایا ہے۔ اسے ملک رب نواز سے کم نہ سمجھ۔ کوئی عورت اتنی آسانی سے خود کو اپنے شوہر کے بدترین دشمن کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔"
"یہ بات میرے ذہن میں ہے لیکن میں اس کی پیش کش کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی مدد سے ہمیں اندر کی بہت ساری باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔"
"وہ اتنی احمق عورت نہیں ہے کہ اپنے شوہر کے راز تجھے بتا دے۔" رئیس بھنا کر بولا "میں تجھے ہرگز اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔"
"چل یار جیسی تیری خوشی۔" میں نے ہنس کر کہا "میں اس چکر باز عورت کے چکر میں نہیں آؤں گا مگر یار رب نواز تو اسپتال جا لیٹا ہے اب ہم کیا کریں اور کیسے مجبور کریں۔"
"وہ ساری عمر تو اسپتال میں نہیں لیٹا رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عورت جھوٹ بول رہی ہو۔ رب نواز اتنا کمزور نہیں ہے۔ کہ چند تصویریں دیکھ کر اسے دل کا دورہ پڑ جائے۔ پہلے اس کی تصدیق ضروری ہے کہ رب نواز کو واقعی دل کا دورہ پڑا ہے یا وہ مکر کر رہی ہے۔"
"یہ کون سا مسئلہ ہے۔ تو کسی بھی فرضی نام سے رب نواز سے بات کرنے کی کوشش کر' تجھے معلوم ہو جائے گا۔"
رئیس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بے حد چالاک لوگ ہیں۔ اگر انہوں نے یہ دھوکا کیا ہے تو پکا کام کیا ہو گا۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ رب نواز کو سچ مچ کسی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہو۔"
رئیس کی بات قابلِ غور تھی۔ واقعی' رب نواز جیسے مکار سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔ تصویریں اور دستاویزی ثبوت دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے ہوں گے اور وہ ہر قیمت پر مجھے گھیرنے پر تل گیا ہو گا۔ کیونکہ اس کے سر پر تلوار کی طرح لٹکنے والے یہ ثبوت میرے ہی قبضے میں تھے۔ رئیس رب نواز کے بارے میں پتا چلانے کا کہہ کر چلا گیا اور میں سوچ بچار کرنے لگا۔ نیلم نے شاپنگ تو نہیں کی لیکن وہ گھر میں ہی تیاری کر رہی تھی۔ اپنا سامان نکلوا کر دیکھ رہی تھی کہ اس میں سے کیا لے جانا ہے اور کیا چھوڑ کر جانا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ سب فضول ہی تھا۔ ایک سوٹ کیس چند جوڑے اور ذاتی استعمال کی اشیا لے جانا ہی کافی ہوتا لیکن اسی بہانے نیلم مصروف تھی اور میں اس کے سوالوں سے بچا ہوا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے موبائل کا انٹینا اونچا کیا۔
"ہیلو!" میں نے کہا۔
"شاہ عالم! میں شائستہ بول رہی ہوں" دوسری طرف سے ملک رب نواز کی بیوی کی ہیجانی آواز آئی۔
"تم ـــ تمہیں میرا نمبر کیسے ملا؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔
"ملک نے فون پر آبزرویشن لگوایا ہوا ہے۔ کسی طرح اس نے تمہارے موبائل کا نمبر حاصل کر لیا۔ اس لیے مجھے معلوم ہو گیا۔"
"گویا دل کے دورے والی کہانی جھوٹ تھی؟" میں نے کہا۔
"وہ ملک کا ڈراما تھا۔ وہ تمہارے لیے جال بچھا رہا ہے۔ اس کے مجبور کرنے پر میں نے تم سے بات کی تھی۔"
"اگر ملک نے تمہیں مجبور کیا ہے تو اس کے بے غیرت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔"
"غیرت" وہ زہریلے انداز میں ہنسی "میں نے اس گفتگو میں ایک بات سچ کہی تھی کہ اس کوٹھی میں غیرت اور آبرو کے لفظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ تم جب مجھ سے ملو گے تو میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گی۔"
"کیا یہ ملک رب نواز کا کوئی اور پلاٹ ہے" میں ہنسا۔
"نہیں' میں اب اپنی طرف سے بات کر رہی ہوں۔"
"کیوں کیا فون پر اب آبزرویشن نہیں ہے؟" میرے لہجے میں طنز تھا۔
"اس وقت میں اپنے پرسنل موبائل سے بات کر رہی ہوں۔ تم اپنے موبائل پر میرا نمبر دیکھ سکتے ہو۔"
واقعی موبائل پر اس کا موبائل نمبر آ رہا تھا۔ میں نے غور نہیں کیا تھا "اب تم نے کیوں فون کیا ہے؟ اپنی پیش کش کے اعادے کے لیے؟"
"تم چاہو تو ایسا سمجھ لو لیکن میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔"
"مجھے مزید کسی فائدے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ملک رب نواز میری مٹھی میں ہے۔ میں اس سے جو چاہوں منوا سکتا ہوں۔ تم بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟"
"میں ـــ میں رب نواز سے چھٹکارا چاہتی ہوں" اس نے سرگوشی کی۔
اس عورت نے مجھے پھر دنگ رہ جانے پر مجبور کر دیا "کچھ دیر پہلے تو تم اسے اپنے بچوں کا باپ قرار دے رہی تھیں۔"
"وہ بھی اس کے ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔"
"سوری ملکانی' میں سانپ کا ڈسا ہوں اور رسی سے ڈرنے پر مجبور ہوں۔ مجھے رب نواز سے متعلق کسی شخص پر بھروسا نہیں ہے۔ تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرو۔"
"پلیز' میں سخت مشکل میں ہوں۔"
"میں بھی مشکل میں ہوں ملکانی۔ اور فی الوقت کسی دوسری مشکل میں پڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"
"سنو' میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس وقت بھی میں باتھ روم میں غسل کے بہانے موجود ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے۔ رب نواز نے لالی کو مجھ پر مسلط کر دیا ہے۔ مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔"
"اس صورت میں تم مجھ سے ملنے کیسے آؤ گی؟" میں نے طنز کیا "تم کوئی چکر چلا رہی ہو۔"
"خدا کی قسم کوئی چکر نہیں ہے۔ شاہ عالم یہ بہت گھناؤنے لوگ ہیں۔ میں ان سے ہر قیمت پر چھٹکارا چاہتی ہوں۔ میں ان کے کچھ ایسے راز جان گئی ہوں جو منظر عام پر آ جائیں تو اس سرزمین پر ان کو کہیں پناہ نہیں ملے گی لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اکیلی عورت ہوں۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔"
"کیسے راز؟" میں نے غور کیا۔
"یہ میں تمہیں ملنے پر بتاؤں گی اور میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ میں کشتیاں جلا کر آؤں گی۔ میری واپسی نہیں ہو گی

کیونکہ اس کے بعد میں ملک خاندان کے ہاتھ آئی تو وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔"

"تمہارے بچے' ان کا کیا ہو گا؟"

"وہ رب نواز کے پاس رہیں گے۔ بعد میں اگر حالات بہتر ہوئے تو میں انہیں حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گی۔"

"شائستہ تم قانون سے مدد کیوں نہیں حاصل کرتی ہو؟"

"قانون۔" وہ ہنسی تو میں خفیف ہو گیا تھا "خیر چھوڑو' اتنا بتاؤ کہ تم میری مدد کر سکتے ہو؟ شاہ عالم' اتنی بڑی زمین پر خدا کے بعد تم میری واحد امید ہو۔ اس روز تم نے جتنی شرافت سے مجھے اور قربان کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اگر تمہاری جگہ رب نواز ہوتا۔"

"میں رب نواز کی جگہ نہیں ہو سکتا" میں نے اس کی بات کاٹی "مجھے انکار کرتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے لیکن میں مجبور ہوں شائستہ' میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا اور رہا رب نواز کو تباہ کرنے کا تعلق تو وہ میں تمہاری مدد کے بغیر بھی کر سکتا ہوں۔"

"ان چند ثبوتوں کی مدد سے" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "رب نواز جیسے ہاتھی کے لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ زیادہ ہوا تو وہ ملک سے ہی غائب ہو جائے گا۔ ان مقدمات کو حکومت کی انتقامی کارروائی قرار دے گا اور جب نئی حکومت آئے گی تو اس کی حمایت کر کے مقدمات ہی ختم کرا دے گا۔ میرے پاس اس وطن فروش غدار خاندان کے خلاف جو ثبوت ہیں وہ انہیں جڑ سے ختم کر دینے کے لیے کافی ہیں۔"

اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے انجان بن کر کہا "میں یہ تو جانتا ہوں کہ ملک رب نواز معاشرے اور قانون کا مجرم ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ وطن فروشی میں بھی ملوث ہے۔"

"اس کا اصل کام یہی ہے۔ اب بتاؤ تم مجھ سے ملنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

ملک رب نواز کی وطن فروشی کا ذکر کر کے اس نے میرے ارادے کو کمزور کر دیا تھا۔ میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اگر یہ رب نواز کا ہی کوئی ڈراما تھا تو اسے اپنی وطن فروشی کے بارے میں نہیں کہنا چاہیے تھا اور میں اس حقیقت سے واقف بھی ہو گیا تھا۔ شائستہ نے پھر کہا۔

"شاہ عالم فیصلہ کرنے میں دیر مت لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وقت میرے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"او کے!" میں نے فیصلہ کر لیا "تم مجھ سے کہاں ملو گی؟"

"کہیں نہیں۔ میں رات آٹھ نو بجے کے درمیان ملک ہاؤس سے نکل جاؤں گی۔ عقبی راستے سے۔ تم نے اگر دیکھا ہو تو وہاں ایک چھوٹا سا پارک ہے' اس کے ساتھ تم کوئی گاڑی لے کر میرے منتظر رہنا۔"

میرا ذہن اب تیزی سے سوچ رہا تھا۔ "گاڑی نہیں۔ میں وہاں ایک ٹیکسی میں تمہارا منتظر ہوں گا۔"

اس نے گہری سانس لی "تھینک یو شاہ عالم اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میری مدد کر کے تم پچھتاؤ گے نہیں۔" اس نے فون بند کر دیا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے یعنی ابھی کافی وقت تھا۔ میری داڑھی مونچھیں بے ہنگم انداز میں بڑھ گئی تھیں اور میں شاہ عالم اور ناصر کلیم دونوں سے ہی مختلف نظر آ رہا تھا۔ میری داڑھی اتنی بھی نہیں بڑھی تھی کہ میں داڑھی والا جن نظر آنے لگتا۔

نیلم اپنے بیڈ روم سے نکلی "میرے خدا' میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ ناصر' تم میری مدد کرو۔"

"حکم کریں سرکار!" میں نے مستعدی سے کہا۔ وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی جو اس وقت کپڑوں کا کوئی شو روم لگ رہا تھا۔ چاروں طرف بلا مبالغہ سیکڑوں سوٹ بکھرے ہوئے تھے اور کوئی درجن بھر سوٹ کیس کھلے ہوئے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں دنگ رہ گیا۔

"ساتھ لے جانے والا سامان!" اس نے سادگی سے کہا۔ تو میں نے سر پکڑ لیا تھا۔

"نیلم' تم یہ سب اپنے ساتھ لے جاؤ گی؟"

"ہاں" اس نے کہا "میں جب بھی باہر جاتی ہوں' اتنے سوٹ تو لے جاتی ہوں۔ ابھی اتنے ہی سوٹ اور ساڑیاں اندر وارڈ روب میں ہیں۔"

"خدا کے لیے' تم کسی شوٹنگ پر نہیں جا رہی ہو۔ اتنا سب لے جانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک سوٹ کیس میں اپنے چند اچھے جوڑے پیک کر لو۔ اتنے سارے سوٹ کیسوں کے لیے تو کارگو بک کروانا پڑے گا۔"

میں بستر پر بکھرے اس کے کپڑے ایک طرف کر کے دراز ہو گیا "فضول آدمی ہو تم" نیلم خفا ہو گئی تھی "اپنے فضول مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔"

"ٹھیک ہے' تم اس کاٹھ کے الو سے مشورہ کر لینا' جو مستقبل میں تمہارے حکم کا غلام بنے گا۔"

"تم نے تیاری کر لی؟"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے۔ جو تن پر جوڑا ہو گا وہی پہن کر جہاز میں سوار ہو جائیں گے۔"

"تمہاری صورت تمہارے پاسپورٹ والی صورت سے قطعی نہیں مل رہی ہے" اس نے کہا "کل میں نے اس پر ویزا لگوانا ہے۔ قونصل خانے سے بات ہو گئی ہے۔"

"ارے اس پر یاد آیا۔ یہ بتاؤ کہ میرا پاسپورٹ ہے کہاں۔ میں نے اب تک اس کی زیارت نہیں کی ہے۔"

"ابھی دیتی ہوں" اس نے ایک سوٹ کیس کو اوپر تک بھر کر بہ مشکل بند کرتے ہوئے کہا۔

نیلم کا بستر واٹر بیڈ تھا۔ اس میں پانی بھرا تھا جسے موسم کی مناسبت سے ٹھنڈا یا گرم بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس پر لیٹ کر آدمی کو عجیب سرور انگیز ہلکورے ملتے ہیں۔ میں آنکھ بند کر کے ان ہلکوروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے پاس مہکتے وجود کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھ کھولی تو یہ دیکھ کر بوکھلا گیا کہ نیلم تقریباً میرے اوپر دراز تھی۔ وہ اتنا نزدیک تھی کہ میں اس کے وجود کی مہک کے ساتھ حرارت بھی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا کہ میری نظر سرہانے کی طرف گئی۔ نیلم نے بستر کے عقبی حصے میں لکڑی کی ٹیک کے ساتھ ایک خفیہ خانہ کھول رکھا تھا اور اس میں سے کچھ نکال رہی تھی۔

"یہ رہا تمہارا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات" وہ کہہ رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور رئیس کا چہرہ نظر آیا۔ نیلم کو میرے اتنا قریب دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے۔ نیلم کو اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔ وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ اس نے اس خانے میں کیا کیا چھپا رکھا ہے۔ رئیس کی آنکھوں میں رنج اور بے یقینی کی کیفیت نظر آئی تھی۔ اسی لیے نیلم کو احساس ہو گیا کہ میں بالکل خاموش ہوں۔ اس نے خانہ بند کیا اور پیچھے ہٹ کر پاسپورٹ مجھے تھما دیا اور پھر اس نے دروازے پر کھڑے رئیس کو دیکھ لیا۔

"ارے' تم اتنی خاموشی سے آئے" نیلم بولی "مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"ہاں' مجھے اتنی خاموشی سے نہیں آنا چاہیے تھا" اس نے تلخی سے کہا اور اندر آ گیا۔

میں اس صورت حال میں بلاوجہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور نیلم کا بھی نہیں تھا۔ اپنی ذات کے حوالے سے اس نے مجھے کبھی مرد نہیں سمجھا تھا اور اس وقت بھی وہ مجھ سے اس طرح پیش آئی تھی۔ اسے شاید احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنی دیر تک اپنے [illegible] نے محسوس کی اور مجھ سے زیادہ رئیس نے۔ رئیس بہرحال ایک مرد تھا جو اپنی عورت کو کسی کے اتنے نزدیک نہیں دیکھ سکتا تھا چاہے اس سے عورت کا کیسا ہی رشتہ کیوں نہ ہو۔ نیلم معمول کے انداز میں بات کرتی رہی اور رئیس ہوں ہاں کر کے جواب دیتا رہا۔ میں نے سوچا کہ اگر فوری طور پر رئیس کی غلط فہمی دور نہ کی گئی تو بات خراب ہو سکتی ہے۔ میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے رئیس سے کہا "چل یار' اس کی تو پیکنگ کبھی ختم نہیں ہو گی۔"

میں اسے لیونگ روم میں لے آیا۔ رئیس بدستور خاموش تھا۔ میں نے کہا "تجھے برا لگا ناں نیلم کو میرے اتنا پاس دیکھ کر؟"

"اپن برا ماننے والے لوگ نہیں ہیں" وہ پرانے انداز میں بولا "اپنی اتنی اوقات ہی نہیں ہے۔"

میں نے دکھی نظروں سے اسے دیکھا "یار! تجھے کیا نیلم اور مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں ہے۔ حالانکہ تو نے خود دیکھ لیا تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ یار! میرے معاملے میں اسے قطعی احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک جوان اور حسین عورت ہے اور میں مرد ہوں۔ وہ مجھے بالکل بیٹے یا بھائی کی طرح سمجھتی ہے۔"

"میں نے تجھ پر شک نہیں کیا اور نہ ہی نیلم پر" رئیس کسی قدر شرمندہ ہو گیا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔ اندر سے تو روایتی مرد ہے۔ افسوس کہ مجھے یا نیلم کو یہ خیال نہیں آیا۔ بہرحال اب میں محتاط رہوں گا۔" میں نے کہا۔

"بس یار اور شرمندہ نہ کر" رئیس اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا "قسم اللہ کی' اس دنیا میں تم دونوں کے سوا میرا ہے ہی کون۔ اگر تم بھی ناراض ہو گئے تو لعنت ہو مجھ پر۔"

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ رئیس کا دل تو صاف ہوا۔ اس نے بتایا کہ رب نواز کو دل کا دورہ نہیں پڑا اور وہ اپنی ہی کوٹھی میں ہے۔ میں نے اسے ملکانی کے فون کے بارے میں بتایا تو پہلے تو وہ حیران رہ گیا تھا پھر اس نے کہا "مجھے اس میں بھی کوئی چال لگتی ہے۔"

"اس کا حل میرے ذہن میں ہے تو ایک ٹیکسی پکڑ اور ایک ٹیکسی مع ڈرائیور کے لے آ۔ بے شک سارے دن کے لیے ہائر کرنا پڑے۔ اسے بتا دے کہ وہ رات آٹھ بجے رب نواز کی کوٹھی کے عقب میں واقع پارک کے پاس ٹیکسی لا کر کھڑی کر دے وہاں ایک عورت آئے گی۔ وہ شاہ عالم کے بارے میں پوچھے تو اسے لے کر شیزان تک آ جائے۔"

رئیس نے سرہلایا "میں سمجھ گیا لیکن دوسری ٹیکسی کس لیے؟"

"اس میں ہم جائیں گے" میں نے جواب دیا "ہم دور سے نگرانی کریں گے اور اگر ملکانی کوٹھی سے نکلی اور ٹیکسی میں آکر بیٹھی تو ہم دیکھیں گے کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کررہا ہے۔ اگر مجھے اطمینان ہوگیا تو پھر ہم ملکانی کو اپنی ٹیکسی میں منتقل کرلیں گے۔"

"لیکن اسے رکھیں گے کہاں؟" رئیس نے پوچھا تو مجھے وہ بنگلا یاد آگیا جو شبنم نے میرے دفتر کے طور پر منتخب کیا تھا اور اسے شاندار طریقے سے ڈیکوریٹ کرایا تھا۔ وہ دفتر اب تک دشمنوں کی نظروں سے محفوظ تھا۔ اس بنگلے کی چابیاں بھی نیلم کے پاس تھیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں نیلم سے چابی مانگتا تو وہ سوال کرتی اور شک کرتی کہ میں پھر کسی چکر میں ہوں۔ اسے مطمئن کرنا آسان کام نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے نیلم سے کہا۔

"وہ میرے دفتر کی چابیاں تمہارے پاس ہیں مجھے دو۔"

"کیا کروگے؟" اس نے فوراً کہا۔

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "دیکھو نیلم' ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں اور ہمیں اضافی ٹھکانوں کی ضرورت ہے جو دشمنوں کی نظروں سے محفوظ ہوں۔ یہ بنگلا بھی ایسا ہی ایک خفیہ ٹھکانا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلسل نیلم ہاؤس میں رہنا درست نہیں ہے۔ اس سے تم مشکل میں پڑجاؤگی اور ممکن ہے کہ ہماری روانگی بھی مشکل میں پڑجائے لہٰذا میں یہ تین چار دن کسی اور جگہ گزارنا چاہتا ہوں۔"

اس سے پہلے نیلم کچھ کہتی' رئیس نے میری تائید کردی۔ "شاہ صیح درست کہہ رہا ہے۔ ہمارا سارا انحصار ہی تم پر ہے۔ اگر تم کسی مصیبت میں پڑگئیں تو مشکل ہوجائے گی۔ ہماری باہر روانگی ملتوی ہوسکتی ہے یا اس میں تاخیر ہوسکتی ہے۔"

نیلم نے بے بسی سے ہمیں دیکھا "اگر تم دونوں کوئی چکر چلارہے ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

اس نے چابیاں مجھے لادیں "لیکن ابھی نہیں' تم رات کو جانا۔"

"رات کو ـــ نیلم وہاں جاکر دیکھنا ہے۔ ضرورت کی کچھ اشیا بھی چاہیے ہوں گی۔ ذرا صفائی ستھرائی بھی کرنا ہوگی۔ رات کو تو یہ سب نہیں ہوسکے گا۔"

"اوکے' شام کو جانا۔ اس سے پہلے ہلنا مت" نیلم نے وارننگ دی۔

میں نے سعادت مندی سے سرہلایا۔ رئیس کے باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی لہٰذا وہ کھانے کے بعد چپکے سے کھسک لیا۔ نیلم تھک گئی تھی۔ اس لیے آرام کرنے چلی گئی۔ نیلم ہاؤس کے عقبی حصے میں نیلم نے شاندار قسم کا سوئمنگ پول بنوا رکھا تھا۔ جس کے گرد چار دیواری تھی اور اندر مختصر سا باغ تھا۔ ظاہر ہے اس میں نیلم تیراکی کا شوق پورا کرتی تھی۔ ہلکے نیلے ٹائلوں سے بنے اس سوئمنگ پول کی شکل کچھ دل کی طرح تھی۔ دل کی نوک والے حصے میں پول کی سیڑھیاں لگی تھیں۔ میں وہاں تیراکی کرنے چلا آیا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں باقاعدگی سے سوئمنگ پول جایا کرتا تھا۔ کبھی میں اور چندا پکنک منانے راوی کنارے جاتے تھے تو ہمارے درمیان سوئمنگ کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا جس میں فتح عموماً میری ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ بے چاری چندا کو پورے لباس میں تیرنا پڑتا تھا۔ وہ وقت یاد کرکے میں ایک کسک محسوس کرنے لگا۔ نہ جانے چندا کب میرے گھر میں چاندنی بکھیرے گی۔ مگر میرا گھر تھا ہی کہاں۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک تیرتا رہا۔ پول میں ہوا سے بھرا ایک گدا بھی تھا جب تھک جاتا تو اس پر لیٹ جایا کرتا۔ کبھی میں سانس روک کر دیر تک زیر آب رہتا۔ ایک بار جب میں اوپر ابھرا تو نیلم کو پول کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے پایا۔ ٹراؤزر اس کی شفاف گلابی پنڈلیوں تک چڑھا ہوا تھا اور وہ پانی میں پیر ماررہی تھی۔

"اکیلے اکیلے مزے ہورہے ہیں؟" اس نے شوخی سے کہا۔

"اکیلا کہاں ہوں میں۔" میں نے ذومعنی بات کی۔ سچی بات تھی جب میں چندا کے بارے میں سوچتا تھا تو خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا تھا۔

"مجھے بلالیا ہوتا۔ دونوں مل کر تیرتے۔ مجھے بھی کتنا عرصہ ہوگیا ہے سوئمنگ کیے۔ ایک منٹ' میں ابھی چینج کرکے آتی ہوں" وہ اٹھنے لگی۔

"ایک منٹ نیلم!" میں نے کہا اور سوئمنگ پول سے باہر آگیا۔ میں نے باتھ روب پہن لیا تھا "تم کس ناتے میرے ساتھ سوئمنگ کرنا چاہوگی؟"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں ناتے کا خیال کیوں آیا؟"

میں اسے ہاتھ سے تھام کر اپنے ساتھ کرسیوں تک لایا۔ "یہاں بیٹھو اور میری بات غور سے سنو۔ دیکھو نیلم' میرا اور تمہارا رشتہ بہت عجیب ہے۔ میں آج تک اس کی نوعیت سمجھ نہیں پایا۔ میں تمہیں بیک وقت ماں کی طرح بہن کی طرح اور

بعض اوقات محبوبہ کی طرح پاتا ہوں۔ میں نے آج تک کبھی مرد کی حیثیت سے تمہارے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بارے میں کچھ ایسے ہی جذبات تمہارے دل میں بھی ہیں۔"

"ہاں ـــ مگر ان باتوں کو دہرانے کا مقصد؟"

"نیلم ضروری نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جس طرح سوچتے ہیں اور جذبات محسوس کرتے ہیں دوسرے بھی اسے اسی طرح محسوس کریں۔ میں جانتا ہوں کہ میری تم سے حد درجے کی بے تکلفی اور بعض دفعہ کی جسمانی قربت رئیس کو بھی پسند نہیں آئے گی۔ اگرچہ وہ دوستی اور محبت کی وجہ سے خاموش رہے گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" نیلم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا "کیا میں تم سے قطع تعلق کرلوں۔ تم سے بات بھی نہ کروں یا رئیس کو خوش کرنے کے لیے تم سے پردہ شروع کردوں؟"

"تم صرف ایک کام کرو۔ وہ یہ کہ آج تم میرے لیے اپنے رشتے کا تعین کردو۔ منہ بولی سہی لیکن تم میری بہن بھی بن سکتی ہو۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔"

"میں تمہاری بڑی بہن ہوں" اس نے کہا۔

"ایک بڑی بہن۔ ہمارے معاشرے میں اپنے بھائی کے ساتھ اس درجہ بے تکلفی سے پیش نہیں آتی ہے اور نہ ہی وہ اس کے ساتھ سوئمنگ کرتی ہے۔ تم اپنے معاشرے کی اقدار سے اچھی طرح واقف ہو۔"

"میں ـــ میں سمجھ گئی" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آج اس کڑوی بات کو سمجھ لے تاکہ بعد میں کسی ناخوشگوار واقعے سے بچا جاسکے۔ اس کی اور رئیس کی خوشگوار زندگی کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس میں میرا عمل دخل ایک حد تک ہو۔ جیسے میرے رخشی اور عباسی یا پھر عینی اور عاقل سے تعلقات تھے۔ حتیٰ کہ قمر جسے میں سگی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ اس کی نجی زندگی میں میرا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں ایزی چیئر پر تقریباً دراز تھا اور آنکھیں بند کرکے سوچوں میں گم تھا کہ مجھے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ چند لمحے تک مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر مجھے اپنی طرف آنے والے پتھر سے بچنے کے لیے کرسی سے اٹھنا پڑا۔ پول کی دوسری طرف ایک دس گیارہ سالہ بچی کھڑی تھی' اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے آنکھ کھولتے دیکھ کر اس نے اتنی پھرتی سے

اور اتنی قوت سے پتھر مارا تھا کہ اگر پتھر میرے سر پر لگتا تو میرا فوری طور پر خاتمہ ہوجاتا۔ اس کا نشانہ بھی بہترین تھا' پتھر آرام کرسی پر اس جگہ آکر لگا تھا جہاں ایک لمحے پہلے میرا سر تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میرا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا تھا۔ وہ ہاشم رضا کے مکروہ تجربات کا ایک اور ثمر تھی۔ ایسے ہی کچھ بچوں نے نیلم ہاؤس اور شبنم کے اخبار کے دفتر پر حملہ کرکے تباہی پھیلائی تھی۔ نیلم ہاؤس کی دس فٹ اونچی چار دیواری پر تین فٹ تک خاردار تاریں لگی تھیں جن میں ہمہ وقت کرنٹ دوڑتا رہتا تھا۔ وہ کوئی دیوار پھلانگ کر ہی آسکتی تھی۔ لڑکی کا رنگ سانولا اور اس کے چہرے پر ویسے ہی حیوانی تاثرات تھے جیسے میں لالی' جمو اور اسی قبیل کی دوسری مخلوقات کے چہروں پر دیکھ چکا تھا۔ اپنا نشانہ خطا دیکھ کر اس نے دانت کچکچائے اور دوسرا پتھر مارا۔ میں نے بہ مشکل غوطہ لگا کر خود کو محفوظ رکھا۔ پھر اس لڑکی نے ناقابل یقین انداز میں جست لگائی اور بیس فٹ پار کرکے پول کے دوسرے کنارے پر آگئی۔ جیسے ہی اس کے قدم زمین پر ٹکے' وہ میری طرف لپکی تھی۔

"گارڈز ـــ!" خطرہ محسوس کرتے ہی میں پوری قوت سے چلایا اور لڑکی سے مقابلے کے لیے تیار ہوگیا۔ غالباً اس کے پاس دو ہی پتھر تھے جو اس نے نیلم ہاؤس کے لان سے کہیں سے حاصل کرلیے تھے۔ اس کی جسامت کی کوئی عام لڑکی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ شہ زوری میں کسی پہلوان سے کم نہیں ہوگی۔ اس کے ننھے سے جسم میں تباہ کن حیوانی طاقت بھری ہوئی ہوگی اور اسے ذرا سا موقع ملا تو وہ مجھے مار ڈالے گی۔ میری آواز پر فوری ردّعمل ہوا اور میں گارڈز کی سیٹیوں کی آواز سن رہا تھا۔ وہ سوئمنگ پول کی طرف آرہے تھے۔ لڑکی نے قریب آتے ہوئے ماہرانہ انداز میں چھلانگ لگائی۔ اس کی کوشش تھی کہ میرے جسم کو لے کر زمین پر جاگرے۔ میں زمین پر گر گیا اور جیسے ہی وہ میرے نزدیک آئی' میں نے الٹی لات چلائی جو اس کی پشت پر لگی اور وہ اڑتی ہوئی ایک جھاڑی پر جاگری۔ اس کے منہ سے حیوانی چیخ نکلی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری لات سیمنٹ کی بوری سے ٹکرائی ہو۔ اس کا جسم بے حد ٹھوس تھا۔

جھاڑی پر گرتے ہی وہ اچھل کر دوبارہ میری طرف لپکی جبکہ ابھی میں زمین سے اٹھ ہی رہا تھا۔ ہر فن کی طرح مارشل آرٹ بھی پریکٹس مانگتا ہے اور مجھے عرصہ ہوگیا کہ میں نے مخصوص ایکسرسائزز نہیں کی تھیں۔ ردّعمل میں میرے ریفلیکسز سست ہوگئے تھے۔ اس بار لڑکی کو موقع مل گیا' اس

نے چھلانگ لگائی اور میرے سینے پر آگری۔ اس کے پنجے میرے شانوں میں گڑ گئے۔ اس نے منہ کھولا تو اس کے بے حد تیز اور سفید دانت نمایاں ہو گئے۔ اس نے منہ میری گردن کی طرف بڑھایا۔ اگر مجھے اس کی گردن پکڑنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ منہ مار کر میری شہ رگ دانتوں سے ادھیڑ چکی ہوتی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی گرفت مضبوط کر کے اس کی گردن توڑ دیتا۔ اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور اچھل کر پیچھے ہٹ گئی اور مجھے اٹھنے کی مہلت دیے بغیر دھم سے دوبارہ میرے سینے پر کودی۔ اس دبلی پتلی نظر آنے والی لڑکی کا وزن بے پناہ تھا۔ اس کے وزن سے میری پسلیاں بل کر رہ گئی تھیں۔ اس نے وحشیانہ انداز میں میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ خاص طور سے میری آنکھیں اس کا نشانہ تھیں۔ میں ایک بار پھر بال بال بچا۔ چہرہ داڑھی کی وجہ سے اس کے ناخنوں سے محفوظ رہا تھا جو کسی بندریا کے ناخنوں سے کم تیز نہیں تھے۔ میں نے پوری قوت سے اس کے سینے پر مکا مارا۔ لیکن ایک تو وہ بے حد نزدیک تھی دوسرے میں لیٹا ہوا تھا۔ مکا زیادہ مؤثر نہیں تھا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کروٹ لی اور اسے دور اچھال دیا مگر زمین پر گرتے ہی وہ اسپرنگ کی طرح بل کھا کر میری طرف واپس آئی۔ اس بار میں اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ میں نے پوری قوت سے پیر جوڑتے ہوئے اس کے پیٹ پر مارے۔ وہ ہوا میں اڑتی میری طرف آ رہی تھی۔ اس لیے تصادم کی قوت دوگنی ہو گئی۔ اس بار اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی تھی اور وہ اچھل کر سوئمنگ پول میں جا گری۔ میں تیزی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا۔ اس لمحے دو سیکیورٹی گارڈز دوڑتے ہوئے باغ میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں خودکار رائفلیں تھیں۔ میں نے سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے زندہ پکڑنا ہے یار نامت۔"

میں سوئمنگ پول کی طرف بڑھا۔ وہ اوندھے منہ پانی میں تیر رہی تھی لیکن وہ تیر کہاں رہی تھی۔ وہ پانی میں ساکت تھی۔ بلکہ پول کے پانی کی حرکت کے ساتھ اس کا جسم حرکت کر رہا تھا۔ شاید چوٹ اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی تھی۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ ایک کونے میں درختوں کے زرد پتے توڑنے والا ہک وار بانس رکھا تھا۔ اس کی لمبائی بارہ فٹ تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور لڑکی کے لباس میں اس کا ہک پھنساتے ہوئے اسے کنارے کی طرف کھینچ لیا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ مکر نہ کر رہی ہو۔ میں نے اسے باہر کھینچا اور گارڈز کو محتاط رہنے کو کہا۔ اس اثنا میں نیلم بھی وہاں آ گئی تھی۔ میں نے اسے دور رہنے کو کہا۔ لڑکی کی سانس بہ ظاہر رکی ہوئی تھی لیکن نہیں، وہ بہت آہستہ سانس لے رہی تھی اور اس کی نبض بھی رک رک کر چل رہی تھی۔ بلاشبہ اس کی حالت خراب تھی۔ میں نے ایمبولینس منگوانے کو کہا اور اس کا پیٹ دبا کر پانی نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن پانی وہاں نہیں تھا۔ غالباً وہ جب پانی میں گری تو اس کی سانس رک گئی تھی۔ نیلم واپس اندر چلی گئی۔ ایک گارڈ لڑکی کو اٹھا کر اندر لے گیا۔ اسے لیونگ روم میں قالین پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ بے حد کم عمر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر دو سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی بڑھوتری حیوانی تھی جس طرح بندریا بن مانس چند سال میں بلوغت کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں اسی طرح یہ لڑکی بھی بے حد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ بیس منٹ بعد ایمبولینس سائرن بجاتی نیلم ہاؤس میں داخل ہوئی۔ میں نے لڑکی کے ساتھ ایک گارڈ کو بھی بھیج دیا۔ مجھے اس پہلی والی لڑکی کی لاش یاد تھی جو اسپتال سے غائب کر دی گئی تھی۔ اسی اثنا میں نیلم نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی اور نہ جانے صحافیوں کو کیسے معلوم ہو گیا تھا۔ انہوں نے الگ یلغار کر دی تھی۔ رئیس پانچ بجے لوٹ آیا تھا۔ اس نے آکر مجھے بتایا کہ سارا بندوبست ہو گیا۔ دوسرا ٹیکسی والا بھروسے کا آدمی تھا۔ ایک زمانے میں وہ چاچا پتنگ باز کی ٹولی میں شامل تھا۔ اب ٹیکسی چلا رہا تھا۔ دوسری ٹیکسی بھی اسی کی تھی جسے اس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ رئیس کی خاطر اس نے یہ ٹیکسی ڈرائیور سے لے لی تھی۔

"ٹیکسی میں لے آیا ہوں۔ نیلم ہاؤس سے کچھ دور کھڑی ہے لیکن تو باہر کیسے نکلے گا۔ پریس والوں نے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا ہے۔ کل اخبارات میں تیری تصویر ہو گی" رئیس نے تشویش سے کہا۔

"یار، اب مجھے نیلم ہاؤس میں خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔ آخر رب نواز نے اس لڑکی کو یہاں ہی کیوں بھیجا۔ کیا اسے شبہ ہو گیا ہے کہ شاہ عالم یہاں چھپا ہے؟ وہ تو شکر ہے کہ لڑکی پکڑی گئی ورنہ وہ واپس جا کر اپنے آقاؤں کو رپورٹ دے چکی ہوتی۔ میرا فوری طور پر یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔"

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیسے؟" رئیس جھنجلایا۔

"مجھے بھیس بدلنا ہو گا۔ ایسا بھیس جس میں کوئی آنکھ مجھے شاہ عالم کے طور پر شناخت نہ کر سکے۔"

"مثلاً کیسا بھیس!"

"تو مجھے کوئی دیہاتی ٹائپ کا لباس لا دے۔ یعنی کرتہ اور لاچا۔ ہاں آنکھ پر لگانے والی وہ عینک بھی جس کے شیشے گول ہوتے ہیں۔"

"وہ تو شاید گھر میں ہی مل جائیں۔ پر تو اتنا نہیں بدلے گا کہ دیکھنے والی آنکھ تجھے پہچان نہ سکے۔ خاص طور سے اگر ہجوم میں دشمن بھی ہوئے۔"

"پھر میں کسی گاڑی کی ڈکی میں چھپ کر نکل جاتا ہوں۔"

"یہ بہتر رہے گا۔ اب تو تیار ہو جا وقت نہیں ہے۔ اسلحہ بھی ساتھ لے لینا۔"

رئیس چلا گیا تو میں نے کپڑے بدلے۔ ایک عام سا جوڑا لیا۔ نیلے رنگ کی پتلون اور اوپر ہلکی جرسی۔ جیسی کہ گلابی جاڑوں میں پہنی جاتی ہے۔ میں نے درمیان سے مانگ نکالی۔ دونوں طرف سے بال خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ میرے پاس ربر کے دو پیڈ تھے جو مجھے عیسیٰ بھائی نے دیے تھے۔ انہیں گالوں میں دبانے سے چہرہ اور بھرا بھرا نظر آنے لگا تھا۔ مجموعی طور پر میرے حلیے میں خاصی تبدیلی آئی تھی۔ لیکن مجھے یہ خوش فہمی ہرگز نہیں تھی کہ دشمن مجھے شناخت نہیں کر سکے گا البتہ عام لوگوں یا پولیس والوں سے میں خاصی حد تک محفوظ ہوتا بشرطیکہ کوئی مجھے شاہ عالم سمجھ کر پہچاننے کی کوشش نہ کرتا۔ رئیس نے آکر مجھے بتایا کہ گاڑی تیار ہے۔ میں جانے لگا تو نیلم بھی پیچھے آئی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا اور موبائل پر مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

"میں رئیس کو ساتھ لے جا رہا ہوں کیونکہ دشمن اس کے اور میرے تعلق سے واقف ہو گئے ہیں۔ اگر یہ نیلم ہاؤس میں نظر آیا تو دشمنوں کے اندازے کی تصدیق ہو جائے گی۔"

نیلم اداس ہو گئی "میں اکیلی رہ جاؤں گی۔"

اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اس کی ناراضگی کا پتا چلتا۔ نیلم ایک سمجھ دار عورت تھی۔ زمانے کے سارے سرد و گرم سہہ چکی تھی۔ فلم انڈسٹری میں اسے بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ اور وہ دوسروں کی نفسیات خوب سمجھتی تھی لہٰذا اسے میری بات سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی اور اس نے اسے قبول بھی کر لیا تھا۔

"دو تین دن کی بات ہے، پھر ہم لندن کے لیے روانہ ہو جائیں گے" رئیس نے اسے تسلی دی۔

کار پورچ میں ایک بڑی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ اس کی ڈکی اتنی کشادہ تھی کہ ہم دونوں ہی اس میں سما سکتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کی ڈکی اندر سے بھی کھولی جا سکتی تھی۔ ڈکی میں سمانے سے پہلے رئیس نے نیلم کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر دبایا۔ میں مسکرایا اور ڈکی بند ہو گئی۔ ڈرائیور پرانا آدمی تھا اور نیلم کو اس پر پورا بھروسا تھا۔ اس نے ایک بار نیلم کو بچایا تھا۔ اسٹوڈیو سے واپسی پر نیلم کے چند بدتمیز مداحوں نے اسے سڑک پر روک لیا اور پھر اسے زبردستی ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر ڈرائیور نے مزاحمت کی۔ اس نے مار بھی کھائی لیکن ان بدمعاشوں کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ اس اثنا میں ایک پولیس موبائل وہاں آ گئی جسے دیکھ کر وہ بدمعاش نو دو گیارہ ہو گئے۔ ڈرائیور گل خان خاصا زخمی ہوا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے وہ گل خان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی تھی اور سارے اہم کام اس کے سپرد کرتی تھی۔

ہمیں ڈکی میں بند کر کے گل خان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نیلم ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ میں ڈکی کی ایک جھری سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہمارے پیچھے کوئی نہیں تھا مگر فوراً ہی میں نے سڑک کے کنارے کھڑی ایک نیلی ڈاج کو تیزی سے مرسیڈیز کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر ایک فرد بیٹھا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ پچھلی نشست پر بھی کوئی بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "رئیس، ہوشیار کچھ لوگ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔"

ڈکی کتنی ہی کشادہ سہی لیکن ہم دونوں آزادی سے حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ غالباً گل خان کو بھی تعاقب کا پتا چل گیا تھا۔ اس نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ ڈاج رفتار میں مرسیڈیز سے بہتر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں تھی۔ دوسرے وہ ہلکی اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے آسانی سے موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں نے پہلے ہی گل خان سے کہہ دیا تھا کہ تعاقب کی صورت میں کار کسی کشادہ سڑکوں والے رہائشی علاقے کی طرف موڑ لے۔ ٹریفک میں جہازی سائز مرسیڈیز پھنس کر رہ جاتی۔ مگر ڈاج تیزی سے نزدیک آ رہی تھی۔ اچانک میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص کا ہاتھ کھڑکی سے باہر آتے دیکھا۔ فضا دھماکے سے لرز اٹھی۔ وہ مرسیڈیز کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور ڈکی میں ہماری جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ کوئی بھی بھولی بھٹکی گولی ہمارا کام تمام کر سکتی تھی۔ پھر تو اس نے متواتر فائر کیے۔ ایک گولی عقبی شیشے پر بھی لگی مگر گل خان نے رفتار کم نہیں کی۔

"رئیس یوں تو ہم مارے جائیں گے۔" میں نے تشویش

سے کہا اور اپنا بریٹا نکال لیا۔ یہ مکمل طور پر لوڈ تھا۔ میں نے اسے چیک کیا "رئیس جیسے ہی میں کہوں تو ڈکی کھول دے گا اور بیرے اسے نیچے آنے سے روکے گا اور جیسے ہی میں کہوں "اسے بند کردینا" سمجھ گیا۔"

"سمجھ گیا" رئیس بولا۔

"رئیس تیار ہوجا" میں نے جلدی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا اور جیسے ہی رئیس نے ڈکی کھولی۔ میں نے ہاتھ باہر نکال کر ڈاج کے ڈرائیور کا نشانہ لے کر پورا میگزین خالی کردیا۔ ڈاج والوں کو توقع نہیں تھی کہ مرسیڈیز کی ڈکی سے ان پر حملہ ہوگا ورنہ وہ اتنے نزدیک آنے کی جرأت نہ کرتے۔ میں نے ڈاج کی ونڈ اسکرین بکھرتے اور پھر اسے گھوم کر بجلی کے کھمبے سے ٹکراتے دیکھا۔ ڈرائیور یقینی طور پر مارا گیا تھا کیونکہ وہ اسٹیرنگ پر سر رکھے ہوئے تھا۔ رہی سہی کسر کھمبے سے ٹکرانے سے پوری ہوگئی۔ بجلی کے تار ٹوٹ کر ڈاج پر گرے اور اس نے آگ پکڑلی۔ ہم بہ مشکل سو گز دور گئے ہوں گے کہ ڈاج میں دھماکا ہوا۔ اس کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا۔ اب اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور رئیس نے ڈکی بند کرلی۔ کچھ اور لوگ رب نواز کے مفادات پر قربان ہوگئے تھے۔ پچھلے کچھ ہفتوں میں ہونے والی قتل و غارت گری نے مجھے افسردہ کردیا تھا۔ مجھے خود پر حیرت ہورہی تھی۔ میں کتنا بدل گیا تھا۔ کبھی مجھے ایک چیونٹی مارتے ہوئے دکھ ہوتا تھا اور اب میں کتنے آرام سے کم سے کم تین انسانوں کی جان لے چکا تھا۔ بے شک اپنے دفاع میں سہی لیکن یہ قتل تو تھے۔

کار رکنے کا دھچکا مجھے سوچوں کی دنیا سے کھینچ لایا۔ رئیس نے ڈکی کھولی اور ہم پھرتی سے باہر نکل آئے۔ یہ جگہ نیلم ہاؤس سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ تعاقب کی وجہ سے ہم خاصی دور نکل گئے تھے۔ پھر ڈرائیور واپس گھما کر لایا تھا۔ سامنے فٹ پاتھ پر اپنے کتے کے ساتھ ٹہلتے ہوئے بڑے میاں نے حیرت سے ڈکی سے دو بندوں کو برآمد ہوتے دیکھا لیکن عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دخل در نامعقولات سے گریز کیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی لے جائے اور میڈم کو اس واقعے کے بارے میں بتا کر محتاط رہنے کا کہے۔

"مگر پولیس میں رپورٹ نہیں کرانی" رئیس نے کہا "ورنہ ہم سب پریشانی میں پڑجائیں گے۔"

مرسیڈیز کا عقبی شیشہ غائب تھا۔ اس کے علاوہ خوش قسمتی سے اور کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ جانے سے پہلے شیشے لگوالے تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔

ڈرائیور کے جانے کے بعد ہم اس طرف روانہ ہوئے جہاں رئیس نے ٹیکسی کھڑی کی تھی۔ ڈرائیور رئیس کو بننا تھا لہٰذا میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رئیس نے سر پر پی کیپ پہنی اور اس کا چھجا آگے جھکالیا۔ اس وقت سات بج رہے تھے' میں نے پوچھا۔

"کیا تیرا وہ جاننے والا پہنچ گیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے' یہ تو وہاں چل کر ہی پتا چلے گا" اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ بیس منٹ بعد ہم رب نواز کی کوٹھی کے سامنے سے گزرے جو اب کسی قلعے کا منظر پیش کررہی تھی۔ سامنے گیٹ کا جالی دار دروازہ نکال کر اس کی جگہ لوہے کے مضبوط پٹ والے دروازے لگائے گئے تھے۔ دیواروں کی اونچائی میں اضافہ کیا گیا تھا اور کوٹھی کے چاروں کونوں پر طاقت ور سرچ لائٹس لگی تھیں۔ رات کی تاریکی میں یہ پوری کوٹھی کو بقعۂ نور بنادیتی ہوں گی۔ ہم گھوم کر کوٹھی کے عقبی حصے میں آئے۔ میں نے دیکھا کہ پارک کے دوسری طرف ایک ہلوکیب کھڑی ہے۔

"یہی ہے سراج!" رئیس بولا اور اس نے ٹیکسی دائیں طرف والی لائن میں گھسادی۔ اس طرف نسبتاً چھوٹے بنگلے تھے۔ ٹیکسی روک کر رئیس نے نیچے اتر کر اس کا بونٹ کھول دیا۔ اب بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مسافر کو منزلِ مقصود پر پہنچانے سے پہلے ہی ٹیکسی کا انجن دغا دے گیا ہو۔ وہ وقفے وقفے سے انجن پر جھک جاتا اور اس کے کل پرزوں کے ساتھ بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ میں بور ہوجانے والے مسافر کی طرح ٹیکسی سے اتر کر ذرا ٹہلتا ہوا سڑک تک گیا۔ رب نواز کی کوٹھی کا پچھلا حصہ پارک سے لگ رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ اس قسم کے پوش علاقوں میں ویسے تو ہر وقت ہی سناٹا طاری رہتا ہے لیکن شام ہوتے ہی یہاں الو سے بولنے لگتے ہیں۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ کھمبوں پر لگے بلب تاریکی سے لڑنے میں مصروف تھے۔ یہ مرکری بلب تھے جو گرم ہوکر خود بہ خود بجھ جاتے ہیں اور پھر دوبارہ جل اٹھتے ہیں۔ میں جان بوجھ کر ایک گھنے لیکن نسبتاً کم اونچے درخت تلے کھڑا ہوگیا۔ یہاں سے میں نمایاں طور پر نظر نہیں آرہا تھا۔ سڑک کے پار پارک اور اس کے دوسری طرف کھڑی ہلوکیب میری نظر میں تھی۔ دوسری طرف میں رب نواز کی کوٹھی پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ رئیس وقفے وقفے سے آتا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی' ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک رب نواز کی کوٹھی کی طرف سے کوئی عورت پارک کی سمت آتی نظر نہیں

آئی تھی' ایک لمحے کو میرے دل میں آیا کہ میں شائستہ کے موبائل پر فون کروں لیکن پھر میں نے یہ خیال مسترد کردیا۔ ممکن ہے' میرے فون کرنے سے وہ کسی مشکل میں پڑجاتی۔ میں صبر سے انتظار کرتا رہا۔ نو بج گئے۔ مجھے تو رئیس کے اس ساتھی ڈرائیور پر حیرت تھی کہ وہ اتنے صبر سے انتظار کررہا تھا۔ ایک بار رئیس آیا تو میں نے کہا۔

"یار' وہ بور ہوکر چلا نہ جائے؟"

"وہ نہیں جائے گا۔ میں نے اسے بارہ بجے تک کے لیے بک کیا ہے۔ وہ لے نہیں رہا تھا لیکن میں نے اسے زبردستی دو ہزار روپے دے دیے تھے۔ اب اس کا باپ بھی ..... بارہ بجے تک یہاں رکے گا۔"

میں مطمئن ہوگیا۔ پھر ساڑھے نو بج گئے۔ میں واپس رئیس کے پاس آیا۔ "میرا خیال ہے اسے نکلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔"

"یار' انتظار تو کرنا پڑے گا۔ میں ڈر رہا تھا کہ یہ کوئی دھوکا نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں ہے ورنہ اب تک رب نواز کے کتے ہمیں گھیر چکے ہوتے۔"

میں نے رئیس سے اتفاق کیا اور واپس سڑک کے کنارے جا پہنچا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس طرح درخت کے نیچے کھڑے رہنے سے کسی کو شک بھی ہوسکتا ہے۔ میں سڑک پار کرکے پارک میں آگیا۔ یہ دراصل بچوں کے لیے ایک چھوٹا سا پلے لینڈ تھا جس میں جھولے اور سلوپس لگے تھے۔ پارک کی دیوار کے ساتھ چھوٹی قامت کے درخت لگے تھے اور درمیان میں صرف گھاس تھی تاکہ بچوں کے کھیل کود میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ درختوں کے ساتھ ہی لکڑی کے بینچ لگے تھے' میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا جہاں روشنی ذرا کم آرہی تھی اور دور سے مجھے پہچاننا مشکل تھا۔ یہاں سے میں کوٹھی کی طرف بھی نظر رکھ سکتا تھا اور ہلوکیب تو میرے سامنے ہی تھی۔

جب دس بجنے لگے تو میں کسی قدر مایوس ہوگیا تھا۔ شائستہ شاید موقع نہیں نکال پائی تھی یا رب نواز نے اس کی نگرانی اور سخت کردی تھی۔ اب اس کے لیے باہر نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا کہ ایک سایہ رب نواز کی کوٹھی کی دیوار سے جدا ہوا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا پارک کے ساتھ کھڑی ہلوکیب تک آیا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی' اس کے باوجود اس کی چال ڈھال اور جسمانی خدوخال پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی۔ اس نے ہلوکیب کے پاس آکر ڈرائیور سے کچھ کہا اور چند لمحے خاموش کھڑے رہنے کے بعد ہلوکیب کی عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ میں بینچ سے اٹھا اور رئیس کی ٹیکسی کی طرف بھاگا' رئیس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹیکسی اسٹارٹ کرکے سڑک تک لے آیا۔ ہلوکیب روانہ ہوچکی تھی۔

"رئیس جلدی' ہمیں انہیں راستے میں ہی روکنا ہوگا۔"

"فکر مت کر یار! تو ذرا پیچھے کا دھیان رکھ" ٹیکسی کو پہلے گیئر میں ڈال کر رئیس نے کہا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ دور تک کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی اور جب خاصی دیر تک کوئی تعاقب میں نہیں آیا تو میں مطمئن ہوگیا تھا۔ رئیس نے چند منٹ میں ہلوکیب کو جالیا تھا۔ اس کے برابر میں آکر رئیس نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ سراج نے اپنی ہلوکیب کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے کرلیا۔ رئیس نے اپنی ٹیکسی اس سے آگے لے جاکر روکی۔ میں تیزی سے اتر کر ہلوکیب تک آیا۔ میرے ذہن میں دھوکے کا خطرہ تھا اس لیے میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"شائستہ!" میں نے پچھلی کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا تو اس نے جلدی سے چہرے سے چادر ہٹادی۔ اسے پہچان کر میں نے سکون کی سانس لی تھی "ہری اپ۔ ادھر میری ٹیکسی میں آؤ" پھر میں نے سراج سے کہا "اب تم جاؤ تمہارا کام ختم!"

شائستہ ہلوکیب سے اتری۔ اس نے چہرہ ایک بار پھر چادر سے ڈھک لیا تھا۔ وہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔

"پلیز' جلدی سے نکل چلو۔"

"فکر نہ کرو۔ اب تم رب نواز کی پہنچ سے دور ہو۔" میں نے اسے رئیس والی ٹیکسی کی عقبی نشست پر بٹھایا۔ رئیس کو معلوم تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ شائستہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ "شاہ عالم' تم رب نواز سے واقف نہیں ہو' وہ بہت دست دراز شخص ہے۔"

"اس کی دست درازی کا ایک نمونہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں" میں نے ہنس کر کہا "تم اس کی ناک تلے سے اس کو دھوکا دے کر نکل آئیں۔"

"پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے" وہ ذرا سرک کر میرے ساتھ لگ گئی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے گداز لمس کو یوں استعمال کیا تھا کہ میں بے اختیار ذرا پرے سرک گیا۔ اس عمر میں اتنے ساحرانہ حسن کی مالک عورتیں میں نے بہت کم دیکھی تھیں۔ اس کا حسن کسی بھی مرد کی عقل کو گھاس چرنے بھیج سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں پوری طرح محتاط تھا۔ رئیس اور میں دونوں ہی راستے پر نظر رکھے ہوئے تھے لیکن ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد

ہم اس بنگلے میں داخل ہو رہے تھے جسے شبنم نے میرے دفتر کے طور پر منتخب کیا تھا۔ رئیس نے مقفل بیرونی گیٹ کھولا اور ٹیکسی احاطے میں لے گیا۔ شائستہ نے اب تک رئیس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور میرے خیال میں یہ بہتر ہی تھا۔ میں اسے دفتر میں لے آیا۔ سامنے بڑا ہال تھا جو عملے کے لیے مخصوص تھا۔ اسی ہال میں ایک طرف واش روم اور چھوٹا سا کچن تھا۔ عقب میں میرا ذاتی کمرا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ سامنے دفتر تھا جب کہ عقبی حصہ ایک آرام دہ بیڈ روم پر مشتمل تھا۔ یہاں بھی ایک واش روم اور ایک کچن تھا۔ فی الوقت سب ہی کچھ مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس جگہ کی ہفتوں سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔ میں شائستہ کو اپنے بیڈ روم والے حصے میں لے آیا۔

"تم یہاں بیٹھو' میں ابھی آیا" اسے چھوڑ کر میں نے باہر آ کر سب سے پہلے فون چیک کیے۔ ابھی تک لائنیں نہیں کھلی تھیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ رئیس باہر ہی موجود تھا۔

"ناصر' تو اس آفت کی پرکالہ کو کیسے سنبھالے گا۔ ایک تو یہ رب نواز کی بیوی ہے۔ دوسرے وہ تجھ پر مائل نظر آ رہی ہے۔ میں عقبی آئینے میں اس کی پیش قدمیاں دیکھ رہا تھا۔"

"تو اس کی فکر نہ کر' یہ ٹیکسی واپس کر آ۔ اور ہاں' واپسی میں کھانے کو کچھ لیتے آنا' اور کچھ آلات صفائی بھی لے آنا۔"

"مجھے دیر لگ جائے گی" رئیس بولا "ٹیکسی واپس کرنے کرشن نگر جانا پڑے گا۔ واپسی میں دیر تو لگے گی۔ اس وقت تک فوراً اس سے خود کو بچا کر رکھنا۔ مجھے اس عورت کے عزائم درست نظر نہیں آتے۔"

رئیس چلا گیا۔ میں نے گیٹ اندر سے بند کر لیا۔ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بنگلا گرد آلود ہو رہا تھا۔ لان کے پھول پودے پانی کی کمی سے مرجھا رہے تھے۔ میں اندر آیا تو شائستہ بستر پر دراز تھی۔ خاصے خطرناک انداز میں۔ میں کرسی اس کے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا "ہاں تو ملکانی صاحبہ! اب آپ ثابت کریں کہ یہ سب کچھ آپ کے شوہر کی ہدایت کاری کے تحت نہیں ہو رہا ہے؟"

"کیا؟" اس نے انجان بن کر کہا۔

"رب نواز بہت مکار آدمی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی کو بھی چارے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ہدایت کار رب نواز جیسا ہو تو اداکارہ تم جیسی ہونی چاہیے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے۔" وہ بستر سے اتر کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی "تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔"

اس نے چادر اتار دی تھی۔ چادر اس نے صرف خود کو چھپانے کے لیے استعمال کی تھی۔ ورنہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ چادر تلے اس نے جسم کی پیمائشوں کے لحاظ سے سلا لباس پہن رکھا تھا۔ جو اس کے بھرپور بدن کے تمام پیچ و خم' دائرے اور قوسیں نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال شاہانہ تھے۔ خاص طور سے ہلکے بادامی رنگ کی آنکھیں خطرناک حد تک سحر انگیز تھیں۔ کولہوں تک آتے سیاہ اور گھنے بالوں میں ایک تار بھی سفید نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ کسی اعلیٰ درجے کے ہیئر کلر کا کمال ہو لیکن بہت سارے لوگوں کی چالیس سال کی عمر میں بال سفید نہیں ہوتے۔ میں جھینپ کر پیچھے ہٹا تو وہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگی تھی۔

"ہاں' میں دودھ کا جلا ہوں اور چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتا ہوں" میں نے اعتراف کیا۔

"میں کس طرح تمہارا اطمینان کر سکتی ہوں؟" وہ بولی۔ "کیا تم میری تلاشی لو گے؟"

اس کے انداز میں چیلنج تھا۔ جسے میں نے قبول کرنے کی جرأت کی "ہاں' مجھے شبہ ہے تمہارے لباس میں کوئی ہتھیار یا ایسی کوئی شے ہے جو میرے خلاف استعمال ہو سکتی ہے۔"

"تم میری تلاشی لے سکتے ہو" اس نے ہاتھ اوپر کیے۔ جب تک میں اس کی تلاشی لیتا رہا وہ مسکراتی رہی۔ اس نے فطری شرم یا جھجک نہیں دکھائی تھی۔ اس کے مقابلے میں میرا شرمندگی سے برا حال تھا۔ میں خود کو یاد دلا رہا تھا کہ وہ میرے دشمن کی بیوی ہے اور میں اخلاق اور احترام نسواں کے چکر میں پڑ کر اسے موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اپنے طور پر میں نے خاصی جرأت سے کام لیا تھا اس کے باوجود تلاشی ختم کرتے کرتے میں پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "ہاتھ نیچے کر لو۔"

میں نے کچن میں جا کر دیکھا۔ فریج میں منرل واٹر کی بوتلیں رکھی تھیں لیکن میں نے ایک سافٹ ڈرنک کاٹن لیا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ رئیس درست کہہ رہا تھا۔ یہ عورت میرے لیے خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ میں کچن سے آیا تو وہ فاتحانہ انداز میں کمرے کے وسط میں کھڑی تھی "تم نے میری تلاشی لے لی' شاہ عالم!" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیا میرے پاس سے کچھ نکلا؟"

"نہیں" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم احمق ہو" وہ ہنسی اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ

ڈال کر ایک ننھا سا چپٹا پستول نکال لیا "اب میں تمہارے سر میں سوراخ کر کے تمہارے مردانہ غرور کو بہا دوں تو۔؟"

میں نے گہری سانس لی۔ میں نے واقعی خود کو احمق ثابت کیا۔ مارے جھجک کے میں نے اس کے بدن کے مخصوص حصوں کی صحیح سے تلاشی ہی نہیں لی اور مات کھا گیا۔ اس نے پستول مجھ پر تان لیا تھا۔ میں نے کہا۔ "وقتی طور پر تم نے فتح حاصل کر لی ہے لیکن کیا اس ننھے سے پستول کے بل پر تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گی؟"

"میں تمہیں بتا رہی تھی کہ تم ایک احمق آدمی ہو۔ تمہاری جگہ اگر رب نواز ہوتا تو تلاشی لینے کے بجائے میرے بدن سے کپڑے ہی اتروا دیتا۔"

"افسوس کہ میں شاہ عالم ہوں۔ رب نواز نہیں ہوں" میں نے تلخی سے کہا "اب تمہارے کیا ارادے ہیں' میرے سر میں سوراخ کر کے فرار ہونا ہے؟"

"فرار!" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "میں رب نواز کی قید سے فرار ہو کر تمہاری پناہ میں آئی ہوں۔ اب یہاں سے فرار ہو کر کہاں جاؤں گی۔ یہ پستول تو میں نے صرف تمہاری کمزوری جتانے کے لیے نکالا تھا۔"

"یہ مجھے دے دو" میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے بغیر ہچکچائے پستول دے کر مجھے پھر حیران کر دیا تھا۔

"تمہارے پاس کوئی اور شے تو نہیں ہے؟"

"چاہو تو ایک بار پھر تلاشی لے لو" اس نے تلخی سے کہا "اور چاہو تو رب نواز کے انداز میں لے لو۔"

اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر مجھے پسینہ آ گیا تھا۔ نہ جانے یہ عورت سچ مچ اتنی بے باک تھی یا میرے سامنے بن رہی تھی۔ میں عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ کہیں رب نواز کی سازش نہ ہو۔ میرے پاس اس کے خلاف جو ثبوت تھے انہیں حاصل کرنے کے لیے وہ کسی حد تک بھی جا سکتا تھا۔ اب مجھے مار ڈالنے سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ ثبوت اس کے لیے زیادہ اہم بن گئے تھے اور میرے خلاف کچھ کرنے سے پہلے رب نواز انہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر رب نواز نے اپنی بیوی کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا تو اس نے یقیناً اسے ایسی کوئی چیز دی ہوگی جو مواصلات کے کام آ سکے۔ اسی صورت میں رب نواز کے گرگے میری پوزیشن سے بھی واقف ہوں گے۔ الیکٹرانکس کی بے پناہ ترقی نے آلات کا حجم اتنا کم کر دیا ہے کہ جاسوسی اب بے حد آسان ہو گئی ہے۔ شائستہ اپنے جسم کے کسی حصے' لباس یا کسی زیور میں ایک چھوٹا سا مائیکرو فون چھپا کر لا سکتی تھی جو ہماری گفتگو آس پاس نشر کر رہا ہوگا۔

"مجھے افسوس ہے شائستہ' لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ میں ملک رب نواز پر اعتبار نہیں کر سکتا اور بدقسمتی سے تم بھی اسی سے متعلق ہو۔ جب میں اتنا بڑا پستول نہیں تلاش کر سکا تھا تو تمہارے لباس میں پوشیدہ کوئی ننھا سا جاسوسی کا آلہ کیسے تلاش کر سکوں گا۔"

شدید اشتعال کے عالم میں اس نے اپنے کپڑے اتار کر پھینکنے شروع کر دیے۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اس کے بدن کے سارے ہی کپڑے میرے سامنے ڈھیر تھے۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا "لو انہیں دیکھ لو اور اگر پھر بھی شک ہے تو مجھے بھی دیکھ لو" یہ کہتے کہتے وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے اس کے لباس کی تلاشی لی۔ خاصی باریک بینی کے باوجود کوئی مشکوک شے نہیں ملی۔ دوسرا مرحلہ زیادہ دشوار تھا یعنی اسے دیکھنا۔ اس کے شفاف چاندنی جیسے بدن پر بھی کوئی آلہ چسپاں نہیں تھا۔ اس نے کلائی میں سونے کے دو کنگن پہن رکھے تھے اور کانوں میں ہیرے کے مختصر سے ٹاپس تھے۔ ان میں کوئی چیز چھپانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں باہر جا رہا ہوں' تم کپڑے پہن لو۔"

"کپڑے پہن کر کیا کروں گی۔ تم نے مجھے میری نگاہ میں بے لباس کر دیا ہے۔"

"فلمی ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ رب نواز کے خاندان کی عورت کتنی پاک باز اور آبرو یافتہ ہو سکتی ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا اور باہر آ گیا۔ باتھ روم میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ رئیس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے جا کر پانی کی موٹر چلائی۔ واپس آیا تو شائستہ لباس پہن کر بستر کے کنارے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے افسوس ہے لیکن یہ سب ضروری تھا۔"

"میں سمجھتی ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں نے ہی غلط توقع لگائی تھی اور اس خوش فہمی کا شکار تھی کہ تم مجھ پر فوراً اعتماد کر لو گے۔"

میں ہنسا "یعنی تم نے مجھے بالکل ہی احمق سمجھ لیا تھا؟"

"تم سے جو چند ملاقاتیں ہوئیں اور تم نے رب نواز سے دشمنی کے باوجود مجھ سے جس طرح کا سلوک کیا اس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ

کاش مجھے رب نواز کے بجائے تم مل گئے ہوتے۔"

مجھے رئیس کی بات یاد آگئی۔ اس نے مجھے اس سے خبردار رہنے کو کہا تھا۔ رئیس کا تجزیہ درست تھا۔ میں نے نرمی سے کہا "میں رب نواز کی جگہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ عمر میں تم سے خاصا بڑا ہے۔"

"پورے سولہ سال۔ جب میں انیس برس کی تھی تب میری اس سے شادی ہوئی تھی۔ اس وقت میں گریجویشن کر رہی تھی۔ مجھے ڈراموں کا شوق تھا۔ کالج آرٹ کلب کے زیرِ انتظام ہونے والے ڈراموں میں میرا رول لازمی ہوتا تھا۔ رب نواز نے مجھے پہلی بار ڈرامے میں دیکھا تھا۔ وہ مہمان خصوصی بن کر آیا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بلا کر شاباش دی اور ہزار روپے بھی دیے۔ اس زمانے میں ہزار روپے بڑی رقم ہوتی تھی۔ بعد میں ساتھی لڑکیوں نے مذاق میں کہا کہ ملک صاحب کا مجھ پر دل آگیا ہے۔ ان کا یہ مذاق سچ بن گیا۔ تیسرے دن رب نواز ہمارے گھر آگیا۔ میں گھر میں سب سے بڑی تھی۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ میرے ابو ایک کالج میں پروفیسر تھے اور امی ایک گرلز اسکول کی پرنسپل تھیں۔ خود میرا رجحان بھی ایجوکیشن کی طرف تھا۔ رب نواز اس وقت بھی سیاست کی جانی پہچانی شخصیت تھا۔ دولت مند تھا اگرچہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن ہینڈسم اور خوبصورت بھی تھا۔ امی ابو اس سے متاثر تھے۔ دوسری ملاقات میں اس نے ڈھکے چھپے انداز میں میرا ہاتھ مانگ لیا۔ امی ابو خوش ہو گئے لیکن جب مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔"

"اس انکار کی کوئی خاص وجہ؟"

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا "ہاں' میرا خالہ زاد بھائی تھا۔ اسرار احمد' میں اسے ابن صفی کہہ کر چھیڑا کرتی تھی۔ اسے ابن صفی کے ناول بے حد پسند تھے۔ مگر روایتی فلمی اسٹوری کی طرح وہ بے روزگار ہیرو تھا۔ لہٰذا ماں باپ دولت مندولن کی طرف مائل تھے۔ میں نے انکار کیا تو امی ابو مایوس ہوئے تھے۔ بہرحال وہ روشن خیال ماں باپ تھے لہٰذا انہوں نے مجھ پر زور نہیں دیا اور ملک رب نواز کو شائستگی سے انکار کر دیا۔"

"مگر اسے شائستگی کی زبان سمجھ میں نہیں آتی ہے" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں' اس نے دوسرے حربے استعمال کرنا شروع کیے۔ ایک روز مجھے کالج سے آتے ہوئے اس نے روک لیا۔ شائستہ' تم نے رشتے سے کیوں انکار کیا؟ اس نے بلاتمہید کہا۔ اس زمانے میں' میں بے حد ڈرپوک سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ خاص طور سے مردوں کے معاملے میں لیکن رب نواز کے سوال نے میرے تن بدن میں آگ لگادی تھی۔ میں نے تڑخ کر کہا "کیونکہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور مسکرایا تھا "بڑی تیکھی ہو رہی ہو۔ مجھے ایسی لڑکیاں ہی پسند ہیں۔"

"لیکن مجھے تم جیسے مرد بالکل پسند نہیں ہیں۔"

"تم بہت جلد مجھے پسند کرنے لگوگی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور اپنی بڑی سی کار آگے بڑھادی تھی۔

"اس کی بات کا مفہوم میں اس وقت سمجھی جب ایک روز صبح کالج کے لیے میں گھر سے نکلی اور مجھے اغوا کر لیا گیا۔ ایک کار آکر میرے پاس رکی۔ اس میں سے دو ہٹے کٹے افراد نکلے۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر کار میں پھینکا اور اس سے پہلے میں چلاتی' کسی نے نم رومال میری ناک سے لگایا اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں یہ دیکھ کر شرم سے کٹ کر رہ گئی کہ میرے بدن پر ایک دھجی نہیں تھی اور میں کسی اجنبی کمرے میں تھی۔ کمرا شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ میرے جسم کے نازک حصوں پر ایسے نشان تھے جیسے کسی درندے نے مجھے بھنبھوڑا ہو۔ اپنی قسمت پر آنسو بہاتے میں نے کھڑکی پر لگے پردے کو کھینچ کر اپنا جسم ڈھانپا۔ میرا مرجانے کو دل کر رہا تھا۔ ابھی میں رو ہی رہی تھی کہ رب نواز اندر آگیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر میں پھٹ پڑی تھی۔ میں نے اسے بے شمار گالیوں سے نواز دیا۔ مگر وہ بے غیرتی سے مسکراتا رہا پھر بولا "شکر کر' میرا تجھ پر دل آگیا ہے اس لیے صرف کپڑے اتارے ہیں' عزت نہیں اتاری۔"

"بے غیرت' میرے ساتھ جو ہو چکا ہے' اس کے بعد میرے پاس کون سی عزت باقی رہ گئی ہے؟"

"یہ صرف مجبوری کی وجہ سے کیا" اس نے کچھ تصویریں میرے سامنے پھینک دیں۔ ان کو دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں زمین میں زندہ دفن ہو جاؤں۔ یہ فحاشی اور بے حیائی کی ایسی تصاویر تھیں کہ ایک شریف لڑکی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اور یہ سب میری تصویریں تھیں..."

رب نواز کہہ رہا تھا۔

"صرف ان تصاویر کے لیے تمہارے جسم پر نشان ڈالے گئے ہیں۔ حقیقت میں تمہاری عزت محفوظ ہے۔"

"میں نے ایک بار پھر چیخ چلا کر اسے خوب گالیاں دیں۔ اسے کہا کہ کیا وہ اپنی ماں بہن کی بھی ایسی ہی عزت کرتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرتا ہے۔ اس نے مجھے طمانچہ مارا "بھونک مت کتیا۔ ورنہ زبان کاٹ دوں گا۔ اب تیری عافیت اسی میں ہے کہ جب میرا رشتہ آئے تو سر جھکا کر ہاں کر دینا ورنہ۔"

"اس ورنہ سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری تصاویر اس کے پاس تھیں۔ ان کی مدد سے وہ میرے سارے گھر کو جہنم کی ایسی آگ میں جھونک سکتا تھا جس میں نہ ہم مر سکتے تھے اور نہ ہی ہمیں اذیت سے نجات ملتی۔ رب نواز نے مجھے کالج ٹائم ختم ہونے سے پہلے گھر تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے طبیعت خرابی کا بہانہ کیا اور کئی دن تک امی سے اپنا جسم چھپاتی رہی۔ ایک ہفتے بعد رب نواز کی طرف سے دوبارہ رشتے کا پیغام آیا۔ اس سے پہلے میں خوب غور کر کے فیصلہ کر چکی تھی کہ رب نواز کی ہوس نفسانی کے آگے سر جھکا دینے میں ہی میری عافیت ہے۔ میں نے ڈھکے چھپے انداز میں امی پر واضح کر دیا کہ رب نواز کے رشتے سے انکار کرنا میری حماقت تھی اور یوں امی ابو نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ میں رب نواز کی دوسری بیوی بن کر اس کی لاہور والی کوٹھی میں آگئی اور اس نے سہاگ رات کو ان تصویروں کا تحفہ مجھے پیش کیا جن کے بل پر اس نے مجھے شادی پر مجبور کیا تھا۔ میں نے وہ تصویریں اس کے منہ پر دے ماریں کہ اب بے شک ان کے پوسٹرز بنوا کر شہر کی دیواروں پر لگوا دے۔ اس نے اس بے عزتی پر مجھے کچھ نہیں کہا اور میرے سامنے تصویریں مع نگیٹو کے جلا ڈالیں۔

"مجھے معلوم تھا کہ رب نواز نے خاندان والوں کی اجازت کے بغیر مجھ سے شادی کی تھی اور کئی برس تک اس کے خاندان کا کوئی فرد رب نواز کی اس کوٹھی میں نہیں آیا تھا البتہ وہ خود گاؤں جاتا رہا تھا۔ اس کا بڑا بھائی لاہور میں ہی ایک دوسری کوٹھی میں رہتا تھا اور اس نے ایک فلمی اداکارہ سے تعلقات بڑھا رکھے تھے (ان دنوں نیلم پر ملک خاندان کی نظرِ کرم تھی) رب نواز بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ رب نواز دوسری عورتوں سے تعلقات رکھتا ہے یا دو شادیاں اور کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتائے بغیر دو شادیاں اور کیں اور میری خاموشی دیکھ کر اس کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ وہ کوٹھی میں کوٹھے والیوں کو لانے لگا تھا۔ دس سال کے عرصے میں میرے دو بچے ہو گئے تھے۔ بڑا نعمان جو ان دنوں کانونٹ میں پڑھ رہا ہے۔ اس سے چھوٹا عدنان ایک دوسرے اسکول میں ہے۔ اس کے بعد مجھ پر اس خاندان کی ایک اور بے غیرتی کا انکشاف ہوا۔ ایک روز اچانک ہی رب نواز کے دو بھائی کوٹھی پر چلے آئے۔ ملک رب نواز گاؤں گیا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ملے تو ان کی آنکھوں میں بھائی کا ذرا سا بھی تقدس نہیں تھا بلکہ ایسی غلاظت تھی کہ وہ پہلی بار نہ آئے ہوتے تو میں دھکے دے۔ انہیں کوٹھی سے نکلوا دیتی۔ کاش کہ میں ایسا ہی کرتی" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

رب نواز کے خاندان کی اخلاقی حالت کے بارے میں' میں نے تھوڑا بہت سنا تھا لیکن شائستہ کا انکشاف دنگ کر دینے والا تھا۔ اس نے بتایا "ان حرام زادوں نے دھوکے سے مجھے کچھ کھلا دیا۔ اس کے اثر سے میرا پورا جسم سن ہو گیا لیکن میں ہوش میں رہی اور بے بسی سے اپنی بے آبروئی کا تماشا دیکھتی رہی۔ دونوں شیطان باری باری میرے کمرے میں آکر منہ کالا کرتے رہے۔ انہوں نے پوری بے غیرتی سے انکشاف کیا کہ ان کے خاندان میں پہلی بیوی کو چھوڑ کر باقی بیویاں بھائیوں میں مشترک سمجھی جاتی ہیں۔ یہ گھناؤنا انکشاف سن کر میں بے ہوش ہو گئی تھی اور جب ہوش میں آئی تو وہ جا چکے تھے۔ رب نواز اس کے پورے ایک مہینے بعد کوٹھی واپس آیا تھا اور اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں پھر ماں بننے والی تھی۔ ظاہر ہے یہ بچہ رب نواز کے بھائیوں میں سے کسی ایک کا تھا۔ اگر دو بچے میرے پیر کی زنجیر نہ بن گئے ہوتے تو میں خودکشی کر چکی ہوتی۔ رب نواز نے واپس آکر یہ خبر سنی تو کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ یعنی اسے معلوم تھا کہ میری کوکھ میں پلنے والا بچہ کس کا تھا۔ اس کے بعد یہ تماشا پوری بے حیائی سے ہونے لگا۔ رب نواز کے بھائی مہینے یا دو مہینے میں آتے تھے۔ وہ سارے بھائی مجھے اس طرح استعمال کرتے تھے جیسے سب لوگ ایک ہی تولیہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک بار میں نے احتجاج کیا تو رب نواز نے ہنٹروں سے مجھے اتنا مارا تھا کہ اس کے نشان آج تک میری کمر پر ہیں' یہ دیکھو" وہ اٹھ کر پشت سے اپنی قمیص اوپر کرنے لگی تھی' میں نے گھبرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔"

وہ مسکرائی۔ اس نے دامن نیچے کیا اور بیٹھ گئی۔

"تمہیں ان لوگوں کی ذہنیت کا..."

"مجھے ان لوگوں کی ذہنیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی "یہ بتاؤ کہ اب تک تم اس درندگی کو برداشت کرتی آئی تھیں' اس مشترک ملکیت رکھنے والے خاندان میں مشترک ملکیتی بچوں کی ماں بھی بن گئیں تو اب

ایسا کیا ہوا کہ تمہیں اس طرح تن کے کپڑوں میں وہاں سے فرار ہونا پڑا؟"

"میں یہی بتانے جارہی تھی۔ بچوں کے ساتھ میرے پیروں کی زنجیر میرے خون کے رشتے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں فرار ہوئی تو رب نواز کا عتاب ان لوگوں پر ٹوٹے گا۔ لہٰذا میں صبر سے اس وقت کا انتظار کرتی رہی جب میرے بہن بھائی کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔ بہن شادی کرکے سعودی عرب چلی گئی۔ ایک بھائی تعلیم حاصل کرنے جرمنی گیا تھا' وہ وہیں کا ہوگیا۔ کسی جرمن یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ اس سے چھوٹے کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پہلے کوریا اور پھر جاپان چلا گیا۔ جاپانی لڑکی سے شادی کی وجہ سے اسے جاپان کی شہریت مل گئی۔ امی ابو انتقال کرگئے۔ گویا اب میرا ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جسے رب نواز اذیت دے سکے۔ بچے ہیں' وہ اس کی اپنی اولاد ہیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "لہٰذا تم منہ اٹھا کر گھر سے نکل آئیں۔" میں نے کہا "میں نہیں مان سکتا کہ تمہاری جیسی عقل مند اور ذہین عورت اس طرح خالی ہاتھ' بے سہارا اس دنیا میں نکل آئے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اکیلی عورت اس معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اگر وہ حسین بھی ہو تو اس کے گرد منڈلانے والے بھیڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے۔"

"تعریف کا شکریہ!" وہ مسکرائی "تم نے درست کہا۔ میں آنکھ بند کرکے نہیں نکلی بلکہ مکمل بندوبست کرکے آئی ہوں۔ میں نے رب نواز سے چھپ کر بہت کچھ بنایا ہے۔ بینک بیلنس بھی اور رب نواز کے وفاداروں میں اپنے وفادار بھی۔ اس کے لیے میں نے دولت بھی استعمال کی اور اپنا حسن بھی۔ آبرو میرے لیے پہلے ہی معنی کھوچکی تھی لیکن مجھے ملک رب نواز کے گھر سے نکلنے کے بعد ایسے سہارے کی ضرورت تھی جو رب نواز سے دشمنی کرنے کی ہمت رکھتا ہو اور میرے پاس رب نواز کے خلاف جو معلومات ہیں انہیں عقل مندی سے استعمال کرکے اس شیطان خاندان کو تباہ کرسکے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ صلاحیت مجھے تم میں نظر آئی لیکن تمہارے پاس آنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ شرارت سے مسکرائی "تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ بے شک عمر میں' میں تم سے بڑی ہوں۔ تم شاید تیس کے آس پاس ہو اور میں چالیس کی ہونے والی ہوں لیکن اپنے ایمان سے کہو کہ کیا میں اتنی عمر کی لگتی ہوں؟"

"نہیں" میں نے بادل ناخواستہ اعتراف کیا۔ وہ بات کو پھر غلط رخ پر لے جارہی تھی "لیکن۔"

"میں خوب صورت ہوں' دولت بھی ہے میرے پاس۔ سب سے بڑھ کر زندگی اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ ہے میرے پاس ورنہ جس صورت حال سے میں گزری ہوں' کوئی اور ہوتی تو خودکشی کرچکی ہوتی یا رب نواز کے کتے اس کی ہڈیاں چباچکے ہوتے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آبرومندانہ زندگی نہیں گزاری لیکن کوئی سہارا دینے والا ہو تو میں شریفانہ زندگی بھی گزار سکتی ہوں۔ میں اپنا تن' من' دھن سب اس کے حوالے کردوں گی۔"

"اگر تم مجھے لالچ دے رہی ہو تو یہ سب بے کار ہے" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "دولت کی میرے پاس بھی کمی نہیں ہے اور جس کے پاس دولت ہو اسے خوب صورت جسموں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ تم کام کی بات کرو۔"

میری بات سن کر اس کے حسین چہرے کا رنگ ایک لمحے کو پھیکا ہوا تھا مگر وہ مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ اس نے فوراً خود پر قابو پالیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے میری بات اس کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔ اس نے کہا "کیا یہاں چائے یا کافی بنانے کا کوئی انتظام ہے؟"

"کچن میں ہوگا۔" میں نے اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر کچن میں گئی۔ کافی کے ڈبے' شکر اور پاؤڈر کریم کا ڈبا اسے اوپر والے شیلف میں مل گئے تھے۔ اس نے فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکالی اور کافی بنانے لگی۔ موقع پاکر میں باہر آیا۔ رئیس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ میں نے رب نواز کا نمبر ملایا اور بلا تمہید بولا "رب نواز کو بلاؤ' اس کی بیوی کا معاملہ ہے۔"

کچھ دیر بعد رب نواز لائن پر تھا۔ میں نے ہنس کر کہا "تم عظیم کذاب ہو رب نواز' اتنی جلدی اسپتال سے آبھی گئے؟"

"شاہ عالم!" وہ دہاڑا "شائستہ کہاں ہے؟"

"آہستہ میری جان' آہستہ۔ میں فون پر تمہاری کوئل کی طرح کوکتی آواز سن سکتا ہوں تو کتے کی طرح بھونکنے کی کیا ضرورت ہے اور شاید تم اپنی بیوی کی بات کررہے ہو تو تمہاری بیوی کے بارے میں' میں کیا جانوں ۔۔۔ یا جانتا ہوں؟"

اس نے بے تحاشا گالیاں دینا شروع کردیں "شاہ عالم ۔۔۔ ماں کے ۔۔۔ تیری ۔۔۔ اب حد ہوگئی ہے' تو میرے ہاتھ آگیا تو تجھے کتوں سے نچوادوں گا۔"

"اب تمہیں دل کا دورہ ضرور پڑے گا۔ ہائے وا وے تمہاری بیوی کہاں گئی؟ میں نے اسے دیکھا ہے' اس عمر میں بھی زبردست عورت ہے۔ ہوسکتا ہے اسے سچ مچ کا مرد مل گیا ہو۔ بے چاری کب تک تمہارے بھائیوں کے حرامی بچے پیدا کرتی؟"

اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ "شاہ عالم! وہ کتیا تیرے پاس ہی ہے اور وہ حرام زادی ۔۔۔" اس نے پھر گالیاں شروع کردیں پھر میرے اور اپنی بیوی کے مراسم کے حوالے سے ناقابل بیان قسم کی باتیں کرنے لگا۔

"رب نواز' تم جیسے بے غیرت شخص کے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ بہرحال میں نے ایک اور مقصد کے لئے فون کیا تھا۔ تم نے تصویریں اور دستاویزی ثبوت کی کاپیاں دیکھ لی ہیں۔"

رب نواز نے تصویروں اور دستاویزات کے بارے میں بھی ایک ناقابل ذکر قسم کا مشورہ دیا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا "تم بے شک یہ ثبوت پولیس کے حوالے کردو مگر تم رب نواز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"میں یہ ثبوت پولیس کے نہیں بلکہ میڈیا کے اور ہائی کورٹ کے ججوں کے حوالے کروں گا پھر تم کس طرح بچتے ہو یہ میں بھی دیکھوں گا۔"

رب نواز کو ایک بار پھر سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس بار وہ بولا تو انسانی جون میں تھا "کیا چاہتے ہو تم؟"

"یہ کی نا تم نے کام کی بات" میں ہنس کر بولا "رب نواز میں تمہیں ایک پتا بتارہا ہوں۔ یہ موج دین المعروف استاد موج دین کا ایک گودام ہے جہاں وہ اسمگل کی ہوئی اعلیٰ درجے کی غیر ملکی شراب رکھتا ہے۔ اس گودام کو صبح کا سورج نکلنے سے پہلے اس طرح تباہ ہوجانا چاہئے کہ اس میں رکھی ایک چیز بھی سلامت نہ رہے۔"

رب نواز حیران ہوا تھا "تمہیں موج دین سے کیا دشمنی ہے؟"

"وہی جو تمہیں مجھ سے ہے۔ تم مجھے تباہ کردینا چاہتے ہو اور میں اسے تباہ کرنا چاہتا ہوں اور تم سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ صبح تک یہ کام نہیں ہوا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کیا کروں گا؟"

"شاہ عالم' تم بچوں کی سی حرکت کررہے ہو۔"

"بچوں کی سی؟" میں نے حیرت سے کہا "رب نواز' تم تو سستے چھوٹ رہے ہو۔ شکر کرو کہ میں نے تم سے ان چیزوں کے بدلے رقم نہیں مانگی۔ تم اپنی آزادی اور جان کی قیمت لگا سکتے ہو۔ میں نے جو کہا ہے وہ تمہارے چند کتے بہ آسانی کرسکتے ہیں۔ چند گیلن پیٹرول پر زیادہ خرچا نہیں آئے گا اور راہ میں کوئی مزاحم ہوا تو صرف ایک گولی خرچ کرنا پڑے گی۔ اب بتاؤ کہ تم سستے میں چھوٹ رہے ہو کہ نہیں۔"

رب نواز جھنجلایا "مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ تم مجھے موج دین سے دشمنی کے چکر میں الجھا کر اپنا الو سیدھا کررہے' تم یہ کام خود کیوں نہیں کرلیتے۔"

"اول تو جب تم جیسا خادم موجود ہے تو مجھے خود زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسرے میں تمہیں موج دین سے دشمنی کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم دونوں کی دشمنی تو پہلے ہی موجود ہوگی کیونکہ تم دونوں کا بزنس ایک ہی ہے اور پھر استاد موج دین نوادرات کے بزنس میں بھی قدم رکھ رہا ہے۔ وہ تمہارا طاقت ور حریف ثابت ہوگا۔ اسے صوبائی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔"

"رب نواز بھی کوئی چوزا نہیں ہے۔" اس نے غرور سے کہا۔

"بس تو پھر صبح سے پہلے موج دین کے ہوش و حواس رخصت نہ ہوئے تو تمہارے ضرور ہوجائیں گے" میں نے کہا۔ اور فون بند کردیا۔ اسی لمحے رئیس گیٹ کے بغلی دروازے سے اندر آیا۔ اس نے شاپرز اٹھا رکھے تھے۔

"تو باہر کیا کررہا ہے؟" وہ بولا "اسے اندر اکیلا چھوڑا ہوا ہے۔"

"رب نواز سے بات کررہا تھا۔ تو اس کی فکر نہ کر۔"

"ابے یار' وہ ایک نمبر کی حرافہ عورت ہے۔ ملک رب نواز کی بیوی' میں تو ڈر رہا تھا کہ واپس آکر تجھے غائب نہ پاؤں۔"

رئیس نے شاپرز مجھے پکڑاتے ہوئے برہمی سے کہا۔ "ناصر تو اس ناگن پر ضرورت سے زیادہ اعتبار کررہا ہے۔ اس سے کام کی بات معلوم کر اور اسے چلتا کر۔"

"تو باہر ہی ٹھہر" میں نے کہا "بلکہ ایسا کر ہال میں آجا۔ تو وہاں سے بہتر طور پر نگرانی کرسکے گا۔"

رئیس نے سر ہلایا "میں نے کھانا کھالیا ہے تو کھالے اور اسے بھی کچھ کھلادے اور دیکھ یار' اگر اس نے سیدھی طرح زبان نہ کھولی تو ہمیں انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑیں گی۔"

"یہ بھی کرلیں گے لیکن میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں اندر آیا۔ وہ بستر پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ "بھوک لگی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ چہرے سے وہ اُداس نظر آ رہی تھی۔ "مجھے بھوک نہیں ہے ان حالات میں مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ مجھے.... مجھے اپنے بچے یاد آ رہے ہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

میں نے زور نہیں دیا۔ مجھے زور کی بھوک لگ رہی تھی میں نے کھانا نکال لیا۔ کھانا کھا کر میں نے برتن سمیٹے اور نیم گرم کافی کا مگ لے کر اس کے پاس آیا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ "رب نواز کے بارے میں' کاش وہ ایک مچھر ہوتا تو میں اسے ہاتھوں سے مسل دیتی۔"

"رب نواز لوہے کا چنا ہے جسے چبائے بغیر حلق سے اتار لینا مناسب ہوگا۔ رب نواز زہریلا سانپ ہے اسے پھن مارنے کا موقع دیے بغیر ختم کرنا ہوگا۔ وہ معاشرے اور قانون کا مجرم ہے۔ اس نے ہزاروں لوگوں پر ظلم ڈھائے ہیں جن میں تم بھی شامل ہو۔ اور میں بھی۔"

"ہاں،" دونوں ہی مظلوم ہیں اور ہم ہی اسے کیفرِ کردار تک پہنچا سکتے ہیں۔ تمہارے پاس طاقت ہے' ذہانت ہے اور میرے پاس رب نواز کے راز ہیں۔"

"تم نے اس کے غدارِ وطن ہونے کا ذکر کیا تھا۔"

"یہ سچ ہے۔" اس نے بلا تامل کہا "وہ جس زمین پر رہتا ہے' اس کا سودا کر رہا ہے۔ اب سے نہیں برسوں سے اس کے بھارتی جاسوسوں سے تعلقات ہیں۔ وہ اس سرزمین پر انہیں پناہ اور وسائل فراہم کرتا ہے۔ حکومت سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ان سے تخریب کاری کراتا ہے۔ معاشرے کے باغی بیروزگار نوجوانوں کو بھارتی ایجنٹ بننے کے لیے انڈیا بھیجتا ہے۔ اس کے جرائم کی فہرست خاصی طویل ہے۔"

شائستہ کے منہ سے یہ انکشافات حیرت انگیز تھے مگر اس میں ہاشم رضا کے پروجیکٹ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ جس میں بھارتی بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ میں نے کہا "کیا تم ہاشم رضا کے بارے میں جانتی ہو؟"

"ہاں' وہ رب نواز کے لیے لالی اور جبو جیسے حیوانات تیار کرتا ہے۔ اس کے پاس ایسے کئی اور جانور بھی ہیں۔"

"کیا تم کسی شرما جی کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے گہری سانس لی "شائستہ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ رب نواز ان حیوانوں اور ان کے تیار کرنے والے فارمولوں کا انڈین حکومت سے سودا کر رہا ہے۔ شرما جی ایک انڈین سائنس داں ہے جو اس سلسلے میں رب نواز کے پاس ٹھہرا ہے۔"

"انڈین حکومت کو اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" اس نے الجھن سے کہا۔

شائستہ کیوں کہ ایک پڑھی لکھی اور ذہین عورت تھی جس کی عالمی سیاست پر بھی نظر تھی اس لیے جب میں نے اسے تفصیل سے لالی اور جبو جیسے نیم انسان و نیم حیوان مخلوق کے مقاصد اور عالمی فوجی قوتوں کی ان میں دلچسپی کے اسباب بیان کیے تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ غالباً اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہاشم رضا کی تحقیقات اتنی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا "میں تو اسے رب نواز کا شوق سمجھتی ہوں۔"

"اس جیسے لوگوں کو سستے داموں بے شمار غلام مل جاتے ہیں تو انہیں خرچا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے خیال میں رب نواز کے ذہن میں شروع سے یہ خیال تھا کہ وہ اس چیز کو کیش کرائے گا۔ کوئی بھی حکومت ہاشم رضا کی تحقیق کے عوض منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہو جائے گی۔"

شائستہ سچ مچ ذہین تھی اس نے بھی وہی سوال کیا تھا جو میرے ذہن میں تھا۔ "رب نواز نے آخر انڈین حکومت سے کیوں رابطہ کیا ہے۔ اسے زیادہ قیمت تو کوئی مغربی ملک بھی دے سکتا تھا جیسے امریکا۔"

"میں نے اس پر غور کیا ہے اور اس کی ایک ہی وجہ ذہن میں آتی ہے۔" میں نے جواب دیا "وہ یہ کہ اس پروجیکٹ میں امریکی حکومت بھی دلچسپی لے رہی ہے لیکن اس کام کے لیے وہ بھارتیوں کو استعمال کر رہی ہے۔ امریکا یا کسی اور مغربی ملک میں بڑے پیمانے پر اس قسم کے تجربات ممکن نہیں۔ وہاں پر انسانی حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے اور انسانوں پر خصوصاً عورتوں پر اس قسم کے تجربات کی اجازت مشکل سے ہی ملے گی۔ انڈیا میں آبادی بہت زیادہ ہے' غربت بے پناہ ہے اور انسانی حقوق کا خیال بھی نہیں رکھا جاتا۔ وہاں پر حکومتی سرپرستی میں اس قسم کے تجربات عین ممکن ہیں۔ لالچ دے کر ہزار دو ہزار عورتوں کو اس کام کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے اور ان کے مرنے کی صورت میں چند ہزار دے کر ان کے گھر والوں کا منہ بھی بند کیا جا سکتا ہے۔ رب نواز احمق نہیں ہے وہ پوری قیمت وصول کرنے والوں میں سے ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ رقم امریکا یا کوئی اور مغربی ملک لگا رہا ہو اور سہولیات خاص طور پر عورتیں بھارتی حکومت

فراہم کرے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیوں کہ پچھلے ایک مہینے کے دوران میں کم سے کم تین بار امریکی لوگ ہمارے ہاں آئے تھے۔ میں نے ان کے انگریزی بولنے کے انداز سے جانا تھا کہ وہ امریکی ہیں۔ رب نواز ان کی خاطر مدارات کرتا تھا اور جب وہ میٹنگ کر رہے ہوتے تھے تو کسی کو بھی اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ مجھے بھی نہیں۔ ایک بار میں اس طرف گئی تو مجھے لالی نے آگے جانے سے روک دیا تھا۔"

"سوال یہ ہے کہ رب نواز اب تک رکا ہوا کیوں ہے؟ اس نے سودا مکمل کیوں نہیں کیا؟"

"ہاشم رضا کی وجہ سے۔ اس تجربے کی خاص خاص باتوں کا علم صرف ہاشم رضا کو ہے اس کے بغیر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا سائنس داں کیوں نہ ہو۔"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہاشم رضا مزید تین عورتوں پر تجربات کر رہا تھا۔ وہ ولادت کے قریب تھیں اور میرے خیال میں اب تک ان بچوں کو جنم دے چکی ہوں۔ تمہارے خیال میں یہ بچے کہاں ہو سکتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ رب نواز نے مجھے کبھی ان چیزوں کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میرے خیال میں ایک شخص ہے جو بتا سکتا ہے۔ یہ عمر صدیق نام کا ایک نوجوان ہے جو تجربات میں ہاشم رضا کی مدد کیا کرتا تھا۔ وہ جینیٹک سائنس میں ایم ایس سی کر کے بے روزگار پھر رہا تھا۔ رب نواز نے اسے ملازم رکھ لیا اور ہاشم رضا کے ساتھ لگا دیا۔ وہ ایک طرح سے رب نواز کا جاسوس بھی تھا جو ہاشم رضا پر نظر رکھتا تھا۔ وہ لیب میں مدد دینے کے علاوہ باہر کے سارے کام کرتا تھا کیونکہ ہاشم رضا کے باہر جانے پر پابندی تھی۔ یہ نوجوان گلبرگ میں کہیں رہتا ہے۔ اس کا فون نمبر میرے پاس ہے۔"

"تمہارے پاس ہے؟" میں چونکا کیوں کہ وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لائی تھی۔

وہ مسکرائی "فی الوقت نہیں ہے لیکن میں حاصل کر لوں گی۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی تھی یا اس نے مجھے مکمل معلومات نہیں دی تھی لیکن ابھی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ رات خاصی ہو چکی تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "رات بہت ہو گئی ہے اب تم آرام کرو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"میں اکیلے نہیں رہوں گی تم بھی یہاں سو جاؤ۔" اس نے فوراً کہا۔

"یہاں ایک ہی بستر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا ہوا۔" وہ ہنسی "اگر تمہیں ایک بستر پر سونے پر اعتراض ہے تو تم صوفے پر بھی سو سکتے ہو۔"

اس کی پیش کش کے پیچھے چھپی غرض سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونا ایسا تھا جیسے کسی آدم خور شیرنی کے ساتھ پنجرے میں رہا جائے۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو کسی مرد کو تسخیر کرنے کی ٹھان لیں تو اس کے لیے ہر حربہ استعمال کر گزرتی ہیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک قاتلانہ انگڑائی لی۔

"مجھے اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے اور یہ تو ہے بھی اجنبی جگہ۔"

میں نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹا لیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم.... تم آرام کرو۔ میں ذرا کام کر کے آتا ہوں۔" عملاً میں بیڈ روم سے نکل بھاگا۔ میں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ رئیس ہال کے ایک صوفے پر محوِ استراحت تھا اور میں الو کی طرح جاگ رہا تھا۔ میں نے دوسرا صوفہ سنبھالا۔ دروازے سارے اندر سے بند تھے اور رئیس نے باہر کے گیٹ پر تالے ڈال دیے تھے۔ بنگلے کی چاردیواری آٹھ فٹ اونچی تھی اور اگر شائستہ کسی طرح باہر نکل بھی جاتی تو تب بھی اس کے لیے چاردیواری سے باہر جانا بے حد مشکل تھا۔ مگر مجھے اطمینان تھا وہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گی۔ تھکن کے باوجود مجھے خاصی دیر سے نیند آئی تھی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو رئیس جا چکا تھا۔ شاید ناشتا لینے۔ میں نے اٹھ کر ہال کے ساتھ موجود واش روم میں منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں غسل کی گنجائش نہیں تھی۔ پندرہ منٹ بعد رئیس آ گیا۔ وہ ناشتا کر کے آیا تھا اور ہمارے لیے لے آیا تھا۔

"یار میں نیلم ہاؤس جا رہا ہوں' ذرا وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔" اس نے کہا۔

میں ہنسا "ابے بے وقوف کسی اور کو بنانا' تو نیلم کو دیکھنے جا رہا ہے۔ ٹکٹوں کا معلوم کر لینا اور یہ بھی کہ ہمارے پاسپورٹس پر ویزے لگ گئے۔ اگر ویزا لگ گیا ہو تو کسی بہانے میرا پاسپورٹ نیلم سے لے آنا۔ ایک کام اور کرنا' نیلم کے پاس میری چیک بک ہے اس سے چیک نکال لینا۔ میرے سائن ہیں۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے نکلوا لانا اور وہاں واپسی پر وہی لانسر کار لیتے آنا جو تم نے اوپن لیٹر پر خریدی تھی۔ جعلی

نام ہے۔"

"سب ہو جائے گا تو فکر نہ کر۔"

"اور ہاں وہ را نفل بھی لیتے آنا۔"

رئیس چلا گیا۔ میں نے ناشتے کا تھیلا اٹھایا اور دروازہ کھول کر بیڈ روم میں آیا۔ شائستہ باتھ روم میں نہا رہی تھی۔ پانی گرنے اور اس کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ناشتا کچن میں رکھا اور چائے کا پانی چڑھا دیا۔ جتنی دیر میں میں نے چائے بنائی وہ نہا کر باہر نکل آئی تھی۔ "گڈ مارننگ۔" اس نے کہا۔ میں کیتلی چولھے سے اتار رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کیتلی ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ وہ صرف تولیے باندھے ہوئے تھی۔ میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے۔ تم کپڑے پہن کر باہر نہیں آ سکتی تھیں۔"

وہ ہنسی "مجھے غسل کے بعد باسی کپڑے پہننے سے وحشت ہوتی ہے اور میرے پاس یہی ایک جوڑا ہے۔"

"تو۔۔۔ تم اس طرح تولیہ باندھ کر گھومو گی؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں۔۔۔ کیا حرج ہے۔ صرف تم ہی تو ہو دیکھنے والے اور تم مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ ہی چکے ہو۔"

"پلیز شائستہ۔" میں نے اس بار لہجہ سخت کیا "میرے ساتھ یہ کھیل مت کھیلو۔"

"کون سا کھیل؟" وہ کچن کے دروازے پر ٹک گئی اس کے انداز میں معصومیت تھی۔

میں نے خاصی کوشش کر کے خود پر قابو پایا۔ وہ بے حد ڈھیٹ عورت تھی۔ مجھ سے مار بھی کھا لیتی مگر اپنی روش نہیں بدلتی۔ میں نے کہا "الماری میں میرے کپڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی مناسب سوٹ پہن لو۔"

"تولیہ بھی نامناسب نہیں ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "خیر تم کہتے ہو تو ایسے ہی سہی۔"

اس نے جا کر الماری کھولی میں اس کی طرف نہ دیکھنے کی سخت کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ حسن و شباب اور مقناطیسی کشش کا حامل بدن رکھنے والی ایسی عورت تھی جو اپنے حربوں سے کسی زہد صد سالہ کے خشک جسم میں آگ لگا سکتی تھی۔ اس نے اندر سے ہاف آستین کی سیاہ چست بنیان نکالی۔ "یہ کیسی رہے گی؟" اس نے جسم سے لگا کر دکھایا۔

"ٹھیک رہے گی بابا۔ تم پہنو تو۔" میں نے جھلا کر کہا۔

اس نے بے تکلفی سے وہیں کھڑے کھڑے کپڑے بدلنے شروع کر دیے۔ سیاہ شرٹ کے ساتھ اس نے میرا رات کو پہننے والا دھاری دار پاجامہ منتخب کیا تھا۔ یہ سائز میں اسے خاصا بڑا تھا لیکن اس نے پائنچے موڑ کر کام چلا لیا تھا مگر چست بنیان اس کے جسم پر پھنسی پھنسی تھی۔ میں نے کہا۔ وہ اوپر سے میری کوئی شرٹ پہن لے لیکن اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے یہ مشورہ اڑا دیا۔ ناشتے کے دوران میں وہ مسلسل بولتی رہی۔ اپنے بارے میں اور اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بری عورت نہیں تھی لیکن اس نے جس گندے ماحول میں اتنے سال گزارے تھے اور جیسی انسانیت سوز زندگی بسر کی تھی، اس کا کچھ نہ کچھ اثر اس کی شخصیت پر پڑنا ہی تھا۔ جیسے ایک پاکباز عورت عرصے تک طوائفوں کے کوٹھوں پر رہے تو اس کے اطوار میں طوائفوں جیسی بات آ ہی جاتی ہے۔

"تم خود کو خراب عورت کیوں پوز کرتی ہو؟" میں نے اچانک پوچھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ "تم اندر سے ایسی نہیں ہو۔ میری جگہ اگر کوئی ہوس پرست ہوتا اور تمہاری طرف بری نیت سے ہاتھ بڑھاتا تو مجھے یقین ہے کہ تم جان دینا پسند کرتیں بہ نسبت بے آبرو ہونے کے۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے تند لہجے میں کہا "میرے پاس آبرو ہے کہاں؟"

"میں ذہنی کیفیت کی بات کر رہا ہوں۔ ذہن ہی تو ہمیں اچھا برا بناتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کتنے لوگوں نے تمہارا جسمانی استحصال کیا ہے۔ میں اس کے لیے تمہیں قصوروار نہیں سمجھتا۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں جب ایک عورت کسی مرد کے جبر کا شکار ہوتی ہے تو سب اس سے یوں کترانے لگتے ہیں جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو۔ شاہ عالم ہم ایک منافق معاشرے میں جی رہے ہیں جو باتیں تو کتابی کرتا ہے لیکن اس کا عمل اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔"

"سب لوگ ایسے نہیں ہوتے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"درست ہے لیکن ان کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ تم اچھے آدمی ہو لیکن کیا تم مجھے قبول کرو گے۔ مجھ سے شادی کرو گے۔" وہ میرے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" میں نے اسے دور کرنے کی کوشش کی "تم رب نواز کی بیوی ہو۔"

ابھی میں اسے خود سے الگ نہیں کر پایا تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور میں نے وہاں چندا کو دم بہ خود کھڑے دیکھا۔

اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے شائستہ کو دیکھا جو نہایت نامناسب لباس میں (وہ بھی میرا تھا) مجھ سے بے حجابانہ چپٹی ہوئی تھی۔ چندا کو دیکھتے ہی میں نے اسے ایک جھٹکے سے خود سے الگ کر دیا۔ "چندا۔" میں نے کہنا چاہا۔

"میرا نام مت لو۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پلٹ کر چلی گئی۔

"مارے گئے۔" میں اس کے پیچھے دوڑا اور جاتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ باہر سے بند کر گیا تھا۔ چندا ہال کے دروازے تک پہنچی تھی کہ میں نے اسے جا لیا۔ "چندا۔" میں نے اس کا بازو پکڑا۔ اگلے ہی لمحے میں اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ شکر ہے میرا سر دیوار سے نہیں لگا تھا۔ ورنہ وہیں میرا خاتمہ ہو جاتا۔ میں کراہتے ہوئے اٹھا تو وہ باہر جا چکی تھی لنگڑاتے ہوئے میں نے دوسری بار اسے باہر جانے والی روش پر پکڑا۔ اس بار میں نے اسے عقب سے اس طرح قابو کیا کہ وہ ہاتھ پیر نہ چلا سکے۔ بے شک وہ میری طرح آؤٹ آف پریکٹس تھی لیکن اس کے خطرناک ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

"چھوڑو مجھے گھٹیا اور کمینے شخص۔" اس نے جدوجہد کرتے ہوئے کہا۔

"میری بات سنو چندا۔" میں نے اسے قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اس وقت وہ بپھری ہوئی شیرنی ہو رہی تھی۔

"نہیں سننی میں نے تمہاری بات۔" وہ مچلتی ہوئی بولی "چھوڑو مجھے۔"

میں بہ مشکل اسے کھینچ کر ہال تک لے آیا۔ وہ اب ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ میں نے اچانک اسے تھپڑ مارا اور گرج کر بولا "میری بات بھی سنو۔"

وہ روتی ہوئی صوفے پر گر گئی "ذلیل۔۔۔ تم نے مجھے مارا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے دوسرا تھپڑ مارا تو وہ روتے روتے یک دم بے ہوش ہو گئی۔ مجھے پچھتاوا ہونے لگا۔ ڈوز زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ عرصے پہلے ہی ہسٹریا کا شکار رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈا پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑکا۔ اس کے گال تھپکے اور پھر بھرپور محبت سے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ چند منٹ میں ہوش میں آ گئی تھی اور مجھے اتنے قریب دیکھ کر اس کے چہرے کی سرخی لوٹ آئی تھی پھر اسے یاد آ گیا کہ میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا تو اس نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

"چندا۔ میری بات سنو۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔" اس نے اٹھ کر اپنا دوپٹہ درست کیا۔

"تمہیں سننا پڑے گا۔"

"ورنہ تم مجھے مار دو گے۔۔۔ ہے ناں؟" اس نے طنز کیا تو میں نے عاجزی سے کہا۔

"بابا۔۔۔ غلطی ہو گئی۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو اور ایک بار میری بات سن لو۔"

اس کا منہ پھولا ہوا تھا لیکن اس نے انکار نہیں کیا۔ میں نے اسے تفصیل سے کل سے اب تک کی روداد سنائی۔ آخر میں اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "یہ واقعی رب نواز کی بیوی ہے۔"

"سو فیصد ذاتی اور سگی بیوی۔"

"تو پھر یہ تمہارے گلے لگ کر کیا کر رہی تھی اور اس نے غالباً کپڑے بھی تمہارے پہن رکھے ہیں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ رو رہی تھی اور خود ہی میرے گلے پڑ گئی تھی۔ میں اس بلا سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم آ گئیں۔"

"جان چھڑانے کی یا اسے سینے سے لگانے کی۔" اس نے اسی انداز میں کہا "خاصی خوب صورت عورت ہے اور لباس بھی ہوش ربا پہن رکھا ہے۔"

"تم سے زیادہ نہیں ہے۔"

"لیکن بے حیا ہے۔" اس نے طیش سے کہا "اسے بالکل شرم نہیں آتی کسی غیر مرد کے ساتھ اس طرح رہتے ہوئے، تاہم یہ عورت تمہارے چکر میں ہے، اسے فوراً سے بیشتر چلتا کرو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے اس کے پاس رب نواز کے خلاف اہم ثبوت ہیں۔" میں نے جواب دیا "اس وقت اسے برداشت کرنا پڑے گا۔"

"عورت اگر حسین ہو تو اسے برداشت کرنا برا بھی نہیں لگتا۔" اس نے طنز کیا۔

"بات اس کے حسن کی نہیں ہے۔" میں نے مدافعت کی۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ رب نواز کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے اس کا ہونا ضروری ہے۔"

"مجھے نہیں لگ رہا کہ تم رب نواز کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ تاہم ہم خاموشی سے اس ملک سے جا سکتے ہیں۔ آدمی راہ میں آنے والے ہر پاگل کتے سے نہیں الجھ سکتا۔"

"رب نواز پاگل کتا نہیں زہریلا سانپ ہے اس کا پھن

کھلے بغیر ہم سکون سے نہیں رہ سکتے۔ لندن میں بھی نہیں۔ وہ جگہ بھی اس کی پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ چندا آج اسے چھوڑ دیا تو وہ صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ اس ملک کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔"

"ہمیں پہلے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ ملک کی حفاظت کا کام ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے جو اس کے ذمے دار ہیں۔"

میں نے افسوس سے اسے دیکھا "مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں کرنل خان کی پوتی اور ایک شہید فوجی کی بیٹی کے منہ سے یہ بات سن رہا ہوں۔"

وہ تھوڑی سی شرمندہ نظر آئی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم کسی ایسی ایجنسی سے مدد لے سکتے ہیں جس کا کام ہی یہ ہے وہ بہتر طور پر ان وطن دشمنوں سے نمٹ سکتی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "فی الوقت ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہماری بات پر کوئی ایجنسی رب نواز جیسے بارسوخ شخص کے خلاف حرکت میں نہیں آئے گی۔ جو کرنا ہے ہمیں خود ہی کرنا ہے۔"

چندا نے بے بسی سے مجھے دیکھا "ناصر ہم پہلے ہی بہت مشکل میں ہیں۔"

"تم نہیں' میں مشکل میں ہوں۔" میں نے اس بار رکھائی سے کہا۔

"میں اور تم کیا الگ ہیں؟"

"کم سے کم نقطۂ نظر کے لحاظ سے الگ ہیں۔"

"ٹھیک ہے' جیسا تم چاہو۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "مگر تمہیں اس عورت کی ناز برداریاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"چندا مجھے اس سے معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"تم اسے میرے سپرد کرو۔ میں یہ کام کر کے دکھاتی ہوں۔" اس نے چیلنج کیا۔

"جبر کے ذریعے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مجھے بہرصورت رب نواز کے اندر کے راز درکار ہیں۔"

چندا کا ہینڈ بیگ میز پر رکھا تھا اس نے دوپٹہ تکلی کر کے گرد باندھا اور جارحانہ انداز میں دفتر والے حصے کی طرف بڑھی۔ اس وقت مجھے اس میں پرانی تند مزاج شعلہ و شبنم چندا کی جھلک نظر آئی تھی۔ مجھے شائستہ کی عافیت خطرے میں لگ رہی تھی مگر اس کے رویے کے جواب میں اسے سختی کا ایک ڈوز دینا ضروری تھا اور میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ چندا کو اندر گئے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ شائستہ کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ غالباً چندا اس سے عملی تعارف کرا رہی تھی۔ ان آوازوں کا سلسلہ وقفے وقفے سے کوئی ایک گھنٹے تک جاری رہا اس کے بعد چندا مسکراتی ہوئی اندر سے برآمد ہوئی۔

"میرا اندازہ درست تھا' وہ اپنے عورت ہونے سے فائدہ اٹھا کر تم سے بہت کچھ چھپا رہی تھی۔ یہ عورت برسوں رب نواز کے خلاف ثبوت جمع کرتی رہی ہے اور یہ تمام ثبوت اس نے گلبرک کے ایک مکان میں رکھے ہوئے ہیں۔ مکان بھی اس کی ملکیت ہے۔"

"مکان کا پتا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کاغذ پر ایک پتا لکھ دیا۔ "چندا میں اس طرف جا رہا ہوں جب تک تم اس کی نگرانی کرو اور کوشش کرو کہ یہ اور بھی کوئی کام کی بات بتائے۔ رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا "میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں گی۔"

میں جانتا تھا چندا کا طیش سے برا حال تھا۔ وہ جب سے پلٹ کر آئی تھی میرے معاملے میں بے حد حساس ہو گئی تھی۔ میں نے اسے خبردار کیا "کہیں مار ہی نہ دینا۔ ابھی یہ بھی رب نواز کے خلاف ہمارے ہاتھ میں ترپ کا ایک پتا ہے۔"

"میں خیال رکھوں گی۔" اس نے وعدہ کیا۔

میں کپڑے بدلنے اندر گیا تو مجھے شائستہ کے چہرے پر نیلوں کے نشانات نے اتنا حیران نہیں کیا تھا جتنا اسے اس کے ہی کپڑوں میں دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ چندا نے اس کے جسم سے میرے کپڑے تک اتروا لیے تھے۔ ویسے بھی میری اسکن فٹ جرسی اس کے لیے کسی طرح مناسب نہیں تھی۔ اس میں اس کے خدوخال کی تفصیلات بے حد نمایاں نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے شکوہ زدہ نظروں سے دیکھا اور چندا کو دیکھ کر سہم گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"شائستہ اگر تمہاری بتائی ہوئی کوئی بات غلط ثابت ہوئی تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"میں نے کوئی بات غلط نہیں بتائی ہے۔" وہ بلبلائی "خدا کے لیے اسے مجھ سے دور رکھو' یہ لڑکی نہیں جلاد ہے۔"

"اسے تو میں خود سے دور نہیں رکھ سکتا تم سے کیسے دور کروں۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا تو چندا جھینپ گئی تھی۔ میں نے واش روم میں جا کر کپڑے بدلے۔ رئیس ابھی تک

نہیں آیا تھا۔ میں نے چندا سے کچھ رقم ادھار لی۔ اس نے اپنے پاس موجود ساری ہی رقم میرے حوالے کر دی تھی "اپنا خیال رکھنا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

پستول میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ ٹیکسی لے کر میں گلبرگ کے اس علاقے میں پہنچا جس کا پتا میرے پاس تھا۔ یہ خوش حال طبقے کی آبادی تھی۔ جہاں زیادہ تر ایک کنال پر بنے بنگلے تھے۔ پرانی آبادی تھی اس لیے اس میں ایک رکھ رکھاؤ نظر آرہا تھا۔ مجھے مطلوبہ پتا تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ کنال بھر کے پلاٹ پر بنا مختصر سا مکان تھا۔ جس کے چاروں طرف باغ تھا۔ باغ عدم توجہی سے اُجڑ رہا تھا۔ مکان کی حالت سے بھی لگتا تھا کہ اس کی ضروری دیکھ بھال نہیں کی جاتی تھی۔ مین گیٹ لوہے کی سلاخوں کا تھا۔ اس سے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا مگر اندر جانے کے لیے سامنے کا رخ موزوں نہیں تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا لہٰذا مستقبل کے معمار سڑک کو ہی کرکٹ کا میدان بنا کر کھیل میں مصروف تھے۔ میں گھوم کر پچھلی گلی میں آیا۔ وہاں سناٹا بھی تھا اور دیوار بھی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جمپ لگائی۔ دیوار کے اوپر چڑھا اور اگلے ہی لمحے میں چار دیواری کے اندر تھا۔ اس طرف کچے صحن میں بڑے درخت لگے تھے۔ ان میں آم اور جامن کے درخت بھی تھے۔ مکان چاروں طرف سے بند تھا۔ میں کسی طرف سے بھی کوئی راستہ نہ پا سکا۔ دروازے لاک تھے اور کھڑکیوں پر لوہے کی ناقابلِ شکست جالی تھی۔ میرا دل اپنا سر پیٹنے کو چاہا۔ مجھے شائستہ سے کم سے کم یہ معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ اس مکان میں داخلے کا طریقۂ کار کیا ہے۔ میں نے فلموں میں ہیرو یا ولن کو اس قسم کی پچویشن سے منٹوں میں نمٹتے دیکھا تھا۔ وہ کسی تار کی مدد سے یوں تالا کھول لیتے تھے جیسے ہم چابی کی مدد سے کھولتے ہیں مگر میں نہ تو ہیرو تھا نہ ولن اور یہ بھی کوئی فلم نہیں تھی۔ بہرحال میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد مجھے ایک عدد سخت لوہے کا زنگ آلود تار ملا جسے میں نے توڑ موڑ کر چابی کی شکل دی اور سامنے والے دروازے پر طبع آزمائی کرنے لگا مگر پندرہ منٹ کی کوشش کے باوجود تالا ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کاش کہ میرے ساتھ رئیس ہوتا تو وہ سیکنڈوں میں کھول لیتا' اس کی ہاتھ کی صفائی میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ تھک ہار کر میں نے تار واپس نکالنا چاہا تو تالے میں ہی پھنس گیا۔ میں نے اسے نکالنے کی کوشش کی۔ تار ایک جھٹکے سے نکلا اور ساتھ ہی کلک کی آواز آئی۔ مجھے شادیِ مرگ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تالا کھل گیا تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔

اندر تاریکی اور ایسی بُو تھی جو کئی مہینوں سے بند گھروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ میں مختلف کمروں سے گزرتا بیڈ روم تک آیا۔ اس کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ شائستہ نے اس کمرے میں ہی رب نواز کے خلاف جمع کیے جانے والے ثبوت چھپا رکھے تھے۔ میں احتیاط سے اندر داخل ہوا۔ اگرچہ شائستہ نے یقین دلایا تھا کہ اس کمرے میں کوئی ٹیپ نہیں ہے مگر میں اس کی بات پر اعتبار کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بھی غیر مقفل تھا۔ میں نے وہ الماری کھولی جس کے نچلے خانے میں ایک تختے کے عقب میں ثبوت پوشیدہ تھے۔ چور خانہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر سے ایک چھوٹا سا چرمی بیگ نکلا جو تین طرف زپ سے بند تھا۔ میں نے بستر پر رکھ کر اس کی زپ کھولی اندر سے ایک موٹا سا لفافہ نکلا جس میں بے شمار تصویریں تھیں۔ میں نے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تصویروں میں رب نواز اور دوسرے لوگ نظر آرہے تھے۔ ہر تصویر کی پشت پر نظر آنے والوں کے نام لکھے تھے۔ یہ زیادہ تر ہندوانہ نام تھے۔ ایک چونکا دینے والی شے' نمبر تھے۔ ہر تصویر کی پشت پر نمبر لکھا تھا۔ بعض اوقات ایک ہی نمبر کئی تصویروں کی پشت پر نظر آیا تھا۔ دوسری شے ربر بینڈ سے بندھی ہوئی کئی عدد آڈیو کیسٹس تھیں۔ ان پر نمبر دیکھ کر نمبروں کا معما میری سمجھ میں آگیا۔ شائستہ نے کسی طرح رب نواز کی بھارتی جاسوسوں کے ساتھ میٹنگ کی تصویریں لی تھیں اور ان کی باتیں ریکارڈ کی تھیں۔ یہ مواد واقعی رب نواز کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ تصویروں میں رب نواز کے خاندان کے کچھ اور افراد' اس کے بیٹے اور بھائی بھی نظر آرہے تھے۔ گویا یہ پورا خاندان ہی وطن فروشی کے اس کاروبار میں رب نواز کے ساتھ شریک تھا۔ میں نے تصویریں اور کیسٹس پھر سے بیگ میں ڈالیں اور جانے کے لیے کھڑا ہوا ہی تھا کہ دروازے پر ایک چھوٹے قد کے شخص کو بڑا سا ریوالور لیے کھڑا دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ وہ اتنی خاموشی سے آیا تھا کہ مجھے اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ریوالور پر لگے سائلنسر کی وجہ سے اس کی لمبائی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور اس شخص کے ننھے سے ہاتھ میں وہ کوئی چھوٹی موٹی توپ لگ رہی تھی۔ اس کا قد بمشکل پانچ فٹ ہوگا۔ سر بھی جسم کی مناسبت سے چھوٹا تھا لیکن ناک خاصی بڑی تھی مگر اس کی خطرناکی میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ جتنی خاموشی سے آیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر

مضحکہ اڑاتی مسکراہٹ بتارہی تھی کہ اسے خود پر پورا اعتماد ہے۔ وہ میری جسامت سے ذرا بھی خائف نظر نہیں آرہا تھا جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کے ہیبت ناک ریوالور کے سامنے میرے لمبے چوڑے وجود کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔" اس نے اپنی باریک مضحکہ خیز آواز میں کہا۔

"ایک ہی بات ہے تم کر دیا میں۔" میں نے خوش خلقی سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے خطرناک انداز میں ریوالور کو جنبش دی۔ میں رک گیا۔ وہ اسی قسم کا شخص لگتا تھا کہ مجھے اس طرح مسکراتے ہوئے گولی مار سکتا تھا اور گولی مار کر بھی مسکراتا رہتا۔

"عقل مند آدمی ہو۔ یہ بیگ واپس رکھ دو۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور بیگ بستر کے عقبی تختے اور دیوار کے درمیانی خلا میں پھینک دیا۔ اس بار اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے اس کے جثے سے کہیں بڑی گالی برآمد ہوئی "دیوار کی طرف منہ کر کے اور ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے دانت پیس کر حکم دیا۔ میں خاموشی سے مشرقی دیوار کی طرف بڑھا اور منہ اس کی طرف کر کے ہاتھ سر سے اوپر کر لیے۔ وہ محتاط اور دبے قدموں..... میری طرف آیا۔ اس کی بدقسمتی کہ کمرے کی لائٹ مغرب کی طرف لگی تھی اور اس کا سایہ صاف نظر آرہا تھا۔ جب اس نے نال سے ریوالور پکڑتے ہوئے اسے میرے سر پر مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا تو میں نے تیزی سے گھومتے ہوئے کہنی اس کے مختصر سے منہ پر ماری ضرب خاصی سخت تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ضرب لگائی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے ڈھیلے کی طرح اڑ گیا۔ اس کے منہ سے دوسری بڑی گالی نکلی۔ اس نے سنبھل کر میری کمر پر لات ماری' یہ مکمل مہارت کے ساتھ ماری گئی پیشہ ورانہ کک تھی۔ میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگر دونوں ہاتھ سامنے نہ کر لیتا تو میرا ناک نقشہ بگڑ جاتا۔ میں نے ہاتھوں کی قوت کو اسپرنگ کی طرح استعمال کیا لیکن اتنی دیر میں وہ اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ اس بار قالین نے میرا ناک نقشہ بگڑنے سے محفوظ رکھا۔ میں گرتے ہوئے اسے ریوالور اٹھاتے دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا اٹھنے کی عقل مندی سرزد نہیں ہوئی۔ میں اس طرح رول کرتا بستر کے دوسری طرف چلا گیا۔ اس کی چلائی دونوں گولیاں بستر میں لگیں۔ میں نے بستر کے عقب میں جاتے ہی اپنا برٹا نکال لیا۔ غالباً اس نے مجھے پستول نکالتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے فوراً الماری کی آڑ میں ہو گیا۔

میں نے احتیاطاً گولی چلا کر اس پر واضح کر دیا کہ میں نہتا نہیں ہوں۔ وہ مزید الماری کے عقب میں دبک گیا تھا۔ اس کی مختصر جسامت یہاں خوب کام آرہی تھی جبکہ بستر مجھے پوری طرح چھپانے سے قاصر تھا۔ میں پٹی سے پوری طرح چپکا ہوا تھا اس کے باوجود وہ ذرا سی کوشش کرتا تو مجھے نشانہ بنا سکتا تھا مگر اسے خود مارے جانے کا خطرہ تھا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک ہم میں اسی طرح سرد گرم جنگ چلتی رہی۔

"رب نواز کے کتے' بہت جلد تیرا ریوالور خالی ہو جائے گا۔" میں نے تاک کر گولی چلائی جو اس کے بازو کے پاس سے گزری تھی۔ اس نے گھبرا کر لگاتار دو گولیاں چلائی تھیں۔ اس کے پاس اب ایک ہی گولی رہ گئی تھی مگر اس کے پاس اور گولیاں ہونا لازمی تھیں اور عین ممکن تھا کہ وہ درمیان میں چیمبر بھی بھرتا جا رہا ہو۔ ریوالور کا یہی ایک فائدہ ہوتا ہے کہ اس میں آخری گولی ختم ہونے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ میرے پستول کے میگزین میں ابھی تین گولیاں باقی تھیں۔

"میں کسی رب نواز کو نہیں جانتا۔ میں اس جگہ کا چوکیدار ہوں۔"

"گویا تم ملکانی کے کتے ہو۔" میں نے اسے اشتعال دلایا مگر وہ بے حد سرد مزاج آدمی تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کس کا کتا ہوں۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا "تمہارے پاس اب تین گولیاں رہ گئی ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ جیسے ہی میں آخری گولی استعمال کرتا' وہ اطمینان سے آکر میرے سر میں سوراخ کر دیتا یا مجھے ہینڈز اپ کرا دیتا۔ میں بستر کے نیچے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے پیر کا ایک حصہ ایک لمحے کو سامنے آیا۔ پیروں کے معاملے میں وہ اتنا محتاط نہیں تھا۔ اس نے اپنے جسم کے اوپری حصے کو بچا رکھا تھا۔ میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے لگاتار دو فائر اس کے سامنے والے حصے کی طرف کیے اور پھر تیزی سے ہاتھ نیچے لا کر اس کے پیر والی سمت کا نشانہ لیا۔ جیسے ہی اس کا پیر سامنے آیا میں نے اللہ کا نام لے کر گولی چلا دی۔ اگر نشانہ خطا جاتا تو میری وفات میں کوئی شبہ نہ رہ جاتا مگر خوش قسمتی سے گولی اس کے ٹخنے پر لگی۔ وہ کراہ کر نیچے گرا۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے میگزین بدلا اور اس کا نشانہ لے کر کہا۔

"تم میرے نشانے پر ہو' ریوالور پھینک دو۔"

کچھ دیر بعد اس نے ریوالور پھینک دیا۔ میں احمقانہ

انداز میں اٹھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کے پاس کوئی اور ہتھیار بھی ہو سکتا ہے اور فوت ہوتے ہوتے بچا۔ اگر مجھے گرنے میں ایک سیکنڈ کے سویں حصے کی تاخیر ہو جاتی تو جو گولی میرا سر چھو کر گزری تھی وہ میرے سر میں ترازو ہو جاتی۔ گرتے ہی میں نے بستر کے نیچے سے اس کے نظر آنے والے جسم پر لگاتار کئی فائر کیے۔ ہر فائر پر اسے جھٹکا لگتا تھا۔ آخری فائر کے ساتھ ہی اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس بار میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جوابی کارروائی کے قابل نہیں رہا ہے تو میں بستر کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ کروٹ کے بل گرا ہوا تھا۔ اس کا کھلا منہ اور بے نور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ زندگی سے اس کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ میری آخری گولی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس کے پیٹ کے اوپری حصے سے داخل ہو کر دل میں اتر گئی تھی۔ اس کے خون سے قالین تر ہو رہا تھا۔ اتنی دھواں دھار فائرنگ کے باوجود آواز اس مکان سے باہر نہیں گئی تھی کیونکہ ہم دونوں کے ہتھیاروں پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے مارے جانے کا افسوس تھا۔ حالانکہ اس نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

بستر کے عقب سے بیگ نکال کر میں کمرے سے باہر آیا پھر ایک خیال کی وجہ سے پلٹا اور ایک کپڑا لے کر بیڈ روم میں ہر اس جگہ کو صاف کیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات لگے ہو سکتے تھے پھر میں نے احتیاطاً اس آدمی کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر اس کے پاس سے کوئی شناختی علامت نہیں نکلی تھی۔ میں جس راستے سے آیا تھا' اسی سے باہر نکل گیا۔ مجھے امید تھی کہ کسی نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔ کچھ دور پیدل چل کر مجھے مین روڈ سے ٹیکسی مل گئی تھی۔ اسے میں نے دفتر والے بنگلے سے کچھ فاصلے پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ میں نے پاس ہی ایک ہوٹل سے کھانا پیک کروایا۔ کیونکہ چندا اور شائستہ بھوکی بیٹھی ہوں گی۔

ہال میں قدم رکھتے ہی مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ وہاں غیر فطری سی خاموشی طاری تھی۔ میں نے چندا کو آواز دی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں تیزی سے بیڈ روم کی طرف آیا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا اور چندا سامنے بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ میں بیگ پھینک کر اس کی طرف لپکا۔ اس کے سر پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کی نبض ذرا سست لیکن متوازن تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ خطرے میں نہیں تھی۔ دس منٹ کی کوششوں کے بعد میں اسے ہوش میں لے آیا۔ اس کے حواس بحال کرنے کے لیے میں نے اسے تیز سیاہ کافی پلائی۔

"ناصر۔۔۔ وہ۔۔۔"

"بات مت کرو۔" میں نے اس کے گال تھپکے۔ تلاشی کے بعد مجھے میڈیکل بکس سے درد کش دوائیں مل گئیں۔ میں نے اکٹھے کئی گولیاں چندا کو کھلا دیں۔ اسے آرام کرنے کا کہہ کر میں نے دفتر کی پوری عمارت چھان لی۔ شائستہ غائب تھی۔ میں نے باہر والے گیٹ کو بند کیا۔ میں پلٹ رہا تھا کہ رئیس آگیا۔ اس نے لانسر کا ہارن بجایا۔ میں نے گیٹ کھول کر اسے اندر بلا لیا اور اسے شائستہ کے فرار کے بارے میں بتایا۔

"بہت برا ہوا۔ وہ حرام زادی ہمارا ٹھکانا بھی دیکھ گئی ہے۔ اب یہاں سے بھی جانا پڑے گا۔" رئیس فکر مند ہو گیا "چندا کیسی ہے؟"

"سر پر چوٹ آئی تھی لیکن اب ہوش میں ہے۔"

پین کلر لے کر چندا کی حالت خاصی سدھر گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ شائستہ نے بے خبری میں پیپر ویٹ سے اس کے سر پر حملہ کیا تھا۔ وہ چکرا کر گری تو شائستہ نے دوسری ضرب لگائی تھی اور چندا بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کتنی دیر کی بات ہے؟"

"تین بجے کے فوراً بعد کی۔" چندا نے جواب دیا۔ "کیونکہ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی گھڑی دیکھی تھی۔"

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ گویا شائستہ کے پاس نکل جانے کا خاصا وقت تھا۔ رئیس نے تجویز پیش کی کہ ہمیں واپس نیلم ہاؤس چلنا چاہیے لیکن میں نے یہ تجویز مسترد کر دی کہ ان حالات میں نیلم ہاؤس میں جانا نیلم کو بھی خطرے میں جھونکنے کے مترادف ہے۔ جبکہ اس کی سلامتی سے روانگی کا وقت قریب ہے۔ موج دین جیسے خطرے کی وجہ سے نیلم اور رئیس کا بہرصورت یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے رئیس سے کہا "تو لانسر چھوڑ جا۔ میں اور چندا کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔ بلکہ چندا اسپتال واپس جائے گی۔"

"ہرگز نہیں' اب میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ خلاف توقع رئیس نے بھی اس کی حمایت کی "ناصر تیرے ساتھ کسی کا رہنا ضروری ہے۔ اگر نیلم کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تیرے ساتھ ہوتا مگر چندا

بہتر رہے گی۔"

"اس پر بعد میں سوچیں گے۔" میں نے کہا "فی الوقت تو یہاں سے نکلو۔ اس سے پہلے کوئی آجائے۔"

پھر کوئی تو البتہ نہیں میرے موبائل پر کال آگئی۔

"خیریت سے ہو؟" شائستہ نے کہا۔

"کیا اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"مجھے شرمندہ کرنے کی فضول کوشش مت کرو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں نے صرف اس لیے فون کیا کہ تم اگر اس جگہ سے میری وجہ سے جارہے ہو تو اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

"مسز رب نواز مجھے اتنا احمق مت سمجھو۔ میں اس جگہ سے پہلے ہی نکل چکا ہوں۔ بائے دی وے تم نے اس نمے سے محافظ کی لاش دیکھ لی ہے۔"

"مجھے اس کا افسوس ہے لیکن وہ ثبوت میں پہلے ہی تمہارے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ شاہ عالم تم جتنی جلدی رب نواز کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکو' ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔ چندا کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا مجھے افسوس ہے وہ ایک نادان لڑکی ہے۔ میری طرف سے اس سے معذرت کرلینا۔"

"اب تم کہاں ہو؟"

"ایک محفوظ جگہ پر جہاں رب نواز کا خیال بھی نہیں آسکتا ہے۔" اس نے جواب دے کر فون بند کردیا۔

"اب نکل چلو۔" میں نے کہا۔ ہم نے دروازے بند کیے تالے لگائے۔ چابیاں رئیس کے حوالے کیں۔ وہ پیدل چلا گیا۔ میں اور چندا لانسر میں نکلے۔ راستے میں چندا نے فون کرکے کمال کو اپنے بارے میں بتایا تاکہ وہ اس کے لیے پریشان نہ ہو پھر نیلم کا فون آگیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں بالکل سکون سے دفتر میں بیٹھا ہوں۔ اسے کل سے ہونے والے ہنگاموں کا قطعی علم نہیں تھا۔ شکر ہے لانسر ائرکنڈیشنڈ کار تھی۔ ورنہ نیلم ٹریفک کا بے ہنگم شور سن لیتی۔ میں نے نیلم سے بات کرکے لانسر مال روڈ کے ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے روکی۔

"مادام شاپنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے چندا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ نیلم نے دو لاکھ روپے دیئے تھے۔ ان سے میں نے اور چندا نے دل کھول کر شاپنگ کی۔ میں نے کئی سوٹ لیے اور چندا نے فیشن کے شعبے میں دل کھول کر خریداری کی پھر اس نے وہیں ایک بیوٹی پارلر سے بال بنوائے۔ میں نے اس پارلر کے مردانہ حصے میں بال کٹوائے اور داڑھی کو ترشوایا۔ اس طرح کہ میرا چہرہ پہلے سے مختلف نظر آئے۔ حمام میں نہا کر میں نے ایک سوٹ پہنا۔ جب چندا تیار ہو کر آئی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ویسے تو وہ خدا کی صناعی کا شاہکار تھی لیکن آرائشِ گیسو اور ہلکے سے میک اپ نے اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا۔ اس نے سیاہ بارڈر کی کامدانی کی ساڑی باندھی تھی۔ جس میں اس کا تراشا ہوا بدن نرمی اور نزاکت سے اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وہ شرمائی۔

"ایسے کیوں گھور رہے ہو؟"

"افسوس کہ فی الوقت صرف گھور ہی سکتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی پتلی سی کمر میں ہاتھ ڈالا "چلیں بیگم۔"

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ جلدی سے مجھ سے الگ ہوگئی۔

ہم نے سارا سامان دو سوٹ کیسوں میں پیک کرایا۔ باہر جاتے ہوئے الیکٹرانکس کے شعبے میں میری نظر ایک چھوٹے سے جدید قسم کے ٹیپ ریکارڈر پر پڑی۔ مجھے آڈیو کیسٹس کا خیال آیا۔ میں نے اسے خرید لیا۔ چندا نے حیرت سے کہا۔

"اس کا کیا کرو گے؟"

"گانے سنیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

مال روڈ پر ہی واقع ایک اچھے درجے کے ہوٹل میں ہم نے ڈبل بیڈ کا روم کرائے پر لیا۔ سامان وغیرہ کمرے میں رکھ کر ہم نے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔ چندا کے سنگ یہ لمحات بے حد خوشگوار تھے۔ ہم بھول گئے تھے کہ کچھ دیر پہلے ہم کتنی خطرناک صورتِ حال سے گزرے تھے۔ چندا کے سر کے عقبی حصے میں گومڑ نمایاں تھا اور میں ایک خونی مقابلے کے بعد شائستہ کے بچھائے جال سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ چندا آج صرف میرے لیے تھی۔ وہ میری باتوں پر ہنس رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ لجا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی قوسِ قزح بکھری ہوئی تھی۔ بادل ناخواستہ گیارہ بجے ہم لوگ واپس کمرے میں آئے۔ تھکن کے باوجود ہم خوش تھے۔ چندا نے سوٹ کیس سے کپڑے نکالے اور باتھ روم چلی گئی۔ میں نے کوٹ اتار کر کرسی پر ڈالا۔ جوتے موزے اتارے۔ بستر پر بیٹھ کر میں نے ٹیپ کا تار پلگ میں لگایا اور اس کے فنکشن دیکھنے لگا۔ یہ جدید قسم کا ڈیجیٹل آڈیو پلیئر تھا۔ میں نے بیگ سے کیسٹوں کا بنڈل نکالا اور ایک کیسٹ لگا کر دیکھی فوراً ہی کمرے میں رب نواز کی منحوس آواز گونجنے لگی تھی۔ چندا نے بھی یہ آواز سن لی تھی' وہ تیزی سے باہر آگئی۔ اس نے ساڑی اتار کر ڈھیلا سا کرتہ شلوار پہن لیا تھا۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا لیا تھا۔

"یہ رب نواز کی آواز ہے ناں؟"

"ہاں۔ یہ اسی شیطان کی آواز ہے۔" میں نے سر ہلایا "اس تحفے کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ اگر تم کوشش نہ کرتیں تو وہ عورت نہ جانے کب تک مجھے ٹالتی رہتی۔"

"وہ کس طرح ٹال رہی تھی میں بھی جانتی ہوں۔" چندا نے طنزیہ لہجے میں کہا اور پھر ٹیپ سننے لگی۔ رب نواز کسی کرم چند سے بات کررہا تھا اور ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ تخریب کاری کے کسی منصوبے پر بحث کررہے تھے۔ منصوبہ بس میں بم دھماکے کا تھا۔ اختلاف رقم پر تھا۔ رب نواز آدمی اور سہولت فراہم کرنے کے لیے دس لاکھ روپے مانگ رہا تھا اور کرم چند اسے پانچ لاکھ دینا چاہتا تھا بالآخر معاملہ آٹھ لاکھ میں طے ہوگیا۔ ایک مسافروں سے بھری بس میں بم دھماکے کا سودا آٹھ لاکھ میں طے پاگیا تھا۔ چالیس پچاس لوگوں کی زندگیوں کو کتنا سستا بیچ دیا تھا۔ رب نواز نے۔ میں اور چندا گم صم سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ ایسے کل چار کیسٹ تھے جنہیں ہم صبح چار بجے تک سنتے رہے اس دوران میں چندا نے اس گفتگو کے مختصر نوٹس بنائے۔ نیند بھگانے کے لیے ہم بار بار کافی منگواتے رہے۔ صبح چار بجے تک ہم نے جو سنا اس کے مطابق رب نواز کا وہ مکروہ چہرہ سامنے آیا جو اب تک ہم لوگوں سے پوشیدہ تھا۔ آخری کیسٹ میں رب نواز شرماجی سے بات کررہا تھا۔ یہ بھارتی سائنس داں اس سے ہاشم رضا کے کام کا سودا کرنے آیا تھا۔ رب نواز کی بدقسمتی کہ ہاشم رضا اس کی دسترس سے باہر تھا اور اس کے بغیر یہ پروجیکٹ بیکار تھا۔ شرماجی رب نواز سے ہاشم رضا کا مطالبہ کررہا تھا اور وہ اسے ٹال رہا تھا۔ گفتگو کے دوران سرخ حویلی کا کئی بار حوالہ آیا۔ رب نواز کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ نئے حیوانی بچوں کے لیے تجربات اسی حویلی میں جاری تھے لیکن اس کی باتوں سے حویلی کے محلِ وقوع پر کوئی روشنی نہیں پڑی تھی۔ گفتگو کے آخر میں شرماجی نے واضح کیا کہ اس کے اوپر والے اب مزید انتظار نہیں کریں گے۔

"مجھے حیرت ہے کہ اس شخص کے پاس کس قدر دولت ہے۔ اس کے باوجود یہ ملک سے غداری کررہا ہے صرف پیسے کے لیے۔" چندا حیران تھی۔

"ملک سے غداری یہ پیسے والے ہی کرتے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "غریبوں کو اس نیک کام کی توفیق کم ہی ہوتی ہے۔"

"شرماجی اور رب نواز کسی سرخ حویلی کا ذکر کررہے ہیں۔ یہ کہاں ہوسکتی ہے؟"

"امکان تو یہی ہے کہ رب نواز خاندان کی زمینوں پر یہ حویلی ہوگی مگر لاہور میں بھی ہوسکتی ہے۔ لاہور میں اب تک بے شمار پرانی طرز کی حویلیاں موجود ہیں۔"

"اف میرا سر پھر دکھنے لگا ہے۔" چندا نے جماہی لے کر کہا۔

"بہتر ہوگا تم گولیاں لے کر سو جاؤ۔"

چندا اپنے بستر پر چلی گئی۔ میں نے سارا سامان سمیٹ کر رکھا اور خود بھی روشنی بجھا کر سو گیا۔ گیارہ بجے آنکھ کھلی تو چندا بدستور سو رہی تھی۔ میرا سر بوجھل تھا۔ گرم پانی سے غسل کرکے طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی۔ سوتے وقت میں نے موبائل چارج پر لگا کر اسے آف کردیا تھا۔ اسے آن ہی کیا تھا کہ گھنٹی بجی۔ دوسری طرف نیلم تھی۔ اس نے برہمی سے کہا۔

"کہاں تھے تم۔ اتنی دیر سے رنگ کررہی تھی؟"

"موبائل چارج پر لگا کر سو رہا تھا۔ ابھی جاگا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے پاسپورٹ پر بھی ویزا لگ کر آگیا تھا اور ٹکٹ بھی اوکے ہوگیا ہے۔ کل رات دس بجے روانگی ہے۔"

"میں براہِ راست ائرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "لیکن بہتر ہوگا کہ جہاز میں سوار ہونے تک ہم الگ الگ رہیں۔ کوئی خاص واقعہ تو پیش نہیں آیا۔"

"نہیں اس لڑکی کے ہنگامے کے بعد سکون ہے۔ اس لڑکی کو سنا ہے کہ اسلام آباد کے کسی سائنسی تحقیق کے ادارے نے حاصل کرلیا ہے۔ اب وہ اسپتال میں نہیں ہے۔ اسے ہوش آگیا تھا اور اس نے وہاں بھی ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کی تھی۔ کھانا کھالیا تم نے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"نہیں کھانے جارہا ہوں۔ پاس ہی ہوٹل ہے۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہوٹل جانے کی۔ میں رئیس کے ہاتھ بھجوا رہی ہوں۔"

"رئیس کہاں ہے اسے بلاؤ۔" میں نے کہا چند لمحے بعد رئیس لائن پر تھا۔ میں نے اسے اپنے اصل محلِ وقوع سے آگاہ کیا۔

"اب میں یہ کھانا کہاں لے جاؤں گا۔ نیلم نے پورا ٹوکرا بھر دیا ہے۔"

"لے آ یار، سب کھالیں گے۔ ناشتا نہیں کیا ہے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" میں ہنسا۔

فون بند کیا تو چندا جاگ رہی تھی۔ نیم غنودگی میں آڑی ترچھی لیٹی۔ کہیں سے ڈوب رہی تھی کہیں سے ابھر رہی تھی۔ ایسا دلکش مجسمہ لگ رہی تھی جسے صرف کائنات کا صناع ہی تراش سکتا تھا۔ میری نظریں محسوس کرکے وہ جلدی سے اٹھ گئی "منہ ہاتھ دھولو۔ رئیس زبردست قسم کا لنچ لے کر آرہا ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

اس نے بکھرے بال سمیٹے۔ دوپٹہ درست کیا "نیلم سے بات ہورہی تھی۔ یہ ائرپورٹ کا کیا ذکر ہے۔"

میں نے اسے نیلم کے ارادے سے آگاہ کیا "اس نے کل کی سیٹیں بک کرائی ہیں لیکن میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں کوئی چکر چلا دوں گا۔"

"ہو ناں چرب باز۔" وہ ہنسی "یاد ہے جب خان جی باہر جانے کی اجازت دینے سے انکار کرتے تھے تو تم کوئی نہ کوئی چکر چلا کر اجازت لے لیا کرتے تھے۔"

"ہاں۔ بہانہ ہوتا تھا تمہاری سہیلی۔ کہ یہاں سے نوٹس لینے کا اور ہم پہنچ جاتے تھے شالامار یا مقبرہ جہانگیر۔"

خان جی کے ذکر پر چندا اداس ہوگئی "ناصر تمہیں یاد ہے خان جی کی برسی کا دن۔۔۔ کل ہی ہے۔"

"نہیں۔" میں نے شرمندگی سے کہا "مجھے یاد نہیں رہا تھا۔"

"تمہیں تو اور بھی بہت کچھ یاد نہیں رہا۔ کل ہم خان جی کے ایصالِ ثواب کے لیے غریبوں کو کھانا کھلائیں گے۔ داتا دربار جاکر۔"

"جیسا تم کہو۔" میں نے کہا۔

"اور ناصر، خان جی کی قبر پر بھی چلیں گے۔ میں دو مہینے پہلے گئی تھی۔ ان کی قبر کے سرہانے ان کے نام کا کتبہ لکھوانے کا کہہ کر آئی تھی۔ خان جی کو پسند نہیں تھا کہ ان کی قبر کے سرہانے کوئی کتبہ لگے۔ انہوں نے سادہ قبر کی وصیت کی تھی مگر میں ان کی قبر پر نشانی چاہتی ہوں۔ ممکن ہے ہماری آنے والی نسلیں قبرستان جائیں تو انہیں خان جی کا نام نظر آجائے۔"

"خان جی کا نام ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہم اپنے بچوں کے۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔ وہ شرما گئی تھی "سوری روانی میں منہ سے نکل گیا۔"

"میں نے برا نہیں منایا۔" اس نے دوسری طرف دیکھا۔

دروازے پر دستک ہوئی "کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رئیس۔" رئیس بولا "تمہارا باپ!"

"ان کو گزرے خاصا عرصہ ہوچکا ہے۔" میں نے دروازہ کھولا۔ رئیس بڑی سی باسکٹ لیے کھڑا تھا۔

"منحوس آدمی مروا دیا۔ ہوٹل میں بیٹھا ہے اور مجھے یہ ایک من کی ٹوکری لانا پڑی..... تیری وجہ سے۔" اس نے ٹوکری لاکر میز پر رکھ دی "نیلم نے برتن تک رکھ دیئے ہیں۔"

چندا ہنستی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ جب تک وہ منہ ہاتھ دھوکر آئی۔ میں اور رئیس کھانا لگا چکے تھے۔ اس کے آتے ہی ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کوفتوں کے سالن کے علاوہ چکن پلاؤ تھا۔ آلو بھرے پراٹھے تھے۔ ماش کی دال کا حلوا تھا اور ربڑی تھی۔ کھانے کے بعد چندا نے چائے کا آرڈر دیا اور میں رئیس کو رب نواز کے کرتوتوں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے اسے آڈیو کے کچھ حصے بھی سنوائے۔ وہ حیران ہوا تھا۔

"یہ رب نواز تو شیطان کا نوازا ہوا لگتا ہے۔"

"رئیس۔ تو معلوم کر کہ یہ کس سرخ حویلی کا ذکر ہو رہا ہے۔"

"رب نواز کا خاندان قصور کے پاس ہی آباد ہے۔ ان کے گاؤں سے بھارتی سرحد کچھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ممکن ہے یہ سرخ حویلی وہیں کہیں ہو۔"

رئیس کی بات سن کر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ رب نواز خاندان سرحد کے پاس آباد تھا۔ ان کے اسمگلروں سے تعلقات ہوں گے۔ اس طرح تخریب کاری کے لیے

بھارتی سرحد عبور کرکے آنے والے انڈین ایجنٹس بھی سب سے پہلے انہی کے پاس پناہ لیتے ہوں گے۔ لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ سرخ حویلی اس طرف کہیں ہو۔ وہاں رب نواز قانون اور معاشرے کی نظروں سے دور اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہوگا۔

"ممکن ہے۔ لاہور جیسے بھرے پُرے شہر میں یہ کام ذرا مشکل ثابت ہوسکتا ہے۔ رب نواز کی دیہی حویلی اس کام کے لیے زیادہ موزوں رہی ہوگی۔ وہاں سب اس کے بھروسے کے لوگ ہوں گے۔ علاقے کے لوگوں کے اس طرف جانے پر پابندی بھی ہوسکتی ہے۔۔۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے حویلی کو آسیب زدہ مشہور کر رکھا ہو۔" میں نے کہا پھر مجھے وہ نوجوان عمر صدیقی یاد آگیا "یار شائستہ نے مجھے ایک نوجوان کے بارے میں بتایا تھا، اس کا نام عمر صدیقی ہے اور وہ گلبرگ میں کہیں رہتا ہے۔ یہ نوجوان ہاشم رضا کے تجربوں میں اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ اگر کسی طرح اس کا پتا چل جائے تو ہم سرخ حویلی تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"یہ کام ذرا مشکل ہے۔ گلبرگ بہت بڑی آبادی ہے محض نام سے کسی کو تلاش نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

"مشکل ہے ناممکن نہیں۔ خیر چھوڑ اسے۔ چل کر آج کا اخبار لاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اس بونے شخص کی لاش دریافت کرلی گئی ہوگی اور اب پولیس قاتل کی تلاش میں ہوگی۔ ممکن ہے ہمیں اس حوالے سے کوئی مدد ملے۔"

چائے پی کر ہم نیچے آئے۔ ہوٹل سے خاصے فاصلے پر نیوز اسٹینڈ تھا۔ میں اور رئیس باتیں کرتے جارہے تھے۔ ہم نے صبح کے دو تین اخبار دیکھے۔ سب میں ہی گلبرگ میں پائی جانے والی لاش کی خبر تھی۔ قاتل کے ساتھ مقتول بھی نامعلوم تھا۔ صرف ایک اخبار نے ذرا گہرائی میں جاکر رپورٹ دی تھی اور مقتول جس جگہ پایا گیا تھا اس کی نشان دہی کی تھی۔ مکان کے اردگرد رہنے والوں میں سے کسی نے قاتل کو آتے یا جاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ مقتول سے واقف تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ آیا کیسے۔ اسے کس طرح معلوم ہوا کہ میں مکان میں اور اس بیڈ روم میں داخل ہوگیا ہوں۔ شاید مکان میں کوئی الارم لگا تھا۔ میری کسی حرکت سے الارم کا سرکٹ بریک ہوگیا اور وہاں پر الارم بج اٹھا جہاں وہ مختصر الوجود آدمی رہتا تھا۔ آج کل وائرلیس اور مختصر الیکٹرانکس کا دور ہے۔ ایسے الارم عام مل جاتے ہیں جن کا سرکٹ تار پر نہیں بلکہ ریڈیائی طریقے سے کام کرتا ہے۔ میں نے مکان میں قدم رکھا اور اس کو علم ہوگیا تھا۔ اس کے آنے میں کوئی پندرہ منٹ لگے تھے گویا وہ اس مکان سے دس منٹ کی مسافت پر کہیں موجود تھا۔ اس کا امکان تھا کہ وہ بلاک بھر کے فاصلے پر رہتا ہو۔ گویا اب اس کا ٹھکانا تلاش کرنا ناممکن نہیں تھا۔ ممکن ہے وہاں سے شائستہ یا رب نواز کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ میں نے اپنے خیالات سے رئیس کو آگاہ کیا تو وہ اچھل پڑا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ واقعی کہیں آس پاس سے آیا ہوگا بلکہ اب میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ شائستہ اور وہ نوجوان عمر صدیقی بھی اس کے آس پاس ہی کہیں رہتے ہوں گے۔"

اس سے پہلے میں رئیس کی بات کا جواب دیتا میری نظر ایک فیشن ایبل قسم کے کاسمیٹکس اسٹور کے سامنے رکنے والی سرمئی رنگ کی مرسیڈیز پر پڑی اس سے اترنے والی ہستی کو دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا، وہ شائستہ تھی۔ اس نے نفاست سے سلکی ساڑی باندھ رکھی تھی جو اس کے بدن پر سرسرا رہی تھی۔ تناسب سے سلے بلاؤز میں وہ بے حد ہیجان خیز لگ رہی تھی۔ اس کی چال میں شاخِ گل کی سی لچک تھی۔ وہ اسٹور کی طرف بڑھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوجوان تھا۔ خوش پوش اور خوب رو۔ میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا غالباً وہ عمر صدیقی تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو وہی حرام زادی ہے" رئیس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

میری نظر اسی پر مرکوز تھی۔ خاص انداز سے باندھی گئی ساڑی میں اس کا بدن شاخِ گل کی طرح لچک رہا تھا۔ نوجوان تابعدار خادم کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ شاپنگ سینٹر کے ریوالونگ ڈور سے اندر چلے گئے۔ اگر یہ شائستہ ہی تھی تو اس کی دیدہ دلیری قابلِ تعریف تھی۔ رب نواز کے کتے اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ اب مجھے بھی اس کی تلاش تھی اور وہ اتنی بے فکری سے گھوم رہی تھی۔ اسے اندر گئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک کھلی جیپ وہاں آکر رکی اور اس میں سے دھادھم چار مشٹنڈے کودے، ایک نے چلا کر کہا۔

"گاڑی کھڑی ہے، وہ اندر ہیں۔"

میری چھٹی حس نے فرمایا کہ یہ رب نواز کے دوپایہ کتے ہیں... جو شائستہ کی بو پر یہاں تشریف لائے تھے اور اب اس کی جان خطرے میں تھی۔ میں نے رئیس سے کہا "یہ رب نواز کے آدمی ہیں۔ شائستہ کو یا اس کی جان لینے آئے ہیں۔"

"وہ اسی قابل ہے" رئیس خفا تھا "حرافہ نے چندا کا سر تقریباً پھاڑ ہی دیا تھا۔"

"نہیں یار! اس نے ہماری مدد بھی کی ہے۔ ہم اسے یوں بے یار ومددگار رب نواز کا شکار بننے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔"

"ہم کیا کرسکتے ہیں؟" رئیس بولا "میرے تیرے پاس چاقو بھی نہیں ہے اور انہیں دیکھ۔"

میں نے دیکھا کہ چاروں نے جیپ کے اندر سے اسلحہ نکال لیا تھا۔ ایک کے پاس چھوٹی نال والی کلاشنکوف تھی۔ ایک کے پاس چائنا گن تھی اور دو کے پاس مقامی ساختہ شاٹ گنیں تھیں۔ وہ چاروں شاپنگ سینٹر کے دروازے کی طرف لپکے۔ مسلح لوگوں کو آتے دیکھ کر پبلک میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ جس کا منہ جس طرف اٹھا' وہ بھاگ نکلا' جب سے اسلحے کی فراوانی ہوئی تھی۔ اس قسم کے مناظر عام دیکھنے میں آتے تھے۔ مسلح گروہوں کے تصادم میں عوام کے مارے جانے کے واقعات ہوتے تھے لہٰذا اسلحہ کی جھلک دیکھتے ہی اب لوگ جان بچانے کی فکر کیا کرتے تھے۔

"رئیس تو الگ ہوجا۔ بلکہ اندر جاکر رائفل لے آ' گاڑی پیچھے کھڑی ہے۔ مگر سامنے مت آنا۔" میں نے رئیس سے کہا اور اس سے پہلے وہ مجھے روکتا' میں سڑک کراس کررہا تھا۔ دو گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے ذاتی مہارت سے کام لے کر مجھے بچایا تھا اور ایک وین کے نیچے آنے سے میں صرف اسی وجہ سے بچ گیا تھا کہ ابھی میری قضا نہیں آئی تھی۔ جیپ کے ڈرائیور کی ساری توجہ شاپنگ سینٹر کے دروازے کی طرف تھی۔ لہٰذا جب میں اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا تو اسے خاصی تاخیر سے علم ہوا اور جب علم ہوا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں رہا تھا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن پر لگا۔ وہ کراہ کر جھکا اور دوسرا ہاتھ کھا کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر انٹاغفیل ہوگیا تھا۔ میں نے جیپ کی چابی نکالی اور دوسری طرف کود گیا۔ مال غنیمت میں ڈرائیور کی جیب سے ایک پسٹل بھی ملا تھا۔ مال روڈ اس وقت کھوا سے کھوا چھلنے کا منظر پیش کررہی ہوتی ہے لیکن اسلحہ برداروں کو دیکھتے ہی سب غائب ہوگئے تھے حتیٰ کہ دکانوں اور شاپنگ سینٹروں کے سامنے جو گارڈز یا پولیس والے نظر آتے تھے' وہ بھی غائب تھے۔ اس لیے کسی نے مجھے ڈرائیور کو بے ہوش کرکے اور اس کی جیب سے پستول نکالتے نہیں دیکھا۔ شاپنگ سینٹر سے لوگ نکل کر بدحواسی میں فرار ہورہے تھے۔

میں کسی عام سے گاہک کی طرح شاپنگ سینٹر میں داخل ہوا تھا۔ اندر پہلا حصہ تقریباً خالی تھا۔ اچانک ہی اندر سے ایک برسٹ چلنے کے ساتھ چیختے چلاتے لوگوں کا ایک نیا ریلا نمودار ہوا تھا۔ اندر گڑبڑ شروع ہوگئی تھی۔ مجھے لگا کہ رب نواز کے آدمیوں نے شائستہ یا اس کے ساتھی لڑکے کو شوٹ کردیا تھا۔ میں نے پسٹل جیب سے نکال لیا اور سامان کے ریکس کی آڑ میں اندر کی طرف جانے لگا۔ ایک ریک کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے پیچھے سے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا' میں تیزی سے گھوما۔ جہاں دو ریک مل رہے تھے' ان کے درمیان مختصر سی جگہ میں ایک خوبصورت لڑکی چھپی بیٹھی تھی۔ مارے دہشت کے اس کا برا حال تھا اور جب میں نے پسٹل اس کی طرف کیا تو وہ بے ہوش ہوگئی۔

اچانک ہی وہ سامنے کی طرف سے نمودار ہوا تھا۔ یہ ان چاروں میں سے ایک تھا۔ اس کے پاس شاٹ گن تھی۔ مجھے پہلے تو وہ عام سا گاہک سمجھا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل اسے خاصی تاخیر سے نظر آیا تھا' جب تک میں گولی چلا چکا تھا۔ گولی اس کے داہنے بازو پر لگی۔ اس نے دل خراش چیخ ماری اور شاٹ گن غالباً رضاکارانہ طور پر میری طرف پھینک دی۔ بہ طور شکریہ میں نے پسٹل کے دستے سے اس کا سر بجاکر اسے اذیت سے نجات دلادی۔ گولی نے اس کے بازو کی ہڈی توڑدی تھی۔

اندر سے کسی عورت کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔

میں تیزی سے اس طرف لپکا۔ پسٹل میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ محدود فاصلے کے لیے شاٹ گن سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ گولی چلنے اور اپنے ساتھی کے چلانے کی آواز ان لوگوں نے بھی سن لی تھی اور وہ محتاط ہوگئے تھے۔ معاً ایک گولی جو غالباً کلاشنکوف سے چلائی گئی تھی' میری گردن کو چھوکر گزرگئی۔ میرے زمین پر گرتے ہی پورا برسٹ اوپر سے گزرا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ جب فائر کیا گیا تو کلاشنکوف سیمی آٹومیٹک تھی۔ فائر کرنے والا سامنے کاؤنٹر کے عقب میں چھپا تھا۔ میں نے شاٹ گن سے لگاتار دونوں راؤنڈ چلادیے اور اسے ری لوڈ کیا۔ میں ریکس کی آڑ میں تھا۔ گولیوں کے جواب میں دوبارہ برسٹ آیا۔ اس بار مجھے اندازہ ہوگیا کہ فائر کرنے والا کاؤنٹر کے عقب میں کسی جگہ پر ہے میں نے اس کی طرف لگاتار پھر دو گولیاں چلائیں۔ اس بار خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ کلاشنکوف بردار نے چلا کر گالی دی۔

"سدو کیا ہوا؟" کسی نے چلا کر کہا مگر سدو شاید جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

کسی نے چائنا گن کا برسٹ مارا مگر میں محفوظ تھا۔

مارنے والے کو میری پوزیشن کا اندازہ نہیں تھا۔ میں جس طرف دبکا تھا' یہاں اوپر تلے گھی کے ڈبے رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے آڑ دے رکھی تھی۔ معاً کوئی میرے عقب میں آیا' میں نے تڑپ کر پلٹنا چاہا تھا کہ نرم وگداز وجود مجھ پر آگرا "یہ میں ہوں" شائستہ نے سرگوشی کی۔

"بہت بھاری ہو" میں کراہا "خدا کے لیے ایک طرف ہوجاؤ۔"

"اتنی جگہ کہاں ہے؟" وہ بہ مشکل ذرا سی ہٹی۔

"فائر کس پر ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"عمیر پر" اس نے کہا "لیکن اس کا پاؤں زخمی ہے۔ اصل نشانہ تو میں تھی۔"

"ابھی دو باقی ہیں" میں نے کہا "پسٹل چلانا جانتی ہو؟"

"دو نہیں ایک ـــ جس نے عمیر پر گولی چلائی تھی' اسے میں اپنے ہاتھ سے مار چکی ہوں۔ تم نے دیکھا تھا' میرا ننھا سا پستول۔ مگر وہ بھاگ دوڑ میں گر گیا۔"

"اسے بھی استعمال کرکے دیکھو" میں نے پسٹل اس کی طرف بڑھادیا۔ دشمن سپاہ کی تین چوتھائی نفری کام آگئی تھی۔ مگر فرد واحد بھی زیادہ خطرناک ہتھیار سے مسلح تھا اور اس کے بارے میں پتا بھی نہیں تھا کہ وہ تھا کہاں؟ عین ممکن تھا کہ وہ اب فرار کی فکر میں ہو۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ تاک میں بیٹھا ہو۔ آڑ سے نکلتے ہی میں مارا جاتا۔ مجھے زیادہ خطرہ پولیس سے تھا۔ فائرنگ کا آغاز ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا ہوچکا تھا۔ پولیس کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے آنا ہی تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔

"تم اکیلے رہ گئے ہو۔ پولیس آگئی تو چوہے کی طرح پکڑلیے جاؤگے۔"

"تم بھی نہیں بچوگے" اس نے جواباً کہا۔ مجھے اتنا اندازہ ہوگیا کہ وہ داخلی دروازے سے ذرا دور ریک کارنر کے پاس کہیں دبکا تھا۔

"چلو تصفیہ کرلیتے ہیں۔ میں تمہیں نکلنے کا موقع دیتا ہوں۔ تم مجھے جانے دو۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"پہلے تم جاؤ" وہ بولا۔

"مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ تم میرے سر میں سوراخ کرنے کے لیے بے چین ہوگے۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم جاؤگے تو میں تمہیں بلاوجہ قتل کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شائستہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اس جگہ سے نکلنے کا ایک اور راستہ بھی ہے جو شاپنگ سینٹر کے منیجر کے کمرے سے ہوکر گزرتا ہے۔ ہم وہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

موقع سے فائدہ اٹھاکر وہ مجھ پر ہی لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ساڑی میں ہونے کے باوجود اس نے اتنی بھاگ دوڑ کیسے کرلی اور اس کے بے حد چست بلاؤز میں پستول آیا کیسے لیکن فی الوقت مجھے یہاں سے نکلنے کی زیادہ فکر تھی۔ میں نے اس سے اتفاق کیا "تمہارا ساتھی کہاں ہے؟"

"اتفاق سے وہ ہنگامے سے فائدہ اٹھاکر منیجر کے کمرے میں گھس گیا تھا' وہیں ہوگا۔"

"اوکے ـــ لیکن پہلے تم تو مجھ پر سے ہٹو۔"

وہ خفیف سی ہوکر اٹھی بلکہ ذرا سرک گئی۔ اس وقت کھڑا ہونا فوت ہونے کے مترادف تھا۔ وہ زمین پر رینگتی ہوئی آگے جارہی تھی اور میں اس کے عقب میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ منیجر کا کمرا کہاں ہے۔ یہ مین کاؤنٹر کے عقب میں تھا۔ ہم مختصر سے راستے سے گزرے۔ ساڑی میں ہونے کے باوجود شائستہ تیزی سے سرک رہی تھی۔ پہلے وہی منیجر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جب میں اندر گھسا اور میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تو وہ زخمی نوجوان کو دیکھ رہی تھی گولی اس کی ران کو ادھیڑ گئی تھی۔ زخم گہرا تھا اور اب تک خون رس رہا تھا۔

"کیسے ہو تم؟" شائستہ نے جس بے قراری سے کہا تھا' اس سے مجھے ان دونوں کے تعلق کا کچھ کچھ اندازہ ہوا تھا۔ نوجوان شائستہ کو دیکھ کر بلاوجہ مسکرانے لگا۔

"تم چل سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کوشش کرسکتا ہوں۔ اگر کوئی سہارا دے" اس نے شائستہ کی طرف دیکھا۔

شائستہ نے فوراً اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کا وزن خاصا تھا۔ میں نے شائستہ سے اسے لے لیا۔ "باہر نکلنے کا راستہ دکھاؤ" میں نے شائستہ سے کہا۔ اس کی ساڑی کا پلو بازو پر لٹکا ہوا تھا۔ اسے بدحواسی میں احساس ہی نہیں تھا۔ وہ آگے بھاگنے کے انداز میں چلنے لگی۔ منیجر کے کمرے کا عقبی دروازہ ایک گیلری میں کھلتا تھا۔ گیلری ایک مختصر سے صحن میں کھل رہی تھی اور وہیں سے باہر جانے کا راستہ تھا۔ کچھ ملازم نما لوگ ڈرے سہمے وہاں موجود تھے۔ ہمیں مسلح دیکھ کر انہوں نے فوری طور پر راستہ چھوڑدیا۔ باہر عام سی گلی تھی۔ یہاں پر لوگوں نے اپنی کاریں پارک کررکھی تھیں۔ شاپنگ سینٹر کے سامنے والے حصے میں خاصا گھوم کر جانا پڑا۔ عمر زخمی ٹانگ کے ساتھ بہ مشکل باہر تک آیا تھا۔

عملاً اس کا سارا بوجھ میں نے ہی سنبھال رکھا تھا۔ اسے ایک کار سے نکال کر میں نے شائستہ سے کہا۔
"تم جاکر اپنی کار لے آؤ۔"
"میں۔" وہ ہچکچائی "تم لے آؤ۔"
"اوکے' لاؤ چابی دو۔"
اس نے اپنے مختصر سے ہینڈ بیگ سے چابی نکال کر مجھے دے دی۔ میں گھوم کر سامنے والی سڑک پر آیا۔ وہاں جیپ اور اس کا ڈرائیور موجود تھا۔ شاپنگ سینٹر میں بچ جانے والا واحد نمازی اگر اندر نہیں تھا تو فرار ہوگیا تھا۔ میں نے اطمینان سے مرسیڈیز کا دروازہ کھولا۔ اسے اسٹارٹ کیا اور گھوم کر عقبی گلی میں آگیا۔ شائستہ نے کار رکتے ہی دروازہ کھولا اور پہلے عمر کو اندر کیا اور پھر خود بھی کار میں گھس گئی۔
"بس اب نکل چلو" اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔
میں نے دوسری سڑک سے کار موڑلی۔ عین ممکن تھا کہ یہاں رب نواز کے اور کتے موجود ہوتے۔ کوشش کے باوجود میں رئیس کو تلاش نہیں کرسکا تھا۔ اس جگہ سے خاصی دور نکل کر اور یہ اطمینان کرکے کہ کوئی تعاقب میں نہیں ہے' میں نے شائستہ سے پوچھا "اب کہاں جانا ہے؟"
"ماڈل ٹاؤن۔ تم چلو' میں رہنمائی کرتی رہوں گی۔"
میں نے عقبی آئینے میں دیکھا "پہلے تم اپنی ساڑی درست کرلو" اس نے جھینپ کر جلدی درست کیا۔
"یہ رب نواز کے آدمی تھے؟" میں نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ سڑک فی الوقت تو صاف تھی "تمہارے پیچھے کیسے لگے؟"
"میں نہیں جانتی" وہ نروس ہورہی تھی۔ کتنی ہی دلیر سہی' تھی تو عورت۔ ایسا کشت وخون دیکھ کر اچھے خاصے مردوں کی حالت خراب ہوجاتی ہے۔ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔
"میرا اندازہ ہے کہ تم گاڑی کی وجہ سے ان کی نظروں میں آئیں؟"
"یہ... یہ کار مجھے رب نواز نے دی تھی۔ بعد میں' میں نے اسے کہا کہ میں نے کار دے کر اس کی جگہ ایک پجیرو لے لی تھی۔ کار میں نے نہیں بیچی تھی۔"
"اور اب تم اس پر گھومتی پھر رہی ہو" میں نے طنز کیا "تم نے رب نواز کو احمق سمجھا ہے؟"
"میں... میں سمجھی تھی کہ وہ پانچ سال پرانی اس بات کو بھول گیا ہوگا۔"
"رب نواز شیطان ہے' اسے سب یاد رہتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ تمہارا ٹھکانا بھی اس کی نظر میں ہوگا۔"
"نہیں" اس بار شائستہ کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "یہ اتفاقی واقعہ ہے لیکن رب نواز کو میرے موجودہ ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔"
"ممکن ہے جلد تمہاری خوش فہمی بھی دور ہوجائے" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل نے رنگ دی۔ رئیس تھا دوسری طرف۔ "ناصر' تو کہاں ہے۔ میں نے تجھے مرسیڈیز میں جاتے دیکھا تھا۔"
"میں شائستہ کے ساتھ ماڈل ٹاؤن جارہا ہوں۔ وہاں اس کی رہائش ہے۔"
"لعنت بھیج اس پر' چندا سخت خفا ہے۔"
"چندا کو میں منالوں گا" میں نے کہا "تو آدھے گھنٹے بعد مجھے رنگ کر۔"
فون بند کرکے میں نے شائستہ سے راستہ دریافت کیا۔
"بس پہنچ گئے۔ یہ اگلی گلی میں لے لو' دائیں طرف کا دوسرا بنگلا ہے۔"
یہ ہلکے نیلے رنگ کا بنگلا تھا جس کے گرد اونچی چاردیواری تھی۔ مین گیٹ پر باوردی گارڈ تھا۔ جس کے پاس جی ایس ایم تھی۔ اس نے غور سے کار کا معائنہ کیا مگر اس وقت تک گیٹ نہیں کھولا جب تک شائستہ نے کھڑکی سے اپنی صورت دکھا کر گیٹ کھولنے کا اشارہ نہیں کیا۔ میں نے کار لے جاکر پورچ میں روکی۔ شائستہ نے باہر نکل کر نوکروں کو آواز دی اور مجھے اشارہ کرتی اندر کی طرف بڑھی۔ راستے میں اس نے نوکروں کو احتیاط سے عمر کو اندر لانے کا حکم دیا۔ لیونگ روم جیسے ایک کمرے میں آکر اس نے فون پر کسی ڈاکٹر روبینہ سے رابطہ کرکے اسے فوراً آنے کو کہا۔ اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے حیرت ہورہی تھی۔ وہ اتنی ہی شاہانہ زندگی گزار رہی تھی جتنی کہ ملک ہاؤس میں گزارتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے بہت کچھ بنالیا تھا اور پوری بے خوفی سے اس بنگلے میں رہ رہی تھی۔ اسی اثنا میں نوکر عمر صدیقی کو اٹھاکر اندر لے آئے تھے۔ شائستہ نے اس کے زخم سے خون روکنے کے لیے راستے میں اپنا رومال اس کی ران کے اوپری حصے میں کس کر باندھ دیا تھا۔ وہ باحوصلہ جوان تھا۔ اتنا خون ضائع ہوجانے کے باوجود ہوش میں تھا اور مسکرا مسکرا کر الٹا شائستہ کو تسلی دے رہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل پچیس چھبیس سال ہوگی یعنی شائستہ اس سے کم سے کم پندرہ سولہ برس بڑی تھی مگر میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ عمر اس سے محبت کرتا تھا۔ غالباً عمر نے ہی شائستہ کو رب نواز اور پروفیسر ہاشم رضا کے

بارے میں وہ ثبوت فراہم کیے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر روبینہ آگئی اور وہ عمر صدیقی کو اندر لے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا' میں نے موبائل پر رب نواز کا نمبر ملایا۔
"شاہ عالم بات کررہا ہوں۔"
"ہاں بولو" وہ محتاط انداز میں بولا۔
"تم نے جو دو کتے روانہ کیے تھے' وہ اب تک دم کٹا کر واپس آچکے۔" میں نے طنز کیا۔
"ان کی لاشیں اس وقت نہر میں سفر کررہی ہیں" اس نے سکون سے کہا۔
"چلو خس کم جہاں پاک۔ یہ بتاؤ کہ موج دین کے گودام کا کیا بنا؟"
"وہ نذرِ آتش ہوچکا ہے۔ حال ہی میں موج دین کی دو کروڑ کی شراب کی کھیپ آئی تھی' وہ اسی گودام میں تھی' تم چاہو تو آج کا اخبار دیکھ لو۔ پرسوں رات کو چار بجے میرے آدمیوں نے گودام کو آگ لگادی تھی" وہ بولا۔
"گڈ رب نواز اگر تم اسی طرح فرماں برداری سے میرے حکم کی تعمیل کرتے رہے تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اب تم ایسا کرو کہ تاوان کے طور پر فرید عباسی کے بینک اکاؤنٹ میں ایک کروڑ روپے جمع کرادو' اس کا نقصان تو کم ہوا ہے لیکن ذہنی صدمہ زیادہ ہوگا۔"
"ہوجائے گا لیکن شاہ عالم دشمنی کے اس چکر کو اب ختم ہوجانا چاہیے۔"
"چھیڑ ہمیشہ تمہاری طرف سے ہوتی ہے" میں نے اسے یاد دلایا "فرید عباسی صرف میرا وکیل ہے بلکہ اب وہ وکالت بھی نہیں کررہا ہے میری۔ عدالت کئی کیسوں میں مجھے مفرور قرار دے چکی ہے اور مجھے عدالت میں اپنے مقدمات کی پیروی کرنی بھی نہیں ہے' میں یہاں سے جارہا ہوں۔"
"تو جا بھی چکو" رب نواز بے زاری سے بولا "کیوں مجھے روگ بن کر چمٹ گئے ہو۔ تمہاری وجہ سے دلنواز کا ایک پیر ضائع ہوگیا ہے۔ میں اس بات کو کوشش کے باوجود بھول نہیں پارہا۔ عباسی والی حماقت بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی۔"
"رب نواز' میں بتادوں کہ اب حماقت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس قسم کا کوئی بھی واقعہ ہوا تو میں اپنی دھمکی پر عمل کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"
"شائستہ کہاں ہے؟"
"یہ بات تم زیادہ بہتر جانتے ہوگے" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور فرض کرو کہ جانتا بھی تو کیا تمہیں بتادیتا۔"
"رب نواز کو کسی نے اتنا بڑا دھوکا نہیں دیا ہے" اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ "اگر تم شائستہ کو جانتے ہو تو اسے بتادو کہ وہ زیادہ دنوں مجھ سے محفوظ نہیں رہے گی۔ جب بھی میرے ہاتھ لگی۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہانپنے لگا "اگر میں مر بھی گیا تو میرے خاندان والے اسے نہیں چھوڑیں گے۔"
"یہ بات ملکانی خود بھی جانتی ہوگی۔ ممکن ہے وہ ملک سے جاچکی ہو۔"
"نہیں' وہ اسی شہر میں ہے۔ میرے آدمیوں نے اسے دیکھا ہے' وہ اسے تلاش کررہے ہیں۔"
میں نے سوچا اور کہا "رب نواز اگر تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو تو میں تمہارے خلاف موجود سارے ثبوت تمہارے حوالے کردوں گا۔"
"واقعی؟" اس کے انداز میں بے یقینی تھی۔
"ہاں واقعی۔ لیکن اس سے پہلے مجھے تم سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ میں ایک اور جگہ کا پتا بتارہا ہوں۔ یہاں پر موج دین نے ناجائز قبضہ کرکے کاروں کا شوروم بنایا ہے۔ یہاں چوری کی گاڑیاں نئی نمبر پلیٹوں اور کاغذات کے ساتھ بکتی ہیں۔ تم اس شوروم کا وہی حال کرو جو اس سے پہلے شراب کے گودام کا کیا ہے۔"
"میں... میں یہ کام نہیں کرسکتا" رب نواز جلدی سے

بولا "گودام تو رات کی تاریکی میں خاموشی سے تباہ کردیا گیا تھا مگر شو روم کا معاملہ دوسرا ہے۔ ایک تو یہ معروف کاروباری علاقے میں ہے' دوسرے اس کی حفاظت بھی زیادہ بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔"

"رب نواز بے شک یہ جگہ پرائم منسٹر ہاؤس ہو' تمہیں اسے تباہ کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"میں... انکار نہیں کررہا۔ یہ کام میرے بس سے باہر ہے۔"

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ کون سا کام تمہاری اوقات سے باہر ہے اور کون سا نہیں ہے۔ میں تمہیں صرف تین دن کی مہلت دیتا ہوں' چوتھے دن میں یہ ثبوت پوسٹ کردوں گا۔"

"شاہ عالم' تو مجھ سے اس طرح دھمکی دے کر کام نہیں کرا سکتا" رب نواز نے کہا۔

"میں تم سے ہر طرح سے کام کرا سکتا ہوں" میں ہنسا "کیونکہ تمہاری دم پر میرا پاؤں ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھو" میں نے فون بند کردیا۔ اسی لمحے بیل بجی' میں نے کال ریسیو کی' رئیس تھا۔

"ناصر' تو مجھے مروائے گا" اس نے برہمی سے کہا "نیلم سے ہم پہلے ہی جھوٹ بول رہے ہیں اوپر سے چندا بھی ناراض ہے۔"

"تو جانے کی تیاری کر" میں نے کہا "فون چندا کو دے۔"

چند لمحے بعد چندا لائن پر تھی "ناصر کیا حماقت ہے۔ وہ ایک بار ہمیں دھوکا دے چکی ہے۔ تم پھر اس کے چکر میں آرہے ہو؟" چندا کے لہجے میں برہمی تھی۔

"میرا خیال ہے' رئیس تمہیں ساری صورت حال بتاچکا ہے۔ شائستہ کے ساتھ جانے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ عمر صدیقی اس کے پاس ہی ہے۔ یہ شخص نہ صرف پروفیسر ہاشم رضا کے پروجیکٹ کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہے بلکہ مجھے شبہ ہے کہ یہ لال حویلی کے بارے میں بھی جانتا ہے۔"

"تمہیں اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا' کم از کم رئیس کو تو ساتھ رکھتے۔"

"چندا! میں رئیس کو ان معاملات سے الگ کرنا چاہتا ہوں۔ کل رئیس اور نیلم کی فلائٹ ہے۔ یہاں کے معاملات ہمیں نمٹانے ہیں۔ ایسا کرو کہ کسی اور ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے کر مجھے کال کرو۔ فون رئیس کو دو۔"

"ہاں' کیا بات ہے؟" رئیس بولا۔

"تو اب نیلم ہاؤس چلا جا اور وہاں سے بلاوجہ مت نکل' نیلم کو میرے بارے میں مطمئن کردینا۔"

"اچھا بھائی' جیسی تیری مرضی۔ مگر سب کچھ اکیلے مت کرتے رہنا' چندا کو ساتھ رکھنا۔"

موبائل بند کرکے میں پلٹا تو شائستہ وہاں موجود تھی۔ اس نے لباس بدل کر ایک ڈھیلا سا لبادہ پہن لیا تھا جس میں اس کے بدن کی دلکشی ایک نئے انداز میں سامنے آرہی تھی۔ میں جتنی بار اسے دیکھتا' مجھے اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ اتنی خوش بدن عورتیں میں نے کم ہی دیکھی تھیں۔ اس نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا تھا یا اس کی طلب میں بے قرار تھا۔ وہ اپنے لمبے گھنے بالوں کو جوڑے کی صورت دیتی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بیٹھو شاہ عالم!" اس نے کہا۔ میں اس کے سامنے صوفے پر ٹک گیا۔ اسی لمحے ایک ملازم لڑکا مختصری ٹرے میں مہک اور بھاپ اڑاتی کافی لے آیا۔ اس نے پہلے میرے سامنے ٹرے کی' میں نے کپ اٹھالیا۔ پھر اس نے شائستہ کو کافی دی۔ لڑکے کو مہمان داری کے آداب آتے تھے۔

"کافی لو' پھر کھانا لگ رہا ہے" شائستہ بولی۔

"نہیں شکریہ' میں واپس جاؤں گا" میں نے سپ لیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔ کیا کچھ دیر میرے ساتھ نہیں رہوگے؟" اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور کافی کا سپ لے کر کپ تپائی پر رکھنے کے لیے خاص انداز سے آگے جھکی۔ میں نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹالی تھیں۔ اس کے ارادوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی موت بلکہ دردناک موت کے منہ سے بچ کر آئی تھی اور اس نے آتے ہی مجھے رجھانے کی کوششوں کا آغاز کردیا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ میں جلد کی رنگت سے میچ کرتے سنہری کنگن سے کھیل رہی تھی۔ پہلے سپ کے بعد اس نے کافی نہیں لی تھی۔

"تم کافی کیوں نہیں لے رہیں؟" میں نے دریافت کیا۔ میں نے خود بھی کافی رکھ دی تھی۔

"میں آرام سے پیتی ہوں۔ ارے تم نے کیوں رکھ دی۔ بے فکر رہو' اس میں کچھ نہیں ملا ہے۔ اگر شک ہے تو بے شک میری کافی سے بدل لو" اس نے کہا اور دونوں کپ بدل دیے۔ میرا کپ وہ لے کر پینے لگی۔ بادل ناخواستہ میں نے اس کا کپ لیا۔ جس پر اس کی لپ اسٹک کا نشان نمایاں تھا۔ میں نے چند ہی گھونٹ لیے تھے کہ میرا دل گھبرانے اور سر چکرانے لگا۔ خطرے کے احساس کے ساتھ میں نے اٹھنا چاہا تھا لیکن ایک بجیم شحیم عورت اندر داخل ہوئی۔ ایک لمحے کو تو مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا۔ یہ لالی تھی مگر لالی تو رب نواز کی وفادار تھی' وہ یہاں کہاں؟ یہ یقیناً میرے دماغ کا فتور تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے کپ لے لیا اور مجھے دھکا دے کر دوبارہ صوفے پر بٹھادیا۔ اس کے چہرے پر وہی حیوانی تاثرات تھے۔ میں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر بہ مشکل کہا۔

"ذلیل عورت... !تو آخر نکلی نا رب نواز کی بیوی... مجھے دھوکا دیا۔"

شائستہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس مسکراتی رہی۔ اول تو میرے اندر اتنی سکت نہیں تھی اور نہ ہی وہ مجھے اجازت دیتی۔ ورنہ میں اس عورت کی گردن موڑ دینا چاہتا تھا۔ خمار گہرا ہوتا گیا۔ گہرا دھندلاتے دھندلاتے یک دم تاریک ہوگیا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا۔ مگر میں مستقل بے ہوش نہیں تھا بلکہ درمیان میں میرے اوپر جو گزری تھی' اس کی ایک جھلک میرے لاشعور نے محفوظ کرلی تھی۔ یہ بے حد شرمناک تھی۔ جب مجھے مکمل طور پر ہوش آیا تو میں ایک حسین خواب گاہ میں وسیع و عریض بیڈ پر پڑا تھا۔ میرے جسم پر صرف ایک چادر تھی۔ بستر کی ہر شکن اور میری حالت گزری واردات کا احوال سنارہی تھی۔ میرا ذہن سن سی کیفیت میں تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے سرہانے رکھے جوس کا گلاس پیا تو میری جسمانی حالت کسی قدر بہتر ہوئی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور شائستہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں وہی تھی' شائستہ کو دیکھتے ہی اشتعال کی لہر سی اٹھی تھی۔ اس نے نفاست سے استری کیا جوڑا پہن رکھا تھا اور نہا دھو کر بے حد ترو تازہ لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی' میں نے گالی دے کر کہا۔

"آخر نکلیں نا تم طوائف!"

"تم کچھ بھی کہو" اس نے اطمینان سے کہا "یہ چندا کے رویے کا جواب ہے۔ اس نے مجھے صرف جسمانی زخم ہی نہیں دیے تھے بلکہ تمہارے حوالے سے میری روح پر بھی گھاؤ ڈال دیے تھے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "چندا کی آڑ مت لو۔ بات اتنی ہے کہ ملک خاندان میں رہ کر تمہارے اندر ہوس کی آگ بھڑک گئی ہے۔ ایک مرد پر تمہارا گزارا نہیں ہوتا۔ یہاں بھی تم نے ایک لونڈا پال رکھا ہے۔"

میری باتیں سن کر بھی وہ مسکراتی رہی۔ وہ یا تو سچ مچ حیا کے جذبے سے عاری ہوچکی تھی یا پھر بے حد ٹھنڈے مزاج کی تھی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہارا لباس باتھ روم میں ہے۔ نہا کر آجاؤ' میں ڈرائنگ روم میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے گویا میں تقریباً چھ گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔ کافی میں دی جانے والی دوا زود اثر تھی لیکن اس کے بعد بھی مجھے بے ہوش رکھنے کے لیے کوئی دوا دی گئی تھی۔ میں نے بازو دیکھے' دائیں بازو پر انجکشن کا نشان تھا۔ گویا مجھے کوئی دوا اس طرح دی گئی تھی۔ غسل کے دوران میں' میں نے محسوس کیا کہ طیش میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا' وہ ہوچکا تھا۔ میں شائستہ کے قبضے میں تھا اور مجھے اس کے قبضے سے نکلنے کے لیے ذرا ڈپلومیسی سے کام لینا تھا۔ میں تیار ہوکر ایک ملازم کی رہنمائی میں ڈائننگ ہال تک پہنچا۔ شائستہ میرا انتظار کررہی تھی۔ کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا پھر وہ مجھے اسی لیونگ میں لے آئی' اس نے انٹرکام پر کافی لانے کو کہا۔

"کیا پھر کچھ پلانے کا ارادہ ہے؟" میں نے طنز کیا۔

وہ ہنسی "نہیں' مجھے جو حاصل کرنا تھا' کرلیا۔"

میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا۔ ورنہ اس کی گردن توڑ دینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ میں بھی مارا جاتا۔ یہاں اس نے اپنی حفاظت کا کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کررکھا ہوگا۔ میں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا "اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ دیکھو' میں تمہارے کام آئی' میں نے تمہیں رب نواز کے خلاف ایسے ثبوت فراہم کیے ہیں جو اسے تختہ دار تک لے جانے کے لیے کافی ہیں اور آج..." اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا "نہ چاہتے ہوئے بھی تم میرے کام آہی گئے۔"

"عملاً ان ثبوتوں کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ یہ عدالتی کارروائی میں تو کام آسکتے ہیں لیکن مجھے ضرورت ہے رب نواز کے اس ٹھکانے کی جہاں پر وہ پروفیسر ہاشم رضا کے تجربے کا شکار بننے والی عورتوں کو رکھے ہوئے ہے۔ اس صورت میں یہ ثبوت زیادہ کارآمد ہوں گے۔ بہ صورت دیگر رب نواز کو سزا تو ہوجائے گی لیکن وہ بھارتی حکومت سے اس ایجاد کا سودا کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ یہ لالی جیسی مخلوق ہے نا تمہارے ساتھ۔"

"ہاں" اس نے مختصراً جواب دیا "بائی دا وے' تمہیں

آج وطن کا درد کیوں اٹھ رہا ہے؟"
میں نے سرد آہ بھری "مجھے حالات نے اور وقت نے بہت کچھ سکھادیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ میں بھی اس زمین سے غداری کرنے والوں میں شامل تھا لیکن اب۔"
"بلی نو سو چوہے کھا چکی ہے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔
"تم چاہے جو بھی کہہ لو لیکن میں رب نواز کی طرح بالکل ہی بے ضمیر نہیں ہوں۔ میرے لیے ان سارے چکروں میں پڑنے سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ میں اس ملک چلا جاؤں جہاں میں نے اپنی آئندہ زندگی کا سیٹ اپ بنا رکھا ہے اور عیش و عشرت میں وقت گزاروں۔ محض رب نواز سے انتقام لینے کے لیے مجھے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے" میرا لہجہ کسی قدر تلخ ہوگیا تھا۔
"سوری!" اس نے جلدی سے معذرت کرلی "میں غلط کہہ گئی تھی۔" پھر اس نے اپنا گداز ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا "شاہ عالم' میری پیش کش اب بھی برقرار ہے۔ صرف ایک بار مجھ پر اعتبار کرکے دیکھو۔ میں اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کردوں گی۔"
وہ پہلے ہی سب کچھ نچھاور کرچکی تھی لیکن یہ بات کہنے کے بجائے میں نے ڈپلومیسی سے کام لیا "شائستہ تمہاری پیش کش کو رد کرنا کسی بھی مرد کے لیے مشکل ہے لیکن میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔"
"چندا کی وجہ سے؟" وہ جلتے لہجے میں بولی۔
"وہ بھی ایک وجہ ہے" میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا "تم۔۔!" میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ موبائل کی بیل بجی تھی۔ موبائل اس کے پاس تھا۔ اس نے صوفے کے ساتھ رکھے گلدان کے عقب سے موبائل فون نکالا یہ میرا موبائل تھا۔ میں نے اضطراری طور پر شائستہ سے تقریباً اسے چھین لیا۔
"سوری! اس کی بیٹری لو ہوگئی تھی اس لیے میں نے چارج پر لگادی تھی۔"
مجھے چندا کا خیال تھا' وہ مجھے کال کرکرکے پاگل ہوگئی ہوگی۔ فون چندا کا ہی تھا اور وہ بے حد غصے میں تھی "کہاں تھے تم۔ میں دوپہر سے فون کیے جارہی ہوں۔"
"سوری' بیٹری لو ہوگئی تھی میں نے موبائل آف کرکے چارج پر لگادیا تھا" میں نے شائستہ والی وضاحت دہرادی "تم کہاں ہو؟"
"میں میریٹ ہوٹل میں کمرا نمبر دو سو بتیس میں ہوں' تم فوراً آجاؤ" اس نے فون بند کردیا۔

"چندا تھی؟" اس نے پوچھا۔
میں نے سرہلایا اور اٹھتے ہوئے بولا "مجھے فوراً جانا ہوگا۔"
"میں ڈرائیور سے کہتی ہوں وہ چھوڑ آئے گا" شائستہ نے پیش کش کی جسے میں نے مسترد کردیا۔
"شکریہ! میرے خیال میں تمہاری کوئی گاڑی محفوظ نہیں ہے۔ رب نواز کے کتے کار دیکھ کر ہی پیچھے لگے تھے۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔"
اس نے میرا پرس اور دوسری چیزیں بھی میرے حوالے کردیں۔ جب وہ مجھے چھوڑنے باہر آنے لگی تو اس نے اچانک کہا "شاہ عالم' مجھے اپنی حرکت کا افسوس ہے۔ پتا نہیں میں کیوں اس لڑکی کی باتوں پر اتنی مشتعل ہوگئی تھی۔"
"جو ہوگیا اس پر افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "سنو' میں جانے سے پہلے عمر صدیقی سے ملنا چاہوں گا۔"
"وہ تو ابھی سو رہا ہے۔ تکلیف بڑھ جانے کی وجہ سے اسے مارفین کا انجکشن لگانا پڑا تھا۔ تم کل آجاؤ یا فون پر بات کرلینا۔" اس نے ایک کارڈ پر مجھے اپنی کوٹھی کے فون نمبر لکھ کردے دیے "شاہ عالم' رب نواز کے خلاف تمہیں جس قسم کی مدد درکار ہو' تم مجھ سے بے جھجک کہہ سکتے ہو۔"
"شکریہ" میں نے کہا۔
گیٹ پر چوکیدار نے سلام کرکے چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے یقین آیا کہ میں اس حسین ساحرہ کی پہنچ سے باہر نکل گیا ہوں۔ شائستہ کسی جادوگرنی کی طرح مجھے اپنے حسن و شباب کے قلعے میں قید کرلینا چاہتی تھی مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ میرے ساتھ دھوکا کرکے اس نے ثابت کردیا تھا کہ اس کے نزدیک اپنی آبرو کی واقعی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رب نواز کے ساتھ رہ کر وہ بھی محبت کو جسم کی بھوک مٹانے تک محدود سمجھنے لگی تھی۔ میں نے مین روڈ سے ذرا پہلے ہی ایک ٹیکسی پکڑلی۔ اسے میریٹ ہوٹل کا کہہ کر میں پچھلی نشست پر نیم دراز ہوگیا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ ابھی مجھے چندا کے ردعمل کا اندازہ کرنا تھا۔ موبائل کی گھنٹی نے مجھے چونکادیا۔ نمبر نیلم ہاؤس کا تھا اور دوسری طرف نیلم تھی۔
"کہاں تھے' میں شام چار بجے سے مسلسل کال کررہی ہوں؟"
"موبائل چارجر پر تھا۔"
"تم کہاں جارہے ہو؟" اس نے ٹریفک کے شور سے

اندازہ لگالیا۔
"میں میریٹ ہوٹل تک جارہا ہوں۔ چندا وہیں ہے"
میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا "میں اس بنگلے میں نہیں رہ رہا ہوں۔ شبنم دشمن کے قبضے میں رہی ہے' ممکن ہے اس نے اس جگہ کے بارے میں بھی بتایا ہو۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔ میریٹ ہوٹل ایک محفوظ جگہ ہے۔ ویسے بھی کل ہم نے روانہ ہوجانا ہے۔"
"فلائٹ چھ بجے ہے لیکن تم چار بجے تک پہنچ جانا۔ بعض اوقات بورڈنگ میں مسئلہ ہوجاتا ہے۔"
"میں آجاؤں گا۔"
"پاسپورٹ ہے ناں تمہارے پاس؟"
"ہاں ہے' تمہاری تیاری کیسی ہے؟"
"بس ایسی ہی ہے۔ وہ بھی منع کررہا ہے۔"
"وہ کون؟" میں ہنسا "نام لینے سے کچھ نہیں ٹوٹتا۔"
"رئیس" وہ شرما کر ہنسی "کچھ پاگل سا لگ رہا ہے۔ کل سے کسی بات پر کئی بار معافی مانگ چکا ہے اور بات بھی نہیں بتاتا۔"
"نیلم' رئیس بہت سیدھا لیکن روایتی مرد ہے۔ ایسا مرد جو اپنی عورت کے لیے بہت حساس ہوتا ہے۔ تم سے محبت کی خاطر وہ بہت کچھ نظرانداز کردیتا ہے۔ مگر کبھی اس کی دل آزاری مت کرنا اور کوئی غلطی کرجائے تو اس سے ناراض بھی مت ہونا۔"
"بہت سائڈلی جارہی ہے آج رئیس کی؟"
"اس لیے کہ اسے مجھ سے زیادہ کسی نے نہیں جانا ہے۔ میں بچپن سے اس کے ساتھ رہا ہوں۔ ہم نے دن رات ساتھ گزارے ہیں۔ اس نے شادو کے معاملے میں میرے لیے قربانی دی۔ نیلم' وہ دوستی میں خود کو اور اپنی خودی کو فنا کردینے والوں میں سے ہے۔ خدارا! اسے کبھی کوئی دکھ مت دینا۔ اتنے عرصے بعد اسے کوئی سچی خوشی ملی ہے۔"
میرے لہجے سے نیلم بھی متاثر ہوئی تھی۔
"مجھے۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم دونوں کی دوستی میں اتنی گہرائی ہے۔"
"اس سے بھی کہیں زیادہ' تم جانتی نہیں ہو وہ کس قدر ہیرا آدمی ہے۔"
"ابے کیا بکواس کررہا ہے؟" رئیس کی آواز آئی۔ نہ جانے کب اس نے فون نیلم سے لے لیا تھا "اپن ہیرا نہیں کھرا آدمی ہیں۔"
"بکواس تو نہ کر" میں نے ہنستے ہوئے کہا "جورو کے غلام ابھی سے معافی تلافی شروع کردی۔"
"بس یار' اس والی بات پر شرمندگی جا نہیں رہی ہے" وہ بولا "یہ بتا کہ تو تیار ہے نا؟"
"ہاں' میں وقت سے ذرا پہلے خراب حال میں ائرپورٹ پہنچوں گا اور میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہوگا۔"
"یار' نیلم کا موڈ آف ہوجائے گا۔ اسے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔" میں نے کہا اور سامنے نظر آنے والی ہوٹل کی شاندار عمارت دیکھ کر بولا "اچھا میں میریٹ ہوٹل میں ہوں۔ کمرا دو سو بتیس یاد رکھنا۔"
کرایہ ادا کرکے میں ہوٹل میں داخل ہوا۔ ریسپشن سے چندا کے کمرے میں کال کی تو اس نے تصدیق کی کہ میں ہی مسٹر جہانگیر خان تھا۔ اس کا شوہر نامدار۔ ایک پورٹر نے صرف رہنمائی فراہم کی اور مجھے دو سو بتیس تک پہنچادیا۔ چندا نے دروازہ کھولا۔ اس کا موڈ واضح طور پر خراب تھا۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہی کہا۔
"ناصر' تم اسی طرح من مانی کرتے رہوگے۔"
"میں نے من مانی نہیں کی۔ حالات دیکھ کر قدم اٹھایا۔ میں نے شائستہ کی مدد نہیں کی بلکہ رب نواز کے ارادوں کو ناکام بنایا تھا۔"
"اور پھر ان کے ساتھ چلے گئے؟"
"شائستہ کے ساتھی کے پیر میں گولی لگی تھی اور شائستہ گھبرائی ہوئی تھی۔ خود مجھے بھی خطرہ تھا' میں تمہارے پاس ہوٹل میں نہیں آنا چاہتا تھا کہ رب نواز کے آدمی میرے تعاقب میں ہوں بھی تو وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔"
"تب سے اب تک تم شائستہ کے پاس تھے" چندا نے کہا تو مجھے اس کے انداز سے گڑبڑ کی بو آنے لگی۔
"ہاں۔" میں نے کہا۔
"تم۔۔۔ تم بے حد گھٹیا آدمی ہو" وہ پھٹ پڑی "تم ابھی اس حرافہ کے پہلو سے اٹھ کر آرہے ہو۔"
میں ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا کہ شائستہ نے اپنی انا کی تسکین کے لیے اسے یہ خبر دے دی تھی۔ میں نے پورے اعتماد سے کہا "جو بھی یہ کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور ہماری محبت سے جلتا ہے۔"
"وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی' ورنہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ تمہاری پشت پر سکے کے برابر سرخ نشان ہے۔"
"میں بتاتا ہوں" میں نے کہا اور اسے خود پر گزرنے والی واردات سنادی۔ مناسب سنسر کے ساتھ۔ کس طرح شائستہ نے میرے ساتھ دھوکا کیا اور مجھے بے ہوش کرکے

اپنے پاس روکے رکھا۔
"لیکن اس کا فائدہ؟" چندا نے اعتراض کیا۔
"اس کا مقصد میرے اور تمہارے درمیان غلط فہمی کے بیج بونا ہیں۔ تم دیکھ ہی چکی ہو کہ وہ کس طرح مجھے رجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری مجبوری ہے کہ مجھے رب نواز کے خلاف اس کا تعاون چاہیے۔ خاص طور سے عمر صدیق کا۔ وہ حیوانی مخلوق کی تخلیق کے پروجیکٹ میں ہاشم رضا کا نائب تھا اور اسے اس بارے میں بہت کچھ پتا ہے۔"
"تم۔۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو نا؟" اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔
"تم جو کہو میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں" میں نے پورے اعتماد سے کہا اور دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگی۔ رفع فساد کے لیے اس نے بھی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ میں نے شکر کا سانس لیا جب چندا نے مجھے کوئی قسم نہیں کھانے کو کہا۔ اس نے کسی قدر شرمندگی سے کہا۔
"اس نے اتنے اعتماد سے کہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آگئی۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا "تمہیں نہیں معلوم ہے اس عورت کا ذہن کس قدر گندا ہے' اس نے کس قدر بے ہودہ باتیں کی تھیں۔"
میں نے اسے نرمی سے بازوؤں میں لے لیا "چندا! اگر تم اسی طرح بدگمان ہوتی رہیں تو خود تمہارے لیے بعد میں مشکل ہو جائے گی۔"
"میں۔۔۔ میں کیا کروں۔ تمہارے بارے میں کوئی ایسی بات سنوں تو دل پر قابو نہیں رہتا۔"
"محبت تو نام ہی اعتماد کا ہے" میں نے اس کے ریشمی بالوں کو سہلایا۔
"مجھے اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہا۔ میں اندر سے ٹوٹ چکی ہوں۔"
میں سمجھ رہا تھا' وہ جن حالات سے گزری تھی۔ خاص طور سے میرے شاہ عالم بننے والے معاملے میں ملوث ہونے کے بعد چندا اور خان جی بہت دکھی تھے۔ اسی کیفیت میں پہلے خان جی بیمار ہوئے اور پھر انتقال کر گئے۔ چندا نے کبھی منہ سے نہیں کہا لیکن وہ اس معاملے میں مجھے ہی مجرم سمجھتی تھی۔ اس کے بعد میرا پہلے رخشی اور پھر شبنم والے چکروں میں ملوث ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے بدظن ہو گئی تھی۔ خاص طور سے شبنم جس طرح دن رات میرے ساتھ رہی تھی اور درمیان میں انسیت کا جو تعلق ہو گیا تھا خود چندا بھی میری یادوں سے محو ہونے لگی تھی لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔ چندا سے میرا تعلق اتنا کمزور نہیں تھا۔ ہمارے درمیان غلط فہمیاں آئی تھیں' ہم بدگمان بھی ہوئے تھے لیکن ہمارے درمیان کشش کبھی ختم نہیں ہوئی تھی' جیسے چاند دن میں نظر نہیں آتا لیکن اس کی کشش موجود ہوتی ہے۔ میرے سمجھانے اور چمکارنے سے چندا رفتہ رفتہ نارمل ہو گئی تھی۔ بالآخر اس نے جھینپ کر خود کو الگ کیا اور سر جھکائے ہوئے بولی۔
"سوری۔۔۔ میں اس کی باتوں میں آگئی تھی" اس کے لہجے میں معصومیت تھی۔
میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ جب میں شائستہ جیسی مکار کے چکر میں آگیا تو چندا تو پھر بھی محبت کرنے والی کمزور جذباتی لڑکی تھی۔ جو محبوب کی ذرا سی بے اعتنائی پر بکھر جاتی تھی اور ذرا سی توجہ پا کر کھل جاتی تھی۔ چندا ان عورتوں میں سے تھی جو خوش ہوتی ہیں تو ان کا سراپا مسکرانے لگتا ہے اور افسردہ ہوتی ہیں تو پورا وجود جیسے خزاں رسیدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسے بہلانے کے لیے میں نے کہا "چلو تیار ہو جاؤ' ذرا باہر گھوم کر آتے ہیں۔ کہیں اچھی سی آئس کریم کھائیں گے۔"
"اور قمر کے پاس بھی چلیں گے۔"
"جیسا تم کہو" میں نے سہلایا۔ وہ تیار ہونے چلی گئی۔ اس نے حسب معمول سفید۔ بے داغ لباس منتخب کیا تھا۔ چوڑی دار پاجامے کے ساتھ سادہ سا کرتہ تھا۔ ہاتھوں میں سفید رنگ کے کنگن اور گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی۔ پیروں کے لیے اس نے سفید ہی سینڈل لی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ لجا گئی تھی۔ "بالکل برف کا مجسمہ لگ رہی ہو۔"
رئیس کی کار چندا کے پاس تھی' ہم اسی میں نکلے۔ شالامار کے پاس ایک جگہ سے آئس کریم لی' کچھ دیر باغ میں رہے' ٹہلتے رہے اور آئس کریم کھاتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔
"ناصر' نیلم کل چلی جائے گی" چندا نے کہا "پھر تم کیا کرو گے؟"
"میں نیلم کی وجہ سے بھی بندھا ہوا ہوں کیونکہ موج دین اس کے پیچھے پڑا ہے۔ میں نے رب نواز کو اس سے لڑا دیا ہے۔ اس کا کروڑوں کا ناجائز شراب کا گودام تباہ کرا دیا اور اب اس کے ایک کاروں کے شوروم کی باری ہے۔ اس طرح موج دین کی توجہ نیلم کی طرف سے ہٹی رہے گی اور اسے یہاں سے نکلنے میں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔"
"نیلم کی بہت فکر ہے؟" چندا مسکرائی۔

"کیا تم اس سے بھی جیلس ہو؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔ بعض اوقات ہو جاتی ہوں۔ لیکن ان معنوں میں نہیں۔ بس میں یہ نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے زیادہ کسی اور پر توجہ دو۔"
"چندا' تم جانتی ہو۔ میں بے خاندان کا بے نام و نشان شخص ہوں۔ اگر خان جی اپنی شفقت کے سائے میں میری پرورش نہ کرتے تو نہ جانے آج میں کہاں ہوتا۔ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے بے شمار محبت کرنے والے دیے۔ سب کی محبت کا انداز جدا ہے لیکن ان میں سے ہر فرد میرے لیے سوائے محبت کے کچھ نہیں ہے۔ رئیس اور کمال جیسے دوست' قمر جیسی بہن' نیلم جیسی بہن جو ماں کی جگہ ہے۔ عباسی جیسا مخلص شخص' عینی اور اس کا شوہر اور۔۔۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔
"اور۔۔۔؟" اس نے میری طرف دیکھا۔
سامنے سے نوجوانوں کی ایک ٹولی آرہی تھی۔ وہ اچھے لگتے۔ اگر ان کے انداز اوباشانہ نہ ہوتے۔ وہ واضح طور پر چندا کو دیکھ کر اس طرف آئے تھے اور بلند آواز سے بے ہودہ باتیں اور لچر مذاق کر رہے تھے۔ چندا نے موقع کی نزاکت بھانپ لی "ناصر' چلو یہاں سے۔"
ہم جانے لگے تو وہ جان بوجھ کر اس طرح راستے میں آگئے کہ ہم گزر نہ سکیں۔ روش کے دونوں جانب پھولوں کے تختے تھے۔ میں نے نرمی سے کہا "یار ذرا ایک طرف ہو جاؤ تاکہ ہم گزر سکیں۔"
"گزر جاؤ' راستہ تو ہے۔" ایک ڈھٹائی سے بولا۔
وہ شرارت پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ابھی ان کی ایسی کم تیسی کر دوں مگر چندا نے میرا بازو تھام لیا "چلو' دوسری طرف سے چلتے ہیں۔ ان کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"ہاں' یہ لگے گا تو مزہ بھی نہیں آئے گا" ایک تیزی سے چندا کی طرف آتے ہوئے بولا "تم لگو۔"
اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ چندا نے اتنی پھرتی سے گھومتے ہوئے اس کے منہ پر لات ماری کہ میں بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ پھولوں کے تختے پر جا گرا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا کیونکہ وہ عجیب سے انداز میں لٹک رہا تھا۔ جسے وہ مضحکہ خیز آواز میں چلاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر باقی تین بھی ڈر گئے تھے۔ ایک نے جلدی سے معافی تلافی شروع کر دی۔
"تم لوگ زبان کی بات نہیں سمجھتے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "اسے لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"
اور وہ فوراً دفع ہو گئے۔ میں نے فخر سے چندا کی طرف دیکھا "تم ہمیشہ مجھ سے زیادہ ماہر رہی ہو۔"
"اس کی وجہ ہے۔ میں نے سیکھنے کی طرف توجہ دی اور تم۔۔۔"
"میں تم پر توجہ دیا کرتا تھا" میں نے کہا تو وہ شرما گئی۔
"ہاں' میں اس کا فائدہ بھی اٹھاتی تھی۔ یاد ہے' پریکٹس میں ہمیشہ مجھے زیادہ پوائنٹس ملتے تھے۔"
رات دو بجے ہم شالامار سے نکلے۔ چندا نے کہا کہ ہوٹل چلتے ہیں لیکن میں نے سوچا کہ اب نکلے ہیں تو کمال اور قمر سے مل لیں۔ میں دن کی روشنی میں ان سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ حسب معمول گارڈز نے خاموشی سے ہمیں روکا اور پہچان کر اندر اطلاع کی۔ یہ دوسرے گارڈز تھے' چند لمحوں بعد کمال کے کوارٹر میں روشنی ہوئی اور وہ گاؤن کی ڈوریاں کستا ہوا نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ گالیوں سے میرا استقبال کرتا' اس کی نظر چندا پر پڑ گئی۔ اندر جاتے ہی مجھے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ کمال نے برابر والا کوارٹر جو دراصل چندا کا تھا' اپنے کوارٹر سے ملا لیا تھا اور وہاں مجھے نمایاں تبدیلیاں نظر آرہی تھیں۔ نیا اور جدید قسم کا فرنیچر تھا۔ دیواروں پر نیا پینٹ ہوا تھا اور جدید طرز کی سیلنگ لائٹس لگی تھیں۔ چار میں سے ایک کمرا ان لوگوں کا بیڈ روم تھا۔ ایک کو انہوں نے ڈرائنگ روم بنا لیا۔ ایک ٹی وی لاؤنج تھا اور ایک ڈائننگ روم۔ ٹی وی لاؤنج میں ہلکے سرمئی رنگ کا کارپٹ تھا۔ اس کے سوا کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ فرنیچر کے بجائے فرشی تکیے اور گدیاں تھیں۔ سامنے ٹرالی میں ٹی وی اور اس کے ساتھ کے دوسرے لوازمات تھے۔ ان میں ہی ایک سی ڈی پلیئر بھی تھا۔
"تو نے بڑی ترقی کر لی ہے" میں نے تعریفی نظروں سے دیکھا۔
"یہ تیری بہن کا کمال ہے" کمال مسکرایا "اس نے یہ سب کیا ہے' مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔"
"کیا یہ سب تیری مرضی کے خلاف ہوا ہے؟" میں نے غور سے کمال کو دیکھا۔ وہ کچھ خوش نظر نہیں آرہا تھا۔
"ارے نہیں یار! میں نے ہی قمر سے کہا تھا لیکن یہ سب مجھے بے چین کر رہا ہے۔"
"نیا نیا ہے نا" میں نے اسے تسلی دی "کچھ دنوں میں تو عادی ہو جائے گا اور خود دیکھے گا کہ ان چند آسائشوں سے تیری زندگی میں کتنی خوشگوار تبدیلی آئے گی۔"
"شاید" اس نے بے یقینی سے کہا۔ ہم ٹی وی لاؤنج میں

آ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر میں قمر بھی آنکھیں ملتی نمودار ہوئی۔ اندر چندا اس کے بچے کو پیار کر رہی تھی۔ چندا کے یہاں رہنے کی وجہ سے وہ اس سے مانوس تھا۔ "بھیا!" قمر نے آتے ہی شکوہ کیا "اب تم نے بہن کا حال پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے؟"

"بس میری بہن' شب و روز ایسے ہی گزر رہے ہیں" میں نے اسے جواب دیا۔

"تم نے چاکلیٹ لانا بھی چھوڑ دیا ہے۔" وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ کمال چائے بنانے چلا گیا۔

"کہیں جاؤں گا تو چاکلیٹ لاؤں گا" میں ہنسا "لاہور کی ہر چاکلیٹ کا مزہ تو چکھ چکی ہے۔ ویسے بھی اب تو بچی نہیں رہی ہے' جسے میں چاکلیٹ لا کر دوں۔"

"تمہارے لیے تو بچی ہوں" اس نے سر میرے بازو پر رکھا "تمہارے سوا اس دنیا میں اور ہے کون جسے میں اپنا کہہ سکوں۔"

"کیوں' کیا میں نہیں ہوں" چندا اندر سے قمر کے بچے کو اٹھائے نمودار ہوئی۔

"ہاں تم ہو' رئیس ہے' فرید اور رخشی ہیں لیکن یہ سب بھیا کے رشتے سے ہیں۔"

"کمال تو تیرا شوہر ہے" میں ہنسا۔

"ہاں مگر وہ بھی تمہارے توسط سے ملا تھا۔ میرے لیے تو خاندان کا محور تمہی ہو۔"

قمر کے بچے نے خاصی ترقی کر لی تھی اور اب چلنے پھرنے لگا تھا۔ مجھ سے اس کا ڈر بھی کم ہو گیا تھا۔ چندا سے وہ خاصا مانوس تھا۔ قمر نے اس سے کہا "چندا' تم کہاں ہو آج کل؟"

"ناصر کے ساتھ" اس نے چھوٹے سے کھیلتے ہوئے سادگی سے کہا۔

"ایک ہی جگہ ٹھہرے ہو؟" اس نے دوبارہ تصدیق چاہی تو چندا نے سوچے بغیر سر ہلا دیا۔

"ہاں میریٹ ہوٹل کے کمرا نمبر دو سو بتیس میں۔"

"یعنی ایک ہی کمرے میں؟" قمر نے میری طرف دیکھا "بھیا! یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"قمر تو اپنے بھائی کو جانتی ہے اور....."

"میں تمہیں بھی جانتی ہوں اور چندا کو بھی لیکن یہ معاشرے کے لحاظ سے کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں نہیں تو کمال یا کوئی اور اس بات کو محسوس کر سکتا ہے۔ بھائی' اس سے پہلے تم ہی کیوں محسوس نہیں کر لیتے۔ آخر چندا پہلے بھی تو یہاں رہتی تھی' اب بھی رہ سکتی ہے۔"

چندا شرمندہ نظر آنے لگی۔ میں نے قمر کو سمجھانا چاہا "دیکھو قمر' چندا کا میرے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ آج کل میں رب نواز سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ میرے ساتھ چندا کے ہونے سے میری طاقت دوگنی ہو جائے گی۔ اب تو رئیس بھی نیلم کے ساتھ جا رہا ہے۔"

"تمہاری مرضی بھیا! میں تو اتنا جانتی ہوں کہ پٹرول اور آگ ایک جگہ نہیں رہ سکتے" وہ اٹھتے ہوئے بولی "میں دیکھوں' یہ چائے بنا رہے ہیں یا پائے؟"

"چندا! قمر کی بات کا برا نہیں منانا" میں نے قمر کے جانے کے بعد کہا۔

"اب مجھے کسی کی باتوں کی پروا نہیں ہے۔ بس میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے نہیں غرض کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ میری دنیا۔" کمال اور قمر کے آنے سے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن میں اس کا جملہ پورا سمجھ گیا تھا۔ میں اس کی دنیا تھا۔

قمر کی بات نے ماحول میں ایک کشیدگی سی پیدا کر دی تھی جسے کمال محسوس نہ کر سکا۔ وہ اسی انداز میں ہنستا بولتا رہا اور اسپتال کے بارے میں بتاتا رہا۔ جو دو نئے بلاکوں کی تعمیر کے بعد شہر کے چند بڑے اسپتالوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ دل کے امراض کے لیے بھی شعبہ قائم کرے۔ چائے ختم کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا' اب ہم چلتے ہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

"اب تو صبح ہونے والی ہے" کمال ہنسا "اب مجھے نیند نہیں آئے گی' چلو کچھ پڑھ لوں گا۔"

چندا کے میرے ساتھ جانے سے قمر کا موڈ درست نہیں تھا اس لیے وہ بچے کو سلانے کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی اور کمال ہمیں چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ واپسی پر ہمارے درمیان ایک پرتکلف قسم کی خاموشی چھائی رہی تھی۔ ہم جس حقیقت سے نظریں چرا رہے تھے' وہ قمر نے اچانک آئینے کی طرح میرے سامنے کر دی تھی۔ اب ہم دونوں ہی اس سے شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں تو سونے کے بہانے لیٹ گیا۔ چندا تھوڑی دیر تک واش روم میں رہنے کے بعد آ کر لیٹ گئی تھی۔ نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ چندا سو گئی ہے تو میں اٹھ کر باہر بالکونی میں آ گیا۔ پچھلے کچھ عرصے میں میری زندگی بے سمت اور بے بس سی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں رب نواز کے خلاف کوشش کے باوجود کچھ کرنے سے قاصر تھا اور اس بے بسی کی وجہ یہ تھی کہ میں خود کو بے پناہ اکیلا محسوس

کرتا تھا۔ میرا صحیح معنوں میں کوئی مددگار نہیں تھا۔ کہنے کو تو میرے کئی ساتھی تھے لیکن رب نواز کے خلاف مجھے کہیں زیادہ مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ اس ملک میں قانون نافذ کرنے والے کئی ادارے تھے۔ غداروں اور غیر ملکی ایجنٹوں پر نظر رکھنے والی کئی ایجنسیاں تھیں لیکن میں ان کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ جب تک کوئی خاص دباؤ نہ ہو' یہ سب تھرو پراپر چینل ہی کام کرتی تھیں۔ میں بالکونی سے شہر کی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ دور سڑک پر ٹریفک کم ہو گیا تھا۔ فضا میں خنکی اور خاموشی تھی۔ اس وقت میں نے خدا سے دعا کی کہ میری مدد فرما۔ میں بہت اکیلا اور بہت کمزور ہوں۔ دعا کر کے مجھے سکون سا ملا تھا اور پھر کسی الہام کی طرح میجر شاہد کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی' مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ میری مدد کر سکتا تھا۔

میجر شاہد نے بہ وقت رخصت مجھے ایک نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے جب ضرورت محسوس ہو' میں اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ میں نے کمرے میں آ کر ہوٹل کے آپریٹر کو مطلوبہ نمبر ملانے کو کہا۔ رات کے اس پہر ساری ہی لائنیں فری رہتی ہیں لہٰذا نمبر ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دوسری طرف سے کسی نے کھردرے لیکن مہذب لہجے میں کہا "یس سر۔ کس سے بات کرنی ہے؟"

"میجر شاہد سے" میں نے کہا۔

"وہ تو سو رہے ہیں۔"

"جب وہ جاگیں تو انہیں بتا دیجیے گا کہ ناصر عظیم ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے میریٹ لاہور کے کمرا نمبر دو سو بتیس میں بات کر لیں۔ معاملہ سابقہ معاملے سے بھی زیادہ اہم ہے۔"

فون بند کر کے میں سونے کے لیے لیٹ گیا اور مجھے فوراً ہی نیند بھی آ گئی تھی۔ شاید مسائل کا حل نظر آنے کی وجہ سے مجھے اندرونی طور پر اطمینان مل گیا تھا۔ میں چار بجے سویا تھا اور آٹھ بجے چندا نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا۔

"کسی میجر شاہد کا فون ہے" اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"خیریت' بڑی گہری نیند سو رہے تھے؟" اس نے سلام دعا کے بعد ہنس کر کہا۔

"بس یار' رات کو دیر سے سویا تھا۔ ایک منٹ۔" میں نے واش روم میں جا کر ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور واپس آ گیا "میں نے چار بجے فون کیا تھا۔ اس کے بعد سویا تھا۔"

"پھر تو میں نے اٹھا کر زیادتی کی" اس نے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں۔ معاملہ ایسا ہے کہ میں اسے جلد از جلد تمہارے علم میں لانا چاہتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی اس کے اندر کا پیشہ ور اور مستعد فوجی بیدار ہو گیا "معاملہ کیا ہے؟"

"تم نے شاید اخباروں میں سنا ہو' لاہور میں پچھلے ایک سال میں کچھ انوکھے بچے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ ایک بچی نے روزنامہ صدائے وقت کے دفتر پر حملہ کیا تھا اور خاصی تباہی مچا کر فرار ہو گئی تھی۔ اسی طرح ایک بندر نما بچے نے مشہور اداکارہ نیلم کے گھر پر حملہ کیا تھا اور اس کے گارڈز کی فائرنگ سے مارا گیا تھا۔"

"اس کی لاش اسپتال سے غائب ہو گئی تھی۔ ایسی ہی ایک بچی نے دوبارہ اداکارہ نیلم کے گھر پر حملہ کیا تھا اور پکڑی گئی تھی" اس نے میری بات کاٹ کر کہا "اب وہ اسلام آباد کے ایک خفیہ اسپتال میں ہے۔"

"گڈ' یعنی تم اس بارے میں جانتے ہو؟"

"لڑکی ایک خفیہ ادارے کی تحویل میں ہے اور طبی ماہرین اس کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ہمیں انٹیلی جنس سے اطلاعات ملتی رہتی ہیں مگر تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"تفصیل سے تو میں ملاقات پر بتاؤں گا مگر یوں سمجھ لو کہ جن لوگوں کا یہ کام ہے اس سے ہٹ کر ان کے بارے میں اگر کوئی شخص جانتا ہے تو وہ میں ہوں۔ اب یہ معاملہ ملکی سلامتی سے منسلک ہو گیا ہے کیوں کہ بھارتی حکومت اس چیز میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

"ایک منٹ!" اس نے میری بات کاٹی "فون پر اس قسم کی باتیں مناسب نہیں ہیں۔ ایسا کرو تم میرے پاس آ جاؤ۔"

میں نے سوچا اور کہا "اوکے۔ لیکن آج نہیں' میں کل آؤں گا۔ اور سنو' اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم نیلم ہاؤس سے وہ ثبوت حاصل کر سکتے ہو۔ جن سے اس زمین کے غداروں کے مکروہ چہرے سامنے آ جائیں گے۔"

"اداکارہ نیلم؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' میری اس سے برسوں پرانی جان پہچان ہے۔ میں اس پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا کہ اپنی ذات پر کرتا ہوں۔ تم میرا نام لے کر متعلقہ اشیا حاصل کر سکتے ہو۔"

فون بند کر کے میں نے چندا کو تلاش کیا۔ وہ واش روم میں جا چکی تھی اور غالباً غسل کر رہی تھی۔ موقع پا کر میں دوبارہ سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ موبائل کی بیل بجی۔ میں نے جھلا کر کال ریسیو کی۔ حسب توقع دوسری طرف نیلم تھی'

اس نے کہا "تم تیار رہو۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے۔ بس ائرپورٹ جانا ہے۔ پاسپورٹ میرے پاس ہے لیکن میرا ٹکٹ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"میرے پاس" نیلم بولی "مجھے معلوم تھا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے بھی ایک سوٹ کیس تیار کرلیا ہے۔ تمہارے کچھ اچھے سوٹ اور ضروری سامان ہے"۔

"جیسی تمہاری مرضی" میں نے سرد آہ بھری "اب مجھے سونے دو۔ میں طیارے میں سونے کا عادی نہیں ہوں۔"

اسی لمحے چندا واش روم سے نکل آئی۔ اس نے گیلے بالوں میں تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ پانی کے شفاف قطرے اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا۔

"اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟"

"نہیں" میں نے انگڑائی لی "صبح چار بجے سویا تھا۔ کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔"

"بھول گئے پھر۔۔۔ آج خان جی کی برسی ہے۔ ہم نے داتا دربار پر جاکر دیگ دینی ہے اور پھر خان جی کی قبر پر حاضری بھی دینی ہے۔"

"اوہ' میں پھر بھول گیا" میں بستر سے اترا اور غسل کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ جب واپس آیا تو چندا ناشتا منگوا چکی تھی۔ زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ لہٰذا ناشتے کا اکثر حصہ میں نے ہی صاف کردیا تھا۔ چندا نے برائے نام ہی کھایا۔ اس کا وزن معمولی سا بڑھا تھا۔ تب سے وہ کھانے پینے میں احتیاط کرنے لگی تھی۔ ناشتے کے بعد ہم تیار ہوکر داتا دربار پہنچے۔ وہاں دیگ لے کر اس حصے میں پہنچا دی جہاں کھانا دیا جارہا تھا۔ داتا صاحب کی برکت سے لاہور شہر میں کوئی بھوکا نہیں سوتا تھا۔ وہاں سے ہم میانی صاحب قبرستان گئے پھولوں کی چادر اور اگربتیاں لیں۔ شاید چندا اکثر خان جی کی قبر پر جاتی رہتی تھی اس لیے اس حصے کا نگران اسے خوب پہچاننے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی لپکا۔

"سلام بی بی!" اس نے کہا۔ وہ نوعمر لڑکا تھا۔

"وعلیکم السلام! یہ بتاؤ کہ مولسری کا پودا لگادیا؟" چندا نے اس سے پوچھا۔

"جی بی بی' اب تو بڑا بھی ہوگیا ہے۔"

خان اعظم کو مولسری بہت پسند تھا اور انہوں نے اپنی اسٹڈی کے باہر کیاریوں میں اس کے پودے لگوائے تھے جو خاصے بڑے ہوگئے تھے۔ خان جی کی قبر اچھی حالت میں تھی۔ اس کے چاروں طرف سنگ مرمر سے حاشیہ سا بنادیا گیا تھا۔ جس کے درمیان میں کچی جگہ میں ننھے ننھے رنگ برنگ پھولوں والے گھاس نما پودے لگے تھے۔ جس سے قبر خوشنما معلوم ہونے لگی تھی۔ انسان اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا حالانکہ قبر کے اندر کا حال صرف مردہ ہی جانتا ہے۔ سرہانے لگے کتبے میں خان جی کا نام مع ولدیت' سن پیدائش اور سن وفات لکھا تھا۔ وہ اکہتر برس جیئے تھے اور انہوں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔

دعا کرتے ہوئے میرا دل خان جی کی یاد سے بوجھل ہونے لگا۔ انہوں نے مجھے صرف سہارا ہی نہیں دیا تھا۔ دنیا میں بہت سارے لوگ یتیموں کو سہارا دیتے ہیں۔ لیکن خان جی نے مجھے پتھر سے تراش کر ہیرا بنایا' مجھے صرف تعلیم ہی نہیں تربیت بھی دی تھی۔ ان ہی کی دی ہوئی تربیت تھی کہ میں بیک وقت رب نواز اور سبحان شاہ جیسے طاقتور مخالفوں کا سامنا کرکے بھی زندہ سلامت تھا۔ بلکہ اس مقابلے میں اب میری پوزیشن ان سے زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔ دعا کرکے میں نے دیکھا۔ چندا رو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے دھیرے سے اس کے شانے کے گرد ہاتھ رکھ دیا۔

"خان جی کی روح کو تکلیف مت دو" میں نے اس سے کہا۔

"بس خان جی یاد آگئے تھے" اس نے آنسو صاف کیے۔

ہم نے پھولوں کی چادر بچھاکر قبر پر پانی چھڑکا اور واپس ہوگئے۔ دو بجے ہم ہوٹل واپس پہنچے۔ میں نے چندا سے کہا کہ وہ کار لے کر قمر کے پاس چلی جائے۔ اس نے انکار کردیا۔

"قمر نے وہ بات کرکے میری اور تمہاری توہین کی ہے۔ اسے اگر کوئی اعتراض تھا تو خود کرتی' دوسروں کے نام سے کیوں بات کی۔" چندا نے خفگی سے کہا "میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ تم یہیں رہو۔ مجھے ذرا ایک ڈراما اسٹیج کرنا ہے۔"

"نیلم کے ساتھ؟" وہ مسکرائی۔

"مجبوری ہے۔ وہ میری جان چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اب یہاں رہے۔ میری ذات کے حوالے سے وہ دشمنوں کے لیے سب سے آسان ٹارگٹ بن سکتی ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں" اس نے کہا اور فون پر روم سروس کو لنچ کا آرڈر دینے لگی۔

کھانے کے بعد میں نے کپڑے بدلے اور ایسے کپڑے

پہنے جو آدمی عام طور پر سفر میں پہنتا ہے پھر میں نے اپنا پاسپورٹ چندا کے حوالے کیا۔ "اسے احتیاط سے رکھنا۔ میں نے اس کی گمشدگی کا ڈراما کرنا ہے۔ ظاہر ہے پاسپورٹ کے بغیر تو کوئی باہر نہیں جاسکتا۔"

چندا سے رخصت ہوکر میں نے لانسر کا رخ ائرپورٹ کی طرف کردیا۔ راستے میں ایک جھگی ہوٹل کے سامنے میں نے کار روکی اور باہر نکل کر وہاں میزوں پر بیٹھے لوگوں کا معائنہ کیا اور ایک کو منتخب کرکے میں اس کی طرف بڑھا۔ یہ کوئی کیم شحیم ٹرک ڈرائیور لگتا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے غرایا۔ "دفع ہوجاؤ یہاں سے۔"

پہلے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ غالباً اسے مجھ جیسے مہذب نظر آنے والے شخص سے اس لہجے میں اس بات کی توقع نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ میں نے پہلے سے بھی زیادہ خراب لہجے میں کہا۔

"سنا نہیں کتے کے بچے۔ دفع ہوجاؤ۔"

اس بار اس کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے غرا کر اٹھنا چاہا کہ میں نے میز اس پر الٹ دی۔ میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ جگ کا پانی اس پر جاگرا اور گلاس اس کے منہ پر لگا۔ یہ پیتل کا خاصا وزنی گلاس تھا۔ اس کا بلبلانا جائز تھا۔ اس نے مجھے ایک ناقابل اشاعت گالی دی۔ میں نے ایک واجبی سا مکا مارا۔ جواب میں اس نے وحشیانہ انداز میں مجھ پر چڑھائی کرتے ہوئے مجھے لے جاکر دوسری میز پر گرا دیا۔ میں نے اسے ہلکے پھلکے ہاتھ مارے لیکن اس نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا تھا۔ جب تک دوسرے افراد اسے میرے اوپر سے ہٹاتے' وہ اوپر تلے کئی مکے میرے چہرے پر جما چکا تھا۔

"خدا کی ۔۔۔ قسم ام تم کو چھوڑے گا نہیں۔"

وہ طاقت ور آدمی تھا۔ تین افراد بمشکل اسے قابو کیے ہوئے تھے اور باقی صورت حال جاننے کی کوشش کررہے تھے۔ میرا ایک ہونٹ پھٹ گیا تھا اور آنکھ کے نیچے کا حصہ مکا لگنے سے سوجنے لگا تھا۔ بعض حلیئے سے دھوکا کھاگئے۔ وہ پٹھان ڈرائیور کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ خاص طور سے جھگی ہوٹل کا مالک یا منیجر خاصا پریشان تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی "صاحب اسے معاف کردیں یہ غصے کا ذرا تیز ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنی پیٹھ تھپکی کہ میں نے درست آدمی کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے روکا۔ جگ سے پانی لے کر ہونٹ کا زخم صاف کیا۔ میز پر گرنے سے میری ایک آستین پھٹ گئی تھی۔ میں نے منیجر سے کہا۔

"نہیں بھائی غلطی میری ہے۔ میں اسے اپنا ایک پرانا دشمن سمجھا تھا۔"

پٹھان پھر دنگ رہ گیا "تمہارا دماغ ٹھیک اے۔ ام نے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہاں دراصل دادا جان کے زمانے سے اس سے دشمنی چلی آرہی ہے۔" میں نے معذرت کی "اس کی صورت تم سے ملتی جلتی ہے۔"

"تم پاگل اے۔" پٹھان خفا ہوگیا "ام تم کو اپنے دادا کی عمر کا نظر آتا اے۔"

"یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا۔ بہرحال تمہیں جو زحمت ہوئی اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں اور جرمانے کے طور پر یہ رکھ لو۔" میں نے ہزار کا ایک نوٹ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔ پٹھان حیرت سے پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اس کی عقل خبط ہوگئی تھی۔ پہلے میں نے بلاوجہ اس کو گالی دی۔ اس سے جھگڑا کیا اور پھر مار کھاکر اپنی غلطی بھی تسلیم کرلی اور آخر میں اسے ہزار کا نوٹ بھی دے کر جارہا تھا۔ باقی لوگ بھی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں نظرانداز کرکے میں کار میں جابیٹھا۔ آئینے میں اپنی صورت مجھے خاصی تسلی بخش نظر آئی تھی۔

کار کو ائرپورٹ سے ذرا دور ایک ریستوران کی پارکنگ میں چھوڑ کر میں نے ائرپورٹ کی طرف دوڑ لگانی شروع کردی۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ لوگ ایک اچھے خاصے شخص کو خراب حلیئے میں یوں جاگنگ کے انداز میں دوڑ لگاتا دیکھ کر حیران ضرور ہورہے تھے لیکن کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ تقریباً ڈھائی کلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے جب میں ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہوا تو میری حالت اس گھوڑے سے زیادہ خراب تھی جس نے میراتھن ریس میں اول پوزیشن حاصل کی ہو۔ خوشگوار موسم کے باوجود میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ انٹرنیشنل فلائٹ ٹرمنل میں داخل ہوا تو پانچ بج رہے تھے۔ رئیس اور نیلم لاؤنج میں ہی منتظر تھے۔ وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ رئیس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گیا "کیا ہوا ہے تیرے ساتھ۔"

"بہت برا۔" میں نے نیلم کی طرف دیکھا "راستے میں ایک کار نے میرا پیچھا کیا اور ٹکر مار کر لانسر کو الٹ دیا تھا۔ میں زخمی ہوا لیکن کار سے نکل گیا۔ دوسری کار میں دو افراد تھے۔ وہ مسلح تھے اور انہوں نے مجھ پر فائرنگ بھی کی۔ بس اللہ نے بچالیا۔"

"کہاں پر ہوا یہ واقعہ؟"

"ائرپورٹ سے کوئی تین میل دور۔ میں نے جھاڑیوں میں گھس کر جان بچائی اور پھر چھپتا چھپاتا یہاں تک آگیا۔"

"چلو شکر ہے۔" نیلم نے اطمینان کی سانس لی۔

"ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔" میں نے کسی قدر تامل کے ساتھ کہا "بھاگ دوڑ میں میرا پاسپورٹ وہیں کہیں جھاڑیوں میں گر گیا ہے۔ مجھے ائرپورٹ آکر علم ہوا۔"

میری بات کا مفہوم سمجھ کر نیلم کا چہرا اتر گیا تھا۔ رئیس میرے چکر سے واقف تھا لیکن اس نے پریشانی کا اظہار ضروری سمجھا "یہ تو بہت برا ہوا۔ اب تو کیسے جائے گا؟"

"ظاہر ہے ابھی تو ممکن نہیں ہے لیکن میں بعد میں پاسپورٹ تلاش کرکے آسکتا ہوں۔"

"پاسپورٹ کیسے ملے گا۔" نیلم نے تیز لہجے میں کہا "رئیس یہ مسئلہ اہم ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں ناصر کا دوسرا پاسپورٹ بننے تک یہاں رکنا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے سختی سے کہا "پاسپورٹ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں ایک دو دن میں خود بھی بنوا سکتا ہوں۔ میں قدیر احمد کو پکڑ لوں گا اور ویزا بھی لگ سکتا ہے۔ تم لوگوں کا رکنا بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔"

نیلم ہچکچائی تو رئیس نے فوراً میری تائید کی "ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ تین چار دن بعد کی سیٹ حاصل کرکے آسکتا ہے۔ تمہارا ٹریول ایجنٹ اس کے لیے انتظام کردے گا۔"

"بالکل۔ ویسے بھی تم لوگوں کی تیاری مکمل ہے اور شاید سامان بھی جہاز پر بار کیا جاچکا ہے۔ عینی اور عاقل بے چارے کتنے اشتیاق سے انتظار کررہے ہوں گے۔ اگر تم نہ گئیں تو انہیں مایوسی ہوگی۔"

"اوکے۔" نیلم نے ہتھیار ڈال دیے "لیکن میں اس شرط پر جارہی ہوں کہ تین دن کے اندر تم لندن میں ہوگے ورنہ میں اور رئیس واپس آجائیں گے۔"

"میری پوری کوشش ہوگی۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"چندا کہاں ہے؟" نیلم نے اچانک پوچھا تو میرے منہ سے نکل گیا۔

"ہوٹل میں۔"

"ہوٹل میں۔۔۔! وہ وہاں کیا کررہی ہے؟ اسے تو کمال کے گھر چلے جانا چاہیے تھا۔"

"دراصل آج خان جی کی برسی تھی۔ ہم نے داتا دربار پر دیگ دی اور خان جی کی قبر پر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر میں نے چیک آؤٹ کے لیے چندا کو ہوٹل پر اتار دیا تھا اور خود ائرپورٹ کی طرف آرہا تھا کہ یہ حادثہ ہوگیا۔"

"ناصر مجھے تمہاری طرف سے فکر رہے گی۔ اپنا خیال رکھنا۔" نیلم نے میرا ہاتھ تھاما۔

"میں اپنا خیال رکھوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

نیلم مطمئن نہیں تھی لیکن میرے اور رئیس کے اصرار کے آگے مجبور ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈیپارچر کا اعلان ہوا اور مسافر گیٹ کی طرف جانے لگے۔ رئیس اور نیلم نے بھی اپنے ہینڈ بیگ اٹھائے۔ رئیس مجھ سے بغل گیر ہوا۔

"کیا سچ مچ کہیں جھگڑا ہوا تھا؟" اس نے سرگوشی کی۔

"نہیں یار۔" میں نے ہنس کر کہا "میں کوئی پنگا نہیں لوں گا۔"

"تمہارا اعتبار تو نہیں ہے۔" نیلم نے کہا۔ اس نے مجھے گلے لگانے یا مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اسی وجہ سے کہ وہاں بے شمار لوگ تھے اور نیلم ان کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ دوسرے اسے میری بات کا احساس ہوگیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان تعلقات میں ایک حد ہونی چاہیے تھی تاکہ رئیس مطمئن ہوجائے۔ وہ لوگ باؤنڈری عبور کرکے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ طیارے میں سوار ہورہے تھے۔ نیلم نے اندر جانے سے پہلے سیڑھی پر رک کر ہاتھ ہلایا تھا۔ وہ مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔ مجھے بیک وقت اطمینان اور تنہائی کا احساس ہوا تھا۔ طیارے کے ٹیک آف کرتے ہی میں نے واپسی کے لیے مڑنا چاہا تھا کہ میری نظر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف سے آتے شخص پر مرکوز ہوگئی۔ میں تیزی سے اپنے پاس کھڑے شخص کی آڑ میں ہوگیا۔ آنے والا استاد موج دین تھا۔ جیسے ہی وہ لاؤنج میں آیا' دو افراد تیزی سے اس کے پاس پہنچے جو حلیے سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آرہے تھے مگر دونوں ہی سخت پریشان نظر آرہے تھے۔ موج دین نے ان کے قریب پہنچتے ہی دبی ہوئی مگر غضب ناک آواز میں کہا۔

"کچھ پتا چلا یہ کن حرامیوں کا کام ہے۔"

"نہیں استاد۔" ایک نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"تم۔ تم سب کتے کے بچے ہو۔ مفت کی روٹیاں توڑتے رہتے ہو۔" موج دین کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوگیا "تمہاری ماں کے یار آکر شوروم میں آگ لگا گئے اور تم دیکھتے رہے۔"

وہ دم دبا کر استاد کی گالیاں سنتے رہے۔ یہ سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا تھا کہ رب نواز نے موج دین کے شوروم کو بھی تباہ کردیا تھا۔ یہ خاصا بڑا شوروم تھا اور اس میں کروڑوں

مالیت کی گاڑیاں موجود رہتی تھیں۔ موج دین ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ میں ذرا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے تھا۔ میں اس کی باتیں سننے کے لیے اس کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کام کی بات میں سن چکا تھا۔ باہر پارکنگ میں ایک جیپ استاد موج دین کی منتظر تھی۔ جو اسے لے کر روانہ ہوگئی۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ریستوران کی طرف روانہ ہوگیا جہاں میری کار کھڑی تھی۔

راستے میں میں نے موبائل پر رب نواز کو کال کی "مبارک ہو تم نے ایک اور امتحان پاس کرلیا۔"

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" رب نواز نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔"

میں حیران رہ گیا "حیرت ہے۔ آج کا فرعون مجھ سے اس لہجے میں بات کررہا ہے۔"

رب نواز نے گویا ضبط کرتے ہوئے کہا "شاہ عالم میں بہت پریشان ہوں۔ دلنواز کے زخمی پاؤں میں زہر پھیل رہا ہے۔ اب ڈاکٹر اسے گھٹنے کے اوپر سے کاٹنا چاہتے ہیں۔"

"پرائے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا عام طور سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔" میں ہنسا۔

"شاہ عالم مجھے اتنا مجبور مت سمجھو۔" رب نواز بھڑکا۔

"تم کہاں مجبور ہو۔ مجبور تو میں ہوں۔ تمہارا سہارا لینے پر اب دیکھو دشمنی ہے مجھے موج دین سے لیکن میں اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ تو تمہاری نیکی ہے جو میری مدد کررہے ہو۔"

میرے طنز پر وہ گویا خون کے گھونٹ پی کر بولا "شاہ عالم اب کیا چاہتے ہو۔ دیکھو میں ان سب چیزوں کی بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"دولت کی میرے نزدیک خاص حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی رقم چاہیے۔ ہاں اگر تم ان اشیا کو واپس لینا چاہتے ہی ہو تو میرے پاس ایک ڈیل ہے۔"

"کیسی ڈیل؟" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں پھر موج دین کے خلاف کسی کارروائی کا مطالبہ کروں گا۔

"رب نواز میں تمہارے خلاف سارے ثبوت واپس کردوں گا۔ صرف ایک کام کے عوض۔"

"وہ کام کیا ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"موج دین کو مروا دو۔" میں نے سفاکی سے کہا۔

میری بات سن کر اسے سانپ سونگھ گیا۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا "یہ بہت مشکل ہے۔ ناممکن سمجھو۔ موج دین کا قتل معمولی بات نہیں ہوگی۔"

"رب نواز تمہیں پھانسی کی سزا بھی معمولی بات نہیں ہوگی۔ اگر اپنی گردن بچانا چاہتے ہو تو تمہیں یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کے بعد کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ ویسے بھی ایک ہفتے کے اندر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ جانے سے پہلے میں یہ سب پوسٹ کرجاؤں گا۔ اب اس کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ میں یہ چیزیں کسے پوسٹ کروں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "تمہیں یا کسی اور کو۔"

"یہ کام اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔" رب نواز نے کچھ دیر کے بعد کہا "موج دین ویسے بھی فیصل آباد گیا ہوا ہے۔"

"وہ آج شام کی فلائٹ سے کچھ دیر پہلے ہی واپس آیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ مت پوچھو۔ بس اتنا کرو جتنا میں کہتا ہوں۔"

"میں۔۔۔ میں اس وقت پریشان ہوں۔" رب نواز بولا۔

"رب نواز میں چاہتا ہوں کہ تمہاری پریشانیاں کم ہوجائیں۔ اب تم نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔" میں نے رکھائی سے کہا اور فون بند کردیا۔ کچھ دیر بعد بیل بجی۔ میں نے کال ریسیو نہیں کی۔ ٹیکسی نے مجھے ریستوران کی پارکنگ کے پاس ہی اتار دیا۔ میں نے جانے سے پہلے ایک کپ کافی پینے کا فیصلہ کیا۔ ریستوران معیاری تھا۔ سروس بھی اچھی تھی اور کافی گزارے لائق تھی۔ رب نواز نے دوبارہ کال کی۔ اس بار میں نے ریسیو کرلیا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میں یہ کام کرلوں تو تم وہ سب چیزیں واپس کردو گے۔"

"کوئی گارنٹی نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا "تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔"

"اعتبار اور وہ بھی تم پر۔" رب نواز تلخی سے بولا۔

"تمہارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے یا ہے؟"

"ظاہر ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی کا زہر بڑھ گیا تھا "میں مجبور ہوں۔ تمہارا یہ کام بھی ہوجائے گا مگر شاہ عالم یاد رکھنا اس کے بعد تم مجھ سے چیونٹی مارنے کو بھی کہو گے تو میں انکار کردوں گا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔"

"میں تم سے چیونٹی مارنے کو کہوں گا بھی نہیں۔" میں نے خلوص سے کہا "اور یہ بھی درست ہے کہ ہر بات کی ایک

حد ہوتی ہے پاؤں تلے دب کر چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ رب نواز تمہارے پاس اگلے منگل کی مہلت ہے۔ یہ آخری حد ہے۔" میں نے فون بند کیا اور کافی ادھوری چھوڑ کر بل کی رقم کپ کے نیچے رکھ کر اٹھ رہا تھا کہ ریستوان کے شیشے کے باہر مجھے وہی ٹیکسی ڈرائیور نظر آیا جو مجھے یہاں تک چھوڑ کر گیا تھا۔ میرے چودہ طبق اس کے ساتھ دو پولیس والوں کو دیکھ کر روشن ہوئے تھے۔ بجلی کے مانند یہ خیال میرے ذہن میں آیا کہ میں نے اس کی ٹیکسی میں رب نواز سے جو باتیں کی تھیں' وہ اس نے سن لی تھیں اور پولیس کو خبردار کردیا تھا کہ میں کسی موج دین کے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ باہر جانے کے بجائے میں ریستوران کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ گیلری میں دائیں طرف کچن تھا اور بائیں طرف واش روم تھے۔ کچن میں داخل ہوا تو ایک کفگیر لیے باورچی میری طرف لپکا۔

"اے ادھر کیا کرتا ہے؟"

"یہ۔" میں نے اس کی ناک پر مکا رسید کردیا تھا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔ اس کا انجام دیکھ کر اس کے نائب نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس نے ہاتھ میں تھامی چھری بھی رضاکارانہ طور پر رکھ دی تھی۔ میں نے عقبی دروازہ کھول کر باہر نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ عقبی دروازہ ایک مختصر سے کمرے میں کھلا۔ جو غالباً راشن روم تھا۔ وہاں خشک اشیا ذخیرہ کی گئی تھیں مگر اس طرف سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں واپس پلٹا تو کچن کے دروازے کو مقفل پایا۔ امن پسند نظر آنے والا نائب باورچی زیادہ عقل مند ثابت ہوا تھا اس نے مجھے اس چوہے دان میں گھسنے کا موقع فراہم کیا اور باہر سے کنڈی لگادی۔ مجھے بے وقوف بن جانے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ فرار کا کوئی راستہ ہو۔ ایک طرف گتے کے کارٹن رکھے تھے۔ ان کے اوپر روشنی کا احساس ہورہا تھا۔ میں نے اچک کر دیکھا۔ روشن دان مجھے کسی امید کی طرح نظر آیا تھا۔ میں نے اندر سے دروازے کو کنڈی لگائی۔ گتے کے کارٹن ایک دوسرے پر رکھے اور اوپر چڑھ گیا پھر روشن دان دیکھا۔ اس میں سلاخیں نہیں تھیں صرف لکڑی کا گھومنے والا پٹ لگا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ روشن دان کی دیوار پر جمایا اور دوسرے سے لکڑی کے پٹ کو کھینچ کر توڑ دیا۔ اب اتنا راستہ ہوگیا تھا کہ میں آرام سے باہر نکل سکتا تھا۔ ایک منٹ بعد میں کمرے سے باہر تھا۔ اطمینان سے گھوم کر میں سامنے پارکنگ میں آیا جہاں پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ میں نے سکون سے کار کا دروازہ کھولا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اندر پولیس کے ساتھ ریستوران کی انتظامیہ بھی مجھے تلاش کررہی ہوگی۔ میں نے موبائل پر ہوٹل میں چندا سے رابطہ کیا "میں ناصر بات کررہا ہوں۔ فوراً چیک آؤٹ کرکے نیچے آؤ اور سامان بھی لے آنا۔"

"اب کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"لاہور سے باہر جانا ہے۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو چندا چیک آؤٹ کرا کے سامان سمیت میری منتظر تھی۔ ایک پورٹر نے سامان گاڑی تک پہنچایا "ایسی کیا مصیبت آگئی ہے۔" چندا جھنجلا کر بولی "کہاں جارہے ہیں ہم؟"

"سیر کرنے۔ بہت دن ہوئے جب ہم تفریح کے لیے لاہور سے باہر نہیں گئے۔"

چندا میرے موڈ سے سمجھ گئی۔ اس نے دوبارہ یہ سوال نہیں کیا بلکہ بولی "نیلم اور رئیس چلے گئے؟"

"جہاز نے ٹیک آف کرلیا تھا جب میں ائرپورٹ سے نکلا تھا۔" میں نے جواب دیا اور چندا کو وہاں موج دین کے ٹکرانے اور رب نواز سے گفتگو کا بتایا۔ موج دین کے قتل کے سودے کا سن کر وہ چونک گئی۔

"کیا رب نواز یہ کام کرے گا؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"اگر اسے اپنے خلاف ثبوت چاہئیں تو اسے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔"

"اور اس نے موج دین کا پتا صاف کروادیا تو کیا تم سچ مچ اسے یہ سب واپس کردو گے؟"

"دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی ہمارے پاس اس سے کہیں اہم ثبوت آگئے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

راوی عبور کرکے ہم نے فیروز پور روڈ پر سفر جاری رکھا۔ میں ابھی میجر شاہد کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے رب نواز موج دین کا پتا صاف کردے۔ موج دین ایک بدمعاش اور بدکردار شخص تھا۔ وہ نہ صرف انفرادی طور پر مجرم تھا بلکہ اس کی ذات اس وقت جرائم کا منبع بنی ہوئی تھی۔ اس کا مرنا بہت سارے لوگوں کے لیے راحت کا باعث ہوسکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر نیلم کے سر پر لٹکتی تلوار ہٹ جاتی اور وہ پاکستان آنے کے لیے آزاد ہوجاتی۔ میری رائے میں تو اسے اب ملک سے باہر ہی رہنا چاہیے تھا کیونکہ اس کا

لاہور میں ایک ایج تھا جو ساری عمر اس کی جان نہ چھوڑتا۔ رئیس اور اس کے لیے بدمزگی پیدا ہوتی جبکہ باہر وہ بہ آسانی نئی زندگی کا آغاز کرسکتے تھے۔

چندا کو ذرا تنگ کرنے کے بعد میں نے اسے بتادیا۔ اس کا موڈ خراب ہوگیا "اب یہاں رات کہاں گزاریں گے۔ کسی کھیت میں یا کسی جنگل میں۔"

"یہاں پر لوگ رہتے ہیں۔ ان کے گھر میں کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے جب ہم نے لاہور کی حدود عبور کرلی تھیں۔ دیہاتی علاقہ اور اکا دکا گاؤں پہلے ہی شروع ہوگئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ قصور جاکر رات کسی ہوٹل میں گزارتے ہیں اور کل میجر شاہد سے ملاقات کی جائے گی مگر انسان کا سوچا ایک طرف رہ جاتا ہے اور اس کا ارادہ تقدیر کسی اور طریقے سے پورا کردیتی ہے۔ معاً سڑک کے درمیان میں ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ ہاتھ ہلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ کترا کر نکل جاؤں مگر قریب پہنچ کر مجھے روشنی میں ایک چادر پوش عورت اور اس کے ساتھ کھڑے بچے بھی نظر آئے تھے۔ بے اختیار میرا پاؤں بریک پر لگا۔ آدمی میری طرف لپکا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا اچھے مگر کھردرے نقوش والا شخص تھا۔ اس نے سادہ مگر اچھے کپڑے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے صاف اردو میں کہا۔

"بھائی صاحب۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ دو میل آگے بس اسٹینڈ تک پہنچادیں۔"

میں نے احتیاطاً جیب میں رکھے پستول کے دستے کو پکڑ لیا "تم یہاں کیا کررہے ہو؟"

"گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ گاڑی سڑک سے نیچے اتر گئی تھی۔" اس نے سڑک کے نیچے اگی گھاس کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک سفید گاڑی کھڑی تھی "گاڑی نیچے اتر گئی تھی مگر اللہ نے خیر رکھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ مچ پریشانی میں تھا۔ میں نے سرہلایا "شاید یہ آپ کا گھرانا ہے۔ آئیں میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔"

اس نے شکریہ ادا کرکے عورت کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا "نرگس آجا بھئی۔ یہ فرشتے مل گئے ہیں۔"

"شرمندہ مت کرو بھائی۔" میں نے عقبی دروازہ کھول دیا "ایسا کریں آپ آگے آجائیں۔ میری بیوی آپ کی بیگم کے ساتھ بیٹھ جائیں گی۔"

"جیسے مرضی جناب آپ کی۔" اس نے خوش مزاجی سے کہا "بے شک ڈکی میں رکھ کر لے جائیں مجھے۔"

چندا بادل ناخواستہ اتر کر پچھلی نشست پر چلی گئی اور وہ آگے آگیا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا "ملک مہربان کہتے ہیں مجھے۔ ذرا دور میری زمینیں ہیں۔ پرکھوں کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔"

"غالباً انگریزوں نے دی ہوں گی۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"نہیں جی۔ انگریزوں نے تو ہمارا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میرے دادا کے دادا ریشمی رومال تحریک کے کارکن تھے۔ جب عام پکڑ دھکڑ ہوئی تو وہ بھی پکڑے گئے۔ انگریزوں نے ساری زمین ضبط کرلی اور انہیں کالا پانی بھیج دیا۔ میرے پردادا نے وہیں زندگی گزاری۔ شادی کی۔ ان کے مرنے کے بعد حکومت نے پردادا کو ان کی ماں کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ پردادا نے بچی کچی زمین آباد کی۔ جو حکومت نے بنجر سمجھ کر چھوڑ دی تھی۔ اللہ نے اس میں برکت دی۔ کچھ زمین ہم نے پاکستان بننے کے بعد حاصل کی۔"

میں شرمندہ ہوگیا "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"آپ نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ آج کے نوے فیصد جاگیرداروں نے انگریزوں سے زمین حاصل کی تھی۔ آپ کا اسم گرامی جناب!"

"ناصر عظیم۔ میں لاہور میں ایک چھوٹا سا بزنس کرتا ہوں۔"

"کیا بات ہے جناب لاہور کی۔ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران میں بہت مزے کیے تھے۔"

"اچھا آپ یونیورسٹی میں پڑھے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں اکنامکس میں ایم' اے کیا ہے۔ میری بیوی بھی وہیں سے پڑھی ہیں۔"

ملک مہربان کی بیوی اور چندا نے خواتین کی عادت کے مطابق منٹوں میں دوستی کرلی تھی اور مستقل باتیں کررہی تھیں۔ بس اسٹاپ جلد آگیا تھا لیکن میں نے کہا "آپ کا گھر کہاں ہے میں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

"چلیں جی میں تو خود کہنا چاہ رہا تھا۔ ہمیں بھی میزبانی کا موقع دیں۔ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"

"چلیں جناب رات کے کھانے کا مسئلہ تو حل ہوا۔" میں نے خوش دلی سے کہا "دراصل مجھے ہوٹل کا کھانا پسند نہیں ہے۔"

"ہوٹل!" وہ چونکا "جناب جا کہاں رہے ہیں؟"

[illegible]
[illegible] میں نے بے تکلفی سے کہا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ ہم ملک مہربان کے مہمان بن جائیں۔ اس سے اس علاقے کے بارے میں معلومات بھی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ کیونکہ وہ علاقے کا پرانا رہائشی تھا۔ اس کی درمیانے رقبے پر پھیلی حویلی سڑک سے کوئی نصف میل اس کی زمین کے ساتھ ہی تھی۔ اس کی حویلی سے ذرا ہٹ کر گاؤں تھا۔ جس میں بمشکل ڈیڑھ پونے دو سو گھر تھے۔ اس کے کہنے پر میں کار اندر لے گیا۔ سب سے پہلے ملک مہربان نے اپنے ملازموں کو اپنی کار حویلی تک لانے کو کہا اور ہمیں اندر لے گیا۔ چندا اس کی بیوی نرگس کے ہمراہ اندر چلی گئی اور ہم ایک پر تکلف دیہاتی طرز کی نشست گاہ میں آگئے۔ ملک مہربان معذرت کرکے نہانے چلا گیا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ شیخوپورہ سے آرہا تھا جہاں وہ اپنے ایک دوست کی شادی میں شرکت کرنے گیا تھا۔

ملک مہربان پڑھا لکھا شخص تھا۔ نشست گاہ میں ایک ریک پر کتابیں، رسالے اور کچھ تازہ اخبارات رکھے تھے۔ میں نے رسالے دیکھے۔ یہ زیادہ تر سیاست کے بارے میں تھے۔ کتابیں ملی جلی تھیں۔ ان میں زراعت کے موضوع پر تھیں اور ادب پر بھی کئی کتابیں نظر آئیں۔ میں کتابوں کی ورق گردانی کرکے وقت گزارنے لگا۔ اسی دوران میں ایک ملازم میرے لیے مالٹے کا جوس لے آیا تھا۔ غالباً ملک مہربان کی زمین پر مالٹے کے باغات بھی تھے کیونکہ یہ پھل ابھی تک بازار میں نہیں آیا تھا۔ ملک مہربان ایک گھنٹے بعد آیا، اس نے مجھ سے معذرت کی اور بولا۔

"آپ بھی منہ ہاتھ دھولیں۔ کھانا بس لگنے ہی والا ہے۔"

وہ مجھے باتھ روم تک لے گیا۔ یہ جدید طرز کا باتھ روم تھا۔ مجموعی طور پر حویلی کا اندرونی ماحول کسی حد تک شہری تھا۔ اس کی آرائش، فرنیچر اور طرز تعمیر بھی جدید طرز کا تھا۔ مہمان خانے کے ساتھ ہی وسیع و عریض طعام گاہ تھی جس میں شیشم سے بنی خاصی طویل میز تھی۔ اس کے گرد کوئی درجن بھر کرسیاں لگی تھیں۔ مجھے چندا کے ساتھ ملک مہربان کی بیوی کو بھی وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ عام طور سے زمیں دار گھرانوں میں پردے کی پابندی ہوتی ہے مگر نرگس میرے سامنے تھی۔ وہ تقریباً تیس برس کی خوب صورت اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے چار بچے تھے۔ دو تو اس کے تھے۔ بچے تین لڑکے تھے۔ سب سے بڑا شاید دس سال تھا۔ چوتھی لڑکی تھی جو چار سال کی تھی۔ کھانے کے دوران وہ بے تکلفی سے بھائی صاحب کہہ کر ڈشیں میرے سامنے کرتی رہی۔ کھانا لذیذ اور پر تکلف تھا پھر مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے میں زیادہ ہی کھا گیا۔ کھانے کے بعد جب ہم واپس نشست گاہ میں آئے تو ملک مہربان نے وہ پیشکش کردی جس کا میں منتظر تھا۔

"آپ رات یہاں رک جائیں۔ اب اتنی رات کو جائیں گے۔"

"نہیں یار، کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔"

"میرا خیال ہے نہیں ملے گی۔" اس نے نفی میں سرہلایا "قصور میں پچھلے دنوں ہونے والے بم دھماکے کی وجہ سے خاصی سختی کی جارہی ہے۔ ہوٹل میں رات کو کسی کو جگہ نہیں دی جاتی ہے۔ آپ کو خاصی دشواری پیش آئے گی۔ بہتر ہے یہاں رک جائیں۔ کل آرام سے چلے جائیے گا۔"

کسی قدر انکار کے بعد میں مان گیا۔ ملک مہربان نے فوری طور پر ملازموں کو ہمارا سامان مہمان خانے میں پہنچانے کا حکم دیا۔ میں نے چندا کو بلوا کر وہاں رکنے کے بارے میں بتایا تو وہ مسکرا دی۔ "چلو اچھا ہے۔ بس ذرا نرگس باجی سے بات کرسکوں گی۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔"

"اتنی جلدی باجی بھی بنالیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

کمرا اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ میں نے لباس بدل کر سادہ سا کرتا اور پاجامہ لے لیا۔ تھوڑی دیر میں ملک مہربان کا پیغام آگیا۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ ابھی صرف دس ہی بجے تھے۔ میں نشست گاہ میں آیا۔ وہ تہبند اور بنیان میں بے تکلف انداز میں بیٹھا تھا۔ موسم خنک ہو رہا تھا لیکن اتنا نہیں کہ رات کو پورے کپڑے پہننے پر مجبور ہوجاتے۔ ملک کے بلاوے کا مقصد انٹرویو تھا۔ میں اسی کی توقع کررہا تھا۔ لہٰذا اس کے سوالوں کے ممکنہ حد تک درست جواب دیئے۔ آخر میں اس نے کہا "آپ کس کے پاس آئے ہیں؟"

"یہاں پر فیلڈ ہیڈ کوارٹر میں میرے ایک عزیز ہیں۔ میجر شاہد میں ان کے پاس آیا تھا لیکن وہ کسی کام سے سرحد کی طرف گئے ہیں اور کل تک آئیں گے۔"

اس نے سرہلایا "میجر شاہد اچھا آدمی ہے۔ عام طور سے سرحدی علاقوں میں یہ لوگ عوام کو بہت تنگ کرتے ہیں مگر میجر شاہد کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ پچھلے دنوں اس نے کچھ بھارتی جاسوس بھی پکڑے تھے اس پر اس کی خوب واہ

واہ ہوئی تھی۔"

"میجر شاہد کے علاوہ بھی کچھ جاننے والے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "آپ ملک رب نواز کو جانتے ہیں۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "اسے کون نہیں جانتا۔ اس کی زمینیں میری زمینوں سے بمشکل دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری زمینوں سے نہیں ملی ہیں۔ جن لوگوں کی زمینیں ان سے ملی ہیں ان کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے حیرت سے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا۔ دراصل لاہور میں ایک پلاٹ کے مسئلے پر میری رب نواز سے واقفیت ہوئی تھی۔ وہ بھی اس پلاٹ کے چکر میں تھا۔ اس پر کوئی شاپنگ پلازا بنانا چاہتا تھا جبکہ میرا مقصد وہاں ایک اسپتال قائم کرنا تھا۔ میری بات ہوچکی تھی مگر رب نواز نے کوئی ایسا چکر چلایا کہ مالک نے پلاٹ اسے دے دیا۔"

"یہ اسی قسم کے لوگ ہیں۔" ملک مہربان کے انداز میں ناگواری تھی "پچھلے دنوں میرے ملازم مویشی لے کر آرہے تھے۔ وہ ان کے خالی کھیتوں سے گزرے تو انہوں نے بدمعاشی دکھاتے ہوئے ملازموں کو مارا اور ان سے جانور چھین لیے تھے۔ بڑی مشکل سے جرمانہ لے کر واپس کیے۔ یہ ہے ان لوگوں کی بدمعاشی۔"

میری خوش قسمتی کہ ملک مہربان بھی ملک خاندان کا ڈسا نکلا تھا۔ رب نواز کی بات کرکے میں نے گویا اسے چھیڑ دیا تھا۔ اس نے رب نواز کے خاندان کے بارے میں معلومات کے دریا بہا دیے۔ اس نے ان کے کرتوتوں پر مفصل روشنی ڈالی اور جب اس نے بتایا کہ انگریزوں نے اس کے پرکھوں سے زمین چھین کر رب نواز کے خاندان کو دی تھی تو اس کے لہجے میں جھلکتی عداوت کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی ورنہ اس قسم کے چھوٹے موٹے اختلافات تو اس قسم کے علاقوں میں چلتے ہی رہتے ہیں۔

"یہ لوگ گند ہیں۔" اس نے نفرت سے کہا "اس خاندان کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں مشہور ہیں کہ میں سناؤں تو آپ ماننے سے انکار کردیں گے لیکن یہ سب سچ ہیں۔ اس علاقے کے لوگ ان سے شدید نفرت کرتے ہیں مگر ان سے ڈرتے ہیں۔ انسانوں کے روپ میں یہ دراصل بھیڑیے ہیں۔ جو انسانوں کو پھاڑ کھانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔"

"یہاں لال حویلی نامی کوئی جگہ بھی ہے۔" میں نے دوبارہ سرسری انداز میں کہا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا "ہے تو۔ مگر اس سے متعلق خاصی خوفناک باتیں سننے میں آتی ہیں۔ رب نواز کے خاندان کی ملکیت ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں آسیب ہے۔ کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ لوگ اس کے پاس جاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ کچھ منچلے اور تجسس پسند گئے تو وہ یوں غائب ہوگئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ اس کے بعد رب نواز کے خاندان کی طرف سے لوگوں کو اس طرف جانے سے منع کردیا گیا۔ ویسے بھی حویلی عام راستے اور رب نواز کے گاؤں سے خاصی ہٹ کر ہے۔"

میں نے بمشکل اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس پراسرار حویلی کا سراغ اتنی آسانی سی مل جائے گا "آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں۔" وہ مسکرایا "میں ذرا روشن خیال آدمی ہوں۔ بھوت پریت کو نہیں مانتا۔ ہاں جن کا وجود تو قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ میرے خیال میں حویلی کے بارے میں یہ سب غلط فہمی کی وجہ سے مشہور ہوگیا ہے۔ جہاں تک نوجوانوں کے غائب ہونے کا تعلق ہے تو ممکن ہے یہ جرائم پیشہ لوگوں کا کام ہو۔ رب نواز خاندان نے حویلی میں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔ ممکن ہے لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہو۔ جرائم پیشہ اس قسم کی جگہوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔" بات کرکے ملک مہربان نے ملازم کو آواز دے کر حقہ لانے کا حکم دیا۔ میرے لیے چائے لانے کو کہا۔

باہر کی خنکی اندر آنے کی وجہ سے کمرا خاصا سرد ہوگیا تھا۔ اس لیے ملک مہربان نے کھڑکیاں بند کردیں۔ دس منٹ کے اندر ملازم حقہ اور دوسرا چائے لے آیا۔ یہ دودھ پتی کے بجائے شہری رنگ کی چائے تھی۔ ملک مہربان کو آدمی کے ذوق کی پہچان تھی۔ میں نے چائے لی اور پرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ممکن ہے یہ جرائم پیشہ خود ملک خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔"

اس نے حقے کی نے منہ سے لگائی اور کش لے کر آہستہ سے دھواں خارج کیا "بعض باتیں سب جانتے ہیں لیکن کہتا کوئی نہیں ہے۔" اس کا مطلب واضح تھا۔

"رب نواز خاندان جرائم میں ملوث ہے۔" میں نے کہا "یہ بات سب جانتے ہیں۔"

"ہاں وہ بھی جو اس ملک کے ذمے دار ہیں لیکن ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا۔ کیونکہ وہ باعزت اور پیسے والے

ہیں۔ ہر اسمبلی میں ان کے خاندان کے تین چار لوگ ضرور ہوتے ہیں۔ اس کے پڑھے لکھے لوگ' بیورو کریسی میں اعلیٰ ترین عہدوں پر کام کرتے ہیں۔" ملک مہربان کے لہجے میں تلخی تھی۔

رب نواز خاندان کی زمینیں سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں اور یہاں سے اسمگلنگ آسان کام تھا۔ ویسے تو علاقے کے سارے ہی بڑے جاگیردار اس بہتی گنگا میں کسی نہ کسی طرح ہاتھ دھو رہے تھے مگر رب نواز کا خاندان اسے بطور پیشہ اپنائے ہوئے تھا۔ یہ ملک مہربان کا خیال تھا۔ اس بے چارے کو علم نہیں تھا کہ اسمگلنگ تو صرف ایک پردہ تھا اس کی آڑ میں ان کی وطن فروشی کا اصل دھندا جاری تھا۔ وہ اس زمین کا سودا اس کے دشمنوں سے کر رہے تھے اور رقم کی خاطر اپنے ہی ہم وطنوں کو خاک و خون میں نہلا رہے تھے۔ میں یہ سب ملک مہربان کو نہیں بتا سکتا تھا اس لیے انجان بن کر اسے کریدتا رہا۔ بالآخر میں اس سے لال حویلی کا محل وقوع معلوم کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ جگہ اس کی زمینوں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی مگر تھی ملک خاندان کی زمینوں کی حدود میں۔ حویلی ایک بیلے کے وسط میں تھی۔ بیلا یعنی درختوں کا یہ جھنڈ بعد میں اگا تھا۔ پہلے حویلی میدان میں تھی۔

ایک بجے ہم سونے کے لیے اٹھ گئے۔ میں کمرے میں آیا تو چندا سو چکی تھی۔ ہمارے میزبانوں نے میری بات پر اعتماد کرکے ہمیں ڈبل بیڈ والا کمرا دیا تھا۔ جو بہرحال ایک ہی تھا۔ میں چندا کے ساتھ نہیں سو سکتا تھا اس لیے چادر اور تکیہ لے کر قالین پر دراز ہوگیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو ابھی سورج نکلنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ شاید یہ کھلی اور صاف آب و ہوا کا اثر تھا کہ چند گھنٹے سو کر بھی میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ چندا بدستور محو خواب تھی۔ میں نے اس کے خرام ناز میں خلل اندازی سے گریز کیا اور جوتے پہن کر باہر آگیا۔ خلاف توقع ملک مہربان حویلی کے صحن میں ہی مسواک کرتا مل گیا۔

"خیر سے آپ بھی سحر خیز ہو۔" وہ سلام کے بعد بولا۔

"ہر روز نہیں۔ کبھی کبھی۔"

"کیں آپ کو اپنے علاقے کی سیر کرائیں۔ صبح اس جگہ کا حسن الگ ہی ہوتا ہے۔"

"صبح تو ہر جگہ ہی حسین لگتی ہے۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

حویلی کے عقبی حصے سے متصل باغات تھے۔ یہ کینو' مالٹے اور امرود کے باغات تھے۔ مالٹا پک رہا تھا اور باقی پھل ابھی کچا ہی تھا۔ باغات خاصے بڑے رقبے پر تھے اور خاصے سلیقے سے لگے تھے۔ ملک مہربان نے پائپوں کی مدد سے درختوں کو پانی دینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہر دس بارہ گز کے بعد زمین سے ایک پائپ کے اوپر لگا اسپرنکل نکلا تھا۔ جب اسے دباؤ کے تحت پانی دیا جاتا ہے تو یہ فوارے کی طرح گھوم گھوم کر چاروں طرف پانی پھینکتا ہے۔ نالیوں کی نسبت اس طریقے سے پانی کم ضائع ہوتا ہے اور پودے بھی دھل جاتے ہیں۔ ملک مہربان نے اپنی زمین کو ایک جدید قسم کے ایگری کلچر فارم کی صورت دے دی تھی۔ یہاں اس نے باغ بھی لگا دیئے تھے۔ زمین پر گندم کی کاشت کی گئی تھی۔ ایک طرف جدید قسم کا کیٹل فارم تھا اس کے ساتھ ہی پولٹری فارم تھا اور زمین کے نشیبی حصے میں اس نے مچھلیاں پالنے کے لیے تالاب بنا رکھا تھا۔ زیادہ زمین نہیں تھی۔ شاید تین سو ایکڑ ہو لیکن اس نے اتنی سی زمین میں بھی بہت کچھ لگا رکھا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک ماڈل زمیندار تھا۔ اس کی زمین دیکھ کر مجھے صحیح معنوں میں خوشی ہوئی تھی۔ زمین کے ایک سرے پر گاؤں سے ذرا ہی فاصلے پر سرخ اینٹوں کی ایک عمارت زیر تعمیر تھی۔

"یہ آپ ہی بنوا رہے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "میں اسکول بنوا رہا ہوں۔ ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے۔ قریب ترین اسکول بھی کوئی تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اب چھوٹے بچے اتنی دور نہیں جاسکتے۔ ان کے لیے میں یہ پرائمری اسکول بنوا رہا ہوں۔"

"آپ نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ ویسے اسکول چلائے گا کون؟" میں نے تعریفی انداز میں کہا تو وہ خوش ہوگیا۔

"ہیڈ مسٹریس تو میری بیوی ہوگی۔ وہی پڑھائے گی بھی۔ اس کے علاوہ بھی گاؤں میں ایک دو تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں۔ وہ بھی پڑھا سکتی ہیں۔ کتابیں کاپیاں سب اسکول کی طرف سے دی جائیں گی۔ ویسے یہ میرا اکیلے کا کام نہیں ہے۔ گاؤں والے اس میں برابر کے شریک ہیں۔ مزدوری کا سارا کام وہی کر رہے ہیں۔"

میں اس کے جذبے سے متاثر ہوا تھا "ملک صاحب اس کا اجر آپ کو اللہ ہی دے گا' لیکن میں ہر مدد کے لیے حاضر ہوں۔"

"جی ضرورت پڑی تو آپ سے بھی مدد لیں گے۔ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔"

ہم دو گھنٹے بعد واپس آئے تھے۔ ملک مہربان نے مجھے

اپنی ساری ہی زمین اور گاؤں دکھا دیا تھا۔ گاؤں خاصی اچھی حالت میں تھا۔ ملک مہربان اور گاؤں والوں نے مل کر اپنی مدد آپ کے تحت پینے کے پانی اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام کیا تھا۔ جس سے گاؤں کی گلیاں صاف ستھری رہتی تھیں۔ وہاں بجلی تھی اور گیس کے لیے بات چل رہی تھی۔ ملک مہربان گاؤں کی ترقی کے لیے کوشاں تھا۔ انہوں نے اپنی مدد آپ کا ایک فنڈ قائم کر رکھا تھا۔ ہر فصل پر ہر چھوٹے کاشت کار سے اس کی آمدنی کا ایک فیصد اور بڑے کاشت کار سے دو فیصد لے کر اس فنڈ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جب بھی کسی کو ضرورت پڑتی۔ اس فنڈ سے اس کی مدد کی جاتی تھی۔

"آپ تو شیطانوں کے برابر میں فرشتہ ہیں۔" میں نے کہا تو وہ شرمندہ ہوگیا۔

"کہاں جی۔ اللہ کے گناہ گار بندے ہیں۔"

چندا جاگ گئی تھی۔ میں نے اسے مختصراً اپنی سیر کا حال سنایا۔ دیہات میں عام طور سے مہمان کو صبح کا ناشتا الگ ہی فراہم کیا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ملازمہ بڑی سی ٹرے میں ناشتے کے لوازمات لے آئی۔ ناشتے میں حلوا تھا۔ جس میں پستے بادام کی افراط تھی۔ دیسی گھی کے پراٹھے تھے۔ انڈوں کا کئی طرح کا آملیٹ تھا۔ جگ بھر کر لسی تھی اور چائے بھی۔ ڈرتے ڈرتے بھی چندا خاصا کھا گئی تھی۔ اسے چکنائی والی چیزوں سے ڈر لگتا تھا کہ وہ موٹی نہ ہوجائے۔ دراصل وہ دس گیارہ سال کی عمر تک بے حد موٹی رہی تھی۔ میں اس کی اس وقت کی تصویریں دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتا تھا اور اسے موٹی کہہ کر چھیڑا کرتا تھا۔ وہ جب زیادہ ہی تنگ آجاتی تو روہانسی ہو کر کہتی تھی۔

"اب تو میں موٹی نہیں ہوں۔"

"اگر نہیں ہو تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پھر سے موٹی نہیں ہوجاؤ گی۔"

رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں موٹا ہونے کا خوف بیٹھ گیا۔ شروع میں اسے مارشل آرٹ کا بھی شوق نہیں تھا لیکن جب ورزش کرنے کا خیال آیا تو اس نے بھی خان جی سے مارشل آرٹ سیکھنا شروع کردیا۔ ورزشوں اور کڑی ریاضت نے اس کے جسم کو کسی مجسمے کی طرح تراش دیا تھا لیکن موٹا ہونے کا ڈر اب بھی اس کے ذہن سے نہیں گیا تھا۔ جب بھی وہ کوئی چکنائی والی چیز کھا لیتی تو لاشعوری طور پر محتاط ہوجایا کرتی تھی۔

"یہ ملک' رب نواز سے کتنا مختلف ہے۔" چندا نے چائے بنائی۔

"سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔" میں نے پر خیال انداز میں کہا "اچھے برے اور بہت اچھے اور بہت برے سب ہی ہوتے ہیں دنیا میں۔"

"نرگس بتا رہی تھی کہ وہ اسکول کے ساتھ ایک مرکز صحت بھی بنانے پر غور کر رہے ہیں۔"

"اسکول کے مقابلے میں مرکز صحت کا کام مشکل ہے۔ اس کے لیے حکومت کی مدد اور ڈاکٹرز درکار ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں ڈاکٹرز دیہی علاقوں میں آکر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔"

"سنو۔ ہم کمال سے کہہ کر ان کی مدد کرسکتے ہیں۔ ویسے بھی کمال اپنے ٹرسٹ کے تحت ایسے علاقے میں چھوٹی ڈسپنسریاں قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ جہاں کوئی اور ڈاکٹر یا صحت کا مرکز نہ ہو۔"

"گڈ اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے اس کی پیٹھ تھپکی تو اس نے خفگی سے کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"آفیشلی طور پر ہمارا رشتہ اس کی اجازت دیتا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا "بھول گئیں جناب میری زوجہ محترمہ ہیں۔"

ناشتے کے بعد میں نے اسے رات ملک مہربان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ ملک رب نواز کے بارے میں سن کر وہ حیران رہ گئی تھی "یعنی ہم اس کی آبائی زمین سے کچھ ہی فاصلے پر ہیں۔"

"محض چند میل کے فاصلے پر اور لال حویلی بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

چندا کی آنکھیں چمکنے لگیں "تاصر اگر ہم لال حویلی دیکھ کر آئیں۔"

"میرا خیال ہے' پہلے میجر شاہد سے ملنا ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لال حویلی تک ہم ذرا تیاری کے ساتھ جائیں۔ اسے رب نواز نے ایسے ہی کھلا نہیں چھوڑا ہوگا۔ وہاں وہ اہم نوعیت کا کام کر رہا ہے۔ اس جگہ کی سخت حفاظت کی جا رہی ہوگی۔"

"باہر سے دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا "واقعی دور سے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن یہ کام ہم ملک مہربان کی مدد کے بغیر نہیں کرسکتے تھے۔ وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا اور ہمیں کسی محفوظ راستے سے لال حویلی تک پہنچا سکتا تھا لیکن یہ بات اس

سے کیونکر کی جاتی۔ وہ فوراً تجسس میں پڑجاتا کہ میں لال حویلی کیوں دیکھنا چاہتا ہوں اور میں فی الوقت اسے خبردار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی اور سے پوچھنا بھی درست نہیں تھا۔ نہ جانے کون رب نواز کا آدمی نکلے اور اسے جاکر خبردار کردے۔ ناشتے کے برتن لینے کے لیے آنے والی ملازمہ نے چندا کو نرگس کا بلاوا دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں مہمان خانے کے عقبی صحن میں نکل آیا۔ جہاں نیم کے گھنے درخت لگے تھے۔ دیواروں کے ساتھ گلاب اور بیلے کی جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ بیلے میں پھول کھلے تھے۔ میں جاکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایک عمر رسیدہ ملازم صحن کی صفائی کررہا تھا۔ اس نے فوراً آکر مجھ سے لسی پانی یا کسی ضرورت کا پوچھا۔

"شکریہ بابا۔ ابھی کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا "ملک صاحب کہاں ہیں؟"

"ملک جی ذرا باغ کی طرف گئے ہیں۔"

اچانک مجھے ایک خیال آیا "بابا۔ ملک صاحب رات کسی لال حویلی کا ذکر کررہے تھے۔"

"لال حویلی۔" اس نے کسی قدر خوف سے کہا "ادھر کوئی نہیں جاتا۔ وہ جگہ آسیب زدہ ہے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا "کیا تم نے کوئی آسیب دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں۔" وہ نڈھال سا زمین پر بیٹھ گیا "دیکھا نہیں۔ پر بھگتا ہے۔ میرا جوان بیٹا غائب ہوگیا۔ اس منحوس جگہ کو دیکھنے کے شوق میں گیا تھا دوستوں کے ساتھ پھر واپس نہیں آیا۔"

"میرے خدا۔" میرے منہ سے نکلا "معاف کرنا بابا مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"آپ کیوں معافی مانگتے ہو۔ مقدر تو میرا خراب ہے۔"

"یہ کتنے عرصے پہلے کی بات ہے؟"

اس نے حساب لگایا "دو سال اور پانچ مہینے ہوگئے ہیں۔"

گویا اتنے عرصے سے رب نواز نے لال حویلی کو پروفیسر ہاشم رضا کے تجربات کا مرکز بنا رکھا تھا۔ دیہاتی علاقہ ہونے اور اپنی ہی سلطنت کی وجہ سے اسے ان مکروہ تجربات کے لیے عورتیں بھی بہ آسانی مل سکتی تھیں یا وہ انہیں اغوا کرکے زبردستی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ سرحد قریب ہونے کی وجہ سے وہ بھارت سے آنے والے افراد کو پوری رازداری سے یہ تجربات دکھا سکتا تھا۔ ان سے اس چیز کا سودا کرتے ہوئے اسے کسی قسم کا خوف بھی نہ ہوتا۔ اب تک وہ سودا کر بھی چکا ہوتا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہاشم رضا غائب تھا اور اس کے بغیر اس قسم کے مزید تجربات ممکن نہ تھے۔ وہی بھارت سے آنے والے سائنس دانوں کو اپنے تجربات کے خاص نکات سے آگاہ کرسکتا تھا۔ اس کے بغیر یہ سودا بیکار تھا۔

"بابا۔ کیا یہ حویلی ملک مہربان کی زمینوں کے پاس ہی ہے۔"

"نہیں صاحب۔ کوئی فرلانگ بھر دور ہوگی۔ اگر درمیان میں بیلا نہ ہو تو یہ منحوس حویلی ملک صاحب کی زمین سے بھی نظر آئے۔ باغ سے پرلی طرف جائیں تو جہاں ٹیوب ویل ہے اس جگہ سے صرف دو فرلانگ دور ہے۔"

بابا نے سادگی میں مجھے لال حویلی کا مکمل نقشہ ہی بتا دیا تھا۔ اب میں کسی کی مدد کے بغیر بھی وہاں تک جاسکتا تھا لیکن میں اس طرف جانے سے پہلے میجر شاہد سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے نوکر سے فون کا پوچھا۔

"اندر ہے جی۔ ایک تار مہمان خانے میں بھی ہے۔"

غالباً اس کا مطلب تھا کہ ایک ایکس ٹینشن مہمان خانے میں بھی تھا۔ میں نے اندر والے نوکر سے پوچھا۔ اس نے میری فون تک رہنمائی کی۔ یہ نشست گاہ میں تھا۔ میں نے میجر شاہد کا نمبر ملایا۔ اس کی جگہ اس کا نائب کیپٹن شاکر ملا۔ اس نے گرم جوشی سے میری خیریت دریافت کی "میجر شاہد کہاں ہے؟"

"میجر صاحب تو ذرا بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ گشت پر ہیں۔ مورچوں کا معائنہ کرنے گئے ہیں۔ شاید رات تک یا کل صبح تک واپسی ہو۔ انہوں نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ کب تک آرہے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑگیا۔ میں سوائے میجر شاہد کے کسی سے اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کیپٹن شاکر کو ملک مہربان کا فون نمبر دیا "ابھی میں اس جگہ ملوں گا۔ اگر میجر شاہد رات سے پہلے آجائے تو اسے کہنا کہ مجھے کال کرلے۔"

"میں پیغام پہنچادوں گا اور کوئی خدمت سر۔"

"نہیں شکریہ۔" میں نے فون بند کردیا۔ قدرت میری مدد پر آمادہ تھی۔ مجھے ایک دن اور رکنے کو مل گیا تھا۔ میں ملک مہربان کو میجر شاہد کی عدم موجودگی کا بتا کر رکنے کو کہتا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ ملک دوپہر تک واپس آیا تھا۔ اس نے مجھ سے معذرت کی "معاف کرنا جناب۔ پھل اترنے والا ہے اس وقت دیکھ بھال کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ خاصا پھل ضائع ہوتا ہے۔ نوکروں کے سر پر نہ رہو

تو یہ کام بھگتاتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں مزے میں رہا اور ممکن ہے آج بھی آپ کی میزبانی سے لطف اندوز ہوں۔ دراصل جن میجر صاحب سے ملنے آیا تھا' وہ اچانک اپنے افسر کے ساتھ سرحد کے دورے پر چلے گئے ہیں۔ آج رات یا کل صبح واپس آئیں گے۔"

وہ کھل اٹھا "بسم اللہ جی۔ خوش قسمتی ہے جی ہماری۔"

"مہربانی ہے آپ کی۔" میں مسکرایا۔

دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھا کر ملک مہربان دوبارہ زمینوں پر چلا گیا۔ میں نے جاکر کار سے بڑا سوٹ کیس نکلوایا اور اس میں کپڑوں تلے اصل سامان یعنی رب نواز کے خلاف ثبوت اور ہتھیار رکھے تھے۔ ہتھیاروں میں ایک خود کار رائفل تھی۔ اس کے علاوہ دو عدد پستول تھے۔ ایک بریٹا تھا جس پر سائلنسر لگا تھا۔ دوسرا ماؤزر تھا جو رئیس لایا تھا۔ میں نے سامان میں سے دونوں پستول نکال لیے۔ انہیں لباس میں چھپانا آسان ہوتا۔ شام چار بجے میں زمینوں کی سیر کے بہانے روانہ ہوا۔ میں نے ٹیوب ویل والے ڈیرے تک جاکر دیکھا وہاں سے دور درختوں کا جھنڈ نظر آرہا تھا جس کے بیچ میں اب لال حویلی تھی۔ جہاں سے رب نواز کی خاندانی زمینوں کا آغاز ہوتا تھا۔ وہاں ویرانی اور جھاڑیاں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اس طرف کی زمین کو آباد ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ میں نے ذرا گھوم کر دیکھا۔ درختوں کا جھنڈ سڑک سے صرف ایک کلومیٹر جنوب مشرق میں تھا۔ واپس آکر میں نے چندا کو تیار رہنے کو کہا۔

ملک مغرب سے ذرا پہلے آیا تھا۔ میں نے اسے کہا "ملک صاحب ہم لوگ ذرا آرمی کے فیلڈ ہیڈ کوارٹر تک گئے ہیں۔ کیپٹن شاکر نے ملاقات کے لیے دعوت دی ہے۔"

"ضرور جائیں جناب لیکن کھانا ادھر ہی آکر کھانا ہے۔"

"ہم رات نو بجے تک آجائیں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

ضروری سامان میں نے پہلے ہی کار میں رکھ لیا تھا۔ ہم روانہ ہوئے تو سورج غروب ہوچکا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔

"تمہارا ارادہ کیا ہے؟" چندا بولی۔

"تمہارے بارے میں تو نیک ہے۔" میں نے کہا "البتہ لال حویلی کے بارے میں یہ ارادہ ہے کہ اس کا ذرا سروے کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہاں کے کیا حالات ہیں۔"

میں نے کار سڑک پر ذرا آگے لے جاکر کنارے پر اگی جھاڑیوں کے اندر کھڑی کردی۔ یہاں پر یہ محفوظ تھی۔ میں نے پہلے ہی سیاہ شرٹ کے ساتھ نیلی پتلون پہن رکھی تھی۔ اتفاق سے چندا نے گہرے رنگ کے کپڑے ہی پہن رکھے تھے لیکن دوپٹا آف وائٹ تھا اور تاریکی میں نظر آتا تھا۔ میں نے اسے دوپٹا یہیں چھوڑ کر جانے کے لیے کہا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد وہ مان گئی۔

"ناصر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی ناں؟" چندا کسی قدر سہمی ہوئی تھی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں لیکن ہوئی بھی تو تم ہاتھ پیر سے ہر نوعیت کی گڑبڑ سے نمٹ سکتی ہو اور مخالف اگر طمنچہ لے کر آئے تو تم اسے استعمال کرسکتی ہو۔" میں نے ماؤزر اس کی طرف بڑھا دیا "بس خیال رکھنا مجھے ہی گولی نہ ماردینا۔ میرے لیے تمہاری آنکھ کا اشارہ ہی کافی ہے۔"

"شروع ہوگئی بکواس۔"

چندا نے دوپٹا کار کی نشست پر ڈال دیا اور بالوں کی گندھی چوٹیوں کو آپس میں بل دے کر جوڑے کی شکل دے دی۔ میں نے اچانک اسے کھینچا اور بازوؤں میں بھر کر چوم لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اس نے بگڑ کر کہا۔

"اسے موقع سے فائدہ اٹھانا کہتے ہیں۔" میں ہنسا "ویسے تمہارا چہرہ اس تاریکی میں بھی کسی بلب کی طرح چمک رہا ہے۔ دشمنوں اور بدخواہوں کو خاصی دور سے نظر آجائے گا۔"

"تو میں کیا کروں اپنا چہرہ کیسے چھپاؤں؟"

"اس کا بھی حل ہے اس خادم کے پاس۔" میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کے چہرے پر اس طرح باندھ دیا کہ سوائے آنکھوں کے سب ڈھک گیا۔ اس کی چاند سی پیشانی پر پہلے ہی کالی بدلی سے بال چھائے ہوئے تھے۔ "اب جس کا دل چاہے وہ تمہیں دیکھے۔"

وہ ہنسی "میں کسی کو نظر ہی کہاں آؤں گی۔"

ہم جھاڑیوں میں سے ہوتے آگے بڑھے۔ یہ بغیر کانٹوں کی جھاڑیاں تھیں جن پر موسم بہار میں سرخ رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ ان میں کانٹے ہوتے تو ہمارا حشر نشر ہوجاتا پھر بھی جھاڑیاں ٹکرانے سے کپڑے خراب ہو ہی رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ واپسی پر ملک مہربان کے سامنے اپنے حلیے کی کیا وضاحت کروں گا۔ میں نے ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ درختوں کے جھنڈ تک پہنچتے ہوئے ہمیں کسی کھلی جگہ سے نہ گزرنا پڑے۔ ملک مہربان کی زمینوں سے ملی زمین کو رب

نواز نے جان بوجھ کر غیر آباد چھوڑا تھا بلکہ حویلی کے اردگرد کی ساری ہی زمین غیر آباد تھی۔ مقصد وہی تھا کہ لوگ اس طرف آنے اور حویلی کے بارے میں تجسس سے گریز کریں۔

"کس مصیبت میں لے جا رہے ہو۔" جھاڑیوں سے الجھتی چندا جھنجلا کر بولی "میری آستین پھٹ گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ عین ممکن ہے کہ دوسری طرف جاتے جاتے تمہارے سارے ہی کپڑے پھٹ جائیں اور تم کسی جنگل کوئن ٹائپ کسی فلمی ہیروئن کے حلیے میں برآمد ہو۔"

"بکو مت!" اس کی جھینپی ہوئی آواز آئی۔ کیونکہ تاریکی اتنی تھی کہ ہم بمشکل راستہ اور ایک دوسرے کے ہیولے دیکھ پا رہے تھے۔

جھاڑیاں اچانک ہی ختم ہوگئی تھیں اور سامنے کوئی سو گز تک زمین صاف تھی۔ اس کے بعد جنگل شروع ہو رہا تھا ہم ذرا دائیں طرف نکلے تھے۔ جنگل میں زیادہ تر برگد اور بیری کے دیو قامت درخت تھے۔ برگد کی لٹکتی جڑیں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ میں نے چندا کی طرف دیکھا "دوڑ لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ درختوں تک پہنچنا ہے۔"

"میں تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"ریڈی ون ٹو تھری۔" میرے کہتے ہی ہم دونوں جھکے جھکے دوڑ پڑے تھے۔ تیس سیکنڈ کے اندر ہم درختوں تک پہنچ گئے تھے میرے ساتھ چندا کا سانس بھی پھول رہا تھا۔ ہم بری طرح ہانپ رہے تھے۔ میں نے افسوس سے کہا۔

"ایک زمانہ تھا کہ ہم شرط لگا کر صبح چار میل کی دوڑ لگایا کرتے تھے اور ہمارا سانس درست رہتا تھا۔ آج سو گز دوڑ کر یہ حال ہو گیا ہے۔"

"تم بھول رہے ہو۔ ایک میل ان منحوس جھاڑیوں سے بھی گزرنا پڑا تھا۔" اس نے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اب بلاوجہ مت بولنا۔" میں نے اسے ڈانٹا "تم لڑکیوں کو بلاوجہ بولنے کی بہت عادت ہے۔"

وہ خفا ہو گئی۔ ہم ذرا سا آگے گئے۔ یہاں گھنے درختوں تلے اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ میں نے جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔ یہ بمشکل انگلی کے برابر تھی۔ اس کا بلب والا حصہ گھوم کر سامنے آتا تھا تو یہ روشن ہو جاتی تھی اور واپس گھمانے سے بجھ جاتی تھی۔ اس کی روشنی چند گز سے زیادہ دور نہیں جاتی تھی۔ گھپ اندھیرے میں یہ ہلکی سی روشنی بھی زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے تنھے سے سوراخ کے آگے انگوٹھا کر لیا۔ میں آگے تھا اور چندا پیچھے تھی۔ ہر طرف برگد کی شاخیں لٹک رہی تھیں۔ بے انتہا گہرا سناٹا تھا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اچانک چندا نے ہلکی سی چیخ ماری تو میں اچھل ہی پڑا۔ میں برہمی سے پلٹا "آواز نکالنا اتنا ہی ضروری ہے تو گانا گا لو۔"

"وہ۔ وہ کوئی چیز میرے پیر پر چڑھ گئی تھی۔"

"غالباً بابا ہی ہوگا۔ وہیل تو خشکی پر آ نہیں سکتی۔"

میرا طنز محسوس کر کے وہ خاموش ہو گئی۔ یہ اضطراری بات تھی۔ عورتیں چاہے شوہر سے ڈریں نہ ڈریں پاؤں پر چڑھ جانے والی چیزوں سے ضرور ڈرتی ہیں۔ چندا جیسی بہادر لڑکی بھی اس فطرت سے خالی نہیں تھی۔ مجھے اپنے سخت لہجے پر افسوس ہونے لگا مگر یہ وقت معافی تلافی کا نہیں تھا۔ میں اب پوری طرح محتاط تھا۔ میرے کان کسی آہٹ پر مرکوز تھے۔ عین ممکن تھا کہ رب نواز نے اس جنگل میں اپنے پالتو چھوڑ رکھے ہوں۔ مجھے زیادہ خطرہ چار پیروں والوں سے تھا۔ اس جنگل کی نگرانی کے لیے سب سے بہتر شے کتے تھے جو آنے والے کسی بھی فرد کی بو سونگھ کر یا اس کی آہٹ سن کر اس کی طرف لپکتے جبکہ دوپایہ پالتو نہ تو اتنے مستعد ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے حواس خمسہ اتنے تیز ہوتے ہیں۔ میں نے سرگوشی میں چندا سے کہا۔

"خطرہ محسوس کرتے ہی بے دریغ فائر کر دینا۔ خاص طور سے اگر کتے حملہ کریں۔"

"کہنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے جلے ہوئے انداز میں کہا "میں ان سے مذاکرات نہیں کروں گی۔"

معاً مجھے سامنے سے ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا۔ میں نے پھرتی سے ٹارچ بند کر دی۔ میرے رکتے ہی چندا جو میرے عین عقب میں تھی مجھ سے ٹکرائی۔ اگر اس نے بھی روشنی نہ دیکھ لی ہوتی تو وہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور اشارہ کرتی۔ میں نے اسے اشارے سے وہیں رکنے کو کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میں زمین پر بیٹھ کر آگے جا رہا تھا۔ تاکہ کسی ممکنہ پہرے دار کی نگاہوں میں آنے کا کم سے کم امکان رہے۔ میں نے ٹارچ جیب میں رکھ لی تھی اور پستول نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا تھا۔ خطرہ دیکھتے ہی میں گولی چلانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ میں نے شاخوں کو ہٹایا تو مجھے سامنے ہی حویلی نظر آئی تھی۔ اس کی بیرونی دیوار درختوں سے بمشکل دس بارہ گز کے فاصلے پر تھی مگر روشنی حویلی سے نہیں آ رہی تھی بلکہ فصیل کے سائے میں کچھ افراد موجود تھے۔ وہ ایک گڑھے کے کنارے

موجود تھے اور سامنے دیوار کے ساتھ ایک کیل پر لالٹین لٹکی تھی۔ اسی کی روشنی میں نے دیکھی تھی کل تین افراد تھے اور انہوں نے زمین پر لمبے سے پلاسٹک بیگ میں لپٹی کوئی شے رکھی ہوئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی لاش دفنا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لاش سختی سے لپیٹی گئی تھی اور اس کے جسمانی خدوخال بتا رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی۔

"چل اوئے رمضو ڈال اس مصیبت کو تھلے۔" کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

"ابھی لو جی۔" دوسرے نے مستعدی سے کہا۔ وہ دبلا سا اور شاید کسی نشے کا عادی فرد تھا۔ اس نے بمشکل پلاسٹک بیگ میں لپٹی لاش کو کھینچ کر گڑھے میں گرایا۔ میرا دل غم و غصے سے بھرنے لگا تھا۔ نہ جانے کس کی بیٹی اور کس کی بہن تھی جو اس طرح بے کفن دفن کی جا رہی تھی۔ ایک بے نام و نشان قبر میں۔

"تھی بڑی جوردار پر بچے والی تھی۔" تیسرے نے مکروہ سی ہنسی کے ساتھ کہا "اس کا بچہ بھی بندر جیسا ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اشتعال پر قابو پایا۔ ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان تینوں کے سر میں سوراخ کر دوں۔ ایک اور جان ان کی بھینٹ چڑھ گئی تھی لیکن میں نے خود کو یاد دلایا کہ یہ تو غلام تھے جن کا کام ہی اپنے آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرنا تھا۔ برائی کی اصل جڑ تو وہی تھے۔ یہ تو صرف شاخیں اور پتے تھے۔ ایک بار جڑ ختم کر دی جاتی تو یہ اپنے آپ ہی ختم ہو جاتے۔ انہوں نے جلدی جلدی گڑھے میں مٹی بھری اور اسے پاٹ دیا۔ اوپر سے مٹی اچھی طرح ہموار کر کے اس پر سوکھے پتے بکھیر دیئے۔ یوں بظاہر ایسا لگنے لگا کہ زمین پر کوئی کھدائی نہ کی گئی ہو۔ وہ لالٹین لے کر ایک طرف چلے گئے۔ انہوں نے لاش زیادہ گہری دفن نہیں کی تھی بمشکل چار فٹ کی گہرائی تھی۔ پلاسٹک کے بیگ میں شاید اسی وجہ سے لپیٹا گیا تھا کہ بو پا کر کہیں جانور نہ لاش نکال لیں۔

وہ لوگ ذرا آگے جا کر ایک چھوٹے دروازے سے حویلی کے اندر چلے گئے جو باہر سے بظاہر تاریک اور قطعی بے آباد نظر آتی تھی۔ اس کی فصیل دیکھنے میں تو پرانی نظر آتی تھی لیکن یہ خاصی مضبوط اور کوئی دس فٹ بلند تھی۔ میں نے درختوں سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ عین ممکن تھا حویلی کے اوپر سے باہر کی نگرانی کی جا رہی ہو۔ میں واپس پلٹا اور چندا کو وہیں رکنے کا کہہ کر درختوں میں ہی فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بعض جگہوں پر درختوں کے کنارے اتنے کھلے تھے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ لیے جانے کا خطرہ تھا لہٰذا میں ذرا اندر سے ہو کر گزرا تھا۔ حویلی کا مین گیٹ مشرق کی طرف تھا۔ یعنی اس کا منہ رب نواز خاندان کی زمینوں کی طرف تھا۔ اس جگہ سے اندرونی عمارت واضح نظر نہیں آ رہی تھی یعنی سامنے کھلا صحن تھا۔ مرکزی دروازہ لوہے کا اور بھاری بھرکم تھا۔ بظاہر اس کی حالت بھی زنگ خوردہ ہو رہی تھی اور اسے استعمال بھی کیا نہیں جاتا تھا مگر اس کے نیچے کی زمین بتا رہی تھی کہ گیٹ کو باقاعدگی سے آمدورفت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں زمین پختہ تھی اور اس پر باقاعدگی سے چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ تاکہ مٹی جمی رہے۔

اچانک حویلی کے اندر سے کسی کے وحشیانہ انداز میں چیخنے کی آواز آئی تھی۔ ساتھ ہی کوئی یوں بولا تھا جیسے اس کا منہ بند ہو۔ مجھے تجسس ہونے لگا کہ حویلی کے اندر کیا ہو رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر دیوار میں ایسا کوئی رخنہ نہیں تھا جس پر چڑھ کر میں اندر جھانک سکتا۔ معاً میری نظر دیوار سے ذرا ہی فاصلے پر آگے پیپل کے اونچے سے درخت پر پڑی۔ میں اس پر چڑھ کر اندر دیکھ سکتا تھا۔ کراہنے کی گھٹی گھٹی سی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اس کے ساتھ کچھ اور آوازیں بھی آ رہی تھیں جیسے کوئی پانی میں چھپ چھپ کر چل رہا ہو۔

میں نے اردگرد کا معائنہ کیا۔ پیپل کے درخت پر کسی چڑیل کے تو نہیں البتہ سانپ یا اسی قبیل کے کسی کیڑے کے پائے جانے کے روشن امکانات تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ جوتے میں نے اتار کر ان کے فیتوں کو پتلون کی بیلٹ پر کمر کے پیچھے باندھ لیا تھا۔ خوش قسمتی سے اونچا ہونے کے باوجود درخت کی شاخیں آڑی ترچھی تھیں۔ اس لیے ان پر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک خاصی موٹی شاخ حویلی کی فصیل کے تقریباً پاس تک چلی گئی تھی۔ میں اس پر چڑھ کر رفتہ رفتہ آگے کھسکنے لگا۔ ذرا سی دیر میں حویلی کے صحن کا منظر میرے سامنے تھا۔ یہ ایک اور عبرت ناک منظر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ حویلی دہشت اور ظلم کا منبع تھی۔ یہاں انسانوں کی اور انسانیت کی تذلیل کی جاتی تھی اور انہیں ناقابلِ بیان اذیت دی جاتی تھی۔ صحن میں ایسا ہی ایک منظر تھا۔

صحن میں درخت کے ایک خشک تنے کے ساتھ ایک برہنہ شخص کو باندھا ہوا تھا۔ اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور پانی میں چھپ چھپ کرنے جیسی جو آوازیں تھیں وہ دراصل اس کے جسم پر برسنے والے کوڑے سے پیدا ہو رہی

تھی۔ ہر ضرب پر اس کا بندھا جسم ممکنہ حد تک بل کھاتا تھا اور اس کی ناک سے آواز نکلتی تھی۔ منہ پر تو کپڑا باندھا ہوا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں یہ منظر بے حد بھیانک اور آسیب زدہ لگ رہا تھا۔ مارنے والے افراد دو تھے جو اس پر رکے بغیر کوڑے برسا رہے تھے۔ ان کے علاوہ دو افراد اور تھے ایک قوی الجثہ شخص تھا جس کی مونچھیں نمایاں تھیں اس نے جسم پر رائفل سجا رکھی تھی اور مکروہ سا قہقہہ اسی نے لگایا تھا۔ کیونکہ بندھا ہوا شخص جب جسم کے نازک حصے پر لگنے والی ضرب کے بعد مچھلی کی طرح تڑپا تو اس نے ویسا ہی ایک اور پُر ہول قہقہہ لگایا تھا۔ میرا خون ایک بار پھر کھولنے لگا تھا۔ رب نواز کا نام اب شیطانیت اور بربریت کی ایسی نشانی بن گیا تھا جس سے کسی اچھائی کی ذرا سی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ وہ بجائے خود مجسم شیطان ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا ہر عمل انسانیت سوز ہی ثابت ہوتا تھا پھر تقدیر کو مضروب پر رحم آگیا اور اسے بے ہوشی کے حصار میں پناہ مل گئی۔ جہاں ہر تکلیف اور ہر اذیت کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اب وہ درخت کے خشک تنے سے بندھا جھول رہا تھا۔ رائفل والے شخص کے اشارے پر کوڑے برداروں کے ہاتھ رک گئے تھے اور اس کے ساتھ کھڑے شخص نے آگے بڑھ کر تنے سے بندھے شخص کو کھول کر کسی بوری کی طرح شانے پر لاد لیا۔

"اندر لے جاکر اسے نیچے ڈال دو۔" رائفل بردار نے گونجیلی آواز میں کہا۔

دونوں کوڑے والے اپنے کوڑے سمیٹ کر اندر چلے گئے۔ ان کے پیچھے تیسرا فرد بھی بے ہوش ہونے والے کو لے گیا۔ البتہ رائفل بردار صحن میں موجود رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں تھا۔ اس نے کئی بار ارد گرد دیکھا اور درخت پر بھی نظر ڈالی تھی مگر میں پتوں میں اس طرح چھپا تھا کہ روشنی میں بھی بمشکل ہی نظر آتا۔ اس وقت تو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رائفل بردار بے قراری سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے شبہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔ بعض لوگوں کی چھٹی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ بالکل عورتوں کی طرح۔ جنہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی انہیں چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ وہ ٹہلتا ہوا فصیل تک آیا۔ اس نے پھاٹک سے باہر بھی جھانکا اور پھر اندر منہ کر کے کسی کو آواز دی فوراً ہی ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے تحکمانہ انداز میں اس شخص سے کہا۔

"جاکر شیرا اور چیتے کو لے آ۔"

بظاہر یہ کوئی حضرات تھے لیکن اس کے انداز سے میری چھٹی حس الارم دینے لگی۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ اس نے کتے منگوائے تھے۔ اب وہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی بے حد خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں ہر ممکن تیزی سے نیچے اترا اور جب جوتے پہن رہا تھا تو میں نے کتوں کی دبی دبی غراہٹیں سنیں۔ میں پوری قوت سے اس طرف بھاگا جہاں چندا موجود تھی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو چندا وہاں نہیں تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں اس جگہ چندا کو چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اسے پہلے دبی زبان میں پھر زور سے آواز دی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اسی لمحے پھاٹک کی طرف سے کتوں کے زور شور سے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں نے احتیاط بالائے طاق رکھی اور ٹارچ جلاتے ہوئے جنگل سے باہر کی طرف بھاگا۔ کتے بھونکتے ہوئے میری طرف ہی دوڑے آرہے تھے۔ انہیں میری بو مل گئی تھی۔ مجھے چندا کی فکر تھی لیکن میں خود کو محفوظ رکھتا تب ہی تو چندا کو تلاش کر سکتا تھا۔

میں لٹکتی اور نیچی شاخوں سے ٹکراتا الجھتا جنگل سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتوں کو اس معاملے میں سبقت تھی کہ وہ نیچے ہو کر چاروں پیروں سے دوڑ رہے تھے اور اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا کہ میں اس گھنے جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ میں نے رک کر ذرا کان لگائے..... جس طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی، اس کے مخالف سمت دوڑا۔ کتے تو دو ہی تھے لیکن وہ جس وحشیانہ انداز میں مسلسل بھونک رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ شکاری کتوں کا پورا گروپ میرے تعاقب میں ہو۔ میں نے جھاڑیاں ہٹانے کے بجائے جھک کر بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں رات میں اچھی طرح نظر آرہا تھا۔ بالآخر میں الجھی ہوئی شاخوں سے باہر نکلا تو میں نے خود کو جنگل کے کنارے پر پایا۔ میں شمال مغربی سمت سے اندر گیا تھا اور نکلا تو جنوب مغربی سمت میں۔ گویا مجھے چکر کاٹ کر جھاڑیوں کی طرف جانا تھا۔ اس صورت میں طویل حصہ کھلے میں عبور کرنا پڑتا اور میں تعاقب میں آنے والوں کی نظر میں آجاتا۔ کتے قریب آئے بغیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن اگر کتوں کے ساتھ رائفل بردار ہوتا تو وہ مجھے دور سے ہی نشانہ بنا سکتا تھا لہٰذا میں نے سیدھ میں دوڑ لگائی اور جب پہلا کتا نمودار ہوا تو میں جھاڑیوں تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک جسیم ہیولے کو تیر کی طرح میدان پار کر کے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے عقب میں ذرا سے وقفے سے دوسرا کتا چلا آرہا تھا۔ میں نے جانے کے بجائے وہیں رک کر ان کتوں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ جھاڑیوں میں وہ مجھے گھیر بھی سکتے تھے۔

میں تاریکی میں ایک جھاڑی میں دبکا تھا لیکن کتا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے زنجیر چھڑا کر پوری رفتار سے دوڑا چلا آرہا تھا۔ البتہ دوسرے کے ساتھ اس کا رکھوالا تھا۔ سب سے آخر میں رائفل بردار جنگل کے کنارے سے نمودار ہوا تھا۔ رائفل سے زیادہ خطرناک شے اس کے ہاتھ میں دستی سرچ لائٹ تھی۔ جیسے ہی اس نے سرچ لائٹ روشن کی میں نے آگے آنے والے کتے کو گولی مار دی۔ دس گز کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کتا کربناک آوازیں نکالتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ فائر کی آواز کسی نے نہیں سنی ہوگی لیکن شعلہ ضرور دیکھ لیا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ بدلی اور اسی اثنا میں رکھوالے کو جذبات میں آیا کتا کھینچتا ہوا خاصا آگے لے آیا تھا۔ میں نے اسے بھی گولی ماردی۔ جیسے ہی کتے نے چیخ ماری، میں تیزی سے جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس لمحے فضا رائفل کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی سیٹی بجاتی میرے سر کے اوپر سے گزری تھی۔ میرے عقب میں دوڑتے قدموں اور گالیاں دینے کی آواز آرہی تھی۔

"دونوں مر گئے۔" میں نے رائفل بردار کی آواز سنی لیکن کتوں کے رکھوالے نے کیا جواب دیا، یہ میں نہیں سن سکا تھا۔ مجھے کار تک پہنچنے کی فکر تھی اگر چندا محفوظ تھی تو اسے وہیں آنا چاہیے تھا۔ ایک شیطان فطرت آدمی کی وجہ سے ہمارا حویلی مشن تقریباً ناکام ہو گیا تھا۔ ہم سوائے اس کے کچھ نہیں معلوم کر سکے تھے کہ حویلی واقعی جرائم کا گڑھ تھی لیکن دشمن پر یہ بات آشکار ہو گئی تھی کہ کوئی لال حویلی کی سن گن میں ہے اور رب نواز جیسے شاطر کا ذہن فوری طور پر میری طرف جاتا۔ مجھے چندا کی فکر تھی۔ وہ نہ جانے اس جگہ سے کیوں ہٹی تھی جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی نے اسے خاموشی سے قابو کر لیا ہو مگر کس نے___ اگر یہ کام حویلی والوں کا ہوتا تو وہ چندا کو کس راستے سے اندر لے گئے تھے کیونکہ مین گیٹ اور سائیڈ والی دیوار کا راستہ میری نظروں میں تھا اور نہ ہی حویلی میں کوئی ہلچل مچی تھی۔

کتوں سے نجات پاتے ہی چندا کا مسئلہ میرے ذہن پر سوار ہو گیا۔ دو آدمیوں کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں تھی اول تو وہ اب جھاڑیوں میں گھسنے کا خطرہ ہی مول نہ لیتے۔ ان دیکھی موت سے سب ہی ڈرتے ہیں پھر ان وسیع رقبے پر پھیلی جھاڑیوں میں محض دو افراد مجھے کبھی تلاش نہ کر پاتے۔ یہاں یہ خطرہ تھا کہ فائر کی آواز سن کر حویلی سے مزید کمک نہ آجائے۔ اسی وجہ سے میں نے جلد از جلد گاڑی تک پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ہر ممکن تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ اب مجھے خراشوں اور کپڑے خراب ہونے کی فکر بھی نہیں تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ چندا خیریت سے ہو۔ ان درندوں کے ہتھے نہ چڑھی ہو۔ عورتوں کے معاملے میں رب نواز اور اس کے گرگوں کی ذہنیت سے میں اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ بے شک چندا مارشل آرٹ کی ماہر سہی اور اگر کھلے ہاتھ پیر سے مقابلہ ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ وہ درجن بھر افراد کے قابو میں نہ آتی لیکن عیار شخص اسلحے کی مدد سے اس پر قابو پاکر اسے اپنی بربریت کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ چندا کا حسن بے قابو کر دینے والا تھا۔ میں دفن کی جانے والی عورت کے بارے میں کیا جانے والا تبصرہ نہیں بھولا تھا۔ چندا اگر ان کے قابو میں تھی تو اس کی جان کے ساتھ اس کی آبرو بھی خطرے میں تھی۔

میں بہ مشکل اس جگہ تک پہنچا۔ جہاں میں نے کار چھوڑی تھی۔ اسے خالی پاکر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ چندا غائب تھی وہ اب تک نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے آنے کا امکان کم ہی تھا پھر بھی میں نے اس کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں بے قراری سے کار کے پاس ہی ٹہل رہا تھا۔ میرے کان کسی آہٹ پر مرکوز تھے۔ جو آنے والے کا پتا دیتے لیکن کوئی آہٹ نہیں تھی کوئی چاپ نہیں تھی۔ ہر گزرتے لمحے میری بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مجھے چندا کا انتظار کرتے نصف گھنٹا ہو چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ حویلی کے گرد جنگل کی تاریکی میں بھٹک گئی ہو لیکن میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو کتے میرے علاوہ اس کی طرف بھی لپکتے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کتوں کی آمد سے پہلے ہی جنگل سے نکل چکی تھی۔ اگر وہ باہر آتی تو یقیناً کار کے پاس موجود ہوتی لیکن ایسا نہیں تھا۔ یعنی اب ایک ہی جگہ اس کی موجودگی ممکن تھی اور وہ تھی لال حویلی۔ اسے کسی ترکیب سے قابو پاکر ایسے راستے سے اندر لے جایا گیا تھا جو میری نظر میں نہیں تھا۔ ممکن ہے حویلی کی فصیل میں کہیں اور بھی دروازے ہوں یا پھر کوئی خفیہ راستہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جنگل سے کوئی خفیہ سرنگ حویلی کے اندر تک جاتی ہو۔ قانون شکن عناصر اپنے ٹھکانوں میں ہمیشہ فرار کا ایک راستہ ضرور رکھتے ہیں۔ چندا کو کسی ایسے ہی راستے سے اندر لے جایا گیا تھا۔ یہ خیال اذیت ناک سہی لیکن منطقی طور پر چندا کی گمشدگی کا یہی واحد معقول جواز ہو سکتا تھا۔

معاً میں نے ہوا کے دوش پر لہراتی آوازیں سنیں۔ کچھ

افراد اسی طرف آ رہے تھے اور اس کا مطلب تھا کہ حویلی سے اور افراد بلا کر جھاڑیوں میں میری تلاش کا کام شروع کروا دیا گیا تھا۔ اب یہاں سے نکل جانا ہی میرے لیے بہتر تھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور اسے گھما کر سڑک پر لے آیا۔ سڑک پر آتے ہی میں نے ایکسی لیٹر پوری قوت سے دبایا تھا۔ کار چیتے کی طرح جست لگا کر بھاگی تھی۔ میں نے ملک مہربان کے بجائے آرمی فیلڈ ہیڈ کوارٹر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں جلد از جلد میجر شاہد سے ملنا چاہتا تھا۔ چندا کی سلامتی کے لیے ضروری تھا کہ لال حویلی پر فوری چھاپا مارا جائے۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ کچھ روشنیاں میرے تعاقب میں چلی آ رہی ہیں۔ کوئی گاڑی تھی۔ جب وہ روشنی اتنی نزدیک آ گئی کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ یہ کھلی جیپ تھی اور اس میں اوپر سوار افراد کے عزائم ان کے لہراتے ہوئے ہتھیاروں سے جھلک رہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ ایک سیدھی اور صاف سڑک تھی۔ اگر سڑک کچی ہوتی یا سرے سے نہ ہوتی تو جیپ لمحوں میں لانسر کو آ لیتی لیکن اب میں اپنی کار کی رفتار آزما سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے کار کی رفتار کو تیز کیا۔ عقب سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ فاصلہ شاید دو سو گز بھی نہیں تھا اور رائفل کی مار کے لیے یہ فاصلہ کچھ نہیں تھا۔ گولیاں کار کے دائیں بائیں سے گزرنے لگیں۔ جیپ چلتے ہوئے خاصے جھٹکے لگتے ہیں اس لیے نشانہ خطا جا رہا تھا پھر بھی گولیاں خاصی قریب سے گزر رہی تھیں۔ اس کے بعد ان کا نشانہ بہتر ہونے لگا تھا اور ایک گولی نے عقبی شیشہ بکھیر دیا۔ وہ ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور گولیاں تواتر سے ڈکی پر لگ رہی تھیں پھر ایک گولی کام کر گئی۔ عقبی ٹائر دھماکے سے برسٹ ہوا۔ میں نے رفتار کم کرنے کے لیے بریک لگائے تو کار گھوم کر کچے میں اتر گئی۔ یہاں دونوں طرف ہی غیر آباد زمینیں تھیں جن میں جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کار اتر کر لہرانے اور لڑکھڑانے لگی۔ رفتار خاصی تیز تھی۔ میں اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کچے میں آ کر اس کا دوسرا ٹائر بھی پھٹ گیا اور کار الٹ گئی۔ میں چھت سے ٹکرایا۔ کار پھر سیدھی ہوئی۔ میں اپنی نشست پر گرا۔ کار نے تین چار قلابازیاں کھائی تھیں۔ میں اندر ہی اندر زیر و زبر ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا تو چکروں کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ بالآخر کار نے آخری قلابازی کھائی اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ جھٹکے نے میرے حواس بحال کر دیے تھے۔ میں نے فوری طور پر اپنی حالت کا اندازہ لگایا۔ میں ٹوٹ پھوٹ سے بچ گیا تھا لیکن سر پر اسٹیئرنگ لگنے سے گومڑ نکل آیا تھا۔ ہونٹ بھی کسی شے سے لگ کر زخمی ہوا تھا۔ میں نے بریٹا نکالنا چاہا تو پستول جیب میں نہیں تھا۔ الٹنے پلٹنے کے دوران میں ہی وہ جیب سے نکل گیا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ ادھر ادھر ہاتھ مارے تو وہ مجھے فرنٹ سیٹ پر مل گیا۔ اب باہر نکلنا تھا۔ اس سے پہلے کہ جیپ میرے سر پر پہنچ جاتی۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ جام ہو گیا تھا مجھے اسی کی توقع تھی۔ میں نے بریٹا کے دستے سے شیشہ توڑ دیا اور جسم سکیڑ کر باہر نکل آیا۔ میرا جوڑ جوڑ اس حادثے سے ہل گیا تھا۔ ستر اسی میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتی کار کے الٹنے کے بعد میرا اپنے پیروں پر کھڑے ہونا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

جیپ کی غراہٹ سن کر میں زمین پر گر گیا اور رینگتا ہوا کار سے دور جانے لگا۔ کار میں کام کی کوئی شے نہیں تھی۔ میں نے شکر ادا کیا۔ میں نے کار سے سوٹ کیس نکال لیا تھا وہ ملک مہربان کے گھر میں محفوظ تھا اگر کار میں ہوتا تو میرے لیے اسے لے کر بھاگنا ناممکن تھا اور اس میں موجود ثبوت رب نواز کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتے۔ جیپ لمحوں میں آ کر وہاں رکی اور اس میں سے لوگ کودے۔

"کار خالی ہے۔" کسی نے چلا کر کہا "بھاگ گیا حرامزادہ۔"

"بھاگ کر کہاں جائے گا۔" رائفل بردار کی آواز آئی "یہیں کہیں ہو گا تلاش کرو اسے۔"

وہ پھیل گئے اور جھاڑیوں اور گھاس کو کھنگالنے لگے۔ میں نے بریٹا چیک کیا۔ اس میں ابھی سات گولیاں باقی تھیں اور آنے والے چار یا پانچ تھے مگر وہ سب خطرناک اسلحے سے مسلح تھے۔ ان کے پاس خودکار رائفلیں تھیں۔ ذرا سا شبہ ہوتے ہی وہ گولیاں برسا کر مجھے مار دیتے۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ وہاں سے دور نکل جاؤں۔ میں آگے کی طرف رینگنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ پودوں اور گھاس کو حرکت دیے بغیر آگے بڑھوں۔ چاند نکل آنے سے ماحول پہلے جیسا تاریک نہیں رہا تھا۔ اگر وہ جھاڑیاں ہٹاتے تو میں صاف ان کی نظر میں آ جاتا۔ میں ہر ممکن تیزی سے ان سے دور جا رہا تھا۔ اگرچہ ان کی رفتار مجھ سے زیادہ ہی تھی لیکن جیسے جیسے میں کار سے دور ہو رہا تھا' میری تلاش کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اسی تناسب سے میرے تلاش کر لیے جانے کے امکانات کم ہوتے جا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے کسی نے سیدھا میرا رخ نہیں کیا تھا بلکہ وہ دوسری سمتوں میں مجھے تلاش کر رہے تھے۔ خاصی دور نکلنے کے بعد میں نے ذرا سا سر

اٹھایا۔ تاکہ دشمن کو دیکھنے کے ساتھ فرار کے لیے مناسب سمت بھی تلاش کر سکوں۔ دشمن خاصا پیچھے رہ گیا تھا۔ دراصل وہ مجھے تلاش ہی غلط سمت میں کر رہے تھے۔ اس جگہ جھاڑیاں تقریباً ختم ہو گئی تھیں اور کچھ فاصلے پر کھیت شروع ہو رہے تھے جو فی الوقت خالی تھے اور میں یہاں پر فوراً ہی نگاہوں میں آ جاتا۔ کھیتوں سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر کسی گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اکا دکا جگہوں پر روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف ذرا آگے سے ایک باغ تھا جو خاصے وسیع رقبے پر پھیلا تھا۔ میں وہاں تک پہنچ جاتا تو پھر میرے لیے کوئی مسئلہ نہ رہتا۔ میں دشمن سے بھی محفوظ رہتا اور گاؤں تک بھی جا سکتا تھا مگر باغ تک پہنچنا بھی آسان نہیں تھا۔ مجھے جھاڑیوں کے اس سرے کے متوازی سفر کرنا تھا اور دشمن رفتہ رفتہ اس طرف آ رہا تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر آگے کی طرف سرکنا شروع کر دیا بلکہ جہاں جھاڑیاں ذرا اونچی ہوتیں میں جھکے جھکے دوڑ بھی لگا دیتا تھا۔ ایسے ہی کسی موقع پر دشمن کی نظر مجھ پر پڑ گئی جس کے بعد زلزلہ سا آ گیا۔ وہ سب بیک وقت چیخ چیخ کر میری نشان دہی کرنے لگے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی' میں جلد از جلد باغ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

رینگتے ہوئے مجھے اچانک ہی ذرا آگے آہٹ محسوس ہوئی۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی وہ سب خاموش ہو گئے تھے اور اب خاموشی سے مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں ساکت ہو گیا۔ ممکن تھا کہ ہوا سے جھاڑی ہلی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ دشمن ہو۔ میں نے بریٹا اس طرف سیدھا کر دیا جس طرف سے آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ دشمن ہوا تو اسے ذرا بھی مہلت نہیں دوں گا۔ جھاڑیاں ساکت تھیں اور جب میں دوبارہ رینگنے کا ارادہ کر رہا تھا' جھاڑیاں دوبارہ ہلیں اور ان سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ مجھے زمین پر لیٹے دیکھ کر اس کا منہ تعجب سے کھلا تھا کہ میں نے اس کے کھلے منہ میں گولی مار دی۔ اس نے دہاڑ نما آواز نکالی جو ادھوری رہ گئی۔ وہ جھاڑیوں میں گرا اور کرب نزع میں ہاتھ پیر مارنے لگا۔ جھاڑیوں میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔

"اوئے کیا ہوا؟" کسی نے چلا کر کہا۔

ظاہر ہے وہ سب اس طرف آتے لہٰذا میں نے ایک عام نفسیات کے نکتے سے فائدہ اٹھایا اور ان سے دور جانے کے بجائے میں نے خطرہ مول لے کر ان کی طرف رینگنا شروع کر دیا وہ بے پروا دوڑے چلے آ رہے تھے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ان کی طرف آؤں گا۔ ایک تو میرے پاس ہی سے گزرا تھا۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے اپنے ساتھی کی لاش دیکھ لی اور دیوانے ہو گئے۔ انہوں نے اندھا دھند چاروں طرف گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ شکر ہے کہ اپنے عقب کی طرف ان کا دھیان کم تھا لیکن میں احتیاطاً زمین سے چپک گیا۔ کئی گولیاں میرے اوپر سے گزری تھیں۔ ان کا جوش ذرا کم ہوا تو میں نے دوبارہ جھکے جھکے میں باغ کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔

ایک ساتھی کے مرنے سے وہ نہ صرف محتاط بلکہ خوف زدہ بھی ہو گئے تھے۔ اب ذرا سا پتا کھڑکتا تھا تو فائرنگ شروع کر دیتے تھے۔ میں نے رینگنے کے دوران کئی بار فائرنگ کی آواز سنی۔ پچھلے دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور کار حادثے نے مجھے تھکا ڈالا تھا۔ جان کا خوف نہ ہوتا تو میں رینگنا ترک کر کے آرام کرتا مگر رکنے کا مطلب اپنی شامت کو آواز دینا تھا۔ اس وقت وہ اتنے اشتعال میں تھے کہ مجھے جہاں پاتے بلا توقف گولی مار دیتے۔ میرے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ کہنیاں اور گھٹنے چھل گئے تھے اور بالوں میں گرد و غبار اور جھاڑ جھنکاڑ بھر گیا تھا۔ مجموعی طور پر میری حالت دگرگوں تھی۔ ایک بار میں نے رینگتے ہوئے ان کا جائزہ لیا۔ وہ خاصی دور تھے اور اب آزادانہ چلنے کے بجائے محتاط انداز میں حرکت کر رہے تھے۔ میں نے رینگنا جاری رکھا۔ لوگوں نے اکثر فلموں اور ڈراموں میں فوجیوں کو زمین پر اسی طرح رینگتے دیکھا ہو گا لیکن یہ کام کس قدر دشوار ہے' یہ صرف وہی جانتا ہے جو اس کے عملی تجربے سے گزر چکا ہے۔ رینگتے رینگتے میری حالت خراب ہونے لگی تھی۔ تھکن سے میرے بازو اور ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ بس ایک میکانکی سے انداز میں آگے حرکت کر رہا تھا۔ جیسے میں ساری عمر رینگتا رہوں گا۔ نہ یہ منحوس جھاڑیاں ختم ہوں گی اور نہ باغ کی حد شروع ہو گی۔ اس وقت میرا یہ حال تھا کہ اگر کوئی دشمن سر پر آ جاتا تو شاید میں اسے گولی مارنے میں بھی ناکام رہتا۔

رینگتے رینگتے ایک بار میں نے سامنے دیکھا تو باغ کی حد کو پاس ہی پا کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دم توڑتی توانائی پھر سے جی اٹھی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ان تینوں کا معائنہ کیا۔ وہ کم بخت اسی سمت میں آ رہے تھے میں نے تاخیر مناسب نہ سمجھی اور اٹھ کر جھکے جھکے دوڑتے ہوئے باغ میں گھس گیا۔ فوراً ہی کچھ گولیاں میری طرف لپکی تھیں۔ لیکن میں باغ کی چار دیواری عبور کر چکا تھا۔ اندر آتے ہی میرے اندر ایک نیا اعتماد آ گیا تھا۔ میں اب آزادانہ دوڑ سکتا تھا اور میں نے دوڑنے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ درختوں کے درمیان سے تیزی

ہوئے میں اچانک ہی ایک سرخ کھپریل کی چھت والی عمارت کے سامنے جا پہنچا تھا۔ دراصل باغ کے وسط میں یہ بنگلا تھا۔ جو غالباً باغ کے مالکوں نے اپنے ٹھہرنے کے لیے بنوایا تھا۔ بنگلے کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہاں پر لوگ موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ موت کے ہرکارے میرے تعاقب میں بلا تکلف باغ میں گھس آئیں گے۔ میرا جلد از جلد کہیں چھپ جانا ضروری تھا۔ ممکن ہے رب نواز کے اس باغ کے مالک سے بھی تعلقات ہوں اس صورت اس باغ کے رکھوالے ضرور ان کا ساتھ دیتے۔

اس لمحے باغ کے دوسری طرف سے بولنے کی آواز آئی اور پھر آوازیں بنگلے کی طرف آنے لگیں۔ یہ میرے پیچھے آنے والے رب نواز کے کتے نہیں تھے ورنہ وہ آوازیں نہ نکالتے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بنگلے کے تین طرف برآمدہ تھا۔ جس میں ستون اور جالیاں لگی تھیں۔ ان پر مختلف بیلیں چڑھ رہی تھیں۔ البتہ عقبی حصے میں ایک قطار میں کھڑکیاں تھیں۔ جن کے نیچے پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ ساری کھڑکیاں بند تھیں اور ان میں سے دو کے پردوں کے پیچھے سے روشنیاں جھلک رہی تھیں۔ معاً اس کھڑکی کا پردہ سرکا۔ جس کے سامنے میں تھا۔ اس سے پہلے پردہ پوری طرح ہٹتا' میں تیزی سے جھک گیا اور دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ کھڑکی کھلی اور کسی نے باہر جھانکا۔ آوازیں اب بے حد نزدیک آگئی تھیں۔ شاید وہ لوگ بنگلے کے دائیں طرف تھے اور کسی لمحے عقبی سمت میں آسکتے تھے۔ دوسری طرف میرے سر پر کوئی سوار تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مسلح ہو ورنہ مجھے دیکھ کر آواز تو نکال ہی سکتا تھا۔ میرے ذہن نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے قدموں کو پوری قوت سے اوپر کی طرف اچھالا۔ میرا ایک ہاتھ کھڑکی پر جما اور میں اندر جاتے ہوئے ایک نرم و نازک وجود سے ٹکرایا جو اس آفتِ ناگہانی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی ایک اضطرابی چیخ نکلی۔ وہ زمین پر گری اور میں اس کے اوپر گرا تھا۔ ہر بات سے بے فکر ہو کر میں نے سب سے پہلے اس کا منہ دبایا۔

"آواز نہ نکالنا۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا "ورنہ۔۔۔" اور بریٹا کی نال اس کی گردن پر لگا دی۔ میرے چوڑے پنجے کے نیچے اس کے سارے نقوش دب گئے تھے۔ البتہ غزالی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ان میں بے پناہ خوف کے ساتھ حیرت بھی نمایاں تھی۔ اس نے آہستہ سے سرہلایا اور میں نے اس کا منہ دبائے دبائے اسے جھٹکے سے کھڑا کیا۔

کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کر دیا۔ اس وقت آنے والوں کی آوازیں قریب آگئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ میرا صرف ایک ہاتھ اس کا منہ دبائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے پستل سنبھال رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے مجھے نوچنے کھسوٹنے یا اپنا منہ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ اس طرح اپنے تعاون کا دھوکا دے کر اپنا منہ آزاد کرانا چاہتی تھی۔ تاکہ چیخ کر لوگوں کو متوجہ کر سکے۔ اس نے بھی آنے والوں کی آواز سن لی تھی۔ اس نے آنکھوں سے التجا کی کہ میں اس کا منہ آزاد کر دوں مگر میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لمحے کھڑکی پر دستک ہوئی اور کسی نے بلند آواز سے کہا۔

"مالکن۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں۔"

"یہ کون ہے؟" میں نے سرگوشی کی پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس کا منہ بند تھا آواز کیسے نکالتی۔ دستک پہلے سے تیز تھی۔ اس نے پھر مالکن کی خیریت دریافت کی تھی۔ اس بار اس کے انداز میں تشویش تھی۔ غالباً تیسری بار وہ کھڑکی توڑ دیتا۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا "اسے مطمئن کرو۔" اور اس کا منہ آہستہ سے آزاد کر کے میں نے اسے دھمکایا "ذرا سی غلطی تمہاری جان لے لے گی۔"

"پلیز۔" اس نے آہستہ سے کہا "میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی۔"

ہاتھ ہٹتے ہی میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ رب نواز کی بہو اور دلنواز کی بیوی فریال تھی مگر یہ وقت حیرت میں ضائع کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسے کھڑکی کی طرف دھکیلا اور نیچے ہو گیا۔ میرے پستول کا رخ اسی کی طرف تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کھڑکی کھولی اور کہا "کیا بات ہے؟"

"مالکن! آپ کے چیخنے کی آواز آئی تھی۔" اس آواز نے کہا "باغ میں ایک مسلح قاتل گھس آیا ہے۔ اندر تو سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں یہاں سب ٹھیک ہے مگر میں نے سامنے والے حصے میں کسی سائے کو دیکھا تھا؟"

"وہی ہو گا۔" مجھے رائفل بردار کی آواز آئی "دیکھو اسے۔"

"آپ فکر نہ کریں مالکن۔ رمضو ادھر ہی رہے گا۔" پہلے والے نے جواب دیا "آپ کھڑکی بند رکھیں اور جب تک میری آواز نہ آئے کوئی کھڑکی دروازہ نہ کھولیں۔"

"جاؤ اسے دیکھو۔" فریال نے کھڑکی بند کر دی۔

اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو بہکا دیا تھا جو میری تلاش میں تھے۔ اب وہ مجھے بنگلے کے علاوہ ہر جگہ تلاش کرتے۔ میں نے اٹھتے ہوئے ذرا پردہ سرکا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ لوگ اب بنگلے کے عقبی باغ میں مجھے تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے اور آدمی بلوا لیے تھے۔ میں نے مسکرا کر فریال کی طرف دیکھا۔ "شکریہ۔ تم نے نہ صرف مجھے بلکہ خود کو بھی بچا لیا۔"

اس نے اپنے شانوں سے ذرا نیچے تک سرسراتے ریشمی بال جھٹکے "میں نے صرف وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا تو وہ پورے دنوں سے تھی اور میں شائستہ کو یرغمال بنا کر رب نواز کی قید سے فرار ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن اس وقت جو فریال میرے سامنے تھی۔ وہ دل کشی کا نازک پیکر تھی۔ ماں بننے کے بعد اس کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ رخساروں پر سرخی تھی اور آنکھوں میں چمک۔ اس نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ جس میں سے اس کا دلکش جسم نمایاں تھا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ خوبصورتی سے آراستہ ایک خواب گاہ تھی۔ جہازی سائز کے بستر پر اس کا بچہ ایک کونے میں سو رہا تھا۔ اس نے جا کر اسے چادر سے اڑھا دی۔

"یہ دلنواز کا بچہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سرہلایا "ہاں' وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔"

"مجھے حیرت ہے تمہارا شوہر اسپتال میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے اور تم یہاں پر ہو۔ اس کے پاس ہونے کے بجائے۔"

"اگر میں وہاں ہوتی تو اب تک اپنی ساس کی طرح فرار ہو چکی ہوتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے اس جگہ قید رکھا گیا ہے۔ میں بنگلے سے باہر نہیں جا سکتی۔"

"ایک اور کہانی۔" میں نے گہری سانس لے کر سوچا۔ لیکن فی الوقت میں کسی کی کہانی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں رب نواز کے شکاری کتوں سے بچتا پھر رہا تھا اور مجھے چندا کی فکر بھی تھی۔ میں فریال پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ذرا سی لغزش مجھے مروا دیتی۔ میں نے کمرے کی تلاشی لی۔ بستر دیکھا۔ بالآخر ایک دراز سے مجھے پستول مل گیا۔ یہ اعشاریہ بائیس کا چھوٹا سا پستول تھا۔ جو عام طور پر خواتین استعمال کرتی ہیں۔ پستول برآمد ہوتے دیکھ کر اس کا رنگ ایک لمحے کو بدلا تھا مگر فوراً ہی معمول پر آگئی تھی۔ پستول میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"بنگلے کے اندر اور کتنے لوگ ہیں؟"

"تین آدمی ہیں۔ ایک خانساماں ہے۔ ایک میری ذاتی ملازمہ ہے جو بچے کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ رات کو وہ میرے ساتھ ہی ہوتی ہے۔"

"اس وقت کہاں ہے؟"

"اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے میں نے اسے آرام کرنے بھیج دیا۔"

"تیسرا کون ہے؟"

وہ کسی قدر ہچکچائی پھر اس نے جواب دیا "لالی۔ وہ مجھے بنگلے سے باہر جانے سے روکنے پر مامور ہے۔"

رب نواز اپنے خاندانی معاملات میں لالی کا خوب استعمال کر رہا تھا۔ وہ کسی شہ زور مرد سے بھی زیادہ طاقت ور تھی اور اس کو زنان خانے میں رکھنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ رب نواز کے خاندان کی جو اخلاقی حالت تھی' ان سے یہ توقع محال تھی کہ وہ اپنی عورتوں پر بھروسا کریں گے۔ لالی کا سن کر میں فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ صرف حیوانی قوت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ اس کے پاس خطرات بھانپنے والی حیوانی حسیں بھی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"لالی کہاں ہے؟"

"کمرے کے باہر گیلری میں ہو گی۔ وہ ہمہ وقت میرے کمرے کے سامنے رہتی ہے۔"

"سنو! کیا اسے کسی طرح بنگلے سے باہر بھیجا جا سکتا ہے۔"

"نہیں۔ لالی میری کوئی بات نہیں مانتی۔ وہ صرف رب نواز کی بات سنتی اور مانتی ہے۔" فریال کے انداز میں بے بسی تھی۔

بستر کے برابر رکھی میز پر پانی کا جگ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی شدت سے پیاسا تھا۔ میں نے پورا جگ ہی خالی کر دیا۔ پانی پی کر مجھے ذرا سکون ملا تھا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا۔ ناصر عظیم کی جگہ ایک درماندہ اور تباہ حال شخص کھڑا نظر آیا تھا۔ میرے بال اور چہرہ مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ قمیص شانے اور آستین سے پھٹ گئی تھی۔ سامنے کے بٹن ٹوٹ گئے تھے اور حالت بری تھی۔ مجھے حیرت تھی کی فریال نے مجھے پہچانا کس طرح۔

"تم منہ ہاتھ دھو لو۔" اس نے پیش کش کی "باتھ روم ساتھ ہی ہے۔"

خیال اچھا تھا۔ لیکن میں اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ "تم بھی چلو۔" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا تو وہ بلا مزاحمت چلی آئی۔ باتھ روم خاصا کشادہ اور جدید سہولیات سے آراستہ تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ بال صاف کیے۔ خراشوں اور زخموں پر ڈیٹول لگایا۔ وہیں رَیک میں اسپرین کی شیشی سے دو گولیاں لیں۔ باہر آکر اس نے مجھے تھرماس میں رکھی کافی دی۔ کافی پی کر میں نے خود کو انسانی بدن میں محسوس کیا تھا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے ایک خوبصورت اور نازک عورت سے اب تک خاصا درشت سلوک کیا تھا۔

"معاف کرنا۔ میں دراصل موت و زندگی کی درمیانی شاہراہ پر سرپٹ دوڑتا یہاں تک آیا ہوں اس لیے تمہیں میرے رویّے میں سختی محسوس ہوئی۔ ورنہ خواتین کے معاملے میں میں خاصا شریف آدمی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔ اس روز جب تم نے مجھے یرغمال بنایا تھا۔ دہشت سے میرا برا حال تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھ سے وہی سلوک کرو گے جو مرد بے بس عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں اور جو میں۔۔۔ آئے دن اپنے گھر میں ہوتے دیکھتی رہتی تھی۔" اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔ "لیکن جب تم نے آرام سے ہمیں جانے دیا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس وقت تم مجھے فرشتہ نظر آئے تھے۔"

میں ہنس دیا "رب نواز کے خاندان والوں کے سامنے تو شیطان بھی فرشتہ نظر آئے گا۔"

"امی تم سے بے حد متاثر تھیں۔ کئی بار انہوں نے رب نواز کے سامنے بھی تمہاری تعریف کی اور ایک بار وہ اتنا بگڑ گیا کہ اس نے امی کو مارا تھا۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ اس کی ساس صاحبہ مجھ سے کس انداز میں متاثر تھیں اور انہوں نے اپنا مقصد کس طرح پورا کیا تھا۔ میں نے پوچھا "تم اپنی سوتیلی ساس کو تو امی کہہ رہی ہو لیکن سگے سسر کو اس کے نام سے پکار رہی ہو؟"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا "کیوں کہ وہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اسے کسی قابلِ احترام رشتے سے پکارا جائے۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ رب نواز کے لوگ تمہارے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" میں ہنسا تو وہ خفیف سی ہو گئی۔

"میرا۔۔۔ مطلب ہے کہ ابھی یہ کہاں سے تمہارے پیچھے لگے؟"

"بس لگ گئے۔" میں نے گول مول انداز میں کہا "میں یہاں اپنے ایک واقف کار کے پاس آیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا اور پیچھے لگ گئے۔ بائی دی وے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ رب نواز کے ہی آدمی تھے؟"

"ان میں سے جس نے لمبی سی رائفل رکھی تھی جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اسے میں نے کئی بار رب نواز کے پاس آتے دیکھا ہے۔ جب لالی آئی تھی تو یہی شخص اس کا نگران تھا۔ لالی اس کے اشاروں پر چلا کرتی تھی اور اس نے اسے رب نواز کا حکم ماننا سکھایا تھا۔ اس کا نام شاید بہادر ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی پھر اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا "وہ کہہ رہے تھے کہ تم قاتل ہو۔ کسی آدمی کو مار دیا ہے۔"

"میں اسے نہیں مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا اور اسے مختصراً اپنے تعاقب اور کار کو پیش آنے والے خطرناک "حادثے" کے بارے میں بتایا۔ جس میں میرا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی رب نواز کے کرگے مجھے تلاش کرتے رہے اور اس کوشش میں ایک کی ملاقات ملک الموت سے ہو گئی تھی۔

"تم نے ٹھیک کیا۔ ورنہ وہ ضرور تمہیں مار دیتا۔ یہ بے حد سفاک لوگ ہیں۔ انسانی جان کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"غالباً تمہارے اس رویّے کے پس پشت ان لوگوں سے نفرت بھی ہے۔" میں نے غور سے اسے دیکھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی "میں ایک کمزور عورت ہوں۔ ان لوگوں کے خلاف کھل کر کچھ نہیں کر سکتی مگر ان کے دشمن کا ساتھ ضرور دے سکتی ہوں۔"

اس کے لہجے میں سچائی کے تاثر نے مجھے متاثر ضرور کیا تھا لیکن میں نے یہ بات اپنے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دی۔ اگر وہ اداکاری کر رہی تھی تو بلاشبہ ڈراموں میں صفِ اول کی اداکارہ بن سکتی تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ بے شمار اداکاروں سے کہیں بہتر تھی۔ اچانک اس کا بچہ کسمسایا پھر اس نے ہلکے سروں میں رونا شروع کر دیا۔ فریال نے لپک کر اسے گود میں لیا اور چمکارنے لگی مگر بچے کے سُروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس نے اپنا والیوم بڑھانا شروع کر دیا۔ تو فریال نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"اسے بھوک لگ رہی ہے۔ فیڈ کراتا ہے۔"

"تو کراؤ۔" میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔

وہ ہچکچائی "تمہارے سامنے۔"

"سوری۔" میں نے کہا "میں رخ پھیر لیتا ہوں۔ تب بھی تم میری نگاہوں میں رہو گی۔"

اس نے گہری سانس لی اور بچے کو دوسری طرف لے کر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے نظر جما کے دروازے کو دیکھنا شروع کر دیا مگر آنکھ کے گوشوں سے فریال پر نظر بھی رکھی تھی۔ اس کی ذرا سی حرکت مجھے خبردار کر سکتی تھی۔ بچہ اب خاموش تھا۔ یعنی اس کی ضرورت پوری ہو رہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا لیکن میرا جسم شدت سے آرام طلب کر رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ نرم و ملائم بستر پر لیٹ کر سو جاؤں مگر ساتھ ہی یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں یہ نیند ہمیشہ کی نہ ہو جائے۔ تقریباً بیس منٹ بعد فریال نے بچے کو برابر میں لٹا کر اپنا گاؤن درست کیا اور میری طرف دیکھ کر شکر آمیز انداز میں مسکرائی۔

"تم واقعی اچھے آدمی ہو۔"

"میں صرف آدمی ہوں۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "ویسے بہت سارے لوگ مجھے برا آدمی بھی کہتے ہیں۔"

"ان کی نظر کمزور ہو گی یا ان کے دماغ میں برائی ہو گی۔" اس نے بچے کو درست کرکے اس کی کاٹ پر لٹاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے معاشرے میں ایسے کتنے لوگ ہوں گے کہ ایک جوان اور حسین عورت ان کے رحم و کرم پر ہو اور وہ اس کی بے بسی سے فائدہ نہ اٹھائیں۔"

"ایسے بھی بے شمار ہوں گے۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے اور یہاں ابھی تک نیکی کو افضل مانا جاتا ہے۔ نسبت بدی کے۔"

وہ میرے پاس چلی آئی۔ کرسی کے بالکل قریب رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کوئی بہت اچھا پرفیوم لگا رکھا تھا۔ جس کی دھیمی سی خوشبو اس کے بدن کی مہک کے ساتھ مل کر آ رہی تھی۔ "تمہارا حلیہ خراب ہو رہا ہے۔ بہتر ہو گا کہ شرٹ چینج کر لو۔" وہ بولی "میرے پاس دلنواز کے کچھ کپڑے پڑے ہیں۔ تم لمبے قد کے ہو لیکن چلے گا۔"

"میڈم اس وقت مجھے اپنی کھال کی فکر ہے۔ شرٹ کی نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا "لیکن آپ عنایت کر سکیں تو مہربانی ہو گی۔"

اس نے اٹھ کر الماری کھولی تو میں احتیاطاً اس کے عقب میں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شرٹ کے بجائے کوئی ہتھیار نکال کر مجھے شوٹ کر دیتی اور بعد میں اپنی کامیاب پالیسی پر قہقہے لگاتی کہ اس نے کس طرح مجھے الو بنا دیا اور پھر نوٹ بھی کر دیا۔ لیکن اس نے خالی سیاہ ہی رنگ کی ایک قمیص نکالی۔ اپنے عقب میں مجھے پا کر وہ ذرا ٹھٹکی۔

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔" اس کے انداز میں ہلکی سی خفگی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنی قمیص اتاری اور فریال کی دی ہوئی شرٹ پہننے لگا تو اس نے روک دیا "ایک منٹ یہ تمہارے شانے پر زخم ہے۔"

"رینگنے کے دوران میں آیا تھا۔ معمولی سا زخم ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"ٹھہرو میں اسے صاف کر دوں۔" وہ باتھ روم گئی اور وہاں سے میڈیکل باکس لے آئی۔ اس نے پہلے ڈیٹول سے زخم صاف کیا پھر اس پر میڈی کیٹڈ پٹی چپکا دی پھر اس نے ایک چھوٹا تولیا پانی میں بھگو کر لا کر دیا۔

"اس سے جسم صاف کر لو۔ بہت مٹی ہو رہی ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر تولیا اس سے لے لیا۔

"فریال تم میرے لیے اتنا کیوں کر رہی ہو؟"

اس نے مجھ سے نظریں چرائیں۔ "اس لیے کہ تم ایک اچھے آدمی ہو۔"

میں مسکرایا "کیا تم ہر اچھے آدمی پر اسی طرح مہربان ہو جاتی ہو؟"

"نہیں، میں ذاتی طور پر تمہیں اچھا انسان سمجھتی ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ دنیا تمہیں کیا کہتی ہے۔"

"تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے مگر میں منگوا لیتی ہوں۔"

"نہیں پھر چھوڑو۔"

"ڈرو مت، میں خانساماں سے کہوں گی۔ وہ سینڈوچ بنا لائے گا۔ اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔ میں دودھ بھی منگوا لوں گی۔"

"کس سے؟" میں نے غور کیا "کیا تم باہر جاؤ گی؟"

"نہیں، بہت آسان ہے۔" اس نے بستر کے دوسری طرف اشارہ کیا "وہاں انٹرکام ہے۔ میں اس پر کہوں گی، خانساماں کچن میں ہی ہوتا ہے۔"

"تو بس اسے جگا لو۔" میں نے بے تابی سے کہا "رات کے بارہ بج رہے تھے اور مجھے کھائے ہوئے خاصی دیر گزر چکی تھی۔ فریال نے انٹرکام کا بٹن دبا کر کچن سے رابطہ کیا اور خانساماں کو چکن بٹر سینڈوچ تیار کرکے لانے کا حکم دیا۔ میں

نے اسے اشارے سے کافی کا بھی کہا "اس نے کافی بھی تیار کرنے کو کہا تھا۔ انٹرکام بند کر کے اس نے اپنے بچے کو دیکھا۔ اسے پیار کیا اور چہرے پر جالی دار کپڑا ڈال دیا تاکہ مچھر نہ کاٹنے پائیں۔ موسم ذرا سرد ہوتے ہی مچھروں نے یلغار کی تھی اور کمرے میں خوشبودار میٹ جلنے کے باوجود فضا میں اکا دکا مچھر اڑ رہے تھے۔

اسپرین سے جسم کا درد کم ہوا تھا لیکن کھانے کا سن کر معدہ ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ میں رب نواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سے رابطے کا سوچ کر مجھے یاد آیا کہ میں اپنا موبائل فون ملک مہربان کے ہاں بھول آیا تھا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اس موبائل سے کئی نمبر دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتے۔ جن میں نیلم ہاؤس کے نمبر بھی تھے اور کمال کے اسپتال کا نمبر بھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ رب نواز سے بات کروں لیکن اس نے فون پر آبزرویشن لگا رکھی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"یہ باغ کس کی ملکیت ہے؟"

وہ ہنسی "مجھے دیکھ کر بھی تمہیں پتا نہیں چلا۔"

میں جھینپ گیا "بس ذرا تصدیق کر رہا تھا۔"

"یہ باغ اور اردگرد کی ساری زمین ہی رب نواز کے خاندان کی ملکیت ہے۔ یہاں زمین پر ان کا حکم ہی چلتا ہے۔ یہ خدا بن کر لوگوں کی زندگیوں کے مالک بن بیٹھے ہیں۔"

ہم اتنی آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے کہ صرف ہم ہی ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے مجھے اصل خوف لالی سے تھا۔ اس کی قوتِ سماعت عام آدمی سے تیز تھی کیوں کہ اس کا باپ افریقی بن مانس تھا۔ جو سونگھنے اور سننے کی بے حد تیز حس رکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو میں تیزی سے کھڑکی کے پردے کے پیچھے چلا گیا۔ فریال نے پھرتی سے میری خراب شرٹ سمیت ساری ایسی چیزیں وہاں سے ہٹا دیں جن سے میری موجودگی کا پتا چلتا پھر اس نے جا کر دروازہ کھولا تو خانساماں ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ کر فریال کی طرف دیکھا "اب تم جا سکتے ہو۔ برتن صبح لے جانا۔" فریال نے تحکمانہ انداز میں کہا تو وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

فریال نے دروازہ اندر سے بند کیا ہی تھا کہ میں سینڈوچ پر ٹوٹ پڑا۔ اپنا پستول میں نے برابر میں رکھ لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے سینڈوچ صاف کردیے پھر میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو اسے پستول لیے اپنی جانب گھورتے پایا۔ اس نے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔

"اگر میں تمہارے سر میں سوراخ کردوں تو۔"

میں نے گہری سانس لی۔ پستول کی طرف سے غافل ہو کر میں نے خود اسے موقع فراہم کردیا تھا۔ میں نے کہا "تم ایسا کر سکتی ہو۔ حالانکہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"میرے شوہر سے تو ہے۔ تمہاری وجہ سے اس کی ٹانگ کٹی اور تمہاری وجہ سے اب وہ زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔"

"اس کے اپنے اعمال ایسے ہیں۔" میں نے شانے ہلائے "میرے نہ سہی کسی اور کے ہاتھوں اسے اس انجام تک پہنچنا ہی تھا۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"نہیں اور اب لاؤ' یہ کھلونا مجھے دے دو تمہارے نازک ہاتھوں میں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے پستول لے لیا۔ خلافِ توقع نہ تو اس نے ٹریگر دبایا اور نہ پستول دینے میں مزاحمت کی۔ پستول لے کر میں نے بے پروائی سے جیب میں ڈال لیا اور جیسے ہی فریال نے برتن اٹھا کر کونے میں رکھی میز پر رکھے میں نے پھرتی سے جیب سے میگزین نکال کر برتنا میں ڈال لیا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے پستول اٹھانے کا موقع دیا تھا اور اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دے رہی تھی۔

بستر کے برابر میں ہی ایک سیٹی رکھی تھی۔ میں تکیہ لے کر اس پر دراز ہوگیا۔ میں کچھ دیر لیٹ کر آرام کرنا چاہتا تھا اور چندا کی بازیابی کی کس ترکیب پر غور کرنا چاہتا تھا مگر تھکن اتنی تھی کہ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کب سوگیا پھر فریال نے جھنجوڑ کر مجھے اٹھایا۔ دروازے پر تواتر سے دستک ہو رہی تھی۔ فریال شاید غسل کرتے ہوئے آئی تھی اس کے صبیح چہرے پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے اور اس کے بالوں سے بھی ٹپک رہے تھے۔ اس نے باتھ روب پہن رکھا تھا۔ غالباً عجلت میں وہ اس کی ڈوری کسنا بھول گئی تھی ایک لمحے کو میں مبہوت رہ گیا۔ میری نظر محسوس کر کے وہ جھجکتے اور اس نے جلدی سے باتھ روب درست کر کے مجھے ڈریسنگ روم کی طرف جانے کا اشارہ کیا پھر تیزی سے باتھ روم میں جا کر بولی۔

"آرہی ہوں' ذرا صبر کرو۔"

میں نے پھرتی سے اٹھ کر جوتے پہنے اور ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ یہ زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی۔ تین طرف الماریاں تھیں اور ایک طرف دیوار میں بڑا سا آئینہ لگا تھا۔

[illegible]

"دروازہ [illegible]"

میں تیار ہی تھی۔ اب کپڑے پہنے تھی تو دروازہ کھولنے سے رہی۔" فریال کے لہجے میں تلخی تھی "تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"مالک کا فون آیا ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔"

"میرے ساتھ چلو۔ مالک نے ابھی بلایا ہے۔"

فریال جھلا گئی تھی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں خاموشی سے لالی کے ساتھ چلی گئی۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور اتنی صبح رب نواز کا فون آنا خالی از علت نہیں تھا۔ میرے خیال میں دلنواز کے بارے میں کوئی خبر ہوگی۔ فریال اور لالی کے جانے کے بعد میں نے ذرا سا دروازہ کھولا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا مگر اسی لمحے ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی کم از کم اس کے ہاتھ میں کسی جھاڑن سے ایسا ہی ظاہر تھا۔ اس نے ڈسٹنگ شروع کردی۔ مجھے خطرہ ہوا کہ وہ ڈریسنگ روم میں نہ چلی آئے۔ اشیا سے گرد جھاڑ کر اس نے بچے کو دیکھا اور اس پر پڑا ہلکا سا کمبل درست کیا۔ اسی لمحے سسکیاں لیتی فریال کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آواز سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ کیا بات ہو چکی ہے۔ اس نے چلا کر ملازمہ سے کہا۔

"چلی جاؤ یہاں سے۔" اس نے ملازمہ کو باہر کی طرف دھکیلا۔

"خیر تے ہے بی بی، کی ہویا؟" ملازمہ نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

"تیری سمجھ میں بات نہیں آئی' دفع ہو۔" فریال چلائی تو ملازمہ بدحواس ہو کر باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی فریال نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔ اس نے آنکھیں صاف کیں۔ میں باہر آیا اس نے مجھے دیکھتے ہی آہستہ سے کہا "دلنواز مرگیا۔ اس کے پورے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹر اسے بچانے میں ناکام رہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔ کیا تسلی دوں یا دلنواز جیسے شخص سے چھٹکارا پانے پر مبارک باد دوں۔ اس کے بچے کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن اب اسے بن باپ کے پلنا تھا اور شاید فریال کے مقدر میں گھٹ گھٹ کر

"تمہیں [illegible] حل کرے گی۔"

"فی الوقت تو اس کا اپنا مسئلہ ہے۔" [illegible]

[illegible] نواز کو علم ہوا کہ چندا میرے [illegible] کے ساتھ بھی تو وہ دلنواز کی موت کا بدلہ اس [illegible] کس طرح لیتا یہ بات واضح تھی۔ چندا مرنے [illegible] جاتی تو حالات اور خراب ہوجاتے وہ اسے مار [illegible] اچھی بات یہ تھی کہ کسی نے مجھے دیکھا نہیں [illegible] قتل حویلی کی طرف آنے والے دو افراد [illegible] تھے۔ جن میں سے ایک نے ان کے دو ساتھیوں کو [illegible] فوت کردیا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ [illegible] تھا۔ چندا اس لحاظ سے محفوظ تھی۔ بشرطیکہ وہ [illegible] چھوڑ دے۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے [illegible] طرف دیکھا۔ جواب اپنے بچے پر جھکی ہوئی [illegible] تھی اسے شوہر کی موت کا غم نہیں تھا مگر [illegible] رو رہی تھی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ [illegible]

"جو ہو گیا اس پر افسوس کرنے کا کوئی [illegible] آگے کی سوچو۔ میرے خیال میں اس خاندان [illegible] نہ ہی تمہارا بچہ محفوظ ہیں۔"

"ہمیں۔ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی [illegible] نے بے بسی سے کہا "اس دنیا میں میرا [illegible] ہے۔"

"کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ ماں باپ، بہن بھائی [illegible] اور رشتہ تو ہوگا۔"

"تھے۔ بہت تھے لیکن اپنا کوئی نہیں ہے۔" [illegible] لہجے میں تلخی تھی "اور جو تھے وہ ایک رات [illegible] نامعلوم قاتلوں کا نشانہ بن گئے۔ بس میں بچ گئی [illegible] نے سب کو بے ہوش کیا اور پھر خنجر سے سب [illegible] ماں باپ میرے تین جوان بھائی۔" اس کے لہجے [illegible] در آیا تھا "بس میں ہی بے غیرت تھی جو بچ گئی۔"

"یہ قتل کس نے کیے؟" میں نے اسے غور سے [illegible]

"صرف دو دن پہلے میں نے دلنواز کے رشتے [illegible] کیا تھا۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

سارا معاملہ واضح تھا۔ رب نواز کا خاندان یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی اس کی راہ میں آئے یا اس کی فرعونیت کو چیلنج کرے۔ فریال کے گھر والوں کو اس انجام سے دوچار ہونا ہی تھا۔

"پھر تمہاری شادی دلنواز سے کیسے ہوئی؟"

"میرے والی وارث چچا جان نے یہ کام کیا اور بدلے میں رب نواز نے ان کے دو بیٹوں کو دبئی بھجوا دیا۔ پہلے ان کے گھر میں فاقے ہوتے تھے۔ ایسے میں' میں ان پر بوجھ ہی تھی۔ جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ انہوں نے اپنے بیٹوں کا مستقبل بھی سنوار لیا۔"

"سنو فریال۔" میں نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ کہا "تم چاہو تو میرا ایک کام کرسکتی ہو۔"

وہ چونکی "کیسا کام؟"

"میرے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ مجھ سے بچھڑ گئی اور مجھے شبہ ہے کہ وہ رب نواز کے گرگوں کے ہتھے چڑھ گئی ایسے میں اسے سخت خطرہ لاحق ہے۔"

"اگر وہ حسین اور جوان ہے تو اس کی آبرو بھی خطرے میں ہے۔ ورنہ جان کو تو خطرہ ہے ہی۔" اس نے کہا "ویسے تم لوگ اس علاقے میں کیا کررہے ہو؟"

"بس' شامتِ اعمال سے آنکلے۔" میں نے کہا "اور راستہ بھٹک کر ایک ویران حویلی کی طرف جانکلے۔ وہاں سے یہ شکاری کتے پیچھے لگ گئے۔ اسی بھاگ دوڑ میں میری ساتھی مجھ سے بچھڑ گئی۔ میرا خیال ہے انہوں نے اسے پکڑ لیا ہے۔"

"راستہ بھٹک کر۔" اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا "حویلی ایسی جگہ ہے کہ کوئی وہاں راستہ بھٹک کر نہیں جاسکتا۔"

"لیکن ہم چلے گئے تھے۔ یہ بتاؤ کہ تم کسی طریقے سے چندا کے بارے میں معلوم کرسکتی ہو؟"

"چندا۔ کون۔ تمہاری ساتھی؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں کوشش کرتی ہوں۔ اس بنگلے کا نگران علی بخش ہے۔ وہی جو کل مجھے کھڑکی بند رکھنے اور ہوشیار رہنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ کسی قدر شریف آدمی ہے۔ میں اس سے پوچھوں گی۔"

"ذرا طریقے سے معلوم کرنا۔ تمہیں انکار کرنا ذرا مشکل کام ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ جھینپ گئی۔ اس نے بچے کو دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر جانے لگی۔

"خیال رکھنا۔ بلکہ بہتر ہے تم ڈریسنگ روم میں ہی چلے جاؤ اور محتاط رہنا۔ بعض اوقات لالی بلاوجہ بھی چلی آتی ہے۔ مجھے اور میرے بچے کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی ہے کہ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو' میں پوری طرح محتاط رہوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

اس کے جانے سے پہلے ہی میں ڈریسنگ روم میں پناہ گزیں ہوگیا۔ ڈریسنگ روم مختصر سی جگہ تھی اور اچھا خاصا خوشگوار موسم ہونے کے باوجود یہاں حبس اور گرمی تھی۔ اندر ایک چھوٹا سا وال فین لگا تھا لیکن اسے چلانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس کی آواز سن کر کمرے میں آنے والا کوئی فرد متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس لیے میں گرمی برداشت کرتے ہوئے فریال کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت مجھے انتظار شدت سے کھل رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ فریال جلد از جلد واپس آئے اور میں اس چوہے دان سے نجات پاسکوں مگر وقت گزرتا رہا اور فریال کی واپسی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

معاً دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں نے بمشکل خود کو باہر نکلنے سے روکا اور جھری سے جھانکا۔ یہ خانساماں تھا۔ اس نے ناشتے کی ٹرے وہاں رکھی تھی اور رات کے برتن اٹھاتے ہوئے جارہا تھا کہ ڈریسنگ روم کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں نے پھرتی سے خود کو پیچھے ہٹالیا۔ اس کے باوجود مجھے لگ رہا تھا کہ اس باورچی نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے بریٹا نکال لیا اور ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔ آہٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ ڈریسنگ روم کی طرف آرہا ہے۔ قریب آکر اس نے آہستگی سے کھینچ کر دروازہ بند کردیا اور چلا گیا۔ میں نے سکون کی طویل سانس لی تھی۔ وہ صرف دروازہ بند کرنے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو یہ انکشاف ہوا کہ دروازہ باہر سے بند ہے اور ہینڈل گھمانے سے بھی نہیں کھل رہا ہے۔ میں جھنجلا گیا۔ الو کا پٹھا زیادہ ہی فرض شناسی دکھانے کے چکر میں مجھے بند کرگیا تھا۔ اب فریال کا انتظار اور بھی عذاب ہوگیا تھا۔ گرمی اور حبس سے زیادہ بے چینی سے میرا برا حال تھا۔ میں باورچی کی وجہ سے اس چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ اب فریال یا کوئی چاہتا تو مجھے بہ آسانی گرفتار کرا دیتا۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا۔ میری گھڑی بتا رہی تھی کہ میں آدھے گھنٹے سے یہاں تھا لیکن لگ ایسا رہا تھا جیسے میں صدیوں سے اس جگہ قید تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد دوبارہ

آہٹ سنائی دی۔ میں دھڑکتے دل سے انتظار کرنے لگا کہ اب فریال آکر دروازہ کھولے گی۔ عجیب مصیبت تھی میں آواز بھی نہیں دے سکتا تھا کہ کوئی اور نہ ہو۔ میں نے تالے کے سوراخ سے باہر دیکھا تو مجھے لالی کا جسیم بدن گزرتا نظر آیا وہ بیڈ والے حصے کی طرف جارہی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے کوئی آواز نہیں نکالی تھی ورنہ اس وقت بے حد مشکل میں پڑ گیا ہوتا۔ لالی یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ دروازہ کھلا اور میں نے فریال کی تیز آواز سنی "لالی' بچے کے پاس کیا کررہی ہے؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ میں اسے دیکھ رہی۔۔۔ تھی۔" لالی نے غراتی آواز میں کہا۔

فریال تیزی سے بچے کے پاس گئی تھی پھر اس کی آواز آئی "کتنی بار کہا ہے کہ میری غیر موجودگی میں ادھر نہ آیا کر۔ اب یہاں سے جا۔"

لالی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور کمرے سے چلی گئی۔ فریال نے کمرے کا دروازہ بند کرکے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھولا۔ اس وقت تک میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔

"دروازہ باہر سے کیسے بند ہوا؟"

"تمہارا فرض شناس خانساماں بند کرگیا تھا۔" میں نے باہر آکر چند گہری سانسیں لیں۔

"سوری' تمہیں اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔" اس نے معذرت کی "مگر علی بخش نے ذرا دیر سے اگلا ہے!"

"چندا کے بارے میں کچھ پتا چلا؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"ہاں۔" اس نے گہری سانس لی "وہ پکڑی گئی ہے اور اس وقت لال حویلی میں ہے۔"

میرا دل جیسے مٹھی میں جکڑ گیا "نہ جانے کس حال میں ہو وہ؟"

"فکر نہ کرو۔" اس نے مجھے تسلی دی "ابھی تو سب دلنواز کے سوگ میں ہوں گے چندا کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوگی۔" اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بولی "یہ چندا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میری ساتھی ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

"کس قسم کی' کیا زندگی کی ساتھی؟" اس کے تجسس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"تم جو چاہو سمجھ لو۔ بس اتنا جان لو کہ اس کی اور میری پرورش ایک ہی شخص نے کی ہے۔ ابھی میں نے طے نہیں کیا کہ اس سے میرا کیا رشتہ ہے۔"

"اوہ۔ آئی سی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "چلو ناشتا کرلو۔ میں نے کچن میں ہی کرلیا تھا۔"

میں ناشتے کی طرف متوجہ ہوا "کیا تمہیں یقین ہے کہ چندا لال حویلی میں محفوظ ہوگی؟"

اس نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا "میں نے لال حویلی کے بارے میں جو باتیں سنی ہیں۔ مجھے چندا کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں پتا سوائے اس کے کہ وہ وہیں ہے اور زندہ ہے۔"

چندا کا سوچ کر میری بھوک مرگئی تھی لیکن جسم کی گاڑی چلانے کے لیے ایندھن ضروری تھا۔ میں نے تھوڑا بہت زبردستی کھایا پھر میں نے چائے لی "فریال' اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ دلنواز کے بعد اس خاندان سے تمہارا رشتہ ختم ہوچکا ہے۔"

"میں۔۔۔ میں کیا کرسکتی ہوں۔ میں نے بتایا نا کہ اس دنیا میں میرا ایسا کوئی نہیں ہے جو مجھے اور میرے بچے کو پناہ دے سکے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"سنو' ابھی تم جوان ہو۔ خوب صورت ہو اور میرا اندازہ ہے کہ رب نواز کے خاندان کی مکروہ روایات سے بھی محفوظ ہو۔ اس صورت میں تمہارا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔"

"مگر سوال وہی ہے میں کہاں جاؤں۔ کون مجھے پناہ دے گا' میرے بچے کو قبول کرے گا۔" اس کے انداز میں تلخی تھی۔

میں ہچکچایا "اگر تم مجھ پر اعتماد کرو۔ تو میں تمہیں ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کرسکتا ہوں۔ تم وہاں پر رب نواز کے شر سے محفوظ رہوگی۔"

"تم۔ تم مجھے پناہ دوگے؟" اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

میں گھبرا گیا "میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں ایک محفوظ ٹھکانے تک پہنچا سکتا ہوں۔"

اس کی چمک اٹھنے والی آنکھیں بجھ گئی تھیں "اوہ۔ تو تم مجھے لے جاکر کسی اور کے حوالے کردوگے۔"

"وہ کوئی اجنبی نہیں ہوگا' مجھے یقین ہے کہ تم اس کے پاس خوش اور مطمئن رہوگی۔"

"مجھے سوائے تمہارے کسی پر اعتماد نہیں ہے۔" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک رات کے ساتھ میں ہی وہ

مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ پہلے ساس صاحبہ اور اب بہو۔ دونوں نے میری ذات کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا تھا۔ شائستہ کے انداز میں اگر جارحیت اور بے باکی تھی تو فریال کا انداز محتاط اور ڈھکا چھپا تھا۔ شائستہ میں ہوس تھی تو فریال میں ایک نرم سی دلچسپی لیکن میں ان دونوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ شائستہ نے دھوکے سے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا لیکن فریال مجھے دوسرے طریقے سے گھیر رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے کہا۔

"فریال' میں تمہارا مطلب کسی حد تک سمجھ رہا ہوں لیکن میں خود اپنی منزل سے بھٹکا مسافر ہوں۔ منزل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ تمہیں کہاں سے پناہ اور حفاظت فراہم کروں گا۔ تمہارا اور میرا یہ ساتھ عارضی ہے۔"

اس نے پلکیں اٹھائیں "کیوں' کیا اس لیے کہ میں تمہارے دشمن کی بیوہ اور اس کے بچے کی ماں ہوں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"کیا میں حسین اور جوان نہیں ہوں؟"

میں پھنس رہا تھا "یہ بات بھی نہیں ہے۔ تم میرا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں خود سخت مشکل میں ہوں۔ میری ساتھی رب نواز کی قید میں ہے۔ اس کی جان اور آبرو خطرے میں ہے۔ ان حالات میں' میں تمہیں کس طرح اپنی پناہ میں لے سکتا ہوں۔ میں اتنا کرسکتا ہوں کہ تمہیں ایک محفوظ مقام تک پہنچادوں۔ جہاں تم ان بھیڑیوں سے محفوظ رہو گی۔ جو دلنواز کے مرتے ہی تم پر دانت تیز کررہے ہوں گے۔"

"پلیز' مجھے ڈرانے والی بات مت کرو۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا "میں پہلے ہی پریشان ہوں۔"

"ڈرنے یا پریشان ہونے سے آنے والی آفت نہیں ٹلے گی۔" میں نے خشک انداز میں کہا "اگر تم اس جہنم میں رہنے پر آمادہ ہو تو میں کیا کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کرسکے گا۔"

وہ ہچکچا رہی تھی۔ اسے یہاں سے جانے پر اکسانے کے میرے دو مقاصد تھے ایک تو میں اس کی مدد سے اس جگہ سے نکلنا چاہتا تھا۔ دوسرے میں رب نواز کو ایک اور ذہنی جھٹکا پہنچانا چاہتا تھا۔ اس پر دباؤ بڑھا کر میں اسے چندا کو کوئی نقصان پہنچانے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری سوتیلی ساس اپنے گھر سے کیوں فرار ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "شاید وہ رب نواز کے ظلم و ستم سے تنگ آگئی تھیں۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا "تم بے حد انجان ہو' تمہاری ساس اپنے دیوروں کے ناجائز بچے پیدا کرکے تنگ آگئی تھی اور اسی وجہ سے گھر سے فرار ہوئی تھی۔"

اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں "نہیں۔"

"یہ سچ ہے' شائستہ نے مجھے خود بتایا ہے۔ تم چاہو تو اس سے فون پر بات کرکے اس کی تصدیق کرسکتی ہو لیکن جو فیصلہ کرنا ہے جلد کرلو۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔"

"امی کو تم نے نکالا تھا۔" اس نے حیرت سے کہا "وہ کہاں ہیں؟"

"انہوں نے اپنا مضبوط ٹھکانا بنالیا ہے۔ چاہو تو تم اس سے بات بھی کرسکتی ہو۔ یہاں فون کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں نہیں ہے مگر میں بات کرسکتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں نے اسے شائستہ کے موبائل کا نمبر دیا۔ اس کے گھر کا نمبر دینا خطرناک ہوسکتا تھا کیونکہ یہ ٹرنک کال ہوتی اور اس کا نمبر بل میں لگ کر آجاتا "میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے جاتے ہوئے کہا "شیری کا خیال رکھنا' مجھے لالی کی طرف سے پریشانی ہے۔"

"تم بے فکر رہو۔" میں نے کہا "میں اسے دیکھ لوں گا۔"

وہ کمرے سے چلی گئی تو میں دوبارہ ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ اس بار میں نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ فریال نے کہا تھا کہ وہ جلد آئے گی کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ فریال جلدی واپس آگئی ہے مگر لالی کی جھلک دیکھتے ہی میں تیزی سے الماری کے کونے میں ہوگیا۔ لالی خاموشی سے آئی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کیا اسے میری موجودگی کا شبہ ہوگیا تھا مگر لالی ڈریسنگ روم کی طرف نہیں آئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے بچے کی طرف جارہی تھی۔ وہ جاگ گیا تھا اور اس نے ہاتھ پیر مار کر اپنا کمبل اتار دیا تھا۔ میں نے ذرا آگے ہو کر جھانکا۔ لالی بچے پر جھکی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم تنا ہوا تھا۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا پھر دیکھتے ہی دیکھتے لالی کا ہاتھ بچے کی گردن کی طرف بڑھنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کی گردن پکڑتی۔ میں ڈریسنگ روم سے نکل آیا۔

"رک جاؤ لالی!" میں نے کہا۔

لالی نے آہستہ سے سر گھمایا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی نمودار ہونے لگی تھی پھر وہ سیدھی ہو کر میری طرف بڑھنے لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سناٹے میں رہ گیا۔ بریٹا جیب میں نہیں تھا۔

لالی کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور نتھنے پھیلنے سکڑنے لگے تھے۔ اس کے جسم کا تناؤ اس کے ذہنی رویے کو ظاہر کررہا تھا۔ اس نے بچے پر سے ہاتھ ہٹالیا تھا اور اپنا جسم میری طرف گھما رہی تھی مگر اس سے پہلے وہ حملہ کرتی' فریال اندر آگئی۔ مجھے اور لالی کو آمنے سامنے دیکھ کر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ لالی کی توجہ اس کی طرف ہوئی تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تپائی پر رکھے پستول کی طرف جست لگائی مگر لالی بھی غافل نہیں تھی اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ پستول تک پہنچتا۔ اس کا وزنی اور ٹھوس جسم مجھ سے ٹکرایا۔ بہ ظاہر عورت ہونے کے باوجود اس کے بدن میں نرمی اور گداز نام کو بھی نہیں تھا۔ اس کے بجائے سیمنٹ کی بوری جیسی سختی تھی۔

اس کی ٹکر سے زمین پر گرا اور وہ مجھے زور سے فرش پر رگڑتی چلی گئی۔ فریال نے دوسری چیخ ماری۔ میری تمام تر توجہ خود کو اس کی گرفت میں آنے سے محفوظ رکھنے پر تھی۔ اگر وہ ایک بار مجھے پکڑ لیتی تو اس کی جناتی گرفت سے میری روح ہی نکل سکتی تھی اور وہ مجھے قابو کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے حلق سے حیوانی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ بالآخر مجھے موقع ملا اور فرش پر رول کرتے ہوئے ایک بار اس نے اپنا درمیانی جسم ذرا اوپر کیا تو میں نے دونوں پیر اس کے پیٹ پر رکھ کر اسے ہوا میں اچھال دیا۔ میں نے اسے دائیں طرف اچھالا تھا۔ وہ ذرا فضا میں بلند ہوئی لیکن پھر نہ جانے کیا کرتب دکھایا۔ فضا میں ہی پلٹ کر دوبارہ مجھ پر آگری تھی۔ میں نے بندروں خاص طور سے لنگوروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہوا میں جست کے دوران اپنا رخ بدل لیتے ہیں مگر وہ ہلکے ہوتے ہیں۔ بے پناہ وزنی لالی نے یہ کرتب دکھا کر مجھے اتنا حیران کیا کہ مجھے سنبھلنے یا اپنی جگہ سے ہٹنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ دھم سے مجھ پر گری۔ اس بار میرے منہ سے چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اس کے بوجھ تلے میری پسلیاں بول کر رہ گئی تھیں۔ تکلیف کی شدت کو ضبط کرتے ہوئے میں نے اس کے منہ پر اپنا سر مارا لیکن ایک تو میرے وار میں زور نہیں تھا۔ دوسرے اس کا سر بھی عام انسانی سر سے مضبوط ہی تھا۔

"شاہ عالوم" لالی نے غرائی آواز میں کہا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور ہاتھ اوپر لاتے ہوئے میرا گلا دبوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے باز رکھنے کے لیے سر سے دوبارہ ٹکر ماری۔ اس بار وہ بچا گئی۔ میرا دایاں ہاتھ میرے ہی جسم تلے دبا تھا اور بایاں لالی اور میرے جسم تلے دبا تھا۔ خاصی بیہودہ صورت حال تھی۔ لالی مجھ پر حاوی تھی اور اس نے مہارت سے مجھے بے بس کررکھا تھا۔ میں نے اس کے پیروں پر پاؤں مارے مگر ان کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس کے بجائے وہ میری گردن پکڑنے میں کامیاب رہی تھی۔ اگرچہ مجھ پر دراز ہونے کے باعث وہ پورا زور نہیں ڈال سکتی تھی اس کے باوجود اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے پیر آزاد کرانے کی کوشش کی۔ لالی نے میری یہ کوشش ناکام بنا دی اور اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھانے لگی۔ سانس رکنے سے میرا چہرہ سرخ ہونے لگا اور پھیپھڑوں میں جیسے آگ سی لگ رہی تھی۔ آکسیجن کی کمی سے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے دیوانہ وار ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش کی مگر لالی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ مجھے قابو کیے رفتہ رفتہ.... موت کے پاس لے جا رہی تھی۔ امید کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ فریال میری مدد کرسکتی تھی لیکن وہ نہ جانے کیا کررہی تھی۔ رفتہ رفتہ اندھیرا بڑھتے بڑھتے مکمل تاریکی میں بدل گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تاریکی چھائی رہی پھر رفتہ رفتہ دوبارہ روشنی ہونے لگی۔ شاید مرنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسری دنیا میں بھی انسان کے حواس اسی طرح بیدار ہوتے ہیں۔ غالباً عذاب کے فرشتے مجھے جھنجوڑ رہے تھے۔ دوسرا احساس نمی کا تھا میرے چہرے پر گیلا پن تھا۔ یکایک مجھے ہوش آگیا۔ میں اس دنیا میں تھا' زندہ سلامت تھا اور سانس لے رہا تھا۔ غالباً زندگی میں کبھی اس سانس کی اتنی اہمیت نہیں محسوس ہوئی تھی جتنی کہ اس وقت ہوئی تھی۔ خود کو سانس لیتا پا کر مجھے ناقابل بیان خوشی ہوئی تھی۔ لالی کا بوجھ مجھ پر سے ہٹ کر فرش پر ایک طرف پڑا تھا۔ پھیپھڑوں میں ہونے والی دکھن رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر فریال نے مجھے جھنجوڑنا ترک کردیا اور دوڑ کر گلاس میں پانی لے آئی پھر احتیاط سے میرے سر کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر میری حالت مزید بہتر ہوگئی تھی۔

"اب کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔" میں نے شرارت سے کہا وہ جھینپ گئی تھی۔

"اب اٹھ جاؤ۔" اس نے جلدی سے میرا سر اوپر کیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ لالی برابر میں ہی یوں ہاتھ پیر پھیلا کر لیٹی ہوئی تھی جیسے کوئی محنت کش تمام دن کی محنت کے بعد آرام کرتا ہے۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کا سینہ ہل رہا تھا۔

"اسے کیا ہوا؟"

"میں نے اس کے سر پر یہ مارا تھا۔" اس نے قالین پر ٹکڑوں کی صورت میں پڑا ماربل پیس دکھایا۔ اس کے وار کی قوت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا تھا۔ ماربل کا یہ شوپیس تین ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ لالی کے سر کا نہ جانے کیا حال ہوا

ہوگا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی وہ بہت ڈھیٹ تھی۔ اتنی قوت سے کیے جانے والے وار نے اسے صرف بے ہوش کیا تھا۔ اس کی نبض سست تھی لیکن باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ البتہ اس کے دو ڈھائی گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آنے کے امکانات نہیں تھے۔

"تم اس کے سامنے کیوں آئے تھے؟" فریال نے کسی قدر خفگی سے کہا "اگر یہ تمہیں مار دیتی۔"

"بچانے والا تو اللہ ہے لیکن مجھے پہلے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یو آر گریٹ۔" میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ وہ ذرا شرمائی لیکن کچھ کہا نہیں "دراصل یہ تمہارے بچے کے پاس تھی اور مجھے اس کے تیور خطرناک لگ رہے تھے۔ اس نے بچے کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا تب مجھے مداخلت کرنا پڑی۔"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں "یہ کمینی پہلے بھی کئی بار میری غیر موجودگی میں بچے کے پاس آتی رہی ہے اور مجھے بھی اس کے تیور درست نہیں لگتے تھے۔ خدا کا شکر ہے میرا بچہ محفوظ ہے اور اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار رہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ جذباتی ہو کر کوئی حرکت کرتی میں اس سے دور ہو گیا۔ "فریال۔! اس کے ہوش میں آنے سے پہلے یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔ تم نے شائستہ سے بات کی؟"

اس نے سر ہلایا "میری امی سے بات ہو گئی ہے اور اب میں تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ بات ویسے ہی کھل گئی ہے۔"

"بس تو فوراً تیار ہو جاؤ۔ یہ کپڑے بدل کر ایسے پہن لو جن میں زیادہ آسانی سے حرکت کر سکو اور بچے کا کم سے کم سامان لو۔ بلکہ کچھ نہ لو۔ باقی سب مل جائے گا۔ تمہاری کوئی اہم چیز ہے تو وہ بھی ساتھ لے لو۔"

اس نے تیزی سے الماری سے کپڑے نکالے اور ڈریسنگ روم میں بدلنے چلی گئی۔ میں نے پستول اٹھا کر جیب میں رکھا۔ جوتے پہنے اور اپنے کپڑے اٹھا کر ایک بنڈل کی صورت میں کر لیے۔ میں کپڑے یا کوئی ایسی شے یہاں نہیں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ رب نواز کتوں کی مدد سے میرا پیچھا کر سکتا تھا۔ فریال نے سادہ اور ڈھیلی سی شلوار قمیص پہن لی تھی۔ جس میں وہ آسانی سے حرکت کر سکتی تھی۔ اس نے بچے کا بیگ اٹھایا اور اس میں بچے کا سامان بھرنے لگی۔

"خدا کے لیے یہ سب یہیں چھوڑ دو۔" میں نے کہا "صرف بچے کو لے لو۔"

"اچھا پانی کی بوتل تو لے لوں۔ اسے جلدی جلدی پیاس لگتی ہے۔"

"لے لو مگر جلدی اور یہ اپنا پستول بھی رکھو شاید ضرورت پڑے۔ اسے چلانا آتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔ اور پستول اپنے ہینڈ بیگ میں رکھنے لگی۔ میں نے اسے روک دیا۔

"اس میں مت رکھو۔ بیگ کہیں ادھر ادھر ہو گیا تو تم نہتی رہ جاؤ گی۔"

"پھر کہاں رکھوں؟" اس نے سادگی سے کہا۔

"اپنے لباس میں۔" میں نے دوسری طرف دیکھ کر کہا "اس طرح یہ ہر وقت تمہاری دسترس میں رہے گا۔"

اس نے خاموشی سے پستول اپنے لباس میں رکھ لیا۔

"یہ بتاؤ کہ بنگلے میں کوئی گاڑی ہے۔"

"ہاں ایک پرانی شیورلیٹ ہے۔ چابی ڈرائیور کے پاس ہوگی۔"

"ڈرائیور کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ اپنے کوارٹر میں ہوگا۔ عقبی حصے میں ہے۔"

"ٹھیک ہے پہلے کسی ملازم کے توسط سے اسے مع چابی سمیت یہاں بلاؤ۔"

"ٹھیک۔ میں کوشش کرتی ہوں۔ دراصل یہاں سب ہی فیاض کا حکم مانتے ہیں۔ شاید میرے کہنے سے ڈرائیور چابی نہ لائے۔" وہ کمرے سے چلی گئی۔ میں نے ایک بار پھر لالی کا معائنہ کیا۔ وہ عام انسانوں سے کہیں زیادہ قوت برداشت رکھتی تھی۔ ممکن تھا میرے اندازے سے پہلے ہی ہوش میں آجاتی۔ میں نے اسے کھینچ کر ڈریسنگ روم میں ڈال دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔۔۔۔۔۔ یہ مضبوط شیشم کا دروازہ تھا۔ امید تھی کہ لالی ہوش میں آنے کے بعد اسے آسانی سے نہیں توڑ سکے گی۔ بہ شرطِ کہ وہ وقت سے پہلے ہوش میں آجائے۔ فریال عجلت میں اندر آئی تھی۔

"جلدی کرو۔ فیاض کہیں باہر گیا ہے اور بنگلے کے اندر کوئی نہیں ہے۔ ہم آسانی سے نکل سکتے ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے بچے کو اٹھا لیا۔ میں پسٹل لیے اس کے پیچھے تھا۔ درمیانی کمروں اور ایک راہداری سے گزرتے ہم بنگلے کے دائیں طرف واقع پورچ تک آگئے۔ وہاں ذرا پرانے ماڈل کی شیورلیٹ کھڑی تھی مگر کسی ہاتھی کی طرح مضبوط یہ گاڑی اب تک بہترین حالت میں تھی۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا اور فریال گاڑی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ پانچ منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر اور مرئل سا شخص آیا جس کے چہرے پر ایسی رونی کیفیت تھی کہ بے اختیار اس سے ہمدردی کرنے کو دل چاہتا تھا۔

"جی چھوٹی مالکن۔" اس نے فرماں برداری سے کہا۔

"گاڑی نکالو۔ مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔" فریال نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ڈرائیور ذرا ہچکچایا "آپ نے فیاض صاحب سے پوچھا۔"

"فیاض کون ہوتا ہے۔" فریال غرائی "میں جو کہہ رہی ہوں۔ چابی لائے ہو؟"

"جی مالکن چابی ہے مگر فیاض۔۔۔"

"اسے ڈالو جہنم میں۔" اس بار میں نے کہا اور سامنے آ کر پستول اس کے سینے پر رکھ دیا۔ "شرافت سے گاڑی میں بیٹھو اور جو کہا جائے وہ کرو۔"

پستول دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے کانپتے لہجے میں کہا "م۔۔۔ مجھے گولی نہ ماریں۔ آپ جیسا کہیں گے ویسا کروں گا۔"

"فریال گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے کہا "تم ڈرائیونگ سیٹ پر ہو گے اور میں پچھلی نشست سے تمہیں اپنی زد میں رکھوں گا۔ اگر تم نے ذرا سی غلط حرکت کی تو۔۔۔" میں نے سامنے درخت پر بیٹھے کوے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ کوا مارا گیا۔ مجھے ذرا افسوس ہوا مگر کوے کی لاش اور خون دیکھ کر ڈرائیور کا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ اس نے پھرتی سے کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ فریال پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ میں بھی پچھلی نشست پر آیا لیکن بیٹھنے کے بجائے میں آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیانی خلا میں لیٹ گیا۔ شیورلیٹ خاصی وسیع و عریض تھی اس کے اندر خاصی گنجائش تھی۔ مجھے لیٹنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہاں سے میں تو ڈرائیور پر نظر رکھ سکتا تھا مگر مجھے کوئی اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک وہ بالکل پاس آ کر نہ جھانکتا۔

"بس اب چلو۔" میں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"دروازے پر چوکیدار ہے۔ کہیں وہ نہ روک لے۔" فریال نے کہا۔

"روکے گا تو اپنی شامت کو خود ہی آواز دے گا۔" میں نے جواب دیا "مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے دو چار لاشیں گرانا پڑیں تو اس سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔" میں نے ڈرائیور کو سنانے کے لیے کہا۔

"پلیز ایسی باتیں مت کریں۔" فریال ڈر گئی تھی۔ اسی لمحے گاڑی پھاٹک کے سامنے رکی اور کسی نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"چھوٹی مالکن کو لے کر شہر جا رہا ہوں۔" ڈرائیور نے کہا "چھوٹے مالک کا تمہیں پتا ہی ہے۔"

فریال نے منہ دوپٹے میں چھپاتے ہوئے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ چوکیدار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن اس نے پوچھا "فیاض صاحب سے اجازت لے لی تھی؟"

"ہاں بھائی۔ ان کی اجازت سے ہی جا رہے ہیں۔" ڈرائیور نے اسے یقین دلایا تو اس نے پھاٹک کھولنا شروع کر دیا۔

"میرے خدا۔" فریال نے اچانک کہا "یہ تو فیاض آ رہا ہے۔"

"گاڑی چلاؤ۔" میں نے اٹھ کر پستول کی نالی ڈرائیور کے گردن پر رکھ دی۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔" وہ ہکلایا۔

"گاڑی چلاؤ۔" میں دھاڑا۔ اسی اثنا میں سامنے سے آنے والے شخص نے جو یقیناً فیاض تھا صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ اس نے اپنے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر کوئی ہتھیار نکالا ہی تھا کہ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ پھاٹک ابھی پوری طرح نہیں کھلا تھا۔ لہٰذا گزرتے ہوئے گاڑی کا دایاں فینڈر رگڑ کھا گیا تھا۔ اسی لمحے میں نے گولی چلنے کی آواز سنی مگر کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ٹائر برسٹ ہوا اور نہ ہی گاڑی کا کوئی شیشہ ٹوٹا۔ دوسرے فائر کے بعد میں نے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے لگاتار پیچھے کی طرف کئی فائر کیے۔ میرا مقصد انہیں ڈرانا تھا کیوں کہ چوکیدار کے پاس زیادہ خطرناک ہتھیار یعنی رائفل تھی۔ پھاٹک سے نکلتے ہی مجھے سامنے کوئی سو گز کے فاصلے پر سڑک نظر آئی تھی۔ سڑک تک جانے کے لیے کچا راستہ تھا۔ تیز رفتاری سے شیورلیٹ اس پر اچھلتی کودتی جا رہی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے رائفل کا پہلا فائر کارگر نہیں ہوا تھا میں نے فریال کو مع اس کے بچے سمیت سیٹ پر دبا رکھا تھا۔ ڈرائیور بلند آواز سے "جل تو جلال تو" کا ورد کرتے ہوئے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ لرزنے سے شیورلیٹ لہرا رہی تھی۔

عقب سے چوکیدار اور فیاض لپکتے نظر آ رہے تھے۔ مسلسل فائر کرنے سے فیاض کا ریوالور خالی ہو گیا تھا۔ وہ اس میں گولیاں بھر رہا تھا۔ جب کہ چوکیدار بھاگنے کے دوران شیورلیٹ کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دوسرے فائر نے عقبی شیشے کو بکھیر کر رکھ دیا۔ فریال کے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شیورلیٹ کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور اپنا سر اسٹیرنگ پر رکھے نظر آیا تھا۔ گولی نے اس کی گردن میں سوراخ کر دیا تھا۔ ایکسی لریٹر سے پاؤں ہٹنے کی وجہ سے کار کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ ڈرائیور کا نحیف جسم نزع کے کرب میں جھٹکے لے رہا تھا۔ اس وقت تک شیورلیٹ سڑک کے پاس ہی پہنچ چکی تھی۔

سوچنے کا یا افسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ڈرائیور کی

قضا اس طرح آئی تھی۔ میں تیزی سے اگلے حصے میں آیا۔ دروازہ کھولتے ہوئے میں نے ڈرائیور کو باہر گرایا جو اب تقریباً لاش تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اسٹیرنگ سنبھالا اور کار کو سڑک پر لے آیا۔ اس کا رخ شمال مغرب کی طرف کرتے ہوئے میں نے ایکسی لریٹر دبا دیا تھا۔ شیورلیٹ نے غراتے ہوئے ایک جھٹکا لیا اور رفتار پکڑلی تھی۔ ڈرائیور کے انجام کے پیش نظر میں نے سرنیچے ہی رکھا تھا۔ عقب سے مسلسل فائر ہو رہے تھے لیکن قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی اب تک نہ تو کوئی گولی ٹائرز میں لگی تھی اور نہ ہی پیٹرول ٹینک نشانہ بنا تھا۔ جب تک فیاض اور چوکیدار دوڑتے ہوئے سڑک تک آتے' شیورلیٹ ان کی فائرنگ کی رینج سے باہر جا چکی تھی۔

فریال اب تک عقبی نشست پر بچے سمیت دبکی ہوئی تھی۔ اس نے بچے کو اپنی آغوش میں یوں چھپا رکھا تھا کہ اس کی انگلی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس ساری بھاگ دوڑ اور ہنگامہ آرائی سے گھبرا کر وہ جاگ کر رونے لگا تھا۔

"اب اٹھ جاؤ۔" میں نے کہا "خطرہ پیچھے رہ گیا ہے۔"

فریال سیدھی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے بچے کو چمکار کر اور پیار کر کے خاموش کرایا۔ بچہ بہ مشکل چند مہینے کا تھا۔ اسی وجہ سے زیادہ وقت سو کر گزارتا تھا اور رونا دھونا بھی کم ہی تھا۔ میں نے ایکسی لریٹر کو ممکنہ حد تک دبا رکھا تھا۔ بلاشبہ کار اس وقت اڑ رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے رب نواز کے کارندے پولیس کی مدد حاصل کرلیں۔

"پلیز آہستہ چلاؤ۔" فریال نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا وہ ایک سیدھی سادی سی گھریلو زندگی گزارنے والی عورت تھی۔ ایسی مار دھاڑ اور فائرنگ اس نے پہلے کہاں دیکھی تھی۔ اس کا خوف زدہ ہونا فطری تھا۔ میں نے رفتار ذرا کم کی کیوں کہ آگے سڑک ذرا خراب تھی مگر اسی لمحے رفتار میں خود بہ خود کمی آنے لگی۔ انجن رہ رہ کر جھٹکے کھانے لگا۔ میں نے تشویش سے اسے دیکھا۔ اس مرحلے پر کار میں گڑبڑ کا مطلب تھا' ہم پکڑے جاتے۔ ابھی ہم بہ مشکل چھ میل دور نکلے تھے اور اس بات کا امکان تھا کہ رب نواز کے کرگے کسی دوسری گاڑی میں ہمارے تعاقب میں ہوں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" فریال نے پریشان لہجے میں کہا۔ "گاڑی کیوں رک رہی ہے۔"

"شاید انجن میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔" میں نے جواب دیا اور بدستور گاڑی کو چلانے کی کوشش کرتا رہا مگر شیورلیٹ کے انجن نے آخری جھٹکا لیا اور خاموش ہو گیا۔ کار تھوڑی دور تک رینگتی رہی میں نے اسے سڑک سے اتار لیا۔ دونوں طرف کھیت تھے۔ جن میں گندم کے ننھے پودے سر اٹھا رہے تھے۔ نیچے اترتے ہی انجن رکنے کی وجہ لمبی سی لکیر کی صورت میں نظر آئی۔ جو پیٹرول ٹینک کے عقب میں بنتی آئی تھی۔ کسی گولی نے اس میں سوراخ کر دیا تھا۔ جس سے پیٹرول قطرہ قطرہ رس کر غائب ہو گیا تھا۔ اس جہازی سائز کار کو تو ایندھن بھی اپنی جسامت کے لحاظ سے درکار ہوتا ہے۔ پیٹرول کھانے میں یہ کسی طرح بھی مرسیڈیز سے کم نہیں ہوتی۔ فریال کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ تھا۔

"اب کیا ہو گا؟" اس نے روایتی سوال کیا۔

"وہی جو منظورِ خدا ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔ چاروں طرف دور دور تک کسی بندے بشر کی صورت نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک بھی فی الوقت خالی ہی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ اگر ہم پیدل فرار ہوں تو کتنی دور جا سکیں گے۔ شاید میل بھی بھر سکیں اور رب نواز کے آدمی ہمیں آلیں گے۔ یہ ان کا علاقہ تھا۔ یہاں ذرائع حاصل کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ سامنے سے ایک گاڑی نمودار ہوئی تھی۔ جس طرف ہم جا رہے تھے۔ اسی لیے میں بلا تکلف سڑک کے وسط میں آکھڑا ہوا۔ پہلے تو کار کے ڈرائیور نے رفتار میں کوئی کمی نہ کی مگر پھر میری استقامت اور اس سے زیادہ غالباً فریال کی جھلک نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک صحت مند قسم کا دیہاتی نوجوان تھا۔ اس نے کار مجھ سے بہ مشکل ایک فٹ کے فاصلے پر روکی۔

"کیا مرنے کی صلاح ہے میاں جی۔" اس نے کھڑکی سے اپنی لمبی گردن نکالی۔ لفظ صلاح اس نے یوں ادا کیا جیسے صلح کہہ رہا ہو۔

"ہاں بھائی جب پیچھے ملک الموت لگا ہو تو سوائے مرنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔" میں نے اس کے پاس جا کر کہا اور پستول نکال کر اس کے سر سے لگا دیا "ہمیں لاہور جانا ہے۔"

خلافِ توقع وہ بودا ثابت ہوا۔ پستول کی نالی اپنے سر پر محسوس کر کے وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ "تت۔۔ تو ضرور جاؤ۔۔ مم۔ مجھ سے کیوں بول رہے ہو؟"

"کیوں کہ ہمیں تم لے کر جاؤ گے۔" میں نے کہا اور فریال کو عقبی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسے غالباً میرا طریقۂ کار پسند نہیں آیا تھا مگر مجبوری تھی۔ وہ کار کے اندر بیٹھ گئی اور میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"میں ابھی تو لاہور سے آ رہا ہوں۔" نوجوان نے پریشان ہو کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ایک دن میں دوبارہ لاہور جانے پر

کوئی پابندی نہیں ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "اب تم اچھے بچوں کی طرح اپنی توجہ صرف اپنے کام پر رکھو اور تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی اس کھٹارا سی گاڑی کو ہر ممکن رفتار سے لاہور کی طرف رواں رکھو۔"

خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی گاڑی کو کھٹارا کہنے کا برا منایا اور اس کا اظہار یوں کیا کہ گاڑی کو بحرِ ظلمات کے گھوڑے کی طرح دوڑانے لگا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی خستہ حال گاڑی کا ہر حصہ بجنے لگا اور ایک دروازہ تو یوں ہل رہا تھا جیسے ابھی اکھڑ کر گر جائے گا۔ میں نے ذرا تشویش سے کہا "کیا ہم اس طرح گاڑی میں لاہور تک پہنچ جائیں گے؟ میرا مطلب ہے کہیں گاڑی کے ساتھ ہمارے اسپیئر پارٹس بھی الگ نہ ہو جائیں۔"

با دلِ ناخواستہ اس نے رفتار کچھ کم کر دی۔ "شکل سے تو آپ اچھے بھلے شریف آدمی نظر آتے ہیں۔ زنانی' بچہ بھی ساتھ ہے۔"

"میں سچ مچ شریف آدمی ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی "نہ ڈاکو ہوں اور نہ ہی جیل سے بھاگا ہوا ہوں۔ یہ میری بیوی ہے اور کچھ دشمن پیچھے لگ گئے تھے ان سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ دشمن پاس تھا اس لیے یہ حرکت کرنا پڑی۔"

"ٹھیک ہے جی۔۔۔ مگر میں ماما کو کیا جواب دوں گا۔ یہ اس کی گاڑی ہے اور میں نے صبح سویرے واپس کرنے کو کہا تھا۔ اس نے تو مجھے صلواتیں سنائی ہیں۔"

"تمہارا ماما تمہیں صلواتیں نہیں سنائے گا بلکہ تمہاری بلائیں لے گا جب تم اسے بتاؤ گے کہ تم ڈاکوؤں سے اس کی گاڑی اور اپنی جان بچا کر لے آئے ہو۔ تمہارے ماما کو گاڑی بچ جانے کی خوشی تو ہو گی ہی۔" میں نے اسے تسلی دی "اور فکر نہ کرو۔ لاہور پہنچ کر ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ دو چار گھنٹے کی تاخیر سے تمہیں خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

خوف کی حد سے نکلنے کے بعد فریال اب میری اور ڈرائیور کی گفتگو پر مسکرا رہی تھی۔ جب میں نے اسے اپنی بیوی قرار دیا تو وہ ذرا شرمائی تھی اور پھر گھور کر مجھے دیکھا تھا۔ میں وقفے وقفے سے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ ایک بار مجھے شبہ ہوا کہ ایک پک اپ تیزی سے آ رہی تھی۔ اس میں رب نواز کے کرگے تھے۔ میں نے تیزی سے سرنیچے کیا اور فریال کو بھی نیچے ہونے کو کہا۔ اسے بچے کی وجہ سے تھوڑی سی مشکل ہوئی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح سیٹ کی درمیانی خلا میں ہو گئی۔ میں اس کے قریب ہونے پر مجبور تھا۔ وہ پھر شرمائی لیکن جھجکی نہیں۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے سرگوشی کی۔

"نو پرابلم۔" اس نے جوابی سرگوشی کی پھر اس نے کہا۔ "مجھے برا نہیں لگ رہا۔"

اس کے پاس عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی۔ جو میرے حواس پر طاری ہونے لگی۔ اتنی سی جگہ میں دور ہٹنے کی گنجائش نہیں تھی۔ جب پک اپ تیزی سے پاس سے گزری تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ پک اپ کے عقبی حصے میں دودھ کے برتن کھڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے تیزی سے سیدھے ہو کر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس کی توجہ ڈرائیونگ پر ہی تھی۔ میں نے فریال سے کہا "اوہ' خطرہ سرے سے تھا ہی نہیں۔"

اس نے سیدھے ہو کر بچے کو درمیان میں لٹایا اور اپنا دوپٹا درست کرنے لگی۔ "احتیاط اچھی ہوتی ہے۔"

"پیٹرول ختم ہونے کے پاس ہے۔" نوجوان نے کہا "بھروانا پڑے گا۔"

"بھروا لو لیکن خیال رکھنا ایسا نہ ہو کہ تم بلاوجہ کی بہادری دکھانا چاہو اور کچھ دیر بعد جہنم میں کفِ افسوس مل رہے ہو۔ اتنی سی بات کے لیے زندگی قربان کر دی۔"

"مم۔ میں کچھ نہیں کروں گا جناب۔" اس نے منمنا کر کہا۔

دس منٹ بعد ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ خطرے کی علامت رائفل بردار پولیس والے کی صورت میں سامنے آئی۔ فصل کے سیزن میں اس ہائی وے پر خاصا رش رہتا ہے اور پیٹرول پمپوں کی آمدنی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ حفاظت کے لیے وہاں پر پولیس لگائی جاتی ہے۔ مجھے ڈرائیور کی طرف سے خطرہ تھا اگرچہ اس نے اب تک مکمل فرماں برداری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن انسانی ذہن کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب پلٹ جائے۔ میں نے رکنے سے پہلے اسے آگاہ کر دیا کہ پستول کی نال اس کی عین کمر پر تھی اور اس کی ذرا سی غلط حرکت اس کی ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے کر سکتی تھی۔ اس نے سرہلا کر اٹینڈنٹ کو بلایا۔ جس نے پیٹرول بھرنے والا پائپ کسی ہتھیار کی طرح اٹھا رکھا تھا۔

"ٹنکی بھر دو۔" نوجوان نے کہا اور اٹینڈنٹ نے پھرتی سے نوزل کار کی ٹنکی میں فٹ کی اور ایک منٹ میں ٹنکی بھر دی۔ ادائیگی کر کے ہم آگے روانہ ہوئے۔ مجھے اب بھوک لگنے لگی تھی اور فریال کا بھی یہی حال تھا۔ بلکہ اسے خوراک کی زیادہ ضرورت تھی بچہ اپنی خوراک اس سے حاصل کرتا تھا مگر میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ البتہ راستے میں ایک ریڑھی سے بھنے ہوئے چنے لے لیے۔ جن سے خاصی حد تک تسلی ہو گئی تھی۔ شام چار بجے ہم لاہور کی حدود میں داخل ہوئے۔ میں نے ڈرائیور کو شالیمار کے پاس روکا۔

"بس بھیا۔ ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب تم خیر سے گھر کو سدھارو۔" میں نے فریال کو اترنے کا اشارہ کیا اور نوجوان کو ہزار کا ایک نوٹ پیش کیا۔ "یہ اس زحمت کے بدلے جو تم نے یہاں تک پہنچانے میں اٹھائی۔"

نوٹ لے کر وہ یوں عجلت میں فرار ہوا جیسے میں اس سے مذاق کر رہا تھا اور ابھی نوٹ واپس لے لوں گا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں تھا۔ خیر نام میں کیا رکھا ہے میں نے ایک ٹیکسی روکی۔ جس کے عقبی شیشے پر لاہوری بادشاہ لکھا تھا۔ "شاہ جی۔۔۔ ماڈل ٹاؤن جانا ہے۔"

"بسم اللہ جی بسم اللہ۔ خیر سے گڈی کس واسطے اے۔ آؤ بھرجائی جی آرام سے بیٹھو۔ اپنی ہی گڈی ہے۔"

ٹیکسی والے نے فوراً رشتہ قائم کرلیا اور اس کے بعد سارے راستے اس کا لیکچر جاری رہا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ دنیا بہت کمینی ہو گئی ہے۔ آدمی اور انسانیت کی کوئی قدر ہی نہیں رہی ہے جسے دیکھو پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ منزل مقصود یعنی شائستہ کے بنگلے پر پہنچ کر اس نے جب کرایہ ڈھائی سو روپے طلب کیا تو میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا بات کر رہے ہو بادشاہو۔ بہ مشکل سو سوا سو روپے بنتا ہے اور تم پورے ڈھائی سو روپے مانگ رہے ہو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "کیا کریں جناب حکومت ہر مہینے پیٹرول کی قیمت بڑھا دیتی ہے پھر اس علاقے سے واپسی کی سواری نہیں ملتی ہے۔ ایسے ہی جانا پڑتا ہے۔"

"اچھا راستے بھر بو تو اِل لی جی کی آتی رہی تھی۔ میں تمہارے لیکچر سے متفق نہیں تھا لیکن اب ہو گیا ہوں۔ دنیا واقعی بہت کمینی ہو گئی ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا اور اسے کرائے کی رقم دی۔ اس کا منہ لٹک گیا تھا اور وہ برا مان کر رخصت ہوا۔ فریال بچے کو سینے سے لگائے خاموش کھڑی تھی۔ "اب کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس بنگلے میں۔" میں نے بنگلے کے آرائشی ستون پر لگی کال بیل بجائی۔ فوراً ہی مین گیٹ میں ایک درز کھلی۔

"کون ہے؟"

"ہم شائستہ سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

نام پوچھ کر وہ اندر غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بغلی گیٹ کھول کر ہمیں اندر آنے کو کہا۔ میری آمد کی اطلاع پا کر شائستہ خود ہی باہر چلی آئی تھی اور پھر فریال کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔ فریال "امی" کہہ کر تیزی سے اس سے جا لپٹی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ شائستہ کے انداز میں اس کے لیے ہلکی سی رکھائی تھی "تم۔۔۔ تم کیسے نکلیں وہاں سے؟"

"یہ لائے ہیں۔" فریال نے میری طرف دیکھا۔ "رب نواز نے مجھ پر بھی پہرے بٹھادیے تھے۔"

شائستہ نے میری طرف دیکھ کر ذرا مختلف لہجے میں کہا "لگتا ہے کہ شاہ عالم نے رب نواز خاندان کی مظلوم عورتوں کی مدد کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ باقی باتیں اندر ہوں تو زیادہ بہتر رہے گا۔" میں نے نرمی سے اسے کہا۔

"وہ۔ ہاں اندر آؤ تم دونوں۔" اس نے چونک کر کہا۔

چند لمحے بعد ہم اسی نشست گاہ میں تھے جہاں شائستہ نے دھوکے سے مجھے خواب آور دوا ملی کافی پلائی تھی۔ ابتدائی جھٹکے کے بعد شائستہ اب فریال سے بہتر انداز سے پیش آ رہی تھی اس نے خود اسے پیش کش کی کہ وہ جا کر آرام کرے اور بچے کو فیڈ کرے۔ میں نے کہا "کچھ کھانے کا بندوبست کرو ہم دونوں ہی بھوکے ہیں۔"

شائستہ نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ کرکے کھانے کے لیے کہا۔ ایک ملازمہ فریال کو اندر لے گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی شائستہ اٹھ کر میرے پاس صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ اس کے پاس سے کسی مہنگے پرفیوم کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

"تمہارے جانے کے بعد میں بہت پچھتائی تھی۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ظاہر ہے تم نے کام ہی ایسا کیا تھا۔"

"اونہہ۔ میں اس پر نہیں بلکہ اس بات پر پچھتائی تھی کہ میں نے تمہیں جانے ہی کیوں دیا۔"

"یعنی تم مجھے قیدی بنا کر رکھ لیتیں۔" میں نے طنز کیا "خیر اب یہ شوق پورا کرلو۔"

"غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں قیدی نہیں بلکہ اپنا اسیر بنانا چاہتی ہوں۔"

میں نے گہری سانس لی "شائستہ! میں ابھی بہت پریشان ہوں اور ابھی ایک خونریز معرکے سے اپنی اور فریال کی جان بچا کر آ رہا ہوں۔" میں نے اسے مختصراً بتایا کہ کس طرح میں رب نواز کے گرگوں سے جان بچاتے ہوئے فریال کے پاس باغ والے بنگلے میں جا پہنچا جو اتفاق سے رب نواز خاندان کی ملکیت تھا۔ وہاں سے مجھے لالی کو ناک آؤٹ کرکے نکلنا پڑا تھا۔ اس نے دلنواز کی موت کی خبر کسی ردِ عمل کے بغیر سنی۔ اسے اس کی جواں مرگی کا قطعی کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کے بجائے اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ فریال تم سے خاصی نزدیک لگ رہی ہے۔"

"جن حالات سے ہم ایک ساتھ گزر رہے ہیں، ان میں قربت تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"تم دونوں ایک رات ایک ہی کمرے میں ساتھ ہی

رہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ شائستہ تم نے میرے ساتھ جس طرح دھوکے سے کام لیا۔ اگر میں اس فطرت کا ہوتا تو کیا تمہیں دھوکا کرنے کی ضرورت پیش آتی؟"

وہ کھسیا گئی "میرا مطلب ہے کہ فریال تم سے بہت متاثر ہے۔"

"اس سے قطع نظر کے وہ رب نواز کی بہو ہے وہ ایک شریف اور باکردار عورت ہے۔"

میری بات پر اس کا رنگ ایک لمحے کو پھیکا پڑا تھا لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا تھا۔ میں نے کہا "اب مجھے چندا کی فکر ہے۔ وہ رب نواز کے قبضے میں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ لال حویلی میں ہی ہے اس سے پہلے کہ رب نواز اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کرے میں اسے وہاں سے نکال لینا چاہتا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں وہ کیا اب تک محفوظ ہو گی۔" شائستہ کے لہجے میں طنز تھا۔ "صرف رب نواز ہی نہیں اس کے سارے کتے عورتوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کوئی عورت ان کے ہاتھ لگے تو وہ سب سے پہلے اس کی عزت اتارتے ہیں۔"

"چندا مرجانا پسند کرے گی بہ نسبت اس کے کہ کوئی اسے بری نیت سے ہاتھ لگائے۔"

شائستہ طنزیہ انداز میں ہنسی "بعض اوقات عورت اتنی بے بس ہو جاتی ہے کہ خودکشی بھی نہیں کرپاتی ہے۔ اسے بے بس بنا کر بار بار مارا جاتا ہے۔"

شائستہ کی باتیں میرے اندر طیش کو بڑھا رہی تھیں جب کہ میں خود کو ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چندا سے بغض رکھتی تھی اور اس کے لیے یہ بات باعثِ تسکین تھی کہ چندا بھیڑیوں کے نرغے میں تھی۔ میں نے گہری سانس لے کر اپنا اشتعال کم کیا۔ "ان باتوں سے تمہارا کیا مقصد ہے۔ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہے۔ میں یہ سوچ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر خدانخواستہ چندا کی عزت کو کوئی نقصان ہوا بھی تب بھی اس کے لیے میری محبت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میرے نزدیک وہ اسی طرح معصوم ہو گی۔ جیسے کیچڑ میں گر جانے والا موتی صاف و شفاف ہوتا ہے۔"

شائستہ ایک لمحے کو خاموش رہی تھی۔ "سوری میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" اس نے میرا جائزہ لیا۔ "تمہارا حلیہ خراب ہو رہا ہے۔ ایسا کرو نہا دھو کر کپڑے بدل لو۔ اتنی دیر میں کھانا لگ جائے گا۔"

"مجھے عمر سے بات کرنی ہے؟"

"اس سے بھی بات کرلینا اتنی جلدی کیا ہے۔ اٹھو۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھا دیا۔ وہ مجھے اسی بیڈ روم میں لائی جہاں میں نے انجانے میں اس کی آرزو کی تکمیل کی تھی۔ اس نے الماری کھولی۔ اندر متعدد سوٹ اور کپڑے موجود تھے۔ اس نے میرے سائز کی ایک ہلکی نیلی پتلون اور ہلکے براؤن رنگ کی فل آستین کی جرسی نکالی "یہ تم پر سجیں گے۔" اس نے کہا "میرا مشورہ ہے نہانے کے بجائے گرم ٹب استعمال کرو۔"

اس نے باتھ روم میں جہازی سائز کے ٹب کو پانی سے بھرا۔ اس میں کلون اور دوسری اشیا ملائیں۔ "میرا خیال ہے اب تم باہر جاؤ تاکہ میں غسل کر سکوں۔"

"کیا میرا باہر جانا ضروری ہے۔" وہ شوخی سے مسکرائی "بلکہ میں سوچ رہی ہوں کیوں نہ مل کر۔۔۔"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ میں نے اچانک ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کی طرف دھکیل دیا اور اندر سے باتھ روم کی کنڈی لگا دی۔ اس کے ہنسنے کی آواز آئی تھی۔ گرم پانی سے بھرے ٹب نے واقعی میرے جسم سے ساری تھکن اور مارا ماری اور کار کے حادثے میں آنے والے زخموں اور چوٹوں سے درد کو کھینچ لیا تھا۔ پانی میں ملے کلون کی خوشبو نے میرے ذہن کو تازہ سا کر دیا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس غسل سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا کہ باہر سے شائستہ نے دروازہ بجایا "اب تم باہر آتے ہو یا مجھے دروازہ تڑوانا پڑے گا۔"

"آتا ہوں۔" میں نے چونک کر کہا اور ٹب سے نکل آیا۔

میں تولیا باندھ کر باہر آیا تو شائستہ بدستور کمرے میں موجود تھی۔ میں نے جھینپ کر کہا "تم چلو میں چینج کرکے آتا ہوں۔"

"میرے ہونے سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تمہیں تو نہ پڑتا ہو لیکن مجھے پڑتا ہے۔" میں نے رکھائی سے کہا "پلیز باہر جاؤ۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے شانے اچکائے اور میرے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک مجھ سے لپٹ کر مجھے چوم لیا اور پھر خود ہی الگ ہو کر ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں خفیف سا ہو گیا۔ اس عورت نے مجھے کھلونا بنا لیا تھا۔ لباس پہن کر میں ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہاں شائستہ کے ساتھ فریال تھی۔ اس نے بھی نہا دھو کر لباس تبدیل کرلیا تھا اور خاصی مختلف نظر آ رہی تھی۔ پریشانی اور خوف نے اس کی ساری دلکشی نچوڑ لی تھی مگر اس وقت وہ ایک بار پھر سے پیکرِ رعنائی بن گئی تھی۔ میں نے دل میں اعتراف کیا کہ دونوں ہی ساس بہو مقابلے کی تھیں۔ فرق اتنا تھا کہ شائستہ گرمیوں کا

ڈھلتا سورج تھی جس کی آخری کرنوں میں بھی بلا کی تمازت ہوتی ہے اور فریال سراپا چڑھتا سورج تھی جس کی کرنوں میں حدت آفریں نرمی اور گداز ہوتا ہے۔ فریال مجھے دیکھ کر کھل سی گئی تھی۔

"اتنی دیر لگا دی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میں بھوکی ہوں۔" اس کے لہجے کی ناز آمیز لگاوٹ نے میرے ساتھ شائستہ کو بھی چونکا دیا تھا۔ شائستہ نے سرد نظروں سے اسے دیکھا "کھانا شروع کرو۔"

فریال نے پہلے میرے سامنے رکھی پلیٹ میں سالن نکالا پھر اپنی پلیٹ میں ڈالا۔ اس کی یہ حرکت بھی شائستہ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ میں خاموشی سے سر جھکا کر کھانے لگا۔ کھانے کے دوران میں بھی فریال مختلف ڈشیں اور چیزیں ازخود میری طرف بڑھاتی رہی تھی۔ اس کا انداز کسی خدمت گار اور وفا شعار بیوی کا سا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شائستہ کا مارے رقابت کے برا حال تھا اور فریال کو اس کی جیسے خبر ہی نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ مجھ پر تھی۔ ایک موقع پر جب فریال نے سلاد میری طرف بڑھائی تو شائستہ کاٹ دار لہجے میں کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"وہ خود بھی لے سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ تم اسے دو۔"

فریال نے چونک کر پہلی بار ساس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کھانے کے بعد شائستہ نے روکھے لہجے میں اس سے کہا "اب تم جا کر آرام کرو۔ مجھے شاہ عالم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"کیا میری موجودگی میں کوئی فرق پڑے گا۔" اس بار فریال نے بھی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں پڑے گا۔" شائستہ نے زیادہ خراب لہجے میں کہا "اور ایک بات یاد رکھو' یہ میرا گھر ہے۔ یہاں رہنے والے ہر فرد کو میری بات ماننا ہوگی۔"

"فریال پلیز تم جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ چند لمحے کھڑی دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی پھر جھٹکے سے مڑ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے شائستہ کی طرف دیکھا۔ "وہ دکھی ہے تمہیں اس سے ایسا رویہ نہیں رکھنا چاہیے۔"

"دکھی۔" شائستہ طنزیہ انداز میں ہنسی "کل اس کا شوہر مرا ہے اور آج وہ تیار ہو کر کیسے تمہیں رجھا رہی تھی۔ شاہ عالم ماننا پڑے گا کہ تمہارے اندر عورتوں کے لیے مقناطیسی کشش ہے۔"

"ہر ایک کو اپنے پیمانے پر مت ناپو۔ فریال صرف اس وجہ سے مجھ سے اپیچ ہے کہ میں نے اس کی جان بچائی ہے اور اس نے میری مدد کی بلکہ ایک موقع پر اس نے میری جان بھی بچائی تھی جب لالی نے مجھے تقریباً مار ہی دیا تھا۔"

"مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ ایک عمر میں اس مرحلے سے گزر چکی ہوں۔ فریال تم سے صرف اپیچ نہیں ہے۔ وہ تم کو پسند کرنے لگی ہے اور میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتی۔"

"فار گاڈ سیک۔" میں نے بے زاری سے کہا "میں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔ جس سے تم عورتیں کھیلنے کی کوشش کرو۔ ابھی مجھے چندا کی فکر بھی ہے۔"

"بائی دا وے یہ چندا کون ہے۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا "تم سے کچھ زیادہ ہی منسلک نظر آتی ہے۔"

"یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔" میرا لہجہ سرد تھا "مجھے عمر سے کب ملوا رہی ہو؟"

"چاہو تو ابھی مل لو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہاں موجود ملازمہ کو حکم دیا "ہمارے لیے کافی بیڈ روم میں لے آؤ۔"

اس نے صرف بیڈ روم کہا تھا۔ عمر کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان دونوں کا بیڈ روم مشترک تھا۔ مجھے اس کی بے باکی پر حیرت ہونے لگی تھی۔ اس کے ساتھ میں بیڈ روم میں پہنچا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر بے شمار اقسام کے خواتین کے استعمال کے لوشن اور میک اپ کا سامان تھا۔ عمر صدیقی جہازی سائز کے بیڈ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ اس کے پیر کا زخم تقریباً بھر گیا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ شائستہ نے اس سے کہا "عمر! یہ پروفیسر ہاشم رضا والے پروجیکٹ میں تمہاری مدد چاہتا ہے۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں میرے لیے ناپسندیدگی کی ہلکی سی جھلک موجود تھی۔ غالباً یہ ناپسندیدگی شائستہ کی وجہ سے تھی۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں اس کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "خاص طور سے لال حویلی کے بارے میں۔"

"لال حویلی۔" وہ چونکا "آپ اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہاں۔" اس نے گہری سانس لی "وہاں پروفیسر کے تجربوں کا شکار ہونے والی عورتوں کو رکھا جاتا ہے اور غائب ہونے سے پہلے پروفیسر حویلی میں ہی وسیع پیمانے پر تجربات کے

لیے لیب بنا رہا تھا۔ اس نے بیرون ملک سے خاصی مشینری اور دوسرا سامان بھی منگوایا تھا۔ میں اسے لینے کراچی گیا تھا کہ پیچھے پروفیسر غائب ہو گیا۔"

میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ پروفیسر کو میں نے ہی غائب کیا تھا "اس کے بعد رب نواز کا کیا ردِعمل تھا؟"

"بہت خراب۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ ہر ایک پر شک کر رہا تھا۔ اس نے مجھ پر بھی شک کیا تھا اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو وہ مجھے اپنے کتوں کے حوالے کر دیتا۔" اس نے شائستہ کی طرف اشارہ کیا۔

"پروفیسر اس پروجیکٹ کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کی گمشدگی سے رب نواز کو وہ کروڑوں ڈالر ڈوبتے نظر آنے لگے جو اسے بیرون ملک سے ان تجربات کے عوض مل رہے تھے۔" شائستہ نے وضاحت کی۔

"لال حویلی میں یہ لیب کہاں پر ہے؟"

"لال حویلی دراصل ایک زمانے میں سکھ جاگیردار کی ملکیت تھی۔ تقسیم کے بعد اس کی جاگیر کے ساتھ اس حویلی پر بھی رب نواز خاندان قابض ہو گیا تھا۔ حویلی کے تہ خانے میں سکھ جاگیردار نے پاٹھ شالا بنا رکھا تھا۔ یہ بہت بڑی جگہ ہے۔ سمجھ لیں کہ جتنی حویلی اوپر ہے اتنی ہی زیرِ زمین بھی ہے۔ پروفیسر نے اسی جگہ لیب قائم کی تھی اس نے وہاں پر جدید سہولتوں کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ روشنی اور بجلی کی دوسری ضروریات پوری کرنے کے لیے وہاں پر جنریٹر ہے۔ تہ خانے کا ایک حصہ تجربہ گاہ کے لیے مخصوص ہے وہاں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ سوائے ہاشم رضا کے۔ اس کے برابر میں چھوٹا سا کلینک ہے جہاں پر حاملہ عورتوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے پروفیسر نے ڈاکٹر اور پیرامیڈک کی ایک ٹیم کو خصوصی طور پر تربیت دی ہے۔ تاکہ کسی قسم کی پیچیدگی کی صورت میں ان عورتوں کو باہر لے جانے کی ضرورت نہ پڑے۔"

"ہاشم رضا عورتیں کہاں سے حاصل کرتا ہے۔" میں نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"یہ کام رب نواز کا ہے وہی تجربات کے لیے پروفیسر کو عورتیں اور مطلوبہ جانور مہیا کرتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے یہ عورتیں کہاں سے آتی ہیں۔" شائستہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "رب نواز کے خاندان والوں نے اپنی زمینوں پر نجی جیل قائم کر رکھی ہے۔ جہاں ان کے معتوب رکھے جاتے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی... بلکہ بعض اوقات عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ یہ عورتیں نہ صرف مخالفوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں بلکہ رب نواز کے خاندان والوں اور ان کے نمک خواریوں کی حیوانی خواہشات بھی پوری کرتی ہیں۔ ہاشم رضا کے تجربات کے لیے ان ہی عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔"

"جی نہیں بلکہ ان تجربات میں بنگالی عورتوں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔" عمر صدیقی نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا "میں نے کئی ایسی عورتوں کو دیکھا ہے کیوں کہ یہ سستی بھی مل جاتی ہیں اور ان پر کیے جانے والے مظالم کی کہیں شنوائی بھی نہیں ہوتی ہے۔"

بے حد افسوس ناک بات تھی۔ ہمارے ملک میں بنگالی عورتوں کی اسمگلنگ بڑھتی جا رہی ہے اور انہیں مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے مگر کسی ادارے یا حکومتی ایجنسی کو اس سنگین مسئلے پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ "تم بار بار عورتوں کا ذکر کر رہے ہو کیا پروفیسر لڑکیوں کو اس کام کے لیے استعمال نہیں کرتا۔"

"اس نے شروع میں کیا تھا۔" عمر صدیقی بولا "مگر تجربات کی بھینٹ چڑھنے والی لڑکیاں عام طور سے بچتی نہیں تھیں۔ شادی شدہ اور ایسی عورتیں زیادہ موزوں پائی گئی تھیں جو پہلے بھی ماں بن چکی ہوں۔"

"کیا تم لال حویلی پوری طرح دیکھ چکے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً۔ بس بعض حصوں میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان جگہوں پر رب نواز خاص خاص لوگوں سے ہی ملتا تھا۔"

"پھر تم نے وہاں کی ریکارڈنگ کیسے کی؟"

"میں نے——" وہ کہتے کہتے رک گیا "کون سی ریکارڈنگ؟"

"کوئی سی بھی نہیں۔" میں ہنسا "یہ بتاؤ کہ تم کاغذ پر حویلی کا نقشہ بنا سکتے ہو؟"

"کوشش کر سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

شائستہ نے اسے ایک کاغذ اور پنسل لا دی۔ اس نے پہلے حویلی کی آؤٹ لائن واضح کی۔ "اس کے گرد کم سے کم ایک ایکڑ کا باغ ہے۔ اصل حویلی میرے خیال میں کوئی ایک کنال پر پھیلی ہے اس میں داخلی دروازہ مشرق کی سمت ہے۔ اس کے بائیں طرف والا حصہ ایک زمانے میں مہمان خانہ ہوا کرتا تھا۔ اب یہاں حویلی کے محافظ اور ملازم ہوتے ہیں۔ دائیں طرف والے حصے کے بیشتر کمرے اجاڑ اور غیر آباد ہیں۔ ان ہی میں وہ حصہ بھی ہے جہاں جانا منع ہے۔ اس حصے میں دو کمرے ہیں۔ ایک کانفرنس روم ہے اور ایک نشست گاہ۔ گفتگو کرنے والے زیادہ ہوں تو کانفرنس روم استعمال کیا

جاتا ہے۔" بولتے کے ساتھ وہ کاغذ پر لائنوں سے ان حصوں کی پوزیشن بھی واضح کرتا جا رہا تھا۔" اس جگہ ایک بڑا ہال نما کمرا ہے جہاں بہ ظاہر گندم ذخیرہ کی جاتی ہے مگر اس سے تہ خانے میں جانے والا راستہ ہے۔ کمرے کی شمالی دیوار میں کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں لگی ہیں۔ ان میں درمیانی کھونٹی کو کلاک وائز گھمایا جائے تو راستہ کھلتا ہے۔"

"ایک منٹ اگر تم نے تہ خانہ دیکھا ہے تو اس کا نقشہ الگ سے بناؤ۔" میں نے فرمائش کی۔

اس نے دوسرا کاغذ لیا "میرے خیال میں تہ خانہ اوپر والی حویلی سے زیادہ مختلف نہیں ہے بس فرق اتنا ہے کہ تہ خانے میں کمرے ہال نما ہیں جن کی چھتوں کو سہارا دینے کے لیے ستون لگائے گئے ہیں۔ نیچے اترنے والا راستہ ایک طویل گیلری میں کھلتا ہے۔ یہ گیلری خاصی چوڑی اور لمبائی میں پوری حویلی کے برابر ہے۔ اس کے دائیں بائیں سے بے شمار کمرے نکلتے ہیں۔ جو کمرے در کمرے ہیں۔ اس گیلری سے تہ خانے میں تازہ ہوا کی فراہمی کا کوئی بندوبست بھی ہے۔ گیلری کے دائیں طرف ابتدائی کمرے لیب کے لیے مخصوص کرکے وہاں پر لیب کی تیاری کی جا رہی تھی کہ پروفیسر غائب ہو گیا۔"

"کیا لیب اس کے غائب ہونے کے بعد بھی تعمیر ہوتی رہی تھی۔" میں نے پوچھا۔

"تھوڑی بہت۔ دراصل پروفیسر بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے ساری پلاننگ خود تک محدود رکھی تھی اور رب نواز سے یہی کہتا رہا کہ اس کے سوا یہ کام کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ رب نواز کو سائنس کی الف ب بھی نہیں آتی ہے' وہ پروفیسر کی بات مانتا رہا اور اب پروفیسر غائب ہے تو سارا کام رکا ہوا ہے۔"

اس نے نقشے والا کاغذ میری طرف بڑھایا۔" میں نے اپنی یادداشت کے مطابق مکمل نقشہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ممکن ہے کہیں کمی بیشی رہ گئی ہو۔"

"ایک اہم بات اور۔ یہ بتاؤ کہ حویلی میں جانے کے لیے کوئی خفیہ راستہ ہے کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ ہے لیکن وہ کہاں نکلتا ہے' یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک بار پروفیسر نے میرے سامنے غلطی سے اس کا ذکر کر دیا تھا۔" عمر صدیقی نے پہلو بدلا "اگر آپ حویلی میں جانے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں تو یہ آپ کی بہت بڑی غلطی ہو گی۔ وہاں جانا تو شاید ممکن ہے لیکن باہر آنا دشوار ہے۔ رب نواز نے بے حد درندہ صفت لوگوں کو وہاں کا نگران رکھا ہے اور پروفیسر کے تخلیق کیے ہوئے کچھ نیم حیوان بھی حویلی کے محافظوں میں شامل ہیں۔"

"محافظوں کی تعداد کیا ہے۔ کیا ان میں کتے بھی شامل ہیں؟"

"میرے اندازے کے مطابق کوئی ایک درجن مسلح اور تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ اکثر پولیس کو مطلوب جرائم پیشہ افراد ہیں۔ جنہیں اس حویلی میں نہ صرف پناہ حاصل ہے بلکہ وہ اپنی حیوانی جبلت کی تسکین بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ بے گناہوں پر ایسا لرزہ خیز ظلم کرتے ہیں کہ کوئی درندہ بھی دیکھے تو شرما جائے۔ رب نواز کا کوئی معتوب ان کے ہتھے چڑھ جائے تو یہ اسے تڑپا تڑپا کر مارتے ہیں۔ حویلی کے عقبی حصے میں واقع صحن میں ایسے ہی بے نام و نشان لوگوں کے لاتعداد پنجر دفن ہیں جو ان کا شکار بنے۔ میرے سامنے ایک شخص کو انہوں نے برف توڑنے والے سوؤں سے چھید چھید کر مار ڈالا تھا۔ وہ رب نواز کی حویلی میں ملازم تھا اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے کچھ ایسی باتیں جان لی تھیں جو اسے نہیں جاننا چاہیے تھی۔"

"ایسے ظالم اور سفاک آدمی کے لیے کام کرتے ہوئے تمہیں کوئی ندامت نہیں ہوتی تھی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

"ندامت ہوتی تھی لیکن ساتھ ہی رب نواز کا خوف بھی حاوی تھا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں اگر شائستہ کا سہارا نہ ہوتا تو میں شاید اس سے بغاوت کرنے کی جرأت نہ کر پاتا۔"

"تمہارا شکریہ صدیقی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ممکن ہے تمہاری مدد میرے کام آ سکے۔"

شائستہ میرے ساتھ باہر آئی۔ لیونگ روم میں آکر اس نے دوبارہ کافی لانے کے لیے کہا۔ موسم میں خنکی کا عنصر بڑھ گیا تھا لیکن ابھی سردی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ آگ جلانے کی ضرورت پیش آتی۔ وہاں پر سرخ اینٹوں سے بنا آتش دان تھا۔ ہم اس کے سامنے بچھے دبیز قالین پر جا بیٹھے۔

"شاہ عالم! تمہیں رب نواز کے خلاف میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"فی الوقت تو اتنی مدد کرو کہ مجھے کوئی موبائل فون لا دو۔ میں رب نواز سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"موبائل۔" اس نے سوچا "میرا موبائل تو اسی پتے کا ہے۔ ہاں میں تمہیں عمر صدیقی کا موبائل لا دیتی ہوں۔" وہ شاخِ گل کی طرح لچک کھا کر اٹھی۔ اس نے سادہ سا سوٹ پہن رکھا تھا لیکن یہ بھی اس پر سج رہا تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن پر لباس سجتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد ملازمہ کافی لے آئی۔ وہ خاصی دیر بعد موبائل لے کر لوٹی تھی۔

"خیریت اتنی دیر لگا دی؟"

"صدیقی پوچھ رہا تھا۔ موبائل کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔"

"صرف یہی پوچھ رہا تھا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "میرا خیال ہے وہ تمہارے خاصے نزدیک ہے اور اسے تم سے اور بھی بہت کچھ پوچھنے کا حق حاصل ہے۔"

"حق۔۔ مائی فٹ۔ میں نے اسے ذرا سا منہ لگایا ہے تو وہ سر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"اسے ناراض مت کرو۔ وہ رب نواز کے ساتھ جا ملا تو تم خاصی مشکل میں پڑ جاؤ گی۔"

"وہ اس جگہ سے اپنی مرضی سے نہیں جا سکتا۔" شائستہ نے بے پروائی سے کہا۔

میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ موبائل لے کر رب نواز کا نمبر ملایا۔ فون کسی ملازم نے اٹھایا۔ میں نے کہا "رب نواز سے کہو شاہ عالم بات کرنا چاہتا ہے۔"

"ملک صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ۔۔۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے غرا کر کہا۔ اس وقت وہ بستر مرگ پر بھی ہوا تو میری آواز سن کر اٹھ جائے گا۔ اسے جا کر بتاؤ۔"

چند منٹ بعد رب نواز لائن پر تھا۔ آواز سے وہ بیمار اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ "شاہ عالم۔۔ ابھی مت چھیڑو میں آج ہی اپنے جوان بیٹے کو دفنا کر آیا ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ دنیا میں ہر وقت کہیں نہ کہیں لوگ جوان بیٹے دفنا رہے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک تمہارا بیٹا بھی شامل ہو گیا تو اس سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑے گا۔"

"اتنے سفاک مت بنو۔" وہ رو دیا تھا۔ "میں ٹوٹ گیا ہوں۔"

"بات یہ ہے کہ پہاڑ تلے آنے تک اونٹ اپنے آپ کو ہی سب سے بلند سمجھتا ہے۔ رب نواز تم تو فرعون تھے۔ لوگوں پر خدائی کرتے تھے ان کی زندگی و موت کے فیصلے کرتے تھے۔ آج یہ تمہارے لہجے میں بے بسی کیسی ہے۔" میں نے اسے کچوکے لگانا جاری رکھا۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔" اس نے گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ فون کیوں کیا ہے؟"

"تعزیت کرنے کے لیے۔ رب نواز ولنواز بے شک تمہارا نطفہ سہی لیکن تھا تو انسان۔ مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا ہے اور اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

"ان باتوں کو دہرانے کا مقصد۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے آج تک تمہارے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ اپنا دفاع کیا ہے اور تم نے مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"یہ باتیں اب ماضی کا حصہ ہیں۔"

"ماضی کا حصہ نہیں ہیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "رب نواز یاد رکھنا اب مجھ سے متعلق ایک کتے کو بھی تمہاری طرف سے نقصان ہوا تو میں اسے اعلان جنگ سمجھوں گا۔ اس کے بعد مجھ سے کسی بھی رعایت کی امید مت رکھنا پھر میں تمہیں تمہارے ہی سکوں میں ادائیگی کروں گا۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو۔" اس نے بدمزگی سے کہا "میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "تم اتنے سیدھے نہیں ہو۔ بہرحال یہ بتاؤ کہ موج دین والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ مہلت چاہیے۔ ابھی تو میرے بیٹے کی قبر کی مٹی بھی گیلی ہے۔"

میں نے سفاک لہجہ بنا کر کہا "بہتر ہے تم موج دین کے کفن دفن کا بندوبست کر ہی دو۔ ورنہ اپنے لیے یہ کام کر لینا۔ لیکن تمہیں آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ خاصے عرصے جیل کی روٹیاں توڑنی ہوں گی اور کال کوٹھری کی اذیت برداشت کرنی ہو گی۔"

"ہم۔ میں کوشش کر رہا ہوں مگر موج دین کا قتل آسان بات نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اب ہر وقت درجن بھر محافظ رہتے ہیں۔"

"صدر کینیڈی کے سیکڑوں محافظ تھے لیکن اس کی قضا ایک گولی پر لکھی تھی جو صرف ایک آدمی نے چلائی تھی۔ رب نواز۔۔! تمہارے پاس ایسے جاں نثاروں کی کمی نہیں ہے جو اپنی جان پر کھیل کر موج دین کو ٹھکانے لگا دیں۔ تم ٹال مٹول مت کرو اور پرسوں تک یہ کام نمٹا دو۔ کیوں کہ اب مجھے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سرزمین پر اپنے دشمنوں کا بوجھ ذرا کم کر جاؤں۔ موج دین نہ سہی تم سہی۔ اب فیصلہ تم کو کرنا ہے۔ جتنی جلدی کر سکتے ہو کر لو۔۔۔۔۔" میں نے کہتے ہی فون کر دیا۔

شائستہ دم بہ خود مجھے دیکھ رہی تھی "یہ کیا چکر ہے۔ تم رب نواز کے ہاتھوں موج دین کو مروانا چاہتے ہو۔ اس سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

"دشمنی تو نہیں ہے لیکن اس کے کچھ ایسے جرائم کے بارے میں جانتا ہوں کہ اگر اسے دس بار پھانسی ہو تب بھی اس کی سزا پوری نہ ہو۔ لوگوں کے لیے اس کا وجود کسی عذاب سے کم نہیں ہے بالکل رب نواز کی طرح۔ میں دونوں کو لڑوا رہا ہوں۔ جو بھی مارا گیا کام اچھا ہی ہو گا۔"

"مجھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنا بڑا گیم کھیل رہے ہو۔"

"موج دین کے اسمگلنگ کے مال کے گودام اور اس کے گاڑیوں کے شورم کی تباہی بھی رب نواز کے ہاتھوں ہوئی ہے میرے کہنے پر۔"

وہ ہنسی "تم نے رب نواز کو بالکل موم کی ناک بنا لیا ہے۔ اتنا وہ زندگی میں کسی کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوا ہوگا۔ یو آر سو سویٹ۔" وہ میری طرف جھکی لیکن اس کا ارادہ بھانپ کر میں بروقت پیچھے ہٹ گیا۔ وہ خفیف سی ہو گئی تھی۔ اسی لمحے دروازے کے پردے کے عقب میں ہلکا نیلا رنگ لہرایا۔ وہاں کوئی تھا جو تیزی سے واپس گیا تھا۔ یہ رنگ آج فریال نے پہن رکھا تھا۔ یعنی وہ پردے کے عقب میں موجود تھی اور شاید اس نے اپنی ساس کو مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے دیکھ لیا تھا۔ شائستہ کو پتا بھی نہیں چلا۔ بہرحال مجھے ان ساس بہو کی رسّا کشی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا تھا لیکن مجھے اب ایک گاڑی کی ضرورت تھی اور دوسرے مجھے ایک موبائل فون چاہیے تھا۔ میں نے شائستہ سے کہا۔

گاڑی تمہیں کل مل جائے گی۔ اوپن لیٹر میرے پاس ایک فور وہیل ڈرائیو ہے۔ لینڈ کروزر ہے' دو سال پہلے لی تھی بہت اچھی حالت میں ہے اور موبائل فون بھی کل مل جائے گا۔"

"شکریہ۔ میں تمہیں اس کی پے منٹ کردوں گا۔" میں نے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ مجھ سے یوں غیریت کی بات نہ کرو پھر تم اصل میں میرا ہی تو کام کر رہے ہو۔"

وہ بلاوجہ مجھ سے چپکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے خیال میں ایک بار اس کے حسن و شباب سے انجانے میں فیض یاب ہونے کی وجہ سے اس کا محبوب بن گیا تھا۔ حالانکہ میرے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی اس نے یہ حرکت کرکے اس کا خاتمہ کرلیا تھا۔ اب وہ میرے نزدیک صرف رب نواز کی دشمن ہونے کی وجہ سے اہم تھی۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ "فی الوقت یہ موبائل میرے پاس رہنے دو ممکن ہے مجھے پھر رب نواز سے بات کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔ میں اب ذرا آرام کرنا چاہوں گا۔"

کمرے میں آکر میں نے کمرے کو احتیاطاً اندر سے بند کر لیا۔ شائستہ کا کوئی بھروسا نہیں تھا وہ مجھ پر پھر کوئی حربہ استعمال کر سکتی تھی۔ میں نے موبائل فون پر نیلم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ ایک ملازمہ نے فون اٹھایا۔ میں نے بانو خالہ کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ چند لمحے بعد فون پر تھیں "ارے ناصر میاں کہاں ہو تم؟"

"وہ لوگ خیریت سے پہنچ گئے ہیں نا؟"

"ارے کب کے۔ نیلم کے کوئی درجن بھر فون آچکے ہیں۔ وہ تمہاری خیریت جاننا چاہ رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو تو بتاتی۔"

"نیلم کا فون آئے تو اسے بتانا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پاسپورٹ کے سلسلے میں ایک مسئلہ ہو گیا ہے اس کو حل کرتے ہی وہاں آجاؤں گا۔ یہ بتائیں کہ وہ لوگ بینی کے ہاں ٹھہرے ہیں؟"

"اور کہاں ہوں گے۔ ایسا کرو تم وہاں فون کرلو۔"

"موقع پاتے ہی میں یہ کام کرلوں گا اور بانو خالہ کسی اور کا فون آیا تھا۔"

"ارے ہاں۔۔ کسی کیپٹن شاہد کا فون آیا تھا۔"

"وہ میجر ہے خالہ۔ کیا کہہ رہا تھا۔"

"تمہارا پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ تمہارا کوئی پتا نہیں ہے۔"

"شکریہ خالہ۔ میں اس سے بات کرلوں گا۔"

فون بند کرکے میں نے کمال کا نمبر ملا دیا۔ اس نے کوارٹر میں فون لگوا لیا تھا۔ ورنہ پہلے صرف ایکس ٹینشن تھا جو اسپتال کی آپریٹر ملایا کرتی تھی۔ اس نے میری آواز سنتے ہی کہا "ناصر تو کہاں ہے۔ چندا کیسی ہے؟"

"کیوں خیریت تو نے چندا کے بارے میں کیوں پوچھا؟"

"یار اس کا فون آیا تھا۔ عجیب بات کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ شاہ عالم کا فون آئے تو کہنا کہ میں ٹھیک ہوں۔ میری فکر نہ کرے۔"

میرا دل دھڑک اٹھا اور زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ میں نے خاصی دیر بعد کہا "چندا۔ اور کیا کہہ رہی تھی؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہی ایک جملہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ناصر یار مجھے بتا کیا بات ہے۔ چندا کہاں ہے؟"

"وہ۔۔ وہ رب نواز کے قبضے میں ہے۔" میں نے بہ مشکل کہا اور اسے مختصراً اپنی مہم کے بارے میں بتایا جو ناکام ہوئی تھی ساتھ میں چندا بھی پکڑی گئی تھی۔ کمال نے فکرمند ہو کر کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ یار رب نواز کو تو تو جانتا ہے۔"

"فکر نہ کر چندا کو کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا لیکن اپنے لہجے کی ناطاقتی کا مجھے خود بھی احساس تھا۔

"ناصر۔ میں تجھ سے کہہ رہا تھا۔ اس معاملے کو مت پھیلا مگر تو نے کسی کی نہ سنی۔" اس بار کمال کے لہجے میں بھی برہمی تھی "اگر چندا کی جان یا خدانخواستہ عزت پر بن گئی تو اس کا ذمے دار کون ہوگا۔ تو نے قمر کی بات بھی نہ سنی۔"

"بس یار میں چندا کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا تھا اور تو ایسا کر اپنے نمبر پر آبزرویشن لگوا لے ممکن ہے چندا کا فون

آئے۔"

"یہ کام میں نے کل ہی کرلیا تھا۔ مقامی فون ایکس چینج کا ایس ڈی او میرے ٹرسٹ کے ڈائریکٹرز میں شامل ہے۔ اس نے یہ کام کرا لیا ہے۔"

"دیکھ قمر کو اس بات کی خبر نہ ہونے دینا۔ بلاوجہ رونا دھونا کرے گی اور ہاں عباسی اور رخشی کی کوئی خیر خبر آئی۔"

"سالے مزے سے ہنی مون منا رہے ہیں۔ عباسی کو گھر کی آتش زدگی کا پتا چل گیا ہے۔ مگر اس نے رخشی سے چھپایا ہے۔ مری میں ہیں اور پہلی برف باری دیکھ کر ہی آئیں گے۔"

"اچھی بات ہے یار۔ وہ میرے جھمیلوں سے جتنا دور رہیں اچھا ہے۔ رب نواز کو میں نے ٹائٹ کر دیا ہے اس نے ہرجانے کے طور پر ایک کروڑ روپے عباسی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے ہیں۔"

"یعنی اب دونوں میاں بیوی ہی کروڑ پتی ہو گئے ہیں۔"

"تو کون سا غریب ہے سؤر کے بچے اور تیری بیوی کے پاس بھی بڑا مال ہے۔" میں نے کہا اور اس کی جوابی گالیوں سے پہلے ہی فون بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے سب سے پہلے موبائل کی سی ایل آئی میموری صاف کی۔ جس میں یہ دونوں نمبر آگئے تھے اور سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا مگر سوچوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اس میں سونا ایسا ہی مشکل تھا جیسے کوئی دن کے وقت رش میں مال روڈ کے فٹ پاتھ پر سونے کی کوشش کرے۔ چندا کے فون نے سوچوں کا ایک نیا دروازہ کھول دیا تھا۔ آخر اس نے کمال کو فون کیا کیسے۔ کیا اسے پتا نہیں تھا کہ اس طرح دشمن کو کمال کا بھی پتا چل جائے گا لیکن نہیں چندا بے وقوف نہیں تھی۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی یہ کام کیا ہوگا۔ جب اسے یقین ہوگا کہ اس طرح کمال پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ایک سوال اور بھی قابل غور تھا۔ آخر دشمن نے چندا کو فون تک رسائی کیسے حاصل کرنے دی۔ ان لوگوں سے کسی بھی قسم کی انسانیت کی توقع ایسی ہی تھی جیسے آدم خور بھوکے شیر سے رحم کی توقع کرنا۔ خاصی سوچ بچار کے بعد یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ اس مسئلے پر سر دکھانے کے بجائے میں سو جاؤں تاکہ کل کے لیے تازہ دم ہو سکوں۔ میرا ارادہ سیدھا میجر شاہد کے پاس جانے کا تھا۔ وہی اس معاملے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ اس وقت تک چندا کے معاملے میں میں سوائے صبر کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

سوتے میں مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے سر پر بلکے سروں میں طبلہ بجا رہا ہو۔ یہ ایک تال کا طبلہ مسلسل بجتا رہا تو مجھے بیدار ہونا ہی پڑا تھا۔ طبلہ نہیں بلکہ کوئی مسلسل دروازے پر ہلکی سی دستک دے رہا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اتنی صبح کون ہو سکتا تھا۔ کوئی ایمرجنسی ہوتی تو دروازہ طبلے کے بجائے ڈھول کی طرح بج رہا ہوتا۔ کیا اس وقت شائستہ کا دماغ پھر خراب ہو رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شائستہ ہوئی تو میں دروازہ ہی نہیں کھولوں گا مگر خلافِ توقع فریال نکلی۔ اس کی ہلکی سی آواز آئی۔

"شاہ عالم۔۔ دروازہ کھولو۔"

میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ تیزی سے اندر آئی "تم۔" میں نے حیرت سے کہا "اس وقت؟"

"میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا "لیکن شائستہ کے سامنے نہیں۔"

"خیریت کل تک تو وہ تمہاری امی تھیں؟"

"میں نے انہیں عزت دی تھی لیکن وہ اس کی مستحق نہ تھیں۔ یہاں وہ جیسی زندگی گزار رہی ہیں اس سے بہتر تھا کہ رب نواز کے بھائیوں کی داشتہ بنی رہتی۔" فریال کے لہجے میں تلخی تھی۔ "وہ تم پر بھی ڈورے ڈالنے سے باز نہیں آئیں۔ شاہ عالم میں یہاں نہیں رہ سکتی۔"

"پھر تم کہاں جاؤ گی؟"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا "تم مجھے اس جہنم سے نکال کر لائے تھے مگر اس جگہ بھی میں نہیں رہ سکتی۔ بس تم مجھے کہیں اور لے چلو۔ اس گھر کے علاوہ تم جہاں رکھو گے رہ لوں گی۔"

میں نے اسموکنگ بہت کم کر دی تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے سرہانے رکھے ڈن ہل کے پیکٹ سے سگریٹ نکالی اور اسے سلگایا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا "دیکھو فریال۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کیا وہ انسانی ہمدردی اور پھر تمہارے اچھے سلوک کے جواب میں کیا تھا۔ میں تمہیں وہاں سے نکال لایا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا تم تمہاری جیسی اچھی لڑکی اس گندگی میں رہے جس میں شائستہ رہتی ہے۔ لیکن گھر میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ذمے داری نہیں لے سکتا۔"

"کیوں۔" اس نے میرے نزدیک آتے ہوئے سرگوشی میں کہا "کیا اس لیے کہ میں تمہاری دشمن کی بہو اور اس کے پوتے کی ماں ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ کیا میں حسین نہیں ہوں۔ جوان نہیں ہوں؟" اس نے آہستہ آہستہ میرے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں اس چیز سے بچنا چاہتا تھا میں محسوس کر رہا تھا کہ فریال بھی میری طرف مائل ہے۔ اگرچہ اس کے انداز میں شائستہ جیسی بے باکانہ جارحیت نہیں تھی اس کے بجائے ایک دبی دبی سی پیش قدمی تھی لیکن اس کے مقاصد وہی تھے جو شائستہ کے تھے۔

"تم بہت خوبصورت ہو اور کوئی کافر ہی تمہاری جوانی سے انکار کر سکتا ہے لیکن فریال میرے بے شمار مسائل ہیں۔ فی الوقت میں خود بے گھر اور بے در شخص ہوں۔ جس کے چاروں طرف دشمن ہیں۔ میں اپنی ساری توجہ ان پر رکھنا چاہتا ہوں۔ میری ساتھی دشمن کے قید میں ہے۔ مجھے اس کی فکر بھی ہے۔"

"میں کون سا تم سے ابھی کچھ مانگ رہی ہوں۔" اس نے کہا اور اچانک میرے سینے سے سر لگا دیا۔ "شاہ عالم میں بہت اکیلی ہوں اور اکیلی عورت کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے سہارا چاہیے۔" اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا "کیا تم مجھے سہارا نہیں دو گے۔"

رات کے اس آخری پہر وہ اپنے وجود کی نرمی گرمی کو مجھ پر آزما رہی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس سے متاثر نہیں تھا تو یہ جھوٹ ہو گا۔ اس کے حسن میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اسے چاہنے والا شخص بے حد خوش قسمت ہوتا مگر وہ خوش قسمت میں نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ درشت رویہ نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ وہ بہرحال میری محسنہ تھی۔ اس نے اس وقت مجھے پناہ دی جب رب نواز کے شکاری کتے میرے پیچھے تھے اور میں ان کے ہاتھ آجاتا تو وہ بلا تکلف مجھے مار دیتے پھر لالی سے سخت مقابلے میں جب میری موت میں چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے لالی کا سر توڑ کر میری جان بچائی تھی۔ میں نے نرمی سے اس کے ریشمی بالوں کو سہلایا۔

"فریال میں بہت مجبور ہوں۔ یہ ممکن نہیں ہے لیکن اگر تم یہاں نہیں رہنا چاہتی ہو۔ تو میں تمہیں ایک اور جگہ منتقل کر دوں گا۔"

وہ مزید قریب ہو گئی "کیا اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے؟"

"فریال میں نے کہا نا۔ یہ ممکن نہیں ہے اور تمہارا اتنے نزدیک آنا بھی درست نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے اسے پیچھے کیا تو وہ کچھ خفیف سی ہو گئی تھی "میں انسان ہوں اور نہیں چاہتا کہ بہک کر تم سے نظر ملانے کے قابل نہ رہوں۔"

"سوری، مجھے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے کہا "مگر میں کیا کروں، مجھے اپنا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے۔ میں۔۔ میں نہیں جانتی، مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"ابھی تم پریشان ہو۔ ذرا سکون سے بیٹھ کر سوچو گی تو اپنے مستقبل کا بہتر فیصلہ کر سکو گی۔ اب تم جاؤ کسی نے اس طرح تمہیں میرے کمرے سے نکلتے دیکھ لیا تو اچھی بات نہیں ہو گی۔"

وہ دروازے کی طرف جا کر گھومی "تم واقعی بہت اچھے آدمی ہو شاہ عالم!"

اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں ایک اور آزمائش سے گزر گیا تھا۔ ان ساس بہو نے میرا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ میں دوبارہ سونے کے لیے لیٹا تھا کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر جھلاتے ہوئے دروازہ کھولا "اب کیا بات ہے؟"

سامنے کھڑی شائستہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "کیا کوئی بات ہونے سے رہ گئی تھی؟"

"میں سمجھا نہیں" میں نے اکھڑے انداز میں کہا "ہے کہ اس وقت پہیلیاں بوجھنے میں کیا رمز پوشیدہ ہے؟"

وہ جواب دینے کے بجائے آرام سے اندر آنے لگی۔ اس کی ٹکر سے بچنے کے لیے مجھے مجبوراً اسے راستہ دینا پڑا!

تھا۔ حسب معمول اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے زہد شکن بدن کو نمایاں کر رہا تھا۔ سرسراتا ریشمی گاؤن جو اس کے جسم کی ہر جنبش پر ڈھل جاتا تھا "میرا سوال بہت صحیح ہے۔ فریال ابھی یہاں سے گئی ہے۔ کیا کچھ ہونے میں باقی رہ گیا تھا؟"

"مجھے تمہاری ذہنیت پر افسوس ہے" میرا لہجہ سپاٹ تھا "میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔"

وہ پھر معنی خیز انداز میں مسکرائی "یعنی کوئی ایسی بات ہے جو تم بتانا نہیں چاہتے؟"

"اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو تمہاری مرضی ہے۔"

"کیا بات ہے، بڑے اکھڑے اکھڑے نظر آرہے ہو کیا فریال نے کوئی خواہش۔۔۔"

میں نے بڑی مشکل سے اسے تھپڑ مارنے کی خواہش پر قابو پایا اور اپنا لہجہ بدستور سرد رکھا "میں نے کہا ناں کہ تم کچھ بھی سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔"

اس کے چہرے پر پہلی بار جھلاہٹ کے آثار نمایاں ہوئے تھے "شاہ عالم! یہ میرا گھر ہے اور میں چاہتی ہوں کہ یہاں سب کچھ میری مرضی سے ہو۔"

"یاد دلانے کا شکریہ!" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی پھر جھلا کر باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ بند کر کے سکون کا گہرا سانس لیا۔

بستر پر گر کر میں نے آنکھ بند کر لی۔ مگر نیند میرے نصیب میں نہیں تھی۔ میں نیم غنودگی میں تھا کہ ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں چونک گیا تھا۔ آواز ایک ہی بار آئی تھی۔ اب سناٹا تھا۔ برابر والا کمرا فریال کا تھا اور آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ میں نے سمجھا کہ وہ وہم تھا، نیند میں اکثر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں دوبارہ لیٹا تھا کہ آواز پھر آئی۔ اس بار یوں لگا جیسے فریال کے کمرے میں کچھ گرا ہو۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ہم شائستہ کے گھر میں تھے اور وہ فریال سے خوش نہیں تھی۔ خاص طور سے اس وقت وہ خاصے طیش میں گئی تھی۔ میں نے بریٹا لیا اور کمرے سے نکل آیا۔ گیلری خالی تھی اور فریال کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے بریٹا جیب میں رکھ لیا اور ابھی دروازے پر دستک دینے کا سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور شائستہ باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکی اور میں اس کے عقب میں اس عورت کو دیکھ کر چونکا جو لالی سے مشابہت رکھتی تھی۔ یہ بھی ہاشم رضا کے انسانیت سوز تجربات کا ثمر تھی اور شائستہ نے اسے حاصل کر لیا تھا۔ میرے چونکنے کی وجہ فریال تھی جو اس کے ہاتھ میں بے جان انداز میں پڑی تھی۔ اس کی

گردن اس طرح پیچھے کی طرف مڑی ہوئی تھی کہ میں سمجھا کہ اس کی گردن ہی ٹوٹ گئی ہے۔ ہاتھ اور ٹانگیں فضا میں جھول رہے تھے۔ لالی ثانی نے اسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ میں چند قدم آگے بڑھا تو شائستہ فوراً لالی ثانی کے پیچھے ہو گئی۔

"شائستہ، یہ سب کیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا تم نے اسے مار دیا ہے؟"

"نہیں۔ لیکن اگر تم راستے میں آئے تو یہ بھی ماری جائے گی اور تم بھی۔"

لالی ثانی آگے آگئی تھی، اس نے آرام سے فریال کو زمین پر لٹا دیا تھا۔ اس کے سینے کا زیر و بم دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ وہ مری نہیں تھی بلکہ زندہ تھی۔ "تم حماقت کر رہی ہو۔ فریال کو راستے سے ہٹا کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا" میں نے سکون سے کہا "اور جہاں تک تمہاری یہ لالی ثانی ہے، تو یہ میرے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی" میں اس کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر درندوں کے تاثرات نمودار ہوئے۔ آنکھیں اور ناک کے نتھنے پھیل گئے تھے اور دانت منہ سے جھانکنے لگے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے، میں اس کی طرف لپکا۔ جیسے ہی اس کے پاس پہنچا، اس نے ہاتھ سمیٹ کر مجھے جکڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس موقع پر میں نے وہ کیا جو نہ تو اس نے سوچا تھا اور نہ ہی شائستہ نے۔ میں نے یکدم زمین پر قلابازی کھائی اور اس کے بازوؤں کے نیچے سے گزرتا شائستہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی لیکن میں نے پیروں پر کھڑا ہوتے ہوئے اسے بازو سے گھما کر عقب سے جکڑ لیا۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ جب تک لالی ثانی کی سمجھ میں آتا، میں نے بریٹا نکال کر شائستہ کے سر سے لگا دیا۔

"میں بلاوجہ خون خرابا نہیں چاہتا ورنہ اسے مارنا بہت آسان ہے اور تمہاری گردن تو میں خالی ہاتھ سے بھی توڑ سکتا ہوں۔ اسے کہو، فریال کو آرام سے اٹھا کر اندر لے آئے اور باہر چلی جائے۔"

شائستہ نے پھنسی پھنسی سی آواز نکالی تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی گردن پر میرے بازو کی گرفت زیادہ ہی سخت تھی۔ میں نے ذرا گرفت ڈھیلی کی "شائستہ، اتنا یاد رکھنا کہ میری انگلی کی ایک جنبش زندگی سے تمہارا ناتا توڑ دے گی۔ کوئی حماقت مت کرنا۔" میرے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ اس کا بدن لرز اٹھا۔

"نینی۔۔ اسے آرام سے اندر لے آ۔"

خوب، اس کا نام نینی تھا یعنی لالی کے وزن پر۔ اس نے

شائستہ کے حکم پر کسی قدر تذبذب کے بعد جھک کر فریال کو گڑیا کی طرح اٹھالیا۔ وہ ہوش وحواس سے مکمل طور پر بے گانہ تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یقیناً اس نے مزاحمت کی ہوگی جس کے نتیجے میں اسے زخم آئے تھے۔ اس کی آنکھ کے پاس ہلکا سا نشان تھا اور شانے سے قمیص بھی پھٹ گئی تھی۔ میں شائستہ کو لیے پیچھے ہٹ گیا اور وہ فریال کو لے کر اندر آگئی۔

"اس سے کہو' اسے قالین پر ڈال کر باہر چلی جائے" میں نے شائستہ کی گردن کو ہلکے سے جھٹکا دیا۔

"نیلی! اسے نیچے لٹا دے اور باہر جا" شائستہ نے اسے حکم دیا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی تو اس نے زیادہ سختی سے حکم دیا۔ بادلِ ناخواستہ وہ باہر چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے سلگتی نظروں سے مجھے دیکھا تھا اگر میں نے شائستہ کو قابو نہ کر رکھا ہوتا تو وہ مجھے مار ڈالنے کی کوشش ضرور کرتی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلی' میں نے شائستہ سمیت آگے جاکر دروازہ بند کردیا اور پھر شائستہ کو اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔

"بدتمیز!" اس نے مجھے گھورا "اتنے زور سے پکڑا تھا۔ بدن دکھ رہا ہے۔" اس نے اپنے لباس کو اوپر سے اٹھایا اور دوسری طرف گھوم گئی۔ میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا وہ ہاتھ پکڑا جو لباس میں جا رہا تھا۔ وہ زخمی شیرنی کی طرح بلٹی لیکن میں نے پوری بے رحمی سے اس کا بازو موڑ کر اسے قابو کرلیا۔ وہ دبی زبان میں گالیاں دے رہی تھی۔ میں نے بغیر کسی جھجک کے اس کی قمیص میں ہاتھ ڈال کر وہ ننھا سا ریوالور نکال لیا جو اس کے بدن کا جزو بنا رہتا تھا۔ اس کے آتشیں جسم کی حرارت سے وہ بھی گرم ہو رہا تھا۔ میں نے دھکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔

"یہ نکال رہی تھیں؟" میں نے ریوالور اس کے سامنے لہرایا۔ اور اس کی گولیاں نکال کر ریوالور اس کی طرف پھینک دیا۔ وہ اب تک برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اس نے طیش میں ریوالور اٹھا کر مجھے دے مارا۔ میں ہوشیار نہ ہوتا تو ریوالور میرے سر پر لگتا۔ وہ زمین پر گری ہانپ رہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے میں نے فریال کی نبض دیکھی اور اسے آرام سے اس کے بچے کے برابر میں بستر پر لٹا دیا۔

"بہت خیال ہے اس کمینی کا؟" شائستہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس نے اب تک ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ اسے اس مکروہ لفظ سے پکارا جائے" میں نے رسانیت سے کہا "شائستہ' تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں اسے اس کے ٹھکانے پر واپس بھیج رہی تھی" اس نے اٹھ کر اپنا لباس درست کیا "میں اسے اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔"

"اگر تم ایسا میری وجہ سے کر رہی ہو تو۔"

"ہاں' یہ تمہاری وجہ سے ہے" اس نے میری بات کاٹی "لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ماضی کی زندگی کے کسی فرد کو اپنے پاس نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس وجہ سے میں اپنے بچے تک رب نواز کے گھر چھوڑ آئی۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اس صورت میں تم مجھ سے کہہ سکتی تھیں میں اس کا میں بندوبست کر دیتا۔ میں تو یہ سوچ کر اسے یہاں لایا تھا کہ تم اس سے ہمدردی کروگی۔ یہ بھی تمہاری طرح رب نواز کے خاندان کی ڈسی ہوئی ہے مگر میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس کے ساتھ اتنا بے رحمانہ سلوک کرنا چاہو گی۔ تم جانتی ہو' اس کا شوہر مر گیا ہے اور اب اس کا مقدر رکھیل بن کر رہنا ہوگا اور وہ بھی پورے خاندان کی۔ تم اس مرحلے سے گزر چکی ہو۔ فریال تو ابھی معصوم ہے۔ کیا خیال ہے' تمہیں نہ واپس پہنچا دیا جائے رب نواز کے پاس۔"

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم پر اعتماد کیا۔ تم اس قابل نہ تھیں۔ تم نے پہلے بھی اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے مجھے دھوکا دیا۔"

"مجھے... مجھے افسوس ہے" اس نے گہری سانس لی "مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور عورت تمہارے نزدیک آنے کی کوشش کرے۔"

"میں تمہاری ملکیت نہیں ہوں" میں نے اسے جھڑکا۔

"میں جانتی ہوں لیکن دل کے معاملات میں دماغ کا زور نہیں چلتا۔ میں نے وہی کیا جس کے لیے میرے دل نے مجھے مجبور کیا اور مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ بس اپنی ناکامی کا افسوس ہے۔"

"تم کیا سمجھتی ہو کہ ایک فریال کو یوں اپنی راہ سے ہٹا کر تم مجھے حاصل کرلوگی؟ یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے شائستہ' اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا حقائق کو تسلیم کرلو۔ میرا اور تمہارا ساتھ ممکن نہیں ہے۔ چاہے تم ساری دنیا کی عورتوں کو ماردو مگر تم مجھے حاصل نہیں کرسکتیں۔"

توہین اور ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہتے ہوئے میں نے فریال کو ہوش میں لانے کی

کوشش کی اور بالآخر چند منٹ کی کوشش کے بعد اسے ہوش آگیا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"آرام سے... آرام سے فریال! اب کوئی خطرہ نہیں ہے" میں نے نرمی سے اس کا سر سہلایا۔

"وہ... وہ عورت... وہ کہاں ہے؟"

"اب تم بالکل بے فکر رہو۔ صورتِ حال میرے قابو میں ہے۔"

اس کا بدن اب سکون میں آنے لگا تھا۔ شائستہ سلگتی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو مزید جلانے کے لیے میں نے فریال کو اس وقت تک خود سے جدا نہیں کیا جب تک کہ وہ پوری طرح پُرسکون نہیں ہوگئی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھ پر ایک اور احسان کیا ہے۔"

"میں نے اپنی ذمّے داری نبھائی ہے" میں نے جواب دیا "اپنے بچے کو دیکھو اور چینج کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

مجھ سے جدا ہو کر اس نے پہلی بار شائستہ کو دیکھا تو اس کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے تاثرات نمودار ہوگئے۔ اس نے طیش سے کہا "ذلیل عورت' میں نے تجھے ماں کی طرح سمجھا اور تو...؟"

"میں تمہاری ماں نہیں ہوں" شائستہ نے اس کی بات کاٹی "میرا اب تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"اس کے منہ مت لگو" میں نے اس سے کہا "دیکھو شانے پر سے تمہاری قمیص پھٹ گئی ہے۔ اسے چینج کرلو اور چلنے کی فکر کرو..... ہمیں اس کے بنگلے سے ابھی نکلنا ہے۔"

جتنی دیر میں فریال نے لباس بدل کر بچے کو تیار کیا' میں نے ریوالور میں دوبارہ گولیاں ڈالیں۔ میرے پاس ایک پستول اور شائستہ سے چھینا ہوا ریوالور بھی پہلے سے موجود تھا۔ مگر اس کی فاضل گولیاں نہیں تھیں' صرف بریٹا کے دو کلپ اور پڑے تھے۔ میں نے شائستہ والا ریوالور فریال کی طرف بڑھا دیا۔ "ہوشیار رہنا اور اس کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے تو دریغ نہ کرنا' ٹھیک ہے۔"

فریال نے سرہلایا۔ میں نے شائستہ کی طرف دیکھا "اب تم ہمیں بنگلے سے باہر لے جاؤگی۔ اپنے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہو۔"

"میں نہیں کہوں گی" اس نے ضدی انداز میں کہا۔

میں نے بریٹا سے اس کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ اس نے چیخ ماری اور جب خود کو زندہ پایا تو اس کی رکی سانس بحال ہوئی۔ "شائستہ' میں نے جان بوجھ کر تمہارے سر سے ذرا اوپر گولی چلائی ہے۔ اب انکار کیا تو اگلی گولی تمہارے سر میں اتر جائے گی اور اس میں بھرا سارا گند خون اور مغز کے ساتھ بہہ جائے گا' اٹھو۔"

اس نے لرزتے ہاتھوں سے انٹرکام اٹھایا اور کسی کو حکم دیا کہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہے۔ میں نے ایک بار پھر اسے خبردار کیا "کسی بھی چالاکی کا انجام تمہاری موت ہوگا۔ میں تو مار دھاڑ کرکے نکل جاؤں گا جو میرے راستے میں آیا' مارا جائے گا۔"

"میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی" شائستہ نے یقین دلایا۔

"اور اپنی نیلی کو بھی سنبھال کر رکھنا کہیں میرے ہاتھ سے ضائع نہ ہوجائے۔"

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے گیلری میں ہی نیلی نظر آئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چند قدم آگے آئی تھی مگر شائستہ نے اسے روک دیا "نیلی واپس جا اور اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا' کوئی بھی حرکت نہ کرنا' سمجھی؟"

نیلی نے چند لمحے بعد سرہلایا۔ اس کی ذہنی سطح چند سال



بیٹے سے [illegible] نہیں تھی بلکہ ذہن کے مقابلے میں وہ مجھے لالی سے مرتبہ نظر آئی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں پوری طرح محتاط تھا اور اس کے لیے بالکل تیار تھا کہ اس نے کوئی جارحانہ حرکت کی اور میں نے اسے شوٹ کردیا۔ لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے شائستہ کو آگے رکھا تھا۔ پستول اس کی کمر سے لگا تھا اور فریال میرے عقب میں چل رہی تھی۔ میں نے اسے پیچھے نظر رکھنے کو کہا تھا۔ راہداری اور کمروں سے گزرتے ہوئے ہم باہر نکلے۔ حکم کا غلام ڈرائیور عین سامنے گاڑی لیے انتظار کر رہا تھا۔ کسی نے مداخلت نہیں کی۔ میں شائستہ اور فریال سمیت اس طرح اس بڑی سی جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہوا کہ شائستہ میرے اور فریال کے درمیان.... تھی۔ اس کی ہدایت پر ڈرائیور نے گاڑی باہر نکالی۔

"کہاں جانا ہے تمہیں؟ یہ ڈرائیور چھوڑ آئے گا" شائستہ نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

"مجھے بہتر پتا ہے کہ مجھے کیسے جانا ہے' سب سے پہلے تو ڈرائیور یہاں اتر جائے۔"

شائستہ کے حکم پر ڈرائیور سعادت مندی سے جیپ سے اتر گیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور شائستہ کو اپنے ساتھ والی نشست پر بٹھایا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ نا تجربے کار فریال سے ریوالور نہ چھین لے۔ کچھ دور جاکر میں نے اسے بھی اتر جانے کو کہا "تمہیں تھوڑی زحمت ہوگی۔ اس وقت شاید ٹیکسی نہ ملے لیکن دو میل پیدل چلنا تمہارے لیے دشوار نہیں ہے۔ ہاں' اس لباس میں ضرور پریشانی ہوگی۔"

"پلیز میں نہیں جاسکوں گی؟"

"تو پھر سڑک کے کنارے انتظار کرلو' کوئی نہ کوئی احمق پھنس جائے گا جو تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آئے گا۔"

میں ہنسا "اب اتر جاؤ۔" میں نے پستول اس کی طرف کیا' وہ سخت برہمی کے عالم میں نیچے اتری اور دروازہ دے مارا۔

"تم سخت کمینے اور ذلیل آدمی ہو۔"

"تعریف کا شکریہ" میں نے مسکرا کر کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

"دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھی کہ آپ آئے ہیں" عقب سے فریال بولی "مگر دروازہ کھلتے ہی یہ اس خبیث عورت کے ساتھ اندر گھس آئی۔ اس نے مجھے پکڑنا چاہا' میں بھاگی تو اس نے مجھے نیچے گرا دیا اور میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر میرے سر پر کچھ مارا تھا۔ دوسری ضرب نے مجھے بے ہوش کردیا۔ اب تک سر دکھ رہا ہے۔"

میں نے اس کا سر دیکھا تھا' اس پر زخم کی سوجن کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے کسی نرم سی چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔

[illegible] سے مارا گیا تھا۔ فریال بتا رہی تھی "اس وقت وہ کتیا غضب ناک لہجے میں کہہ رہی تھی کہ مجھے رب نواز کے گھر پہنچادے گی جہاں باقی عمر۔" وہ کہتے کہتے رک گئی لیکن میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"اب تم محفوظ ہو" میں نے اسے تسلی دی۔

"ہاں لیکن آپ کی وجہ سے۔ اگر آپ بروقت نہ آتے تو نہ جانے میرے ساتھ کیا ہوتا؟"

"خدا کو تمہیں بچانا مقصود تھا اس لیے وہ کسی اور کو وسیلہ بنا کر بھیج دیتا۔"

فریال کا بچہ کسمسا کر آوازیں نکالنے لگا تھا۔ اس نے پریشانی سے کہا "اوہ' اس نے کپڑے گیلے کرلیے ہیں۔ میرے پاس اور کپڑے نہیں ہیں اس کے۔"

"ابھی بہلاؤ' بعد میں ہم جہاں پہنچیں گے' وہاں سب مل جائے گا۔"

بچے نے رونا شروع کردیا تھا۔ مجبوراً فریال نے اس کے گیلے ہونے والے کپڑے اتار دیے اور اسے اپنے جسم سے لگالیا۔ موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔ میں نے جیپ کا ہیٹر آن کردیا۔ ذرا سی دیر میں فضا خوشگوار حد تک گرم ہوگئی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم نیلم ہاؤس کے سامنے تھے۔ دروازے پر سنتے گارڈز تھے۔ میں نے بانو خالہ یا سعید میں سے کسی کو بلانے کو کہا۔ میرا نام سن کر بانو خالہ خود دوڑی چلی آئی تھیں۔ انہوں نے دروازہ کھلوایا اور میں نے جیپ اندر لے جاکر روکی۔ سلام دعا کے بعد میں نے خالہ سے کہا۔

"ڈرائیور کو بلا کر اسے کہیے کہ یہ جیپ کہیں دور چھوڑ آئے۔"

"ارے... اتنی اچھی گاڑی کہیں دور چھوڑ آئے؟"

"خالہ' بات یہ ہے کہ گاڑی تو اچھی ہے مگر ہے چوری کی اور پھر دو بندے بھی مارے گئے تھے گاڑی چرانے کے دوران میں۔ اب اگر گاڑی نیلم ہاؤس سے برآمد ہوئی تو نیلم تو بے نہیں' پکڑی تم جاؤگی اور قتل کا الزام بھی تمہارے سر آئے گا۔"

"ارے واہ! میرے سر کیوں آئے گا؟" خالہ نے خفگی سے کہا۔ بہرحال انہوں نے ڈرائیور کو بلالیا۔ میں نے گاڑی کے بارے میں ضروری ہدایتیں دے کر اسے چابیاں دے دیں۔

"ناصر میاں' یہ کون ہے؟" خالہ نے پہلی بار فریال پر توجہ دی۔

"اندر چلیں' بتاتا ہوں۔ بچے کو ٹھنڈ لگ رہی ہوگی۔"

"ارے بچہ بھی ہے" خالہ نے یوں کہا جیسے بچہ بھی میرا ہی ہو۔ بہرحال وہ ہمیں اندر لے آئیں۔ میں نے انہیں پہلے

تو گرم کافی لانے کو کہا اور پھر ناشتا لگانے کو۔ "اور ہاں' اس بچے کے لیے بازار سے کچھ چیزیں منگوانی ہیں۔ فریال سے پوچھ کر وہ منگوا دیجیے۔"

فریال کو دیکھ کر ان کا موڈ خراب تھا لیکن انہوں نے فریال کے بچے کے سامان کے بارے میں پوچھ کر اس کی لسٹ بنائی۔ اتنی صبح کوئی مارکیٹ نہیں کھلتی لیکن بچوں کی ضرورت کی بیشتر اشیا میڈیکل اسٹورز پر مل جاتی ہیں۔ خالہ کے جانے کے بعد میں جوتے اتار کر آرام سے قالین پر دراز ہوگیا۔ کمرے میں ہیٹر کی خوشگوار حرارت تھی۔ فریال نے بچے کو میرے پاس ہی لٹادیا اور خود بھی نیم دراز ہوگئی۔

"لگتا ہے آپ کی خالہ بانو کو میری آمد اچھی نہیں لگی؟" اس نے عجیب انداز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ خالہ ذرا پرانے خیالات کی عورت ہیں۔ مگر جب تمہارے بارے میں علم ہوگا تو وہ خود ہی تم پر مہربان ہوجائیں گی۔ تم یہاں پورے سکون اور حفاظت سے رہوگی۔"

وہ متفکر رہی "مگر کب تک؟"

"یہ تو تقدیر پر ہے۔" میں نے گول مول انداز میں جواب دیا "کیا پتا آدمی کا دانہ پانی کب تک کہاں ہوتا ہے؟"

"اور آپ۔" اس نے کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہوگئی۔ کل سے میرے لیے اس کے انداز میں تبدیلی آئی تھی۔ اور وہ مجھے تم کے بجائے آپ سے مخاطب کرنے لگی تھی۔ یہ تبدیلی اس کے اندر کسی تبدیلی کا نتیجہ تھی۔ میں اس کی کیفیت کسی حد تک سمجھ رہا تھا لیکن میں اسے سہارا دینے سے قاصر تھا اور وہ مجھ سے توقع لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

بچہ مطمئن سا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ بہت پیارا سا بچہ تھا۔ اس کے نین نقش اور بال بالکل فریال جیسے تھے۔ میں نے اسے پیار کیا تو فریال کھل اٹھی تھی "پیارا ہے نا میرا بچہ؟"

"بہت پیارا' بالکل تمہاری طرح" میں نے جواب دیا تو وہ مسکرانے لگی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ حسین ترین عورت تھی۔ نیم دراز وہ دلکش سا مجسمہ لگ رہی تھی۔ ملازمہ کافی لے کر آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ملازمہ کو جانے کو کہا اور خود کافی بنانے لگی۔ رات کو کم سونے کی وجہ سے میرا سر کچھ بھاری ہو رہا تھا۔ کافی پی کر میں نے خود کو بہتر محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد خالہ نے ناشتا لگنے کی اطلاع دی۔

"خالہ' ذرا بچے کو دیکھ لیجیے" فریال نے خالہ بانو سے کہا "میں بھی ناشتا کرلوں۔"

خالہ نے پہلی بار بچے کو دیکھا "ماشاء اللہ بڑا پیارا ہے" وہ بولیں "تم جاؤ' میں دیکھ لوں گی۔"

ناشتے سے پہلے فریال نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے شولڈر کٹ بالوں میں کنگھی کی تھی۔ وہ میری توجہ حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ ناشتے کے دوران میں بھی وہ خود کھانے سے زیادہ میرے کھانے پر توجہ دیتی رہی تھی۔ ناشتا کرکے ہم چائے لے کر دوبارہ لیونگ روم میں چلے آئے۔ خالہ بانو بچے سے کھیل رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا "خالہ' مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ میری چیک بک نیلم کے پاس ہے۔"

"میرے پاس ہے لیکن کتنی رقم کی ضرورت ہے؟"

"تقریباً تین چار لاکھ" میں نے کہا "ابھی بینک کھلنے میں کچھ دیر ہے اور کیش والی گاڑی بھی ذرا دیر سے آتی ہے۔ آپ نو بجے کسی کو بھیج دیجیے گا' میں بینک منیجر کو فون کردوں گا۔"

"بینک بھیجنے کی کیا ضرورت ہے' نیلم دے گئی تھی۔ تمہارے لیے رقم۔ وہ میں نے رکھی ہے۔ ایک منٹ میں لے کر آتی ہوں" خالہ بانو چلی گئیں تو فریال نے پوچھا۔

"یہ اداکارہ نیلم ہے نا' جس کا ذکر ہو رہا تھا؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"آپ کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"دیکھا جائے تو کوئی نہیں ہے اور دیکھا جائے تو نیلم میرے لیے بہت کچھ ہے۔"

"جیسا ابھی آپ کی بہت کچھ ہے" اس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

"ہاں' یہ سارے میرے اپنے ہیں۔"

"اور میں...؟"

"فریال' ابھی مجھے تم سے ملے دو دن ہی ہوئے ہیں۔ بے شک ہماری ملاقات ایسے انداز میں ہوئی ہے کہ جس میں تکلف کے پردے جلد گر جاتے ہیں مگر میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہارے لیے کوئی بات طے کرسکوں۔"

"میں آپ کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی ہوں؟" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں" میں ہنسا "میں بوجھ پالنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس صورت میں' میں تم کو کہیں راستے میں اتار کر اپنی راہ لیتا۔"

"یعنی آپ کو میری فکر ہے؟" وہ کھل گئی تھی۔

"ہاں ہے تو" میں نے بادل ناخواستہ کہا "میں ذرا تیار ہوکر آتا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟" وہ بھی اٹھ گئی۔

"تم بھی چلو" میں نے کہا "بلکہ تم وہیں رہ لینا۔"

میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ نیلم نے اپنے گھر

میں میرے لیے ایک کمرا سیٹ کردیا تھا۔ "یہ میرا کمرا ہے۔"

میں نے الماری کھولی۔ اندر بے شمار کپڑے لٹکے تھے۔ نیلم خود ہی لاتی اور سلواتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ کئی سلے سلائے کپڑے تھے۔ میں نے ایک پتلون اور قمیص نکالی کہ فریال آگے آگئی۔

"ایک منٹ! یہ آپ پر اتنا اچھا نہیں لگتا" اس نے الماری سے ایک سرمئی پتلون اور ہلکے سرمئی رنگ کی فل آستین کی گرم جرسی نکالی۔ اسے میرے شانے سے لگایا "ہاں' یہ اچھی لگ رہی ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "فریال' تم میرے لیے یہ سب کیوں کررہی ہو؟"

"مجھے نہیں پتا" اس نے آنکھیں چرائیں "بس مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"فریال!" میں نے گہری سانس لی "مجھ سے اتنی توقعات مت رکھو۔ میں جس راہ پر چل رہا ہوں' اس کا کچھ نہیں پتا۔ میں کل تک زندہ رہوں بھی یا نہیں۔"

"خدا نہ کرے" اس نے سر میرے سینے پر رکھ دیا "ایسی باتیں نہ کریں۔"

"حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں" میں نے نرمی سے اسے الگ کردیا اور کپڑے لے کر باتھ روم میں آگیا۔ نہادھو کر میں نے کپڑے بدلے۔ باہر آیا تو خالہ بانو فریال سے بات کرتے ہوئے اس کے بیٹے سے کھیل رہی تھیں۔ ان کا موڈ خوشگوار ہوگیا تھا۔ میں نے اشارے سے انہیں فریال کو وہیں روکنے کو کہا اور خود ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میں نے فون اٹھا کر لندن میں عینی کے گھر کا نمبر ملایا۔ کئی بیل جانے کے بعد عاقل کی سوئی ہوئی آواز آئی "کون ہے بھائی اتنی رات گئے؟ میری جورو سے کیوں تعلقات خراب کرانا چاہتے ہو؟"

"بھائی' میں جورو کا بھائی ہوں" میں نے جواب دیا۔

"ارے ـــ آپ قائم مقام سسر ـــ ابھی تک زندہ ہیں اور آدھی رات کو اٹھا کر یہ خبر سنا رہے ہیں؟"

"پیارے داماد! بک بک کرنے کے بعد باقی پارٹی کو اٹھائیں۔ میرے پاس ٹائم کم ہے۔ ایسے مشن پر جانا ہے جہاں سے واپسی کا کچھ نہیں پتا" میں نے اسے مختصراً حالات کا بتایا "یہ بات دوسروں' خاص طور سے عینی اور نیلم کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آہ ـــ کس ستم گر کا نام لے دیا۔ لڑکپن میں ہم بھی ان خاتون کے پرستاروں میں شامل تھے جس پر آج پچھتاوا ہوتا ہے۔ خدا کی قسم' انہوں نے زندگی تلخ کردی ہے۔ عینی کا ذاتی شوہر میں ہوں' مگر اس کی ساری کمانڈ ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر میں بیوی کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔ اول تو دونوں سارا دن ہی شاپنگ کے لیے گھر سے باہر رہتی ہیں اور شام کو میں دفتر چلا جاتا ہوں۔ بس صبح ہیلو ہائے ہوجاتی ہے' ہائے ہائے!" اس نے اتنے دکھی لہجے میں کہا کہ میرے لیے ہنسی برداشت کرنا دشوار ہوگیا تھا۔

"صبر کرو برخوردار' ہر مرد پر ایسا دن ضرور آتا ہے۔"

"ظاہر ہے' اب صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔ جن پر تکیہ تھا وہی پتے میرے دل میں لگی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور دوسروں کو بلانے چلا گیا۔ چند لمحے بعد ہی نیلم لائن پر تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔

"ناصر' کہاں تھے تم؟ میں نے اتنی بار فون کیا اور تمہارے موبائل سے جواب نہیں آرہا ہے۔"

"میں آؤٹ آف رینج تھا۔ دراصل خطرات بھانپ کر لاہور سے چلا گیا تھا۔ کئی دن باہر ہی رہا تھا۔"

"کیا ہوا' حالات تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں' ٹھیک ہی ہیں" میں نے ہنس کر کہا "میرے ساتھ ایک اور پناہ گزین تمہارے محل میں آیا ہے۔"

"کون ہے؟" نیلم چونکی۔ میں نے اسے فریال کے بارے میں بتایا۔ مجھے معلوم تھا کہ خالہ بانو اسے فریال کے بارے میں بتادیں گی لہٰذا میں نے پہلے ہی بتادیا۔ نیلم نے پوچھا۔

"تمہارے ہاتھ کیسے لگی رب نواز کی بہو؟"

"بس قسمت کی بات ہے۔ میں جس جگہ گیا تھا وہ اتفاق سے رب نواز کی نکلی۔ اس کے آدمی پیچھے لگ گئے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے میں جس جگہ چھپا وہاں فریال موجود تھی۔ وہ بھی اس سفاک خاندان کے ظلم کا شکار ہے۔ اس کی اور اس کے بچے کی مدد سے میں رب نواز پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔"

اس وقت مجھے خیال آیا کہ رب نواز نے مجھ سے فریال کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ کیا اسے علم نہیں تھا کہ اس کی بہو میرے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔ کیا لالی نے یہ بات اسے نہیں بتائی تھی؟ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی بے خبر تھا۔ مگر اسے فریال کے بھاگ جانے کا ضرور علم ... ہوگا۔ ابھی وہ بیٹے کے سوگ میں تھا' اس کے بعد ہی وہ فریال کی طرف توجہ دیتا۔ کچھ دیر نیلم اور پھر عینی سے بات کرکے میں نے فون بند کردیا۔ رئیس کی طبیعت خراب تھی' وہ سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگانے سے منع کردیا۔ فون رکھ کے میں واپس اپنے کمرے میں آیا۔ مجھے دیکھ کر خالہ بانو نے ایک بریف کیس میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ نمبروں سے کھلنے والا تھا۔ میں نے خالہ بانو کے بتائے نمبر ملا کر لاک کھولا۔ اندر سرمئی نوٹوں کی گڈیاں سلیقے سے جمی تھیں۔ یہ کم سے کم دس لاکھ روپے تھے۔ میں نے اس میں سے چار گڈیاں نکال لیں۔ میں تیار تھا۔ لیکن ابھی گاڑیوں کے شوروم کھلنے میں دیر تھی۔ میں آرام کرنے کے لیے بستر پر دراز ہوگیا' میں نے خالہ بانو سے کافی کی فرمائش کی تو وہ سمجھ گئیں کہ میں انہیں ٹہلا رہا ہوں۔

"کسی کے ہاتھ بھجواتی ہوں" وہ اٹھتے ہوئے بولیں "مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔"

ان کے جاتے ہی فریال جو اب تک بیٹھی تھی' بے تکلفی سے اپنے بچے کے پاس دراز ہوگئی۔ میں بے اختیار اس سے نظریں چرا گیا تھا۔ "میں نے نیلم سے بات کرلی ہے۔ یہاں پر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

اس نے بچے کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا "میں صرف آپ کو جانتی ہوں' کسی نیلم کو نہیں جانتی۔"

"پلیز فریال!" میں تھوڑا سا جھلا گیا تھا "میرے مسائل میں اضافہ مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے سخت لہجے کا وہ اتنا اثر لے گی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ پھر وہ منہ چھپا کر رونے لگی "میں آپ پر ـــ اتنی ہی بوجھ ہوں ـــ تو ـــ کیوں ساتھ لائے؟ کہیں چھوڑ آئے ہوتے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" میں نے پشیمانی سے کہا۔

"مجھے آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہیے" وہ بولی اور بستر سے اٹھنے لگی تھی۔

"فریال رکو" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"چھوڑیں مجھے" اس نے مزاحمت کی "میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔"

"کہاں جاؤ گی؟"

"میں کہیں بھی چلی جاؤں گی" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔

میں نے اسے کھینچ کر بستر پر بٹھادیا "فضول باتیں مت کرو۔ نہ تم کہیں جاؤ گی اور نہ میں اس کی اجازت دوں گا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا "تم اس گھر سے باہر قدم نہیں نکالو گی۔"

وہ اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ پچویشن ایسی تھی کہ خالہ بانو یا کوئی اور ملازم آجاتا تو نہ جانے کیا سوچتا۔ میں اسے خاموش کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ "فریال! پلیز' چپ ہوجاؤ۔ خدا کے لیے۔ میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟ بابا' ابھی کوئی آجائے گا' ورنہ جانے کیا سمجھے گا؟" مگر اس کے رونے دھونے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مجبوراً مجھے اسے سہلا کر اور چمکار کر خاموش کرانا پڑا۔ رفتہ رفتہ اس کے آنسوؤں سے دھلے چہرے پر اجلی سی مسکراہٹ نمودار ہونے لگی۔ وہ کروٹ بدل کر میرے قریب آگئی۔

"جب میرا رونا برداشت نہیں ہے تو مجھے کیوں رلاتے ہیں؟"

"سوری!" میں نے کہا' اسی لمحے موبائل کی بیل بجی۔ وہ میرے عقب میں بستر کے سرہانے بنے لکڑی کے شیلف پر رکھا تھا۔ میں نے گھومنا چاہا لیکن فریال نے مجھے روک دیا۔

"میں اٹھاتی ہوں" اس نے اور قریب آکر ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھالیا اور اس بہانے اپنے وجود کی ساری نرمیوں گرمیوں سے مجھے روشناس کرانے لگی۔ موبائل مجھے دینے کے بجائے اس نے خود کال ریسیو کی "ہیلو!" وہ بولی۔ "ہاں' میں ہی ہوں۔ شاہ عالم ـــ وہ میرے پاس ہیں ـــ بہت پاس ـــ سانسوں سے بھی نزدیک ـــ تم خود کیا ہو؟"

میں سمجھ گیا' دوسری طرف شائستہ تھی۔ جسے فریال جلارہی تھی۔ میں نے اس سے موبائل چھین لیا۔ دوسری طرف شائستہ فراٹے سے گالیاں دے رہی تھی "کیا بکواس ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ کتیا ٹھیک کہہ رہی تھی' تم واقعی اس کی بغل میں ہو؟"

فریال نے فون سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

"شائستہ' زبان کو قابو میں رکھو۔ ہر ایک کو اپنی طرح ہوس زدہ مت سمجھو۔ فریال میرے پاس ہے لیکن ان معنوں میں نہیں۔ مجھے تم جانتی ہو ناں؟"

وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "عورت تو بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتی ہے۔"

"ہاں لیکن ہر عورت نہیں۔ میں فریال کو ایسا نہیں سمجھتا۔"

"شاہ عالم' تم میرے ساتھ اچھا نہیں کررہے ہو۔ اگر میں نے رب نواز کو چندا کے بارے ـــ"

"تم ایسا نہیں کرسکتیں" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں کرسکتی؟ جب تم مجھے ٹھکرا کر اس حرافہ کو ساتھ لے جاسکتے ہو تو میں ایسا کیوں نہیں کرسکتی؟"

"شائستہ' مجھے افسوس سے کہنا پڑرہا ہے' تم بھی رب نواز سے مختلف نہیں ہو۔ جیسے اس کے نزدیک صرف اپنی اور اپنے مفادات کی اہمیت ہے' اسی طرح تم بھی صرف اپنے مفاد کے بارے میں سوچتی ہو۔"

"تو کیا برا کرتی ہوں' ساری دنیا سوچتی ہے۔"

میرے قمیص کے بٹنوں سے کھیلتی فریال رک گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ بات غلط رخ پر جارہی ہے' میں نے اس کا چہرہ ذرا دور کیا۔ اس کی گرم سانسیں مجھے ڈسٹرب کررہی تھیں۔ "شائستہ' تم رب نواز کو چندا کے بارے میں

ضرور بتاؤ لیکن یہ سوچ کر بتانا کہ اس کے بعد رب نواز کے علم میں اور بھی بہت کچھ آئے گا۔ اس سے مجھے اتنا فرق نہیں پڑے گا۔ میرے پاس رب نواز کے خلاف ثبوت ہیں' معلوم ہونے کے باوجود وہ چندا کا بال بھی بیکا نہیں کرسکے گا۔"

شائستہ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ میری دھمکی کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ خاصی دیر بعد اس نے ہنس کر کہا "میں تو بلف کررہی تھی۔ بس فریال کی بات سن کر غصہ آگیا تھا۔ میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ تم نے گاڑی کا کہا۔۔؟"

"اب مجھے ضرورت نہیں ہے" میں نے اس کی بات کاٹی "فون کرنے کا شکریہ۔"

میں نے کال ختم کرکے فون بستر پر پھینک دیا۔ شائستہ کی بات نے میری سوچوں کو منتشر کرکے رکھ دیا تھا۔ اگر رب نواز کو چندا کے شاہ عالم سے تعلق کا پتا چل جاتا تو صورتِ حال یکسر بدل جاتی۔ رب نواز کے خلاف سارے ثبوتوں سے زیادہ اہم چیز میرے لیے چندا کی ایک انگلی تھی۔ میں اسے ذرا سا نقصان ہوتے بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اگر رب نواز مجھے چندا کے حوالے سے دھمکی دیتا تو شاید میں ہتھیار ڈال دیتا۔ پریشانی کے عالم میں مجھے ایک بار پھر سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ فریال بہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہا ہے شائستہ نے۔ اس ذلیل عورت نے چندا کی دھمکی دی ہے؟"

"ہاں" میں نے سرہانے رکھا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا "اس کی بات نے مجھے پریشان کردیا ہے۔"

"اور آپ پریشانی ختم کرنے کے لیے سگریٹ کا سہارا لے رہے ہیں" اس نے اچانک مجھ سے پیکٹ چھین لیا۔

"پیکٹ دو" میں نے واپس لینے کی کوشش کی مگر اس نے ہاتھ سے پیکٹ چرمرا کرکے اسے دور پھینک دیا۔

"اگر آپ کو پریشانی میں کسی سہارے کی ضرورت ہے تو کیا۔۔۔ میں نہیں ہوں؟"

اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا "فریال' ابھی میں شائستہ کے سامنے تمہارا دفاع کررہا تھا اور تم۔۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرا وہ مقصد ہرگز نہیں ہے" اس نے نرمی سے کہا پھر اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "ویسے بھی میں عدت میں ہوں۔"

"تو پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟" میرا لہجہ برہم تھا۔

"عورت صرف ایک ہی طرح سے تسکین کا باعث نہیں ہوتی۔ وہ ماں' بہن اور بیٹی کے روپ میں بھی سکون بخشتی ہے" اس نے کہا اور میرا سر اپنے سینے سے لگالیا۔ اس کی انگلیاں میرے بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔ میں نے سچ مچ بے حد سکون محسوس کیا تھا۔ میرے ذہن کا انتشار رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ اب میں درست طریقے سے سوچنے سمجھنے کے لائق ہوں۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تھینک یو فریال!"

"ویلکم!" وہ مسکرائی۔

میں اٹھ بیٹھا "تم واقعی اچھی ہو۔"

"ہاں لیکن ہر ایک کے لیے نہیں" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ جلدی سے بستر سے اٹھ گئی۔ ملازمہ کافی لے آئی تھی۔ فریال نے کافی بنا کر مجھے دی۔ اس نے خود نہیں لی تھی۔ بچے کی وجہ سے وہ چائے کافی قسم کی چیزیں کم ہی استعمال کرتی تھی۔ کافی ختم کرکے میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ "اب مجھے چلنا ہوگا" میں نے فریال سے کہا۔

وہ اداس ہوگئی تھی "پھر آپ کب آئیں گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کل تک واپس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کبھی۔۔۔"

"خدا نہ کرے۔۔" اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر ذرا سا اچکی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے گداز اور نم لبوں کا لمس مجھے اچھا لگا تھا "بس اتنا یاد رکھیے گا" اس نے سرگوشی کی "کوئی آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔"

"فریال' اتنا دور مت جاؤ کہ واپسی کی راہ بھی نہ رہے" میں نے سنجیدگی سے کہا "میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا ہوں۔"

"میں۔۔ بھی آپ سے کچھ مانگ نہیں رہی ہوں" اس کی آواز بھرا گئی "بس آپ مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ بے شک خادمہ بنا کر رکھ لیں۔"

"تم دل میں رکھنے کے قابل ہو" اس کی پشت سہلاتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا "مگر میں مجبور ہوں اور میری مجبوری سے تم اچھی طرح واقف ہو۔"

"میں جانتی ہوں" اس نے الگ ہوکر آنکھیں صاف کیں "چندا آپ کے لیے اہم ترین ہستی ہے مگر میں صرف آپ کی توجہ چاہتی ہوں' بس تھوڑی سی۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں" میں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔ حلیے میں کسی قدر تبدیلی کے لیے میں نے سر پر پرانی وضع کی انگریزی ٹوپی اور سیاہ شیشوں کی عینک لے لی تھی۔ رقم ایک کپڑے میں لپیٹ کر پتلون کے نیچے کمر سے باندھ لی تھی۔ نیلم ہاؤس کے پورچ میں نئی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن میں نے سیاہ شیشوں والی پجارو کا انتخاب کیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا

کہ مجھے گاڑیوں کے شوروم تک چھوڑ دے۔ راستے میں مجھے علم کا خیال آیا۔ میں نے ڈرائیور سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔

"وہ تو چلا گیا صاحب!"

"چلا گیا۔۔۔ مگر کہاں؟"

"پتا نہیں۔۔۔ بس ایک دن خاموشی سے چلا گیا۔ اس کا کچھ سامان ابھی تک پڑا ہے۔"

اعلم کے دل میں اپنے خاندان کی رب نواز کے ہاتھوں تباہی کے بعد انتقام کا شعلہ پوری توانائی سے جل رہا تھا۔ میں اسے بڑی مشکل سے رام کرکے لایا تھا لیکن نیلم ہاؤس کا پُرسکون ماحول اس کی بے قرار روح کو قرار نہیں دے سکا تھا۔ موقع پاتے ہی وہ نکل گیا تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہوگا؟ ممکن ہے' رب نواز سے انتقام لینے کے چکر میں کسی عذاب میں گرفتار ہو یا اس دنیا سے ہی گزر گیا ہو۔

شورومز کے علاقے میں آکر میں نے ڈرائیور کو واپس جانے کے لیے کہا۔ راستے میں دیکھتا آیا تھا اور مجھے شبہ نہیں ہوا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب کررہا ہے۔ سڑک پار کرکے میں نے نظر آنے والے پہلے شوروم میں قدم رکھا ہی تھا کہ کئی سیلز مین میری طرف لپکے۔ سبقت ایک گول مٹول سے نظر آنے والے سیلز مین نے حاصل کی تھی۔ "جی سر' فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"مجھے ایک فور وہیل ڈرائیو چاہیے۔۔۔ بے شک چھوٹی ہو مگر بہترین کنڈیشن میں' اور ہاں' تیز رفتار ہونی چاہیے۔"

"آئیے سر! میں آپ کو دکھاتا ہوں۔" وہ مجھے جیپوں والے حصے میں لے آیا۔ وہاں کئی جیپیں اور فور وہیل کھڑی تھیں۔ مجھے ایک چھوٹی سی اور چوڑے ٹائروں والی جاپانی جیپ پسند آئی۔ اس کا کیبن مختصر سا تھا اور عقب میں سامان رکھنے کا حصہ تھا۔ اس کے شیشے گہرے رنگ کے تھے۔ انجن پیٹرول تھا۔ سیلز مین نے مجھے ٹرائی کرائی' اس کا پک اپ واقعی شاندار تھا اور اسٹیئرنگ کنٹرول اچھا تھا۔ ایک بجے تک میں سودا کرچکا تھا۔ جب تک میں نے ایک قریبی ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ سیلز مین نے کاغذی کارروائی مکمل کرلی۔ میں نے جیپ شاہ عالم کے نام سے خریدی تھی۔ شکر ہے' وہ اس نام پر چونکا نہیں اور نہ ہی اس نے میری صورت پر غور کیا تھا۔ اب شاہ عالم قصۂ پارینہ بنا جارہا تھا۔

جیپ ملتے ہی میں روانہ ہوگیا تھا۔ تین بجے میں نے لاہور کی حدود کو عبور کیا اور قصور جانے والی سڑک پر سفر کررہا تھا۔ فریال کے حصار سے نکلنے کے بعد اب میں ایک بار پھر چندا کے بارے میں فکرمند تھا۔ اس عورت نے اتنی دیر کے لیے جیسے میرے حواس پر قابو کرلیا تھا۔ حسین عورت ایک ایسی آفت ہوتی ہے جس سے شاذ ہی کوئی بچ پاتا ہے۔ فریال بے شک شائستہ کے مقابلے میں کہیں باکردار اور باحیا عورت ہے لیکن مجھے اپنا مان لینے کے بعد اس کے ہتھکنڈے بھی مختلف نہیں تھے۔ بہانے بہانے سے میرے نزدیک آنا' نازو انداز دکھانا' اپنے وجود کی نرمیوں گرمیوں سے روشناس کرانا۔ یہ سب مجھے متاثر کرنے کی کوششوں کا ایک حصہ تھا۔

چندا کے فون نے مجھے الجھا دیا تھا۔ اگر اسے وہاں سے فون کرنے کا موقع ملا ہی تھا تو وہ وہاں سے فرار کیوں نہیں ہوئی تھی۔ لازمی ہے اسے اس کی ہمدردی حاصل تھی۔ جس کی مدد سے اس نے فون کیا تھا۔۔۔۔ اگر وہ وہاں سے فرار ہوئی تھی تو اسے واپس لاہور آنا چاہیے تھا۔ اس صورت میں وہ کمال کے پاس جاتی یا نیلم ہاؤس کا رخ کرتی مگر وہ کسی جگہ نہیں آئی تھی۔ ان ہی سوچوں میں شام پانچ بجے تک میں ملک مہربان کی حویلی تک جا پہنچا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پہلے تو حیران پھر خوش ہوا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"یار ناصر صاحب' آپ کہاں غائب ہوگئے' میں تو پریشان ہوگیا تھا۔ آپ کی بیوی کہاں ہے؟"

"بس ملک صاحب' یہاں سے نکلے تو راستے میں ایک حادثہ پیش آگیا۔ میری بیوی زخمی ہوگئی تھی۔ اسے فوراً واپس لاہور لے گیا۔ اسپتال کے چکر میں آپ کو بتانے کا موقع نہیں ملا!" میں نے فوری طور پر کہانی بنالی۔

"اوہ' بڑا افسوس ہوا" اس نے کہا اور مجھے اندر لے گیا۔ رسمی باتوں کے بعد چائے پیتے ہوئے میں نے اس سے سامان کے بارے میں پوچھا۔

"اوہ جی' ابھی آئے ہو' ذرا دم تو لو۔ آرام سے سامان بھی دیکھ لینا۔ رات ادھر ہی رہنا ہے نا!"

"نہیں ملک صاحب' مجھے میجر صاحب کے پاس جانا ہے' ان سے ملاقات ضروری ہے۔ میرا سامان ابھی آپ کے پاس ہی رہے گا۔ مجھے صرف کچھ چیزیں درکار ہیں۔"

اس نے اصرار کرکے مجھے اتنا کچھ کھلا دیا تھا کہ اب رات کے کھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ پتا نہیں ملک مہربان سادہ آدمی تھا یا پھر سچ مچ شریف تھا۔ اس نے میری کہانی پر یقین کرلیا اور کوئی سوال نہیں کیا۔ سات بجے میں اس کے پاس سے رخصت ہوا تو سورج غروب ہوچکا تھا اور اندھیرا بے حد تیزی سے چھایا تھا۔ نومبر کے آغاز کے ساتھ ہی موسم کے تیور بدل گئے تھے۔ رات کو خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ ملک مہربان نے جاتے ہوئے زبردستی ہاف آستین کا اپنا سوئٹر دے دیا تھا۔ میں نے سوٹ کیس سے وہ ثبوت حاصل کرلیے تھے۔ جو رب نواز کو اس ملک اور قوم کا غدار ثابت کرتے

تھے۔ مگر اس کے خلاف مجرمانہ ریکارڈ میں نے وہیں چھوڑ دیے تھے۔ یہ میں اسے واپس کرنے کا وعدہ کرچکا تھا۔

فیلڈ ہیڈ کوارٹر کے مین گیٹ پر حسبِ معمول چوکس جوان موجود تھے۔ انہوں نے میرا نام اور کام پوچھا اور اندر اطلاع کرائی' میجر شاہد موجود تھا۔ اس نے فوری طور پر مجھے اندر بلوالیا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

"یار' کہاں غائب ہوگئے تھے۔ میں نے بعد میں رابطے کی کوشش کی مگر تم ملے ہی نہیں۔"

"بس میجر! پھنس گیا تھا ذرا۔"

وہ مجھے دفتر کے بجائے اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ اس نے اپنے اردلی کو بھنا ہوا مرغ تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ مگر اس نے میری سنی ہی نہیں۔ اس نے قہقہہ مار کر کہا "مرغ اپنی جگہ خود پیدا کرے گا۔"

ایک گھنٹے میں' میں نے اسے رب نواز کے کرتوتوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ نیم انسانی نیم حیوانی مخلوق کے بارے میں سن کر وہ حیران ہوا تھا۔ اور لال حویلی کا سن کر وہ اچھل ہی پڑا تھا۔ "میری ناک تلے یہ سب ہو رہا ہے' میں دیکھ لوں گا ان سب غداروں کو۔"

"میجر' میں مشورہ دوں گا کہ اسے آرمی انٹیلی جنس کے سپرد کردو۔ رب نواز کو معمولی آدمی مت سمجھو۔ یہ خاندان حکومت کی جڑیں ہلا سکتا ہے اس سے بے حد احتیاط سے نمٹنا ہوگا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے سر ہلایا "تم ان کے خلاف کچھ ثبوتوں کی بات کر رہے تھے؟"

"ثبوت کا ایک حصہ میں ساتھ لایا ہوں۔" میں نے کہا اور وہ بنڈل اس کے سامنے رکھا جس میں کیسٹس اور فوٹو گراف تھے۔ "ان کی مدد سے کوئی بھی عدالت رب نواز اور اس کے ساتھیوں کو کئی بار پھانسی کے پھندے کی سزا دے سکتی ہے۔"

اس نے پیکٹ کھولا۔ اندر سے برآمد ہونے والی کیسٹوں کو ایک طرف رکھا۔ تصویریں دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر بار بار غیظ و غضب کی سرخی چھا رہی تھی اور وہ مردانہ زبان میں بتا رہا تھا کہ وہ ان غداروں کے ساتھ کیا کرے گا۔ اس اثنا میں اس کے اردلی نے مرغ تیار ہونے کی اطلاع دی۔

"فی الحال لے آؤ۔" میجر شاہد نے کہا "غصے میں اور بھوک لگنے لگی ہے۔"

مرغ واقعی مزے کا تھا۔ اردلی اچھا باورچی تھا۔ میں خواہش نہ ہونے کے باوجود اچھا خاصا کھا گیا تھا۔ مرغ سے فارغ ہو کر ہم نے کافی پی جو میجر شاہد نے خود بنائی تھی۔ "یار' یہ کیسٹس سننے کے لیے کوئی ٹیپ ریکارڈر چاہیے۔ ایک منٹ میں اپنے نائب کیپٹن غوری سے پوچھتا ہوں' اسے گانوں کا شوق ہے۔"

وہ چلا گیا۔ کیپٹن غوری کا نام مجھے یاد نہیں تھا لیکن ایک بار اس سے ملاقات ہوئی تھی اور فون پر بھی بات ہوئی تھی۔ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ عزائم اور حوصلوں سے چمکتا دمکتا نوجوان۔ جس کے لیے فوج نوکری نہیں بلکہ مشن تھا۔ میجر شاہد ایک چھوٹے مگر اچھے ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ واپس آیا تھا۔ میں نے ترتیب کے لحاظ سے نمبر ون کیسٹ لگایا۔ ہم دونوں سننے لگے' جیسے جیسے کیسٹ آگے بڑھ رہی تھی' میجر شاہد کا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے مختلف کیسٹوں سے خاص خاص حصے سنائے۔ اس نے ہاتھ پر مکا مارا۔

"یہ ثبوت ان غداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔"

"مگر تمہیں جلدی کرنا ہوگی۔ اس سے پہلے یہ لوگ خطرہ بھانپ کر یا کسی اور وجہ سے فرار ہوجائیں۔ خاص طور پر رب نواز پر خاصا دباؤ ہے۔"

"یہ ثبوت تم نے کہاں سے حاصل کیے؟"

"اس چکر میں نہ پڑو۔ میں ان لوگوں کے نام نہیں لے سکتا جنہوں نے جان پر کھیل کر یہ ثبوت جمع کیے۔ ان کی کچھ مجبوریاں ہیں۔ وہ سامنے نہیں آسکتے' باقی میں حاضر ہوں۔"

میجر شاہد کی پیشانی پر شکنیں پڑگئی تھیں۔ "او کے۔ میں دیکھ لوں گا اور کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ تھرماس تک گیا۔

"بالکل چلے گی" میں نے کہا۔

اس نے دوبارہ کپوں میں کافی نکالی۔ ایک کپ مجھے دیا۔ "میں کس سے آتا ہوں' بات کرنا ہوگی۔"

"میجر شاہد میں چاہتا ہوں کہ لال حویلی پر فوری چھاپا مارا جائے۔ سب کچھ وہیں ہے اور میری ساتھی بھی اس جگہ قید ہے۔ میں اس کی سلامتی کے لیے سخت پریشان ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں" اس نے ساری کیسٹس واپس پیکٹ میں ڈالیں "کیا میں اب یہ لے جا سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟" میں نے جواب دیا "میں یہ سب تمہارے لیے ہی لایا ہوں۔"

اس نے کیپٹن غوری والی کیسٹ واپس ٹیپ میں لگائی اور پیکٹ لے کر چلا گیا۔ میں آرام سے اس کے بستر پر دراز ہوگیا تھا۔ کافی واقعی لذیذ تھی۔ میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کافی ختم کرکے میں نے کپ رکھنے کے لیے اٹھنا چاہا تو میرے پیروں نے جیسے حرکت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ میں

نے کوشش کی تو پیروں میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ مگر انہوں نے اٹھنے سے انکار کردیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے پیروں پر فالج گر گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ بھی سنسنانے لگے تھے۔ میرے ساتھ کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے کافی پی تھی۔ اس میں کچھ شامل تھا تو کیا میجر شاہد بھی ۔۔۔ نہیں نہیں۔ میرے ذہن نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا مگر حقیقت سامنے تھی۔ آخر اس نے مجھے کافی میں کچھ کیوں دیا۔ میں نے بریٹا نکال لیا۔ مگر لرزتے ہاتھوں نے بتادیا کہ میں زیادہ دیر اسے نہیں سنبھال سکوں گا۔ بے جان ہوتے ہاتھوں میں مفلوج بریٹا اتنا ہی بے ضرر ہوگا جتنا کہ دانتوں کے بغیر زہریلا سانپ ہوتا ہے۔ میرا جسم جتنا بے حس ہوتا جا رہا تھا' ذہن میں اتنا ہی شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اب کسے رہنما کرے کوئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملک کے معتبر ترین ادارے کا ایک افسر غدار نکلے گا۔ اس نے کتنی آسانی سے مجھ سے وہ سب حاصل کرلیا جس کی رب نواز کو خبر بھی نہیں تھی۔ اور نہ ہی رب نواز اسے مجھ سے حاصل کرسکتا تھا... بلکہ اسے خبر ہوئی کہ میں اس کے خلاف کام کر رہا ہوں مگر وہ مطمئن تھا کہ میں جس پر اعتماد کر رہا تھا' وہ اس کا ساتھی تھا۔

بے بس ہوتے جسم کے ساتھ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی شے ایسی نہیں تھی جس سے میں کوئی مدد لے سکتا۔ ویسے بھی میں کسی کو مدد کے لیے بلاتا تو میرے بجائے میجر کی ہی سنی جاتی۔ اچانک میری نگاہ سرہانے رکھے مختصر سے ٹیپ ریکارڈر پر پڑی۔ اس میں کیسٹ ڈلی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ریکارڈنگ بٹن دبادیا اگرچہ اس کام میں مجھے اپنی پوری قوتِ ارادی استعمال کرنا پڑی تھی۔ یہ اعلیٰ درجے کا ٹیپ ریکارڈر بے آواز تھا۔ اور اس کے بٹن بھی اتنے مختصر تھے کہ غور سے دیکھے بغیر یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ کوئی بٹن دبا ہے یا نہیں۔ محض پانچ منٹ کے اندر میرا پورا جسم بے حس و حرکت ہوچکا تھا۔ اب میں اپنے طور پر انگلی ہلانے پر بھی قادر نہیں تھا۔ میجر شاہد کو دوائی کی تاثیر کا علم تھا۔ اس وقت وہ مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے اس کے اندر کی خباثت کو پہلے ہی کیوں نہیں دیکھ لیا۔ اب اس کے چہرے کا تاثر ہی بدل گیا تھا۔ شاید حقیقت چہرے بھی بدل دیتی ہے۔ یہ کسی محبِ وطن کا نہیں بلکہ ایک غدار کا چہرہ تھا۔ اس نے پاس آکر اطمینان سے بریٹا میرے بے جان ہاتھ سے لے لیا۔

"یہ وہی پستول ہے نا جو میں نے تمہیں واپس کردیا تھا؟"

"ہاں" میں نے بولنا چاہا تو یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ میں آسانی سے بول سکتا تھا۔ "اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے اسے تمہارے جیسے غدار پر کیوں نہیں استعمال کیا۔"

"غدار!" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "یہ ایک اصطلاح ہے۔ تمہارے نزدیک میں غدار ہوں۔ لیکن اپنے نزدیک میں صرف اپنے وطن کی خدمت کر رہا ہوں۔"

"جیسے رب نواز کرتا ہے۔ تم اس سے بھی بدتر ہو۔ وہ ایک سیاست داں ہے اور جاگیردار ہے لیکن تم تو اس وطن کے محافظ ہو۔ تمہارا وطن دشمنوں کا ساتھ دینا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تمہاری سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔"

"شاید تم نے لالچ میں یہ کام کیا ہے؟ اس ملک میں تمہارے جیسے لالچی کتوں کی کمی نہیں ہے جو روپے کے لیے اپنی ماں کو بیچنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔"

"تم جو چاہے سمجھو۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور اچانک ہی میرے منہ پر گھونسا مارا تھا "تمہاری وجہ سے مجھے اپنے ہی چند ساتھیوں کو گرفتار کرنا پڑا تھا۔"

"وہ بھی تمہارے ساتھی تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارا "را" سے بھی تعلق ہے؟"

"ہاں' تم ایسا ہی سمجھ سکتے ہو" اس نے گھڑی دیکھی۔

"اب تم کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں' تم جن کی امانت ہو' وہ لینے آنے والے ہوں گے۔"

"میجر' یہ صرف وطن فروشی نہیں ہے" میں نے گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی "بلکہ رب نواز پروفیسر ہاشم رضا کے کام کو بھارتیوں اور امریکیوں کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے۔ اس نیم انسانی مخلوق کو وہ فوج کی جگہ استعمال کریں گے اور اس سے جو تباہی آئے گی اس کی ذمے داری تم پر بھی آئے گی۔"

"تو آنے دو' تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا۔" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"رب نواز غدار بھی ہے' وہ اپنے ہی لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے ہے۔ سرحد پار سے را کے آنے والے دہشت گردوں کو پناہ دیتا ہے اور انہیں تخریب کاری کے لیے سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ کیا تم بھی اس جرم میں شامل ہو؟"

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے" اس نے سگار سلگایا۔

"کیا تم کبھی لال حویلی میں گئے ہو؟"

"کئی بار" اس نے گہرا کش لے کر دھواں خارج کیا "مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ جب میں رب نواز کے ساتھ ہوں تو گویا اس کے ہر کام میں شریک ہوں اور اس کے سارے ٹھکانوں سے واقف ہوں۔"

مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ وہ بے حد ہوشیار آدمی

تھا۔ اگر کھٹک جاتا تو ٹیپ ریکارڈر بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسے معلوم ہوجاتا کہ ہماری ساری باتیں ٹیپ ہورہی ہیں۔ لہٰذا میں نے موضوع بدل دیا "میں اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ دیکھ سکوں کہ تم کتنے بڑے حرامی ہو۔ مجھے شبہ ہے تمہارا تعلق اس سرزمین سے نہیں ہے؟"

"تمہارا شبہ درست ہے" اس نے مسکرا کر کہا تو میں دنگ رہ گیا۔

"پھر۔ پھر تم فوج میں۔"

"میں نے ایک مقامی میجر کی جگہ لی ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور دوست احباب بھی کم ہی ہیں بلکہ تھے کیونکہ اب وہ مرچکا ہے۔ میری شکل اس سے ملتی تھی باقی کمی پلاسٹک سرجری سے پوری کردی گئی۔ میں چار سال پہلے اس کی جگہ آیا تھا۔ اب تک کسی نے مجھ پر شک نہیں کیا۔"

"تم ہندو ہو؟"

"میں بھارت ماتا کا سپوت ہوں" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"رب نواز یہ بات جانتا ہے؟"

"اس کی کیا حیثیت میرے بارے میں تو پاکستان میں بھارت کا ہائی کمشنر نہیں جانتا۔ میں بہت خفیہ آدمی ہوں۔ اگر میں کسی بڑے عہدے تک پہنچ گیا تو تم دیکھنا' اس ملک کی تباہی میرے ہاتھ سے ہی ہوگی۔"

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ یہ تصور ہی خوف ناک تھا کہ پاک فوج کا ایک اعلیٰ افسر اصل میں دشمن کا آدمی ہے۔ "خدا نہ کرے" میرے منہ سے نکلا۔

"وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے" اس کے لہجے میں غرور تھا۔

"تم نے مجھے کوئی دوا دی ہے؟"

"ہاں' بڑی زوداثر دوا ہے۔ اس کے اثر سے پورا جسم بے حرکت ہوجاتا ہے لیکن ذہن کام کرتا رہتا ہے۔"

"تم مجھے رب نواز کے حوالے کروگے؟"

"نہیں' تم کسی اور کے پاس جاؤ گے۔ وہ لوگ تم سے پوچھ گچھ کریں گے۔ وہ اسی کام کے ماہرین ہیں۔"

"مجھ پر تشدد کریں گے؟"

"ضرورت پڑی تو ہم یہ بھی کرگزریں گے۔" اس نے بے پروائی سے کہا "ویسے ہم کوشش کرتے ہیں کہ تشدد کرنے بغیر ہی کام نکل آئے۔"

"غالباً بسوں اور ٹرینوں میں بم دھماکے تمہاری اس پالیسی کا نتیجہ ہیں" میں نے طنز کیا۔ یہ اور بات ہے کہ میری آواز سے ایسا کوئی تاثر نہیں جھلک رہا تھا' کوشش کے باوجود بالکل سپاٹ آواز نکل رہی تھی۔ شاید ایسا دوا... کی تاثیر کی وجہ سے تھا۔ اس نے میرے منہ پر زبردست ہاتھ مارا تھا لیکن مجھے قطعی تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"یہ مملکتوں کی سیاستیں ہیں" اس نے اسی انداز میں کہا۔ وہ یقیناً زبردست تربیت یافتہ تھا اس لیے لب ولہجے سے مجھے ایک لمحے کو شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں ہے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں کھل کر بتادیا تھا۔ اسے اس بارے میں قطعی خوف نہیں تھا کہ میں یہ بات کسی اور سے نہ کہہ دوں۔ اس کا ایک مطلب تھا کہ میرے بارے میں وہ کوئی فیصلہ کرچکا تھا۔ پوچھ گچھ کے بعد مجھے ماردیا جاتا اور اس نے جو کہا ہے وہ سب محفوظ رہتا۔

"تم نے کہا تھا کہ یہ ان رازوں کا صرف ایک حصہ ہے" اس بار اس نے پوچھا۔ "باقی کہاں ہیں؟"

"وہ تمہارے ماہرین پوچھ لیں گے۔"

"شاہ عالم میں تمہارے بارے میں پڑھتا رہا ہوں۔ میرے نزدیک تم ایک خودغرض سیاست داں ہوں۔ پھر تم پر یہ حب الوطنی کا دورہ کیوں پڑا؟"

"میں غدار وطن پہلے بھی نہیں تھا" میں نے کہا "جب میرے مرنے کا ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ تب ہی میری سوچ بدل گئی تھی۔"

"تمہارے اور کون کون ساتھی ہیں؟"

"کوئی نہیں' بس وہ لوگ میرے نئے سیٹ اپ کا ایک حصہ ہیں۔ وہ میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے اسے صرف نیلم کے بارے میں بتایا تھا اور وہ ملک سے باہر تھی۔ ابھی وہ اس کی پہنچ سے باہر تھی۔ باقی وہ دوسروں سے بے خبر ہی تھا۔ سوائے چندا کے جو لال حویلی میں تھی۔

"میں نے سنا ہے' تم نے سیاست اور مافیا کے ساتھ کاروبار میں خوب کمایا ہے۔ وہ رقم کہاں ہے؟"

"ظاہر ہے' اس قسم کی رقم کہاں محفوظ ہوتی ہے' وہیں ہے۔"

وہ میرے پاس آکر جھکا "اگر تم مجھے اپنے بیرون ملک کے اکاؤنٹس کے بارے میں بتاؤ تو میں تمہیں رعایت دے سکتا ہوں۔ تمہاری جان بچ جائے گی اور وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا...؟ اسے بھی چھوڑ دیا جائے گا۔"

"ایسا ممکن ہے" میں نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے کہا "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے واقعی رہا کردو گے؟"

"تم جو ضمانت کہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کہا۔ اس دیش بھگت کا چہرہ لالچ سے چمک رہا تھا۔ وہ مجھے احمق سمجھ رہا تھا کہ اس کی باتوں میں آکر میں اسے اپنے خفیہ بینک اکاؤنٹس کے بارے میں بتادوں گا۔

اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنا بینک اکاؤنٹ کہاں کھول رکھا ہے تو اس کا منہ غصے سے لال ہوگیا تھا۔ اس بار اس نے میرے بائیں جبڑے کو نوازا تھا۔ جھٹکے سے میرا منہ دوسری طرف گھوم گیا تھا۔ مگر کسی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ البتہ میری نظر اس پر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ زیرلب گالیاں دیتا ہوا چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ "حرام زادے' جلد تمہیں پتا چلے گا" اس نے میرے پاس آکر کہا۔ مجھے انجکشن کی جھلک نظر آئی۔ وہ اس کی سوئی سے ہوا نکال رہا تھا۔ مجھے سوئی کی چبھن کا پتا نہیں چلا لیکن غنودہ ہوتے ذہن نے بتادیا کہ خواب آور دوا میرے جسم میں اتاری جاچکی ہے۔

غالباً سیزر کو اتنی حیرت نہیں ہوئی ہوگی جب بروٹس نے اسے خنجر گھونپا ہوگا جتنی مجھے میجر شاہد کی اصلیت جان کر ہوئی تھی۔ میں نے اس پر بھروسا کرکے رب نواز کے وطن سے غداری کے سارے ثبوت اس کے حوالے کردیے تھے۔ میں جسے رہنما سمجھا تھا وہ رہزن نکلا تھا۔ میں نہ صرف تمام ثبوتوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا بلکہ میری اور چندا کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑگئی تھیں۔ ڈوبتے ذہن سے میں نے سوچا کہ اب کوئی امید نہیں ہے۔ شاید عالم بالا میں آنکھ کھلے۔

○☆○

اگر یہ عالم بالا تھا تو میرا شمار خاصے گناہ گاروں میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یوں جھٹکے لگ رہے تھے جیسے مجھے کنکریٹ مکسر میں ڈال کر اسے چلایا جارہا ہو۔ احساس لوٹ آنے کے بعد جوڑ جوڑ میں درد ہورہا تھا۔ یہ غالباً اس دوا کے مابعد اثرات تھے جس نے میرا پورا جسم سن کردیا تھا۔ میں نے خاصی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ ذہن اب بھی غنودہ سا تھا۔ لیکن کسی نے بے دردی سے میرے پاؤں پر ٹھوکر ماری۔

"ہوش میں آرہا ہے حرامی!" بولنے والے کا لہجہ مختلف تھا لیکن اس کے پاؤں کی ٹھوکر نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ میرا جسم جیسے خستہ مٹی کا ہورہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ذرا سی ٹھیس سے بکھر جائے گا۔ میں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ ایک بند وین تھی۔ جھٹکے لگنے سے ظاہر تھا کہ وین کسی کچے راستے پر سفر کررہی تھی۔ میں اس کے فرش پر پڑا تھا۔ دائیں بائیں دو افراد منکر نکیر کی طرح بنچوں پر براجمان تھے۔ دائیں والے نے مجھے ٹھوکر ماری تھی۔ میں نے دوبارہ آنکھ بند کرلی تھی۔ پہلا سوال ذہن میں یہی آیا تھا کہ مجھے کہیں منتقل کیا جارہا تھا۔ مجھے بے ہوش ہوئے یقیناً کئی گھنٹے گزرچکے تھے اور میں اب تک سفر میں تھا۔ تو کیا مجھے کہیں اور منتقل کیا جارہا تھا؟

"اس حرامی کی وجہ سے لونڈیا ہاتھ سے نکل گئی" دائیں طرف والے نے پھر ٹھوکر ماری "بڑی مشکل سے پٹائی تھی۔ باپ مولوی ہے اور بیٹی..." اس نے ایک فحش ترین بات کی تھی۔

دوسرے نے حاسدانہ لہجے میں کہا "ابے اکیلے اکیلے مزے کررہا ہے۔"

"کہاں کررہا ہوں۔ آج پہلی بار ملنے آرہی تھی کوٹھا پھلانگ کر۔ مگر باس نے گند کردی۔ اسے مار کر وہیں ڈال دینا تھا۔"

"ابے یہ کوئی اہم بندہ ہے۔ اسے تبھی ہیڈ کوارٹر بھیجا جارہا ہے۔"

اس پر جھلائے شخص نے وین کی ماں بہن ایک کرنا شروع کردی۔ جس نے انہیں چار گھنٹے تک جنگل میں خوار رکھا۔ پہلے اس کا ایک وہیل پنکچر ہوگیا اور اسپیئر بھی پنکچر نکلا۔ پھر انجن مسئلہ کرنے لگا تھا۔

"ابے مرتا کیوں ہے' لونڈیا پھر آجائے گی۔"

"کہاں آجائے گی۔ اس کا باپ دورے پر نکلا تھا۔ اب نہ جانے کب جائے گا اور مجھے اگلے مہینے تک مکان بدل لینا ہے۔"

"لڑکی اور مل جائے گی۔"

"نہیں یار منوہر۔ اس پر دل آگیا تھا۔ بالکل چوسنے آم کی طرح تھی۔"

منوہر! میں نام سن کر چونکا تھا۔ وہ ہندو تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ان کے لہجے کے مختلف ہونے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ وہ بھارتی فلموں کے انداز میں بول رہے تھے۔ دائیں طرف والا بائیں والے کو تفصیل سے مولوی کی بیٹی کے جغرافیے سے آگاہ کررہا تھا۔ میرا خون ضرور کھول رہا تھا مگر میں فی الوقت ہاتھ ہلانے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ را کے ایجنٹ تھے جو اس ملک کی مٹی اور بیٹی کی بے حرمتی کرنے آئے تھے۔ میں آنکھ بند کرکے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک زمانے میں خان جی نے مجھے اور چندا کو ان ورزشوں کی مشقیں کرائی تھیں لیکن ہم دونوں نے ہی اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی مگر اس میں سے کچھ یاد رہ گئی تھیں۔ میں انہیں ہی دہرانے لگا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میری توجہ ٹوٹتے جسم اور ان لوگوں کی دل آزار باتوں سے ہٹ گئی تھی۔

"لگتا ہے پھر بے ہوش ہوگیا" دائیں والے نے ایک بار پھر پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ اس بار مجھے زیادہ اثر نہیں ہوا تھا لیکن میں یوں کراہا جیسے بے ہوشی میں انسان کسی تکلیف پر

راہتا ہے۔ وین بدستور تیز جھٹکوں کے ساتھ سفر کررہی تھی۔ اردگرد بالکل خاموشی تھی۔ جس میں وین کے انجن کی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ یہ کوئی معروف راستہ نہیں تھا اور نہ ہم ہی انسانی آبادیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر دن نکل آیا تھا یا بدستور رات تھی۔ یہ لوگ مجھے اپنے کسی ہیڈکوارٹر لے جارہے تھے۔ میجر شاہد نے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے رب نواز کے بجائے اس کے آدمی لے جانے کے لیے آرہے تھے۔ انہوں نے مجھے کیمپ سے کیسے نکالا ہوگا' کیا دوسروں نے دیکھا نہیں ہوگا؟ اور میجر نے انہیں کیسے مطمئن کیا ہوگا۔ میں سوچ سکتا تھا۔ میجر نے انہیں لازماً مطمئن کیا ہوگا۔ مجھے وین کا خیال آیا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھ کھول کر دیکھا۔ چھت پر لگے چھوٹے سے بلب سے مدھم سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں نے ممکنہ حد تک چہرہ ہلائے بغیر کیبن کا جائزہ لیا اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں ایک ایمبولینس میں سفر کررہا تھا۔ وین کے کونے میں ایک سلنڈر رکھا تھا جس پر آکسیجن لکھا ہوا تھا لیکن یہ ایک ڈمی تھی۔ اس کا مقصد ایمبولینس کا تاثر دینا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چھت پر گھومنے والی روشنیاں اور سائرن بھی لگا ہوگا اور وین کی شکل وصورت بھی ایمبولینس جیسی ہوگی۔ کسی حساس فوجی علاقے میں سفر کرنے کے لیے اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ کسی کو شاید ہی شک ہو کہ ایمبولینس اور طبی عملے کی آڑ میں را کے ایجنٹ حرکت کررہے ہیں۔

میرے ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی کم ہورہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جسمانی حالت بھی بہتر ہورہی تھی۔ جوڑوں میں درد کم ہونے لگا تھا۔ اچانک وین کی رفتار میں تبدیلی آئی۔ اب یہ تیز رفتار کے بجائے آہستہ رفتار سے اور سنبھل کر چل رہی تھی۔ اس کی وجہ سے جھٹکے بھی کم لگ رہے تھے۔

بائیں طرف والے نے کہا۔

"چل یار' چھٹی ہوئی۔"

"اس حرامی سے فارغ ہوتے ہی چلیں گے۔ چوہدری امام علی کے ڈیرے پر وہاں ذرا موج میلہ کرکے آئیں گے۔"

"اس طرف جانے سے منع کردیا گیا ہے" پہلے والے نے اسے خبردار کیا "ادھر آج کل گڑبڑ ہے۔"

دائیں طرف والے نے جھلا کر منع کرنے والوں کو پھٹکارا۔ اپنی باتوں سے وہ کوئی جنسی مریض لگتا تھا۔ اس کے ذہن پر ہمہ وقت عورت سوار رہتی تھی۔ اس اثنا میں وین ذرا سا کسی ڈھلان پر گئی اور پھر سیدھی ہوگئی۔ اس وقت وہ بالکل ہموار فرش پر رواں تھی پھر وین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر وین کا عقبی دروازہ کھلا۔

"اسے اٹھاؤ اور نمبر چار سیل میں لے جاؤ۔" کسی نے نرم سی آواز میں حکم دیا۔

منکر نکیر پھرتی سے نیچے اترے اور انہوں نے مجھے بے دردی سے باہر کھینچ لیا۔ میں پکے فرش پر گرا پھر انہوں نے مجھے بازوؤں اور ٹانگوں سے اٹھایا اور اندر لے جانے لگے۔ نیچے گرنے اور اٹھائے جانے کے دوران میں نے دیکھ لیا تھا کہ وین ایک ہال میں کھڑی تھی جو شاید گودام تھا۔ وہاں ہر طرف لکڑی کی مختلف سائز کی پیٹیاں رکھی تھیں۔ ہال کی چھت کی اونچائی بتا رہی تھی کہ یہ خاصا وسیع وعریض تھا۔ جب ان دونوں نے مجھے اٹھایا تو مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑی تھیں۔ وہ دونوں خاصے نزدیک تھے۔ ایک نے مجھے بغل کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر تھام لیا تھا اور دوسرے نے میرے پیر سنبھال لیے تھے۔ ایک جگہ ذرا تاریکی کا احساس ہوا تو میں نے ذرا سی آنکھ کھولی مجھے کسی سرنگ سے لے جایا جارہا تھا جس میں خاصے فاصلے پر بلب لگے تھے۔ سرنگ یقیناً ہال سے نکلی تھی اور خاصی طویل تھی۔ مجھے لے جانے والے خاصے جھلائے ہوئے تھے۔ میرا وزن ایک سو ستر پاؤنڈز کے لگ بھگ تھا۔ مجھے اٹھانا یقیناً آسان نہیں تھا۔ بالآخر ایک اور راہداری آئی۔ اس میں دونوں طرف سلاخوں والے دروازے تھے۔ یہ گویا جیل تھی۔ کسی نے دروازہ کھولا اور ان دونوں نے مجھے دائیں طرف والے ایک سیل میں لے جاکر زمین پر پٹخ دیا۔

"منحوس۔ اتنا بھاری ہے۔" ایک نے جھلاتے ہوئے کہا۔

میں نے راستے میں کئی بار سوچا کہ ان دونوں پر قابو پانے کی کوشش کروں۔ میں سامنے والے کے پیٹ پر لات مارتا تو وہ یقیناً خاصی دیر اٹھنے کے قابل نہ رہتا اور جس نے مجھے بغلوں سے اٹھایا ہوا تھا اس کی گردن توڑنا بھی زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن ایک تو میری جسمانی حالت اس قابل نہ تھی کہ میں یہ تیز رفتار ایکشن درست طور پر لے سکتا۔ دوسرے مجھے یقین تھا کہ اس جگہ کی حفاظت کے لیے اور بھی لوگ ہوں گے جو آسانی سے مجھے جانے نہیں دیں گے۔ یہ جگہ زیر زمین اور غالباً کسی ویرانے میں تھی اس صورت میں یہاں سے نکلنا اور فرار ہونا آسان نہیں تھا۔

دشمنوں نے اس سرزمین پر اتنا بڑا اور مضبوط اڈا بنا رکھا تھا اور اس کی حفاظت کے ذمے دار اداروں کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ عین ممکن ہے یہ جگہ ان کی ناک تلے کہیں

واقع ہو۔ وہ لوگ چلے گئے اور فولاد کا بھاری دروازہ بند ہوگیا۔ تالا لگنے کی آواز سن کر میں نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ کوٹھری کے سامنے راہداری میں چھت پر لگے تیز روشنی والے بلب نے پوری کوٹھری کو روشن کردیا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا کیونکہ سامنے کوئی نہیں تھا۔

"خوب یعنی تم مکاری کررہے تھے۔" کسی نے اچانک کہا تو میں اچھل پڑا تھا۔

"کون۔ کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

"غالباً تمہیں راستے میں ہی ہوش آگیا تھا۔ تم ہمارے اندازوں سے زیادہ سخت جان ہو۔ سی نائن کے بعد بے ہوشی کا انجکشن لگنے کے بعد کوئی اتنی جلدی ہوش میں نہیں آتا۔"

اسی اثنا میں آواز کا مخرج مجھے نظر آگیا تھا۔ یہ فرش کے پاس ہی زمین سے کوئی دو فٹ کی بلندی پر دیوار کی ہم رنگ جالی تھی۔ یہ دھاتی جالی دیوار میں اس طرح کسی تھی کہ اسے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ یہ عقبی دیوار میں تھی۔ آواز اس میں سے آرہی تھی۔ اسپیکر چھوٹا تھا یا بولنے والا جان بوجھ کر اس طرح بول رہا تھا کہ آواز کوٹھری سے باہر نہ جائے لیکن اسے کیسے پتا چلا کہ میں ہوش میں آگیا تھا۔ کوئی کیمرا میری جانب نگران تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اس آواز نے پھر کہا۔

"اپنا وقت مت ضائع کرو۔"

مگر میں کیمرا تلاش کرچکا تھا۔ یہ تیز روشنی والے بلب کے ذرا آگے اس طرح لگا تھا کہ اس کا لینس کوٹھری کی طرف تھا۔ بلب کی تیز روشنی کی وجہ سے کیمرے کو دیکھنا آسان نہیں تھا۔ دوسرے یہ بہت چھوٹا سا تھا۔ ممکنہ طور پر جدید ترین لیکن سادہ کلوز سرکٹ کیمرا جو کمپیوٹر کے ساتھ لگا کر بہ آسانی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آج کل مارکیٹ میں اس قسم کے کیمرے عام ملتے ہیں۔ را والوں کے لیے ایسی سہولتوں کا حصول کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

"تم کون ہو اور یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ذرا اپنی پوزیشن پر غور کرو۔ تم سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" آواز نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔"

"پوچھو؟" میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے جسم سے سوائے لباس کے ہر شے اتار لی گئی تھی۔ حتیٰ کہ جوتے اور گھڑی بھی۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں پیشہ ور ایجنٹ تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"شاہ عالم۔" میں نے جواب دیا۔

"شاہ عالم مرچکا ہے۔"

"تم نے مداری اور بچہ جمورا کا تماشا دیکھا ہے۔ بچہ جمورا مرجاتا ہے اور مداری کی ہدایت پر پھر زندہ ہوجاتا ہے۔ تم مجھے سیاست کا بچہ جمورا سمجھ سکتے ہو۔"

"کیا تم نے ایسا کسی ایجنسی کی ہدایت پر کیا؟"

"اس پر میں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔"

"تم کسی پریس کانفرنس میں نہیں ہو۔" آواز یک دم درشت ہوگئی تھی "جو پوچھا جائے سیدھی طرح جواب دو۔"

"اوکے۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ تمہارے لیے بیکار ہے۔"

"اس کا فیصلہ تم نہیں کروگے کہ کون سی چیز ہمارے لیے بے کار ہے اور کون سی کار آمد..... تم تیزی سے مقبول ہورہے تھے پھر ایسی کیا وجہ ہوئی جو تمہیں یہ ڈراما کرنا پڑا۔"

"یہی بات ہے کہ میں اس زندگی سے بور ہونے لگا تھا۔ صبح سے شام تک ٹینشن ہوتی تھی۔ سیاست کے بدبودار تالاب میں رہنے کے لیے ناک کا بند کرنا ضروری ہے۔ میں تنگ آنے لگا تھا۔ دوسرے اس ملک کے ارباب اختیار کو میری پارٹی کے نعرے سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ نظام میں کوئی بھی ایسی تبدیلی آئے جو ان کے اختیارات میں کمی کا باعث بنے لہٰذا اسٹیبلشمنٹ میرے خلاف ہوگئی۔ میرے پاس دو راستے تھے۔ سیاست چھوڑ دوں یا دنیا چھوڑ دوں۔"

"تم نے پہلے راستے کو ترجیح دی؟"

"ظاہر ہے ورنہ میں تم کو کہاں ملتا۔"

"مارے جانے والے ڈرامے کے بعد تم دوبارہ ڈرامائی انداز میں منظر عام پر آئے۔ تم نے عدالت میں اپنے زندہ ہونے کو ثابت کیا۔ کیا اسٹیبلشمنٹ کو اس پر اعتراض نہیں ہوا۔"

"نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں سیاست سے آؤٹ ہوجاؤں۔ اس کے بعد میں ان کی بلا سے جہنم میں جاتا۔"

"رب نواز اور لندن والے جمی کے ساتھ تمہارا نوادرات کا خفیہ بزنس اچھی طرح چل رہا تھا۔ تم کروڑوں لٹا رہے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ تم نے رب نواز کو ڈبل کراس کیا اور اسے بھاری نقصان پہنچایا۔"

"یہ غلط ہے۔ نقصان میری غلطی سے نہیں ہوا تھا۔ میں یہ بات رب نواز پر ثابت کرچکا ہوں۔ بددیانتی اس نے کی اور چرایا جانے والا مال میرے علم میں لائے بغیر میرے توسط سے بین الاقوامی مارکیٹ میں بھیجا۔ اس سے میری ساکھ خراب

ہوئی۔ دوسرے میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس ہنگامہ خیز زندگی سے اکتا چکا تھا اور چاہتا تھا کہیں سکون سے زندگی گزاروں۔"

"اس مقصد کے لیے تم نے پاکستان سے باہر کسی ملک میں اپنا سیٹ اپ قائم کیا ہے۔ کہاں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"اوکے۔ تم نے لاہور میں ناصر عظیم کے نام سے ایک بیک اپ بنایا۔ اس کا مقصد؟"

"ظاہر ہے۔ میں شاہ عالم والی شناخت سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔ میں نے اسی وجہ سے ناصر عظیم کا بیک اپ بنایا تاکہ اگر کبھی پاکستان آؤں تو مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شبہ نہ ہو۔"

"لندن میں نوادرات کی ڈکیتی کا ڈراما ہوا۔ اب وہ نوادرات کہاں ہیں؟"

"یہ بات جمی سے پوچھو۔ ڈراما اس نے کیا تھا۔"

"جمی نے جیل میں خودکشی کرلی ہے۔" اس نے انکشاف کیا "یہ چند دن پرانی بات ہے۔"

"خس کم جہاں پاک!" میں نے کہا "اب جولی کے سر سے لٹکی تلوار ہٹ گئی ہوگی۔"

"چندا سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"

"کوئی نہیں۔ وہ اصل میں میری سیکریٹری ہے اور بس۔"

"غالباً تفریح کی چیز ہے۔ میں نے سنا ہے خوب ہے۔"

"ہاں خوب تو ہے۔" میں نے دل پر جبر کرکے چندا کے بارے میں ایسے کہا جیسے وہ سچ مچ میری رکھیل ہو اور میں اس سے صرف جسمانی حظ اٹھاتا ہوں۔

"اس کا مطلب ہے کہ اگر اسے دوسرے استعمال کریں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ گھٹیا لہجے میں بولا۔

"اول تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دوسرے میں اعتراض کروں بھی تو کیا تم میری بات مان جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں مانیں گے۔ تم ایک بار کہہ کر تو دیکھو۔"

"دیکھو میرے ساتھ گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے صاف صاف کہو کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ میں تم سے ہر تعاون کرنے کے لیے تیار رہوں کیونکہ مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔"

"تم نے رب نواز کے خلاف جو ثبوت حاصل کیے ہیں ان کا بقیہ حصہ کہاں ہے؟" اصل بات اس کی زبان پر آگئی۔

"میں نے میجر سے غلط کہا تھا۔ میرے پاس جتنے بھی ثبوت تھے۔ میں نے لاکر میجر کو دے دیے تھے۔"

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ تمہارے پاس کچھ ثبوت باقی ہیں۔ رب نواز نے خود کہا ہے۔ ان میں کئی ایسے ثبوت نہیں ہیں جن کی بنیاد پر تم اسے بلیک میل کرتے رہے تھے۔"

"رب نواز بھی بکواس کرتا ہے۔ اگر میرے پاس سچ مچ ایسے ثبوت ہوتے تو کیا میں رب نواز سے یوں چھپتا پھرتا پھر تو میں ڈنکے کی چوٹ پر اس کے سامنے آتا اور وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ تم جانتے ہو اس نے میری سابق گرل فرینڈ شبنم کو اغوا کرکے اس پر شرمناک تشدد کیا۔ اس نے میرے وکیل ایڈووکیٹ فرید عباسی کا گھر جلا دیا۔ اگر میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت ہوتا تو کیا وہ یہ کرنے کی جرأت کرسکتا تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ رب نواز کو ہم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ بات تم رب نواز سے پوچھو کہ آخر اسے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے رب نواز نیم حیوانی مخلوق کے پروجیکٹ میں تم کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے کئی اور پارٹیوں سے بھی تعلقات ہیں۔ ان میں اسرائیلی اور دنیا کی کئی معروف دہشت گرد تنظیمیں ہیں جو اس میں دلچسپی لے رہی ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ رب نواز ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔"

"اس سے پوچھو کہ وہ اچانک استاد موج دین سے دشمنی پر کیوں اتر آیا ہے۔ یہ سب اس چکر میں ہو رہا ہے استاد نے اس کی پارٹی توڑنے کی کوشش کی اور وہ اسے تباہ کرنے پر تل گیا ہے۔"

"اس پر تو ہمیں بھی حیرت ہے کہ رب نواز اچانک موج دین کے خلاف کیوں ہوگیا ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا "لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رب نواز ہم سے غداری کیوں کر رہا ہے۔"

"غداری!" میں نے قہقہہ مارا "جو اپنی زمین کا غدار ہے تم اس سے وفاداری کی توقع رکھ رہے ہو۔ معاف کرنا میں تمہیں ذرا عقل مند سمجھنے لگا تھا۔"

"بکومت!" اس کا موڈ خراب ہوگیا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟ اگر صبح ہوگئی ہے تو کچھ کھانے پینے کو ملے گا یا نہیں۔"

"ضرور ملے گا۔ ہم اپنے مہمانوں کو بھوکا نہیں رکھتے۔" اس نے کہا پھر خاموشی چھاگئی۔

کچھ دیر بعد ایک شخص آیا۔ اس نے لمبی سی قمیص پہن رکھی تھی اور سر گنجا تھا۔ چہرے پر کسی قدر لاابالی پن کے تاثرات تھے مجھے لگا کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ تھا اس نے لوہے کے دروازے کے نچلے حصے میں واقع خلا سے چھوٹی سی

پلاسٹک کی ٹرے اندر کی جس میں دو توس کے ساتھ ایک مگ چائے رکھی تھی۔ مگ بھی پلاسٹک کا اور خاصا میلا تھا۔ توس باسی تھے ایسا لگتا تھا کہ کئی دن پرانی ڈبل روٹی تھی۔ چائے البتہ گرم اور ذائقے میں کسی قدر بہتر تھی۔ ہلکی سی سردی میں چائے اچھی لگی تھی۔ میں نے اللہ کی یہ نعمتیں صبر شکر سے پیٹ میں اتار لیں کہ آگے چل کر نہ جانے کیا حالات ہوں۔ یہ بھی نصیب ہو یا صرف مار ہی کھانے میں ملے۔ اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی مجھے ڈھیل دے رہے تھے جلد وہ اپنے حربوں پر اتر آتے اور مجھ سے زبان کھلوانے کے لیے تشدد کرتے یا ذہنی دباؤ کے طریقے استعمال کرتے۔ چندا کی صورت میں ان کے پاس ایک کارڈ تھا اسے استعمال کرکے وہ مجھے اپنے آگے جھکنے پر مجبور کرسکتے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ میں چندا کی جان یا آبرو پر آنچ آتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ناشتا کرکے میں فرش پر ہی دراز ہوگیا۔ میں زیادہ سے زیادہ آرام کرکے اپنی جسمانی حالت کو بہتری کی طرف لانا چاہتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد سیل کا دروازہ کھلا سامنے ایک چھوٹے قد کا اور گٹھے ہوئے جسم کا شخص کھڑا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور بال مختصر تھے اس کی آنکھوں میں بے پناہ سرد مہری تھی۔ اس کے عقب میں دو کمانڈوز نما آدمی کھڑے تھے انہوں نے آرمی کلر یونیفارم پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھوں میں ایل ایم جی گنیں تھیں۔ عام آدمی انہیں دیکھ کر ہی مرعوب ہو جاتا مگر میرا تجربہ تھا کہ اس قسم کے نمونے صرف نمائش کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ ان سے زیادہ خطرناک مجھے یہ چھوٹے قد کا آدمی لگ رہا تھا۔ اس کا انداز اور اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ اس جگہ خاصی حیثیت رکھتا ہے۔

"باہر آؤ۔" اس نے کہا تو اس کی آواز بھی یخ بستہ تھی۔ خاصی محنت کے بعد اس نے اس انداز میں بولنا سیکھا ہوگا۔

"غالباً اب باقاعدہ ناشتا ملے گا۔" میں نے باہر آتے ہوئے بے تکلفی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا "بیڈ ٹی خاص نہیں تھی۔"

"تم چلو۔" اس نے میرا ہاتھ نظر انداز کردیا "تمہیں ناشتا بھی کرایا جائے گا۔"

ایک گوریلے نے ہتھکڑی نکالی اور میری طرف بڑھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا "میں ہتھکڑی نہیں لگواؤں گا۔"

"انکار مت کرو۔ یہاں تم بالکل بے بس ہو۔" مختصر آدمی نے اسی انداز میں کہا۔

میرے پیچھے ہٹنے پر دوسرے گوریلے نے یوں ایل ایم جی تان لی تھی جیسے ابھی مجھے چھلنی کردے گا۔ پہلے والا گوریلا میری طرف بڑھا تو میں اس سے مقابلے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس دوران میں مختصر قامت کو موقع مل گیا اس نے پھرتی سے لات گھما کر میری تشریف پر ماری۔ میں بے اختیار گوریلے پر جا گرا۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ مجھے قابو کیا اور مختصر قامت نے میرے ہاتھ پیچھے موڑ کر پھرتی سے ان میں ہتھکڑی ڈال دی اور گوریلے نے مجھے آزاد کردیا "آگے چلو۔" اس نے مجھے دھکیلا۔

راہداری آگے جا کر دائیں بائیں مڑگئی تھی۔ اگر یہ جگہ زیر زمین تھی تو اس کی وسعت حیران کن تھی۔ نہ جانے انہوں نے کیسے سب سے چھپا کر یہ جگہ بنائی تھی۔ یقیناً یہ را کا معمولی اڈا نہیں تھا۔ میں نے گودام نما جو لکڑی کی پیٹیاں دیکھی تھیں ان میں یقیناً آلو اور پیاز نہیں تھے۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ ان میں اسلحہ ہوگا جو یہاں تخریب کاری کے لیے لایا گیا تھا۔ پچھلے دنوں تواتر سے پنجاب میں بسوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بم دھماکے ہو رہے تھے ان کے بارے میں سرکاری ایجنسیوں کا کہنا تھا کہ یہ کام را والے کروا رہے ہیں اور اب میں اپنی آنکھوں سے اس خوفناک دہشت گرد تنظیم کا سیٹ اپ دیکھ رہا تھا۔

مجھے بائیں طرف والے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہاں پر وہ لوگوں کو اذیتیں دے کر ان سے معلومات حاصل کرتے ہوں گے۔ وہاں فرش میں لوہے کی کرسی نصب تھی۔ مجھے اس پر دھکیل کر میرے دونوں پیر نیچے لگے لوہے کے کنڈوں میں جکڑ دیے گئے۔ یہ اتنے مضبوط تھے کہ میں ان سے کسی صورت پاؤں نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کے بعد میرے ہاتھ سے ہتھکڑی کھول کر دونوں ہاتھ بھی ہتھوں پر لگے کنڈوں میں جکڑ دیے گئے تھے۔ وہاں تشدد کے لیے بے شمار اوزار موجود تھے۔ ان میں ناخن کھینچنے والے پلاس بھی تھے اور دانت کھینچنے والے زنبور بھی۔ شاک دینے والے آلات تھے۔ گرم کرکے داغنے کے لیے ہیٹنگ راڈز تھیں۔ میرا دل فطری طور پر خوف سے جکڑنے لگا تھا۔ میری آزمائش کا وقت آگیا تھا۔ مسئلہ ان کو کچھ بتانے کا نہیں تھا کیونکہ میجر شاہد کے توسط سے انہیں اکثر باتیں معلوم ہو ہی چکی تھیں۔ مسئلہ اپنی جان بچانے کا تھا۔ اگر انہیں احساس ہو جاتا کہ میں ان کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتا یا میرے پاس رب نواز کی غداری کے ثبوت باقی نہیں رہے ہیں تو وہ مجھے مار بھی سکتے تھے۔ مجھے مار کر غائب کردینا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا... بلکہ یہ ضروری تھا۔ میں ان کے بارے میں بہت ساری ایسی باتیں جان گیا تھا۔ اگر میں آزاد ہو جاتا تو ان کے لیے خطرہ ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ مجھے زندہ چھوڑنے کا

خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے لیکن یہ بات بھی اہم تھی کہ میرے پاس ان کے لیے اور کتنی کار آمد معلومات تھیں۔

"اب!" مختصر قامت نے سرد انداز میں کہا "تم خود زبان کھولو گے یا ہمیں کوشش کرنا ہوگی۔"

"میں سب بتا چکا ہوں۔" میں نے خوف زدہ انداز میں کہا "تم تشدد کرکے مجھ سے کوئی نئی بات نہیں معلوم کرسکتے۔"

"یہ بات تو تِل کو کولھو میں ڈالنے کے بعد ہی پتا چلتا ہے کہ اس میں سے کتنا تیل نکلے گا۔" اس بار اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔ اس نے اپنے ایک گوریلے کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک آلہ اٹھایا۔ جس کا دستہ لکڑی کا تھا۔ اس پر سرخ رنگ کا بٹن لگا تھا اور لمبی تار پلگ تک جارہی تھی۔ دستے کے آگے لوہے کی چھوٹی سی راڈ نکلی تھی۔ یہ کرنٹ دینے والا آلہ تھا۔ اس نے پلگ وہاں پڑے ریگولیٹر میں لگایا۔ اس کو سوپر سیٹ کیا اور آلہ لاکر مختصر قامت کو تھما دیا۔ اس نے بلا جھجک راڈ میرے بازو سے لگا کر بٹن دبا دیا۔ میں بے اختیار اچھلا مگر میں اس طرح بندھا تھا کہ اچھلنے کی گنجائش کم ہی تھی۔ میرے حلق سے تیز دھاڑ نکلی تھی۔

"کیسا لگا یہ تجربہ؟" اس نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ایک ہی جھٹکے نے میرے مساموں سے پسینہ نکال دیا تھا۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا "پلیز۔" میں نے بمشکل کہا "میں کچھ نہیں جانتا۔"

"میں جانتا ہوں۔ ابھی تمہاری یادداشت اتنی اچھی نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے جب تم اس جگہ سے نکلو گے تو تمہاری یادداشت خاصی بہتر ہو چکی ہوگی۔"

"تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہمیں ان ثبوتوں کے باقی حصے چاہئیں ہر صورت۔ تم سمجھ لو یہ ہمارے لیے اتنے اہم ہیں کہ ہم ان کے لیے تمہارے بدن کا ریشہ ریشہ ادھیڑ سکتے ہیں۔"

"تم چاہو تو ایسا کرسکتے ہو۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا "مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"یہ بات ہم بہتر سمجھتے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے دوبارہ راڈ میرے بازو سے لگا دی اور اس بار زیادہ دیر تک لگا کر رکھی۔ میرے حلق سے فلک شگاف چیخیں نکل رہی تھیں۔ جب اس نے راڈ ہٹائی تو میں یوں ہانپ کانپ رہا تھا جیسے شدید سردی لگ رہی ہو۔ اس بار پسینہ بھی دھار کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

"باقی ثبوت کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا۔ میرے پاس صرف رب نواز کے جرائم کے کچھ ثبوت ہیں۔"

"تم یوں نہیں مانو گے۔ ابھی وولٹیج صرف پہلے لیول پر ہے۔ اگر اس پر تمہارا یہ حال ہے تو تم دوسرا اور تیسرا کیسے برداشت کرو گے؟"

میرے حلق میں جیسے کانٹے اُگ آئے تھے۔ میں نے کراہ کر کہا "پانی۔ مجھے پانی دو۔"

"پہلے ہمارے سوالوں کے جواب دو۔ ورنہ پانی نہیں صرف کرنٹ ملے گا۔"

میں خاموش رہا تو اس نے پھر راڈ لگا دی اور اس بار پہلے سے بھی زیادہ دیر لگا کر رکھی۔ چیختے ہوئے میری زبان دانتوں تلے آگئی۔ میں جی جان سے لرز رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری رگوں میں تیزاب بھر دیا گیا ہو ایک آگ سی پورے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ میں نے اپنا ہی گوشت جلنے کی بو سونگھی پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں شاید دو تین یا پانچ دس منٹ بے ہوش رہا تھا پھر کسی نے میرے منہ پر پانی مارا۔ عالم بے ہوشی میں بھی میں نے بے تابی سے منہ کھول کر پانی پینے کی کوشش کی مگر پانی نیچے گر رہا تھا۔ میرے منہ میں چند قطرے آئے۔ جو ایسے ہی تھے جیسے خشک پیاسے صحرا میں پانی کے چند قطرے۔ مگر ان کی نمی مجھے جلد ہوش میں لے آئی۔ پانی پھینکنے سے میرا چہرہ اور جسم گیلا ہو رہا تھا۔ پتلون کا خاصا حصہ بھی بھیگ گیا تھا۔

"بڑے بودے نکلے۔" پست قامت سفاک انداز میں مسکرایا "چند جھٹکے نہ برداشت کرسکے۔"

"اس جگہ۔ صرف میں ہی۔ یہ برداشت کرسکتا ہوں۔" میں نے رک رک کر کہا "اگر ایسا ہی ہے تو یہ راڈ مجھے دو۔"

"بکو مت!" اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کا ہاتھ پتھر کی طرح سخت تھا۔ مجھے اپنے خشک منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا "اسے دیکھتے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے اپنے گوریلوں کو حکم دیا۔

اس کے جاتے ہی ایک گوریلے نے راڈ سنبھالی اور اس کے ساتھی نے ہیٹر لگا کر لوہے کی سلاخیں گرم کرنا شروع کردیں۔ وہ مجھے دہشت زدہ کر رہے تھے۔ جس نے راڈ لی تھی اس نے گویا تفریحاً راڈ میری کرسی سے لگا کر اس کا بٹن لمحے لمحے کے لیے دبانا شروع کردیا۔ یہ اذیت دینے کا زیادہ خطرناک طریقہ تھا۔ میں بار بار جھٹکے کھا رہا تھا اور ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لے پاتا تھا کہ دوسرا جھٹکا لگتا۔ یہ قیامت کے لمحے تھے میں ایک بار پھر اس طرح چیخنے لگا جیسے کسی جانور کی زندہ کھال اتاری جائے تو وہ چیختا ہے۔

اسی اثنا میں دوسرے نے لوہے کی سلاخیں گرم کرلی تھیں۔ اس نے اس کی جلتی نوک سے میرا بدن داغنا شروع کردیا۔ اس نے میری جرسی پھاڑ دی۔ بازو اور پھر سینہ اور پیٹ اس کا نشانہ بننے لگا۔ یہ اذیت بھی کم نہیں تھی لیکن بجلی کے جھٹکوں کے مقابلے میں کم ہی تھی۔ میں انہیں تاثر دینے کے لیے چیختا چلاتا اور رحم کی اپیلیں کرتا رہا۔ اس سے وہ زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بس اپنے کام میں مگن رہے پھر انہوں نے بیک وقت اذیت رسانی شروع کردی۔ ایک پہلے گرم راڈ لگاتا پھر دوسرا بجلی کا جھٹکا دیتا۔ میں نہ جانے کب تک ان کی یہ ستم رسانی برداشت کرتا رہا۔ ایک بار پھر بے ہوش ہوا تو اگلی بار آنکھ واپس اپنی کوٹھری میں ہی کھلی۔ میرا پورا جسم جیسے سمندر میں ہلکورے لے رہا تھا۔ تکلیف کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ جسم پر جہاں جہاں زخم تھے وہاں میڈی کیٹڈ پٹیاں چپکی تھیں۔ مجھے شاید کوئی پین کلر انجکشن دیا گیا تھا۔ اس کے اثر سے میں اپنے جسم کو سُن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ پاس ہی ایک بڑے سے مگ میں پانی تھا جسے میں نے بے تابی سے ایک ہی سانس میں ختم کردیا۔ اس سے پہلے کہ میں مگ منہ سے ہٹاتا وہی آواز آئی "خوب تمہیں ہوش آگیا۔"

"اتنی مہربانی کس لیے؟" میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "میں تو سوچ رہا تھا کہ اب آنکھ ہی نہیں کھلے گی۔"

وہ ہنسا "اتنی سی پوچھ تاچھ سے نہیں مرتے تم۔ ابھی تو آگے اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ باکسنگ کا میچ دیکھا ہے۔ پندرہ راؤنڈ ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس اس سے زیادہ راؤنڈ ہیں اور ابھی تو پہلا راؤنڈ تھا۔"

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ جب میں تم سے تعاون کر رہا ہوں۔" میں زمین پر بچھے موٹے کمبل سے اٹھ گیا۔ یہ فوجی کمبل تھا۔ قمیص نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ہلکی سی سردی لگ رہی تھی لیکن یہ قابلِ برداشت تھی۔ پیاس بجھنے کے بعد پیٹ میں بھوک کا درندہ انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

"تم تعاون ہی تو نہیں کر رہے ہو۔" اس نے کہا "ہمیں رب نواز کے خلاف باقی ثبوت ملنے چاہئیں۔ ورنہ تم ابھی بہت سارے عذابوں سے گزرو گے۔"

"فی الوقت تو میں بھوک کے عذاب سے گزر رہا ہوں۔" میں نے ہاتھ پیٹ پر رکھا "میں کتنی دیر بے ہوش رہا؟"

"تمہیں ہوش تو جلدی آجاتا لیکن زخموں کی تکلیف سے بچانے کے لیے تمہیں نیند کا انجکشن دیا گیا تھا۔ تمہیں بارہ گھنٹے بعد ہوش آیا ہے۔" آواز نے کہا "کھانے کے لیے تمہیں کچھ نہ کچھ بھیجا جائے گا۔"

"مجھے حیرت ہے تم نے اتنا بڑا اڈا بنالیا ہے۔ یہاں کسی کو خبر نہیں ہوئی؟"

"اس سے تم ہماری مہارت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔" اس نے فخر سے کہا "بھارت سرکار ہر سال ہم پر اربوں روپے خرچ کرتی ہے۔ را کا شمار دنیا کی تیسری بڑی خفیہ تنظیم میں ہوتا ہے۔"

"مجھے اعتراف ہے کہ را بے حد منظم ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ را کے متعدد بڑے منصوبے بری طرح ناکام ہوئے۔ خاص طور سے کشمیر میں جاری تحریک کو تم لوگ قابو کرنے میں ناکام رہے ہو۔ اس طرح پچھلے کچھ عرصے میں تم لوگ احمقانہ قسم کے ناکام ڈرامے کرکے دنیا بھر میں اپنی جگ ہنسائی کرا چکے ہو۔"

"بکواس ہے۔" اس نے غرا کر کہا "را کا کوئی پروجیکٹ کبھی ناکام نہیں ہوا۔ ہم نے ہمیشہ اپنے مقاصد حاصل کیے۔ مشرقی پاکستان کا بنگلا دیش بننا ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

"اگر دعوے سے ہٹ کر دیکھا جائے تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں را کا خاص رول نہیں تھا۔ کیونکہ تم لوگوں کی کھڑی کی گئی تحریکِ مزاحمت چند ہفتوں میں کچل دی گئی تھی اور بالآخر منصوبے کی ناکامی کے بعد بھارتی فوج کو ننگی جارحیت کرکے مشرقی پاکستان کو الگ کرنا پڑا تھا۔"

میری بات سن کر اسے سانپ سا سونگھ گیا تھا۔ غالباً اس کے احساسِ برتری کو دھچکا پہنچا تھا۔ وہ مجھ پر فوقیت رکھتا تھا اور اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں اسے نااہل ثابت کروں۔ اس کا بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ اگر میرے پاس کھانا بھیجنے کا ارادہ بھی تھا تو اسے ملتوی کردیا گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ کوئی نہیں آیا وقت کے ساتھ دوا کا اثر کم ہوا تو زخموں میں تکلیف جاگ اٹھی تھی۔ سردی کے بڑھتے احساس نے بتایا کہ رات ہو چلی تھی۔ میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا۔ بھوک اور اس سے زیادہ پیاس سے مجبور ہو کر میں نے کئی بار بولنے والے کو آواز دی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس طرح لوہے کا دروازہ بجانے کا بھی کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اس تہ خانے کے قید خانے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ یہ احساس اتنا خوفناک تھا کہ میں چند لمحے کے لیے گھبرا سا گیا تھا پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ وہ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ یہیں ہیں اور میری قوتِ برداشت آزما رہے ہیں۔ میں نے عافیت اس میں

سمجھی کہ کمبل اوڑھ کر لیٹ جاؤں۔ اگر سونے میں کامیاب ہوجاتا تو تکلیف کے ساتھ بھوک پیاس کا احساس بھی مٹ جاتا مگر زخموں کی بڑھتی ہوئی تکلیف نے میری سونے کی کوشش ناکام بنادی۔ تنگ آکر میں اٹھ کر ٹہلنے لگا اور دل ہی دل میں ان لوگوں کو گالیاں دینے لگا۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بس میرے دل کی بھڑاس نکل رہی تھی۔

تھک کر میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ اپنی تکلیف اور بھوک کے احساس سے بچنے کے لیے میں دوسروں کے بارے میں سوچنے لگا۔ نیلم، رئیس بھٹی اور عاقل لندن میں تھے۔ بے خوف اور آزاد زندگی گزار رہے تھے۔ خوش تھے اور بے خبر تھے کہ ناصر عظیم پر کیا گزر رہی ہے۔ رخشی اور عباسی مری میں اپنے تاخیر سے منائے جانے والے ہنی مون کو انجوائے کررہے ہوں گے۔ حتیٰ کہ کمال اور قمر بھی اپنے گھر میں چین کی نیند سو رہے ہوں گے۔ بس میں اور چندا آفت میں مبتلا تھے۔ نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں نے دل سے دعا کی کہ وہ عافیت سے اور خیریت سے ہو۔ میرا ساتھ دینے کی اسے اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہیے۔

میں نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ پستہ قامت اندر آیا تھا۔ اس کے دونوں گوریلے حسبِ معمول اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کرسی لاکر اندر رکھی۔ پستہ قامت نے نفیس قسم کا گرے کلر سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پتلون ذرا اوپر چڑھاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"اب تمہارا کیا حال ہے؟" اس نے حسبِ معمول سرد لہجے میں پوچھا۔

"مہربانی ہے تمہاری۔" میں نے دیوار سے ٹیک لگالی۔

"اب کیا خیال ہے؟" اس نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"میں تمہارے ہاتھ میں ہوں۔ جو چاہو کرسکتے ہو۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم میرے قابو میں ہو لیکن تمہارا تعاون ضروری ہے۔" اس بار اس نے نرم لہجے میں بتایا۔

"میں تعاون کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر پیکٹ میری طرف بڑھایا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ نکال لی اور پھر اس کے دیئے گئے لائٹر سے سلگالی۔ سگریٹ کا دھواں خالی پیٹ میں جاکر لگا تھا مگر اس سے بھوک کا احساس کم ہونے لگا تھا۔ اس نے پُرخیال انداز میں کہا "تم مکمل تعاون نہیں کررہے ہو؟"

"تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔ رب نواز کے خلاف ثبوتوں کی بات نہ کرنا۔ میں آخر وقت تک یہ بات کہتا رہوں گا۔ میں رب نواز کے خلاف سارے ثبوت میجر شاہد کو دے چکا ہوں۔"

"تمہیں ہاشم رضا کے پروجیکٹ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"رب نواز کی حماقتوں سے۔" میں نے جواب دیا اور اسے ذرا تفصیل سے بتایا کہ رب نواز نے کس طرح مجھ سے چھیڑ چھاڑ کی۔ مجبوراً مجھے جواب دینا پڑا اور میں اس کی جڑوں تک پہنچتا رہا تھا۔ میں نے نہ صرف اس کے راز حاصل کرلیے بلکہ اسے شدید نقصان بھی پہنچایا۔

"موج دین سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم رب نواز کو اس کے خلاف کیوں استعمال کررہے ہو۔"

"میں۔!" میں نے حیرت سے کہا "میں موج دین کو سرسری جانتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم رب نواز کی اس سے کیا دشمنی ہے اور وہ اسے میرے سر کیوں تھوپ رہا ہے۔ البتہ میں نے سنا ہے کہ موج دین نے بھی نوادرات کے میدان میں قدم رکھا ہے اور وہ رب نواز سے یورپ کی مارکیٹ چھیننا چاہتا ہے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ رب نواز کو موج دین سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" وہ بولا "اسے ہم سے جھوٹ بولنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں مجھے شبہ ہے کہ رب نواز ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ ایک طرف وہ تم بھارتیوں اور امریکی اور یہودیوں سے ڈیل کررہا ہے۔ دوسری طرف دنیا کی اور سپر طاقتوں سے معاملہ کررہا ہے اور تیسری طرف وہ دہشت گرد گروپوں سے رابطے میں ہے اور تینوں طرف سے مفاد حاصل کررہا ہے مگر وہ کسی کے حوالے بھی یہ چیز نہیں کرے گا۔"

"تم ایسا کیونکر کہہ سکتے ہو؟" اس کی آواز حسبِ معمول سپاٹ تھی۔

"پھر پروفیسر ہاشم رضا کہاں ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"یہ بات تمہیں معلوم ہونی چاہیے۔ اسے تم نے اغوا کیا تھا۔"

"یہ بات بھی تمہیں رب نواز نے بتائی ہوگی۔" میں نے تلخی سے کہا "اگر ہاشم رضا کو میں نے اغوا کیا ہوتا تو کیا میں اس کے عوض رب نواز سے منہ مانگے فوائد حاصل نہیں

کرسکتا تھا۔"

"ہاشم رضا کو آزاد کرانے کی کوشش میں اس کا بیٹا مارا گیا۔" اس نے سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے جوتے سے مسل دیا "اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"اس کا بیٹا پروفیسر کو آزاد کرانے کی کوشش میں نہیں بلکہ مجھے مارنے کی کوشش میں کیفرِ کردار کو پہنچا۔"

اس کی پیشانی پر نمایاں ہونے والی لکیر بتا رہی تھی کہ وہ میری بات کا تجزیہ کررہا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ مدلل بات کروں۔ رب نواز کی طرف سے اسے بدظن کروں پھر

اس نے سرہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا "تمہارے لیے ابھی کھانا بھجوایا جائے گا اور میڈیکل ٹریٹمنٹ بھی ملے گی۔"

"میں اس کے لیے تمہارا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا۔ وہ چلا گیا اس کے گوریلے بھی کرسی اٹھا کر رخصت ہوگئے۔ تقریباً بیس پچیس منٹ کے بعد وہی گنجا اور لمبے کرتے والا چھوٹی سی ٹرے میں پیالہ لایا جس میں ابلے ہوئے چاولوں اور سبزیوں کا ملغوبہ تھا۔ کھانے کی ٹرے نچلے حصے سے اندر سرکانے کے بعد وہ جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی بلاوجہ مسکرانے لگا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مو۔ موجو۔" اس نے بھاری زبان سے کہا۔ غالباً ذہنی پسماندگی کی وجہ سے اسے بولنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ اس کا نام شاید مجید یا موج تھا۔ جسے مقامی رواج کے مطابق مختصر کرکے موجو کردیا گیا تھا۔

"تم یہیں رہتے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے سرہلایا "پہلے چاچا پاس۔ تھا۔ اس۔ نے نکال۔ دیا۔ فیر۔ ادھر آگیا۔"

غالباً اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ اس کے چاچا نے اس کی پرورش کی لیکن جب اسے کسی کام کا نہ پایا تو اسے نکال باہر کیا اور یہ اب بھارتی ایجنٹوں کے پاس تھا۔ اسے شاید یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اس ملک اور اس کے عوام کے دشمن ہیں وہ انہیں اپنا مربی اور محسن سمجھتا ہوگا۔ جنہوں نے اسے کھانا اور رہنے کے لیے جگہ دی تھی۔ میں نے اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یہاں کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا۔ شاید اسے ایک مخصوص حصے تک محدود رکھا گیا تھا اور اسے ہر جگہ یا باہر آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے کھانا ختم کیا اور اس سے پانی مانگا۔

"ام بھی لایا۔" اس نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد وہی آواز آئی "تم بیکار کوشش کررہے ہو۔ یہ کچھ نہیں جانتا۔ یہ صرف اسی حصے تک محدود ہے۔"

"تم لوگوں نے ایک ذہنی پسماندہ شخص کو بھی نہیں بخشا اسے بھی اپنی دہشت گرد... سرگرمیوں میں استعمال کررہے ہو۔ کسی دن تم اسے بم دے کر کسی بس یا ٹرین میں بٹھا دو گے۔ یہ اپنے ساتھ بے شمار لوگوں کو لے مرے گا۔"

وہ ہنسا "ہم انسانوں کو استعمال کرنے کے معاملے میں جینئس ہیں۔" اس کے انداز میں فخر تھا "اور تم نے قابلِ غور بات کی ہے۔ واقعی ہم اسے بڑی آسانی سے تخریب کاری کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ اس پر کوئی شک بھی نہیں کرے گا مگر فی الوقت ہمیں اس کی یہاں ضرورت ہے۔"

آہٹ سن کر میں گھوما تو وہ پانی کا گلاس لیے باہر کھڑا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس نے ہماری باتیں سنی تھیں کیونکہ اب اس کے چہرے پر کسی قدر فکر کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں نے جاکر اس سے پانی کا گلاس لیا اور پانی پینے کی آڑ میں اسے خاموش ر[illegible] کا اشارہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ کیمرے کا لینس میرا اشارہ دیکھنے میں ناکام رہا ہوگا۔ وہ جس جگہ کھڑا تھا وہ جگہ کیمرے کی حد سے باہر تھی اس لیے بولنے والے کو اس کی آمد کا علم نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ میرا اشارہ سمجھا یا نہیں لیکن بولنے کے بجائے وہ خاموشی سے گلاس اور نیچے رکھے برتن لے کر چلا گیا۔ میں واپس آکر کمبل میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ اس لمحے دروازے پر پھر کوئی آیا۔ اس بار ایک ادھیڑ عمر اور پستہ قد ذرا گول مٹول سا شخص تھا۔ اس کے ساتھ ایک گوریلا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور گول مٹول شخص اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل بکس تھا۔ اس نے خاموشی سے آکر بکس رکھا۔ اس میں سے ایک انجکشن لگا کر میرے بازو میں لگایا اور کھانے کے لیے کچھ گولیاں دیں۔

"پانی کے بغیر انہیں کیسے کھاؤں۔"

"پانی لاؤ۔" اس نے پہلی بار گوریلے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اوئے۔ موجو۔ پانی لا۔" گوریلے نے چلا کر کہا۔ کچھ دیر میں موجو پانی لے آیا۔ میں نے گولیاں پانی کے ساتھ لے لیں پھر اس گول مٹول ڈاکٹر سے کہا۔

"ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" میں نے چھوٹی انگلی اٹھائی۔

"مجھے اس کا نہیں پتا۔" اس نے جواب دیا اور بیگ بند کرکے جانے لگا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"یہ کیا جواب ہے کیا میں اس جگہ فارغ ہوجاؤں۔"

گول مٹول نے بے بسی سے گوریلے کی طرف دیکھا "اس

سے کہو۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ڈاکٹر کو جانے دو۔" آواز نے اچانک ہی کہا "تمہاری ضرورت ابھی پوری کی جاتی ہے۔"

میں نے ڈاکٹر کا راستہ چھوڑ دیا وہ پھرتی سے باہر نکل گیا۔ گوریلے نے دروازہ بند کرکے تالا لگا دیا۔ مجھے مایوسی ہوئی انہوں نے مجھے بے وقوف بنایا تھا لیکن گوریلا پانچ منٹ بعد ہی واپس آیا اس بار اس کے ساتھ موجو تھا۔ اس نے موجو کو چابی دی "تالا کھول۔"

اس نے تالا کھولا۔ گوریلا چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اس بار اس کے ہاتھ میں ایل ایم جی کے بجائے زیادہ خطرناک اعشاریہ پینتالیس کا پستول تھا۔ قریب سے فائر کے لیے اس سے زیادہ مہلک ہتھیار کم ہی ملیں گے۔ اس نے پستول کو حرکت دی "کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔ ورنہ مر جاؤ گے۔" اس کے انداز میں دھمکی تھی۔

"میں بس ایک ہی غلط حرکت کروں گا۔" میں نے اسے چھوٹی انگلی دکھائی "تم نے دیر لگائی تو یہ حرکت یہیں کر دوں گا۔"

"باہر آؤ۔" اس نے حکم دیا۔

میرے باہر آتے ہی وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ موجو نے میری رہنمائی کی۔ وہ سب سے آگے تھے۔ درمیان میں میں تھا اور پیچھے گوریلا۔ باتھ روم راہداری کے دائیں طرف تھا۔ وہاں دروازے پاس پاس تھے جس سے ظاہر تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے کمرے شاید باتھ روم، کچن اور اسٹور روم کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ میں نے فراغت حاصل کی موقع سے فائدہ اٹھا کر منہ ہاتھ دھویا۔ میں نے ذرا دیر لگائی تو گوریلے نے دروازہ بجایا۔

"باہر آؤ۔" وہ غرایا۔

"آتا ہوں۔" میں نے چلا کر کہا "کیا ادھورا کام چھوڑ کر آجاؤں۔"

دوسری بار اس نے زیادہ خطرناک انداز میں دروازہ بجایا اور اندر آنے کی دھمکی دی تو مجھے باہر آنا ہی پڑا تھا۔

"کیا ساری عمر کی کسر نکال رہے تھے؟" گوریلے نے غرا کر پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے متانت سے کہا "میں آنے والے چند دن کی کسر نکال رہا تھا۔"

"واپس چلو۔" اس نے کہا۔

"چلو۔" میں نے موجو کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ گوریلے کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے آگے آنے کی کوشش کی اور جیسے ہی میرے اور گوریلے کے درمیان۔۔۔ آیا، میں نے جھپٹ کر اسے پکڑ کر گھمایا اور اپنے سامنے کرلیا۔ اس کا مضبوط جسم میری گرفت میں پھڑپھڑانے لگا۔ میں نے اس کی گردن پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"خبردار! اگر تم نے حرکت کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ پستول پھینک دو۔"

اس نے پستول پھینکنے کے بجائے یوں میری طرف دیکھا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آرہی ہو۔ میں نے پھر سے اپنے الفاظ دہرائے۔ اس کے سیاہ چمکتے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگالی "ہاں توڑ کر دکھاؤ۔ اس کی گردن۔"

"کیا تمہیں اس کی زندگی کی پروا نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہے۔ لیکن اتنی نہیں ہے کہ اس کی جان بچانے کے لیے پستول تمہارے حوالے کر دوں۔"

"تم شاید اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔" میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔ اسے چھوڑتے ہو یا میں ایک ہی گولی سے دونوں کا کام تمام کر دوں۔"

"تم۔ تم اسے بھی مار دو گے؟" میں نے بے یقینی سے کہا "یہ تمہارا ساتھی ہے۔"

"ساتھی۔" وہ حقارت سے بولا "یہ صرف ہمارا غلام ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"اوکے۔" میں نے شکست خوردگی سے موجو کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ تڑپ کر مجھ سے دور ہو گیا اس کی گردن میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی گردن مسل رہا تھا۔ گوریلے نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں آزاد کرانے کے لیے میں نے یہ بات کہی۔ ورنہ تم تو ہمارے دوست ہو ناں۔"

"یہ۔ یہ بُرا۔ آدمی۔ ہے جی۔"

"ہاں۔ ہم اسے سزا دیں گے۔ جیسے اس آدمی کو دی تھی۔"

"جس کی کھال اتار دی تھی۔" وہ مسرت سے بولا۔

گوریلے نے سر ہلا کر اس کی بات کی تصدیق کی "اب اسے واپس لے چلو۔ اسے بند کرنا ہے۔"

موجو نے مجھے دھکا دیا "چل۔ اندر۔"

میں خاموشی سے چل پڑا۔ را کا یہ سفاک ایجنٹ صرف اسے بہلا رہا تھا۔ ورنہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ سچ مچ ہم دونوں کو گولی مار دیتا اگر میں اسے آزاد نہ کرتا۔ میں اپنے سیل میں آیا۔ موجو نے دروازہ بند کرکے تالا

لگایا۔ وہ دونوں چلے گئے۔ میں دوبارہ کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا۔ اس بار دواؤں کی وجہ سے مجھے آسانی سے نیند آگئی تھی۔ جاگنے کے بعد میں نے خود کو خاصا بہتر محسوس کیا تھا۔ میں کمبل سے نکلا تو دروازے پر ایک قمیص لٹکی تھی۔ یہ موٹی جینز کی فل آستین کی قمیص تھی۔ میں نے اسے پہن کر دیکھا۔ کسی قدر تنگ تھی مگر کام چل رہا تھا۔ گزشتہ ایک دن میں سردی میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ مجھے وقت کا قطعی اندازہ نہیں تھا لیکن میرا خیال تھا کہ مجھے اس قید خانے میں آئے کم سے کم چھتیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ کچھ دیر بعد موجو ایک کپ چائے اور دو سوکھے توس لایا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ صبح کا وقت تھا۔

"آپ نے۔ جی۔ مجھے زور سے۔ دبایا۔ تھا۔" اس نے ناشتے کی ٹرے اندر سرکاتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیکھا۔ ان لوگوں کو تمہاری پروا نہیں ہے۔" میں نے سرگوشی کی "یہ تمہیں بم دے کر کسی بس میں بھیج دیں گے بم سمجھتے ہو ناں؟"

"بڑا والا پٹاخہ۔" اس نے سادگی سے بم کی تشریح کی۔

"ہاں۔ اس سے آدمی مرجاتا ہے تم بھی مرجاؤ گے۔"

"میں بھی۔" اس کی آنکھوں میں خوف جھلک آیا۔ یہ اچھی علامت تھی خوف آدمی کو جان بچانے پر اکساتا ہے۔

"ان کے پاس سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ یہ تمہیں مار دیں گے۔"

"میں۔ میں کہاں جاؤں جی؟"

"تم میرے ساتھ چلو۔ میرا بڑا سا گھر ہے وہاں رہنا۔ میں تمہیں لاہور دکھاؤں گا۔" میں نے اسے لالچ دیا اور دل ہی دل میں خدا سے اپنے اس فعل کی معافی مانگی۔

"اچھا۔" اس کے لہجے میں حسرت تھی "مجھے فلم بھی دکھاؤ گے؟"

"بہت ساری۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"مگر میں تمہیں کیسے نکال سکتا ہوں۔" اس نے مایوسی سے کہا "چابی۔ میرے پاس۔ نہیں ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے چابی کہاں ہے؟"

اس نے سر ہلایا "پر۔ مجھے۔ ادھر جانے سے منع کیا ہے۔"

"تم کوشش کرو۔ اگر ہم ادھر سے نکل گئے تو میں تمہیں بہت سارے مزے کراؤں گا۔"

میں دروازے کے پاس اس انداز میں بیٹھا تھا جیسے وہیں ناشتا کر رہا ہوں۔ میں اور موجو دونوں ہی بہت ہلکی سی آواز میں بات کر رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ یہ آواز دیوار میں لگے مائیکروفون تک نہیں جائے گی۔ وہ کوئی دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ موجو کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔

"یہاں کتنے آدمی ہیں؟"

"پانچ ہیں۔ جی۔" اس نے کہا "باقی آتے۔ جاتے رہتے ہیں۔"

"جو آدمی ہر وقت ٹی وی دیکھتا رہتا ہے وہ کہاں ہے؟"

"اس والی گلی میں۔" اس نے اشارے سے بائیں سمت مڑنے والی گیلری کا بتایا "چابی۔ اسی کے پاس۔ ہوتی ہے۔"

میں نے کل چار افراد کو دیکھا تھا اور پانچویں کی آواز سنی تھی۔ گویا اس جگہ یہی کل پانچ افراد ہوتے ہیں۔

"سنو بجلی کا بٹن کہاں ہے؟"

"ادھر والی گلی میں آخری کمرے میں۔"

"تم کسی طرح چابی حاصل کرکے پہلے بجلی والا بٹن بند کرنا پھر آکر مجھے کھولنا۔ میں تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ وہ بہت بڑا شہر ہے۔"

"ڈیگا والا سے بھی بڑا؟" اس نے غالباً اپنے گاؤں کا نام لیا۔

"بہت بڑا۔" میں نے سرگوشی کی "وہاں بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ گاڑیاں ہیں۔"

"میلہ بھی لگتا ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"وہاں سارے سال ہی میلہ لگا رہتا ہے۔"

اسی دوران میں ناشتا ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے برتن واپس کرتے ہوئے اس سے پانی مانگا اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں۔ پانی دینے سے۔ منع کیا ہے۔" یکایک اس کی آنکھوں اور لہجے میں بیگانگی آگئی تھی۔

وہ برتن لے کر چلا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا۔ وہ ناقص العقل شخص تھا۔ عین ممکن تھا کہ ان لوگوں سے ذکر کر دیتا اور میری نگرانی سخت کر دی جاتی۔ مجھے بہرصورت فرار ہونا تھا۔ اپنی رہائی سے زیادہ اہم چیز چندا کی رہائی اور اس سے بھی زیادہ اہم مقصد میجر شاہد کو بے نقاب کرنا تھا وہ آستین کا سانپ بنا تھا اور موقع پاتے ہی ڈس رہا تھا۔ اس کی سرکوبی ضروری تھی۔ پروفیسر ہاشم رضا کے پروجیکٹ کی طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ وہ اس کے بغیر بیکار تھا۔ کوئی دوسرا فرد اس تکنیک سے واقف نہیں تھا جس کی مدد سے انسانی بیضے میں جانور کے تولیدی خلیے کی ملاوٹ کرکے ایک بار آور انڈا حاصل کیا جا سکتا تھا اور پھر اس انڈے سے ایک پورا نیم انسان اور نیم انسانی کیونکر حاصل ہوتا تھا۔ اس

ساری تکنیک سے صرف پروفیسر ہاشم رضا ہی واقف تھا۔ رب نواز یا اس کے غیر ملکی ساتھی لاکھ سر پٹختے مگر اس چیز کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جینیٹک سائنس بہت ہی خاص قسم کی سائنس ہے۔ اس میں برسوں بعد جا کر کامیابی ملتی ہے۔

میرے زخموں میں تکلیف اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور زخموں پر کھرنڈ آنے لگا تھا۔ یہ بات دشمنوں کو بھی معلوم تھی۔ لہٰذا انہوں نے میرے لیے دوسرے راؤنڈ کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔ پستہ قد کو دونوں گوریلوں کے ساتھ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ ایک اور آزمائش آ چکی ہے۔ ایک گوریلے نے دروازہ کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے انکار کر دیا "میں باہر نہیں آؤں گا۔"

"اسے باہر لاؤ۔" پستہ قد نے ایک گوریلے سے اس کی رائفل لے لی۔ وہ جارحانہ تیور کے ساتھ اندر آیا۔ میں تیار تھا۔ بظاہر ڈر کر پیچھے ہٹا اور اچانک بیٹھتے ہوئے لات گھمائی مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ شاید وہ بلیک بیلٹ کا تربیت یافتہ کراٹے کا تھا۔ وہ صفائی سے اچھل کر میری لات سے بچ گیا اور اس سے پہلے میں اٹھتا اس نے سامنے کے رخ سے میرے سینے پر لات ماری۔ اگر میں بروقت بلاک نہ کرتا تو اس کی لات میری کئی پسلیاں توڑ دیتی۔ ہاتھ میں آنے کے بعد میں نے اس کی ٹانگ موڑ دی۔ وہ گھوم کر گرا مگر دوسری لات سے مجھے دیوار کی طرف دھکیل دیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تیزی سے میری طرف آیا تھا لیکن میں نے دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس کے گھٹنوں پر بھرپور وار کیا تھا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری۔ غالباً اس کا ایک عدد گھٹنا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گھٹنا تھام کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پستہ قد تیزی سے اندر آیا وہ اتنی پھرتی سے آیا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس نے گھومتے ہوئے جوتے کی ایڑی میرے سر پر ماری ضرب اتنی شدید تھی کہ میں شاید سیکنڈ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ یہ ایک مکمل پیشہ ورانہ کک تھی جس میں قوت بھی تھی اور توازن بھی۔

گیلے پن اور سردی کے احساس کے ساتھ مجھے ہوش آیا تھا۔ کسی نے میرے منہ پر پانی پھینکا تھا۔ میں ہاتھوں کے بل ہوا میں جھول رہا تھا۔ مجھے زنجیر کے سہارے دیوار سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس طرح کہ میرا منہ دیوار کی طرف تھا اور دونوں ہاتھ دیوار میں کنڈوں سے لگی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ میرا سر یوں دکھ رہا تھا جیسے اس پر سے روڈ رولر گزر گیا ہو۔ بڑی ظالم کک تھی۔ اس نے میرا مغز سر کے اندر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھنا چاہا تو کسی نے میرے بال جکڑ لیے۔

"تم اپنے لیے خود مشکلات پیدا کر رہے ہو۔" پستہ قد نے اچک کر میرے کان میں کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے ایک جھٹکا دے کر میرے بال چھوڑ دیئے۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

"تمہارے گوریلے کا کیا حال ہے میرا خیال ہے اس کا گھٹنا ٹوٹ گیا ہے۔"

"تمہیں اس حرکت کا خمیازہ بھی بھگتنا ہوگا۔" اس نے زہریلے انداز میں کہا۔

سڑاک کی آواز پر میں نے سر گھما کر دیکھا۔ دوسرا گوریلا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مگر بل کھایا صورت سے ہی خوفناک نظر آنے والا ہنٹر جھٹک رہا تھا۔ اس کے جھٹکنے سے سڑاک کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے پستہ قد کی طرف دیکھا اور میری طرف آیا۔ غالباً اسے اشارہ مل گیا تھا۔

"شاہ عالم اب بھی وقت ہے ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

"میں اور کیا تعاون کروں۔" میں نے ذہنی طور پر خود کو تیار کرتے ہوئے کہا۔ ایک بار پہلے بھی میں رب نواز کی قید میں دلنواز کے ہاتھوں ہنٹر کا تشدد جھیل چکا تھا۔ اس وقت بھی میری کھال ادھڑ گئی تھی۔ اس وقت کے نشانات اب تک میری کمر پر تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں ایک بار پھر اس تشدد کو جھیل سکتا تھا۔ پستہ قد میرے پاس آیا "مجھے رب نواز کے خلاف ثبوت چاہئیں۔"

تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ انہیں رب نواز کے جرائم کے ثبوت درکار تھے جن کا تعلق اس کی وطن فروشی سے نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے جال میں پھنسانے یا اس سے اپنا کوئی مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ ثبوت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ غالباً ہاشم رضا والے معاملے میں۔ ان کے خیال میں رب نواز انہیں ڈبل کراس کر رہا تھا اور اس نے ہاشم رضا کو خود ہی کہیں غائب کر دیا تھا۔ ان ثبوتوں کی مدد سے وہ رب نواز سے اپنی مرضی سے سودا کر سکتے تھے۔ مجھے سوچوں میں مگن ہونے کا خمیازہ ہنٹر کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ میں تیار نہیں تھا۔ ضرب نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ ضرب بے حد شدید تھی۔ دلنواز ایک ناز و نعم سے پلا شخص تھا۔ اس کے بازوؤں میں وہ طاقت نہیں تھی جو اس گوریلے کے بازوؤں میں تھی۔ وہ پیشہ ور جلاد لگ رہا تھا۔ ہنٹر نے میری کمر تک کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری چیخ پستہ قد کی ہنسی کمرے میں گونجی تھی۔

"شاہ عالم یہ صرف آغاز ہے۔ ممکن ہے صرف آدھے گھنٹے بعد تمہاری کمر پر کھال نام کی کوئی شے ہی باقی نہ رہے۔ وہ وقت آنے سے پہلے ہماری بات مان لو۔"

میں نے جواب نہیں دیا۔ دوسرا ہنٹر زیادہ شدید تھا لیکن میں ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے برداشت کر گیا پھر جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا غالباً اسے اپنے ساتھی کا غصہ بھی تھا۔ جس کی میں نے ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ غصہ یوں مجھ پر نکال رہا تھا کہ جیسے سچ مچ میری کھال اتارنے پر تل گیا تھا۔ دس منٹ بعد جب پستہ قد نے اسے روکا تو میں غشی کے عالم میں ہاتھوں کے بل جھول رہا تھا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ میں بے ہوش بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ جبکہ میری اس وقت یہی خواہش تھی کہ بے ہوشی مجھے اپنی آغوش میں پناہ دے دے پھر قدرت کو شاید رحم آ گیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

تکلیف اتنی شدید تھی کہ میں بے ہوشی کے عالم میں بھی اسے محسوس کرتا رہا تھا۔ پورے بدن میں گرم سی لہر اٹھتی تھی اور مجھے جھلساتی تڑپاتی گزر جاتی تھی۔ خاص طور سے پشت پر جیسے انگارے دہک رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میری پشت کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے چھوا ہو۔ میں دیکھے بغیر جان گیا تھا کہ وہ کون تھی "چندا۔" میں نے تڑپ کر کہا۔

"تاصر یہ کیا ہوا؟" اس نے سسکی لی۔

"کچھ۔ کچھ نہیں بس معمولی سی تکلیف ہے۔ تم آ گئی ہو تو اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بہت مارا ہے ان ظالموں نے۔" اس نے نرمی سے میرے زخموں کو چھوا تو تکلیف کے بجائے ایک سکون آمیز ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔ وہ ہاتھ پھیرتی رہی اور میں تکلیف میں کمی محسوس کرتا رہا تھا۔ میں نے تاریک خلا میں ہاتھ چلایا تو چندا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔

"تم ٹھیک تو ہو انہوں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دیکھو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ آنکھ کھولو۔"

میں نے کوشش کر کے آنکھ کھولی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے سیل میں کمبل پر گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ کمر میں عذاب ناک درد ہو رہا تھا۔ بے اختیار میرے حلق سے کراہیں نکل گئیں۔ چندا نہیں آئی تھی۔ صرف اس کا خیال تھا مگر میرے لیے اس کا خیال ہی کم نہیں تھا۔ شاید میرے حواس خمسہ دھوکا دے رہے تھے مجھے سیل میں چندا کے بدن کی خوشبو آ رہی تھی۔ معاً کوٹھری کا دروازہ کھلا اور موجو اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا۔ وہ میرے پاس ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے نرمی سے مجھے اوندھے منہ لٹایا اور میری کمر پر کسی مرہم کی مالش کرنے لگا۔ پہلے تو اس کے ہاتھوں کے لمس نے مجھے تڑپا دیا تھا لیکن پھر سکون سا ہوتا چلا گیا۔ مرہم نے زخموں کی آگ کو سرد کر دیا تھا۔ مرہم لگا کر اس نے مجھے سیدھا ہونے کو کہا۔ میں کسی قدر کوشش سے اٹھ بیٹھا پھر اس نے پیالے میں سوپ لا کر مجھے دیا۔ اس میں سبزی اور مرغی کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی اس حالت میں گرم سوپ نے خاصا سہارا دیا پھر اس نے مجھے لٹا دیا "اب۔ سو جاؤ۔" مجھے اس کی آنکھوں میں تاسف کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں نے سعادت مند بچے کی طرح اس کی بات مان کر آنکھیں بند کر لیں۔ سوپ میں شاید کوئی خواب آور دوا بھی ملائی گئی تھی۔ چند منٹ میں میں گہری نیند سو چکا تھا۔

نیند کا یہ وقفہ میرے لیے باعث رحمت تھا۔ میرے ٹوٹے ہوئے درماندہ جسم کو آرام ہی نہیں ملا تھا، بلکہ زخموں کی تکلیف بھی خاصی حد تک کم ہوئی تھی۔ سونے کے دوران میں ہی ایک بار پھر مرہم کی مالش کی گئی تھی۔ میں اپنی پشت دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہنٹر نے جا بجا میری کھال ادھیڑ کر رکھ دی تھی اور اب زخموں کو ٹھیک ہونے میں کئی دن لگتے۔ ہوش میں آنے کے بعد موجو نے آ کر ایک بار پھر مرہم لگایا۔ مجھے کھانے کے لیے چکن کلر دی اور روہی ذائقے دار سوپ پلایا۔ اسے پی کر میں ایک بار پھر سو گیا تھا۔ جاگنے کے بعد اپنی حالت کسی قدر بہتر محسوس ہوئی تھی۔ موجو نے آ کر پھر وہی معمول دہرایا اور میں سوپ پی کر ایک بار پھر سو گیا۔ مجھے لگا کہ یہ لوگ کسی وجہ سے مجھے مستقل سلا کر رکھنا چاہتے تھے۔ تیسری بار دوا کا اثر ذرا کم ہوا تھا۔ اس لیے میں وقت سے پہلے ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ جاگنے کے بعد بھی میں خاموشی سے کمبل میں لیٹا پڑا تھا۔ اب کمر کے زخموں کی

تکلیف برائے نام رہ گئی تھی۔ میں نے بازو کے جلائے جانے والے زخم کے مندمل ہونے سے اندازہ لگایا کہ میں اسی طرح دو دن سوتا رہا تھا۔ مرہم زود اثر تھا۔ اس نے کمر کے زخموں کو خاصی حد تک درست کردیا تھا۔ درد میں بھی کمی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہونے لگی تھیں اور میں سوچنے لگا کہ یہ مجھے مستقل سلا کر کیوں رکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ اتنے ہمدرد نہیں تھے کہ زخموں کی تکلیف سے بچانے کے لیے مجھے بے ہوش رکھتے۔ بات کچھ اور تھی۔ میرے جاگنے کے کوئی دو گھنٹے بعد موجو مرہم اور سوپ کا پیالہ لے کر آیا تھا۔ مرہم لگوانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

"میں پانی لاتا ہوں۔" موجو کہہ کر باہر نکل گیا۔ میں نے سوپ کا پیالہ لیا اور رخ موڑ کر اس طرح کرلیا کہ کیمرے کی آنکھ سے بچ جاؤں۔ دروازے کے باہر گوریلا مستعد تھا۔ میں نے سوپ آہستہ آہستہ کمبل پر گرانا شروع کردیا۔ کمبل نے سوپ جذب کرلیا۔ پیالہ خالی کرکے میں نے یوں رکھ دیا جیسے سوپ پی کر ختم کیا ہے۔ کمبل کا گیلا ہوجانے والا حصہ میں نے چھپا دیا تھا۔ معمول کے مطابق میں چند منٹ بعد اونگھنے لگا تھا۔ موجو پانی لے کر آیا تو میں نے اونگھتے اونگھتے پانی پیا اور پھر لیٹ گیا۔ موجو نے گوریلے سے کہا "سو گیا ہے۔"

"باہر آکر تالا لگاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ میں نے تالا لگنے کی آواز سنی اور وہ چلا گیا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اگرچہ یہ آسان کام نہیں تھا مگر ملنے سے انہیں یقین ہوجاتا کہ میں بے ہوش نہیں ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میری بے ہوشی میں وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر اس دوران میں کوئی آتا تو میں اسے قابو کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ کوئی آرہا تھا۔ میں نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا یہ وہی پستہ قد تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"شاہ عالم تم میری بات سن رہے ہو۔" اس نے بھاری آواز میں کہا "تمہارا شعور سو رہا ہے لیکن لاشعور جاگ رہا ہے۔ تم میری آواز سن رہے ہونا؟"

گویا مجھے سوپ میں ایسی کوئی دوا دی جاتی تھی جو میرے شعور کو سلادیتی تھی مگر لاشعور کو سامنے آنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس نے کئی بار پوچھا تو میں نے کسمسا کر کہا "ہاں میرا لاشعور جاگ رہا ہے۔ میرا نام۔۔۔ نام۔۔۔ شاہ عالم ہے۔"

"تم کیا کام کرتے ہو؟"

"میرا کنسٹرکشن کا بزنس ہے۔ میں ۔۔ میں ۔۔ میں نوادرات اسمگل کرتا ہوں۔"

"تمہارا شعور اب بھی مزاحمت کررہا ہے۔ میں حکم دیتا ہوں اس مزاحمت کو ختم کردو۔"

"میں۔۔ مزاحمت نہیں کروں گا۔" میں نے گویا خواب میں کہا۔

"یہ بتاؤ کہ رب نواز کے خلاف تم نے ثبوت کہاں رکھے ہیں؟"

"میں۔ میں نہیں۔ بتا سکتا۔"

"کیوں؟" وہ غرایا "اس بات کا جواب دو۔"

میں نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھا تھا۔ اس کی چست وردی میں کمر کے ساتھ ہولسٹر سے بندھا پستول صاف نظر آرہا تھا۔ میں اچانک کوشش کرتا تو شاید اس سے پستول حاصل کرلیتا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا تھکا ہوا اور تین دن سے سویا جسم اس معاملے میں میرا ساتھ دے سکے گا یا نہیں مگر یہاں کی ناکامی سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ لہٰذا میں نے چانس لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔

"میں یہ ثبوت کسی کو نہیں دے سکتا۔ رب نواز پر میرا دباؤ ان کی وجہ سے ہی قائم ہے۔"

اسی دوران میں حرکت کرتے ہوئے میرا ہاتھ بتدریج اس کی کمر کے گرد بندھے ہولسٹر کے پاس ہوتا جارہا تھا۔

"کیا یہ ثبوت تم نے کسی کے پاس رکھوائے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ میرا ہاتھ سستی سے آگے جارہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری کسی حرکت سے وہ ہوشیار ہوجائے۔

"کس کے پاس؟"

"میں۔ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ میرا ہاتھ اب چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

"مجھے بتاؤ۔" اس نے سختی سے کہا۔ میں نے جواب میں ہاتھ مارا اور اس کے ہوشیار ہونے سے پہلے میں نے پستول نکال لیا تھا۔ وہ اچھلا تھا لیکن میں نے پستول کی نال کو اس کے سینے سے لگا دیا۔

"حرکت مت کرنا۔ ورنہ میں ٹریگر دبا دوں گا۔"

میں آہستگی سے اٹھا اور کمبل اتار کر پھینک دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمیں دیکھا جارہا تھا اور چند ہی لمحوں میں دوسرے پہنچ جاتے لیکن میں اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا مگر اس سے پہلے میں کچھ کرتا ایک دم دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہوگئی تھی۔

ایک لمحے کو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا تھا۔ دراصل لائٹ چلی گئی تھی۔ سیاہ وردی پوش نے تاریکی ہوتے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے پستول کی زد سے ہٹنے کی کوشش کی مگر میں اس سے پہلے ہی ٹریگر دبا چکا تھا۔ ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ اس کا جسم زمین پر گرا۔ اگر اس نے چیخ ماری بھی تو مجھے فائر کی آواز میں سنائی نہیں دی تھی۔ وہ شاید مرگیا تھا۔ ورنہ زخمی تو ضرور تھا۔ میں تیزی سے اٹھا تو مجھے چکر سا آگیا۔ میں زمین پر بیٹھ گیا۔ تین دن سے طاری مسلسل نیند نے میرے جسم کو سن سا کردیا تھا۔ اس سے زخم بھر گئے تھے مگر مسلز اپنی پوری توانائی سے کام کرنے سے قاصر تھے۔ میں نے خود کو خطرے کا احساس دلایا اور دیوار کا سہارا لے کر اٹھ گیا۔ اس بار میرے قدم مضبوطی سے فرش پر قائم رہے تھے۔

سیل اور اس کے باہر مکمل تاریکی تھی۔ کسی نے مین سوئچ بند کردیا تھا مگر کس نے؟ میرا ذہن موجو کی طرف گیا لیکن یہ وقت سوچ بچار کا نہیں، موقع سے فائدہ اٹھا کر نکلنے کا تھا۔ گیلری میں، میں بائیں طرف گھوم گیا۔ باہر جانے کا راستہ اس طرف ہی تھا۔ معاً عقب سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ موجو سے دیّق لاشوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ غالباً وہ اپنی جگہ سے غائب تھیں۔ موجو کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر وہ چیخ چیخ کر اسے گالیاں دینے لگا تھا۔ اس بار میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ یہ وہی شخص تھا جو اسپیکر پر بات کرتا تھا۔ میں نے اب تک اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ دونوں کمانڈوز میں سے ایک تو میرے ہاتھوں ریٹائرڈ ہرٹ ہوگیا تھا اور غالباً مرمت کے لیے کہیں بھیج دیا گیا تھا۔ اگر اس کا متبادل نہیں آیا تھا تو اب بھی مجھے دو افراد سے نمٹنا تھا۔ تب ہی میں شاید اس زیرزمین زندان سے باہر جاسکتا تھا۔

میں اندھیرے میں احتیاط اور ہرممکن خاموشی سے حرکت کررہا تھا۔ میری ذرا سی آہٹ میرے دشمنوں کو ہوشیار کردیتی۔ ابتدائی چیخ و پکار کے بعد اب سناٹا تھا۔ یعنی دشمن بھی میری طرح خاموشی سے مجھے تلاش کررہے تھے۔ اب واضح تھا کہ یہ موجو ہی کا کام تھا۔ اس نے مین سوئچ آف کرکے وہاں کچھ ایسا کام کیا تھا کہ یہ لوگ دوبارہ روشنی نہ کرسکیں۔ ہوسکتا تھا کہ اس نے فیوز کے۔۔۔۔۔۔ کٹ آؤٹس ہی غائب کردیے ہوں۔ تارچوں کی طرح۔۔۔۔۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ میری مدد کے لیے ایسا کررہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں چلتا چلتا خاصی دور نکل آیا تھا اور اپنے اندازے کے مطابق اس گودام کے پاس تھا جہاں مجھے ایمبولینس سے اتارا گیا تھا۔ دوسرے وجود کا احساس کسی آہٹ سے ہوا تھا۔ آواز بے حد معمولی اور ناقابل سماعت لیکن اس وقت میں سراپا سماعت بنا ہوا تھا۔ اس لیے یہ معمولی سی آہٹ بھی سن لی۔ پستول میرے ہاتھ میں پوری طرح تیار تھا۔ میں گولی چلانے اور کسی کو بھی قتل کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ میرے وطن کے دشمن اور اس کے بے گناہ عوام کے قاتل تھے ان پر رحم کسی سانپ یا بچھو پر رحم کرنے کے مترادف تھا۔ میں بالکل ساکت تھا جب خاصی دیر تک آہٹ دوبارہ نہیں سنائی دی تو میں نے ایک قدم اور آگے کی طرف بڑھایا۔ اسی لمحے ایک شعلہ لپکا اور میرے سر کے قریب دیوار میں پیوست ہوگیا۔ مکار دشمن زیادہ صبر سے انتظار کررہا تھا۔ اگر اس کی گولی چند انچ نیچے ہوتی تو میرا کام تمام ہوچکا ہوتا۔ میں نے اسی جگہ جوابی فائر کیا جہاں سے شعلہ برآمد ہوا تھا اور فوراً ہی اپنی جگہ بدل دی۔ یہی کام غالباً اس نے بھی کیا تھا۔ اس لیے وہ بھی محفوظ تھا۔ گولی چلانے سے ہونے والی ذرا سی روشنی میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ میں گودام کے عین دہانے پر تھا اور میرا دشمن دائیں طرف کی پیٹیوں میں کہیں چھپا تھا۔ میں دائیں طرف کی دیوار کی آڑ میں ہوگیا۔ دشمن ایک بار پھر خاموشی سے میری کسی حرکت کا انتظار کررہا تھا۔ اس کے پاس لامحدود وقت تھا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ جتنی دیر ہوتی میں اتنا ہی اس جگہ پھنستا چلا جاتا۔ اگر اندر موجود شخص کسی طرح روشنی کرلیتا یا انہیں باہر سے مدد مل جاتی تو میرے لیے خاصی مشکل ہوجاتی۔ دشمن کی توجہ ہٹانا ضروری تھا لیکن میرے پاس کوئی شے نہیں تھی جس سے میں دشمن کی توجہ کہیں اور کرتا یا اسے فائر کرنے پر مجبور کرتا۔ میرے پاس پستول تھا یا جسم پر لباس۔ اچانک مجھے گولی کے خول کا خیال آیا۔ میں نے فائر کیا تھا تو میں اس وقت بائیں دیوار کے پاس تھا۔ خول بھی وہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دشمن اسی طرف سے کسی آہٹ کا منتظر تھا۔ میں نے بہت آہستگی سے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ پھیلا کر فرش پر گولی کا خول تلاش کرنا شروع کردیا۔ یہ گیلری زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بمشکل چار فٹ چوڑی تھی۔ گویا خول بیس مربع فٹ کے اندر ہی کہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے دائیں طرف سے آغاز کیا اور بائیں طرف آیا۔ تلاش کرتے کرتے معاً میرا ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا۔ یہ گولی کا خول نہیں تھا لیکن اسی سائز کی زیادہ وزنی شے تھی۔ جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کنکریٹ کا کوئی ٹکڑا تھا۔ دشمن کی گولی نے دیوار چھید دی تھی۔ غالباً اس سے یہ ٹکڑا ٹوٹ کر گرا تھا۔ بہرحال میرا کام ہوگیا تھا۔ میں نے ٹکڑا اٹھایا اور واپس دائیں دیوار کی طرف آیا۔ پستول اندازے سے اس طرف سیدھا کیا

جس طرف دشمن تھا اور کنکریٹ کا ٹکڑا اندازے سے مخالف سمت میں اچھال دیا۔ یہ سب اندازے تھے عین ممکن تھا دشمن اسی طرف ہوتا جس طرف میں نے ٹکڑا پھینکا تھا اور اسے میری جائے پناہ کا اندازہ ہو جاتا۔

ٹکڑا کسی شے سے ٹکرایا۔ سناٹے میں واضح آواز آئی اور ایک شعلہ لپکا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بھی فائر کر دیا۔ فائروں کی بے پناہ آواز کے باوجود میں نے اس کی دبی ہوئی چیخ سن لی تھی گولی نے کام کر دیا تھا۔ وہ زخمی ضرور ہوا تھا لیکن زندہ اور ہوش میں تھا۔ اس نے جھلاہٹ اور خوف میں پورا میگزین اسی طرف خالی کر دیا جہاں میں تھا۔ اگر میں دیوار کی آڑ میں نہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی گولی مجھے چاٹ جاتی۔ اس بار میں نے زیادہ احتیاط سے فائر کیا اور اس کی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔ وسیع ہال میں اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔ ممکنہ طور پر اس کا کام تمام ہو چکا تھا لیکن میں نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔ عین ممکن تھا۔ وہ مکاری کر رہا ہو مگر اس طرف مکمل خاموشی تھی۔

جس طرح لائٹ اچانک گئی تھی اسی طرح اچانک بحال بھی ہو گئی۔ میں اچھل پڑا اور کچھ دیر تک اپنی آنکھیں کھولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ گیلری یا سرنگ میں روشنی تھی لیکن آگے گودام میں ایک دو بلب ہی جل رہے تھے۔ جن کی روشنی میں یہ وسیع جگہ تاریک تاریک سی لگ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اس جگہ دیکھا۔ جہاں دشمن کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ وہیں تھا لیکن اپنے ہی خون میں غلطاں اور خاموش پڑا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول خالی تھا لیکن لباس میں تین عدد میگزین اور کمر سے بندھا خنجر بھی مل گیا۔ اب میں زیادہ مسلح تھا۔ میرے پستول میں جو آنجہانی وردی پوش کا تھا۔ ابھی پانچ گولیاں باقی تھیں۔ اب مجھے موجو کی فکر تھی۔ اندر روشنی کرنے والا کوئی دشمن ہی ہو سکتا تھا اس صورت میں موجو کی عافیت مشکوک تھی۔ اندر کی طرف جانے کے بجائے میں نے پہلے گودام میں رکھی لکڑی کی پیٹیوں کو دیکھا۔ ان سب پر تالے لگے تھے اور ظاہر ہے چابی میرے پاس نہیں تھی لہٰذا میں نے فائر کر کے ان کے تالے توڑنا شروع کر دیے۔ میں احتیاط سے فائر کرتا تھا کہ گولی پیٹی میں نہ لگے۔ ورنہ اندر موجود گولا بارود پھٹ کر میرے بھی چیتھڑے اڑا دیتا۔

حسب توقع ان پیٹیوں میں اسلحہ ہی بھرا تھا۔ پہلی پیٹی میں نئی تیار شدہ ایل ایم جی رائفلیں تھیں۔ دوسری پیٹی میں ان کی گولیوں کی بیلٹیں تھیں۔ یہ عام اسلحہ نہیں تھا۔ ایک پیٹی میں انار کے سائز کے دستی بم تھے پانچویں پیٹی سے بھی ماؤزر پستول نکلے تو مجھے مایوسی ہوئی۔ میں بموں کی تلاش میں تھا۔ جو انہی پیٹیوں میں کہیں موجود تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان میں ٹائم بم موجود نہ ہوں لیکن سیکڑوں پیٹیوں کی تلاشی لینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں پیٹیوں پر گولیاں ضائع کرتا رہتا تو دشمن آ کر بڑی آسانی سے میرے سر میں سوراخ کر دیتا۔ میں نے پیٹی سے ایک ایل ایم جی نکال کر اس پر گولیوں کی بیلٹ فکس کی۔ یہ کام میں نے آسانی سے کر لیا مگر اسے چلاتا کیسے؟ اس کا دھکا بہت زیادہ ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے اسٹینڈ پر رکھ کر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال نہ چلانے پر بھی اس کی دہشت ناکی ہی کافی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے دستی بم بھی لے لیے مگر میرے دائیں ہاتھ میں پستول ہی تھا۔ اتنی مختصر سی جگہ پر اس سے زیادہ کارآمد ہتھیار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اصولاً تو مجھے نکل جانا چاہیے تھا لیکن میں موجو کو لیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کم عقل شخص میرا محسن تھا۔ اس نے اپنی دانست میں میری مدد کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور اس کے لیے اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔

سرنگ میں مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن راہداری میرے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اپنے سیل میں جھانکا اور سیاہ پوش کو زندہ پا کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس کا ہاتھ اپنے سینے کے زخم پر تھا۔ جس سے اب تک خون ابل رہا تھا۔ اس کا ہاتھ، پیٹ اور آس پاس کا فرش سب خون میں تر بتر تھے۔ مجھے حیرت تھی اس کا جس قدر خون بہہ چکا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو مر چکا ہوتا۔ وہ نہ صرف زندہ تھا بلکہ ہوش میں بھی تھا۔ میں فرش پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔

"اب کس لیے آئے ہو؟" اس نے واضح لیکن مدھم آواز میں کہا۔

"میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہیں بھی دیکھتا چلوں۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا "تم اب کچھ لمحوں کے مہمان ہو۔ کیا یہ بتاؤ گے کہ اس جگہ سے نکلنے کا راستہ کہاں ہے؟"

"گودام میں۔ شمالی دیوار پر چار بٹن لگے ہیں۔ سرخ، نیلا، سبز اور پیلا اگر ان کو دائیں طرف سے ایک ترتیب سے دباؤ تو باہر جانے کا راستہ کھل جائے گا۔" اس نے بلا توقف مجھے باہر جانے کا راستہ بتا کر حیران کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آخری دموں پر تھا لیکن بے پناہ قوتِ برداشت نے اسے سنبھال رکھا تھا۔

"لال حویلی یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت دور ہے۔" اس نے تکلیف کے عالم میں گہرے

گہرے سانس لینا شروع کر دیے تھے "تمہارے لیے بہت دور ہے تم بھی وہاں نہیں پہنچ پاؤ گے۔ سنو...... میں نے تمہیں باہر نکلنے کا راستہ بتا دیا ہے۔ پلیز میری تکلیف ختم کر دو۔"

اس کا اشارہ واضح تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ قتل ہو گا۔ میں اپنے دفاع میں دس قتل کر سکتا ہوں لیکن کسی کو بلاوجہ نہیں مار سکتا۔"

"یہ بلا...... وجہ نہ ہو گا۔" اس کی آواز پھٹنے لگی تھی "میں بہت تکلیف میں ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ اگر تم میرے دوست ہوتے تو میں تمہاری خواہش ضرور پوری کرتا لیکن تم میرے دشمن ہو۔"

وہ کچھ دیر مایوسی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ چند لمحوں کا مہمان تھا۔ اس نے پھر کہا "مجھ سے...... ایک سودا کر لو۔"

"کس قسم کا سودا؟"

"میں تمہیں فرار کا ایک ذریعہ بتا سکتا ہوں۔ تم پیدل اس علاقے سے نہیں نکل سکتے۔"

"کیا ذریعہ ہے؟"

"نہیں پہلے...... تم وعدہ کرو کہ مجھے اس تکلیف سے نجات...... دلاؤ...... گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے فوراً کہا۔ میرا اس وعدے پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"ایسے نہیں اپنی مقدس کتاب کی قسم کھا کر کہو۔" اس حالت میں بھی اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔

بادل نخواستہ میں نے اس کی فرمائش پر قسم کھائی اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا "اب مجھے یقین ہے کہ تم وعدہ...... خلا...... فی...... نہیں کرو گے۔ سنو باہر نکلنے والے راستے کے دائیں طرف واقع مٹی کے ٹیلے کے عقب میں ایک جیپ کھڑی ہے تم اس کے ذریعے فرار ہو سکتے ہو۔" اس کی آواز اتنی مدھم ہو گئی تھی کہ میں بمشکل ہی سن سکا تھا "اب...... اپنا...... وعدہ پورا کرو۔"

میں نے پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے زیرِ لب کوئی ورد کرنا شروع کر دیا۔ میں نے دل کڑا کر کے ٹریگر دبا دیا۔ اس کا جسم چند لمحے کے لیے پھڑک کر ساکت ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے موجو اور اس آخری دشمن کا خیال آیا۔ میں سیل میں آ کر اس کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا تھا۔ میں ایل ایم جی سنبھالے باہر نکلا۔ باہر طرف راہداری میں وہ کمرا یا اذیت خانہ تھا جہاں مجھے بے پناہ اذیتوں سے گزارا گیا تھا۔ اس راہداری میں کنٹرول روم بھی تھا۔ جہاں سے اس پورے تہ خانے پر کیمروں اور مائیکروفونز کی مدد سے نظر رکھی جاتی تھی۔ دائیں طرف واش روم، اسٹورز، کچن اور اس قسم کے کاموں کے لیے مخصوص کمرے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں تھا۔ وہ کسی جگہ بھی ہو سکتا تھا اور چھپ کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ اگر میں احمقوں کی طرح منہ اٹھائے چلا جاتا تو بعد میں مرحوم کہلاتا۔ میں نے اسے وارننگ دینا بہتر سمجھا۔

"تم میری بات سن رہے ہو ناں۔ اسپیکر کی اولاد، ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ ورنہ میں دستی بم پھینک کر تمہارا کام تمام کر دوں گا۔ سن رہے ہو ناں؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ بول کر اپنی پوزیشن واضح کر دیتا۔ میں نے دوبارہ وارننگ دی۔

"میں دس تک گنوں گا۔" میں نے کہا اور بلند آواز سے گنتی گننے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک دستی بم کی پن نکال لی۔ گنتی مکمل ہوتے ہی میں نے اسے دائیں طرف راہداری میں اچھال دیا۔ اعصاب شکن دھماکے کے ساتھ ہی راہداری سے گرد و غبار کا بادل نمودار ہوا۔ میں پیچھے ہٹ کر اپنے سیل میں چلا آیا۔ مٹی و گرد میرے ناک منہ میں جا رہی تھی۔ میں آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ گرد و غبار سے فائدہ اٹھا کر وہ مجھ پر حملہ کرنے یا بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ جب گرد بیٹھی تو میں دوبارہ آگے آیا۔

"اس بار تم اس تہ خانے میں دفن ہو جاؤ گے۔" میں نے چلا کر کہا۔

"اور تم بچ جاؤ گے؟" اس نے جواب دیا۔ دستی بم نے اس کے اعصاب بھی منتشر کر دیے تھے۔ گھبراہٹ میں بول کر اس نے بتا دیا کہ وہ بائیں طرف تھا۔ اس نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔

"احمق میں اسی طرف ہوں۔ میرے پاس بھاگنے کا راستہ بھی ہے۔ بہتر ہو گا ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ ورنہ میں دوسرا دستی...... بھیجنے جا رہا ہوں۔ جو اس جگہ کو تمہارا مزار بنا دے گا۔"

"...... جگہ گولا بارود کا ذخیرہ ہے۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا "تم نے دستی بم پھینکا تو پورا تہ خانہ ہی اڑ جائے گا۔" اس کا جھوٹ اس کے لہجے سے ظاہر تھا۔

میں نے گنتی گننا شروع کی تو وہ چلایا "تم پاگل ہو گئے ہو۔" اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں لیکن میری گنتی نو تک پہنچتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے سامنے آ کر ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ یہ گورا چٹا نوجوان تھا جس کے بال فوجی انداز میں بنے تھے۔ اس نے ہلکی سی فرنچ داڑھی رکھی ہوئی تھی۔

خوف سے اس کا حلیہ نہ بگڑا ہوتا تو وہ اچھا خاصا نظر آتا۔ بظاہر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ اس نے اپنے لباس میں کچھ چھپا رکھا ہو۔ میری ہدایت پر وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک چھوٹا سا پسٹل نکل آیا تھا۔ میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔

"یہ کیا ہے حرام زادے؟"

اس کا سر دیوار سے ٹکرایا دوسرے تصادم نے اسے چکرا دیا تھا۔ میں نے مزید ایک ضرب لگا کر اسے انٹا غفیل کر دیا۔ میں نے بائیں طرف کے کمروں کی تلاشی لی۔ کچن میں فریج اور فریج میں کھانے پینے کی بے شمار اشیا دیکھ کر میری جان میں جان آئی تھی۔ میں بے صبری سے ڈبل روٹی، مکھن اور جام پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کھانے کے دوران اچانک مجھے موجو کا خیال آیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ رک گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا۔ اس طرف کے کسی کمرے میں موجو کا سراغ نہیں ملا تو میں راہداری کے دائیں طرف کے کمروں میں آیا۔ دستی بم نے خاصی تباہی مچائی تھی۔ کنٹرول روم کی دیوار گر گئی تھی اور ملبے نے وہاں رکھے آلات جاسوسی کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ میز پر ایک تباہ حال کمپیوٹر رکھا تھا۔ دوسری میز پر ایک ریڈیو تھا لیکن یہ بھی تباہ ہو چکا تھا۔ اب اس کی تباہی سے پہلے کوئی ایس او ایس روانہ کر دیا گیا ہو تو مجھے نہیں معلوم ورنہ اب یہ کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ بائیں طرف کے تینوں کمرے تباہی کا شکار ہوئے تھے۔ باقی دو ان لوگوں کی رہائش کے لیے تھے۔ ایک کمرے میں دیوار کے ساتھ بنا بار گرنے سے ساری زمین شراب سے آلودہ ہو رہی تھی۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ تفتیشی کمرے کا دروازہ باہر سے کھولا۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ موجو سامنے ہی کرسی پر بندھا بیٹھا تھا اور اس کے سر پر لوہے کی ایک بڑی سی ٹوپی چڑھی تھی جس سے کیلیں نکل کر اس کے سر میں پیوست ہو رہی تھیں۔ لہو اس کے پورے چہرے پر یوں بہہ رہا تھا کہ اس کے خدوخال چھپ گئے تھے۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ میں نے اس کے سر سے ٹوپی اتارنے کی کوشش کی تو وہ تڑپ گیا۔ بمشکل میں اس کے سر میں پیوست یہ ٹوپی اتارنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اندر کی کیلوں نے کوئی درجن بھر مقامات سے اس کے سر کو چھید کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر فولادی کنڈوں میں بندھے تھے۔ اس وقت وہ نیم غشی کی حالت میں تھا اور بولنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ کیلیں کوئی ایک تہائی انچ اس کے سر میں اتری تھیں۔ یعنی اس کے دماغ کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اسے جس اذیت سے گزرنا پڑا تھا' یہ وہی جانتا تھا۔ میں نے پانی لا کر اس کے زخم صاف کیے۔ چہرے پر پھیلا خون پونچھا اور اسے طبی امداد کے لیے میڈیکل بکس تلاش کیا۔ یہ مجھے اسٹور روم میں مل گیا۔ اس کے زخموں پر جراثیم کش دوا لگا کر میں نے پٹیاں چپکا دیں اور اسے چار پین کلر کھلا دیں۔ وہ کسی معمول کی طرح میری ہدایتوں پر عمل کر رہا تھا۔ اسے ایک تباہ شدہ کمرے کے بستر پر لٹا کر میں نے نوجوان کو اٹھا کر اس کرسی پر بٹھایا۔ اسے شکنجے میں جکڑا اور اس کے سر پر بھی فولادی ٹوپی باندھ دی۔ اب مجھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا اور کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ایک طریقہ آزمایا۔ سگریٹ سلگا کر جو اسی کے پاس سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کی گردن کو داغنے لگا۔ تیسری بار جب میں نے سگریٹ کا سلگتا سرا اس کی گردن سے لگایا تو وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ تکلیف سے وہ بلبلا رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی پھینکا تو وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ خود کو بندھی ہوئی حالت میں پا کر اور فولادی ٹوپی اپنے سر پر محسوس کر کے وہ لرزنے لگا تھا۔ میں اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے خاموشی سے ٹوپی کے عقب میں لگے اسکرو کو کسنے لگا جو کیلوں کو آگے دھکیلتا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے چلا کر کہا۔

"تمہارے دماغ میں سوراخ کر کے دیکھ رہا ہوں کہ اس میں کیا بھرا ہے۔" میں نے کسنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ کیلیں اب اس کے سر تک پہنچ گئی تھیں۔ ابھی وہ سر میں نہیں گھسی تھیں لیکن اس نے یوں واویلا مچایا جیسے میں اسے ذبح کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے مجھ پر اس کے واویلا کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا تعلق درندوں کے جس گروپ سے تھا ان پر رحم کرنے کا مطلب انسانوں پر ظلم کرنا تھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" اس بار اس نے بھوں بھوں روتے ہوئے پوچھا۔

"اب کی ناں تم نے کام کی بات!" میں نے ہاتھ روک لیا۔ "اگر مجھے کچھ سوالوں کے جواب مل جائیں تو میں اپنا فیصلہ ملتوی کر دوں گا۔ تمہارے سر میں درجن بھر سوراخ کرنے کا۔"

"پوچھو۔" اس نے یوں جلدی سے کہا جیسے میں ابھی اسکرو پھر کسنا شروع کر دوں گا۔

"یہ جگہ کہاں پر ہے؟"

"قصور کے جنوب مشرق میں کوئی چالیس میل کے فاصلے پر سرحد سے نزدیک۔"

"اتنے حساس مقام پر تم لوگوں نے اتنا بڑا اڈا آسانی

سے بنا لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کسی مقامی بااثر شخص کا تعاون حاصل ہے کون ہے وہ غدار؟"

"چوہدری رحیم خان۔" اس نے فوراً جواب دیا "یہ رب نواز کا رشتے دار ہے۔"

"گویا پورا خاندان ہی وطن فروشی کے کاروبار سے منسلک ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں آنے والا اسلحہ آگے کہاں پہنچایا جاتا ہے۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم...... یہ سب باتیں سنیل کو معلوم ہوتی ہیں۔"

"کون سنیل؟"

"وہی جو تم سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ سیاہ وردی والا۔"

"اچھا وہ...... وہ تو اب دنیا سے رخصت ہو گیا۔" میں نے اسے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

"اور کون لوگ ہیں جو اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے لاعلمی ظاہر کی لیکن جب میں نے اسکرو مزید کسا تو اس کی یادداشت ذرا بہتر ہوئی اور اس نے مجھے چند اور لوگوں کے نام بتائے۔ ان میں وہ دو خبیث بھی شامل تھے جو مجھے یہاں تک جعلی ایمبولینس میں لائے تھے۔ اس نے ایمبولینس کا نمبر بھی بتایا تھا۔ نمبر اصلی تھا۔ دراصل انہوں نے کباڑے سے یہ ایمبولینس خرید کر اسے ٹھیک کروا لیا تھا۔ ورنہ ان کے لیے ایمبولینس کا حصول اتنا آسان نہیں تھا۔ اس سے حاصل شدہ معلومات میں ایک چھوٹی سی ڈائری میں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ یہ ڈائری بھی اس کے پاس سے نکلی تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے تو میں نے باہر نکلنے والے راستے کے بارے میں پوچھا۔

"شمال کی دیوار پر سرخ، نیلے، سبز اور پیلے رنگ کے بٹن لگے ہیں۔ انہیں بائیں طرف سے ایک ترتیب سے دباؤ تو باہر جانے کا راستہ کھل جائے گا۔"

میں چونکا کیونکہ سنیل نے مجھے دائیں طرف سے بٹن دبانے کے لیے کہا تھا "اگر بٹن کسی اور ترتیب سے دبائے جائیں تو؟" میں نے اسے بغور دیکھا۔

"تو...... تو دھماکا ہو جائے گا۔ یہ پورا تہ خانہ تباہ ہو جائے گا۔ اس کی بنیادوں میں بارود بھرا ہوا ہے۔ جو غلط بٹن دبانے سے ایکٹی ویٹ ہو جائے گا۔ ہمارے لیے راز کی بہت اہمیت ہے۔"

"یعنی تم مجھے فرفر سب بتا رہے ہو۔" میں نے طنز کیا۔ اس کے بعد میں نے اسکرو مزید کسے تا کہ اس نے کوئی بات غلط بتائی ہو تو قبول دے۔ وہ تڑپا اور چلاتا رہا مگر کوئی بات غلط بتانے کا اقرار نہیں کیا تھا لہٰذا میں اسے چھوڑ کر تباہ ہونے والے کمروں کی تلاشی لینے لگا مگر کوئی خاص شے برآمد نہیں ہوئی۔ صرف وہی چھوٹی ڈائری تھی۔ جس میں میں نے حاصل شدہ معلومات لکھی تھیں۔ اس میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں نوجوان سے پوچھنا بھول گیا تھا کہ اس نے یہاں ہونے والے واقعات کی کسی اور کو اطلاع دی تھی۔ ریڈیو کی موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ ان لوگوں کا کسی نہ کسی سے رابطہ رہتا تھا۔ نوجوان چلاتے چلاتے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے جا کر موجو کو اٹھایا۔

"کیا تم چل سکتے ہو؟"

پین کلر نے اس کی تکلیف کم کر دی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔

"ہاں...... چل سکتا...... ہوں۔"

اس کی قوت برداشت زیادہ تھی۔ میں اسے سہارا دے کر باہر تک لایا۔ دیوار میں لگے بٹنوں کو بائیں طرف سے دبایا۔ چند لمحے تو کچھ نہیں ہوا پھر دیوار ہلکی سی آواز کے ساتھ دائیں طرف سرکتی چلی گئی اور اتنا بڑا راستہ بن گیا جس میں درمیانے سائز کی وین بھی بہ آسانی آ سکتی تھی۔ سامنے نیم پختہ ڈھلان راستہ تھا۔ جس کے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ آنے والی گاڑیاں اس سے گزر کر آتی تھیں۔ جھاڑیوں نے اوپر سے مل کر اس راستے کو سرنگ کی شکل دے دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس جگہ کو فضا سے دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں موجو کو سہارا دے کر باہر تک لایا۔ سرنگ کوئی سو فٹ طویل تھی اور جس جگہ جا کر نکلی اس طرف بھی جھاڑیاں تھیں ان کے بیچ سے کئی راستے نکل رہے تھے۔ اگر ٹائروں کے نشانات نہ ہوتے تو یہ بات کہنا دشوار... تھی کہ آنے جانے کے لیے کون سا راستہ استعمال ہوتا ہے۔ میں نے موجو کو اسی طرف بٹھایا اور سنیل کی بتائی ہوئی جگہ گیا۔ ٹیلا زیادہ بلند نہیں تھا۔ اس کے عقب میں چھوٹی اور اوپر سے کھلی جیپ کھڑی تھی۔ میں نے سیٹیں اٹھیں۔ ایک کے نیچے سے چابی کے ساتھ ایک سیون ایم ایم رائفل اور اس کے راؤنڈز موجود تھے۔ میں موجو کے پاس واپس آیا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

اندر آ کر میں نے سنیل کی تلاشی لی۔ وہ باہر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کے پاس کرنسی موجود ہونی چاہیے تھی۔ اس کی ایک جیب سے پرس برآمد ہوا جس میں نہ صرف خاصی رقم تھی بلکہ ایک شناختی کارڈ بھی تھا۔ اس پر تصویر تو سنیل کی ہی تھی لیکن نام لال محمد ولد محمد بخش تھا۔ گویا اس نے آزادانہ نقل و حرکت کے لیے جعلی شناختی کارڈ بھی تیار کروا رکھا تھا۔ میں نے بٹوا اپنے

پاس رکھ لیا۔ اس کی کلائی پر گھڑی موجود تھی۔ وقت دیکھنے کے لیے میں نے اسے بھی اتار لیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ نومبر کی دوسری تاریخ دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا تھا۔ گویا مجھے اس جگہ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مجھے چندا کے خیال نے مضطرب کر دیا۔ نہ جانے لال حویلی میں اس پر کیا گزری ہوگی۔ رب نواز مجھے قابو میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا ہوگا۔ میں تورا کی تحویل میں تھا اس لیے میرے معاملے میں وہ بے بس تھا لیکن چندا تو اس کے بس میں تھی۔ اس کے ساتھ وہ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ یہ احساس اتنا بھیانک تھا کہ چند لمحے کے لیے میرے ہاتھ پیروں سے جیسے جان نکل گئی تھی پھر رفتہ رفتہ آتش فشاں میرے اندر سر اٹھانے لگا۔ اگر چندا کا بال بھی بیکا ہوا ہوگا تو رب نواز کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

میں نے گودام والے حصے میں آ کر پیٹیاں دیکھیں۔ میرے پاس اتنی ساری پیٹیاں کھولنے کا وقت نہیں تھا۔ میں واپس اندر گیا۔ سوئچ روم میں جنریٹر تھا اس کے لیے ایندھن کے طور پر وہاں ڈیزل کے جیری کین رکھے تھے۔ میں نے دس دس لیٹر والے دو جیری کین اٹھائے اور گودام میں لا کر ڈیزل پیٹیوں پر چھڑکنے لگا۔ ہر جگہ تھوڑا تھوڑا چھڑک کر میں نے باقی فرش پر بہا دیا۔ اس کے بعد گودام کے دروازے پر جا کر ایک دستی بم نکالا۔ اس کی پن نکال کر اسے اندر پھینکا اور پوری قوت سے باہر کی طرف بھاگا۔ ابھی بم پھٹنے میں دس سیکنڈ باقی تھے۔ جب دھماکا ہوا تو میں سرنگ کے سرے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے باوجود دھماکے نے میرے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ میں دوبارہ اٹھ کر موجو کی طرف دوڑا جو دھماکے بلکہ دھماکوں سے ہراساں سا کھڑا تھا۔

"پٹاخے...... بڑے والے پٹاخے!" اس نے چلا کر کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور ٹیلے کی طرف بھاگا۔ ٹیلے پر چڑھا تو ایک شدید دھماکے نے گودام کی چھت اڑا دی۔ میں نے فضا میں آتش و آہن کے ساتھ ریت مٹی کے بادل کو بلند ہوتے دیکھا۔ ہم خطرے کی حد میں تھے۔ میں نے موجو کو عقبی حصے میں پھینک کر جیپ اسٹارٹ کی اور اسے ٹیلے سے نکالنے لگا۔ اسی لمحے چاروں طرف جلتے ٹکڑوں اور ہتھیاروں کے دھاتی حصوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ میں جیپ کو دیوانہ وار اس جگہ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے سامنے جو پہلا راستہ آیا۔ میں نے جیپ اسی پر گھما دی تھی۔ میرے عقب میں لگاتار دھماکے جاری تھے اور آتش و آہن کی بارش ہو رہی تھی۔ میں دیوانہ وار جیپ کو اس جگہ سے دور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاً ایک چیز شوں کی آواز کے ساتھ اوپر سے گزری اور عین راستے پر جا کر زوردار دھماکے سے پھٹی۔ میں نے بروقت جیپ ایک طرف گھمائی تھی ورنہ جیپ دھماکے سے پیدا ہونے والے شعلوں میں جا گھستی۔ جیپ جھاڑیوں میں گھس گئی۔ بمشکل میں اسے واپس راستے پر لایا۔ عقب میں موجو خوف زدہ انداز میں چیخ رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسلحے کے ذخیرے میں راکٹ یا میزائل بھی تھے جو اب اڑ اڑ کر دور دور تک گر رہے تھے۔ دھماکوں سے اب بھی زمین لرز رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ دھماکے تین چار میل کے دائرے میں صاف سنے جا رہے ہوں گے۔ اگر نوجوان کا بیان درست تھا اور یہ سرحدی علاقہ تھا تو پاک فوج کے ذمے داروں کو اس جگہ پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور ابھی میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک ان میں میجر شاہد موجود تھا، میرا فوج سے رابطہ کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

"تم راستے پہچانتے ہو۔" کوئی دو میل دور نکل کر میں نے ایک جگہ جیپ روک کر موجو سے پوچھا۔ میرے خیال میں وہ جگہ کسی قدر محفوظ تھی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں سر ہلایا۔

"نہیں...... یہاں سے چلو...... ورنہ بڑا والا پٹاخا لگ جائے گا۔"

اسے بھی بے خبری میں اسی جگہ لایا گیا تھا۔ میں نے سورج کی پوزیشن سے راستے کا تعین کیا اور اندازے سے شمال مغرب کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں میرے خیال میں قصور کا شہر ہونا چاہیے تھا۔ ایک بار میں قصور پہنچ جاتا تو لاہور کی طرف سفر آسان ہو جاتا۔ اب بھی ہلکے ہلکے دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ اس سرزمین سے دشمنوں کا ایک اڈا فنا ہو گیا تھا۔ وہ اسلحہ تباہ ہو گیا تھا۔ جو نہ جانے کتنے بے گناہوں کی موت کا سبب بنتا اور کتنی ہی دہشت ناک وارداتوں میں استعمال ہوتا مگر کسی کو اس بارے میں پتا نہیں چلے گا۔ بس اتنا معلوم ہوگا کہ اس جگہ گولا بارود کا ذخیرہ تھا جو کسی وجہ سے اڑ گیا۔ تہ خانے کی ہر چیز فنا ہو چکی ہوگی۔ مع لاشوں کے۔

سڑک دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی تھی جتنی کہ کولمبس کو امریکا کی طرف سفر کے دوران خشکی دیکھ کر ہوئی ہوگی۔ اس کا رخ بھی شمال مغرب کی طرف تھا۔ میں نے جیپ سڑک پر ڈال کر ایکسی لریٹر کو ممکنہ حد تک دبا دیا تھا۔ موجو کے زخم اور کپڑوں پر لگا خون ہمیں مشکوک بنا سکتا تھا۔ کچھ دور جا کر سڑک کے دونوں طرف ہی کھیت شروع ہو گئے۔ اکا دکا لوگ بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ سورج سر پر آنے کے بعد کسی قدر گرمی کا

احساس ہونے لگا۔ اس ہنگامے، قتل و غارت گری نے اندر آگ سی بھڑکا دی تھی۔ مجھے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ بالآخر راستے میں ایک جگہ ٹیوب ویل نظر آیا جو خوش قسمتی سے چل بھی رہا تھا۔ جگہ سڑک سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ میں اتر کر اس طرف گیا تو ٹیوب ویل کے ساتھ ہی مختصر سے کمرے سے ایک بوڑھا نکل آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے آگے ہاتھوں کا چھجا بنایا۔

"کی اے پتر۔"

"چاچا پانی پینا ہے۔" میں نے کہا "بڑی پیاس لگی ہے۔"

"پیو۔ پیو۔ پانی تے خدا دی نعمت اے۔" اس نے سر ہلایا۔ میں نے اجازت ملتے ہی دھار سے گرتے شفاف اور کسی قدر سرد پانی میں اوک بنا دی۔ واقعی پانی خدا کی نعمت ہے اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب شدت کی پیاس ہو اور آدمی ایک گھونٹ پانی کے بدلے اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ تھر کے صحرا میں قلت کے دنوں میں پانی کا ایک کنستر سو دو سو روپے کا بکتا ہے۔ وہی پانی جو فی منٹ کئی کنستروں کے حساب سے اس وقت اس ٹیوب ویل سے بہہ کر زمین کو سیراب کرنے جا رہا تھا۔ میں نے اشارے سے موجو کو بلایا اور اسے پانی سے اپنے کپڑوں پر لگے خون کے داغ صاف کرنے کو کہا۔

چاچا کی نظر کمزور تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ اس نے اس کے کپڑوں پر لگے خون کے داغ دیکھ لیے تھے "اے منڈے نوں کی ہویا؟" اس نے تفتیش کی۔

"چاچا۔ ذرا جھلا ہے۔ جیپ کے سامنے آ گیا تھا۔ میں نے مرہم پٹی کر دی ہے۔ اب اسے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

"کتھوں؟" اس نے سوالات کا سلسلہ دراز کیا۔

"قصور چاچا۔"

"اچھا۔ اچھا۔" اس نے سر ہلایا۔

کسی قدر تذبذب کے ساتھ میں نے پوچھ لیا "چاچا۔ یہ سڑک قصور کی طرف جاتی ہے ناں؟"

اس نے سر ہلایا اور منہ سے کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کا رویہ یک دم ہی روکھا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی مسئلہ ہوتا۔ میں نے وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ موجو کو جیپ کے عقبی حصے میں بٹھا کر میں آگے روانہ ہو گیا۔ میرے جسم پر ڈھیلا سا لباس تھا۔ سادہ قمیص اور پاجامہ نما پتلون۔ یہ حلیہ سفر کے قابل نہیں تھا۔ اسلحے میں میں ایک پستول لایا تھا۔ جو کمانڈو نمبر دو کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ کمانڈو نمبر ون کی انگلی ٹوٹنا اس کے لیے نیک شگون ثابت ہوا تھا۔ اس کی جان بچ گئی تھی۔ دوسرا ہتھیار وہی سیون ایم ایم رائفل تھی جو پچھلی نشست کے نیچے رکھی تھی۔ پستول میں نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ اس ویران سڑک پر سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے جب کہیں جا کر پہلا سنگ میل نظر آیا۔ جس پر لکھا تھا "قصور چار میل۔"

دس منٹ میں جیپ قصور کے مرکزی علاقے سے گزر رہی تھی۔ بالآخر ایک جگہ مجھے مطلوبہ دکان نظر آ گئی۔ یہ ریڈی میڈ سوٹس کی دکان تھی۔ میں نے سنیل کے بٹوے میں موجود رقم سے اپنے اور موجو کے لیے دو عدد دیہاتی طرز کے شلوار سوٹ لیے۔ اپنے لیے شان دار سا طرہ اور موجو کے لیے معمولی سی پگڑی لی۔ لاہور تک سفر کرنے کے لیے گیٹ اپ بدلنا ضروری تھا۔ اب تک "میجر شاہد" اور رب نواز کو راکے اڈے کی تباہی کی خبر مل چکی ہوگی اور اب وہ میری تلاش میں ہوں گے۔ میں ان سے توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے مردہ تصور کر کے آرام سے بیٹھ جائیں گے۔ میں رب نواز کے لیے اتنا بڑا خطرہ نہیں تھا جتنا کہ اب میجر شاہد کے لیے ہو گیا۔ بھارت ماتا کا یہ سپوت اپنی اہم ترین پوزیشن بچانے کے لیے میری تلاش میں زمین آسمان ایک کر سکتا تھا۔

ایک ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھا کر ہم فوری طور پر آگے روانہ ہو گئے۔ شک سے بچانے کے لیے میں نے موجو کو پہلے ہی پگڑی پہنا دی۔ ایک میڈیکل اسٹور سے اس کے لیے پین کلر بھی لی تھی۔ ممکن ہے اسے راستے میں درد شروع ہو جاتا۔ شہر سے باہر ایک ذرا ویران سے علاقے میں ہم نے کپڑے بدلے۔ اس سے میری شخصیت بدل گئی تھی۔ اور سر پر طرہ باندھ کر تو میں اچھا بھلا چوہدری ٹائپ کی کوئی چیز لگنے لگا تھا۔ موجو کو میں نے پیچھے سیون ایم ایم رائفل دے کر کسی محافظ کی طرح بٹھا دیا۔ رائفل لے کر وہ بے حد خوش تھا۔ اس نے کئی بار ٹریگر بھی دبایا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ میں نے اسے لوڈ رائفل نہیں دی تھی۔

اس کے ساتھ میں نے پہلے ملک مہربان کی حویلی کا رخ کیا۔ یہ اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ وہ مجھے اس حلیے میں دیکھ کر حیران ہوا تھا اور میزبانی پر آمادہ تھا لیکن میں نے رکنے سے انکار کر دیا۔ میں اس سے سوٹ کیس اور بیوی کی طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے وہاں سے چل دیا۔ میرے روکھے رویے نے اس اچھے شخص کو رنجیدہ کر دیا تھا۔ اس کا مجھے افسوس تھا لیکن میں رک نہیں سکتا تھا اور اس کے سامنے صورت حال کی وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس سے رخصت ہو کر میں نے جیپ کا رخ لاہور کی طرف کر کے ایکسی لریٹر دبا دیا میں جلد از جلد وہاں تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ رب نواز کے خلاف یہ آخری

ثبوت بھی میرے ہاتھ سے نکل جاتے تو میرے پاس پھر کچھ بھی نہ بچتا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر سڑک پر کسی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں اپنا اسلحہ استعمال کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاؤں گا مگر خیریت گزری۔ کسی نے راہ نہیں روکی۔ شام سات بجے میں نے راوی کا پل عبور کرلیا تھا۔ اب میں خود کو کسی قدر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ہزار خطرات کے باوجود میں لاہور میں خود کو امان میں محسوس کرتا تھا۔

جیپ میں نے جان بوجھ کر تھانے کے سامنے چھوڑی اور وہاں سے ٹیکسی لے کر کمال کے اسپتال پہنچا۔ نیلم ہاؤس جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رب نواز کے کرگے اس کی نگرانی کررہے ہوں گے اور میں وہاں جاتے ہی پکڑا جاتا۔ اسپتال میں سامنے والے حصے کے بجائے میں عقبی حصے سے اندر گیا تھا۔ موجو میرے ساتھ تھا۔ کمال اپنے دفتر میں ہی تھا۔ پہلے تو وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکا۔ جب میں نے طرہ اتارا تو اس نے خفگی سے کہا۔

"سؤر کے بچے تو زندہ ہے پھر آ گیا زندگی حرام کرنے۔"

"کوئی آیا میرے پیچھے۔" میں کرسی پر گر گیا "منحوس آدمی۔ نہ سلام نہ دعا۔ نہ حال چال پوچھا آتے ہی بکواس شروع کردی۔"

"کوئی نہیں آیا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "ہاں چندا کا ایک پیغام اور آیا تھا خیریت کا۔ چار دن پہلے۔"

"اچھا۔ کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا "ٹھیک تو تھی ناں؟"

"آواز سے تو ٹھیک ہی لگ رہی تھی۔ اس نے مختصر الفاظ میں صرف اتنا کہا، ناصر کو بتا دینا میں ٹھیک ہوں۔ وہ فکر نہ کرے۔"

"یار میں اس کی طرف سے پریشان ہوں۔ رب نواز کو میری اصلیت پتا چل گئی ہے۔ ابھی بھی میں اس کی قید سے فرار ہوکر آرہا ہوں۔"

"تیری کہانیاں اب اس قابل ہوگئی ہیں کہ ان پر بالی ووڈ میں فلمیں بنیں۔ ابھی میں مصروف ہوں۔ تو گھر جا اور قمر سے کھانا بنانے کو کہہ دے میں آتا ہوں۔"

"ایک آدمی باہر بھی بیٹھا ہے۔ اسے طبی امداد چاہیے اور آرام کی ضرورت بھی ہے۔ وہ ذہنی طور پر پس ماندہ ہے۔ ذرا خیال رکھنا باہر نہ نکل جائے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

قمر پہلے ہی کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ چکن بریانی کی خوشبو نے میرے معدے میں اُچھل مچادی تھی۔ قمر میرے گلے لگ گئی تھی "بھائی کہاں تھے۔ میں اتنی فکرمند تھی۔ رات برے برے خواب بھی آرہے تھے۔"

"تیرے بھیا کے ساتھ جب تک تیری دعائیں ہیں کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔" میں نے فلمی جذباتی ڈائیلاگ بولا اور پھر ایک چیخ سن کر اچھل پڑا۔ یہ قمر کا لختِ جگر تھا جو اپنی ماں کو ایک اجنبی کے گلے لگا دیکھ کر رو رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو اس نے ایک اور دہشت ناک چیخ ماری۔ میں نے گھبرا کر اسے قمر کو تھما دیا۔

"یہ انسان کا بچہ ہے یا ریل کا انجن۔"

قمر ہنسی "ڈر گیا ہے۔ تم بھی تو اتنے وقفے سے آتے ہو کہ اب تک یہ تمہیں پہچان ہی نہیں سکا ہے۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا اور چپل اتار دی۔ میرا دل نہانے کو چاہ رہا تھا۔ قمر سے کہا تو اس نے فافٹ انتظام کردیا گیزر سے آنے والے گرم پانی نے میری تھکن اور جسم کا درد جیسے نچوڑ دیا تھا۔ نہا دھو کر میں نے کمال کا ایک نائٹ سوٹ پہنا۔ اس کا سائز تقریباً میرے برابر تھا لیکن جسم کسی قدر فربہ ہوگیا تھا۔ اس وقت تک کمال بھی آ گیا تھا اور چکن بریانی بھی تیار ہوگئی تھی۔ ہم دونوں ہی ٹوٹ پڑے۔ بے چاری قمر آرام سے کھانے کی تلقین کرتی رہ گئی تھی۔ میں نے اتنا کھالیا تھا کہ اٹھنا بھی محال ہوگیا تھا۔ بمشکل کمال کے لیونگ روم تک آئے۔ قمر کافی لے آئی۔

"یار یہ معاملہ تو بہت اونچے لیول کا ہے۔"

"ہاں...... لیکن میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ جب تک چندا رب نواز کی قید میں ہے۔" میں نے کہا "یار! مجھے اس سے بات کرنی ہے۔"

کمال نے نفی میں سر ہلایا "یہاں سے ممکن نہیں۔ رب نواز نے اپنے فون پر آئیڈینٹیفکیشن لگا رکھی ہوگی۔"

"میں بھی سمجھتا ہوں۔ چلو باہر کہیں سے کر کے آتے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں اور کمال پیدل اس کے اسپتال سے ذرا فاصلے پر ایک پی سی او تک آئے۔ رات کے گیارہ بجے تک اس جگہ تقریباً تمام ہی دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ پی سی او بھی خالی ہی تھا۔ میں نے وہاں موجود شخص کو رب نواز کا نمبر ملانے کو کہا۔ اس نے مجھے کیبن میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے نمبر ملانا شروع کیا۔ بیل جانے پر اس نے مجھے کیبن میں موجود فون اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف کوئی پوچھ رہا تھا۔

"کس سے بات کرنی ہے؟"

"رب نواز سے۔" میں نے کہا "اسے کہو شاہ عالم بات کررہا ہے۔"

رب نواز ایک منٹ بعد لائن پر تھا "شاہ عالم تم کہاں ہو؟"

"اسی شہر لاہور میں۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے خلاف ثبوت حاصل کرنے سے دلچسپی ہے؟"

اس نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا "اسی وجہ سے چندا اب تک محفوظ ہے۔"

"رب نواز کیا تمہارے دوستوں کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟" میں نے طنز کیا۔

"میرے مفادات ان سے الگ ہیں۔ مجھے صرف اپنی فکر ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "کیا تمہیں فکر نہیں ہے کہ میں تمہارے مکروہ منصوبے کا راز فاش کردوں گا۔"

"وہ معاملہ اب ختم سمجھو۔ پروفیسر کے بغیر یہ پورا پروجیکٹ ہی بیکار ہے۔ میں نے لال حویلی سے سب کچھ ہٹا دیا ہے اب کسی کو وہاں کچھ نہیں ملے گا۔"

"میں چاہتا ہوں تم چندا کو رہا کردو۔ میں تمہارے خلاف سارے ثبوت تمہارے حوالے کردوں گا۔"

وہ ہنسا "مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ دونوں کا تبادلہ ایک ساتھ ہوگا۔"

"اب تم مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہو۔ کیا میں خود آؤں گا اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ثبوت حاصل کرنے کے بعد مجھے اور چندا کو جانے دوگے۔"

"پھر تم کہو کہ اس کا کیا حل نکالا جائے۔" خلافِ توقع رب نواز کا لہجہ بدلا ہوا تھا اس کے لہجے کا کروفر، طنطنہ اور غرور غائب تھا۔

"ابھی میں نے کچھ سوچا نہیں ہے لیکن میں جلد کوئی طریقہ کار سوچ لوں گا۔ جس سے ہم دونوں ہی مطمئن ہوسکیں۔ ابھی میں صرف اتنا کہوں گا کہ چندا کو کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔"

"شاہ عالم میں نے کسی لڑکی کے لیے تمہیں اتنا مجبور ہوتے نہیں دیکھا۔ تم نے شبنم کو بھی دل بھر کر استعمال کیا مگر اس کی پروا نہیں کی۔ اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"رب نواز یہ لڑکی میری سیکریٹری رہی ہے۔ اسی وجہ سے مجھے اس کی پروا ہے۔ رہے تمہارے خلاف ثبوت تو وہ میں پہلے ہی تمہیں دینے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ تبھی میں نے اس نام نہاد میجر کو وہ ثبوت نہیں دیے تھے۔ شاید میری نیت کی یہی نیکی میرے کام آ گئی۔ ورنہ یہ ثبوت را والوں کے ہاتھ لگ جاتے اور تم بھی بچ گئے۔ تم را والوں کو جانتے ہو ناں۔ وہ یہ ثبوت تمہیں اپنے اشاروں پر نچانے کے لیے استعمال کرتے۔"

"میں ان کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں...... لیکن فون پر یہ باتیں مناسب نہیں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ فریال اور میرا پوتا کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہیں۔ سکون سے ہیں۔ انہیں وہیں رہنے دو۔"

"میں فریال کی بات نہیں کرتا۔ میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔" اس کے انداز میں طیش تھا "مجھے اپنا پوتا حق نواز واپس چاہیے۔"

"بچہ ماں کے پاس ہی اچھا رہتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس آ کر وہ کوئی اچھا انسان بنے گا پھر فریال اپنا بچہ دینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگی۔ ہر عورت شائستہ کی طرح سنگ دل نہیں ہوتی کہ اپنی اولاد کو چھوڑ جائے۔"

"سنو اگر تمہارا شائستہ سے رابطہ ہے تو اس سے کہو ایک بار مجھ سے بات کرے۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی گمشدگی سے خاندان میں میرے لیے کتنے مسائل کھڑے ہوگئے ہیں۔"

"ہاں۔" میرے لہجے میں تلخی آ گئی "تم بھائیوں کی عیاشی کا ایک سامان تھا جواب نہیں رہا۔"

"میرے گھریلو معاملات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میں نے فون بند کردیا۔ کمال باہر انتظار کررہا تھا "اتنی دیر لگادی۔ رب نواز کے بارے میں نہیں جانتا اس کے کتے یہاں تک نہ چلے آئیں۔"

"ابھی پتا چل جائے گا۔" میں اسے پاس ہی واقع کیفے تک لے گیا۔ جہاں سے ہم پی سی او پر نظر رکھ سکتے تھے۔

وقت گزاری کے لیے ہم نے کافی منگوائی۔ جو اتنی بد ذائقہ تھی کہ میں ایک کے بعد دوسرا گھونٹ نہیں لے سکا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد پی سی او کے سامنے ایک کار رکی اور اس میں سے دو افراد اتر کر دندناتے ہوئے پی سی او میں گھس گئے۔ ان کے انداز ہی ان کے اشتہار کا کام دے رہے تھے۔ ایک منٹ بعد وہ تیزی سے باہر نکلے اور سڑک پر آگے چلے گئے۔ اصولاً تو انہیں واپس جانا چاہیے تھا۔ یک دم میرے اندر ایک خدشے نے سر اٹھایا۔

"یار کمال ہم سے حماقت ہوئی ہے۔ تجھے مجھ سے دور رہنا چاہیے تھا۔ پی سی او والے بندے نے رب نواز کے آدمیوں کو تیرے بارے میں بتا دیا ہے۔ کیا یہ تجھے جانتا ہے۔"

"ممکن ہے۔" کمال بھی پریشان ہوگیا تھا "ہوسکتا ہے یہ رب نواز کے آدمی نہ ہوں۔"

"تو یہیں ٹھہر۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے کمال سے کہا اور پی سی او تک آیا۔ اندر موجود شخص مجھے دیکھ کر خوف زدہ

ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے بلا تمہید پوچھا۔
"یہ جو ابھی دو آدمی آئے تھے انہیں تم نے کیا بتایا ہے؟"
"کون سے دو آدمی؟" وہ مکر گیا۔
میں نے پستول نکال لیا "وہ جو ابھی ہلکے رنگ کی کار میں آئے تھے۔"
پستول دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "ہاں۔ ہاں۔ آئے۔ تت۔ تو..... مگر فون کرتے۔"
"تم اس طرح نہیں مانو گے۔" میں نے اسے گردن سے پکڑ کر آگے کھینچا اور پستول اس کے سر سے لگا دیا "میں جو پوچھوں اس کا درست جواب دو۔ ورنہ بھیجا اڑا کر واپس چلا جاؤں گا۔"
"وہ..... وہ..... تمہارا پوچھ رہے تھے۔" اس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔
"اور تم نے انہیں ڈاکٹر کمال کا بتا دیا۔" میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔
"نہیں۔" اس نے کہنا چاہا لیکن پستول کے دباؤ نے اسے حقیقت اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو ڈاکٹر کمال کا بتا دیا تھا کہ وہ فون کرنے والے کے ساتھ آیا تھا اور یہ بھی کہ اس کا کمال اسپتال ہے جو پاس ہی ہے۔ اس پر غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جیسے اب مجبور تھا اسی طرح پہلے بھی مجبور ہی تھا۔
میں واپس کمال کے پاس آیا۔ وہ اب کسی قدر پُرسکون تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی "اتنی فکر نہ کر یار۔ وہ اسپتال کے اندر بھی نہیں گھس سکیں گے۔ گارڈز انہیں باہر سے ہی بھگا دیں گے۔"
"میرے خیال میں تو اکیلا جا۔ وہ اسپتال کے آس پاس ہی ہوں گے۔ تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا ہے کہ تو بھی فون کرنے گیا تھا۔ اسپتال کا فون گڑبڑ کر رہا تھا۔"
"اور وہ نہ مانیں تو؟"
"نہ مانیں لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ رب نواز اگر تیرے بارے میں مشکوک ہو گیا کہ تیرا مجھ سے کوئی تعلق ہے تو وہ تجھے دوسرے طریقوں سے بھی پریشان کر سکتا ہے۔"
ہم دونوں کیفے سے ساتھ نکلے لیکن کمال اسپتال کے اگلے حصے کی طرف گیا اور میں نے ایک بار پھر عقبی حصے کا رخ کیا۔ میں سیدھا قمر کے گھر گیا۔ اس نے پریشان ہو کر کمال کا پوچھا
"کمال کہاں ہیں؟"
"باہر ہے۔ کوئی مل گیا تھا۔ ابھی آتا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی لیکن اندر سے میں خود پریشان تھا۔ اگر رب نواز کے گرگے راستے میں کہیں گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تو معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ وہ کمال کو خاموشی سے اٹھا کر لے جاتے اور اس کے اسپتال کے گارڈز کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ پندرہ منٹ بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اور میں کمال کو دیکھنے جا رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں نے سکون کی طویل سانس لی تھی۔
"الو کے پٹھے۔ میری جان سولی پر لٹکی تھی کیا تو امن مذاکرات کرنے بیٹھ گیا تھا۔" میں نے سرگوشی میں اسے ڈانٹا۔ کمال مجھے لیونگ روم میں لے آیا۔
"وہ تو سر ہو گئے تھے۔" اس نے بتایا "اصرار کر رہے تھے کہ میں شاہ عالم کو جانتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ مجھ سے پہلے ایک آدمی پی سی او پہنچا تھا اور اس نے پہلے فون کرنے کی درخواست کی تھی جو میں نے مان لی۔ اس سے زیادہ نہ میری بات ہوئی اور نہ ہی میں اسے جانتا ہوں۔"
"انہوں نے تیری بات کا یقین کر لیا؟" میں نے پوچھا۔
"مشکل ہے وہ چھٹے ہوئے لوگ اتنی آسانی سے کسی بات کا یقین کہاں کرتے ہیں۔ میرے اسپتال کے گارڈز کی وجہ سے مجبور تھے ورنہ مجھے ہی اٹھا کر لے جاتے۔"
"یہ رب نواز کتے کی دم ہے کبھی سیدھا نہیں ہوگا۔"
"سدھرے گا تو بھیا تو بھی نہیں..... لیکن اس وقت بریانی کا خمار مجھ پر طاری ہو رہا ہے میں تو سونے چلا تو بھی گیسٹ روم چلا جا۔"
"میں یہیں سو جاتا ہوں۔ تو قمر کے ہاتھ تکیہ اور کوئی چادر بجھوا دے۔" میں وہیں قالین پر دراز ہو گیا۔
تھکن اتنی زیادہ اور نیند اتنی حاوی تھی کہ میں قمر کے آنے سے پہلے ہی سو گیا تھا۔ اس نے کب آ کر میرے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور کب مجھے چادر اڑھائی مجھے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اسی زمین دوز را کے اڈے میں ہوں۔ میں نے وہاں رب نواز کو اسلحے کے ڈھیر پر بٹھا رکھا ہے اور بارود کو آگ دکھانے جا رہا ہوں۔ میں ہنستے ہوئے رب نواز سے کہہ رہا تھا "دیکھنا ابھی یہ سب بم اور راکٹ آتش بازی کی طرح چھوٹیں گے۔ تم بھی ان کے ساتھ آسمان پر جا کر پھٹو گے اور تمہارے ٹکڑے بھی کچھ سرحد کے ادھر گریں گے اور کچھ سرحد کے دوسری طرف..... دونوں طرف کے مردار خور جانوروں کا بھلا ہوگا۔ تمہارے سور جیسے جسم میں خاصا گوشت ہے۔" پھر میں نے رب نواز کے رونے گڑگڑانے کی پروا کیے بغیر ماچس کی تیلی جلا کر بارود کے ڈھیر پر پھینک دی۔ دھماکا اتنا

شدید تھا کہ میں خود اچھل کر بیٹھ گیا۔ کمرا جیسے ڈول گیا تھا پھر قمر کے چلانے اور اس کے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بدحواس کمال گاؤن کی ڈوریاں کستا کمرے سے برآمد ہوا۔
"یہ کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔
"کیا ہوا؟" میں نے الٹا اس سے دریافت کیا۔
"دھماکا ہوا ہے۔" کمال نے جھلا کر کہا۔
"دھماکا۔" میں کھڑا ہو گیا۔ گویا کہیں سچ مچ دھماکا ہوا تھا۔
"تو یہیں رک۔ قمر کو دیکھ وہ ڈر گئی ہے۔ میں باہر دیکھ کر آتا ہوں۔" کمال یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دھماکے کے بعد باہر ایک بھگدڑ سی مچی تھی اور لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ جیسے دھماکا کمال کے اسپتال کے اندر ہی ہوا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ آفت میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ جہاں جاتا وہاں کے لوگوں پر نازل ہو جاتی تھی۔ کمال میرا جگری دوست تھا۔ قمر میری بہن تھی۔ میری دشمنی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اس کے باوجود کمینے دشمن نے انہیں نقصان پہنچایا تھا۔ مارے طیش کے میرا جسم لرزنے لگا تھا اور ہاتھ یوں بھنچنے لگے جیسے میں رب نواز کی گردن دبا رہا ہوں مگر رفتہ رفتہ اشتعال کم ہوا تو مجھے قمر کی فکر ہوئی۔ وہ اپنے بچے کو اپنے بازوؤں میں چھپائے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔
"بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔
"کچھ نہیں میرا خیال ہے۔ باہر کوئی گیس لائن پھٹ گئی ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔
"لیکن یہ شور کیسا ہے؟"
"ابھی کمال آ جائے گا تو پتا چل جائے گا۔ تو کیوں فکر کرتی ہے۔"
"فکر کیوں نہ کروں۔ میں اور کمال تمہاری طرح چھپ بھی نہیں سکتے۔" اس نے روہانسا ہو کر کہا "بھائی میرا تو بچہ بھی ہے۔"
میں ایک لمحے کو سن سا رہ گیا تھا۔ قمر نے بالواسطہ کہہ دیا تھا کہ میں اپنی دشمنی کی آگ سے انہیں دور رکھوں۔ واقعی مجھے اس کا کوئی حق نہیں تھا کہ ان کی پُرسکون زندگی میں زہر گھولوں۔ دشمن ملک الموت کی طرح میرے پیچھے پڑا تھا اور اسے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی راہ میں کون آتا ہے۔ وہ مجھ سے وابستہ ہر شخص کو آزار پہنچانے کو تیار تھا "تو ٹھیک کہہ رہی ہے میری بہن۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ تم لوگوں کو بھی خطرے میں ڈالوں۔"
"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" اس نے بے قراری سے کہا۔
"میں جانتا ہوں میری بہن..... لیکن مجھے خود ہی خیال رکھنا چاہیے۔ میں کہیں اور بھی جا سکتا تھا۔ یوں یہاں آ کر تم لوگوں کو خطرے میں نہ ڈالتا۔" میں جانے کے لیے مڑا تو قمر نے اپنے بچے کو بچا اور بھاگتی ہوئی آ کر مجھ سے چمٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔
"بھائی..... میرا..... یہ مطلب..... نہیں تھا۔" اس نے کہا۔
"مجھے..... معاف کر دیں۔"
میں نے اس کا سر سہلایا "پاگل میں ناراض نہیں ہوں۔ دیکھ اگر کسی کو چھوت کی بیماری لگ جائے تو وہ اس سے بچانے کے لیے اپنے پیاروں سے دور رہتا ہے۔ سمجھ لے میرے دشمن طاعون کی طرح مہلک ہیں جو مجھے چمٹ گئے ہیں۔ تم لوگوں کو ان سے بچانے کے لیے میرا تم سے دور رہنا ضروری ہے۔"
مگر قمر کو یقین نہیں آیا۔ جب تک میں نے اس سے نہ جانے کا وعدہ نہیں کر لیا اس نے مجھے چھوڑا نہیں۔ اتنے میں کمال آ گیا۔ اس نے حیرانی سے کہا "یہ برسات کس خوشی میں بن بادل کی؟"
"بس یار اس کا رونے کا موڈ ہو رہا تھا۔ میری ایک بات بہانہ بن گئی۔" میں نے ہنس کر کہا "یہ بتا کہ دشمنوں نے کیا مارا بم یا ایٹم بم۔"
"دستی بم تھا۔ کسی نے چلتی گاڑی سے اسپتال کے گیٹ کی طرف پھینکا تھا۔ گارڈز ہوشیار تھے لیٹ کر اپنی جان بچالی۔" کمال عجلت میں تھا۔ وہ کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کپڑے بدل کر نکلا تو میں نے پوچھا۔
"نقصان کیا ہوا ہے؟"
"خاص نہیں مین گیٹ کا ایک ستون گر گیا ہے۔ دونوں گارڈز معمولی سے زخمی ہوئے ہیں۔ علاقے کا ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ آنے والے ہیں۔"
"دیکھ تو نے کس کا نام نہیں لینا۔"
"اتنی عقل میرے پاس بھی ہے۔" کمال قمیص کے بٹن لگاتا باہر چلا گیا۔
اس میں ایک فی صد بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ کارروائی رب نواز کے آدمیوں کی تھی۔ انہوں نے کمال کی بات پر یقین نہیں کیا تھا اور اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے اس کے اسپتال کو نشانہ بنایا تھا۔ ان کا مقصد نقصان پہنچانا نہیں بلکہ کمال کو یہ جتانا تھا کہ وہ جب چاہیں اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یعنی ان کا شبہ پختہ نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ان کی کارروائی زیادہ شدید ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ حفاظتی انتظامات جانچ رہے ہوں تا کہ بعد میں ایک بھرپور حملہ کر سکیں۔ کمال کا اسپتال بے حد محفوظ تو نہیں تھا لیکن اس کے اندر گھس کر مسلح کارروائی کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ اسپتال میں ہر کس و ناکس کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ کمال

نے او پی ڈی اسپتال کے ایک بیرونی حصے میں رکھی تھی۔ جہاں صرف بیرونی مریضوں کو چیک کیا جاتا تھا۔ اندر داخلے کے دو راستے تھے۔ سامنے والا اور عقبی راستہ۔ دونوں پر دو گارڈز موجود رہتے تھے۔ وہ چیک کیے بغیر کسی شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس کے علاوہ دو گارڈز اسپتال کے اندرونی حصے میں رہا کرتے تھے۔ جن کا کام خاص طور سے کمال کے کمرے کی حفاظت کرنا تھا لیکن یہ عمومی طور پر اندر کے پورے حصے پر نظر رکھا کرتے تھے۔ یہ سب پیشہ ور تربیت یافتہ گارڈز تھے جو بارہ بارہ گھنٹے کی شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی کا اندر گھس کر کارروائی کرنا آسان نہیں تھا۔

اس کے باوجود کمال کو اب محتاط رہنے کی ضرورت تھی اور مجھے یہاں سے نکل جانا تھا۔ عین ممکن ہے یہ دھماکا اس لیے کیا گیا ہو کہ میں کمال اسپتال میں کہیں موجود ہوں تو گھبرا کر باہر نکلوں اور رب نواز کے بھیجے ہوئے مجھے چھاپ لیں۔ کمال آٹھ بجے آیا تھا۔ اس وقت تک کچن میں ناشتا بنا رہی تھی اس لیے مجھے کمال سے اپنے خدشات بیان کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے سکون سے میری بات سنی اور اس سے اتفاق کیا۔ اس نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ رب نواز نے تجھے یہاں سے نکالنے کے لیے یہ حرکت کرائی ہے۔''

''کمال بہت ضروری ہوگیا ہے کہ تو اسپتال کی سیکیورٹی میں اضافہ کر یا نہیں اور رہائش کرلے مگر میرا مشورہ ہے کہ یہیں رہ اور اپنی حفاظت میں اضافہ کرلے۔ بلکہ ایک کام کر۔ تیرا اسپتال جس گلی میں ہے یہ ایک طرف سے بند ہے۔ دوسرے لوگ جن کے بنگلے اس گلی میں ہیں ان سے مل کر گلی کے ایک سرے پر گیٹ لگا لے اور وہاں سے صرف اجازت شدہ لوگوں کو گزرنے دیا جائے۔''

''یہ تجویز بھی میرے ذہن میں کچھ عرصے سے تھی۔ اب میں اس پر عمل بھی کردوں گا۔ آج ہی سیکیورٹی ایجنسی کے کرنل شبیر سے گارڈز میں اضافہ کرنے کے لیے کہہ دوں گا۔''

''یار یہ تیرا کرنل شبیر کیسا آدمی ہے۔''

''کرنل میرا نہیں ہے۔ تو شاید بھول رہا ہے۔ یہ نیلم کی جان پہچان والا شخص ہے مگر میں نے اسے اچھا آدمی پایا ہے۔ اکہتر کی جنگ لڑ چکا ہے اور کوئی تمغا بھی ملا ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے انٹیلی جنس میں ہوا کرتا تھا۔ اب اپنی ایجنسی چلا رہا ہے۔''

کمال کی بات نے مجھے غور کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر کرنل شبیر انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا تھا تو وہ میری مدد کرسکتا تھا۔ مجھے میجر شاہد کے خلاف اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس معاملے میں میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے کمال سے کہا۔

''یار اگر میں اس چکر سے نکلنے کے لیے کرنل کی مدد لینا چاہوں تو کیا وہ میری مدد کرے گا۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے شانے اچکائے ''کرنل اب فوج میں نہیں ہے لیکن اس کے تعلقات یقیناً ہوں گے۔ جہاں تک اس کے مزاج کا تعلق ہے میں بالکل نہیں کہہ سکتا۔ بہتر ہوگا تو نیلم سے بات کرے۔''

''یہ تو نے کام کا مشورہ دیا ہے۔''

میں نے کمال کے فون سے لندن میں عاقل کا نمبر ملایا۔ فون اس نے اٹھایا تھا۔ شاید ابھی ڈیوٹی سے آیا تھا اس لیے جھلایا ہوا لگ رہا تھا ''کون ہے بھائی اس وقت؟''

''تیری جورو کا بھائی۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ!'' وہ کراہا ''بس آپ کی کسر رہ گئی ہے۔ کہیں ہیتھرو ائر پورٹ سے تو نہیں بات کررہے ہیں کہ میں بقلم خود آپ کو آ کر لے جاؤں۔''

''میں اتنی سی بات کے لیے تمہیں زحمت نہیں دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ سب خیریت ہے ناں۔ تو ادرات کا معاملہ کہاں تک پہنچا۔ ان کی واپسی کے آثار نظر آرہے ہیں؟''

''کسی حد تک..... میں کوشش کررہا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان دنوں ایک لمحے کی فرصت نہیں ہے۔ اخبار کا کام چل رہا ہے اور میرا ایک نجی چینل سے بھی معاہدہ ہوگیا۔ یہاں یورپ میں ان کا نمائندہ اور رپورٹر ہوں ابھی کل مجھے ڈبلن جانا ہے ایک سربراہ کانفرنس کی کوریج کے لیے۔''

''گڈ۔ گویا عینی نے رفتہ رفتہ تمہیں انسان سے شوہر بنا دیا ہے۔ یعنی ذمے داریاں ڈھونے والا گدھا۔''

اس نے سرد آہ بھری اور خبردار کیا ''قائم مقام سسر صاحب مت بھولیں کہ یہ وقت آپ پر بھی آسکتا ہے۔''

''ایسا کرو کہ نوادرات والا معاملہ رئیس کے سپرد کردو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اس کے آنے سے میرا بوجھ ہلکا ہوگا۔''

''اب جا کر ذرا نیلم کو اٹھا لاؤ۔''

وہ گھبرا گیا ''نا بابا۔ کل میں نے انہیں اونگھتے ہوئے چھیڑ دیا تھا کہ شامت آ گئی۔ اتنی سنائیں کہ میں نے صحافی ہونے کے باوجود گزشتہ دس سالوں میں نہیں سنی ہوں گی۔ سوتے سے اٹھا دیا تو وہ مجھے دنیا سے اٹھا دیں گی۔ مجھے تو معاف ہی رکھیے۔''

''مرد ہو کر ڈرتے ہو۔'' میں نے اسے ڈانٹا ''ایسا کرو عینی سے کہو۔ وہ اٹھا دے گی۔''

''اب اسے اٹھاؤں۔'' عاقل نے مردہ لہجے میں کہا ''آخر تم سارے مشکل کام مجھ سے ہی کیوں کہتے ہو۔''

ایک منٹ بعد عینی لائن پر تھی ''بھیا آپ کیسے ہیں؟ ہم سب آپ کا کتنی بے چینی سے انتظار کررہے ہیں۔ آپ کب آئیں گے۔''

''بہت جلد میری بہن۔'' میں نے اسے تسلی دی ''تو ایسا کر نیلم کو اٹھا دے۔ میں زیادہ دیر بات نہیں کرسکتا ایک غریب ڈاکٹر کے فون سے بات کررہا ہوں۔'' میں نے کمال کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ بھیا ایک تو اتنے دن بعد فون کرتے ہیں اور اتنی سی بات کرتے ہیں پھر مجھے کیوں اٹھایا۔'' اس نے خفگی دکھائی۔

''یہ بتا کہ تیرا آنے والا مہمان کیسا ہے؟''

وہ شرما کر ہنسی ''ٹھیک ہے۔ ہم نے اس کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ تیمور..... کیسا رہے گا؟''

''تیمور..... کیا یہ طے ہوگیا ہے کہ لڑکا ہی ہے۔''

''یہ تم کس قسم کی باتیں پوچھ رہے ہو؟'' عینی کے بجائے نیلم کے ڈانٹنے کی آواز آئی تھی۔

''عام سی باتیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تم کہاں غائب ہو۔ ایک بار آئے اور پھر غائب..... ناصر میں جلد پاکستان واپس آرہی ہوں۔''

''ایسا غضب مت کرنا۔ یہاں مسائل تمہارے حوالے سے ذرا گڑبڑ ہیں۔ میں فون پر نہیں بتا سکتا..... لیکن میری بات کا اعتبار کرو۔''

''ناصر تم سخت بے ایمان اور دھوکے باز آدمی ہو۔'' اس کے لہجے میں خفگی تھی ''مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم کس طرح ڈراما کرکے رک گئے تھے۔''

''الو کا پٹھا۔'' میں نے بے اختیار رئیس کو یاد کیا ''یہ راز اس نے فاش کیا ہوگا۔ تمہارے عاشقِ نامراد نے۔'' میں نے بھنا کر کہا ''الو کا پٹھا۔ ایک ذرا سی بات پیٹ میں نہیں رکھی۔''

''میں نے اپنی قسم دی تھی۔'' نیلم ہنسی۔

''اچھا اب کام کی بات سنو۔ نیلم مجھے تمہارے کرنل شبیر کی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہ کس قسم کا شخص ہے؟''

''بے حد اصول پسند، سخت گیر..... لیکن محبِ وطن۔'' نیلم نے چند لفظوں میں اس کا حلیہ کھینچ دیا ''بالکل تمہارے کرنل خان کی طرح۔ بائی دی وے تمہیں کیا کام ہے؟''

''فون پر نہیں بتا سکتا۔ بس سمجھ لو کہ ملکی سلامتی کا معاملہ ہے۔''

''تم ان پر آنکھ بند کرکے اعتماد کرسکتے ہو۔ وہ میرے چند بہترین دوستوں میں سے ہیں جو بغیر کسی غرض کے مخلص دوستی کا تعلق رکھتے ہیں۔''

نیلم دوسری باتیں کرنے لگی۔ میں نے فون کا عذر کیا تو اس نے جھٹ خود لندن سے فون کرلیا۔ ان کی کمال اور قمر سے بھی بات ہوئی۔ رئیس کو بھی اٹھا لائے تھے اس نے میری گالیاں سنتے ہوئے ہنسا اور بولا۔

''قسم اللہ کی پیارے۔ یہ عشق آدمی کی مت مار دیتا ہے۔ اب یہ اپنے عاقل خان ہیں۔ بیوی سے ایسے ڈرتے ہیں کہ بس۔ میں تو ابھی شوہر بھی نہیں ہوں۔''

''آدمی کی بات ہے پیارے..... لیکن تو آدمی کہاں ہے۔''

''چندا کہاں ہے؟'' رئیس نے اچانک وہ سوال پوچھ لیا جس سے میں ڈر رہا تھا۔

''یار چندا کے ساتھ ایک مسئلہ ہوگیا ہے لیکن وہ ٹھیک ہے۔ میں تجھے پھر بتاؤں گا۔'' میں نے آہستہ سے کہا ''کسی اور کو مت بتانا۔''

''اچھا اچھا سوری ہے۔'' رئیس نے دوسروں کو سنانے کے لیے کہا ''اسے میرا اسلام دینا۔''

فون بند کرنے سے پہلے نیلم نے وارننگ دی کہ اگر میں جلد لندن نہ آیا تو وہ لاہور آجائے گی۔ ''بس اب میں تمہیں یوں شترِ بے مہار نہیں چھوڑ سکتی۔''

''ہاں میں بیل ہوں جسے تم کسی کولہو سے باندھ دو۔''

ان لوگوں سے بات کرکے میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ رب نواز کی حرکت کی وجہ سے دماغ پر جو بوجھ طاری ہوگیا تھا وہ اتر گیا۔ رہی سہی کسر قسل اور پھر قمر کے بنائے لذیذ پراٹھوں نے پوری کردی۔ اس نے گھر داری میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ مجھے یاد ہے جب اس کی شادی نہیں ہوئی تو ایک بڑا سا بوتیک چلانے والی کو ہانڈی میں چمچ سے چمچہ چلانا نہیں آتا تھا۔ اس کے ہاتھ سے بنی روٹی کھانا خاصے دل گردے کا کام ہوتا تھا اور اب اس نے خود کو ایک مکمل گھر گرہست عورت کے روپ میں ڈھال لیا تھا جس کی زندگی کا محور گھر، شوہر اور اس کے بچے ہوں۔

ناشتا کرکے میں نے کمال سے کہا ''کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکوں۔''

اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا ''تو ایمبولینس میں

جاسکتا ہے۔ میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا۔ وہ نیا بندہ ہے۔ جارج اب اسپتال کے ایڈمنز میں شامل ہے۔"

"بھائی تم نہیں جاؤ گے۔" قمر نے ضدی لہجے میں کہا۔

"میرا جانا ضروری ہے۔ مجھے بہت سارے کام نمٹانے ہیں جو میں یہاں رہ کر نہیں کرسکتا۔ مجھے چندا کو آزاد کرانا ہے اور رب نواز کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔"

"بھائی مجھے معلوم ہے تم پھر غائب ہوجاؤ گے۔" قمر نے آنسو بہانے شروع کردیے۔

"تمہارا بھائی محاذ پر نہیں جارہا ہے۔" کمال نے اسے ڈانٹا "اسی شہر میں رہے گا اور ہم سے رابطہ بھی رکھے گا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں ناں بھائی؟" قمر نے مشکوک لہجے میں دریافت کیا۔ میں نے کمال کے جھوٹ کی تائید کی۔

بمشکل قمر سے رخصت ہوکر میں کمال کے ساتھ اسپتال تک آیا۔ اس نے ایمبولینس کے ڈرائیور سے کہا۔

"خان، نیاز میڈیکل سے دواؤں کے کارٹن لانے ہیں۔ میں سلپ دوں گا۔ کارٹن دیکھ لینا پیک ہوں اور اس سلپ کے مطابق ہوں۔" کمال نے اس گورے چٹے ڈرائیور کو ایک کاغذ دیا "اور ہاں ان کو بھی راستے میں جہاں کہیں اتار دینا۔ یہ میرے دوست ہیں۔"

پٹھان ڈرائیور نے سینے پر ہاتھ رکھ کر نیاز مندی کا اظہار کیا۔ میں نے کمال سے کہا "یار مجھے افسوس ہے کل رات میری وجہ سے تجھ پر یہ آفتیں آ گئیں۔"

"بکواس نہ کر سؤر کے بچے۔" اس نے کھینچ کر مجھے سینے سے لگایا "مجھے شرمندگی ہے کہ تجھے کیوں جانے دے رہا ہوں۔ کاش میں بھی رئیس اور چندا کی طرح تیرا ساتھ دے سکتا۔"

"میں اور تم ایک ہی کام کررہے ہیں۔ ذرا مختلف انداز میں۔" میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا اور ایمبولینس کے عقبی حصے میں سوار ہوگیا۔ وین نما ایمبولینس کا عقبی حصہ مکمل طور پر بند ہوجاتا تھا۔ صرف ڈرائیور کے پاس کی ایک کھڑکی کھلی رہتی تھی۔ باہر سے کسی کے لیے اندازہ لگانا محال تھا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں ہے۔ میں نے دروازے بند کرلیے اور ایمبولینس روانہ ہوگئی۔ کمال نے عقل مندی کی کہ ڈرائیور کو ایک کام بھی بتا دیا تاکہ اگر کوئی نگرانی کررہا ہو تو اسے شک بھی نہ ہو۔ ایمبولینس مال روڈ پر واقع ایک بڑے میڈیکل اسٹور کے سامنے جا کر رکی اور ڈرائیور اتر کر اندر چلا گیا۔ میں عقبی جالی سے دیکھتا رہا تھا کہ کوئی گاڑی ہمارا تعاقب تو نہیں کررہی ہے لیکن پُرہجوم سڑکوں پر میں اس کا اندازہ لگانے میں ناکام ہی رہا تھا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"خان واپسی میں ذرا ویران سڑکوں سے گزرنا اور جہاں میں کہوں وہاں گاڑی روک دینا۔"

"جو حکم صاحب......" اس نے کھڑکی کی طرف منہ کرکے کہا۔

اس نے ذیلی سڑکوں سے گاڑی گزارنا شروع کردی اور جب مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں ہے تو خان سے گاڑی روکنے کو کہا اور وہیں اتر گیا۔ مجھے اتار کر وہ آگے روانہ ہوا اور میں نے پیدل مارچ شروع کردیا۔ میرے پاس مختصر سے بیگ کے سوا جس میں رب نواز کے خلاف ثبوت تھے اور تن کے کپڑوں کے کچھ نہیں تھا۔ میں نیلم ہاؤس کا رخ نہیں کرسکتا تھا۔ عباسی کا گھر باقی نہیں رہا تھا۔ شبنم نہ معلوم کہاں تھی۔ دشمن ایک ایک کرکے میرے سارے دوستوں کو مجھ سے دور کررہا تھا اور سارے ٹھکانے میرے لیے ممنوعہ ہوتے جارہے تھے۔ کچھ دور پیدل چل کر خوش قسمتی ایک ٹیکسی کی صورت میں سامنے آئی۔ یہ یلو کیب تھی جسے ایک خوش پوش اور صورت سے مہذب نظر آنے والا نوجوان چلا رہا تھا۔ اس نے خود ہی ٹیکسی روک دی۔

"کہاں جانا ہے جناب؟"

میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا "فی الوقت تو کسی نزدیکی پی سی او تک چلو۔"

مجھے حیرت ہوئی جب اس نے کرایہ طے کیے بغیر میٹر ڈاؤن کیا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس کام میں نوجوان اور پڑھے لکھے افراد سامنے آرہے تھے۔ جن کا طرزِ عمل اس معاملے میں روایتی ٹیکسی ڈرائیوروں سے خاصا مختلف تھا۔ میں برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں ٹیکسی میں سفر کرچکا تھا۔ وہاں ڈرائیور صحیح معنوں میں مہذب اور پیشہ ور ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسے ڈرائیورز ہمارے ہاں بھی نظر آجاتے ہیں۔ دس منٹ بعد اس نے ٹیکسی ایک پی سی او کے سامنے روکی۔ میں نے کمال کا دیا کرنل شبیر کے دفتر کا نمبر ملوایا۔ وہ روز ٹھیک نو بجے دفتر آجاتا تھا۔ وقت کے معاملے میں وہ جنونی تھا اور اپنے آدمیوں سے بھی اس کی پابندی کراتا تھا۔ رابطہ ہوتے ہی ایک بھاری اور سرد آواز آئی۔

"یس کرنل اسپیکنگ! ہو از؟"

"میں ناصر عظیم بات کررہا ہوں۔" میں نے محتاط انداز میں کہا "نیلم کے ریفرنس سے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کسی قدر بدلے ہوئے انداز میں کہا "میں نے یہ نام سنا ہے لیکن تمہارے پاس کیا

ثبوت ہے کہ تم ہی ناصر عظیم ہو؟"

"یہ ثبوت میں ملاقات پر ہی پیش کرسکتا ہوں۔ میں نے اس لیے آپ کو فون کیا ہے۔"

"او کے آجاؤ۔" اس نے بلاتوقف کہا "کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو۔"

"میں آپ کے دفتر سے شاید بیس منٹ کی مسافت پر ہوں۔ آپ آدھے گھنٹے بعد کا وقت رکھ لیں۔"

"او کے۔" اس نے فون بند کردیا۔ میں ادائیگی کرکے باہر آیا اور ٹیکسی ڈرائیور نوجوان کو کرنل کے دفتر کا پتا بتایا اور خود سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد میں نے آنکھ کھولی تو چونک گیا۔ وہ اس طرف نہیں جارہا تھا جس طرف کرنل کا دفتر تھا۔

"یہ کہاں جارہے ہو؟" میں نے سختی سے کہا۔

"گاڑی میں سی این جی ڈلوانی ہے۔" اس نے مڑے بغیر کہا "گیس ختم ہوگیا۔ سی این جی اسٹیشن اس طرف پڑتا ہے۔ بس دو منٹ لگیں گے۔"

"اوہ......" میں آرام سے واپس نشست سے ٹک گیا تھا۔ حالات نے مجھے اس قدر حساس کردیا تھا کہ میں ذرا ذرا سی بات پر شک کرنے لگا تھا۔ اس زمانے میں سی این جی نئی نئی متعارف ہوئی تھی اور لاہور میں اس کے ایک دو ہی گیس اسٹیشن تھے۔ دوسری بار مجھے ڈرائیور کی حرکت نے چونکا دیا۔ وہ بار بار عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں پہلو بدلا اور عقبی آئینے میں دیکھا۔ مجھے ایک کار نظر آئی تھی۔ سرمئی رنگ کی یہ بڑی سی کار تھی اور مسلسل ہمارے پیچھے ہی آرہی تھی۔ اس کے اگلے حصے میں دو افراد نظر آرہے تھے اور عقب میں کتنے تھے۔ اس کا اندازہ اتنی دور سے لگانا ناممکن تھا۔

"سی این جی اسٹیشن کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ذرا دور ہے جناب۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر جب تم نے ٹیکسی روکی تو میں نے پیٹرول کی بو محسوس کی تھی۔" میں نے ہنکا لگایا۔

"جی پیٹرول...... پیٹرول بھی ہے۔" وہ مزید گھبرا گیا تھا۔ اسی لیے پچھلی کار تیزی سے ہماری طرف آنے لگی تھی۔ میں نے پستول نکال کر اس کے سر سے لگا دیا۔

"عقبی کار میں کون ہے؟"

"مجھے...... مجھے کیا معلوم......" وہ ہکلایا۔

اسی لمحے سرمئی کار ہمارے برابر میں آگئی تھی۔ میں نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے شخص کے ہاتھ میں ایک مہیب نال دیکھی

"جھک جاؤ۔" میں سیٹوں کے درمیانی خلا میں گرتے ہوئے چلایا۔ اگلے ہی لمحے تڑتڑاہٹ کی خوف ناک آواز کے ساتھ ٹیکسی لہرانے لگی۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ فائرنگ شاید سب مشین گن سے کی جارہی تھی۔ گولیاں تواتر سے کار پر پڑ رہی تھیں اور اس کی دھاتی باڈی میں سوراخ کرتی نکل رہی تھیں۔ کئی گولیاں میرے آس پاس سے گزری تھیں۔ وہ خبیث اتنے تواتر سے فائر کررہا تھا کہ مجھے جوابی فائرنگ کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اسی دوران میں ٹیکسی بری طرح لہرا رہی تھی اور اس کا نوجوان ڈرائیور اسٹیئرنگ پر سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ یقیناً مرحوم ہوچکا تھا۔ اس نے کسی معمولی سے لالچ کے عوض جان گنوادی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ دشمن نے مجھے تلاش کیسے کیا۔ کمال کے اسپتال سے کوئی میرے پیچھے نہیں تھا۔ یہ شاید اتفاق تھا۔ اگر ٹیکسی والا نوجوان بھی ان کا ساتھی تھا تو اس نے دوسروں کو کیسے آگاہ کیا تھا۔ غالباً اس وقت جب میں پی سی او سے کرنل شبیر سے بات کررہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک دوسرا پی سی او بھی تھا۔ اس نے شاید وہیں سے فون کردیا ہوگا۔

بالآخر مشین گن کا میگزین ختم ہوا اور میں نے اٹھ کر کھڑکی سے سرمئی کار پر گولیاں برسانی شروع کردیں۔ میرا پہلا نشانہ مشین گن بردار تھا جو اس میں دوسرا میگزین لگا رہا تھا۔ گولی نے اس کا بھیجا بکھیر دیا تھا۔ وہ ڈرائیور پر اوندھا ہوا تو سرمئی کار بھی لہرانے لگی۔ میں نے باقی گولیاں اس کے عقبی ٹائروں پر صرف کردیں۔ ان میں سے ایک کارآمد ثابت ہوئی۔ ٹائر دھماکے سے پھٹا۔ میں نے جھپٹ کر ٹیکسی کا اسٹیئرنگ سیدھا کیا۔ مرنے کے بعد نوجوان اسٹیئرنگ پر ہی سیدھا ہوگیا۔ اس لیے ٹیکسی زیادہ نہیں لہرا رہی تھی۔ اس کا پیر ایکسی لریٹر پر ہی تھا۔ مجا میں نے سامنے سے کھمبے کو تیزی سے آتے دیکھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے لمحے میں فیصلہ کیا اور بائیں طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے خود کو باہر گرا دیا۔ میں دروازے سے سیدھا فٹ پاتھ پر گرا اور کچھ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اللہ بھلا کرے اس شخص کا جس نے چکنے فٹ پاتھ پر گتے کے کٹے ہوئے ٹکڑے ڈال دیے تھے۔ ان کی وجہ سے میں چوٹوں سے محفوظ رہا تھا۔ جب میں سیدھا کھڑا ہورہا تھا تو ایک اعصاب شکن دھماکے نے مجھے دوبارہ گرا دیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شامت کی ماری سرمئی کار کھمبے اور ٹیکسی کے درمیان میں آگئی تھی۔ تصادم نے اسے پچکا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ اس کے اندر موجود کسی شخص کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اٹھ کر پہلے اپنا پستول تلاش کیا اور اسے جیب میں رکھ کر کاروں کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تو بلاشبہ

اپنے کیے کی سزا پا چکا تھا۔ میں نے عقبی حصے سے سرمئی کار میں جھانکا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ایک گردن غیر فطری انداز میں پیچھے کی طرف گھومی ہوئی تھی اس کا دھڑ نشستوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ میں اس چہرے کو پہچانتا تھا۔ یہ وہی کمانڈو تھا۔ جو میرے ہاتھوں اپنا گھٹنا تڑوا کر ریٹائر ہوا تھا۔ گویا یہ را والے تھے جو میری تلاش میں تھے۔ میں رب نواز پر شک کر رہا تھا۔ اگرچہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے مگر ابھی ان کے مفادات متصادم تھے۔ یہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے اتنی تیزی سے ہجوم نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی خاصے لوگ نکل آئے تھے۔

"کیا ہوا جناب؟" ایک آدمی نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا۔

"بس صاحب...... اللہ نے بچا لیا۔ ورنہ ان کم بختوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ فٹ پاتھ پر چھلانگ نہ لگاتا تو میں بھی گیا تھا۔ یہ ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے اسی چکر میں حادثہ پیش آیا۔"

اس بیان نے صورت حال بدل دی اور اب لوگوں کی توجہ میرے بجائے کاروں پر ہوگئی تھی۔ میں غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹا اور پھر تیزی سے چل دیا۔ گرنے اور لڑھکنے کے دوران میرا شلوار کرتہ خراب ہوگیا تھا لیکن یہ خرابی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ جب تک کوئی خاص طور سے میری طرف توجہ نہ دیتا۔ اسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا آگے جا کر میں نے ایک دوسری ٹیکسی روکی اور اسے پہلے ایک معروف گارمنٹ اسٹور چلنے کے لیے کہا۔ وہاں جا کر میں نے اپنے لیے ایک سوٹ لیا۔ اس بار میں نے پینٹ شرٹ لی۔ اس میں نقل و حرکت میں آسانی ہوتی ہے۔ وہیں ٹرائی روم میں لباس بدلا اور پرانا لباس ایک شاپر میں کر کے ساتھ لے لیا۔ راستے میں ایک مزدور ٹائپ شخص جا رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے ٹیکسی رکوا کر شاپر اسے پکڑا دیا۔ میں آدھے گھنٹے کا کہہ کر پورے سوا گھنٹے بعد کرنل کے دفتر پہنچا تھا۔ دفتر خاصا شان دار تھا اور اسے اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے میرا نام سن کر کہا۔

"آپ کہاں تھے۔ باس دوبارہ آپ کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔"

"میں وہاں تھا جہاں خود مجھے اپنی خبر نہیں تھی۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا "بہرحال اب تم انہیں میری تشریف آوری کی خبر دے سکتی ہو۔"

اس نے انٹر کام اٹھا کر اپنے باس کو میری آمد کے بارے میں مطلع کیا اور پھر وہاں سے جواب سن کر اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ اس نے انٹر کام رکھا اور بولی "باس نے ملاقات کینسل کردی ہے اب آپ جا سکتے ہیں۔"

یہ قبول صورت اور کسی قدر بھاری بدن کی لڑکی تھی۔ اسے موٹی کے بجائے گدرائے ہوئے جسم کی کہنا زیادہ درست ہوتا۔ میں اس کی طرف جھکا "آپ پھر اپنے باس سے بات کریں اور انہیں بتائیں کہ میری خوش قسمتی کہ میں اس ملاقات کے لیے یہاں تک پہنچ گیا۔ ورنہ بروز قیامت ہی ملاقات ہوتی۔"

"میں...... میں نہیں کہہ سکتی۔" اس نے نروس ہو کر کہا۔ "کرنل غصہ کریں گے۔"

"نہیں کریں گے جب تم انہیں بتاؤ گی کہ مجھ سے ملاقات کر کے وہ شاید اس ملک اور قوم پر احسان کریں گے۔"

"مجھے سمجھ نہیں آرہی ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا "میں بات نہیں کر سکتی۔ پلیز آپ جائیں۔"

"تم نہیں کر سکتی تو میں کر لیتا ہوں۔" میں نے انٹر کام اٹھاتے ہوئے کہا اور اس کے احتجاج سے پہلے بولا "کرنل یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے۔ میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ آپ سے ملاقات میں......"

"اوکے۔ پلیز اسے کو فون دو۔"

میں نے انٹر کام اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر بلاشبہ بارہ بج رہے تھے اور کرنل کی بات سن کر اس کی حالت مزید خراب ہوگئی تھی۔ اس نے انٹر کام پٹخنے کے انداز میں رکھا اور رونے کے انداز میں بولی۔

"آپ جائیے اندر، آپ نے میری نوکری ختم کروادی ہے۔"

"تمہاری نوکری کو کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اسے تسلی دی اور اس کی کرسی کے عقب میں واقع دروازے میں داخل ہوگیا۔ خلافِ توقع کرنل اور اس کا کمرا دونوں سادہ سے ثابت ہوئے۔ پورے کمرے میں سرمئی قالین بچھا تھا۔ ایک میز تھی جس کے ایک طرف کرنل بیٹھا تھا اور دوسری طرف چند کرسیاں تھیں۔ میز پر دفتری نوعیت کا سامان اور فائلیں نظر آرہی تھیں۔ خود کرنل کی شخصیت کسی بھی طرح اس عہدے سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ شاید ساڑھے پانچ فٹ قد کا اور متوسط جسامت کا شخص تھا۔ جس نے ہٹلر مارک مونچھیں رکھی تھیں۔ عام سے نقوش تھے لیکن اس کی آنکھیں چمک دار اور سرد تھیں۔ اس نے ان میں مزید سرد مہری لاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ناصر عظیم تم پورے پون گھنٹے لیٹ پہنچے ہو۔"

"جی کرنل...... لیکن اس کی وجہ بھی تھی۔ اس ملاقات کی اہمیت کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے مجھے

راستے میں مار ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ لالچی ڈرائیور جو میری ٹیکسی چلا رہا تھا اور دوسری کار میں سوار چار افراد مارے گئے۔ جن میں سے ایک یقینی طور پر را کا سکہ بند دہشت گرد تھا۔"

"خوب!" کرنل کے انداز میں دلچسپی پیدا ہوئی "بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور انٹر کام پر اپنی سیکریٹری سے کہا "دو کافی بھجوا دو۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے مجھے تولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا تھا "ناصر عظیم! یہ قصہ کیا ہے۔ را ایک بین الاقوامی تنظیم ہے۔ اس سے تمہاری کیا دشمنی ہوگئی۔"

"وہی جو را کو پاکستان اور ہر اس پاکستانی سے ہے جو ذرا بھی محبِ وطن ہو۔ بات ذرا تفصیل طلب ہے اگر آپ کے پاس وقت ہو تو......"

"میرے وقت کی فکر نہ کرو۔" اس نے میری بات کاٹی "لیکن تمہاری بات سننے سے پہلے میں تم سے چند سوالات کرنا پسند کروں گا۔"

"جی ضرور۔"

اس نے میرے بارے میں کچھ ذاتی نوعیت کے سوال کیے۔ مجھ سے حوالے چاہے۔ کرنل خان اور ابوبکر آزاد صاحب کے بارے میں سن کر وہ چونکا تھا "کرنل خان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اکہتر میں وہ میرے یونٹ میں ہی تھے۔ اتنے شان دار سپاہی میری نظر سے کم ہی گزرے ہیں۔"

"معاملہ ان کرنل خان کا بھی ہے۔ انہوں نے میری شفقت سے پرورش ہی نہیں کی۔ بلکہ مجھے ایک اچھا انسان بنایا۔ آج میں جو کچھ ہوں۔ ان کے طفیل ہی ہوں۔ ان کی اکلوتی بیٹی چندا آج میرے دشمن رب نواز کے قبضے میں ہے اور رب نواز اس سرزمین کا غدار ہے۔ اس کے سرحد پار تعلقات ہیں۔"

کرنل کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی "اب میں تم سے پوری بات سننے کے لیے تیار ہوں۔ شروع ہوجاؤ۔"

میں اگلے دو گھنٹے تک بولتا رہا۔ اسی دوران میں اس کی سیکریٹری دو بار کافی لے کر آئی۔ اس نے دو بار کسی صاحب کی آمد کی اطلاع دی اور دو ہی بار باہر سے فون آئے۔ کرنل نے ہر بار منع کردیا۔ دوسری بار وہ کافی دے کر گئی تو میں نے مسکرا کر کرنل سے کہا۔

"آپ نے بے چاری کو خوف زدہ کردیا ہے۔ اگر اس کی نوکری گئی تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔"

"ڈونٹ وری یگ مین۔ اپنی بات کرو۔" کرنل نے ٹوک دیا۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کرنل اٹھ کر کچھ سوچتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ کرنل دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اس نے مجھ سے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو ناصر عظیم؟"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا "آپ اب بھی یہ سوال کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔ پوچھنا ضروری ہے۔ کیا تم میرے اثر و رسوخ کی مدد چاہ رہے ہو۔ معاملہ ملکی سلامتی کا ہے۔ البتہ آئی ایس آئی میری بات ضرور سنے گی لیکن اس معاملے کو وہ کس طرح ڈیل کرتے ہیں۔ یہ ان پر ہے۔ میں اس جگہ آ کر بے بس ہوجاؤں گا۔ یونو...... ادارے ملک کو اہمیت دیتے ہیں افراد کو نہیں۔ انہیں چندا سے وہ دلچسپی نہیں ہوگی۔ جو تمہیں یا کرنل خان سے تعلق کے ناتے مجھے ہے۔ جب سر پر پڑ جائے تو مجرم سب سے پہلے غیر ضروری گواہوں سے چھٹکارے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اور اگر میں آپ کی براہ راست مدد چاہوں تو؟"

"اس صورت میں بھی مجھے پہلے حالات کو دیکھنا ہوگا۔ میرے پاس وسائل ہیں اور آدمی بھی ہیں لیکن پہلے میں رب نواز کی طاقت کا اندازہ لگاؤں گا۔ بدقسمتی سے میرے پاس کوئی انٹیلی جنس نہیں ہے جو مجھے دشمن کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ چند ایک لوگ ہیں جنہیں میں نے ایجنسی کے کاموں کے لیے تربیت دی ہے۔ میں ان سے کاؤنٹر انٹیلی جنس کا کام نہیں لے سکتا۔"

مجھے مایوسی ہوئی تھی "گویا آپ کچھ نہیں کر سکتے؟"

کرنل مسکرایا "بہ حیثیت ایک پیشہ ور سپاہی میں حقائق کو اہمیت دیتا ہوں اور بہ حیثیت مسلمان مجھے میرا مذہب بتاتا ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ تم نے جو بتایا اس سے رب نواز اور اس کے خاندان کی حیثیت ایک بگڑے ہوئے جاگیر دار گھرانے کے طور پر سامنے آتی ہے لیکن را جیسے ادارے سے ان کے روابط کا مطلب ہے کہ ہم ان کی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ دیکھو معاملہ متوازن ہے۔ اگر تمہارے پاس رب نواز کے جرائم کے ثبوت ہیں تو اس کے پاس چندا ہے۔ اب نہ تم اس کے خلاف کھل کر کارروائی کر سکتے ہو اور نہ وہ کر سکتا ہے۔ اگر اس نے را کو تمہارے پیچھے لگایا ہے تو تم میری مدد حاصل کر رہے ہو یعنی براہِ راست ملوث ہونے سے بچ رہے ہو۔ رب نواز آدمیوں کے لحاظ سے طاقت ور ہے لیکن وہ سامنے رہنے پر مجبور ہے۔ تم اکیلے ہو اس لیے آسانی سے اس کی نظروں سے بچ سکتے

ہو۔ یہاں بھی معاملہ متوازن ہے۔"

"آپ کا تجزیہ درست ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

"اب تم اپنے نفع نقصان کا حساب لگاؤ۔ ایک طرف تم رب نواز کو نہیں چھوڑ سکتے۔ بہر صورت اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے ہو۔ دوسری طرف اس کی قید میں موجود چندا کو بھی نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتے۔ اب بتاؤ کہ تمہاری پہلی ترجیح کیا ہے؟"

"چندا کی بہ حفاظت رہائی۔" میں نے بلاتوقف کہا۔

"اس کے لیے تمہیں رب نواز کو وہ ثبوت واپس کرنا ہوں گے۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں۔" میں نے پھر کہا۔

"اس صورت میں تم آئندہ اس پر دباؤ ڈالنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"میں کوئی اور راستہ نکال لوں گا۔"

"دوسرا معاملہ واقعی تشویش ناک ہے۔ یعنی جعلی میجر شاہد، اس کے بارے میں میں جلد معلوم کرا لوں گا لیکن اس کا زندہ گرفتار ہونا بے حد ضروری ہے۔ تاکہ معلوم ہو ہمارے کون کون سے فوجی راز دشمن تک پہنچ گئے ہیں۔ فوج جیسے ادارے میں دشمن کے ایک شخص کا اتنے بڑے عہدے تک پہنچ جانا ہمارے لیے باعثِ شرم ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ جلد از جلد ہماری تحویل میں آ جائے۔"

"قابلِ غور بات ہے کہ وہ چار سال سے سرحدی علاقوں میں تعینات ہے۔ یعنی ہمارے سارے ہی دفاعی پلان دشمن کے پاس ہوں گے۔ ذرا غور کریں اگر خدانخواستہ جنگ چھڑ جاتی ہے تو اس صورت میں دشمن حاوی نہیں ہو جائے گا؟"

"میرے نزدیک بھی یہ صورتِ حال ہے۔" کرنل نے کہا "لیکن مجھے یقین ہے ہم اس پر قابو پا لیں گے۔ اس معاملے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہا تیسرا پہلو یعنی نیم حیوانی مخلوق کی تیاری تو یہ بات بھی خفیہ ایجنسیوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ نیلم ہاؤس سے پکڑی جانے والی بچی کو میں نے ہی آرمی انٹیلی جنس کے میڈیکل یونٹ کے سپرد کیا تھا اور آج کل اس کا تجزیہ اور ساتھ میں تربیت کی جا رہی ہے۔"

"میرا نہیں خیال کہ تجزیے سے آپ لوگ اس کی حقیقت تک پہنچ سکیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو امریکا، اسرائیل اور حتیٰ کہ بھارت کے پاس بھی ہم سے کہیں بہتر سائنسی سہولیات ہیں۔ اس سارے معاملے میں اصل اہمیت ہاشم رضا کی ہے۔ اس کا جلد از جلد حکومت کی تحویل میں آ جانا ضروری ہے۔ فی الوقت وہ پیر سبحان شاہ کے پاس ہے اور سبحان شاہ بھی کوئی محبِ وطن شخص نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ پروفیسر کی اصل اہمیت سے واقف ہو کر اسے کسی پارٹی کے ہاتھ بھاری قیمت پر بیچ دے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پروفیسر ہاشم رضا کا ہماری تحویل میں آنا ضروری ہے۔ اگر وہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا تو مسئلہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔"

"شکریہ کرنل۔ آپ نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔" میں نے ممنونیت سے کہا۔

"تو یک مین شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے۔ تم نے تخریب کاری کے ایک بہت بڑے اڈے کو تباہ کر کے وطن کی وہ خدمت کی ہے جو درحقیقت ہمارے سپرد کی گئی ہے۔" کرنل نے اچانک کھڑے ہو کر مجھے سیلوٹ کیا تو میں شرمندہ ہو گیا تھا۔

"میں نے صرف اپنی جان بچائی ہے۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اب مجھے اجازت دیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ دشمن تمہیں پاگل کتے کی طرح تلاش کر رہا ہے۔ فی الوقت تمہارے لیے روپوش رہنا ہی اہم ہے۔"

"کرنل میں پابندی قبول نہیں کرتا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پابندی نہیں میرے بیٹے۔ یہ احتیاطی تدبیر ہے۔ تم دشمن کے خلاف ٹرمپ کارڈ ہو اور تمہیں بچانا ضروری ہے۔ کچھ دن کی بات ہے۔ ویسے بھی تمہارا اپنے پرانے ٹھکانے پر پایا جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ واقعی مجھے ایک ایسے ٹھکانے کی ضرورت تھی جہاں دشمن کا خیال بھی نہ جا سکے اور میں وہاں سکون سے بیٹھ کر رب نواز سے چندا کی واپسی کے لیے مذاکرات کر سکوں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس کی بات مان لی۔ کرنل خوش ہو گیا۔ اس نے فون پر کسی نادر خان کو اندر آنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اندر آیا۔ چڑھی ہوئی مونچھوں اور سرخ آنکھوں سے وہ کوئی بدمعاش نظر آتا تھا۔ اس نے کرنل کو سیلوٹ کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

"یہ ناصر عظیم ہیں۔ انہیں ماڈل ٹاؤن والے بنگلے پر لے جاؤ اور ذرا ہوشیاری سے جانا۔"

"جی سر۔" اس نے مختصراً کہا اور میری طرف دیکھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریہ کرنل صاحب!" میں نے اسے ایک بار پھر کہا اور نادر خان کے ساتھ باہر نکل آیا۔

نادر خان نے دفتر کے احاطے میں کھڑی ایک چھوٹی کار کا دروازہ کھولا۔ اس کے شیشے رنگین تھے۔ جن سے باہر تو دیکھا جا سکتا تھا لیکن اندر بیٹھنے والوں کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ نادر خان نے کار سڑک پر نکالی تھی کہ سامنے سے ایک اخبار فروش لڑکا چلاتا اور اخبار لہراتا نظر آیا۔ جب ہم اس کے پاس سے گزرے تو اس کے الفاظ میرے کانوں میں پڑے تھے "آج کی تازہ خبر...... استاد موج دین کو قتل کر دیا گیا! آج کی تازہ خبر......" اخبار اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔

☆☆☆

ماڈل ٹاؤن کا یہ بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک کنال پر بنا ہوگا لیکن اس کا اندازِ تعمیر بتا رہا تھا کہ یہ عام گھروں سے مختلف ہے۔ اس کی چار طرف سے اونچی سنگی دیواریں اور ان پر لگی خاردار تاریں، اندر دروازے مضبوط تھے اور کھڑکیوں پر بھاری آہنی گرلز لگی تھیں۔ نادر خان نے کار پورچ میں روکی۔ اس کے ہارن بجانے پر اندر سے ایک مضبوط جسامت کی نوجوان عورت برآمد ہوئی۔ اس نے شلوار قمیص کے ساتھ پیروں میں جوگرز پہن رکھے تھے۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایتھلیٹ کا لفظ آیا تھا۔ اس کی جسامت میں نسوانیت کا عنصر کم ہی تھا۔

"صاعقہ، انہیں کرنل صاحب نے بھیجا ہے اب یہ یہیں رہیں گے۔ عارضی طور پر۔ ان کے رہنے کا بندوبست کرو اور باقی ہدایات کرنل صاحب سے لے لینا۔"

"ہاؤ ڈو یو ڈو ڈیئر ......" اس نے بے تکلفی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"مجھے ناصر عظیم کہتے ہیں۔"

"مجھے اجازت ہے جناب عالی۔" نادر خان نے رسمی طور پر پوچھا اور میرے سر ہلاتے ہی اپنی تھی سی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

"آئیے اندر ناصر صاحب ......" صاعقہ نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

بنگلا اندر سے بھی سادہ تھا اور اس کی آرائش کے انداز میں سہولت نظر آتی تھی۔ صاعقہ مجھے عقبی حصے کے ایک کمرے میں لے آئی "آپ یہاں رہیں گے۔ یہ برابر میں باتھ روم ہے۔ اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو یہ انٹرکام ہے۔ ایک نمبر کچن کا ہے۔ تین نمبر دروازے کا اور مجھ سے رابطہ چار نمبر پر ہوگا۔"

"کیا یہ فون بھی ہے؟"

"ہاں...... لیکن اس پر کال صرف آتی ہے جاتی نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو گیلری میں رکھا فون استعمال کرنا ہوگا۔"

میں نے سر ہلایا "اگر میں باہر جانا چاہوں تو؟"

"آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے...... لیکن بہتر ہوگا۔ اگر کرنل صاحب نے آپ کو کچھ ہدایات دی ہیں تو آپ ان پر عمل کریں۔"

"فی الوقت تو مجھے زوردار بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

اس نے گھڑی دیکھی "اب سے آدھے گھنٹے میں کھانا میز پر تیار ہوگا۔ سامنے والے حصے میں تیسرا دروازہ ہے۔ اس پر ڈائننگ روم کی تختی لگی ہے۔ تب تک آپ چاہیں تو آرام کریں یا باتھ لے لیں۔"

"شکریہ۔" میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔

"ویل کم۔" وہ مسکرائی۔

اس کے جانے کے بعد میں بستر پر گر کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ تقدیر نے کس طرح مجھے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا لیا تھا۔ جب میں خوش امید ہوتا تو دشمن کی طرف سے مایوسی ملتی تھی اور جب میں مایوس ہوتا تو تقدیر میرے لیے نئی راہ کھول دیتی تھی۔ اتنا کچھ کرنے اور بے شمار حملوں کے باوجود میں رب نواز کا کچھ بگاڑنے میں ناکام رہا تھا اور جب قدرت اسے سزا دینے پر آئی تو اس کا نوجوان بیٹا موت کی آغوش میں جا سویا۔ بیوی گھر سے بھاگ گئی۔ بہو اور پوتے کو میں نکال کر لے گیا۔ پروفیسر ہاشم رضا کے غائب ہونے سے اس کی زندگی کا سب سے بڑا منصوبہ ناکام ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ راکے اڈے کی تباہی اور میرے فرار کے بعد رب نواز اور بھارتیوں کے تعلقات میں بھی دراڑ آئی ہوگی۔ گویا صورتِ حال اتنی خراب نہیں تھی جتنی کہ مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ کرنل شبیر جس طرح میجر شاہد والے معاملے میں فکر مند تھا مجھے یقین تھا کہ وہ اس معاملے میں جلد کچھ کرے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونکا "کم ان۔"

صاعقہ اندر آئی تھی۔ اس نے کہا "کھانا لگ گیا ہے۔ ڈائننگ روم میں چلیے۔"

میں اس کے ساتھ ڈائننگ روم تک آیا۔ یہ بھی سادہ سی جگہ تھی جہاں چھ افراد کے لیے ایک میز رکھی تھی اور کھانے والے صرف ہم دو تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے کھانے کے بعد میں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا یہ کرنل کی اپنی رہائش گاہ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ بنگلا کرنل کے مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔"

''کس قسم کے مہمان؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''پسندیدہ یا ناپسندیدہ؟''

''دونوں طرح کے۔'' اس نے رک کر پانی لیا۔ کھانے کے بعد اس نے پوچھا ''آپ کیا لینا پسند کریں گے۔ چائے یا کافی؟''

''ایک گلاس گرم دودھ ...'' میں نے کہا ''ساتھ میں کچھ فون کرنا چاہوں گا۔''

''فون گیلری میں ہے۔'' اس نے جواب دیا ''دودھ آپ کے کمرے تک پہنچا دیا جائے گا۔''

میں نے گیلری میں آ کر سب سے پہلے کمال کا نمبر ملایا ''ناصر بول رہا ہوں۔ میں کرنل شبیر کے پاس ہوں۔''

''گڈ تو ٹھیک جگہ ہے۔ یہاں فی الوقت سب خیریت ہے۔ کرنل کی ایجنسی سے دو باڈی گارڈز اور آ گئے ہیں۔ حملے کے بعد لوگوں میں جو ذرا خوف آ گیا تھا وہ بھی کم ہو گیا ہے۔ حملے کی خبر پھیلتے ہی میڈیا کے نمائندے اور جاننے والے دوڑے چلے آئے تھے۔ بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی ہے۔''

میں نے اسے اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بارے میں نہیں بتایا اور کچھ دیر بات کر کے فون بند کر دیا پھر نیلم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ فون خالہ بانو نے اٹھایا ''ناصر بات کر رہا ہوں۔ خالہ۔''

''کیسے ہو میاں۔ ارے یہ بچی بے چاری بہت پریشان ہے روتی بھی رہی ہے۔''

''بچی۔ کون۔ بچی؟''

''وہی جسے تم ساتھ لائے تھے فریال۔''

''اسے کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے کہا ''ذرا اسے بلایئے۔''

''ابھی بلاتی ہوں میاں۔'' خالہ کہہ کر چلی گئیں۔

فریال غالباً دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی ''آپ ... آپ کہاں ہیں ... کیسے ہیں؟'' کہتے کہتے وہ رو دی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ دوست ... ابھی مرا نہیں ہوں۔'' میں کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''سوری میں نے آپ کو پریشان کیا۔'' اس نے خود پر جلدی سے قابو پا لیا۔

''میں تمہارے بارے میں فکرمند ہوں۔''

''سچ۔'' وہ کھل گئی تھی ''میں جانتی تھی آپ کو میرا خیال آئے گا۔''

''رب نواز تمہیں اور اپنے پوتے کو تلاش کر رہا ہے۔ اسے نیلم ہاؤس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ تم نیلم ہاؤس میں ہی ہو۔ اس لیے احتیاط کرو۔ باہر نہ نکلو۔ بلکہ زیادہ تر اندر رہا کرو۔ نہ جانے کون کہاں سے دیکھ رہا ہو۔ اگر کسی نے تمہیں نیلم ہاؤس میں دیکھ لیا تو پریشانی ہو سکتی ہے۔''

اس کا لہجہ مرجھا گیا تھا ''بس آپ کو میری اتنی فکر ہے کہ میں رب نواز کے ہاتھ نہ لگوں۔''

''کیا یہ فکر کم ہے؟'' میں نے نرمی سے کہا ''فریال مجھ پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔''

وہ پھر دبی دبی آواز میں سسکیاں لینے لگی ''میں...... میں ... آپ سے...... کچھ مانگتی تو نہیں ہوں۔''

''اور میں دے بھی نہیں سکتا۔'' اس بار میں نے رکھائی سے کہا ''فون خالہ بانو کو دو۔''

خالہ بانو غالباً اس کے پاس نہیں تھیں۔ وہ ذرا دیر سے آئیں۔ خالہ جہاں دیدہ عورت تھیں۔ میرے حوالے سے وہ فریال کی حالت اچھی طرح سمجھ رہی تھیں اور اس لیے اسے تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کا موقع دیا تھا۔ میں نے ان سے کہا ''خالہ فریال کا خیال رکھیے گا۔ ابھی وہ پریشان ہے اور شاید مایوس بھی۔ اس حالت میں کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ اسے مکان سے باہر نکلنے نہ دیں اور گھر کے تمام ملازموں کو سختی سے ہدایت کر دیں۔ اس کے یا اس کے بچے کے بارے میں باہر کے کسی فرد کو ہرگز نہ بتائیں۔ اس کے دشمن اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''میں سمجھ گئی میاں۔''

''شکریہ خالہ۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہو گا۔''

''ارے میاں کیسی بات کرتے ہو۔ تم بھی نیلم ہاؤس کے مالکوں میں سے ہو۔ پتا ہے نیلم نے کہا تھا خالہ آپ ایک بار میرا حکم بھی رد کر سکتی ہیں لیکن ناصر کی کسی بات سے انکار نہیں کرنا۔'' خالہ بولیں ''لو میاں یہ فریال کچھ کہہ رہی ہے۔''

فریال ریسیور لینے کے بعد کچھ دیر خاموش رہی۔ غالباً خالہ کے وہاں سے جانے کا انتظار کر رہی تھی پھر اس نے دبی زبان میں کہا ''ناصر آپ میرے پاس کب آئیں گے۔ میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔''

''میں وہاں نہیں آ سکتا۔ میں نے کہا ناں کہ رب نواز کے آدمی میری اور تمہاری تلاش میں ہیں۔''

''پلیز...... یا تو میرے پاس آ جائیں یا پھر مجھے اپنے پاس بلا لیں۔ میں آپ سے دور نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آواز بھرا گئی

تھی۔

''فریال یہ ممکن نہیں ہے۔ میں زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا ہوں۔ تم اور تمہارا بچہ اس کھیل سے جتنا دور رہیں اتنا ہی بہتر ہو گا۔ اب اجازت دو۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا۔''

''ناصر مجھے برے برے خیالات آ رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو؟''

''تو کچھ بھی نہیں۔ دنیا کا کام کسی ایک شخص کے جانے سے نہیں رکتا۔ میں نہیں رہوں گا تو مجھ سا کوئی ہو گا۔''

''لیکن میرے لیے آپ جیسا کوئی نہیں ہو گا۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''فریال ابھی تم پریشان ہو۔ مصیبت میں ہو۔ جیسے کوئی سیلاب میں گھرا ہو تو اس کے لیے تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ جب یہ حالات ختم ہو جائیں گے تب تم بہتر طور پر فیصلہ کر سکو گی۔''

''میرا فیصلہ اس وقت بھی نہیں بدلے گا۔ آپ میرے لیے تنکا نہیں۔ پناہ کا جزیرہ ہیں۔ جس میں ، میں ساری عمر رہنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ ''ناصر میں آپ سے...... محبت کرنے لگی ہوں۔''

میں چپ سا رہ گیا۔ اس پاگل نے وہ اعلان کر دیا تھا جس سے میں ڈرتا تھا۔ اس کے جذبات کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اس نے کھل کر اپنے دل کی حالت کہہ دی تھی۔ میری خاموشی اسے محسوس ہونے لگی۔ ''کیا آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی؟''

''فریال۔ وہ شخص خوش نصیب ہو گا جسے تمہاری محبت ملے گی لیکن میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں وہ خوش نصیب میں نہیں ہوں۔''

اس بار وہ چپ ہو گئی پھر اس نے فون رکھ دیا۔ میں نے گہری سانس لی اور پلٹا تو صاعقہ عقب میں کھڑی تھی ''سوری۔'' اس نے کہا ''آپ کے لیے کرنل کی کال آئی ہے۔''

مجھے غصہ تو آیا کہ وہ یوں خاموشی سے عقب میں آ کر میری بات سن رہی تھی مگر فی الوقت اپنے جذبات کا میں اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ کرنل کی کال جس فون پر آئی تھی وہ اندر ایک کمرے میں تھا۔ کرنل نے اپنے مخصوص انداز میں اطلاع دی۔

''میجر شاید فرار ہو چکا ہے۔ وہ کل سے اپنی ڈیوٹی سے غائب ہے۔''

''اگر وہ ڈیوٹی پر موجود ہوتا تو مجھے زیادہ حیرت ہوتی۔'' میں نے کہا ''اب آپ کے پاس صرف رب نواز رہ گیا ہے۔ میرا خیال ہے اگر لال حویلی پر چھاپا مارا جائے تو اب بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔''

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ سطح پر حکومت کی اجازت درکار ہو گی۔ رب نواز کی پارٹی اس وقت حکومت کی مخالف ہے اگر اس نے واویلا کیا تو یہ ایک سیاسی ایشو بن جائے گا۔ سیاست دانوں کو غدار قرار دینا ایک روایت سی بن گئی ہے۔ عین ممکن ہے رب نواز اس کی آڑ میں صاف بچ جائے۔''

''کیا آپ اپنے طور پر بھی کچھ نہیں کر سکتے؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''برخوردار اب میں سرکاری آدمی نہیں ہوں۔'' اس نے کہا ''مجھے کوئی کام کرنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑتا ہے اور وہ میں کر رہا ہوں۔''

''سوری میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تمہارے پاس رب نواز کے خلاف جو ثبوت ہیں ان کے ہوتے ہوئے وہ تمہاری ساتھی کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔'' کرنل نے میرے دل کی بات سمجھ لی تھی۔ اس سے سودے بازی کر کے تمہاری ساتھی کو چھڑایا جا سکتا ہے۔ تم رب نواز سے بات کرو۔''

''یہاں سے...... اس کے نمبروں پر آبزرویشن لگا ہے۔''

''اس بنگلے کے نمبروں سے کی جانے والی ہر کال محفوظ ہے۔ اسے نہ تو کوئی سن سکتا ہے اور نہ ہی اسے ریکارڈ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کال ٹریس کی جا سکتی ہے۔ تم بے فکر ہو کر رب نواز سے بات کرو اور جو بھی طے ہو مجھے بتا دینا۔''

''شکریہ کرنل۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو...... تھینکس۔ تم بھی اپنا کام نہیں کر رہے ہو۔ اگر میں تمہارے کام آ رہا ہوں تو اس میں شکریہ کی ضرورت نہیں ہے جب تمہارا کوئی ذاتی کام کروں تو شکریہ بھی کرنا۔''

''اگر میں رب نواز سے ڈیل میں آپ کو شامل کر لوں؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ تم وہ ایڈیٹر کا کیا نام ہے ہاں آزاد...... اس کو ضامن بنا لو۔ یہ سیاست داں اگر کسی سے ڈرتے ہیں تو وہ یہی صحافی ہیں۔''

کرنل کا مشورہ درست تھا۔ آزاد صاحب پہلے بھی

میرے کام آتے رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی انکار نہیں کریں گے۔ میں نے آزاد صاحب کے اخبار فون کیا مگر ابھی وہ دفتر نہیں آئے تھے۔ وہ شام چار بجے تک دفتر آتے تھے تب تک میں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہفتے راوالوں کی قید میں گزار کر میری حالت خاصی خراب ہوئی تھی میں اب بھی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ دوا پی کر میں سو گیا۔ صاعقہ کو ہدایت دی تھی کہ مجھے چار بجے اٹھا دے اس نے مجھے ٹھیک چار بجے اٹھا دیا۔ میں طبیعت میں بوجھل پن محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے گرم پانی سے غسل کر لیا۔ کافی پی کر میں چاق و چوبند ہو گیا۔ پھر رب نواز کا نمبر ملایا۔ فون حسب معمول اس کے کسی گھریلو ملازم نے اٹھایا۔

''رب نواز سے بات کراؤ۔ میں شاہ عالم بات کر رہا ہوں۔''

رب نواز خاصی دیر بعد فون پر آیا۔ ''کہو کیا بات ہے؟''

''پہلے تو موج دین کا کانٹا نکالنے کا شکریہ۔''

''کام کی بات کرو۔'' اس کے انداز میں سرد مہری تھی

''میری چیزیں کب دے رہے ہو؟''

''جب تم چندا کو میرے حوالے کرو گے۔''

''میں چندا کو حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آج اسی وقت۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے حیرت ہے تم اتنی جلدی تیار ہو گئے۔'' میں نے ہنس کر کہا ''آج تمہارا انداز بھی بدلا ہوا ہے خیر میں چاہتا ہوں کہ چندا اور چیزوں کا تبادلہ کسی غیر جانبدار جگہ پر ہوں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

''گڈ! تم انتظار کرو۔ میں تمہیں سات بجے فون کر کے بتاؤں گا کہ یہ تبادلہ کہاں ہونا ہے۔''

''ایک منٹ۔'' رب نواز تیزی سے بولا ''اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ تم تمام ثبوت میرے حوالے کرو گے، کوئی ہیر پھیر نہیں کرو گے۔''

''میں اس سلسلے میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔ تمہیں میری زبان پر بھروسا کرنا پڑے گا۔''

وہ طنزیہ انداز میں ہنسا ''تمہاری زبان.....''

''اگر اس کے علاوہ تمہارے پاس مطمئن ہونے کا کوئی طریقہ ہے تو بتاؤ؟''

''تم پہلے سارے ثبوت میرے حوالے کر دو اس کے بعد میں چندا کو تمہارے حوالے کروں گا۔''

''رب نواز یا تو تم احمق ہو یا پھر مجھے احمق سمجھ رہے ہو۔ میں کسی صورت ثبوت تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ چندا اور ثبوتوں کا تبادلہ ایک ساتھ عمل میں آئے گا۔ تمہارا مطالبہ احمقانہ ہے اگر میں تصویروں کی اور کاپیاں بنا کر رکھ لوں تو تم کیا کرو گے کس طرح تصدیق کرو گے کہ میرے پاس کوئی اور ثبوت باقی نہیں رہا۔ نہیں رب نواز تمہارے پاس بھروسے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں کمرے میں آنے کے بجائے باہر لان میں نکل آیا۔ فضا میں خنکی آ گئی تھی اور مغرب کی طرف جھکتے سورج کی کرنوں میں معمولی سی حرارت باقی رہ گئی تھی۔ بنگلے کی سادگی کے مقابلے میں لان خوب صورت تھا اور سدا بہار قسم کے پھولدار پودوں سے بھرا تھا۔ گھاس بھی بے حد سرسبز اور تازہ تھی۔ یہ غیر ملکی قسم کی گھاس تھی جو سارا سال سبز رہتی ہے۔ اس پر ٹہلتے ہوئے آزاد صاحب سے بات کرنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخری بار جب میں نے ان سے بات کی تھی تو شبنم کے حوالے سے ان کے لب و لہجے میں خاصی تلخی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اب وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں گے لیکن ایک امید تھی کہ وہ میری مدد کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔ شام چھ بجے میں اندر آیا اور آزاد صاحب کے دفتر کا فون نمبر ملایا۔ شکر ہے اس وقت ان کی مصروفیات ذرا کم تھیں اس لیے وہ فوراً لائن پر آ گئے۔

''ہاں میاں کیسے ہو۔ بڑے دنوں بعد یاد کیا؟''

''بس آزاد صاحب زندگانی نے یوں گھیر رکھا ہے کہ موت کی فرصت بھی نہیں ہے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''واہ...... میاں آج کل شاعروں کی صحبت میں بیٹھ رہے ہو یا کسی دشت میں گزر رہے۔'' وہ پھڑک اٹھے ''یہ بخدا تم جیسے نرے سیاست داں اور کاروباری کے منہ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔''

''دل پر جب لگتی ہے تو صدا تو نکل ہی جاتی ہے۔'' میں نے دوسری سرد آہ بھری۔

''میاں اتنی سرد آہوں سے ذرا گریز یاؤ۔ ہم آج کل ویسے ہی نزلے کا شکار ہیں۔ کام کی باتوں کی طرف آؤ۔ آج اپنے موج دین صاحب کی خبر بھی آ گئی۔ بہت دن سے انتظار تھا کوئی تو شہر کی صفائی کا بیڑا اٹھائے کہیں اس کارِ خیر میں آپ کا ہاتھ تو نہیں ہے۔ کیوں کہ بہ قول پولیس قاتل نے دستانے پہن رکھے تھے گویا۔''

''آپ اسے رب نواز کے کھاتے میں ڈالیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ میرا اندازہ ہے یہ اسی کا کام ہے کیوں کہ موج دین ان کاموں میں بھی ٹانگ اڑانے لگا تھا جو پہلے رب نواز کے لیے مخصوص تھے۔''

''آثارِ قدیمہ کی اسمگلنگ گویا۔'' انہوں نے بول کر مجھے حیران کر دیا۔

''یعنی آپ جانتے ہیں؟''

''میاں ہم کیا نہیں جانتے۔'' اس بار انہوں نے سرد آہ بھری ''لیکن یہاں دستورِ زبان بندی ہے۔ خیر فرماؤ کہ کس کام سے فون کیا۔''

میں نے آزاد صاحب کو سارے معاملے سے آگاہ کیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ یہ تبادلہ آپ کے دفتر میں ہو۔''

''بھئی ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ عمرِ عزیز پہلے ہی خاتمے کے قریب ہے اور چلبلی کی دائمی جدائی نے اسے اور قریب کر دیا ہے۔'' انہوں نے ایک اور سرد آہ بھری ''ایک ہفتے پہلے ہی مرحومہ نے آخری سانس لی۔ معالجوں نے پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ کس دکھے دل سے ہم نے انہیں سپردِ خاک کیا ہے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔''

''سپردِ خاک کر دیا۔'' میں دنگ رہ گیا تھا ''یعنی سچ مچ زمین میں دفنا دیا۔''

''برخوردار کیا ہم علامتی جنازے کی بات کر رہے ہیں جو ہمارے وطن میں آئے دن نکلتے رہتے ہیں۔'' وہ خفا ہو کر بولے ''ہم نے اپنی عزیز از جان چلبلی کو اپنے گھر کے آنگن میں دفن کرایا ہے۔ اس کا مزار وہیں ہے۔''

میرے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ بات مضحکہ خیز تھی مگر میرے ہنسنے سے آزاد صاحب کے جذبات ضرور مجروح ہوتے۔ چلبلی ان کے لیے شریکِ حیات سے کم نہیں تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''میاں ہمیں اپنی پروا نہیں ہے مگر ہمارے اخبار کے لوگوں نے کیا قصور کیا ہے۔ رب نواز نے پچھلی مرتبہ بدمعاشی دکھائی تھی۔''

''اس معاملے میں آپ بے فکر رہیں۔ رب نواز کا کوئی بدمعاش آپ کے دفتر میں قدم بھی نہیں رکھے گا۔''

''میاں وہ قدم نہیں بلکہ پورے ہی دفتر میں ہوں گے اور فرض کیا کہ کسی نے قدم نہیں بھی رکھا تب بھی تبادلے کے بعد تو باہر سے دفتر پر ایک آدھ دستی بم یا راکٹ مارنے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ گویا ایک برسٹ بھی چلا تو ہمارے کاتب کتب الدین بلا وجہ انتقال کر جائیں گے۔ اختلاجِ قلب کے پرانے مریض ہیں۔ دو دورے پہلے ہی پڑ چکے ہیں۔''

''آزاد صاحب میں نے کہا ناں آپ فکر نہ کریں۔ تبادلے کے وقت آپ کے اخبار کے دفتر اور اس کے اردگرد سخت حفاظت ہو گی۔''

''گویا بعد میں نہیں ہو گی۔'' انہوں نے نکتہ اٹھایا۔

''آزاد صاحب۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''گویا آپ کی طرف سے انکار ہے۔''

''نہیں میاں۔'' انہوں نے تیسری سرد آہ بھری ''تم سے پرانا تعلق ہے۔ اس ناتے انکار تو ممکن نہیں ہے۔ بہر حال ایسا کرو تم کل کی تاریخ رکھ لو۔ جمعہ ہے ناں مبارک دن ہوتا ہے۔ ناحق مارے جانے کی صورت میں اللہ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں ہے، اس گناہ گار کو شہیدوں میں تسلیم کر لے اور تو کوئی صورت بچت کی نظر نہیں آتی ہے۔''

''اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے انہیں تسلی دی ''شبنم اب کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ ہم نے اسے کراچی بھیج دیا ہے۔ وہاں ایک نجی چینل کھلا ہے۔ اس میں کام کر رہی ہے۔''

مجھے خوشی ہوئی ''یعنی اس کی حالت اب ٹھیک ہے۔''

''ہم صحافی بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ اگر ڈھیٹ ہڈی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کوئی بھی صدمہ ہو، کیسا ہی زخم ہو لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اب ہمیں لو۔ چلبلی کی تدفین کے وقت ہم خود کو بھی مرحوم ہی سمجھ رہے تھے مگر دیکھو اب تم سے بات کر رہے ہیں۔''

''تو طے ہوا کل تبادلہ ہو گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ورنہ چلبلی کا تذکرہ مرثیے کی طرح طویل ہو سکتا تھا۔

''شام سات بجے ٹھیک۔ نہ ایک منٹ ادھر اور نہ ایک منٹ ادھر۔'' انہوں نے بادل ناخواستہ موضوع بدلا۔

کچھ دیر بات کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ سات بجنے والے تھے۔ میں نے رب نواز کا نمبر ملایا۔ وہ خود فون سے لگا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا ''تبادلہ کل ہو گا ٹھیک شام سات بجے۔''

''کہاں؟'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''یہ بات میں تمہیں کل شام چھ بجے بتاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔''

''ایک گھنٹا پہلے۔ ناممکن ...... مجھے کچھ اور وقت چاہیے۔''

''کسی سازش کے لیے۔'' میں نے طنز کیا ''رب نواز سمجھ لو۔ یہ آخری موقع ہے۔ کسی قسم کی حرکت کرنے سے پہلے کم سے کم دس بار سوچ لینا۔''

''میں کوئی حرکت نہیں کروں گا لیکن ایک گھنٹا کم ہے۔''

''ایک گھنٹے میں تم بہ آسانی چندا کو لے کر مطلوبہ جگہ آ سکتے ہو۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم دھوکا نہیں کرو گے؟'' اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''جب میں تمہیں جگہ کا بتاؤں گا تو تم وہاں سے خود بھی تصدیق کر سکتے ہو چاہو تو کسی معتبر شخص کو ساتھ لا سکتے ہو لیکن یاد رہے تمہارا کوئی مسلح آدمی ساتھ نہ ہو۔ تم اپنے ساتھ صرف ایک ڈرائیور لاؤ گے۔ جو گاڑی میں رہے گا۔ اپنے ساتھ تم چندا کو لے کر ہی گاڑی سے نکلو گے۔''

''اس انتظام میں تمہاری بالادستی ہے۔'' اس نے بے بس لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ناں تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہو گا۔'' میں نے زور دیا ''تم جانتے ہو میں دشمن ہوں لیکن کمتر نہیں ہوں۔ میں نے بارہا موقع ملنے کے باوجود تمہیں نقصان پہنچانے سے گریز کیا۔ میں نے اسی وقت مجبور ہو کر کچھ کیا جب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنا دفاع ہی کیا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا ''مجھے اعتراف ہے۔ تم واقعی شریف دشمن ثابت ہوتے ہو۔''

''تعریف کا شکریہ۔ تم آئندہ بھی مجھے شریف ہی پاؤ گے بہ شرط یہ کہ تمہارے دل میں کوئی الٹا خیال نہیں آئے۔ کل شام چھ بجے فون کے پاس ہی رہنا۔''

''تم بے فکر رہو۔''

''چندا کہاں ہے؟'' میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''فی الوقت وہ یہاں نہیں ہے لیکن کل تک آ جائے گی۔''

''رب نواز ایک بات یاد رکھنا۔ چندا کو ذرا سا بھی نقصان ہوا تو تمہیں اس کا بھاری تاوان دینا ہوگا۔''

''وہ بالکل محفوظ ہے۔'' رب نواز نے جواب دیا ''مجھے دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نیک نیتی سے دشمنی ختم کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''تمہاری نیک نیتی کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں... رب نواز۔ تم مجبور ہو کر یہ سب کر رہے ہو۔ پروفیسر ہاشم رضا والا پلان اس کی گمشدگی کی وجہ سے ناکام ہو چکا ہے اور اس سرزمین پر تمہارے غیر ملکی دوستوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔''

''شاہ عالم کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں اور کبھی کی راتیں۔'' اس نے غرا کر کہا۔

میں نے کہا ''رب نواز تمہاری لمبی رات آ گئی ہے اور اس کے خاتمے سے پہلے تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔ تم نے ساری عمر جو بویا ہے وہ کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تم ذرا سا غور کرو تو تمہاری سمجھ میں آ جائے کہ تمہارا زوال شروع ہو گیا ہے۔''

اس بار اس نے قہقہہ لگایا۔ ''میرے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا خاندان ہو گا۔ میرے بیٹے ہوں گے۔ ہم اسی طرح حکومت کرتے رہیں گے۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ تم لوگوں نے جس طرح اپنی اولاد کو حرامی اور حلالی میں تقسیم کیا ہے۔ اپنی عورتوں کی عزت کو خود ہی پامال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے تقسیم کے اور نہیں ہو گا۔ رب نواز تمہارا خاندان یوں بکھر جائے گا جیسے ریت کا قلعہ بکھر جاتا ہے۔''

اسے ذرا چپ لگ گئی پھر اس نے کہا ''شاہ عالم! کووں کے کوسنے سے ڈھور مرا نہیں کرتے۔''

''چلو دل خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے۔'' میں نے جواب دیا ''کل شام چھ بجے بات ہوگی اور یاد رکھنا۔ چندا کی آواز سن کر ہی میں ثبوت لے کر مطلوبہ مقام پر آؤں گا۔''

''چندا یہیں ہو گی۔'' اس نے کہا۔ میں نے فون بند کر دیا۔ میں صاعقہ کی تلاش میں نکلا لیکن بہ ظاہر وہ نہیں تھی۔ میں کمرے میں آیا اور انٹر کام پر چار نمبر سے رابطہ کیا۔ صاعقہ کی آواز سنائی دی۔

''لیں۔''

''مجھے کرنل کا فون نمبر چاہیے۔''

''آپ ان کے موبائل پر فون کر لیں۔'' اس نے کرنل کا موبائل نمبر بتایا۔

میں واپس گیلری میں آیا اور کرنل کے موبائل کا نمبر ملایا

''کرنل اسپیکنگ۔'' جواب ملا ''ہواز دیئر۔''

''میں ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

میں نے کرنل کو آزاد صاحب اور رب نواز سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور اسے اپنے پلان کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا ''پلان تو اچھا ہے لیکن مجھے اس کی سیکیورٹی کے پہلو دیکھنے ہوں گے۔ آزاد کے دفتر کا پتا اور فون نمبر بتاؤ۔''

میں نے اسے پتا اور فون نمبر بتا دیا۔ ''اپنے کسی آدمی کو بھیجنے سے پہلے آزاد صاحب سے بات کر لیجیے گا۔ وہ صحافی ہیں اور ہیں بھی ذرا سر پھرے۔''

''ڈونٹ وری میں خود جاؤں گا۔'' کرنل نے جواب دیا ''تم آرام سے ہو۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔''

''نہیں میں آرام سے ہوں۔''

دن میں آرام کرنے کے بعد اب میں فریش تھا اور میرا موڈ ہو رہا تھا باہر جانے کا۔ مجھے رقم کی ضرورت تھی۔ کرنل نے مجھے پناہ فراہم کر دی تھی۔ وہ میرے لیے جو کر رہا تھا میں اس کا ہی مشکور تھا۔ ظاہر ہے رقم کے لیے کہتے ہوئے مجھے شرم آتی۔ میں نے خالہ بانو سے رابطہ کیا اور ان سے رقم کا کہا۔ وہ بولیں ''میاں یہاں آ جاؤ۔''

''میں نہیں آ سکتا۔ آپ ایسا کریں ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیں۔''

وہ چونکیں ''تم کیوں نہیں آ سکتے؟''

''خالہ اس میں خطرہ ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ دشمن نیلم ہاؤس کی نگرانی کر رہا ہے تاکہ میں وہاں آؤں اور پکڑا جاؤں۔''

''پھر تم بالکل مت آؤ۔'' وہ بولیں ''رقم کہاں بھیجوں؟''

اگرچہ کرنل نے کہا تھا کہ اس کا فون محفوظ تھا اور اس سے کی جانے والی کال ٹریس نہیں کی جا سکتی تھی لیکن یہ ممکن تھا اس فون پر ہونے والی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہو۔ میں ڈرائیور کو جس جگہ کا بتاؤں۔ وہاں دشمن کے چمچے پہلے سے موجود ہوں۔ میں نے سوچ کر کہا ''خالہ آپ ڈرائیور سے کہیں کہ وہ گاڑی لے کر نکلے اور شاہ فیصل کی طرف آئے۔ میں راستے میں کہیں اس سے رقم لے لوں گا۔ رقم چھوٹے تھیلے میں ہونی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے میاں۔ میں ابھی بھیجتی ہوں۔''

''نہیں ابھی نہیں۔ آپ ڈرائیور کو ٹھیک دس بجے بھجوایئے گا۔''

''ایسا ہی ہوگا میاں۔''

''شکریہ خالہ بانو۔ کیا نیلم کا فون آیا تھا۔''

''لو اس کا تو روز ہی فون آتا ہے۔ پگلی اتنی دور بیٹھ کر ہم ملازموں کی فکر میں دُبلی ہو رہی ہے۔''

''نیلم کے لیے آپ لوگ ملازم نہیں ہیں۔ خاص طور سے آپ کی حیثیت تو اس کے بزرگ کی سی ہے۔''

''ہاں، میاں اس نے عزت دے رکھی ہے ورنہ دیکھا جائے تو ہم ملازم ہی ہیں۔''

''فریال کیسی ہے اب؟''

''ٹھیک ہے۔ تم سے بات کر کے اس کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ کیا اسے بلاؤں؟''

''نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''بس اس کا خیال رکھیے گا۔''

''میاں میں کیا خیال رکھوں۔ جوان عورت ہے۔ ابھی بیوہ ہوئی ہے۔ اللہ اس کے لیے کوئی سبب بنائے۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ ابھی اسے پناہ چاہیے۔ اس کے دشمن اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

خالہ سے کچھ باتیں کر کے میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور صاعقہ سے رابطہ کر کے اسے کہا ''مجھے ایک بائیک چاہیے ہیلمٹ کے ساتھ۔''

''کیا آپ باہر جائیں گے؟'' اس نے کسی قدر ہچکچا کر پوچھا۔

''ہاں۔ ایک ضروری کام ہے۔''

''میں ابھی بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ وہ یقیناً کرنل سے اس کی اجازت لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر کرنل نے اجازت نہ دی تو میں ایسے ہی چلا جاؤں گا۔ ثبوت میں پہلے ہی کرنل کے حوالے کر چکا تھا مگر کچھ دیر بعد صاعقہ نے بتایا۔

''بائیک مل جائے گی۔''

''ایک ہیلمٹ بھی چاہیے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ظاہر ہے وہ بھی اس کے ساتھ ہی ہوگا۔'' وہ پہلی بار ہنسی۔

''شکریہ! میں کھانا نہیں کھاؤں گا اور ہو سکتا ہے رات مجھے واپسی میں دیر ہو جائے۔''

میں نو بجے نکلا تھا۔ ہیلمٹ کی وجہ سے میری شناخت ممکن نہیں رہی تھی۔ سردی کی شدت میں اضافے کی وجہ سے میں نے ہلکا سویٹر لے لیا تھا۔ جس کے نیچے بریٹا سائلنسر کے ساتھ بہ آسانی آ گیا تھا۔ صاعقہ نے مجھے اس کے اضافی میگزین بھی فراہم کر دیے تھے۔ ساڑھے نو بجے میں نیلم ہاؤس کے پاس تھا۔ میں نے اس کے چاروں طرف گھوم کر معائنہ کیا۔ بہ ظاہر کوئی مشکوک فرد یا گاڑی نظر نہیں آئی۔ سامنے والے فٹ پاتھ پر موجود فقیر برسوں سے یہاں موجود تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے نیلم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ایک کولڈ ڈرنک کارنر پر بائیک کھڑی کر دی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے کوک اور چپس کا پیکٹ لے لیا ابھی دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ٹھیک دس بجے نیلم ہاؤس کے گیٹ سے نیلم کی جہازی سائز مرسیڈیز برآمد ہوئی تھی۔ اس کے تاریک شیشوں کے عقب میں دیکھنا ممکن نہیں تھا مگر اس میں ڈرائیور ہی ہوگا۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی۔ ادائیگی میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ جیسے ہی مرسیڈیز میرے پاس سے گزری، میں نے

بائیں طرف واقع ایک گلی سے ہلکی نیلے رنگ کی جیپ کو تیزی سے نکل کر مرسیڈیز کے پیچھے جاتے دیکھا۔ میں اس کے پیچھے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ جیپ والے مرسیڈیز کا ہی تعاقب کر رہے تھے۔ مرسیڈیز کے ڈرائیور نے بھی کار کے تعاقب کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ اس نے بلا مقصد گلیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ جیپ والے مستقل مزاجی سے اس کے پیچھے لگے رہے تھے۔ یقین ہونے کے بعد میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اب تک میں موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس بند کر کے تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے بریٹا نکال لیا اور رفتار بڑھاتے ہوئے جیپ کے پاس جانے لگا۔ اس کے قریب جاتے ہی میں نے ہیڈ لائٹس روشن کیں اور جیپ کے دائیں طرف رہتے ہوئے اس کے بائیں طرف کے عقبی پہیے پر فائر کیا۔ سائلنسر کی وجہ سے گولی چلنے کی آواز نہیں آئی لیکن رات کے سناٹے میں جیپ کا ٹائر بم کی طرح پھٹا تھا۔ ٹائر برسٹ ہوتے ہی جیپ لہرا کر بائیں طرف دبتی چلی گئی اور میں رفتار بڑھا کر اس کے برابر سے گزر گیا۔ میں نے جیپ کو بائیں طرف فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک گھر کی دیوار سے ٹکراتے دیکھا۔ اس وقت جیپ کی رفتار خاصی کم تھی۔ اس کے ڈرائیور نے مہارت سے جیپ پر قابو رکھا تھا اور اسے الٹنے نہیں دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس میں سوار کسی شخص کو کوئی سنگین چوٹ نہیں آئی ہوگی۔

اب راستہ صاف تھا۔ دور دور تک کوئی اور گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ نیلم کا ڈرائیور صورت سے مجھے پہچانتا تھا۔ میری صورت دیکھتے ہی اس نے رفتار کم کر لی تھی۔ پوش علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر اسٹریٹ لائٹس موجود تھیں۔ اس وقت تک ہم جائے حادثہ سے خاصے دور نکل چکے تھے۔ مرسیڈیز ایک خالی پلاٹ کے ساتھ رکی اور میں نے بائیک اس کے اندر والے پہلو کے ساتھ لگا دی۔ ڈرائیور کی کھڑکی کا شیشہ نیچے ہوا اور مجھے اس کی جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ اس وقت مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔

''خالہ بانو نے جو پیکٹ دیا تھا۔ وہ مجھے دے دو۔''

''پیکٹ تو نہیں دیا۔'' ڈرائیور نے سادگی سے کہا۔

''تمہارا دماغ درست ہے۔'' میں نے برہمی سے کہا ''کیا تمہیں خالہ بانو نے نہیں بھیجا۔''

''بھیجا تو ہے جناب لیکن۔'' اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اسی لمحے مرسیڈیز کا عقبی دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکل کر بائیک پر میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں والہانہ پن تھا پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''چلو...... رقم میرے پاس ہے۔''

''فریال۔'' میں نے برہمی سے کہا ''تمہیں آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تم جاؤ۔'' اس نے ڈرائیور سے کہا ''رات بارہ بجے مجھے آرٹس کونسل کے دروازے سے پک کر لینا۔''

''جی بی بی۔'' ڈرائیور نے سر ہلایا۔ کھڑکی کا شیشہ واپس اوپر ہوا۔ مرسیڈیز بے آواز طریقے سے حرکت میں آئی اور آگے روانہ ہو گئی۔ فریال کا گداز وجود میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس نے تقریباً میرے کان میں کہا ''چلیں ناں۔''

''فریال تم باہر کیوں نکلیں۔ جب کہ تم جانتی ہو رب نواز کے کتے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔'' میں ابھی تک طیش میں تھا۔

''آپ سے ملنے کے لیے ہر خطرے سے گزر کر آ سکتی ہوں۔ اب چلیں ناں۔'' اس نے اپنے گداز وجود کو یوں میری پشت میں پیوست کیا کہ مجھے حرکت میں آنا ہی پڑا تھا۔

''آپ نہیں جانتے یہ دس دن میں نے کیسے گزارے ہیں۔''

''تم ذرا الگ ہو کر نہیں بیٹھ سکتیں۔'' میں نے نرمی سے کہا ''لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

''دیکھنے دیں۔ ایک تو اس طرح بیٹھنا مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ دوسرے میرا چہرہ آپ کی پشت پر ہے۔ کسی کی اتفاق سے بھی نظر نہیں پڑے گی۔''

''تم نے رات بارہ بجے ڈرائیور سے آنے کو کہا ہے۔ اس وقت تک ہم کیا کریں گے۔'' میں نے پوچھا۔

''تب تک میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ہم کھانا کھائیں گے اور تفریح کریں گے۔ میں ایک ایسے ریستوران سے واقف ہوں جہاں ہمیں بالکل تنہائی ملے گی پھر شالا مار چلیں گے۔''

میں نے دوبارہ ہیلمٹ پہن لیا تھا۔ ''یہ بے ایمانی ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی ''محبت میں سب چلتا ہے۔''

فریال مجھے ایک پُراسرار قسم کے ریستوران میں لے آئی۔ جہاں روشنی اتنی کم تھی کہ ہم بہ مشکل ایک خالی میز تک پہنچے۔ البتہ میز کے اوپر روشن فانوس سے ذرا بہتر روشنی ہو رہی تھی۔ فریال نے حلیہ بدل لیا تھا۔ اس نے پینٹ کے ساتھ اسکن فٹ جرسی کے اوپر نسبتاً ڈھیلا سا سویٹر لیا تھا۔ سر کے بال ایک جینڈ سے باندھ کر حال ہی میں ہونے والی بیوہ اور ایک بچے کی ماں کے بجائے کالج گرل لگ رہی تھی جو چوری چھپے کسی لڑکے کے ساتھ ڈنر پر آتی ہو۔ میں بہ غور اس کا معائنہ کر

رہا تھا وہ شرارت سے کھنکاری۔ پاس ہی ویٹر کھڑا تھا۔

میں نے خفیف ہو کر آرڈر نوٹ کرایا۔ اس کے جانے کے بعد فریال معنی خیز انداز میں بولی ''اگر مجھے دیکھنے کا اتنا ہی شوق تھا تو پہلے بتاتے۔ میں آپ کو کسی تیز روشنی والے ریستوران میں لے جاتی۔''

''آج تم بدلی بدلی سی لگ رہی ہو؟''

''صرف آپ کے لیے۔ ویسے یہ لباس میں نے آج ہی لیا ہے۔ کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''بہت اچھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''صرف اچھی؟'' اس کے لہجے میں سوال تھا۔

''اس سے زیادہ اور کیا لگ سکتی ہو؟'' میں نے اس سے نظریں چرائیں۔

''چندا آپ کو کیسی لگتی ہے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''فریال تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟''

''میں...... میں نہیں جانتی۔'' اس کے چہرے سے شوخی اور مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ ایک غم آلود تاثر پھیل گیا تھا۔ ''مجھے...... مجھے نہیں معلوم۔ مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' وہ یک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ مجھے ایسی معصوم اور نوعمر لڑکی لگی جو پہلی بار محبت میں گرفتار ہوئی ہو۔ حالانکہ وہ عورت تھی اور ایک پیارے سے بچے کی ماں تھی۔ دلنواز سے اسے کبھی محبت نہیں رہی۔ اس سے شادی ایک جبر کا نتیجہ تھی اور اس کے بچے کی ماں بننا فریال کی مجبوری تھی۔ شاید وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ تبھی اس کی موت پر میں نے فریال کو غم زدہ نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کچھ کہا نہیں۔ تھوڑی دیر میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ پرس سے ٹشو لے کر اس نے چہرہ صاف کیا۔ اس نے سوائے ہلکی سی لپ اسٹک کے کوئی میک اپ نہیں کیا تھا اس لیے چہرہ اور صاف نظر آنے لگا تھا۔ میری نظریں محسوس کر کے وہ جھینپ گئی ''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟''

میں ہنسا ''کبھی صبح کی شبنم میں دھلے کنول کو دیکھا ہے۔ بس ایسی ہی لگ رہی ہو۔''

''آپ کی یہ باتیں مجھے خوش فہم کر دیتی ہیں۔''

''حالانکہ یہ عام سی بات ہے۔ میں مرد ہوں اور جو تمہارے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو لیکن ان معنوں میں نہیں جن میں تم چاہتی ہو۔''

''کیوں؟'' اس کے لہجے میں شدت کا اصرار تھا ''کیا مجھ میں کوئی کمی ہے۔ میں آپ کے معیار پر پوری نہیں اترتی، بتائیں کیا بات ہے؟''

''بات تمہاری نہیں ہے۔ تم بلا شبہ لاکھوں میں ایک ہو۔ چاہے جانے کے قابل ہو۔ انسان دنیا میں بے شمار چیزوں اور لوگوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ سب اس کے نہیں ہو سکتے ہیں۔ تم نے مجھے متاثر کیا ہے لیکن دل میں جو مقام ہے وہ میں پہلے ہی چندا کو دے چکا ہوں۔''

''کیا مجھے...... کہیں...... کسی کونے کھدرے میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔'' اس کی آواز دوبارہ بھیگنے لگی۔

اسی لمحے ویٹرز ڈشیں لے آئے اور میز پر سجانے لگے۔ اس نے جلدی سے خود پر قابو پا لیا۔ جب ویٹر چلے گئے تو اس نے کھانا نکالنا شروع کیا۔ کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا۔ وہ بے دلی سے کھا رہی تھی۔

''کھانا صحیح سے کھاؤ۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''بابا۔ کھانے سے کیا ناراضی؟''

''کھا تو رہی ہوں۔'' اس نے اب کسی قدر ٹھیک سے کھانا شروع کیا۔

کھانے کے بعد واش روم سے واپس آ کر میں نے کافی کا پوچھا۔ اس نے کہا ''نہیں، یہاں نہیں۔ کہیں اور چل کر پیتے ہیں۔''

''پھر میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''جہاں میں رہ رہا ہوں۔''

وہ بائیک پر اس بار خواتین کے انداز میں بیٹھی تھی۔

''ویسے نہیں بیٹھو گی؟''

''نہیں۔'' اس کے لہجے میں ناراضی تھی۔

''کوئی دیکھ لے گا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ لے۔''

''اگر تمہیں دیکھ کر کوئی پیچھے لگا تو میں مارا جاؤں گا۔''

اس نے کچھ کہا نہیں لیکن پہلے کی طرح پیچھے بیٹھ گئی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نہ جانے اسے سردی لگ رہی تھی یا کوئی اور بات تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں اسے کرنل کے بنگلے تک لایا۔ صاعقہ برآمدے میں مل گئی اس نے سوالیہ نظروں سے فریال کی طرف دیکھا۔

''یہ میری دوست ہیں۔'' میں نے تعارف کرایا ''فریال۔''

''نائیس ٹو میٹ یو۔'' صاعقہ شائستگی سے بولی اور پھر

مجھ سے کہا "کرنل کا آپ کے لیے فون آ چکا ہے۔"

"کیا میرے کمرے میں کال ٹرانسفر کی جا سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

"بس تو کرنل سے کال ملا کر ٹرانسفر کر دیں اور ذرا اچھی سی کافی بنوا دیں۔"

"میں ابھی بھجواتی ہوں۔" صاعقہ نے کہا۔

میں فریال کو لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ فریال نے بہ ظاہر کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

"اس بنگلے کی منیجر ہے۔" میں نے سوئٹر اتار کر کرسی پر ڈالا اور بستر پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"ایک منٹ۔" فریال نے نیچے بیٹھتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں اتارتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے منع کرتا اس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے میرے جوتے کے فیتے کھولنا شروع کر دیے۔

"فریال یہ چیز مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔"

"لیکن مجھے تو اچھی لگ رہی ہے۔" اس نے چہرے پر آنے والے بالوں کو پیچھے دھکیلا۔

میں جھنجلاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے اسے یہاں لا کر غلطی کی تھی۔ تنہائی ملتے ہی وہ اپنے حربوں پر اتر آئی تھی۔ اس نے جوتے اتار کر موزے بھی اتارے اور نرمی سے میرے پاؤں کی انگلیوں کو سہلانے لگی۔ اس کی انگلیوں میں سرور انگیزی لہرا رہی تھی۔ جو میرے پاؤں میں منتقل ہونے لگی۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا "ہیلو۔"

"باس سے بات کیجیے۔" صاعقہ کی آواز آئی اور اس نے کرنل سے رابطہ کرا دیا۔

"ناصر میں آزاد صاحب کے پاس بیٹھا ہوں۔ ان کی تسلی کرا دو۔"

"جی انہیں فون دیں۔" میں بولا۔

"ارے میاں۔ یہ کس چکر میں ڈال دیا۔ ہم پہلے ہی دردی کے ڈسے ہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے "یہ صاحب ہماری حفاظت پر کمر بستہ ہیں۔"

"آزاد صاحب انہیں میں نے ہی بھیجا ہے۔ کرنل شبیر ایک معروف سیکیورٹی ایجنسی کے بانی ہیں اور خود بھی ان معاملات میں ماہر ہیں۔ آپ ان سے تعاون کریں۔ تاکہ کل کی تقریب بہ خیر و خوبی انجام پا سکے۔"

"اچھا میاں۔" انہوں نے سرد آہ بھری "تم کہتے ہو تو ان سے بھی تعاون کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ ورنہ بھروسا سوائے اللہ کے کسی پر نہیں ہے۔"

"اللہ نے تدبیر کرنے سے منع نہیں کیا ہے۔"

فون کرنل نے لے لیا۔ "یہ کس جھکی کے پاس بھیج دیا ہے۔" وہ ہنس کر بولا "ایک گھنٹے میں بلڈ پریشر ہائی کر دیا ہے اس آدمی نے۔"

"خوب گزرے گی آپ دونوں کی۔" میں بھی ہنسا فریال نے فرش پر قالین پر بیٹھے بیٹھے میرے زانو پر سر رکھ دیا تھا۔

"بائی دی وے یہ تمہارے ساتھ لڑکی کون ہے؟"

"یہ..... یہ میری دوست ہے۔" میں ذرا بوکھلا گیا۔

"دیکھو میاں دوست ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں ان چکروں کا قائل نہیں ہوں۔"

میں نے خفت محسوس کی۔ "آپ بے فکر رہیں۔ یہ صرف دوست ہی ہے۔"

فریال نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دی تھی پھر وہ اچانک پلٹ کر سر میرے زانو سے ٹکا کر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے نہ جانے کب سوئٹر اتار دیا تھا اور یہ پوز نہایت خطرناک تھا۔

"وش یو گڈ لک۔" کرنل نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے فون رکھ کر فریال کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔ اسکن فٹ جرسی نے اس کے جسمانی خدوخال کو بے حد واضح کر دیا تھا۔

"یہ تم نے کس قسم کا لباس پہنا ہے؟"

"آپ کو اچھا نہیں لگا۔"

میں نے گہری سانس لی "فریال مجھے عورت کا اس طرح اپنی تشہیر کرنا کبھی اچھا نہیں لگا۔ عورت کی کشش ہی ڈھکے چھپے رہنے میں ہے۔"

"اچھا۔" وہ بجھ گئی تھی "میں..... میں سمجھی کہ میں آپ کو اچھی لگوں گی۔"

"تم اتنی اچھی ہو کہ تمہیں اچھی لگنے کے لیے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اٹھو جاؤ کوئی کافی لے کر آنے والا ہو گا۔ سوئٹر پہن لو۔ میں نہیں چاہوں گا کوئی تمہیں اس عالم میں دیکھے۔"

وہ پھر مسکرانے لگی "آپ کو اچھا نہیں لگے گا کہ کوئی مجھے دیکھے۔" وہ ہر بات کو گھما پھرا کر اسی طرف لے آتی تھی۔ واقعی اگر عورت ضد پر آ جائے تو اپنے مقصد کے لیے سب کر گزرتی ہے۔ مجھے ان ساس بہو کے ساتھ رہ کر اس بات کا اچھی طرح

تجربہ ہو گیا تھا مگر فریال کا انداز شائستہ سے بالکل مختلف تھا۔ شائستہ نے صرف اپنے حیوانی جذبات کی تسکین چاہی تھی جبکہ فریال سرتاپا میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی تھی اگرچہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اس کا نہیں ہو سکتا۔ میں چندا کا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوشش کر رہی تھی۔ اپنے وجود کی نزاکتوں اور خوبصورتی سے مجھے متاثر کرنا چاہتی تھی۔ میری بات پر اس نے بادل ناخواستہ سوئٹر پہنا۔ حالانکہ وہ اس میں بھی اچھی لگ رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے بدن کی کشش سے اپنی طرف متوجہ کر لے گی اور میری محبت حاصل کر لے گی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کس قدر خفا ہے۔

کافی صاعقہ خود لے آئی تھی۔ اس نے ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھی اور کافی بنانے لگی تھی کہ فریال نے اسے روک دیا۔

"تم جاؤ۔" اس نے رکھائی سے کہا "کافی میں بنا لوں گی۔"

صاعقہ نے اس لہجے پر اسے چونک کر دیکھا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ فریال نے میرا غصہ اسی پر اتار دیا تھا۔ حالانکہ صاعقہ مختلف طرح کی لڑکی تھی۔ اس نے اب تک مجھ سے ایک فاصلہ رکھا تھا۔ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود فریال کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ اسی گھر میں رہ رہی تھی جہاں میں تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے کافی بنائی اپنے لیے تھوڑی سی کافی میں ڈھیر ساری کریم ملائی تھی۔ میں ہلکی شکر کے ساتھ سادہ کافی لیتا ہوں۔ میرے لیے اس نے ایسی ہی بنائی تھی۔

"ڈاکٹر نے مجھے کافی منع کی ہے۔" اس نے وضاحت کی "ہاں........ آپ کا ساتھ دینے کے لیے تھوڑی سی لے رہی ہوں۔"

مجھے یاد ہے۔ اس نے بتایا تھا۔ بچے کو فیڈنگ پرابلم کی وجہ سے وہ کافی اور چائے سے پرہیز کرتی ہے۔ میں نے کافی رکھ دی۔ "تم مت پیو۔ میں بھی نہیں پیتا۔"

"نہیں آپ پئیں۔" اس نے اصرار کیا "میں جانتی ہوں۔ آپ کھانے کے بعد کافی کے عادی ہیں۔"

"فریال میں عادی ہونے سے ڈرتا ہوں۔ اگر تم کافی کو میری عادت سمجھ رہی ہو تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔"

"میں تو آپ کو چندا کا بھی عادی سمجھتی ہوں۔"

"وہ میری عادت نہیں محبت ہے۔" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

فریال کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا "تم بچے کو کیسے چھوڑ آئیں۔ کیا وہ خالہ بانو سے بہل جائے گا۔"

"میں اسے فیڈ کرا کے اور سلا کے آئی تھی۔ باقی خالہ دیکھ لیں گی۔ وہ بہت اچھی ہیں مجھ سے محبت سے پیش آتی ہیں۔"

"تمہیں وہاں سب اچھے ملیں گے۔ ابھی تم نیلم سے نہیں ملی ہو۔ رئیس میرا دوست ہے۔ چندا ہے، کمال ہے، میری بہن قمر ہے۔ ان سب سے تمہیں ڈھیر ساری محبتیں ملیں گی۔"

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں اسے سب کی نہیں صرف میری محبت کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے نظریں چرا لیں پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا "چلیے مجھے چھوڑ آیئے۔"

"ابھی تو ساڑھے دس بجے ہیں۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"آپ فون کر کے ڈرائیور کو جلدی آنے کا کہہ دیں۔"

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ "فریال تم ایک سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔"

"نہیں سایہ میرے آگے ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "میں نے آپ کے آگے خود کو سستا کر لیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم میری مجبوری سے واقف ہو۔"

میں نے باہر آ کر نیلم ہاؤس فون کر کے ڈرائیور کو لبرٹی مارکیٹ میں ایک مخصوص جگہ آنے کو کہا۔ فون کر کے میں واپس آیا۔ تو وہ اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ میں نے نرمی سے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

"کیوں آنسو ضائع کر رہی ہو؟"

"بس آخری بار۔" اس نے سرگوشی کی "ایک بار مجھے پیار کر لیں پھر میں کچھ نہیں مانگوں گی۔ کوئی فرمائش نہیں کروں گی۔ پلیز۔" اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا۔

بادل ناخواستہ میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ وہ روتے روتے مسکرانے لگی تھی۔ عجیب عورت تھی لمحوں میں اس کے تاثرات بدل جاتے تھے پھر میں چونک کر اس سے الگ ہو گیا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا "میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں۔ ناصر عظیم یا شاہ عالم اور مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں لیکن کبھی ضرورت پڑی تو اپنی جان بھی آپ پر قربان کر دوں گی۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے اپنے بچے کے لیے۔"

باہر سردی کی شدت بے پناہ ہوگئی تھی۔ صحیح معنوں میں سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں نے بائیک کے بجائے وہاں پورچ میں کھڑی کار میں جانے کے بارے میں سوچا۔ صاعقہ سے کہا "مجھے کار کی ضرورت ہے۔"

"لے جائیں۔ وہ میری ہے۔"

"اوہ معاف کرنا مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں آپ لے جا سکتے ہیں۔" اس نے فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے فریال اس کے ساتھ خاصا نامناسب سلوک کر چکی تھی۔ اس کے پاس سوزوکی مارگلہ تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی اچھی خاصی تنخواہ تھی یا اس کے علاوہ بھی اس کا کوئی ذریعۂ آمدنی تھا۔ کار دو سال پرانی تھی لیکن نہایت احتیاط سے استعمال کی گئی تھی۔ اس کی حالت بہترین تھی۔ راستے میں فریال خاموش سی تھی۔ میں نے لبرٹی کے اس سپر اسٹور کے سامنے کار روکی۔ یہاں میں نے نیلم کے ڈرائیور کو آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ میں نے فریال سے کہا "شاپنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ سے کہا تھا کہ میں اب آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔"

میں نے اس کی طرف جھک کر کہا "اور اگر میں اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہوں تو؟"

وہ کسمسائی "آپ کی مرضی۔"

"تو چلو اترو۔" میں نے چابی نکالی۔

ہم شاپنگ سینٹر میں آئے۔ یہ دو منزلہ عمارت اندر سے خوش گوار حد تک گرم تھی۔ وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے اس کے بے شمار شعبے تھے۔ پہلے ہم پرفیوم کے شعبے میں آئے۔ یہاں ایک سے ایک اور اعلیٰ سے اعلیٰ پرفیوم اور عطر موجود تھے۔ میں نے وہاں موجود سیلز گرل سے خواتین کے لیے خاص پرفیوم دکھانے کو کہا۔

"ایک چیز ہے تو، ابھی آئی ہے لیکن کاسٹلی ہے۔"

"قیمت کی فکر نہ کریں۔ چیز دکھائیں۔" میں نے جواب دیا۔

لڑکی نے ایک گلاس ڈور کھسکایا اور اس کے عقب میں غائب ہوگئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بیضوی شکل کی ایک بوتل تھی۔ جس کے ساتھ ربر کا ملائم گول سا اسپرے تھا۔ اس نے نوزل فریال کی طرف کرتے ہوئے اسپرے دبایا۔ اندر بھرا نیلگوں سیال پھوار کی صورت میں اس پر پڑا۔ شروع میں تو کچھ محسوس ہی نہیں ہوا لیکن پھر ایک عجیب سی سحر انگیز خوشبو پھیلنے لگی جو دم بہ دم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کسی سحر کی طرح پھیل رہی تھی اور حواسوں پر طاری ہو رہی تھی۔ لڑکی مسکرائی "کیسی لگی یہ خوشبو۔"

میں چونکا "ان کی طرح لاجواب۔" میں نے فریال کو دیکھا "اسے پیک کر دیں۔"

"اس کی قیمت ....."

"جو بھی قیمت ہو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "بعض چیزوں اور بعض جذبوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔"

لڑکی ایک خوبصورت کیس لائی جو غالباً اس پرفیوم کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں شیشی مع اپنے اسپرے بال کے آرام سے آ گئی تھی پھر لڑکی نے کمپیوٹر سے پرائس سلپ نکال کر دی۔ اس پر پندرہ ہزار سات سو لکھا تھا۔ میں نے اسے سولہ ہزار کے نوٹ دیے اور فریال کے ساتھ چل پڑا۔

"بقیہ واپس لیتے جائیں۔" لڑکی نے عقب سے پکارا۔

"اس خوشبو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔" میں نے مڑے بغیر کہا۔

شاپنگ سینٹر میں جیولری شاپ بھی تھی اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ونڈو میں رکھے ہوئے ایک ہار کو دیکھ کر رک گیا۔ ہلکے نیلے پتھروں کا بنا یہ ہار اس خوبصورتی سے بنایا گیا تھا کہ اس پر سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ میں نے فریال سے کہا "تمہارے گلے میں یہ کیسا لگے گا؟"

"آپ یہ دلائیں گے۔" اس نے خوشی سے کہا "لیکن یہ تو بہت قیمتی ہے۔"

"ہاں لیکن ساری دنیا کے پتھر مل کر بھی تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتے۔"

"نہیں آپ اسے چندا کے لیے لیں۔"

"فریال یہ مجھے تمہارے لیے پسند آیا ہے۔ چندا کے لیے نہیں۔" میں نے اسے بازو سے پکڑا "آؤ۔"

وہ کھنچی چلی آئی۔ سچویشن محسوس کر کے وہاں موجود سیلز گرل مسکرانے لگی تھی۔ میں نے اس سے مطلوبہ ہار دکھانے کو کہا جب لڑکی ہار لینے لگی تو فریال نے آہستہ سے کہا "میں نہیں لوں گی۔ میں اس کی حقدار نہیں ہوں۔"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا نہیں میرا کام ہے۔"

"کیوں؟" اس کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ "کیا میری کوئی مرضی ..... کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سارے فیصلے آپ کے ہی

چلیں گے۔"

شاپ میں موجود لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ فریال خود پر قابو پاتے ہوئے بولی "پلیز! اسے منع کر دیں مجھے یہ ہار نہیں چاہیے۔"

"فریال۔ میں ہار لینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اگر تم نے نہیں لیا تو میں اسے پھینک دوں گا۔" اس وقت مجھے بھی ضد سی سوار ہوگئی تھی۔" اتنے میں سیلز گرل ہار نکال کر لے آئی۔ میں نے اس سے لے کر اسے فریال کے گلے میں پہنایا۔ اس نے خلافِ توقع مزاحمت نہیں کی تھی۔ ہار واقعی اس کی گردن میں سج رہا تھا۔ سیلز گرل حیران رہ گئی تھی۔ "میرے خدا..... یہ تو جیسے ان کے لیے ہی بنا ہے۔"

"یہ میرے لیے نہیں ہے۔" فریال نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"اس کی سلپ بنا دیں۔"

میرے بارگیننگ نہ کرنے پر لڑکی کھل گئی تھی۔ اس نے پھرتی سے سلپ بنا کر دی۔ یہ خاص نیلم کا بنا ہار تھا۔ جس کی قیمت پونے تین لاکھ تھی۔ بارگیننگ کرنے پر شاید یہ ڈھائی لاکھ تک ہو جاتا۔ میں نے اسے نقد ادائیگی کر دی۔ لڑکی نے خوشی خوشی ہار کا باکس پیک کر کے دیا۔ فریال کا موڈ کسی قدر بہتر ہو گیا تھا۔ وہ پہلی بار مسکرائی تھی اور سرگوشی میں بولی "شکریہ۔"

اس کے بعد جو ہوا وہ مجھے آج بھی خواب کی طرح یاد ہے۔ اچانک جیولری شاپ کا شیشے کا دروازہ کھلا اور اس میں تین افراد اندر آئے۔ ان کے چہرے نقابوں تلے چھپے تھے اور ہاتھوں میں خود کار اسلحہ تھا۔ ایک نے اندر گھستے ہی ہوائی برسٹ مارا۔ اوپر لگے شیشے اور ایک فانوس کے ٹکڑے ہر طرف بکھر گئے تھے۔ شاپ میں اس وقت تین چار ملازموں کے ساتھ دس بارہ افراد اور بھی تھے۔ مرد عورت خوف سے چیخنے لگے۔ ایک نقاب پوش نے گرج کر کہا۔

"خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔" پھر اس نے ایک تھیلا وہاں موجود لڑکی کی طرف پھینکا۔ سارے زیورات اس میں بھر دو۔"

لڑکی نے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے تھیلا سنبھالنے کی کوشش کی مگر تھیلا نیچے گر گیا۔ اس نے نیچے جھک کر تھیلا اٹھانا چاہا تو نقاب پوش جانے کیا سمجھا۔ اس نے بے دردی سے پورا برسٹ اس کاؤنٹر پر چلا دیا جس کے عقب میں لڑکی تھی۔ وہ لمحوں میں چھلنی ہو کر رہ گئی تھی۔ نقاب پوش نے رائفل کا رخ کیش کاؤنٹر پر مامور نوجوان مرد کی طرف کر دیا اور سفاک لہجے میں بولا "تھیلا بھر دو۔"

لڑکا زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے لپک کر مردہ لڑکی کے نیچے سے تھیلا نکالا۔ جو اب خون آلود بھی ہو رہا تھا۔ یہی لڑکی چند لمحے پہلے اچھا کمیشن ملنے پر کتنا خوش تھی۔ نہ جانے کس گھر کی کفیل تھی۔ جو اپنی راتوں کی نیند قربان کر کے یہاں کھڑی تھی۔ اس کے مرنے پر فریال نے میرے سینے پر منہ رکھ دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ نقاب پوش نے باقی لوگوں کو منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ اس کے ساتھی نے جا کر کیش دیکھا۔ اس میں بس میری دی ہوئی رقم تھی۔ غالباً کچھ دیر پہلے ہی رقم شاپنگ سینٹر کے سیف روم میں گئی تھی۔ اس نے وہ رقم نکال کر اپنی جیبوں میں رکھ لی پھر لوگوں کی طرف آیا۔

"سب اپنی اپنی پاکٹس خالی کر دیں جلدی اور اگر کسی نے چالاکی سے کچھ بچانے کی کوشش کی تو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

مردوں نے جلدی سے اپنے پرس سامنے پھینک دیے اس نے انہیں بھی تھیلے والے کی طرف اچھال دیا۔ اس کے بعد عورتوں کے پرسوں کی باری آئی۔ اس کے حکم پر عورتوں نے پرس فرش پر الٹ دیے۔ اس نے جلدی جلدی اس میں سے نقدی اور قیمتی اشیا سمیٹیں۔ اس کے بعد زیورات کی باری آئی تھی۔ وہاں آنے والی سب ہی خواتین نے بادلِ ناخواستہ اپنے زیورات بھی اتار کر پھینک دیے۔ سخاً وہ نقاب پوش فریال کی طرف متوجہ ہوا۔ "اے! کیا اپنے یار کی بغل میں چھپی ہے! زیور اتار۔"

"فریال ہار اتار دو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں نہیں دوں گی۔" اس نے جواب دیا "یہ آپ کا تحفہ ہے۔"

"ایسے کئی تحفے میں تمہیں دے دوں گا۔ ہار دے دو۔ اس پر خون سوار ہے۔"

شاپنگ سینٹر میں سائرن کی آواز گونج رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکا مارنے والے ..... یہ احمق فرار کہاں سے ہوں گے۔ باہر نہ صرف شاپنگ سینٹر کے گارڈز بلکہ پولیس بھی ان کی منتظر ہوگی۔ میں فریال سے ہار اتارنے کے لیے کہہ رہا تھا اور وہ انکار کر رہی تھی۔ نقاب پوش کا صبر جواب دے گیا۔ وہ لپکا اور فریال کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "زیور اتار حرامزادی۔"

فریال نے تڑپ کر اسے تھپڑ مارا۔ یہ سب اتنی تیزی

سے ہوا کہ میں اسے روک بھی نہیں سکا۔ نقاب پوش ذرا پیچھے ہٹا اس کی آنکھیں یک دم سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک فحش گالی دیتے ہوئے رائفل سیدھی کی۔ اس کے عزائم بھانپتے ہوئے میں پہلے ہی فریال کی آڑ میں اپنا بریٹا نکال چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ نقاب پوش ٹریگر دباتا میں نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا۔ گولی اس کے ماتھے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ پٹ سے نیچے گرا۔ دروازے پر کھڑا اس کا تیسرا ساتھی چونکا لیکن اس سے پہلے ہی میں اسے بھی شوٹ کر چکا تھا۔ اوپر تلے کئی گولیاں اس کے سینے اور پیٹ میں اتر گئی تھیں۔ زیورات جمع کرنے والا جو غالباً اس وقت دوسرے نقاب پوش سے نمٹ رہا تھا۔ فریال نے اسے برسٹ مارتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تڑپ کر سامنے آ گئی۔ جب وہ کراہ کر مجھ پر گری تو مجھے معلوم ہوا۔ میرے لیے آنے والی گولیاں اس نے اپنے جسم پر روک لی تھیں۔ مجھے بچتے دیکھ کر نقاب پوش نے پھر فائر کرنا چاہا لیکن اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر دہشت کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''خدا کے لیے......'' اس نے گھگھیا کر کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میں اسے گولی مار چکا تھا۔ ایک جنون کے عالم میں اس کے پاس جا کر جان کنی کی کیفیت میں مبتلا نقاب پوش پر میں نے بقیہ میگزین خالی کر دیا۔

فریال کاؤنٹر کے سہارے نیم دراز تھی۔ اس کے سینے سے کئی جگہ سے خون ابل رہا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ ''فریال میری جان یہ کیا کیا؟''

''میں...... میں نے کہا تھا ناں۔'' وہ مسکرائی ''آپ کے لیے...... جان...... بھی...... دے...... دوں گی۔''

''نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''بس ایک...... با...... بار...... کہہ دیں۔ آپ...... کو...... مجھ سے...... محبت ہے۔ ایک بار۔''

''ہاں...... محبت ہے۔'' میں نے بلا جھجک کہا ''مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔''

''میرے...... بچے کا خیال رکھیے گا۔ وہ صرف میرا بیٹا ہے۔ اسے رب نواز کی اولاد...... مت...... مت۔'' اس کی سانس اکھڑنے لگی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ اسے اپنی اولاد کی طرح رکھوں گا۔''

''یہ ہار چندا کو دیجیے...... گا۔'' اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ زندگی تیزی سے اس کے ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی ''یہ اس کا حق ہے۔''

''نہیں یہ تمہارا ہے۔''

''پلیز...... چندا...... کو...... منا...... ضرور...... دے گا۔'' اس کی آواز ڈوبنے لگی ''مجھے...... ایک بار اور...... پیار کریں۔''

دھندلائی آنکھوں سے میں نے اس کے لبوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ اس نے ایک بار جھٹکا لیا اور ساکت ہو گئی۔ مجھے احساس نہیں تھا لیکن میرے ساتھ وہاں موجود ہر فرد ہی رو رہا تھا پھر کسی نے مجھے سنبھالا۔ فریال کی لاش کو میرے بازوؤں سے جدا کر کے اسے چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ زندگی اور حرارت سے بھرپور ایک وجود تھا۔ جواب سوائے سرد مٹی کے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اسے مٹی میں مل جانا تھا۔ کسی نے مجھے پانی دیا تو میرے حواس بحال ہوئے تھے۔ میں کسی کمرے میں بیٹھا تھا۔ شاید شاپنگ سینٹر کے منیجر کے کمرے میں۔

''آئی ایم رئیلی سوری۔'' اس نے ندامت سے کہا ''ہمارا تو صرف مالی نقصان ہوا ہے لیکن آپ کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے۔ آئی ایم رئیلی سوری۔''

میں خاموش رہا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ میں چکر میں آ گیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس آ جائے گی اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی۔ بے شک ان تین ڈکیتوں کو مار کر میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن میرے پاس موجود بریٹا غیر قانونی تھا۔ میں نے منیجر سے کہا ''مجھے ایک کال کرنی ہے۔''

''شوق سے کریں۔'' اس نے فون کی طرف اشارہ کیا ''لیکن اگر آپ کسی سورس کو فون کر رہے ہیں تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہمارے بھی تعلقات ہیں۔ ہم اپنے معزز کسٹمر کو پریشانی میں نہیں ڈالیں گے۔ آپ کی وجہ سے تو ہمارا بہت بڑا نقصان ہونے سے بچ گیا۔ ڈسپلے میں ستر اسی لاکھ روپے مالیت کے زیورات تھے اس سے بھی زیادہ بڑا احسان آپ نے ہمارے کسٹمرز کو لٹنے سے بچا کر کیا ہے۔ پولیس کو یہی معلوم ہوگا کہ ان تینوں نے جیولری شاپ میں ڈکیتی مارنے کی کوشش کی اور ہمارے گارڈز کے ہاتھوں مارے گئے اس سے پہلے انہوں نے فائرنگ کر کے ایک سیلز گرل اور ایک کسٹمر خاتون کو ہلاک کر دیا تھا۔''

''لیکن وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے۔'' میں اب پوری طرح خود پر قابو پا چکا تھا۔

''ان میں سے اب کوئی شاپنگ سینٹر میں نہیں ہے۔ میں نے کہا ناں۔ اپنے معزز کسٹمرز کو پریشانی سے محفوظ رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔''

''لیکن موت کے آگے آپ بھی بے بس ہیں۔'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔

''درست فرمایا آپ نے۔'' اس نے گہری سانس لی ''آپ کافی یا چائے پینا پسند کریں گے۔''

میں کافی کہنے جا رہا تھا کہ مجھے فریال کی بات یاد آ گئی۔ ''نو تھینکس۔ اب میں جانے کی اجازت چاہوں گا۔''

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ آپ اپنی وائف کی ڈیڈ باڈی نہیں لیں گے۔''

''وہ میری بیوی نہیں تھی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں تھی اور شاید بہت کچھ تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اس سے میرا ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ آپ اس کی لاش نیلم ہاؤس بھجوا دیں۔ اداکارہ نیلم۔ یہ اس کی مہمان تھی۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''ایز یو وش لیکن کیا آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گے؟''

''مجھے ناصر شاہ کہتے ہیں۔ امید ہے آپ مجھ سے میرا شناختی کارڈ طلب نہیں کریں گے۔''

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر مسکرایا ''اوکے۔ بلکہ میں سمجھوں کہ ناصر شاہ نام کا کوئی شخص آج شاپنگ سینٹر میں آیا ہی نہیں......''

''شکریہ۔'' میں نے کہا ''مجھے میرا پستول اور وہ ہار دے دیں جو فریال کے گلے میں ہے۔''

''خاتون کا نام فریال ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کمرے سے باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد دونوں چیزیں لے آیا۔ میں نے بریٹا کمر میں لگایا اور ہار ایک لمحے کے لیے ہاتھ میں رکھا نہ جانے یہ میرا وہم تھا یا حقیقت مجھے اس میں فریال کی مہک محسوس ہوئی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے منیجر کی اجازت سے نیلم ہاؤس کا نمبر ملایا۔

''میں ناصر بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے خالہ کی آواز سن کر کہا۔

''فریال کہاں ہے؟ اس کا بچہ رو رہا ہے۔''

''فریال۔'' میں نے بے خیالی میں کہا ''اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔''

''کیا بول رہے ہو۔ اسے بھیجو۔'' وہ جھنجلائیں۔

''خالہ بچے کو کسی طرح سے بہلائیں۔ فریال نہیں آئے گی۔ وہ مر چکی ہے۔''

''تمہارا دماغ درست ہے۔ کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔'' خالہ چلائیں۔

''یہ حقیقت ہے۔ شاید آج رات کسی وقت پولیس نیلم ہاؤس سے رابطہ کرے گی۔ فریال کی لاش حوالے کرنے کے لیے۔ اب اس کی تدفین آپ نے ہی کرنی ہے۔''

خالہ بلند آواز میں رونے لگی تھیں۔ میں نے فون بند کر دیا۔ ''پلیز! آپ ڈیڈ باڈی کا بندوبست کر دیجیے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' منیجر نے جواب دیا۔

میں بوجھل دل کے ساتھ باہر آیا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا۔ کار میں نے پارکنگ سے نکالی اور بے مقصد انداز میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ مجھے اب یقین نہیں آ رہا تھا۔ محض ایک گھنٹے پہلے میں اور فریال ایک ساتھ تھے اور اب اکیلا تھا۔ کل اسے منوں مٹی میں دبا دیا جاتا اور پھر ایک آدھ مہینے بعد قبر میں اس کا ڈھانچا ہی رہ جاتا۔ وہ خوب صورت بدن جو دیکھنے والوں کے ہوش اڑا دیتا تھا۔ جسے چھونے کو دل مچلتا تھا۔ مٹی میں مل جائے گا۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ میں کہاں کہاں سے ہوتا صبح چار بجے واپس کرنل کے بنگلے تک پہنچا۔ صاعقہ کو جاگتا پا کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔''

میں نے نہیں پوچھا اسے کس بات کا افسوس تھا۔ مجھے واقعی آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اعصاب جیسے ٹوٹنے کے قریب تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ نیند مشکل سے آئے گی۔ میں نے صاعقہ سے پوچھا۔

''کیا کوئی سلیپنگ ٹیبلٹ ہے۔''

''میں دیتی ہوں۔'' اس نے کہا اور مجھے ایک گولی لا دی۔ اسے میں نے پانی کے ساتھ نگل لیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے بدلے بغیر محض جوتے اتار کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اسی بستر پر چند گھنٹے پہلے فریال بیٹھی تھی۔ میں نے چادر کی سلوٹوں پر ہاتھ پھیرا۔

شاہ عالم بننے کے بعد میں نے بے پناہ قتل و غارت گری دیکھی تھی۔ میرے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنے لوگ مارے گئے تھے لیکن میں نے فریال کا سا دکھ کسی کی صورت میں محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے سچ مچ میرے دل میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ وہ میرا قرب چاہتی تھی لیکن جائز طریقے سے۔ شائستہ یا شبنم کی طرح اسے صرف جسم کی بھوک سے غرض نہیں تھی۔ نہ جانے کب میں سو گیا اور جب اٹھا تو سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ دن کے تین بج رہے تھے گویا میں کوئی دس گھنٹے سوتا رہا تھا۔ ایسی کیفیت بے وقت سونے کا

نتیجہ تھی۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا۔ کچن سے رابطہ کر کے کھانے کے لیے کوئی ہلکی چیز لانے کو کہا اور اس کے بعد کافی کے ساتھ چین کلر مانگی۔ انڈے کے سادہ سینڈوچز چائے کے ساتھ مزے کے لگے۔ اس کے بعد اسپرین اور کافی نے مجھے خاصی حد تک چست کر دیا تھا۔ فریال کی موت کا صدمہ کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اب میں اس قابل تھا کہ اپنے مسائل پر سوچ سکوں۔ میں نے کرنل سے رابطہ کیا۔

''اب مزاج کیسے ہیں؟'' کرنل نے پوچھا ''مجھے بھی اس لڑکی کا افسوس ہوا ہے۔''

''آزاد صاحب کے دفتر کی حفاظت کا انتظام ہو گیا۔'' میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

''ہاں! تم ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ جانا۔ باقی معاملات وہیں سے طے کرنا۔''

''ثبوت آپ لے کر آئیں گے۔''

''ہاں۔ وہ میں لے کر آؤں گا۔ رب نواز سے اب اس بنگلے سے بات مت کرنا۔''

''خیریت۔ یہاں کے فون محفوظ ہیں ناں؟''

''ہاں لیکن احتیاط اچھی ہوتی ہے۔''

کرنل سے بات کر کے میں نے تسلیم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ خالہ بانو ذرا دیر سے آئیں۔ وہ دل گرفتہ تھیں۔

''میاں، اب میں اس ننھی سی جان کا کیا کروں۔ جسے اپنی ماں کی تلاش ہے۔''

''خالہ، بہت سارے بچوں کی مائیں انہیں جنم دیتے ہی مر جاتی ہیں لیکن وہ زندہ رہتے ہیں۔ ویسے فریال کی آخری رسومات کب ہوں گی؟''

''ملازم اسے لے کر گئے ہیں دفنانے۔'' خالہ پھر رونے لگیں۔

''خالہ اس کے بچے کا خیال رکھیے۔ اب وہ ہمارے خاندان کا ایک حصہ ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

پانچ بجے تک میں تیار ہو کر بنگلے سے روانہ ہو گیا تھا۔ موج دین کے مارے جانے پر ایک دو دن کے لیے شہر کی رونقیں ماند ہو گئی تھیں لیکن اب لاہور دوبارہ لاہور نظر آ رہا تھا۔ کل ہی اس شہر میں ایک عورت بھی ماری گئی تھی لیکن وہ غیر اہم تھی۔ اس کا دنیا میں سوائے ایک شیر خوار بچے کے کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا اس لیے شہر کی صحت پر اس کی موت کا کوئی اثر بھی نہیں پڑا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے میں آزاد صاحب کے دفتر میں تھا۔ دفتر بڑا ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ اخبار ترقی کر رہا تھا۔ ان کا اخبار سچائی کا ترجمان تھا۔ اس لیے سرکاری اشتہاروں کے بغیر بھی ترقی کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دفتر کی عمارت کے اندر اور باہر سادہ لباس میں گارڈز بکھرے ہوئے تھے جو ہر آنے جانے والے کا عقابی نظروں سے معائنہ کر رہے تھے۔ فی الحال ان کے ہتھیار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑنے پر ان کے ہاتھوں میں لمحے بھر میں اسلحہ آ جائے گا۔

آزاد صاحب خلاف معمول سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے دفتر کے کونے میں لکڑی کے پارٹیشن کی مدد سے اپنا دفتر الگ بنوا لیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ بھی دوسرے عملے کے ساتھ ایک ہی ہال میں بیٹھا کرتے تھے۔ شبنم نے درمیان میں اخبار میں خاصی تبدیلیاں کی تھیں۔ نہ جانے اب ان کا کیا حال ہوا تھا۔ البتہ مجھے کئی نئے چہرے اور نوجوان کام کرتے نظر آئے۔ اندر آنے سے پہلے ایک زمانے میں شبنم کا دست راست اور پرستار بوبی ٹکرایا تھا۔ نہ جانے اس کا نام کیا تھا لیکن بوبی کی عرفیت سے مشہور تھا۔ اچھا بھلا خوش شکل نوجوان تھا مگر خود کو ہونق بنائے رکھتا تھا۔ شاید یہ اس کا کور تھا۔ صحافی اور خاص طور سے رپورٹر صورت سے جتنا احمق اور سادہ نظر آئے اتنا ہی کامیاب رہتا ہے۔

''آؤ میاں۔'' آزاد صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا ''دیکھتے ہیں آج تمہاری ذات سے کیا ہنگامے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔''

''کل والے واقعے کی آپ کو اطلاع مل چکی ہوگی؟''

انہوں نے سر ہلایا تھا۔ ''ظاہر ہے ورنہ ہم صحافی کس کام کے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس ناہنجار کو اطلاع کر دی۔''

''رب نواز کو...... نہیں ابھی کرنی ہے۔'' میں نے فون اپنی طرف کھسکایا۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے مگر میرے خیال میں ذرا جلدی فون کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ رب نواز فون کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

''رب نواز میں آزاد صاحب کے دفتر میں بیٹھا ہوں۔'' میں نے بلاتمہید کہا ''تم چندا کو ساتھ لے کر روانہ ہو جاؤ۔ دفتر تو تم نے دیکھا ہے ناں؟''

''ہاں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔''

''پہلے تم چندا سے میری بات کراؤ۔''

''تھوڑی دیر رکو۔'' اس نے کہا اور غائب ہو گیا۔ کوئی دس منٹ بعد کسی نے ریسیور اٹھایا اور ایک ہلکی سی آواز آئی۔

''ہیلو...... کون۔''

میرا دل دھڑکا ''چندا...... یہ میں ہوں۔''

''شاہ عالم۔'' اس نے آہستہ سے کہا ''تم...... شاہ عالم ہی ہو ناں۔ تم ٹھیک ہو؟''

''تم کیسی ہو چندا۔ انہوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ چندا جواب دیتی رب نواز نے اس سے فون لے لیا ''ہاں شاہ عالم، اب بتاؤ کیا ضمانت دے رہے ہو؟''

''میری ضمانت آزاد صاحب ہیں۔'' میں نے کہا ''اگر چاہو تو ان کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو ورنہ میں یہیں بیٹھا ہوں یہ اسی وجہ سے کہہ رہا ہوں تم شک نہ کرو کہ میں نے کسی اور سے بات کرا دی ہے۔''

''تم فون رکھو۔'' رب نواز نے فرمائش کی میں نے فون رکھا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجی۔ اس بار آزاد صاحب نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہاں...... ہم بول رہے ہیں...... کہاں سے...... میاں اپنے ہی منہ سے بول رہے ہیں...... آپ کہاں سے گویا ہیں۔'' کہہ کر آزاد صاحب بچے کی طرح ہنسے۔ ''ہاں یہیں ہیں اپنے شاہ عالم صاحب مگر کوئی حماقت نہ کرنا۔ ورنہ ہماری ضمانت از خود منسوخ ہو جائے گی۔ شاہ عالم کی امانت لاؤ اور اپنی امانت لے جاؤ...... اور ہاں پولیس کا خیال بھی ذہن میں مت لانا۔ بے شک شاہ عالم قتل کے مقدمات میں مفرور ہے لیکن تمہاری گردن میں پھندا ٹائی کی طرح فٹ ہے۔ بس ذرا کھینچنے کی دیر ہے۔ لو میاں اب تم بات کرو۔'' انہوں نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

''رب نواز میرا خیال ہے تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی؟''

''میں صرف اپنی ضمانت پر مطمئن ہونے والا شخص ہوں۔'' اس نے شکی لہجے میں کہا ''لیکن ابھی میں مجبور ہوں۔''

''رب نواز ٹھیک سات بجے تمہیں اس دفتر میں ہونا ہے۔ ورنہ میں نکل جاؤں گا اور اگر کوئی مشکوک فرد اس عمارت کے ارد گرد بھی نظر آیا تو تمہارے لیے بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔''

''تو کیا تمہیں نقصان نہیں ہوگا۔'' اس نے طنز کیا ''یہ لڑکی تمہارے لیے اہم نہیں ہے کیا؟''

''اہم ہے۔ تبھی تو میں تمہارے ثبوت اس کے بدلے واپس کر رہا ہوں لیکن اسے نقصان پہنچانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ آزاد صاحب اس معاملے سے آگاہ ہو چکے ہیں اور انہیں سچ چھاپنے سے کوئی حکومت نہیں روک سکتی۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔''

''بے فکر رہو۔'' اس بار اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی ''کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔''

''رب نواز مجھے تمہاری ضمانت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے زور بازو پر بھروسا کیا ہے۔ تم پر وہی اعتماد کر سکتا ہے جو عقل سے بالکل پیدل ہو۔''

فون بند کر کے میں نے آزاد صاحب کی طرف دیکھا۔ جو مسکراتے ہوئے اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے ''میاں تم نے تو ہمیں بانس پر چڑھا دیا۔ اب ہم اتنا بھی سچ نہیں چھاپتے۔''

''میں جانتا ہوں مگر رب نواز کو دھمکانے میں کیا حرج تھا۔''

''ہاں حرج تو کوئی نہیں تھا لیکن کیا حرج ہوتا اگر تم ہم سے مرحومہ چلبلی کی تعزیت کر دیتے۔'' انہوں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''فی الوقت تو مجھے اپنی فکر ہے۔ نہ جانے کل کو میری تعزیت کون کرے گا۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ وقت قریب آنے کے ساتھ میرے اندر اندیشے اور امید کی جنگ بھی بڑھ رہی تھی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ رب نواز اتنی آسانی سے مان جانے والوں میں سے ہے۔ اس کی مثال کتے کی دم کی سی تھی۔ جو بارہ سال نلکی میں رہے تو نلکی بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اس کا اتنی آسانی سے چندا کو میرے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جانا میری سمجھ سے باہر تھا۔ ممکن ہے اسے چندا کی اہمیت کا علم نہ ہو۔ اس کے نزدیک چندا محض ایک عورت ہو جس کے لیے میں اس کے خلاف ثبوت واپس کر رہا ہوں۔ وہ مجھے شاہ عالم کے پیمانے پر پرکھ رہا تھا۔ شاہ عالم ایک خود غرض شخص تھا۔ جس کے نزدیک صرف اپنے مفاد کی اہمیت تھی۔ کوئی بھی فرد اس کے لیے اہم نہیں تھا۔ اسے صرف اپنی ذات سے محبت تھی۔ رب نواز اس شاہ عالم سے اچھی طرح واقف تھا۔ لہٰذا اسے خیال آنا مشکل تھا میں صرف چندا کی ذات کے لیے اس کے خلاف سارے ثبوت اسے واپس کر رہا تھا۔

''کہاں کھو گئے میاں۔ وقت ہونے والا ہے۔'' آزاد صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پانچ منٹ باقی تھے۔ ابھی سات بجنے میں۔ دفتر کے افراد آنے والے حالات سے بے خبر اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ البتہ اخبار کے دفتروں والی مخصوص بھیڑ بھاڑ وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ غالباً آج آزاد صاحب نے فالتو لوگوں کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ میں نے اندر کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دفتر پہلے فلور پر تھا اور مین روڈ کی

طرف تھا۔ یہ علاقہ دفاتر پر مشتمل تھا اور شام چھ بجے کے بعد عام طور سے سنسان ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی سڑکوں پر رش نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اِکاّ دُکاّ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ابھی تک کوئی گاڑی عمارت کے سامنے نہیں رکی تھی۔ میری بے قرار نظریں دونوں طرف دیکھ رہی تھیں۔

وہ سیاہ رنگ کی کار اتنی خاموشی سے آ کر عمارت کے سامنے رکی کہ مجھے خاصی دیر سے پتا چلا۔ کار دیکھتے ہی میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ ہو نہ ہو اس میں وہی نمائندہ ابلیس رب نواز تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کار کا عقبی دروازہ کھلا اور رب نواز بڑے طمطراق سے اس میں سے برآمد ہوا۔ اس نے کاٹن کا سفید شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس پر سیاہ واسکٹ اور اس کے سر پر طرے دار پگڑی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کہنا دشوار تھا کہ اس نے چند ہفتے پہلے اپنے جوان بیٹے کو مٹی دی ہے۔ اس کی بیوی گھر سے غائب ہے۔ اس کی بہو اور پوتے کو دشمن اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ وہ پُرغرور انداز میں قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔

مجھے تشویش ہونے لگی۔ چندا اس کے ساتھ نہیں تھی پھر وہ کہاں تھی کیا کار میں..... اور کس کے ساتھ؟ میں نے سادہ لباس والوں کو خاموشی کے ساتھ کار کو گھیرے میں لیتے دیکھا۔ ایک شخص کان پر ہاتھ رکھے کسی سے بات کر رہا تھا۔ شاید کرنل شبیر کے آدمیوں کا آپس میں مواصلاتی رابطہ تھا اس قسم کی ڈیوائس بازار میں عام مل جاتی ہے۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے آلات کو بے حد مختصر کر دیا ہے۔ رب نواز دفتر کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس نے ٹھہری ہوئی نظروں سے وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا اس کا ایک ہاتھ کرتے کی جیب میں تھا جس میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا۔ گھومتی ہوئی اس کی نظر مجھ پر آ کر رکی اس کی نگاہوں میں شعلہ سا بھڑکا تھا۔ شاید یہی کیفیت میری تھی۔ میں نے اپنے گرم ہوتے ہوئے لہو کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ اتنے میں آزاد صاحب اپنے کمرے سے نکلے۔

''جناب رب نواز صاحب۔'' انہوں نے پُرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا اور دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھائے۔ مجبوراً رب نواز کو بھی اپنا ہاتھ جیب سے نکالنا پڑا ''کہیے آج کیسے زحمت کی اس خانہ خراب میں۔''

رب نواز نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ ''کچھ پرانا حساب کتاب ہے۔''

''حساب واقعی بڑھتا جا رہا ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا ''لیکن تمہاری طرف رب نواز۔''

''آپ دونوں اندر آ جائیں۔ یہاں بیچ میدان میں گفتگو ذرا نامناسب رہے گی۔'' آزاد صاحب بولے۔

میں اور رب نواز آزاد صاحب کے کمرے میں آ گئے۔

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا ''چندا کہاں ہے؟''

''پہلے میرے ثبوت دکھاؤ۔''

''ثبوت ابھی آ رہے ہیں۔''

''تو چندا بھی آ رہی ہے۔'' رب نواز نے اطمینان سے کہا۔ میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دھوکا کیا تھا۔ میں نے یک دم پسٹل نکال کر رب نواز پر تان لیا۔ ''مجھے معلوم تھا تم دھوکا کرو گے۔''

رب نواز کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔ ''تم جلد بازی کر رہے ہو شاہ عالم۔'' میرے پسٹل نکال لینے سے آزاد صاحب بھی پریشان نظر آنے لگے۔ ''میاں یہ کیا کر رہے ہو۔ مذاکرات کی میز پر توپ نکال رہے ہو۔''

''آزاد صاحب۔ یہ باتوں سے ماننے والی شے نہیں ہے۔ بولو چندا کہاں ہے؟''

''نیچے گاڑی میں ہے۔'' رب نواز آہستہ سے بولا۔ ''میرے دو ساتھی ہیں۔ چندا بھی گاڑی میں ہے۔''

میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''اس بات کا کیا ثبوت ہے؟''

رب نواز نے جیب سے ایک موبائل فون نما آلہ نکالا اور اس کا بٹن دبا کر بولا ''ایک منٹ کے لیے لڑکی کا چہرہ دکھاؤ۔'' پھر اس نے اسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا ''جا کر دیکھ لو۔''

میں باہر کھڑکی تک آیا۔ کار کا عقبی شیشہ نیچے ہوا اور اس میں سے چندا کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بالکل چندا لگ رہی تھی پھر شیشہ واپس اوپر چلا گیا۔ میں واپس آیا۔ صورت تو چندا جیسی ہے لیکن میک اپ سے کسی لڑکی تو ایسا حلیہ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے میری چندا سے بات کراؤ۔''

رب نواز نے ذرا دیر سوچ کر آلہ دوبارہ اپنی جیب سے برآمد کیا ''لڑکی سے بات کراؤ۔''

اور پھر آلہ میری طرف بڑھا دیا ''چندا۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''شاہ عالم۔'' اس کی آواز آئی۔

''تم......تم چندا ہی ہو ناں؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ آواز بالکل چندا کی سی تھی۔

رب نواز ہنسا ''لو جناب، آج کل عاشق معشوق ایک

دوسرے کو نہیں پہچان پاتے ہیں۔''

میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے چندا سے پوچھا ''تم نے شائستہ کو کس بات پر مارا تھا؟''

''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔'' اس نے حیرت سے کہا ''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہیں اس کی زبان کھلوانی تھی۔ رب نواز کے خلاف ثبوت چاہیے تھے۔''

''خان جی کی سالگرہ کس دن ہوتی ہے؟''

''بارہ اگست کو۔'' اس نے فوراً کہا ''لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تھینکس گاڈ۔'' میں نے دل سے کہا ''چندا بس کچھ دیر کی بات ہے پھر تم میرے پاس ہو گی۔''

آلہ میں نے رب نواز کی طرف بڑھا دیا۔ ''اب میں مطمئن ہوں۔''

اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالی اور اسے طلائی لائٹر سے سلگایا۔

''اب میری تسلی بھی کراؤ۔'' اس نے دھواں فضا میں اگلا۔

میں نے فون اپنی طرف کر کے کرنل کا موبائل نمبر ملایا ''کرنل آپ کہاں ہیں؟''

میں نے دیکھا رب نواز کرنل کے لفظ پر چونکا تھا۔ کرنل نے جواب دیا ''بس پہنچنے ہی والا ہوں۔ کیا رب نواز آ گیا؟''

''آ گیا ہے اور آپ کے فراق میں تڑپ رہا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''وہ ایڈیٹ اپنے خلاف ثبوتوں کے لیے تڑپ رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے آدمی چاروں طرف پھیلا دیے ہیں۔ ان کی طرف سے اب تک مجھے کوئی نیگیٹو رپورٹ نہیں ملی۔ چندا کہاں ہے؟''

''نیچے سیاہ رنگ کی گاڑی کھڑی ہے۔ اس میں ہے۔''

''کیا تم مطمئن ہو۔ میرا مطلب ہے وہ چندا ہی ہے ناں۔''

''ہاں، میں مطمئن ہوں۔ میں نے اس سے بات بھی کی تھی۔''

''گڈ، میں بس پہنچ گیا ہوں۔'' کرنل نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے رب نواز کی طرف دیکھا ''تمہاری امانت بھی پہنچنے والی ہے لیکن تبادلہ اسی دفتر میں ہو گا۔''

اس نے سر ہلایا ''ہاں بہ شرط یہ کہ میں ثبوتوں سے مطمئن ہو گیا۔''

''تمہیں مطمئن ہونا پڑے گا۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

اس نے دوبارہ سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ کہا نہیں۔ میں بے چینی سے کرنل کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آ چکا تھا اور شاید نیچے اپنے آدمیوں سے رپورٹ لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رب نواز بھی اب کسی قدر فکر مند نظر آنے لگا تھا اس کا ہاتھ دوبارہ جیب کی طرف چلا گیا تھا۔ جس میں کوئی مہلک ہتھیار تھا۔ میں بالکل تیار تھا اگر اس نے ہتھیار نکالنے میں کوئی دھوکا کرنے کی کوشش کی تو میں اس کے سر میں سوراخ کرنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا۔ خدا خدا کر کے کرنل نمودار ہوا اس نے حسب معمول عام سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے رب نواز کو دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا تم مطمئن ہو۔ یہ کوئی دھوکا تو نہیں کرے گا۔''

''میں سانپ یا بچھو پر اعتبار کر سکتا ہوں لیکن رب نواز پر نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا ''لیکن فی الوقت اس کی گردن پھنسی ہوئی ہے۔''

کرنل نے سر ہلایا اور اپنے لباس سے نکال کر ایک پیکٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ رب نواز نے شعلہ فشاں نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''شاہ عالم یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ چندا کو میں نے اپنے پاس رکھا۔ اسے دوسری پارٹی مانگ رہی تھی لیکن میں نے اسے ان کے حوالے نہیں کیا اور تم یہ ثبوت دوسروں کو دکھاتے پھر رہے ہو؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب میرے اعتماد کے لوگ ہیں اور مجھ پر احسان نہ جتاؤ۔ اگر تم چندا کو بھی ان کے حوالے کر دیتے تو مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے تمہارے پاس کیا رہ جاتا۔'' میں نے طنز کیا ''یہ لو انہیں چیک کر لو۔ میں نے ان میں سے کسی چیز کی کاپی نہیں بنائی ہے اور نہ ہی کچھ اپنے پاس رکھا ہے۔''

''میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اگر تم نے کچھ رکھ لیا ہے تب بھی میں یقین کرنے پر مجبور ہوں ورنہ جس طرح تم مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتے اسی طرح میں تم پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''مجھے اپنی سطح پر مت رکھو۔ اگر میں تمہاری سطح پر آیا تو تم یہاں سکون سے نہ بیٹھے ہوتے۔ قبر یا کال کوٹھری میں پڑے ہوتے۔''

''رب نواز معمولی آدمی نہیں ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر پُرغرور مسکراہٹ نمودار ہوئی ''میرے خلاف کچھ کرنے سے

پہلے دشمن سو مرتبہ سوچتا ہے پھر بھی کرنے کی ہمت نہیں کرتا ہے۔ دشمن پالنا ہمارا خاندانی شوق ہے اور دشمنی نبھانا ہماری روایت ہے۔"

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ اس کے سر سے غرور کا سودا اب تک نہیں نکلا تھا۔ اس کے خیال میں، میں اس سے ڈر گیا تھا اور اسی وجہ سے میں یہ ثبوت کسی عدالت میں پیش کرنے کی جرائت نہ کر سکا تھا۔

"باتیں کرنے کے بجائے بہتر ہوگا۔ تم یہ سب دیکھ لو۔" کرنل نے اسے خشک لہجے میں مشورہ دیا۔ رب نواز نے گہری سانس لی۔

"اس کا کوئی فائدہ تو نہیں ہے لیکن تم کہتے ہو تو میں یہ کام کر لیتا ہوں۔" اس نے پیکٹ اپنی طرف کھینچا۔ اس پر سے ٹیپ اتار کر اس نے لفافہ کھولا اور ذرا آڑ میں ہو کر اندر رکھی ہوئی چیزیں دیکھنے لگا۔ مرحوم دلاور شاہ نے بڑی محنت سے اس کے خلاف یہ سارا مواد جمع کیا تھا اور اس سے فائدہ اٹھائے بغیر ہی اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سب میرے ہاتھ آ گیا تھا اور آج میرے کام آ رہا تھا۔ رئیس ان سب ثبوتوں کی نقول اور فوٹو کاپیز رب نواز کو پہلے ہی پارسل کر چکا تھا۔ اس لیے رب نواز کے لیے یہ سب کچھ نامانوس نہیں تھا اس کے باوجود انہیں دیکھتے اور معائنہ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے یہی شخص کتنے غرور سے دشمنیاں پالنے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سب سمیٹ کر واپس لفافے میں ڈالا۔ اچانک کرنل کے ہاتھ میں ریوالور نظر آنے لگا تھا۔

"خبردار! اپنے ہاتھ دور رکھو۔ میز پر۔"

"یہ کیا حرکت ہے۔ کون ہے یہ شخص شاہ عالم؟" رب نواز نے غصے سے پوچھا۔

"میں بھی نہیں جانتا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "لیکن بہتر ہوگا۔ تم اس کی بات پر عمل کرو۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار ہے۔"

کرنل نے ذرا آگے ہو کر لفافہ واپس کھینچ لیا۔ اس پر رب نواز نے احتجاج کرنا چاہا تو کرنل نے کہا "پہلے تم لڑکی کو یہاں بلاؤ۔ جس طرح تم نے اپنی تسلی کی ہے۔ اسی طرح ہم بھی اپنی تسلی کریں گے۔ تب ہی تبادلہ عمل میں آئے گا۔"

رب نواز کچھ دیر تک مارے طیش کے ہونٹ چباتا رہا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے رابطے کا آلہ نکالا اور دھاڑ کر بولا "لڑکی کو اوپر لاؤ لیکن کسی پوائنٹ پر کسی نے ذرا سی غلط حرکت کی تو اس کا بھیجا اڑا دینا۔"

"رب نواز یہ غلط ہے۔" میں نے اضطراب سے کہا "تم صحیح نہیں کر رہے ہو۔"

"صحیح تو میرے ساتھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔"

میں نے کھڑکی میں آ کر دیکھا۔ کار سے ایک شخص چندا کے ساتھ اترا تھا۔ اس کا ہاتھ عین چندا کی کمر پر تھا جس میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا اور اس نے چندا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ چندا یوں سر جھکائے چل رہی تھی جیسے مکمل طور پر بے بس ہو گئی ہو۔ مجھے اس پر حیرت تھی۔ ورنہ ایک دو آدمیوں کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ شاید اس کے ساتھ قید میں ظلم ہوا تھا۔ اس کی حالت درست نہیں لگ رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے ہلکا سا لڑکھڑا بھی رہی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں کمرے کی طرف پلٹ گیا۔ عین اسی لمحے میری نظر ایک شخص پر پڑی یہ کچرا اٹھانے والا ڈبا لے کر اندر آ رہا تھا۔ اس نے اپنا ڈبا درمیان میں رکھا اور سارے ڈسٹ بن اٹھا اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا۔ وہ کچرا اٹھانے والا تھا۔

کچھ دیر بعد چندا دفتر کے ہال کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ شخص بدستور اس کے عقب میں تھا۔ کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ بعض نے چندا کو دلچسپی سے دیکھا اور بس...... کسی کو احساس نہیں ہوا کہ اس کی کمر میں پستول کی نال تھی۔ جو اس سے انچ بھر کے فاصلے پر تھی۔ چندا نے سر جھکا رکھا تھا۔ دھکیلنے پر وہ بادلِ ناخواستہ آگے بڑھی۔ میں نے اشارے سے اس طرف بلایا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی پھر میری طرف آنا چاہا لیکن رک گئی۔ غالباً اس شخص نے آگے آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ رب نواز نے کمرے سے نکل کر اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاصا اسمارٹ سا نوجوان تھا لیکن اس کے چہرے پر درشتی اور سفاکی تھی۔ جیسے وہ ذرا سی غلط حرکت پر چندا کو شوٹ کر دے گا اور اس معاملے میں ذرا سی رعایت نہیں دے گا۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔

ہم سب کمرے میں آئے جو اتنے افراد کے آنے سے تنگ ہو گیا تھا۔ رب نواز نے طنزیہ لہجے میں کہا "لو جی اپنا مال چیک کر لو۔ اس کا سب کچھ فٹ فاٹ ہے۔"

"چندا تم ٹھیک ہو۔ انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی ہے۔"

"نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے اطمینان کی طویل سانس لی تھی۔ اگر چندا کو کوئی نقصان ہوا ہوتا تو وہ اس طرح سکون سے نہ کھڑی ہوتی۔ بلکہ شاید زندہ بھی نہ ہوتی۔ رب نواز نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا اب میں اپنا مال لے سکتا ہوں۔"

میں نے اشارہ کیا اور کرنل نے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا جو اس نے فوری طور پر برقی ڈسٹ میں ڈال دیا جب شبنم نے دفتر کا انتظام سنبھالا تھا تو اس نے اخبار میں دفتری نوعیت کے جدید آلات بھی متعارف کرائے تھے۔ ان میں یہ برقی ڈسٹ بن بھی تھا۔ اس میں کوئی بھی کاغذ کی چیز ڈالی جائے تو یہ اسے لمحوں میں جلا کر راکھ کر دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رب نواز کے خلاف سارے ثبوت جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر پھر وہی پُرغرور اور فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے اپنے ساتھی کو چندا کو چھوڑنے کو کہا۔ آزاد ہوتے ہی چندا دوڑتی ہوئی میرے عقب میں آ گئی تھی۔

"شاہ عالم۔ اب ہمارا حساب برابر ہو گیا لیکن آئندہ مجھ سے کسی رعایت کی توقع مت رکھنا۔"

"تم نے پہلے بھی میرے ساتھ رعایت نہیں کی ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "تم رعایت کرنے والے شخص بھی نہیں ہو۔ مجھ سے بھی اس شرافت کی امید مت رکھنا۔"

"یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کون کس کے ساتھ رعایت کرتا ہے اور کون شرافت دکھاتا ہے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا اور جھٹکے سے مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا ساتھی بھی اس کے عقب میں روانہ ہو گیا۔ ہم میں سے کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کرنل نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا "سب کلیئر ہے" دوسری طرف سے جواب دیا گیا وہ میں نہ سن سکا تھا۔ غور سے دیکھنے پر کان کے عقب سے ایک پتلا سا تار نکل کر اس کے کالر میں جا رہا تھا اور قمیص کے کالر سے ایک ننھی سی سیاہ شے جھانک رہی تھی۔ یہ یقیناً مائک تھا۔ جس کے ذریعے کرنل کا اپنے آدمیوں سے رابطہ تھا۔ وہ لوگ بلاشبہ جدید انداز میں کام کر رہے تھے۔ "او کے انہیں جانے دو۔" پھر اس نے ہماری طرف دیکھا "میرے آدمیوں نے رب نواز کی کار سے ایک ڈیوائس لگا دی ہے۔ وہ جہاں جائے گا ہمیں علم ہوتا رہے گا۔"

"یہ آپ نے اچھا کام کیا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"چلو میاں۔ یہ تقریب بھی بہ خیر و خوبی انجام کو پہنچی۔"

آزاد صاحب نے سکون کا سانس لیا اور اسی لمحے کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے دیواریں مجھ پر آن گری ہوں اور فی الوقت ایسا ہی ہوا تھا لکڑی کی وہ دیواریں جن سے یہ کمرا بنایا گیا تھا۔ دھماکے سے ہم پر آ گری تھیں۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں چیخ مار کر میز کے نیچے گھس گیا تھا۔ بے شمار چیزیں گرنے اور لوگوں کی چیخ و پکار سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے زلزلہ آ گیا ہو پھر مجھے چندا کا خیال آیا۔ میں نے چیخ کر اسے آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ میری ٹانگ پر کوئی وزنی شے گری ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں ہلنے سے قاصر تھا پھر میں نے کرنل

کی آواز سنی۔ جو چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو بلا رہا تھا۔ یہ ایک معروف دفتری عمارت تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی وہاں لوگوں کا ہجوم ہوگیا تھا پھر کرنل کے آدمی آ گئے۔ انہوں نے پیشہ ورانہ انداز میں امدادی کارروائی کی اور سب سے پہلے کمرے کا ملبہ ہٹایا۔ میں بہ مشکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جس جگہ ایک خوبصورت اور معروف اخباری دفتر تھا اب وہاں سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں تھا۔ ہر طرف ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا ڈھیر تھا۔ ہال کے وسط میں فرش میں سوراخ ہوگیا تھا۔ دیواروں پر جابجا خون کے لوتھڑے اور انسانی جسموں کے ٹکڑے چپکے تھے۔ بم نے کئی انسانی جسموں کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ دو افراد سنگین حد تک زخمی تھے ایک کا بازو شانے پر سے غائب تھا اور دوسرے کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر آ گئی تھیں۔ لوگ انہیں اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح چندا کی تلاش میں تھا۔ ملبے تلے سے کرنل اور آزاد صاحب صحیح حالت میں نکل آئے تھے لیکن چندا ابھی تک غائب تھی۔ میں چیزیں ہٹا کر ادھر اُدھر کر رہا تھا۔ معاً میرے ہاتھ میں ایک پیر آ گیا۔ بلاشبہ یہ نسوانی پیر تھا۔ میں نے پیر کھینچا تو ملبے تلے سے جسم نمودار ہونے لگا۔ یہ چندا ہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی سوٹ تھا جو اس نے مجھ سے بچھڑتے ہوئے پہنا ہوا تھا۔ میں نے ملبا ہٹایا تو اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ سینے کے بل گری تھی اور اس کا چہرہ ایک ہی صورت میں پشت کی طرف آ سکتا تھا۔ جب اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں نے دیوانوں کی طرح باہر جانے کی کوشش کی۔ کسی نے مجھے روکنا چاہا۔ میں نے اسے دور جھٹک دیا پھر کئی افراد مجھ سے چمٹ گئے۔ آزاد صاحب چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

"میاں ہوش کرو۔ یہ وقت ہوش کا ہے۔"

میں چلا چلا کر رب نواز کو قتل کرنے کا اعلان کر رہا تھا۔ اگر تین چار آدمیوں نے مجھے قابو نہ کر رکھا ہوتا تو میں فلمی ہیرو کی طرح پیدل ہی رب نواز کے تعاقب میں روانہ ہو جاتا۔ اس وقت میں جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ دھماکا رب نواز نے کروایا تھا۔ وہ کمینہ آدمی پہلے سے منصوبہ بنا کر آیا تھا۔ اگر وہ اس وقت میرے ہاتھ آ جاتا تو میں بلاشبہ اس کی گردن مروڑ دیتا مگر میرے اس جنون کو کرنل کے ایک جھٹکے نے ختم کر دیا۔

"یہ...... یہ چندا نہیں ہے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ کرنل چندا کے مردہ جسم کے پاس بیٹھا تھا لیکن وہ چندا کہاں تھی۔ کرنل اس کی گردن سے کوئی جھلی نما شے الگ کر رہا تھا۔ یہ ماسک تھا۔ جب اس نے ماسک اتارا تو بالوں سمیت چندا کا چہرہ اس کے چہرے سے اتر گیا۔ نیچے سے ایک اجنبی اور معمولی صورت شکل کی لڑکی برآمد ہوئی۔ بس اس کی جسامت چندا کے مشابہ تھی۔ ماسک اتار کر کرنل نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ "یہ چندا نہیں ہے۔ رب نواز نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔"

چندا کے زندہ ہونے کی خبر نے میرے جسم میں جیسے دوبارہ زندگی دوڑا دی تھی مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ چندا بدستور رب نواز کے قبضے میں ہے۔ میں نے سر جھٹکا۔

"اس نے مجھے چندا کی آواز سنائی تھی۔"

"ہاں وہ چندا ہی ہوگی۔" کرنل اٹھ کھڑا ہوا۔ "مگر کہیں اور...... رب نواز نے چالاکی سے کام لیا۔ تمہارا یا کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔"

میرے ذہن پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ اسی لمحے آزاد صاحب کے کمرے میں موجود فون کی گھنٹی بجی۔ اتفاق سے وہ صحیح سلامت رہا تھا اور اس کا ریسیور کریڈل پر تھا۔ آزاد صاحب نے اپنے چہرے پر آیا خون صاف کرتے ہوئے فون ریسیو کیا اور پھر تلخی سے بولے "ہاں زندہ ہیں۔ نطفۂ نا تحقیق۔"

میں نے لپک کر ان سے فون چھین لیا۔ دوسری طرف رب نواز تھا۔ میں نے اسے ایک سے ایک گالیاں دی تھیں وہ ہنستا رہا پھر اس نے کہا "شاہ عالم دلنواز کے مرنے پر میں نے قسم کھائی تھی کہ تجھے اور تجھ سے متعلق ہر شخص کو عبرت کا نشان بنا دوں گا۔"

"چندا کہاں ہے؟" میں نے دھاڑ کر کہا۔

"آہستہ میری جان۔ میں بہرا نہیں ہوں۔ تمہاری چاندنی بیگم میرے پاس ہے اور آج رات میں اس کے شفاف بدن کی چاندنی......" میں اسے پھر گالیاں دینے لگا اور بے معنی دھمکیوں سے نوازنے لگا۔ آخر میں رب نواز نے پُرغرور قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔ میں نے سر تھام لیا تھا۔ کرنل نے میرا شانہ تھپکا تھا۔

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ینگ مین۔"

"تو اور کیا کروں۔" میں نے تلخی سے کہا "اب ہمارے پاس رہا ہی کیا ہے چندا کو بچانے کے لیے وہ ثبوت تو رب نواز اپنے ہاتھ سے جلا چکا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے برخوردار۔" کرنل کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے غور سے اسے دیکھا۔

کرنل کی مسکراہٹ قائم تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے لباس سے ایک لفافہ برآمد کیا۔ ویسا ہی لفافہ جس میں وہ ثبوت لایا تھا جو رب نواز جلا کر خاکستر کر چکا تھا اور جب بات میری سمجھ میں آئی تو میں اچھل پڑا۔

"آپ نے رب نواز کو غلط لفافہ دیا تھا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا اور یہ میری ذمے داری تھی کہ چندا تم تک پہنچے ورنہ یہ ثبوت بھی اس کو نہ ملیں۔ اگر وہ دھوکے بازی نہ کرتا اور یہ گھناؤنی حرکت نہ کرتا تو میں کل خود یہ لفافہ اسے پارسل کر دیتا مگر اب......"

"واہ میاں تم نے کمال کر دیا۔" آزاد بولے "اب دیکھنا ہم اس کی کیسی ایسی کم تیسی کرتے ہیں۔ اس کی دُم میں اخبار کا نمدہ بنا کر نہ فٹ کیا تو ہمارا نام ابوبکر آزاد نہیں۔"

"میرا خیال ہے تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔" کرنل نے کہا "اس سے پہلے کہ پولیس آئے اور نہ ہی تمہارا ذکر آنا چاہیے۔"

آزاد صاحب کے دفتر میں بڑی تباہی آئی تھی۔ ہلاک ہونے والوں میں دو افراد باہر سے آئے تھے اور ایک اخبار کا کلرک تھا۔ زخمی ہونے والے دونوں افراد نیوز کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔ بلاشبہ ابوبکر آزاد مضبوط اعصاب کے تھے۔ انہوں نے بڑی جلدی خود پر قابو پالیا تھا اور اب اپنے آدمیوں کو احکامات دے رہے تھے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اخبار کل ہر صورت شائع ہونا تھا۔ ہو جانے والا کام تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس عمارت میں دوسرے اخبار اور رسائل کے دفاتر بھی تھے۔ ان کے مالکان اور کارکن بھی آ گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کل کا دن رب نواز کے لیے تباہ کن ہوگا۔ اس نے بم دھماکا کر کے آزاد صاحب کے دفتر کے ساتھ اپنی سیاسی ساکھ بھی تباہ کر لی تھی۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو آزاد صاحب اداریے کا آغاز کر چکے تھے اور اس کام میں اتنے مصروف تھے کہ انہیں اپنے زخموں کا بھی احساس نہیں تھا۔

میں وہاں سے کرنل کی ایک گاڑی میں روانہ ہوا۔ اس کے وسائل میرے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے میں اس کے بدلے اسے کوئی ادائیگی بھی نہیں کر رہا تھا۔ نہ ہی اس نے کوئی مطالبہ کیا۔ صاعقہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہوئی۔

"یہ آپ کو کیا ہوا؟"

"میں نے اسے مختصراً واقعات سنائے۔ دھماکے اور گرنے والے ملبے نے میرا جسم دُکھا دیا تھا۔ میں شدت سے کسی پین کلر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا لیکن پہلے میں نے غسل کرنا مناسب سمجھا۔ گرم پانی نے میرے درد کو سکون دیا تھا۔ کافی کے ساتھ پین کلر نے رہے سہے درد کو بھی ختم کر دیا۔ زخم معمولی نوعیت کے تھے۔ ان پر میں نے میڈی کیٹڈ پٹیاں لگا دیں۔ صاعقہ نے افسوس کیا اور پھر میرا موڈ دیکھ کر وہاں سے کھسک گئی تھی۔ مجھے چندا کی فکر ستا رہی تھی۔ رب نواز جیسے لوگ دھمکی ہی نہیں دیتے تھے اس پر عمل بھی کیا کرتے تھے۔ اس نے چندا کے بارے میں جو گندے عزائم ظاہر کیے تھے۔ ان پر عمل کرنے کا اس کا ارادہ بھی تھا اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ اب تک کرنل نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں نے خود اس سے رابطے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مجھے روانہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں چندا کی فکر نہ کروں۔ رب نواز اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا میں نے صاعقہ سے کرنل کو کال ملانے کے لیے کہا۔

ایک منٹ بعد کرنل لائن پر تھا۔ "آپ نے رب نواز سے بات کی؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا "بلکہ اسے کچھ چیزیں فیکس بھی کی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔"

"کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔"

"ہاں کر لو مگر زیادہ لمبی بات نہ کرنا۔ رب نواز کے ہاتھ بھی کم لمبے نہیں ہیں۔ ممکن ہے وہ ان لائنوں کا سراغ لگا لے۔"

"میں زیادہ دیر بات نہیں کروں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا اور پھر ذرا رک کر کہا "کرنل آپ میرے لیے جو کر رہے ہیں۔ میں اس کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں۔"

"آں...... ہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا "اور ہاں دھماکا کرنے والا پکڑا گیا ہے وہ صفائی کرنے والے کے بھیس میں آیا تھا لیکن نیچے جاتے ہوئے اصل صفائی کرنے والا آ گیا۔ اس نے شور مچایا تو مجرم نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر میرے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے قبول دیا کہ بم اسے رب نواز نے دے کر بھیجا تھا۔ اس وقت وہ ڈیوٹی مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان دے رہا ہے۔ اس کے بعد اسے ایف آئی اے کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"یہ آپ نے کام کی خبر سنائی ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا "رب نواز کے گلے میں اس بم دھماکے کا پٹا بھی فٹ

ہو جانا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" کرنل نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے صاعقہ کو رب نواز کا نمبر بتا کر اس سے ملانے کے لیے کہا۔ حسبِ معمول فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا تھا "کون ہے؟"

"تمہارا اور رب نواز کا مشترکہ باپ!" میں نے غرا کر کہا "اسے فوراً بلاؤ۔"

وہ میرے لہجے سے ڈر گیا "ابھی بلاتا ہوں جی۔"

رب نواز نے آتے ہی اپنی مادری زبان میں بات شروع کر دی "شاہ عالم دھوکے باز...... میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"

میں نے قہقہہ مارا "ضرور دیکھنا۔ کیا تم نے مجھے عقل سے بالکل ہی پیدل سمجھ رکھا ہے۔ میں اسی وقت نقلی چندا کو پہچان گیا تھا۔ اس لیے میرے اشارے پر تمہیں نقلی لفافہ دے دیا گیا۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا "تم نے اس وقت کیوں نہیں کہا؟"

"میں نے سوچا ذرا دیکھ لیں یہ خاتون کون ہے۔ چندا کو تو میں بعد میں بھی واپس لے سکتا تھا۔"

"اب وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ کل تک اس کی بوٹیاں بھی کتے چبا چکے ہوں گے۔ پہلے میرے دو پیروں والے کتے اور پھر چار پیروں والے۔" اس نے مجھے مشتعل کرنے کی کوشش کی۔

"رب نواز۔ اب میں ان حربوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ چندا میرے لیے اہم ہے لیکن اتنی اہم بھی نہیں ہے کہ میں اس کے لیے تم سے بار بار دھوکے کھاؤں۔ تم نے میری فیئر ڈیل کو اپنی حرکت سے خراب کیا ہے۔ اب معاملہ صرف چندا کی واپسی تک محدود نہیں رہے گا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"رب نواز تمہاری وجہ سے میرا اور میرے جاننے والوں کا بہت نقصان ہو چکا۔ اب تمہیں ان سب کا ہرجانہ بھی دینا ہوگا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں تمہیں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔"

"رب نواز تمہاری زندگی اتنی سستی نہیں ہے کہ تم اسے چند کروڑ کے لیے قربان کر دو۔ آخر وطن فروشی کر کے تم نے جو دولت کمائی ہے وہ قبر میں تو تمہارے کام آنے سے رہی۔ وہاں جن اعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تمہارے پاس سرے سے نہیں ہیں۔"

"اپنے ملا ہی کم نہیں ہیں اب تم جیسے لوگ بھی قبر سے ڈرانے لگے ہیں۔" وہ بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے اتنا عاقبت نا اندیشانہ قدم اٹھایا ہی کیوں۔ تمہیں اندازہ ہے تم نے پوری صحافی برادری کو اپنا مخالف کر لیا ہے۔ کل کے اخبارات میں جو شائع ہوگا، اس کے بعد تمہاری سیاسی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔"

"بھونکنے دو ان پریس والوں کو۔ ان کی سنتا ہی کون ہے۔" اس نے پُرغرور لہجے میں کہا "میری آبائی سیٹ ہمیشہ پکی رہتی ہے۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میڈیا بڑی تیزی سے طاقت پکڑ رہا ہے۔ اب یہ انڈسٹری بنتا جا رہا ہے۔ جلد اس میں ٹی وی کے چینل بھی شامل ہو جائیں گے اس وقت تم اس کی طاقت اور اثر و رسوخ کا اندازہ نہیں کر سکو گے۔"

"میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔" اس نے چلا کر کہا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"رب نواز تمہارا حال برا ہو گیا ہے۔" میں نے تلخی سے اسے آگاہ کیا "اپنے دماغ سے غرور کا خناس نکال دو۔ تم دشمنیاں پالنے کی بات کرتے ہو اور ایک آدمی سے تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔" وہ دہاڑا۔

"فی الوقت میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ چندا کو کسی قسم کا نقصان پہنچا تو تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں اپنی فیکس مشین سے نکلنے والے کاغذ سے ہو گیا ہوگا۔"

"شاہ عالم میں تیری دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔" وہ چلانے لگا۔ میں نے فون رکھ دیا۔

اتنی بڑی ناکامی اور بڑی چالاکی سے بنائی گئی اسکیم کے فیل ہونے سے وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں سارے ثبوت جلا کر خاک کر دیئے تھے لیکن وہ ثبوت باقی تھے۔ مجھے زیر کرنے اور غالباً ہلاک کرنے کی پرانی آرزو دل میں ہی رہ گئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر چندا کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ رب نواز پاگل ہو کر اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس کے بارے میں اپنی دھمکی پر عمل کر سکتا تھا۔

صاعقہ نے کال کی "سر آپ کھانا کب کھائیں گے؟"

"لے آؤ۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر میں ٹرالی میں کھانا لے آئی اور میز پر لگانے لگی۔ میں ہاتھ دھو کر آ گیا۔ بھوک نہیں تھی لیکن کھانا اتنا لذیذ تھا کہ میں زیادہ ہی کھا گیا۔ صاعقہ نے کھانے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے کھانا کھا لیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے برتن سمیٹے تو میں نے چائے کی فرمائش کی "ابھی لائی۔" اس نے کہا۔

مجھے حیرت تھی کہ رب نواز اب تک آزاد تھا۔ واقعی دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ عام آدمی بے گناہ بھی ہو تو محض شبے میں اندر ہو جاتا ہے۔ پولیس اس سے اس جرم کا اقرار کروانے کے لیے جو اس نے کیا ہی نہ ہو، مار مار کر اسے ہلاک کر دیتی ہے اور اس پر کوئی پوچھتا نہیں ہے لیکن دوسری طرف رب نواز جیسے دولت مند لوگ ملک سے غداری کر کے بھی آزادی سے عیش کرتے ہیں۔ پکے ثبوت کے بغیر اور بعض اوقات تو ثبوت ہونے کے باوجود کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔

صاعقہ نہیں آئی تھی بلکہ ایک شخص چائے دے گیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اچانک مجھے میاں سبحان کا خیال آیا۔ پروفیسر ہاشم رضا اس کے پاس تھا۔ میں نے اس کو فون کرنے کا سوچا۔ نمبر ذہن میں تھا۔ میں نے گیلری میں آ کر میاں سبحان کا نمبر ملایا۔ فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔ میرا نام سن کر وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میاں سبحان لائن پر تھا "شاہ عالم کیا حال ہے تمہارا!"

"شاہ صاحب۔ میں کچھ معاملات میں پھنسا ہوا تھا اس لیے آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ یہ بتائیں کہ ہاشم رضا کا کیا حال ہے۔"

"ہاں بابا۔ پتا چلتا رہا ہے۔ تم نے رب نواز کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔"

"اس نے بھی بہت سارے لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا "بے شمار لوگ اسی کی وجہ سے تکلیفوں سے گزر رہے ہیں۔ کیا آپ کو کبھی ان کا خیال آیا۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو۔ آدمی ہے۔ بندہ بشر ہے۔ سب کا خیال رکھ نہیں سکتا۔" اس نے کہا۔ اس نے ہاشم رضا کا ذکر گول کر دیا تھا۔ میں نے دوبارہ پوچھا تو اس نے رکھائی سے جواب دیا "بابا ٹھیک ہے اچھا ہے۔"

میں نے اسے بتایا نہیں کہ میں ہاشم رضا کے بارے میں کرنل کو بتا چکا تھا یعنی یہ بات اب سرکار کے علم میں آ گئی تھی اور اس سے ہاشم رضا کو حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جا رہا ہوگا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے اپنی پرانی پیشکش دہرائی "شاہ عالم بابا مردوں کی طرح میدان میں آ کر کام کرو کیا عورتوں کی طرح کسی دوسرے ملک جا کر چھپ رہے ہو۔"

"شاہ صاحب آپ جانتے ہیں۔ میرے دشمنوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ رب نواز تو اب میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔"

"سنا ہے تم نے اس کی بہو اور پوتے کو اغوا کر لیا ہے۔"

اس کی زبان سے فریال کا ذکر سن کر مجھے کسک سی ہوئی تھی۔ وہ پیاری سی ہستی میرے لیے اپنی جان دار کر منوں مٹی تلے جا چکی تھی اور اس کا بچہ اس وقت نیلم ہاؤس میں تھا۔ میں نے کہا "بکواس کرتا ہے۔ اس کی بہو اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ وہ خود اس کی قید میں تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ رب نواز سے میری دشمنی ہے لیکن میں دشمنی اپنے بل بوتے پر کرتا ہوں۔ عورتوں کے زور پر نہیں۔ یہ کام رب نواز جیسے زنخے کرتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں تمہیں شاہ عالم۔" اس نے جواب دیا "تمہاری قدر بھی کرتا ہوں۔ ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ رب نواز کے خلاف کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھے کہنا۔"

"ضرور شاہ صاحب آپ کا شکریہ۔" میں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

سبحان شاہ کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ہاشم رضا کے مسئلے پر اب مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہا ہے۔ میرے اندر گھنٹی بجنے لگی تھی۔ سبحان شاہ کی نیت درست نہیں لگ رہی تھی۔ پروفیسر ہاشم رضا اس وقت کروڑوں کی آسامی تھا۔ اسے کسی بھی دولت مند ملک کے ہاتھ بیچ کر اس کے پیسے بہ آسانی کھرے کیے جا سکتے تھے۔ گویا جس خطرے سے اس ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے پروفیسر کو رب نواز کے پاس جانے سے بچایا تھا۔ سبحان شاہ کی طرف سے وہی خطرہ سامنے آ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کون سی ایجنسی اس کیس پر کام کر رہی تھی اور کام کہاں پہنچا تھا۔ یہ ملکی سلامتی بلکہ ایک طرح سے دنیا کی سلامتی کا معاملہ بھی تھا۔ اس میں سرکاری انداز میں کام کرنا مناسب نہیں تھا۔ فوری پیش قدمی ہی ہمیں آنے والے خطرات سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔

میں نے کرنل سے رابطہ کیا "آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔" کرنل نے کہا "دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے فون بند کر دیا۔

کرنل دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا

''خطرات بڑھ رہے ہیں۔ رب نواز اپنی کوٹھی سے غائب ہے۔ پولیس کا چھاپا ناکام رہا۔ اس کا کوئی رشتے دار بھی نہیں۔''

''وہ اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوگیا ہوگا۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا'' ویسے پولیس نے کس الزام میں اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ آزاد صاحب کے دفتر میں بم دھماکا کرنے کے الزام میں۔''

کرنل مسکرایا''نہیں موج دین کے قتل کے الزام میں۔ تم جانتے ہو موج دین معمولی آدمی نہیں تھا۔ ایک سابقہ وزیراعلیٰ سے اس کا ان کہا رشتہ تھا۔ وہ اسی قتل پر مشتعل ہے۔ ایک بار رب نواز ہاتھ آجائے تو اس پر بم دھماکے کا مقدمہ بھی ڈال دیا جائے۔ آزاد صاحب پہلے ہی اس کے نام پر ایف آئی آر درج کروا چکے ہیں۔ ایک چھاپا مار ٹیم اس کی زمینوں کی طرف روانہ کی جاچکی ہے۔''

''جو چرغہ کھا کر ڈکار لیتی واپس آجائے گی۔''

''نہیں۔ پولیس کے ساتھ ایجنسی کے دو افسران بھی ہیں جو اس سارے آپریشن کی نگرانی کریں گے۔''

''کوٹھی پر چھاپے کے دوران چندا ملی؟'' میں نے پوچھا۔

کرنل نے نفی میں سر ہلایا تو میرا دل ڈوب گیا''وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو رب نواز سے میری بات ہوئی ہے۔ اتنی جلدی وہ کہاں غائب ہوگیا۔''

''چھاپا بمشکل نصف گھنٹا پہلے پڑا ہے۔ میرا ایک آدمی پولیس کے ساتھ تھا، رب نواز واقعی غائب ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کسی کالی بھیڑ نے اسے بروقت اطلاع کردی۔'' تلخی ایک بار پھر میرے منہ میں گھلنے لگی تھی۔

''جس ملک میں خود نظامِ انصاف کے کل پرزے مجرموں سے تعاون کرنے لگیں۔ وہاں پر انصاف کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔''

''شاید ایسا ہی ہوا ہے۔''

''ہاشم رضا والے معاملے کا کیا ہوا۔ اسے جلد از جلد سبحان شاہ کی تحویل سے نکالنا ہوگا۔ ابھی میری اس سے بات ہوئی ہے اور مجھے اس کے ارادے نیک نظر نہیں آرہے ہیں۔ پروفیسر ہاشم رضا ایک موٹی مرغی ہے۔ اس پر ہر ایک کی رال ٹپک سکتی ہے۔'' میں نے کرنل کو خبردار کیا۔

''تم فکر نہ کرو۔ وہ کہیں نہیں جائے گا۔'' کرنل نے یقین سے کہا''آرمی انٹیلی جنس اس پر کام کررہی ہے۔''

''سبحان شاہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ رب نواز سے زیادہ طاقت ور ہے اور صوبے کے ایک حساس علاقے کا بے تاج حکمران ہے۔ اس کے ایک اشارے پر اس کے مرید دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرانے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔''

''میں نے کہا نا۔ اس معاملے کو کنٹرول کرلیا جائے گا۔ ہاشم رضا ہمارے ہاتھ میں... آجائے گا۔ اب ہماری حکومت بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا''کیا وہ بھی اس نیم حیوانی مخلوق کی افزائش چاہتی ہے۔''

''ظاہر ہے ہر حکومت کو اس سے دلچسپی ہوسکتی ہے۔ ہر اس ملک کو جو دہشت گردی اور امن وامان کے مسئلے سے دو چار ہو اور جس کی پولیس نااہل اور بدعنوان ہو۔'' کرنل نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

''کرنل یہ چیز سوائے تباہی کے کچھ نہیں ہے۔'' میں نے اسے خبردار کیا''اسے بہر صورت ختم ہونا چاہیے۔ اس قسم کے تجربات انسانیت کی توہین ہی نہیں اس کے خلاف بھی ہیں۔''

کرنل نے شانے اچکائے''یہ بات تو حکومت کو سمجھانے والی ہے۔''

کرنل شاید اس معاملے میں مختلف ذہن رکھتا تھا اس لیے وہ اس معاملے کی سنگینی کو نہیں سمجھ رہا تھا یا سمجھ کر بھی انجان تھا کیونکہ اس معاملے میں حکومت بھی ملوث ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

''را کے ایجنٹوں کا معاملہ کہاں تک پہنچا۔''

میں نے کرنل کو را کے اڈے سے ملنے والی ڈائری اور وہاں سے حاصل ہونے والی معلومات دے دی تھیں۔ اس اڈے کی تعمیر اور ایجنٹوں کو پناہ میں مدد دینے والے تمام ناموں کی فہرست بھی اسی کے حوالے کردی تھی۔ کرنل نے جواب دیا''اس معاملے پر بھی تفتیش جاری ہے۔ رب نواز کے رشتے دار چوہدری رحیم خان اور اس کے دو بیٹے گرفتار ہوگئے ہیں۔ انہوں نے اعتراف بھی کرلیا ہے۔ اس کام میں کچھ سرکاری اہلکار اور علاقے کا ڈی ایس پی بھی ملوث ہے۔ اگر ان کے خلاف الزامات درست پائے گئے تو وہ بھی گرفتار ہوجائیں گے۔''

''بشرطیکہ وہ فرار نہ ہوگئے ہوں'' میں نے لقمہ دیا''یہ بتائیں اس نام نہاد میجر شاہد کا کیا بنا۔ اس کا ہاتھ آنا بے حد ضروری ہے۔ نہ جانے وہ کون کون سے دفاعی پلان سرحد پار بھیج چکا ہے۔ خدانخواستہ کل دشمن نے حملہ کردیا تو اسے ہماری ایک ایک دفاعی چال کا علم ہوگا۔''

''تم اتنی فکر نہ کرو۔ اس ملک کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ اس کے منصوبہ ساز ذہن سے سوچتے ہیں۔ ہمارے پاس متبادل دفاعی پلان ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ویسے بھی جنگ ہمیشہ کسی لگے بندھے منصوبے کے تحت نہیں ہوتی جب بزم گاہ بجتی ہے تو ہر ایک اپنی اپنی گانے لگتا ہے۔''

میں کرنل سے متفق نہیں تھا۔ جنگ میں میدانِ جنگ کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی یہ تو ڈرامے کا ایک اسٹیج ہوتا ہے۔ جنگ میں پس منظر کی اس سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور اس کے راستے، گولا بارود کے ذخیروں کی جگہیں، دفاعی تنصیبات یہ سب بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی پردہ پوشی کے بغیر کوئی فوج فتح حاصل نہیں کرسکتی۔ اکہتر کی جنگ ایک مثال تھی۔ اندرونی غداروں کی وجہ سے دشمن ہمارے ایک ایک راز سے واقف تھا اور اس نے کامیابی سے ہمارے دفاع کو ناکام بنادیا تھا لیکن میں اس سے بحث نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بہرحال کرنل رہ چکا تھا اور ان معاملات کو مجھ سے کہیں بہتر سمجھتا تھا۔ ممکن تھا وہ مجھے ٹالنے کے لیے یہ سب کہہ رہا ہو۔ ورنہ راز کی اہمیت سے تو وہ بھی اچھی طرح واقف تھا۔

''ممکن ہے کل تک کوئی اچھی خبر سننے کو ملے۔'' کرنل بولا۔

''کرنل مجھے چندا کی فکر ہورہی ہے۔ جب رب نواز خود کو گھرا پائے گا تو وہ اسے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''اس معاملے میں ہم صرف تقدیر پر ہی بھروسا کرسکتے ہیں۔''

''اگر اسے ذرا بھی نقصان ہوا تو......''

''تو تم اسے توپ دم کردو گے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے امید ہے رب نواز کے خلاف تیز رفتار کارروائی کے باعث وہ چندا کو نقصان پہنچانے سے باز رہے گا۔ میرا اندازہ ہے وہ چندا کو آخری وقت تک ڈھال کے طور پر اپنے ساتھ رکھے گا۔''

میں جانتا تھا۔ رب نواز انتہائی بزدل لیکن انتہائی کینہ شخص تھا۔ وہ چندا کو اسی وقت نقصان پہنچائے گا جب اسے میری طرف سے مکمل اطمینان ہوجائے گا پھر وہ مجھ پر قابو پالے گا مگر ساتھ ہی دل کو اس کی کمینگی کی طرف سے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر خود سے کہا، تم شادو کے مرنے کے بعد زندہ رہے۔ اگر خدانخواستہ چندا کو بھی کچھ ہوگیا تو مرو گے نہیں لیکن رب نواز جیسے ناسور کا خاتمہ ضروری ہے جو ایک چندا کے لیے ہی نہیں بلکہ نہ جانے کتنی چنداؤں کے لیے آزار کا باعث بنے گا۔ وہ اس ملک اور اس کے لوگوں دونوں کا مجرم تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کرنل۔'' میں نے کہا''وہ چندا کو ہی ڈھال بنائے گا لیکن اس کی سرکوبی لازمی ہے۔ چاہے اس کے لیے چندا کی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔''

کرنل نے حیرت سے میری طرف دیکھا''شاہ عالم۔ تمہارے کردار کا یہ رخ میرے لیے اجنبی ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں جو سنا ہے اس سے بالکل مختلف......''

میں نے سوچا اور کرنل سے کہا''اس لیے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔''

کرنل شبیر کی حیرت دوچند ہوگئی تھی جسے رفع کرنے کے لیے مجھے اسے ساری کہانی شروع سے آخر تک سنانی پڑی۔ میں نے تو اسے مختصر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کرنل نہیں مانا اس کے اصرار پر میں نے سارے ہی واقعات جستہ جستہ سنائے۔ اپنے ناصر عظیم سے شاہ عالم بننے اور اس کے بعد شاہ عالم سے دوبارہ ناصر عظیم بننے کی تگ ودو۔

کرنل خان کا سن کر وہ اچھل پڑا تھا''میرے خدا تم کرنل خان کے ساتھ بھی رہے ہو۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ ہی از اے رئیلی گریٹ پرسن۔''

''جی اور چاندنی یعنی چندا ان ہی کی بیٹی ہے۔ اکلوتی بیٹی۔ اس نے اپنی ساری وراثت کمال اسپتال کے نام کردی ہے۔''

''کمال کے لوگ ہو تم سب۔'' کرنل شبیر متاثر کن لہجے میں بولا''میں تو صرف نیلم کے ناتے اور پھر رب نواز جیسے غدار کی وجہ سے تمہارے کیس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔''

''مجھ سے زیادہ یہ ملک وقوم کا کیس ہے اور آپ پر ایک محافظ وطن ہونے کے ناتے ذمّے داری پڑتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے۔ آپ کی وجہ سے مجھے بہت مدد ملی ہے۔''

''وہ لڑکی فریال کیا واقعی رب نواز کی بہو ہے؟''

''ہاں۔ اس کے مرحوم بیٹے دلنواز کی بیوی۔ اس کی دل نواز سے شادی جبر کا نتیجہ تھا جسے اس نے کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ موقع پاتے ہی وہ میری مدد سے وہاں سے نکل آئی۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ اس کے بچے کو رب نواز کے حوالے نہ کیا جائے۔ اب وہ بچہ ہمارے خاندان میں شامل ہے۔ جیسے ہم سب کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بچہ بھی بظاہر ہمارا کچھ نہ ہونے کے باوجود خاندان کے ایک فرد کی طرح ہمارے ساتھ رہے گا۔''

''تمہارا جذبہ لائقِ تحسین ہے۔'' کرنل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا''رات بہت ہوچکی ہے مجھے جانا ہوگا۔

اب میں اس کیس پر اپنا سارا دباؤ اور اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔"

"کرنل! رب نواز کی خاندانی حویلی کے علاوہ اس کے قبضے میں موجود لال حویلی پر بھی چھاپا مارا جائے۔ مجھے شبہ ہے کہ رب نواز نے اب تک وہاں بہت کچھ رکھا ہوگا اور ممکن ہے چندا بھی وہیں ہو۔"

"میں دیکھوں گا۔" کرنل نے کہا اور رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کمال کا نمبر ملایا۔ وہ سو رہا تھا۔ لہٰذا اس نے گالیوں سے استقبال کیا "سؤر کے بچے نہ چین سے جینے دیتا ہے اور نہ سونے۔"

"بکواس کرنے کے بجائے یہ بتا کہ سب خیریت ہے نا الو کے پٹھے۔"

"اب تک تو ہے۔" اس نے بھنا کر کہا "یہی بات پوچھنے کے لیے اٹھایا ہے۔ وہ الو کا پٹھا ایک گھنٹا پہلے ہی ریں ریں کر کے سویا ہے۔"

"تیرا لخت جگر۔" میں نے ہنس کر کہا "چل اب سو جا۔"

میں نے کہا تو کمال نے کچھ مزید ارشادات عالیہ کے بعد فون بند کر دیا۔ مجھے نیلم اور رئیس کا خیال آیا۔ لندن میں اس وقت رات ہو چکی ہوگی اور اس کا امکان تھا کہ سب عاقل کے گھر پر ہی مل جاتے۔ میں نے نمبر ملایا فون عینی نے اٹھایا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چلائی۔

"بھیا..... آپ کہاں ہیں؟ نیلم باجی اور ہم فون کر کر کے پریشان ہوگئے ہیں۔"

"وہیں ہوں..... لاہور میں۔" میں نے کہا "وہاں سب ٹھیک ہے نا..... اور تیرا آنے والا مہمان۔"

وہ شرمائی "سب ٹھیک ہیں مگر آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ سب کو پریشان کیا ہوا ہے۔"

"پرانی عادت ہے اب تم لوگ برداشت کی عادت ڈالو اور تیرا شوہر نامدار کہاں ہے۔"

"میں یہیں ہوں نامراد محترم۔" عاقل کی آواز آئی۔

"اچھا تو چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا نالائق۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"یہ تو بے ایمانی ہے۔ میں نے خود کو لائق ثابت کر دیا ہے کیوں عینی۔"

"دماغ درست رکھو۔" عینی کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی۔ تو میں مسکرا دیا۔ عاقل کا اشارہ میں نے سمجھ لیا تھا۔

"نوادرات والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"فی الوقت اٹکا ہوا ہے۔ وزارت سیاحت کا وہ افسر واپس پاکستان چلا گیا ہے۔ اعلیٰ کمان کی منظوری کے بغیر اس پروجیکٹ پر کام ذرا دشوار ہی ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی "تاخیر ہو جائے بے شک..... لیکن نوادرات صحیح طریقے سے ہی منتقل ہونے چاہئیں۔ یہ بتا کہ ان کے حوالے سے اب تک کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"اب تک تو نہیں ہوئی۔ میں نے نوادرات ایک اور جگہ منتقل کر دیئے ہیں۔ اخبار کے دفتر کے پاس ہی ایک خالی دفتر مل رہا تھا۔ میں نے کرائے پر لے کر نوادرات خود تھوڑے تھوڑے کر کے منتقل کر دیے۔ وہ لینڈ لیڈی مشکوک ہو گئی تھی۔ پولیس کو بلا لیتی تو ہم سب مصیبت میں پڑ جاتے۔"

"یہ اچھا کیا۔ رقم کا تو مسئلہ نہیں ہے۔"

"یہی تو ایک سہولت ہوئی ہے ساس محترمہ کے آنے سے۔ عینی کو نئی کار لے کر دی ہے۔ اسے میری کھٹارا سی کار میں بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی۔"

"ظاہر ہے وہ میری بہن ہے۔ معمولی چیز کہاں استعمال کرے گی۔"

"یعنی میں بھی اعلیٰ چیزوں میں شمار ہوتا ہوں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

اسی لمحے نیلم آ گئی "ناصر کہاں تھے تم؟"

"ابھی تو اسی دنیا میں ہوں۔ اگر جانے کا موڈ ہوا تو تمہیں بتا کر جاؤں گا۔"

"بکو مت!" نیلم نے ڈانٹا "فضول باتیں کرتے رہتے ہو۔ ناصر تم کس چکر میں ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا کر رہے ہو۔ میں نے جتنی بار فون کیا تم غائب ملے۔"

"میں ذرا مصروف ہوں۔"

"اس لڑکی کا کیا چکر ہے۔ وہ آئی بھی اور مر بھی گئی۔"

"ہاں۔" میں نے سرد آہ بھری "بس وہ آئی اور پھر چلی بھی گئی۔ اپنا بچہ میری ذمے داری بنا گئی۔ جسے میں نے سب کی ذمے داری بنا کر قبول کر لیا ہے۔"

"ناصر وہ رب نواز کا خون ہے۔" نیلم نے تیز لہجے میں کہا۔

"وہ انسان کا بچہ ہے اور انسانوں والی فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ اگر اسے رب نواز کے حوالے کر دیا تو وہ اسے بھی اپنے جیسا شیطان بنا دے گا۔ دوسرے یہ کہ میں مرتی ہوئی فریال کو زبان دے چکا ہوں۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے خود کو قربان کر دیا۔ اس کا اتنا حق تو بنتا ہی ہے۔"

نیلم ذرا چپ ہوگئی "سوری اگر تمہارے جذبات ہرٹ ہوئے۔ وہ بچہ اب ہم سب کی ذمے داری ہے۔ ہم اس کی پرورش کریں گے اور اسے اچھا انسان بنائیں گے۔"

"تھینک یو نیلم۔ تم نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔" میں نے گہری سانس لی "یہ بتاؤ کہ لندن میں کیا ہو رہا ہے۔"

"ابھی تو تفریح چل رہی ہے۔ میں نے نواحی لندن میں ایک مکان دیکھا ہے۔ دو منزلہ ہے۔ ہم سب آسانی سے اس میں رہ سکتے ہیں۔ سستا بھی مل رہا ہے۔ بارہ لاکھ پاؤنڈز مانگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے، اس تک میں دے دے گا۔"

"جیسے تم چاہو اور رقم کی ضرورت ہو تو میرا لندن میں اکاؤنٹ ہے وہاں سے پیسے نکلوا لینا۔ میری چیک بک عینی کے پاس ہے۔ اس میں سائن شدہ دو چیک ہیں۔"

"رقم میرے پاس ہے تم فکر مت کرو..... اور تم کب آ رہے ہو؟"

"جیسے ہی حالات بہتر ہوئے۔ ابھی تو رب نواز کے کتے مجھے سونگھتے پھر رہے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ائرپورٹ کی نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔ اگر مجھے ائرپورٹ پر شاہ عالم ہونے کے شبے میں گرفتار کرا دیا تو میں خاصی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"خدا! اس رب نواز کو غارت کرے۔" نیلم نے خالص زنانہ انداز میں کوسنے دینا شروع کر دیے۔

لیکن میں نے خلوص سے کہا "آمین..... مجھے یقین ہے تمہاری بددعائیں رنگ لائیں گی۔ ویسے بھی اس کے گرد گھیرا تنگ ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ممکن ہے جلد تمہیں کوئی خوش خبری ملے۔"

نیلم کے بعد رئیس نے فون لے لیا۔ میں نے اسے کرنل کے اس بنگلے کا نمبر بتایا "اگر کبھی ضرورت پڑے تو مجھے یہاں کال کر لینا۔ میں نہ ہوں تو پیغام دے دینا۔ نیلم کو مت بتانا یہ اسی سیکیورٹی ایجنسی کے سربراہ کرنل شبیر کا بنگلا ہے، جس کے گارڈز نیلم ہاؤس کی نگرانی کرتے ہیں۔"

"ناصر..... یار میں واپس آ رہا ہوں۔ مجھے عورتوں کی طرح یہاں چوڑیاں پہن کر بیٹھنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" رئیس نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ یہاں تیری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود آرام سے چھپا بیٹھا ہوں۔ اچھا اب اجازت دے کرنل کا فون ہے۔" میں نے کہا اور سلام دعا کے بعد فون رکھ دیا۔

اس رات، مجھے گہری اور پرسکون نیند آئی۔ حالانکہ میرا ذہن خدشات سے لبریز تھا لیکن اپنوں سے بات کر کے مجھے بہت سکون ملا تھا۔ صبح میں اٹھا تو خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ غسل کر کے میں نے ناشتا کیا اور پھر کرنل کا فون ملایا "ناصر عرض کر رہا ہوں۔"

"ہاں ینگ مین کیا حال ہیں۔ رات کو صحیح سے نیند آئی۔"

"ہاں۔ اب میں خود کو اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"میں دفتر کی طرف جا رہا ہوں۔"

"کیا رب نواز کے خلاف جانے والی پارٹی کو کوئی کامیابی ہوئی۔"

"نہیں ان کی حویلی میں چھاپہ ناکام رہا۔ کوئی فرد نہیں ملا۔ صرف عورتیں تھیں۔ لال حویلی واقعی خالی ہے اس کے تہ خانے میں کچھ سامان ضرور ملا ہے مگر وہ بیکار ہے۔ آدمی کوئی ہاتھ نہیں آیا۔ پولیس نے رب نواز خاندان کے کچھ ملازموں کو ضرور گرفتار کیا ہے مگر میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کچھ نہیں ہوا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"نہیں کچھ کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔ چوہدری رحیم خان اور اس کے ڈیرے سے کچھ بھارتی ایجنٹ گرفتار ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے نیٹ ورک کے کچھ اور لوگ بھی گرفتار ہوئے ہیں ان سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اور بھی گرفتاریاں کی جا رہی ہیں۔"

"کرنل یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ کوشش نہ کرتے تو یہ سب اب تک آزاد ہوتے اور ممکن ہے سرحد پار فرار بھی ہو چکے ہوتے۔"

"ڈونٹ مینشن ینگ مین۔" کرنل ہنسنے لگا "تم بھی......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ میرے کانوں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ کرنل کی گاڑی کسی مصروف شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ پس منظر میں ٹریفک کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے تیزی سے کہا "کرنل کیا ہوا؟ یہ فائرنگ کی آواز کیسی ہے..... جواب دیں۔"

مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔ کرنل کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ البتہ فائرز کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ یہ کوئی برسٹ چلانے والی گن تھی۔ جس کا پورا میگزین ایک ہی برسٹ میں چلا دیا گیا تھا پھر ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ آواز فون کے پاس سے ہی آئی تھی مگر یہ کرنل کی آواز نہیں تھی۔ میں چلا چلا کر

کرنل کو آواز دیتا رہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے دل میں خدشات سر اٹھانے لگے۔ کل ہی کرنل نے رب نواز کی چال ناکام بنادی تھی اور وہ یقیناً اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا پھر اس کے گھر پر چھاپا۔ اسے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی ہوگی کہ یہ سب کرنل کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس نے کرنل پر حملہ کرا دیا اسلحے اور مروانے کے لیے وفاداروں کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ شاید کرنل کے ہاتھ سے فون گر گیا ہے۔ میں نے دل کو تسلی دی۔

کوئی جواب نہ پا کر میں نے فوری طور پر صاعقہ کو کال کی اور اسے صورتِ حال بتائی۔ وہ دوڑی چلی آئی۔ میں نے اسے سادی صورتِ حال بتائی "میں کرنل کی خیریت معلوم کرتی ہوں۔" اس نے فکرمندی سے کہا اور فون پر کسی سے رابطہ کر کے اسے فوراً کرنل کے گھر سے دفتر کی طرف آنے والے روٹ پر جانے کو کہا۔ فائرنگ کا واقعہ اسی طرف پیش آیا تھا پھر اس نے علاقے کے تھانے سے رابطہ کر کے پولیس سے حادثے کے بارے میں پوچھا لیکن ابھی پولیس بھی اس سے بے خبر ہی تھی۔ صاعقہ کی پریشانی بتا رہی تھی کہ کرنل سے اس کا قریبی تعلق ہے یا پھر کوئی جذباتی رشتہ ہے۔ مضبوط اعصاب کی یہ لڑکی رونے کے قریب ہوگئی تھی۔ خود میں بھی اندیشوں کا شکار تھا۔ اتنے عرصے بعد مجھے ایک مضبوط دنیاوی سہارا ملا تھا جس کی مدد سے میں رب نواز کے مکروہ عزائم خاک میں ملا سکتا تھا۔ نہ جانے فائرنگ کے بعد کرنل کس حال میں تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ کرنل کی کار پر ہی حملہ ہوا ہے۔ ورنہ موبائل سے اس کی آواز کہاں غائب ہوگئی تھی۔ جبکہ موبائل کام کر رہا تھا۔ میں آخر تک فائرنگ کی آواز اور ٹریفک کا شور سنتا رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ صاعقہ نے لپک کر کال ریسیو کی "ہاں بول رہی ہوں کیا ہوا؟"

دوسری طرف سے جو بتایا گیا' اسے سن کر صاعقہ کا چہرہ سفید پڑ گیا پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا۔ میرا سر جھک گیا۔ کرنل بھی میرے لیے جان ہار گیا۔ صاعقہ نے فون رکھا اور روتے ہوئے بولی۔

"پاپا کو مار دیا ہے۔ وہ مر چکے ہیں۔"

"کرنل تمہارے پاپا تھے؟"

اس نے سر ہلایا "میں ان کی سگی بیٹی نہیں ہوں۔ وہ میری والدہ کے رشتے داروں میں سے تھے۔ انہوں نے میری پرورش کی ہے میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔"

"ہوا کیا؟"

اس نے آنسو صاف کیے۔ مضبوط قوتِ ارادی نے اسے جلد سنبھال لیا تھا "چلتی کار پر دوسری کار سے کسی نے برسٹ مارا۔ پاپا کے چہرے اور سینے پر گولیاں لگی تھیں' وہ موقع پر ہی ختم ہوگئے تھے۔ ان کا ڈرائیور اور محافظ بچ گیا تھا۔ اس نے حملہ آور کار پر فائرنگ کی تھی۔ اسے بھی بعد میں گولی مار دی۔"

صاعقہ کی بات سے مجھے موبائل فون پر سے آنے والی آخری چیخ یاد آ گئی۔ کرنل کا ڈرائیور بھی مارا گیا تھا۔

"مجھے...... مجھے بے حد افسوس ہے صاعقہ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔"

"مجھے جانا ہوگا۔" اس نے کہا "پاپا کے سارے معاملات اب مجھے ہی دیکھنا ہوں گے۔"

"کیا ان کا کوئی اور رشتے دار نہیں ہے۔"

"نہیں۔" اس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں جو بار بار گیلی ہو رہی تھیں "ایک بیٹا ہے۔ وہ امریکا جا کر باپ کو بھول گیا۔ پلٹ کر کبھی پاپا کی خبر نہیں لی۔"

"کیا میں چلوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا "نہیں...... قاتلوں کو اصل میں آپ سے دشمنی ہے پاپا تو ان کے راستے کی دیوار بن گئے تھے۔ اگر آپ منظر عام پر آئے تو آپ پر بھی حملہ ہوسکتا ہے۔"

اس کی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔ میری وجہ سے وہ دنیا میں اپنے واحد جذباتی رشتے سے بھی محروم ہوگئی تھی۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"میں آپ کو شرمندہ نہیں کر رہی۔ مجھے پاپا کی موت پر دکھ ہے لیکن ساتھ ہی فخر بھی ہے۔ وہ حق کا ساتھ دینے کی پاداش میں مارے گئے...... وہ شہید ہیں۔"

ہمارے ہاں اب رواج سا ہوگیا ہے کسی بھی مارے جانے والے کو اس کے لوگ فوراً شہید قرار دے دیتے ہیں لیکن کرنل نے جس طرح میرا بے غرضی سے ساتھ دیا تھا' اس نے رب نواز جیسے غداروں اور بھارتی ایجنٹوں کی سرکوبی میں اپنی جان دی تھی۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ شہید ہے یا نہیں لیکن اس کی موت بلاشبہ اعلیٰ مقاصد کے لیے تھی۔ میں تھکے قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ کرنل کے قتل نے ثابت کر دیا تھا کہ رب نواز اب بھی اتنا ہی طاقت ور تھا۔ اس کی روپوشی سے اس کی طاقت اور اثر و رسوخ پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے دن دہاڑے ایک معروف شاہراہ پر واردات کر کے اسے ثابت بھی کر دیا تھا۔ اچانک مجھے ان ثبوتوں کا خیال آیا جو کرنل کے پاس تھے۔ اگر حملے کے وقت بھی کرنل انہیں اپنے ہی ساتھ رکھے ہوئے تھا تو اس بات کا امکان تھا

کہ وہ بھی حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ گئے ہوں۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ میرے پاس چندا کے بچاؤ کے لیے وہ ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ بھی رب نواز کے ہاتھ لگ جاتا تو چندا بالکل ہی اس کے رحم و کرم پر رہ جاتی۔ وہ اس کے ساتھ کوئی بھی ظلم کرنے کے لیے آزاد ہو جاتا۔

میں مضطرب ہوگیا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ صاعقہ ہی مجھے اصل صورتِ حال سے باخبر رکھ سکتی تھی اور اس سے رابطے کا فی الوقت میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مجھے انتظار ہی کرنا تھا۔ مجھے رب نواز کی کوٹھی فون کرنے کا خیال آیا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سارے راستے ایک ایک کر کے پھر بند ہوگئے۔ کل تک میں کتنا پُراعتماد تھا کہ چندا میرے پاس آ جائے گی اور میں ایک بار پھر رب نواز کی ایسی کم تیسی کرنے کے لیے آزاد ہوں گا مگر رب نواز نے چال چل کر میرے اعتماد کو چکنا چور کر دیا۔ کرنل نے جوابی چال میں اس سے اس کے خلاف ثبوت واپس چھین لیے اور اس طرح حساب برابر ہوگیا تھا مگر رب نواز نے کرنل کی جان لے کر توازن ایک بار پھر اپنے حق میں کر لیا تھا اور میں رب نواز کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک مجھے ہاشم رضا کا خیال آیا۔ وہ رب نواز کے قریب رہا تھا اور اس کے بارے میں کہیں زیادہ جانتا تھا۔ ممکن ہے وہ اس کے خلاف کوئی بات بتا سکتا لیکن وہ سبحان شاہ کے پاس تھا۔ میں نے فوری طور پر اس کا نمبر ملایا۔ وہ دربار عام میں تھا لیکن اس کے مرید نے اسے میرا پیغام پہنچا دیا۔ اس نے کال ٹرانسفر کرا لی۔

"شاہ صاحب مجھے ہر صورت ہاشم رضا سے بات کرنی ہے۔ رب نواز کے خلاف مجھے اس کی مدد درکار ہے۔"

"بابا...... شاہ عالم اس سے تو بات ممکن نہیں ہے۔ وہ اس حویلی سے باہر ہے اور جہاں ہے وہاں فون نہیں ہے۔ اگر تم خود ملنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"سبحان شاہ۔ یہ موبائل کا دور ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"معلوم ہے بابا...... مگر وہ جگہ موبائل کی حد سے باہر ہے۔ ہر جگہ لاہور جیسی سہولت تو نہیں ہوتی ہے۔"

اس سے ملنے کے لیے مجھے کہاں آنا ہوگا؟"

"ہماری حویلی میں آ جاؤ۔"

"اگر آپ ہاشم رضا کو حویلی میں بلوا سکتے ہیں تو میں کل اس سے فون پر بات کر لوں گا۔"

"شاہ عالم میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ ہمارا کچھ حساب کتاب تھا جو تم نے واضح کر دیا تھا۔ تم بلاخوف چلے آؤ۔"

"معاف کیجئے گا شاہ صاحب ہمارے تعلقات ایسے بھی نہیں ہیں کہ میں آنکھ بند کر کے آپ کے پاس چلا آؤں۔"

"تو پھر میں تمہارے کام کیسے آؤں گا۔"

"میں ہاشم رضا سے وہیں مل لیتا ہوں جہاں وہ ہے۔" میں نے اچانک فیصلہ سنا دیا۔

"تمہاری مرضی۔ مجھے تو تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔ تم نے رب نواز کا نقصان کر کے میرا دل خوش کر دیا ہے۔"

"میں ہاشم رضا سے کہاں پر مل سکتا ہوں؟"

"ایسا کرو تم نے میری حویلی سے ذرا پہلے ہائی وے پر جو ریسٹورنٹ دیکھا تھا۔ وہاں آ جاؤ۔ وہاں سے میرے بندے تم کو ہاشم رضا کے پاس لے جائیں گے۔"

"میں آؤں گا کل دوپہر دو بجے تک۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

میں بہرصورت رب نواز تک پہنچنا چاہتا تھا اور اس کے لیے کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ مجھے سبحان شاہ پر اعتماد نہیں تھا۔ وہ رب نواز کا ذرا مختلف ایڈیشن تھا۔ جس کے نزدیک اپنے مفاد کی اہمیت سب سے پہلے تھی اور میری طرف سے اس کا دل صاف نہیں ہوسکتا تھا۔ میں بہرحال اس کی قید سے فرار ہوا تھا اور وہ یہ بات نہیں بھولا ہوگا۔ میں اس کے پاس جانے سے پہلے کچھ ایسے انتظامات چاہتا تھا کہ واپس بھی آ سکوں۔ اس کے لیے مجھے صاعقہ سے مشورے کی اشد ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب کرنل کے سارے معاملات وہی سنبھالے گی۔ وہ اس بنگلے کی بھی انچارج تھی۔ کوئی عام گھریلو لڑکی نہیں تھی۔ کرنل نے اس کی تربیت عام انداز سے ہٹ کر کی تھی۔

ایک بجے کے قریب اس کا فون آیا "کرنل کی ڈیڈ باڈی کب ملے گی۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"شام تک مل جائے گی لیکن تدفین کل تک ہی ہوگی۔ ان کے دوست احباب اور آرمی کے جاننے والوں کو اطلاع کر رہی ہوں۔ ان میں سے اکثر آج رات تک آئیں گے۔"

"صاعقہ! کرنل کے پاس کچھ اہم چیزیں تھیں۔ میری......" میں نے ذرا جھجک کر کہا۔

"اگر آپ کا اشارہ رب نواز کے خلاف ثبوتوں کی طرف ہے تو وہ محفوظ ہیں۔" اس نے کہا "لیکن ابھی آپ کے لیے بیکار ہیں۔"

"ہاں۔ صاعقہ میں جانتا ہوں۔ تم اس وقت گھرے

صدمے سے گزر رہی ہو اور بے حد مصروف بھی ہو لیکن میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری ہے۔"

"میں شاید رات آٹھ بجے تک آؤں۔ ورنہ نو بجے تک لازمی آ جاؤں گی۔"

"میں انتظار کروں گا۔" میں نے کہا۔

"پلیز آپ نے باہر نہیں جانا۔ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ آزاد صاحب کے دفتر پر پھر حملہ ہوا ہے۔ وہاں تعینات ایک گن مین مارا گیا۔"

"میرے خدا! آزاد صاحب تو خیریت سے ہیں نا؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"وہ ٹھیک ہیں اس وقت وہ ایک پریس کانفرنس میں تھے۔" صاعقہ نے بتا کر فون بند کر دیا۔

رب نواز زیادہ ہی تیزی دکھا رہا تھا۔ شکر ہے آزاد صاحب دفتر میں نہیں تھے۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ انہیں احتیاط کا مشورہ دینا بیکار ہی تھا۔ وہ کبھی عمل نہیں کرتے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ موت وقت پر ہی آتی ہے اور اپنے حصے کی زندگی وہ گزار ہی چکے تھے۔ اگر میں ان سے کہتا بھی تو وہ یہی کہتے۔

"میاں موت تو اپنے وقت پر آتی ہے اس سے پہلے سوچ سوچ کر مرنے کا فائدہ۔"

رات تک کا وقت میں نے نہایت بے چینی سے گزارا۔ کرنل کی موت کا سوگ اس بنگلے کے ملازموں پر بھی طاری تھا۔ وہ سب بے حد افسردہ نظر آ رہے تھے بلکہ باورچی کو میں نے روتے دیکھا تھا۔ واضح طور پر کرنل اپنے ملازموں میں بے حد مقبول تھا۔ ایک اور اچھا انسان رب نواز جیسے شیطان کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ وہ جتنا عرصے زندہ رہتا اسی طرح اچھے انسانوں کی بلی لیتا رہتا۔ اس کا ناپاک وجود جلد از جلد اس زمین سے پاک کر دینا ضروری تھا۔

صاعقہ رات نو بجے ہی آئی تھی۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ روتی رہی تھی۔ کرنل اس کے لیے باپ کی طرح تھا۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔ تعزیت کے الفاظ دہرانے کے بعد میں اپنے مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔ میں نے اسے ہاشم رضا کے بارے میں بتایا۔

"اس ابلیس کے پاس پہنچنے کا راستہ ہمیں ہاشم رضا سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے سارے بلوں سے واقف ہے۔ وہ سبحان شاہ کی تحویل میں ہے۔ بظاہر اس نے مجھے آزادی سے اس سے ملنے کی اجازت دے دی ہے لیکن مجھے اس کے انداز سے فریب کی بو آ رہی ہے۔ وہ ایک بار پھر مجھ پر قابو پانا چاہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری حفاظت اور میری واپسی کا بندوبست کیا جائے۔"

"ہو جائے گا۔ میں اکبر کو تمہارے ساتھ کر دیتی ہوں۔ وہ ان معاملات میں بے حد تجربہ کار ہے۔ اسپیشل فورس میں رہ چکا ہے۔ وہ کوئی محفوظ پلان ترتیب دے لے گا۔" اس نے فون پر رابطہ کیا۔

"اکبر میں بات کر رہی ہوں۔ تم فوری طور پر میرے بنگلے پر آ جاؤ۔ ایک ضروری کام ہے اور ہاں جنازے میں آنے والوں کو کہاں ٹھہرایا جا رہا ہے۔" دوسری طرف سے سن کر اس نے کہا "بس ٹھیک ہے تم آ جاؤ۔"

"اکبر بے حد مستعد اور ذہین آدمی ہے۔ پاپا کی ایجنسی کا سیکیورٹی پلان انچارج یہی ہے۔ مجھے یقین ہے تم اس کی مدد سے ہاشم رضا کو وہاں سے نکال لاؤ گے۔"

"ویری گڈ۔ یہ تم نے مجھے نئی راہ بجھائی ہے۔"

اس سے پہلے کہ سبحان شاہ مجھے ڈبل کراس کرتا۔ میں خود اسے ڈبل کراس کر سکتا تھا۔ اس میں اخلاقیات کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سبحان شاہ جیسے شخص کی سرے سے کوئی اخلاقیات نہیں تھیں۔ اس کے نزدیک اپنا مفاد اہم تھا اسی طرح میرے نزدیک میرا مفاد اہم تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کرتا تو میں اس کے ساتھ دھوکا کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اکبر تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ یہ وہی پستہ قد شخص تھا جو مجھے کرنل کے دفتر سے صاعقہ کے بنگلے تک پہلی بار چھوڑنے آیا تھا۔ اپنے حلیے اور لباس سے وہ معمولی درجے کا کوئی ملازم لگتا تھا۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں سے سستی اور کاہلی ٹپکتی تھی مگر یہ صرف ایک پردہ تھا اس کے پیچھے ایک چست اور ہر طرف نظر رکھنے والا شخص تھا۔ کرنل شبیر کا دستِ راست کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ رسمی فقروں کے بعد ہم کام کی بات پر آ گئے۔

"میں جا کر چائے بھیجتی ہوں۔" صاعقہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے اکبر کو تفصیل سے اپنا ارادہ بتایا۔ وہ غور سے سنتا رہا پھر اس نے کہا "کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر انہوں نے کوئی دھوکا کرنے کی کوشش کی تو ان کی چال ان ہی پر الٹ دیں گے۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔"

"اس شخص ہاشم رضا کو لاہور تک لانا ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔" اس نے اعتماد سے کہا "آپ کس وقت روانہ ہوں گے۔"

"میں سوچ رہا ہوں صبح سات بجے تک نکل جاؤں۔"

"بس تو میری ٹیم تیار ہو گی۔ ہم آپ کے پیچھے ہی ہوں گے۔"

"کیا تم بھی چلو گے۔" میں چونکا۔

اس نے سر ہلایا "آپ نہیں جانتے۔ کرنل نے آپ کو وی وی آئی پی قرار دیا ہے۔ سمجھ لیں پوری ایجنسی اس وقت آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

میں نے دل ہی دل میں کرنل کا شکریہ ادا کیا اور اس کی مغفرت کی دعا کی۔ اکبر نے کہا "ہم دور سے آپ کی نگرانی کریں گے اگر محسوس کیا کہ آپ کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے تو ہم حرکت میں آ جائیں گے۔"

"اگر میں بار بار سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دوں تو تم سمجھ لینا کہ میں پھنس گیا ہوں لیکن جب تک ہم ہاشم رضا تک نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک تم حرکت میں نہیں آؤ گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

کچھ دیر تک ہم تفصیلات طے کرتے رہے پھر وہ چلا گیا اور میں سونے کے لیے لیٹ گیا مگر نیند بڑی مشکل سے آئی تھی، اچٹتی ہوئی، میں نے چندا کو دیکھا وہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور زخموں سے چور تھی "ناصر مجھے یہاں سے نکالو۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔" اس نے کراہ کر کہا۔ میں اس کی طرف لپکا اور جیسے ہی میں نے اسے زنجیروں سے آزاد کرایا یک دم سارا منظر بدل گیا۔ رب نواز قہقہے لگاتا نظر آیا۔

"پھنس گئے شاہ عالم...... اب بچ کر کہاں جاؤ گے یہ دیکھو میں نے تمہارے لیے خاص چیز تیار کرائی ہے یہ تمہاری بوٹی ہڈی سب چبا جائے گی۔" اس کے اشارے پر ایک نیم حیوانی مخلوق سامنے آئی۔ اس کا بھاڑ سا منہ کھلا تھا جس سے تیز اور نکیلی دانت جھانک رہے تھے اس نے میرے اوپر چھلانگ لگائی اور اپنے دانت میری گردن میں گاڑنے والی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں نے کمبل ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر پانی پیا۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ کچی نیند کی وجہ سے دماغ بوجھل تھا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کر کے ناشتا طلب کیا۔ گرم تلخ کافی کے دو کپ پی کر میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ میں نے کپڑے بدلے۔ بریٹا اور اس کے فاضل میگزین میرے پاس تھے۔ صاعقہ نے مجھے ایک ننھا سا پستول دیا تھا۔ جو کلائی کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ بوقتِ ضرورت یہ ہتھیار کام آتا ہے۔ میں نے سوٹ پہنا تھا۔ اس کی کھلی آستین میں پستول بہ آسانی غائب ہو گیا۔ میں باہر نکلا تو پورچ میں سیاہ رنگ کی تاریک شیشوں والی کار تیار تھی۔ نہ جانے کب آئی تھی۔ اس کی سیٹ پر ایک شخص ڈرائیور کی وردی میں تھا۔ وہ یقیناً کوئی گارڈ بھی تھا۔

"میرا نام انور ہے سر۔" اس نے اتر کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔

"کیا ہمیں چلنا ہے؟"

"بالکل جناب۔" اس نے کہا۔ صاعقہ یا اکبر نہیں ملے تھے مگر اکبر راستے میں ہوتا۔

آدھے گھنٹے ہم لاہور سے باہر جانے والی شاہراہ پر سفر کر رہے تھے۔ میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا لیکن ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی جس میں اکبر اور اس کے ساتھی موجود ہوتے۔ ڈرائیور نے میری بے چینی تاڑ لی تھی۔ اس نے کھنکھار کر کہا "سر وہ ہمارے پیچھے نہیں ہیں۔ پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ اس ریستوران کے آس پاس ملیں گے۔ جہاں ہمیں جانا ہے۔"

"تو پہلے بتانا تھا۔" میں نے اطمینان کی سانس لی۔

"پہلے آپ نے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"کیا تم بھی کرنل کی ایجنسی سے تعلق رکھتے ہو؟"

"جی ہاں۔" وہ اداس ہو گیا "اللہ بخشے۔ کرنل مثالی آدمی تھے۔ بڑی محنت سے انہوں نے ہماری تربیت کی اور ہمیں ہیرے کی طرح تراشا۔"

"کرنل شبیر واقعی اچھے آدمی تھے۔" میں نے کہا۔

وہ کرنل کے بارے میں بتاتا رہا۔ کرنل نے بہت معمولی سطح سے ایجنسی کا آغاز کیا تھا اور آج اس سیکیورٹی ایجنسی کا شمار ملک کی ٹاپ ایجنسیوں میں ہوتا تھا۔ چار گھنٹے کے لگاتار اور تیز رفتار سفر کے بعد ہم اس علاقے میں جا پہنچے۔ جہاں سبحان شاہ کی حکمرانی شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنے بڑھ جانے والے بال جیل کی مدد سے پیچھے کر کے بنائے تھے۔ سیاہ سن گلاسس کے ساتھ میری صورت خاصی حد تک بدل گئی تھی چہرے پر کئی دن کی بڑھی داڑھی تھی۔

"سر ہم قریب آ گئے ہیں۔" ڈرائیور نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم اس علاقے سے واقف ہو؟"

"اسی وجہ سے میرا انتخاب ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا "میں اس سارے علاقے کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح پہچانتا ہوں۔"

چند منٹ بعد کار اس ریستوران کے سامنے جا رکی۔ بس

منظر میں سرسبز کھیتوں کی وجہ سے یہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ عمارت کے سامنے ایک ستون پر پلاسٹر آف پیرس کا عقاب بنا تھا۔ ریستوران کے معیاری ہونے کا اندازہ اس کے سامنے کھڑی بیش قیمت کاروں سے ہو رہا تھا۔ یہاں علاقے کے معززین آیا کرتے تھے۔ میں کار سے اترا تو ڈرائیور بھی اتر آیا "بہتر ہوگا تم اندر رہو اور صرف ڈرائیور نظر آنے کی کوشش کرو۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔ جسے تسلیم کرتے ہوئے وہ فوراً اندر بیٹھ گیا۔

میں ریستوران کے اندر آیا۔ کھانے کا وقت ہونے کی وجہ سے اکثر میزیں بھری ہوئی تھیں۔ اندر سے بھی ماحول صاف ستھرا اور چمکتا ہوا تھا۔ فی الوقت مجھے ایسا کوئی فرد نظر نہیں آیا جو سبحان شاہ کا نمائندہ ہوتا۔ میں ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ رش کے باوجود ویٹر نے میرے پاس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے مینیو میں دیکھ کر بریانی اور چپلی کباب کا آرڈر دیا۔ حیرت انگیز طور پر ویٹر نے صرف پندرہ منٹ میں آرڈر پورا کردیا۔ کھانا گرم اور لذیذ تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے میں نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔

ابھی میں کھانا ختم ہی کر رہا تھا کہ ایک شخص سامنے آ بیٹھا۔

"اگر کھانا ختم کرلیا ہے تو چلیں۔" اس نے آہستہ سے کہا "مجھے شاہ صاحب نے بھیجا ہے۔"

"کہاں جانا ہوگا؟" میں نے رکے بغیر کہا۔

"زیادہ دور نہیں۔" اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

وہ تقریباً تیس بتیس برس کا مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ صورت سے بھی لگتا تھا کہ وہ مار دھاڑ کا عادی رہا ہے۔ کھانا ختم کر کے میں نے بل منگوایا۔ ادائیگی کر کے میں اٹھ گیا۔ جس طرح مجھے اس شخص کی آمد کا پتا نہیں چلا تھا اسی طرح مجھے اب تک اکبر اور اس کے ساتھیوں کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اتنی اچھی طرح خود کو کیموفلاج کر رکھا تھا کہ میں بھی انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔

"کس طرح جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"میری گاڑی ہے۔" وہ بولا۔

"نہیں میں اپنی کار میں جاؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ اپنی گاڑی لے کر میرے پیچھے آئیں۔" اس نے بلا جھجک میری بات مان لی۔

میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ ہلکے ہرے رنگ کی کرولا میں بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"اس کے پیچھے چلو۔"

کرولا گھوم کر سڑک پر آ گئی اور اس طرف روانہ ہوگئی جس پر آگے جا کر سبحان شاہ کی حویلی آتی تھی تاہم اس سے پہلے ہی سبز کرولا دائیں طرف کچے میں اتر گئی۔ جبکہ حویلی بائیں طرف واقع تھی۔ یہ کچا راستہ دونوں طرف سے کھیتوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ ذرا آگے جا کر کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور کانٹے دار جھاڑیاں شروع ہوگئیں۔ میں ہوشیار ہوگیا۔ کسی بھی قسم کے فریب کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ اکبر اور اس کے ساتھی کہاں تھے۔ اب تک ان کی صورت دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی کوئی گاڑی ہمارے عقب میں آئی تھی۔

"یہ لوگ کہاں رہ گئے؟" میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں سر۔" اس نے جواب دیا "انہوں نے جو بتایا تھا میں نے بھی آپ کو بتا دیا۔"

اسی اثنا میں سبز رنگ کی کرولا ایک طرف مڑتی نظر آئی۔ اس طرف درختوں کا بڑا سا جھنڈ تھا۔ میری کار بھی اس کے پیچھے تھی۔ میں نے کمر میں لگے بریٹا پر گرفت کرلی۔ درختوں کے ساتھ راستے سے گھوم کر سبز کار ایک چھوٹے مگر خوب صورت بنگلے کے آگے رکی۔ اس کے گرد چار دیواری تھی اور مین گیٹ پر گارڈ موجود تھا۔ اس شخص نے کار ایک طرف کھڑی کردی۔ میرے ڈرائیور نے بھی اس کے پاس لے جا کر گاڑی روکی۔ وہ کار سے اتر کر میری طرف آیا۔

"ہاشم رضا اس بنگلے میں ہے۔ اندر چلیں۔"

"میرا ڈرائیور بھی اندر جائے گا۔" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "شاہ صاحب نے صرف آپ کے لیے اجازت دی ہے دوسرا کوئی اندر نہیں جائے گا۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تم سبحان شاہ سے پوچھ سکتے ہو؟"

"ان سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پوچھنے کے لیے واپس جانا پڑے گا۔"

میں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر گہری سانس لے کر کار سے اتر آیا "چلو...... لیکن یہ سوچ لینا کہ کوئی دھوکا کیا تو خود تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ تم ہوشیار رہنا۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"جی سر۔" اس نے جواب دیا۔

میں اس کے ساتھ بنگلے کے اندر آیا۔ چار دیواری میں خوب صورت سالان تھا۔ جس میں خوب صورت پھولوں کے تختے تھے۔ عمارت مختصر سی تھی اور پتھروں سے بنی تھی۔ اوپر کھپریل کی چھت تھی۔ اس نے مرکزی دروازے پر دستک

دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اسے دیکھ کر کھولنے والے شخص نے آنے کا راستہ دے دیا۔ لباس اور حلیے سے وہ کوئی ملازم لگ رہا تھا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لایا۔ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس میں ہے ہاشم رضا اندر چلے جاؤ۔"

میں جیسے ہی اندر داخل ہوا میرے قدم رک گئے۔ سامنے سبحان شاہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ میں نے پلٹنا چاہا تو کمر سے ایک سخت سی چیز آ لگی اور پھر کسی نے مجھے اندر کھینچ لیا۔ اندر ایک شخص اور تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ مجھے لانے والے نے میری کمر سے کوئی ہتھیار ہی لگا رکھا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"سبحان شاہ تم نے دھوکا کیا میرے ساتھ......"

"تمیز سے بات کرو شاہ سائیں کے ساتھ۔" داڑھی اور مونچھوں سے خطرناک نظر آنے کی کوشش کرنے والے شخص نے کتے کی طرح غرا کر کہا۔

"ورنہ تم مجھے کاٹ لوگے۔ اسی ڈبا پیر کے پالتو کتے۔" میں نے اسے اشتعال دلانے والے انداز میں کہا۔

اس نے ریوالور میری طرف اٹھایا تھا کہ سبحان شاہ نے اسے اشارے سے روک دیا۔ اس نے احتجاج کیا۔

"شاہ سائیں آپ نے اس کی زبان سنی۔"

"ہم سب سن رہے ہیں لیکن ابھی ہمیں اس سے بات کرنے دو۔"

"یہ تمہارا ہی پلا ہے۔ تم بھی اس کی زبان بولو گے۔" میں نے سبحان شاہ سے کہا۔

"بس شاہ سائیں۔" اس بار اس نے خطرناک انداز میں ریوالور میری طرف کیا۔

"پیرو۔" سبحان شاہ گرجا "دفع ہو جا یہاں سے۔"

"میرے سامنے پیری مریدی کا یہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے حقارت سے کہا "مجھے معلوم ہے ان کے ہی سامنے تم کپڑے اتار کر رقص ابلیس بھی کرتے ہوگے۔"

مجھے پہلے ہی سے توقع تھی کہ سبحان شاہ میرے ساتھ دھوکا کر جائے گا۔ اس لیے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی اور اسی وجہ سے میں نے فوری طور پر ان پر جملے شروع کر دیے تھے۔ مرید کا ریوالور اٹھتے دیکھ کر میں نے غوطہ مارا۔ اسی لمحے گولی چلنے کی آواز آئی مگر میں محفوظ رہا تھا۔ میں نے سبحان شاہ کی سرد آواز سنی۔

"اٹھ جاؤ شاہ عالم!"

اس کے ہاتھ میں ایک عدد پستول نظر آ رہا تھا۔ جس کی نال سے دھواں برآمد ہو رہا تھا مگر اس نے گولی کس پر چلائی تھی؟ اس کا جواب مجھے ایڑیاں رگڑتے مرید کی آخری ہچکی نے دیا۔ گولی۔ اس کے سینے میں دل کے مقام پر اتر گئی تھی۔ سبحان شاہ نے اپنے مرید کو گولی مار دی تھی اور پھر میرے ساتھ آنے والے سے کہا۔

"اس کتے کی لاش لے جا کر کہیں دفنا دو۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا "ابھی چند لمحے پہلے یہ تم پر قربان ہوا جا رہا تھا۔ تمہاری وجہ سے مجھے قتل کرنے جا رہا تھا اور تم نے اس کی عقیدت کا صلہ ایک عدد گولی کی صورت میں دے دیا۔"

"اس نے میرے دو بار منع کرنے کے باوجود تم پر ہتھیار اٹھایا تھا۔ میں نافرمانی برداشت نہیں کرسکتا۔"

میرے ساتھ آنے والے نے دو افراد کو بلایا۔ جو خاموشی سے آ کر مرید کی لاش لے گئے۔ ان کے چہرے لاش لے جاتے ہوئے اتنے سپاٹ تھے جیسے وہ کوئی لاش نہیں کرے سے کچرا اٹھا کر لے جا رہے ہوں۔ سبحان شاہ بھی یوں بے پروائی سے بیٹھا تھا جیسے اس نے ابھی ایک عدد قتل نہیں کیا ہو۔ بلکہ کوئی نیک کام کیا ہو۔ لاش لے جانے کے بعد ایک شخص نے فرش پر بکھرا معمولی سا خون صاف کیا۔ مرید دل میں گولی لگنے سے فوراً ہی جاں بحق ہوگیا تھا۔ اس لیے زیادہ خون بھی نہیں نکلا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ مجھے یہاں ہاشم رضا سے ملنا تھا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "لیکن تم نے آتے ہی مجھے مرعوب کرنے کے لیے یہ گھٹیا ڈرامے شروع کر دیے۔"

اس نے ناگواری سے کہا "اپنی زبان قابو میں رکھو۔ میری برداشت کی بھی ایک حد ہے۔"

"ہاشم رضا کہاں ہے؟"

"اسی بنگلے میں ہے لیکن اس سے ملاقات سے پہلے تم ذرا مجھے کچھ حساب کتاب دو۔"

"میں بتا چکا ہوں۔ نوادرات والے مسئلے میں تمہیں جو نقصان ہوا اس میں رب نواز کا ہاتھ تھا اگر تم کرسکتے ہو تو اس سے حساب طلب کرلو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں اس حساب کی بات نہیں کر رہا۔ میں ان چیزوں کا حساب طلب کر رہا ہوں جو تم نے دلاور شاہ کے لاکر سے نکالی تھیں۔ اس بینک منیجر نے جو حلیہ بتایا تھا وہ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ تم پر پورا اترتا ہے۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے انکار

کر دیا۔

"اس لاکر میں بہت کچھ تھا کروڑوں کی مالیت کے جواہرات تھے۔ بانڈز تھے، ڈالرز تھے اور شیئرز تھے۔ تم بے شک باقی سب رکھ لو لیکن جواہرات میرے حوالے کر دو۔ ان پر دیسے بھی میرا حق بنتا ہے۔"

"حق!" میں ہنسا "حرام کے مال پر کس کا حق ہوتا ہے۔ جس کے قبضے میں ہو اسی کا ہوتا ہے۔"

"میں تم سے مسئلہ وراثت پر بحث نہیں کر رہا۔" اس نے بیزاری سے کہا "مجھے وہ جواہرات چاہئیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں ان کی قیمت کئی کروڑ ڈالر ہے۔"

"ہوگی۔" میں نے بے پروائی سے کہا "لیکن جو چیز میرے پاس ہے ہی نہیں۔ میں وہ کہاں سے دوں۔"

اس کے چہرے پر شعلہ سا لپکا۔ اس بار وہ بولا تو اس کا لہجہ سفاک تھا "شاہ عالم مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم سے پرانے تعلق کو بھول جاؤں۔ دلاور شاہ کا لاکر تم نے ہی خالی کیا تھا۔ اگر تم کہو تو میں اس بینک منیجر کو بھی بلوا سکتا ہوں۔"

"ظاہر ہے وہ وہی کہے گا جو تم چاہو گے۔" میں نے طنز کیا۔

"شاہ عالم، تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔" اس نے گہری سانس لی "کیا اس کی تلاشی لی۔" اس نے عقب میں کھڑے شخص سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا اور جلدی سے میرے جسم پر ہاتھ مارنے لگا۔ اسے بریٹا تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سبحان شاہ کے چہرے پر ناگواری نظر آئی۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اگر یہ مجھے گولی مار دیتا تو تم کیا کر لیتے۔"

"میں اسے گولی مار دیتا۔" اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"...... کے بچے اگر یہ مجھے گولی مار دیتا تو پھر جیتا یا مرتا مجھے اس سے کیا فائدہ ہوتا۔" سبحان شاہ گرجا۔ اس نے اپنے اس عقل مند مرید کو ایک ناپاک جانور کی اولاد قرار دیا تھا۔

"سبحان شاہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بہتر ہے مجھے ہاشم رضا سے ملنے دو۔"

"میں تمہیں مستقل کیوں نہ اس کے ساتھ رکھ لوں۔" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا "ممکن ہے مستقبل میں تمہاری یادداشت بہتر ہو جائے۔"

"تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہو لیکن اس کا اصل فائدہ صرف رب نواز کو ہوگا۔ اس کے خلاف جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ میں منظر سے غائب ہو گیا تو اسے سنبھلنے کا موقع مل جائے گا۔"

سبحان شاہ نے نفی میں سر ہلایا "خفیہ ایجنسیاں اس کی راہ پر لگ چکی ہیں اور جلد وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔"

"یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے۔" میں بولا "اس شخص کو جتنا میں جانتا ہوں کوئی نہیں جانتا۔ اس معاملے میں وہ ابلیس کا ساذہن رکھتا ہے۔"

سبحان شاہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا "دیکھو میں تمہیں رب نواز کی وجہ سے رعایت دے سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم وہ جواہرات میرے حوالے کر دو۔"

"سبحان شاہ۔ جواہرات میرے پاس نہیں ہیں لیکن اگر تم موقع سے فائدہ اٹھانا ہی چاہتے ہو تو میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے پہلے ہاشم رضا سے ملواؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے گہری سانس لی "منظور اسے ہاشم رضا کے پاس لے جاؤ۔"

"چلو۔" میرے ساتھ کھڑے شخص نے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا پھر وہ مجھے لے کر باہر آیا۔ ہاشم رضا کو بنگلے کے ایک عقبی کمرے میں رکھا گیا تھا۔ وہ لوہے کے جان والے پلنگ پر کروٹ بدلے لیٹا تھا۔

"پروفیسر۔" اس نے کہا تو چارپائی پر لیٹا شخص اچھل پڑا تھا۔ وہ میری طرف گھوما تو میں اچھل پڑا تھا۔

"یہ ہاشم رضا ہے؟"

"تو اور کون ہے۔" اس نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

"تمہارا باپ ہے۔" میں نے دھاڑ کر کہا "بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ تم اور وہ تمہارا باپ مل کر۔ سبحان شاہ!"

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "شاید تم اسے پہچان نہیں سکے۔ یہ ہاشم رضا ہی ہے۔"

"یہ ہاشم رضا نہیں ہے۔" میں نے بھنا کر کہا "وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی ہلکی سی فرنچ تھی۔ وہ عینک لگاتا ہے اور سامنے سے تھوڑا سا گنجا ہے۔ اس میں ہاشم رضا والی ایک بھی بات نہیں ہے۔"

وہ بدمزگی سے اسے دیکھنے لگا "یہ ہاشم رضا ہی ہے۔ یقین کرو۔ اوئے بتا تو کون ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو ہاشم رضا ہی ہوں۔" اس نے منمناتی آواز میں کہا۔

"یہ کہیں سے بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نہیں لگتا ہے۔ اس کی زبان دیکھی۔" میں نے کہا۔

"یہ ...... یہ ہاشم رضا ہی ہے۔ اسے تم نے ہمارے حوالے کیا تھا۔"

"وہ اصلی ہاشم رضا تھا۔" میں نے جھلا کر کہا "یہ شخص نہیں ہے۔"

"اوئے تو بتا تا کیوں نہیں ہے۔" اس نے جعلی ہاشم رضا کی گردن دبوچ لی۔

"مجھے مت مارو۔ میری ہڈیاں پہلے ہی توڑ چکے ہو۔" وہ چلانے لگا۔

"میرے سامنے نورا کشتی مت لڑو۔"

اسی لمحے دروازے پر سبحان شاہ نمودار ہوا "کیوں شور کر رہے ہو؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"یہ اصلی ہاشم رضا نہیں ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا "یا تو تم بے وقوف بن گئے ہو یا پھر مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ نہ جانے تمہارے آدمی کسے پکڑ لائے ہیں۔"

"تم نے اس کو میرے آدمیوں کے حوالے کیا تھا۔" وہ بولا۔

"سبحان شاہ تم ڈبا پیر تو ہو ہی۔" میں نے اسے بدمزگی سے دیکھا "لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ جاہل بھی ہو گے اس شخص کو دیکھو۔ اس کی زبان دیکھو، اس کا رکھ رکھاؤ دیکھو کیا یہ کہیں سے بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نظر آتا ہے۔ سبحان شاہ اب مجھے تشویش ہو رہی ہے۔ اگر یہ شخص کسی طریقے سے تم تک پہنچا ہے تو رب نواز کوئی لمبا کھیل کھیل رہا ہے اس نے مجھے بھی بے وقوف بنایا ہے اور تم کو بھی ...... یہ بھی ممکن ہے تم نے ہاشم رضا کا سودا کسی سے کر لیا ہے اور اسی شخص کو میرے سامنے پیش کر رہے ہو۔"

میری بات پر اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا لیکن وہ بے عزتی خاموشی سے پی گیا۔ اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا "اس نے ہمیں رب نواز کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے میرے آدمیوں نے اس کی خاصی مار لگائی ہے مگر یہ تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ خیر بندہ اپنے پاس ہے۔ ابھی معلوم کر لیتے ہیں۔ بابا ذرا جا کر بالے کو بلا لاؤ۔ اس سے کہنا شیرو کو بھی لیتا آئے۔"

جعلی ہاشم رضا کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ سبحان شاہ نے اپنے مرید کو حکم دیا "اسے پچھلے صحن میں لے چلو بابا۔"

"مجھے مت لے جاؤ۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ چلانے لگا۔

"سبحان شاہ غور کی بات ہے اگر یہ شخص بعد میں بدلا گیا ہے تو یہ کام تمہاری صف میں موجود کسی کالی بھیڑ نے کیا ہے۔ ورنہ میرے پاس سے تو اصلی ہاشم رضا تمہارے پاس گیا تھا۔"

"کیا تم دھوکا نہیں کر سکتے؟" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"مجھے کیا ضرورت تھی دھوکا کرنے کی۔ میں ہاشم رضا کو تمہارے حوالے نہ کرنا چاہتا تو سرے سے بات ہی نہ کرتا اور نہ ہی مجھے پروفیسر کو تمہارے سپرد کرنے کی ضرورت تھی۔"

"ابھی سب سامنے آ جائے گا۔"

تھوڑی دیر میں ہم بنگلے کے عقبی صحن میں تھے۔ نقلی ہاشم رضا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا اس نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ ایک طرف سے ایک گرانڈیل شخص گدھے نما کتے کی زنجیر تھامے نمودار ہوا۔ وہ یقیناً بالے اور شیرو کی ٹیم تھی۔ اسے دیکھتے ہی نقلی ہاشم رضا چلانے لگا۔

"میرے کو مت مارو۔ میں سب بتا رہا ہوں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ ہاشم رضا۔"

سبحان شاہ کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ اس نے موبائل فون نکال کر اس پر کسی کو کال کی۔ یہ خصوصی لانگ رینج فون تھا جو خاص طور سے دور دراز علاقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس نے کسی کو حکم دیا "رضا خان اور اس کے سارے ساتھیوں کو گرفتار کر لو۔ ابھی ...... ایک بھی بچ کر نکلا تو اس کی جگہ تم لو گے۔"

غالباً یہ وہ شخص تھا جسے سبحان شاہ نے ہاشم رضا کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے یا اس کے کسی شخص نے غداری کر کے اس آدمی کو ہاشم رضا کی جگہ کر دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تمہیں رب نواز نے بھیجا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور یک دم دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا "اس نے میرے بیوی بچوں کو قید کر رکھا ہے۔ اگر میں خود کو ہاشم رضا بنا کر نہ آتا تو وہ میری بیوی اور بچوں کو مار ڈالتا۔ ان میں میری دو جوان بیٹیاں بھی ہیں۔"

"تو تمہارے خیال میں اب وہ محفوظ ہوں گی۔" میں نے تلخی سے کہا "جان نہ سہی آبرو وہ گنوا ہی چکی ہوں گی۔ میں رب نواز کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس کے چنگل میں کیسے پھنسے؟"

"میں ایک چھوٹا کاروباری ہوں۔ کاروبار کے لیے میں نے رب نواز سے قرض لیا تھا لیکن قرض ڈوب گیا تو اس نے مجھے اپنی کوٹھی پر ملازم رکھ لیا۔ بس میری مت ماری گئی تھی کہ میں بیوی اور بچیوں کو بھی وہاں لے گیا اس کے بعد وہ یرغمال بنالی گئیں اور میں رب نواز کے لیے کام کرنے پر مجبور ہو گیا۔"

"کون سی کوٹھی۔ لاہور میں گارڈن والی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا "وہی۔"

"وہاں اب کوئی نہیں ہے۔ پولیس نے اس کی کوٹھی اور دیہی حویلی پر بھی چھاپا مارا ہے لیکن وہ اور اس کے خاندان کے سارے افراد غائب ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں پتا ہے۔ تمہاری بیوی اور بچے بھی کہیں نہیں ملے۔"

اس کا چہرہ سفید ہوگیا تھا "وہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔"

"کہاں؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ اس کے بے شمار ٹھکانے ہیں۔"

"تم جن کے بارے میں بھی جانتے ہو مجھے بتاؤ۔ یہ بہت ضروری ہے۔ رب نواز کو پکڑ کر نہ صرف تمہارے بیوی بچوں بلکہ اور بھی بے شمار بے گناہ لوگوں کو اس کی قید سے چھڑایا جاسکتا ہے۔"

"ایک تو لال حویلی ہے۔ وہ اس کے نچلے تہ خانے میں چھپ سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"وہاں بھی دیکھ لیا گیا ہے۔ کوئی نہیں ملا۔"

اس نے دو تین جگہیں اور گنوائیں لیکن ان سب پر پولیس اور خفیہ ایجنسی چھاپا مار چکی تھی۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ یہ شخص بھی رب نواز کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا۔ سبحان شاہ نے کہا۔

"تو اس طرح نہیں مانے گا۔ بالے اس پر کتا چھوڑ۔"

"نہیں۔" اس کے حلق سے دہشت زدہ چیخ نکلی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر بالے کے اشارے پر شیرو نے اسے دوسری جست میں ہی جالیا تھا۔ اس کے منہ سے دوسری چیخ نکلی اور شیرو نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ آناً فاناً اس نے اس بدنصیب شخص کا نرخرا ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس کے گلے سے خر خرانے کی لرزہ خیز آوازیں آ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایڑیاں رگڑتے ہوئے دم توڑ دیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا تھا۔ ایک منٹ پہلے وہ جیتا جاگتا انسان تھا جو اب دیکھتے ہی دیکھتے بے جان لاش میں بدل گیا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے غصے سے سبحان شاہ کی طرف دیکھا۔

"وہی جو تمہارے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔" اس کے تیور یک دم بدل گئے تھے "شاہ عالم مجھے وہ جواہرات ہر صورت میں چاہئیں۔ اگر تم اس کی طرح مرنا نہیں چاہتے تو مجھے ان کا پتا بتا دو۔"

مجھے کتے سے زیادہ بالے سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ٹھوس جسم کا تنومند شخص تھا اور خالی ہاتھوں سے بھی کسی کا بھرتا بنا سکتا تھا۔ اس دوران میں طے کرچکا تھا کہ مجھے کیا کرنا تھا۔

سبحان شاہ کی نیت شروع سے درست نہیں تھی۔ بس اس نے درمیان میں نقاب لگالیا تھا۔ جب میں نے اسے جواہرات کے پتے سے آگاہ کیا جو نا قابلِ بیان بھی تھا تو اس کے تیور بدل گئے۔ اس نے چیخ کر بالے کو آواز دی اور بالے کے اشارے پر کتا میری طرف لپکا۔ اس کا انداز اتنا خوف ناک تھا کہ ایک بار تو میں نے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کا سوچا مگر اس صورت میں سبحان شاہ کا مرید مجھے گولی مار دیتا۔ دل کڑا کرکے میں نے کتے کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا۔ میں نے آستین میں چھپے ننھے سے پستول کو جھٹکا دیا۔ وہ پھسل کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ کتے نے بھاڑ سا منہ کھول کر مجھ پر جست لگائی۔ میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اس کے کھلے منہ میں گولی اتار دی اور اس کے ساتھ ہی مرید کو بھی گولی مار دی۔ خوش قسمتی سے گولی بالکل ٹھیک ماتھے پر لگی۔ میرا مقصد سبحان شاہ کو قابو کرنا تھا مگر وہ مکار آدمی گولی کی پہلی آواز سے ہی ہوشیار ہوگیا تھا وہ فوراً بالے کے عقب میں ہوگیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھتے ہی جست لگائی اور برآمدے میں لگی لکڑی کی دیوار کے دوسری طرف جا گرا۔ یہ سب بمشکل آدھا منٹ کے اندر ہوگیا تھا۔ سبحان شاہ نے میری طرف لگاتار کئی فائر کیے۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو آواز دے رہا تھا۔ میرا اندازہ غلط ہوگیا تھا۔ ایک ننھے سے پستول کے سہارے میں سبحان شاہ کے مریدوں کی اس فوج سے نہیں لڑ سکتا تھا جو اب چاروں طرف سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں نے ذرا سا اٹھ کر سبحان شاہ کی طرف کئی فائر کیے مگر ساری گولیاں اس کے آگے ڈھال بنے کھڑے بالے کے دیوہیکل وجود میں سما گئیں۔ اس نے بیل کی ڈکار کی سی آواز نکالی اور منہ کے بل گر گیا۔ ڈھال کے گرتے ہی سبحان شاہ نے صحن میں ایک طرف دوڑ لگادی۔ میں نے اس پر فائر کرنے کی کوشش کی مگر پستول خالی ہوچکا تھا۔ جب تک میں اس کا میگزین بدلتا، سبحان شاہ غائب ہوچکا تھا۔

اسی لمحے کسی نے بائیں طرف سے مجھ پر پورا برسٹ ہی چلا دیا۔ میں بال بال بچا۔ گولیاں دائیں بائیں سے گزری تھیں۔ میں نے چھلانگ ماری اور لکڑی کی اس دیوار کے دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں میں اس آدمی کی فائرنگ سے تو محفوظ تھا لیکن اس کے علاوہ میرے چاروں طرف کھلا میدان تھا۔ کسی طرف سے بھی کوئی نمودار ہوکر مجھے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں جھکا ہوا تھا پاس ہی مجھے مرحوم مرید کا پستول

نظر آیا۔ یہ خاصا بڑا اور زیادہ فاصلے تک نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ مرید کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے میرا بریٹا بھی نکل آیا تھا۔ میں نے ننھا پستول دوبارہ آستین میں چھپا کر دونوں پستول دونوں ہاتھوں میں سنبھال لیے۔ خطرے میں ہونے کی وجہ سے میرے اعصاب زیادہ ہی چوکنا تھے۔ مجھے بروقت اپنے عقب میں دائیں طرف کسی کی نقل و حرکت کا احساس ہوا۔ میں پشت کے بل گرتے ہوئے گھوما۔ گولی مجھ سے بمشکل چند انچ کے فاصلے سے گزری تھی۔ یہ شخص اسی طرف سے نمودار ہوا تھا جہاں سبحان شاہ گیا تھا۔ میں نے اس پر لگاتار کئی گولیاں چلائیں۔ اس نے چلا کر سرائیکی میں گالی دی اور زمین پر گر گیا۔ بائیں طرف والے نے پھر برسٹ چلایا مگر دیوار کے عقب میں میں محفوظ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر بنگلے کی عقبی دیوار کی طرف دیکھا۔ اگر میں اسے دوڑ کر عبور کرنا بھی چاہتا تو وہ اس سے پہلے ہی مجھے مار گراتا۔ بھاگنے سے پہلے اس کا تدارک ضروری تھا۔ اچانک مجھے مرید کا خیال آیا۔ اس کا قد زیادہ نہیں تھا اور نہ ہی وزن خاص تھا لیکن جب میں نے اسے اٹھایا تو وہ خاصا بھاری ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے ذرا اوپر کرتے ہوئے بائیں طرف فائر کیا۔ جواب میں برسٹ آیا اور مرید کی لاش میں کئی سوراخ اور ہوگئے۔ میں نے دل خراش چیخ ماری اور مرید کی لاش یوں گرادی جیسے وہ گولیاں لگنے سے جاں بحق ہوچکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں دیوار کے ساتھ رینگتا آگے کی طرف جانے لگا۔ اس احمق نے یہ سمجھا کہ میں مارا جاچکا ہوں۔ وہ دیوار کی اوٹ سے سر نکال کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب میں اچانک ہی اس کے سامنے سے دیوار کی اوٹ سے برآمد ہوا تو اسے بدحواسی میں مشین گن کا رخ میری طرف کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میں نے اس سے پہلے ہی اسے گولی مار دی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ اس وقت بنگلے میں یہی چند افراد تھے۔ یہ مین گیٹ کا محافظ تھا۔ میں نے اس کی مشین گن اٹھالی اس کے فاضل میگزین اس کی کمر پر ایک بیلٹ سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بنگلے سے جانے کے بجائے اسی طرف سے جانے کا فیصلہ کیا اور فوراً ہی میرا فیصلہ غلط ثابت ہوا۔ اگر میں بروقت برآمدے میں نہ ہوجاتا تو دوسری طرف سے چلایا جانے والا برسٹ مجھے ضرور جاں بحق کردیتا۔ میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ مجھے دوسری طرف بھی نظر رکھنا تھی۔ ورنہ کوئی بھی آسانی سے مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔

"شاہ عالم ہتھیار پھینک دو۔" اندر سے سبحان شاہ نے چلا کر کہا۔

میں نے اسے گالیوں سے نوازا "پیر کی دم، دھوکے باز تجھے یہ دھوکے بازی مہنگی پڑے گی۔ تیرے تین دو پاؤں والے اور ایک چار پیروں والا کتا مارا جاچکا ہے۔ رب نواز کے ساتھ اب میں تیرا بھی بیڑا غرق کرکے ہی چھوڑوں گا۔" میری لاف گزاف کا مقصد وقت حاصل کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ سبحان شاہ اپنے عقل کے اندھے مریدوں کو مجھ پر چڑھائی کا حکم دے دیتا۔

اسی لمحے باہر کی طرف سے مسلسل فائرنگ کی آواز آئی۔ میں نے سبحان شاہ کو چلاتے سنا "یہ کون ہے۔ فائر کون کرر......" اس کی آواز ایک اعصاب شکن دھماکے میں دب گئی تھی۔

دھماکا اتنا شدید تھا کہ میں نیچے گر گیا۔ اس کے بعد مسلسل فائرنگ کے ساتھ کسی کی چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سبحان شاہ اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کر آواز دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی وقت میرے لیے اندر جانے کا تھا۔ میں دوڑ کر اس دروازے میں گھس گیا۔ جس سے ہم باہر آئے تھے۔ کمرے کا نقشہ مجھے یاد تھا۔ اندر گھستے ہی زمین پر گرتے ہوئے لڑھک کر سائڈ میں رکھے صوفے کے عقب میں چلا گیا۔ سبحان شاہ کی ایک جھلک مجھے نظر آئی تھی اس نے مجھ پر فائر کیا اور میں نے اس پر فائر کیا مگر ہم دونوں کے ہی نشانے چوک گئے تھے۔ وہ تیزی سے اگلے کمرے میں گھس گیا تھا۔

"سبحان شاہ تم گھر گئے ہو۔ ہتھیار پھینک دو۔" میں نے چلا کر کہا "تمہارے سارے آدمی جہنم رسید ہوچکے ہیں۔"

سبحان شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے احتیاط سے صوفے کے نیچے.... جھانکا اور پھر اس کے پیچھے سے نکل کر دوسرے صوفے کے عقب میں چلا گیا۔ سبحان شاہ اس طرف نہیں تھا۔ میں نے ایک صوفہ اٹھا کر اس دروازے پر..... مارا جس میں سبحان شاہ گیا تھا۔ دروازہ کھل گیا اور صوفہ اندر جا گرا مگر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ اب باہر سے فائرنگ کی آواز رک گئی تھی۔ بنگلے کے اندر جانے والے دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں بے اختیار دیوار سے لگ گیا تھا۔ میرا جسم تن گیا تھا۔

"یہ میں ہوں اکبر۔" اکبر کی آواز آئی تو میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ وہ محتاط انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

"سبحان شاہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کمرے میں گیا ہے۔" میں نے بتایا۔

اس نے سیٹی بجائی ''وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔''

کہتے کہتے اس نے یک دم جست لگائی اور کمرے میں جا گرا۔ اس بار بھی کوئی فائر نہیں ہوا ''آ جایئے۔ وہ نکل گیا ہے۔'' اکبر نے کہا تو میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ صوفہ ایک طرف سرکا ہوا تھا اور اس سے نیچے جانے والا راستہ ظاہر ہو رہا تھا۔ سبحان شاہ اس راستے سے نکل گیا تھا۔ اکبر کان پر ہاتھ رکھے کسی سے کہہ رہا تھا۔

''دیکھو وہ کسی طرف سے نکل نہ جائے۔ اس نے سرنگ استعمال کی ہے۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔''

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' میں نے تیزی سے کہا ''سبحان شاہ اتنا اہم آدمی نہیں ہے۔''

''نہیں اگر وہ نکل گیا تو ہمارے لیے مشکلات پیدا کرے گا۔ اس علاقے میں اس کے اشارے پر سب ہوتا ہے۔ عام آدمی سے لے کر پولیس تک ہماری راہ کی دیوار بن جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اتر گیا ''آپ یہیں ٹھہریں۔''

اس نے نیچے سے کہا۔ میں اوپر ہی رک گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں سبحان شاہ نے ہمیں دھوکا تو نہیں دیا ہے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک تو وہی دروازہ تھا۔ جس سے سبحان شاہ اندر گھسا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ بظاہر باتھ روم کا نظر آتا تھا۔ میں نے اس پر دباؤ ڈالا یہ اندر سے بند تھا اور باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند نہیں ہوتا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے لاک پر فائر کرکے اسے توڑ دیا۔ میں اندر گھسا۔ یہ ایک اور کمرا تھا چھوٹا سا مگر اس کے اوپر روشن دان کا ایک پٹ کھلا تھا۔ سبحان شاہ یقیناً یہیں سے نکل گیا اس نے ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے سرنگ والا راستہ کھولا تھا۔ میں اچھل کر اس الماری پر چڑھا جس کے اوپر روشن دان تھا۔ اچھی خاصی کھڑکی تھی۔ میں نے اس سے باہر جھانکا۔ یہ چھت کا ہی ایک حصہ تھا۔ جو آگے جا کر کھل گیا تھا۔ میں احتیاط سے اس سے آگے بڑھا۔ سرنگ نما راستہ بنگلے کے ایک ایسے حصے میں جا کر ختم ہوا تھا جہاں چھت چار دیواری کے عین اوپر تھی۔ اگر کوئی دیکھ نہیں رہا تھا تو سبحان شاہ اس سے اتر کر بہ آسانی فرار ہو گیا ہوگا۔ میں نے احتیاط سے نیچے جھانکا۔ اس طرف دیوار کے ساتھ ہی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ سبحان شاہ ان کی آڑ میں نکل گیا تھا اور کم سے کم یہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں واپس آیا تو اکبر جھلایا ہوا موجود تھا۔

''اس نے دھوکا دیا۔ سرنگ آگے سے بند ہے کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔''

''وہ چھت کے راستے فرار ہوا ہے اور اب تک خاصا دور نکل گیا ہوگا۔ بہتر ہے ہم بھی نکل جائیں۔''

''پک اپ کرو۔'' اس نے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہم تیزی سے باہر نکلے نشست گاہ میں ایک لاش نظر آئی اور دوسرا شخص برآمدے میں اوندھے منہ پڑا تھا اس کا زخم نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے ارد گرد جتنا خون پھیلا تھا اتنا ہی کسی صحت مند آدمی کے جسم میں ہوتا ہے۔ بیرونی گیٹ سرے سے غائب تھا۔ دھماکا اس بم کا تھا جس نے گیٹ کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔

''تم لوگ کیسے آئے۔ میں سارے راستے دیکھتا آیا تھا لیکن تم لوگ کہیں نظر نہیں آئے۔'' میں نے پوچھا۔

''ابھی آپ دیکھ لیں گے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔''

جیسے ہی ہم باہر نکلے مختلف اطراف سے چار افراد ہم سے آ ملے۔ انہوں نے خاکی رنگ کے ڈھیلے لباس پہن رکھے تھے۔ آنکھوں پر بڑے سے سیاہ چشمے تھے اور سر پر سیاہ رنگ ہی کی ٹوپی چڑھا کر وہ سب ایک جیسے لگ رہے تھے۔ ان کے پاس ہلکی مشین گنیں تھیں۔ اکبر تیزی سے جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور باقی چاروں میرے پیچھے تھے۔ جھاڑیاں گھنی تھیں مجھے حیرت تھی کہ انہوں نے اس میں راستہ کیسے تلاش کر لیا۔ جھاڑیوں کے بعد جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ اب اکبر دوڑنے لگا تھا اور ہم بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے اچانک مجھے اپنی کار اور ڈرائیور کا خیال آیا۔

''وہ آدمی کہاں ہے جو میرے ساتھ آیا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''واپس چلا گیا کار لے کر۔'' اکبر نے جواب دیا ''اس کی فکر مت کریں۔''

اچانک ہی درخت ختم ہو گئے۔ سامنے ایک مختصر سا میدان تھا اور اس میں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اکبر نے کس طرح نظروں میں آئے بغیر میرا تعاقب کیا تھا ''یہ ہیلی کاپٹر تمہارا ہے؟''

''نہیں کرائے پر لیا ہے۔'' اس نے جواب دیا ''پہلے میرا ارادہ تھا کہ ہم سڑک کے راستے جائیں گے مگر اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔''

ہیلی کاپٹر میں ایک شخص پہلے ہی پائلٹ کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اکبر کو دیکھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ ہم سب سوار ہوئے اور ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو گیا۔ شکر ہے اس کا

پریشرائزڈ کیبن تھا۔ ورنہ شور سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی

''ہاشم رضا کا کیا ہوا؟'' اکبر نے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل سے بنگلے میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بتایا ''وہ سرے سے ہاشم رضا ہی نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے رب نواز نے مجھے اور سبحان شاہ دونوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ ہاشم رضا اس کے پاس ہے اور اس کے پروجیکٹ کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس نے کسی طرح سبحان شاہ کے آدمیوں سے پروفیسر کو حاصل کر لیا تھا اور یہ بے حد خطرناک بات ہے۔ نیم حیوانی مخلوق کی تیاری کا انسانیت سوز کام جاری ہے۔ اس گدھے کے بچے سبحان شاہ نے اسے مروانے میں جلدی کی۔ ورنہ ممکن ہے اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔''

ہیلی کاپٹر سرسبز کھیتوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ نیچے گھر اور لوگ بہت ہی مختصر نظر آ رہے تھے۔ ایک سڑک سے گزرتی گاڑیاں اتنی بلندی سے کھلونا لگ رہی تھیں ''اتنی بلندی سے تم ہماری گاڑی پر کیسے نگاہ رکھے ہوئے تھے؟''

''دوربین سے۔'' اکبر مسکرایا۔

''کیا تم لوگ مستقل پرواز کرتے رہے تھے۔ جب میں ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا۔''

''اس وقت میں نے ہیلی کاپٹر ایک نزدیکی جگہ اتروا لیا تھا۔ میرا ایک آدمی ریستوران کے باہر بھی موجود تھا وہ مجھ سے مسلسل رابطے میں تھا۔ جیسے ہی آپ روانہ ہوئے مجھے معلوم ہو گیا اور ہم بھی ہیلی کاپٹر لے کر چل پڑے۔ بنگلے تک آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی مگر ہم اشارے کے بغیر حرکت میں نہیں آ سکتے تھے۔ فائرنگ نے ہمیں حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔''

''اور اگر وہ مجھے اندر ہی فوت کر دیتے۔'' میں نے خفگی سے کہا۔

''تو ہم کیا کر سکتے ہیں جب موت کا وقت آتا ہے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''بہرحال میرا کام نہیں ہوا۔ رب نواز لاپتا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ سرکاری ایجنسیوں کے ساتھ اب ہم بھی اس کے پیچھے ہیں اسے کرنل کی زندگی کا حساب دینا پڑے گا۔'' اکبر کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا ''کل اس کے مقامی آفس میں کسی نے بم رکھ دیا۔ دھماکے سے پورا دفتر تباہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے دفتر خالی تھا اس لیے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔''

''اس قسم کے معمولی نقصانات سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا ''تم ایک دیو کو کنکر سے مار رہے ہو۔''

''پھر ہم کیا کریں۔ کرنل کی موت ہمارے لیے دل کا داغ بن گئی ہے۔ وہ ہمارا باس ہی نہیں باپ بھی تھا۔'' اکبر کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

''اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے سارے وسائل رب نواز اور ہاشم رضا کی تلاش پر لگا دو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا ''دونوں میں سے ایک بھی ہاتھ آ گیا تو سمجھو ہمارا کام بن جائے گا۔''

جو فاصلہ ہم نے کار میں چار گھنٹے سے زیادہ وقت میں طے کیا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے محض پون گھنٹے میں طے کر لیا۔ لاہور کی ایک پرائیویٹ ائر فیلڈ پر لینڈنگ کے بعد ہم صاعقہ کے بنگلے میں آ گئے تھے۔ میں تھکن اور مایوسی محسوس کر رہا تھا۔ رب نواز تو غائب تھا ہی۔ ہاشم رضا کے معاملے میں دھوکے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گویا میں اسے غائب کرکے مطمئن تھا کہ اب رب نواز کچھ نہیں کر سکے گا لیکن وہ مجھے اور سبحان شاہ کو بے وقوف بنا کر ہاشم رضا سے کام لے رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ اس نے ہاشم رضا کا اس کے کام سمیت سودا کرکے اتنی دولت کمائی ہو کہ اب وہ ساری عمر کہیں اور بھی بسر کرتا تو یہ دولت خرچ نہ کر پاتا۔ بلکہ اسے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت تھی وہ اسی سرزمین پر رہتا اور جب سیاسی حالات بدلتے تو دوبارہ منظر عام پر آ جاتا۔ اس کے دامن کے سارے داغ اور اس کی غداری دولت کے انبار تلے چھپ جاتی۔

صاعقہ کے اصرار پر میں نے چند لقمے زہر مار کیے پھر میں نے پہلے ڈاکٹر کمال ...کو فون کرکے ان کی خیریت کا پوچھا اور انہیں محتاط رہنے کو کہا۔ اس کے بعد نیلم ہاؤس فون کیا۔ وہاں بھی سب خیریت تھی۔ خالہ بانو نے بڑے دل گیر لہجے میں کہا کہ ننھا عمر اب انہیں ہی ماں سمجھنے لگا ہے۔

''میاں اس بے چارے کو تو معلوم ہی نہیں کہ اس پر کیا سانحہ گزر گیا ہے۔''

''خالہ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔'' میں نے کہا ''یہ بتایئے کہ کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی کوئی شخص یا کوئی فون تو نہیں آیا تھا۔''

''تم نے اچھا یاد دلایا میاں۔ کل رات ایک فون آیا تھا۔ اسی اسلم کا جو یہاں سے خاموشی سے بھاگ گیا تھا۔''

''اسلم کا...... کیا کہہ رہا تھا؟''

''تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا ایک نمبر بھی لکھوایا ہے۔'' خالہ بولیں ''ٹھہرو میں ڈائری لے کر آتی ہوں۔ میں نے لکھ

لیا تھا۔'' خالہ گئیں اور واپس آ کر مجھے ایک نمبر بتایا ''بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا کہ آج تم ضرور اس سے بات کر لو ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

میں مضطرب ہو گیا۔ اسلم خاموشی سے نیلم ہاؤس سے بلاوجہ نہیں گیا تھا۔ بلکہ اس کا کوئی خاص مقصد تھا۔ وہ رب نواز سے اپنے خاندان کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ خالہ سے بات مختصر کر کے میں نے ان کا دیا ہوا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے فون اٹھایا ''ہاں جی...... کس سے بات کرنی ہے۔''

''اسلم سے۔'' میں نے مختصر کہا۔

''یہاں کوئی اسلم نہیں رہتا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔

''دیکھیں خود اسلم نے یہ نمبر لکھوایا ہے۔ اس سے کہیں کہ میں شاہ عالم اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ عورت نے ریسیور رکھ دیا اور چلی گئی۔ رابطہ برقرار تھا۔ پس منظر میں کسی خراب چال والے پنکھے کا شور نمایاں تھا۔ تقریباً پانچ چھ منٹ کے بعد ریسیور اٹھایا گیا اور کسی نے محتاط سے انداز میں پوچھا ''آپ شاہ عالم ہیں نا؟''

''ہاں اور تم اسلم بات کر رہے ہو؟''

اس کی آواز بحال ہو گئی ''آپ کہاں تھے جناب...... میں تو تلاش کر کر کے پاگل ہو گیا ہوں۔ میں آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ رب نواز کامیاب ہو جائے۔''

''رب نواز۔'' میرا دل تیزی سے دھڑکا تھا ''کہاں ہے وہ حرام زادہ؟''

''میں فون پر سب نہیں بتا سکتا۔'' اس نے بے تابی سے کہا ''مجھ سے ملیں۔''

''تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔''

''میں...... شاہی محلے میں ہوں۔ کسی سے حسنہ کا پوچھ لیں۔ اس کے کوٹھے پر ٹھہرا ہوں۔ رب نواز کے آدمی کتے کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔''

''تم نے چھپنے کے لیے خوب جگہ تلاش کی ہے۔'' میں ہنسا ''میں ابھی آ رہا ہوں۔''

احتیاطاً میں نے اسلم کو اپنے پاس بلانے کے بجائے اس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے صاعقہ کو بلا کر اسے اپنی روانگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے تشویش سے کہا ''آپ کا اکیلے جانا اچھا نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا اپنے ساتھ ایک دو گارڈز لے جائیں۔''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلم رب نواز کے بدترین دشمنوں میں سے ایک ہے۔ اگر اس کا بس چلے تو رب نواز کے سارے خاندان کو اپنے ہاتھ سے ختم کر دے۔''

''پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔'' اس نے دبی زبان میں کہا۔

''مجھے مستقل طور پر ایک گاڑی چاہیے۔ اگر کوئی مل رہی ہے تو اس کی ادائیگی کر دوں گا۔''

''پلیز یوں شرمندہ نہ کریں۔ ایک گاڑی کیا چیز ہے پوری ایجنسی اس وقت آپ کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس وقت میری گاڑی ہے۔ کل تک میں آپ کے لیے الگ کوئی کار منگوا لوں گی۔''

''نہیں میں تمہاری کار استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

میں نے سوٹ اتار کر سادہ شلوار قمیص پہن لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ حلیے کی وجہ سے کوئی میری طرف متوجہ ہو۔ شیو بڑھ کر اب مختصر داڑھی کا روپ اختیار کر چکی تھی اور مجھے ایک نظر میں شاہ عالم کے طور پر شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ٹیکسی لی اور اسے شاہی محلے چلنے کو کہا۔ باریش ڈرائیور نے لاحول ولاقوۃ پڑھی مگر ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ٹیکسی کی رفتار کے ساتھ اس کی زبان بھی سماج کی اس برائی کے بارے میں چلنے لگی۔ وہ نت نئے انکشافات یوں کر رہا تھا جیسے اس نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہو۔ خدا خدا کر کے ٹیکسی اور اس کے ساتھ ہی اس کی زبان رکی۔ کرایہ دیتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

''تم نے بڑی تحقیق کر رکھی ہے اس بارے میں کہیں اس دھندے میں شامل تو نہیں رہے ہو۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' اس نے جاتے جاتے سخت برا مان کر کہا۔ میں ہنس دیا۔ طوائفوں کی اتنی اقسام کا تو مجھے علم ہی نہیں تھا جتنی اس ٹیکسی ڈرائیور کے علم میں تھیں۔ میں نے دو تین آدمیوں سے حسنہ کے کوٹھے کے بارے میں پوچھا۔ بالآخر ایک ذرا نیک قسم کے دلال نے اپنے مخصوص کوٹھوں پر لے جانے کی کوشش کرنے کے بجائے مجھے حسنہ کا پتا بتا دیا اور ساتھ ہی منہ بنا کر آگاہ کیا۔

''اس کنجری میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ بازار کا سب سے کھرا مال ہے۔''

حسنہ کا کوٹھا اپنی خستہ حالی سے دھندے کی مندی کا رونا رو رہا تھا۔ چرچراتی سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو ایک مریل سے شخص نے میرا استقبال کیا ''آ ہو بادشاہو۔ تمہارا ہی

انتظار تھا۔ بڑا سچا مال ہے۔''

اس کے جملے کا آخری حصہ سن کر میری خوش فہمی دور ہو گئی تھی ''حسنہ کہاں ہے؟'' میں نے رکھائی سے کہا۔

اس نے منہ بنایا اور اندر منہ کر کے بولا ''حسنہ تیرا کوئی جاننے والا آیا ہے۔''

اس نے لفظ جاننے والے کو خاص انداز میں ادا کیا تھا۔ فوراً ہی اندر سے ایک عورت برآمد ہوئی تھی۔ خوب صورت تو وہ جوانی میں بھی نہیں رہی ہوگی مگر اب اس کا وجود واقعی ایک کچرا رہ گیا تھا۔ جس کے پاس سے گزرنے والے اس پر نظر ڈالنے کے بجائے منہ پر رومال رکھ لیتے ہوں گے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''آؤ جی۔ بسم اللہ۔''

''اسلم کہاں ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''اندر ہی ہے۔ آؤ ناں۔'' اس نے بھونڈے انداز میں لگاوٹ کا مظاہرہ کیا۔

''بادلِ ناخواستہ میں نے اندر کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ لکڑی کا دہرے پٹ والا دروازہ تھا۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا دروازہ کھٹ سے عقب سے بند ہو گیا اور میں ساکت رہ گیا۔ غالباً اندر اسلم کے بجائے تین آنکھ والا جن بھی میرا منتظر ہوتا تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی میجر شاہد کو دیکھ کر ہوئی۔

''ناصر عظیم!'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا ''آؤ...... آؤ رک کیوں گئے۔''

گویا میرے لیے اسلم کی مدد سے ٹریپ لگایا گیا تھا اور میں احمقوں کی طرح اس میں آ پھنسا تھا۔ کاش میں نے صاعقہ کی بات مان لی ہوتی۔ میرے کرتے کی جیب میں پستول تھا لیکن اسے نکالنے کی کوشش خودکشی ہی کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ میجر شاہد کے ہاتھ میں موجود پسٹل کا رخ عین میرے دل کی طرف تھا اور اس سے میں امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہ گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر کرے گا۔ اس کی آنکھیں ساکت تھیں اور ان سے سرد مہری ٹپک رہی تھی۔ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر میں مسکرایا تھا۔

''میں تو سوچ رہا تھا کہ تم مہاویر چکرا وصول کر رہے ہو گے لیکن تم تو اب تک یہیں ہو۔''

''بھارت ماتا کے سپوت تمغوں کے لیے کام نہیں کرتے۔''

''ہاں تمہارے اعلیٰ حکام کو بھی میڈلز سے زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ ریوڑی کی طرح بانٹ دیتے ہیں۔ ایک بے چارے کو شہید قرار دے کر میڈل بھی دے دیا جو اسپتال میں پڑا علاج کے لیے رو رہا تھا۔'' میں نے ہنس کر طنز کیا تو اس کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا تھا۔

''بکواس مت کرو۔'' وہ پھنکارا ''تمہاری وجہ سے میری برسوں کی جمی جمائی پوزیشن کا خاتمہ ہو گیا۔ تم نے میری باتیں ریکارڈ کر لی تھیں۔ ورنہ میں اس کرنل کو بھی دیکھ لیتا جو نرک میں جا چکا ہے۔''

''کرنل کو تم نے مارا ہے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''اپنے ہاتھ سے۔'' اس نے قہقہہ لگایا ''مگر ابھی میری انتقام کی آگ بجھی نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا ''وہ تو تمہاری چتا کی آگ کے ساتھ ہی بجھے گی۔''

اس نے اچانک گولی چلائی جو میرے سر کو چھوتی گزر گئی تھی۔ میں نے خود کو زندہ پا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا ''ناصر تمہیں اتنی آسان موت نہیں ملے گی۔''

''تم مجھے مہلت دے کر غلطی کر رہے ہو۔ بھارت ماتا کے احمق سپوت!''

''اس کی تلاشی لو۔'' اس نے میری بات نظر انداز کر کے کسی سے کہا۔

دائیں طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے خدوخال جنوبی ہندوستان کے لوگوں جیسے تھے۔ لمبا قد اور گٹھا ہوا جسم۔ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں میری تلاشی لی اور بریٹا برآمد کر لیا۔ پستول پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرایا تھا ''یہ اب تک ہے تمہارے پاس۔''

''اسلم کہاں ہے؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

''اسے اسلم سے ملا دو۔'' میجر شاہد نے اس شخص سے کہا۔

تامل نے بھی پستول نکال لیا ''چلو۔'' اس نے کہا ''کوئی بدمعاشی مت کرنا۔''

وہ مجھے برابر والے کمرے میں لایا۔ جہاں اسلم ایک کرسی سے بندھا بیٹھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر دکھ کی لہر سی اٹھی تھی۔ اس کا پورا جسم برہنہ تھا اور جا بجا چاقو سے کٹ لگے تھے۔ ایک بازو کی کھال تو اتر ہی گئی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے بے تابی سے اس کا چہرہ تھپکا ''اسلم یہ کیا ہوا؟ بولو......''

اس نے سر اٹھایا۔ ابھی میں نے ایک گھنٹا پہلے ہی اس سے بات کی تھی تو وہ ٹھیک تھا۔ اس کی یہ حالت فون کے بعد ہی ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کر تامل سے کہا ''ظالموں جب اس نے

"تمہارا کام کر دیا تھا تو پھر اس کی یہ حالت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

تاثل سفاک انداز میں مسکرایا "تمہیں دکھانے کے لیے یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ تم نے ہمارے کو جو نقصان کیا ہے اس کی سزا تم کو ضرور ملے گی۔"

میں دوبارہ اسلم پر جھک گیا۔ "اسلم...... اسلم...... آنکھ کھولو...... دیکھو میں شاہ عالم ہوں۔ بتاؤ رب نواز کہاں ہے...... بتاؤ۔" میں اس کا چہرہ تھپتھپانے لگا۔ اس نے سر ہلایا اور بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔

"صاحب...... آپ بھاگ جائیں......" اس نے سرگوشی کی "میں مجبور تھا...... یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔"

"رب نواز کہاں ہے؟"

"لال حویلی میں۔" اس نے آہستگی سے کہا کہ میں بمشکل سن سکا تھا۔ "چندا بھی وہیں ہیں۔"

"چندا۔" میرا دل تڑپا "وہ ٹھیک ہے ناں؟"

اس نے سر ہلایا "میں نے اسے بچا...... نے کی...... کو...... شش کی تھی۔" اس کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ بے تحاشا خون بہنے سے وہ موت کی سرحد پر تھا۔ "مگر...... نہ بچا سکا۔ وہاں سے...... بھا...... گا...... تو انہوں نے...... پک...... پکڑ لیا۔" تو چندا کا وہ مددگار جو اسے فون کی سہولت دیتا تھا۔ اسلم ہی تھا مجھے حیرت تھی کہ وہ رب نواز کے آدمیوں میں کس طرح پہنچ گیا تھا کیا رب نواز اسے نہیں پہچانتا تھا اور جب وہ کسی طرح اس کی صف میں شامل ہو ہی گیا تھا تو اس نے رب نواز کو جہنم رسید کیوں نہیں کیا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"پروفیسر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا "پروفیسر ہاشم رضا۔"

وہ دوبارہ غنودگی میں چلا گیا تھا۔ میں نے اسے ہلایا اس کے چہرے کو تھپکا۔ بمشکل اس نے آنکھیں دوبارہ کھولیں "وہیں...... لا...... لال...... حویلی......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ میں گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تاثل کو سفاک انداز میں مسکراتے دیکھ کر یک دم ہی میرا اشتعال حدوں سے گزر گیا۔ میں نے چلا کر کہا۔

"دیکھو یہ ابھی زندہ ہے۔"

ایک لمحے کو تاثل کی نظر بہکی اور میری لات نے اس کے ہاتھ سے پستول اڑا دیا تھا۔ اس نے کرب سے چلا کر کچھ کہا۔ غالباً اپنی مادری زبان کا کوئی منتخب لفظ کہا تھا جو عام طور سے کسی ڈکشنری میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ کلائی سے ٹوٹ گیا تھا مگر اس نے پروا نہ کرتے ہوئے میرے پیر پر ٹھوکر ماری۔

میں لڑکھڑا کر گرا اور گرنا ہی میری جان بچا گیا تھا۔ میجر شاہد نے دروازے پر نمودار ہوتے ہی مجھ پر فائر کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوسرا فائر کرتا میں نے تاثل کے دونوں پیروں کے درمیان ایڑی ماری۔ وہ چلا کر جھکا تھا کہ دوسری گولی اس کے سر میں اتر گئی۔ وہ مجھ پر گرنے لگا تھا۔ میں نے اسے ڈھال بناتے ہوئے تیزی سے دائیں طرف رکھا ہوا...... اس کا پستول اٹھا لیا۔ میجر شاہد نے پورا میگزین مجھ پر خالی کر دیا تھا لیکن ساری گولیاں تاثل کو لگی تھیں۔ میں نے جوابی فائر کیا وہ دروازے سے غائب ہو گیا۔ اس کے بھاگنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں تاثل کی لاش ایک طرف پھینک کر اس کے پیچھے بھاگا تھا لیکن پھر عقل نے مجھے روک لیا۔ اندھا دھند باہر نکل کر میں آسانی سے اس کا نشانہ بن جاتا۔ بھاگتے قدموں کی آواز دھوکا بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے باہر نکلنے کے بجائے ایک لمحے کو سر باہر کرتے ہی اندر کھینچ لیا۔ فوراً ہی گولی آ کر دروازے کی چوکھٹ پر لگی تھی۔

"بنیے کی اولاد...... میں تیرے دھوکے میں آنے والا نہیں ہوں۔" میں نے چلا کر کہا اسی لمحے ایک کالی اور گول سی شے دروازے کے سامنے گری۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے چھلانگ لگائی اور کمرے کے وسط میں بچھے جہازی سائز پلنگ کے دوسری طرف جا گرا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے ورنہ دھماکے سے میرے کانوں کے پردے ضرور پھٹ جاتے۔ دھماکے کے ساتھ ہی گرد و غبار کا طوفان سا اٹھا تھا اور چاروں طرف ملبے کی بارش ہونے لگی تھی۔ جب یہ بارش تھمی تو میں کھانستا ہوا اٹھا۔ مجھے بعض چیزیں لگنے سے معمولی زخم آئے تھے مگر بم کے مہلک ٹکڑوں کی یلغار سے بیڈ نے بچا لیا تھا۔ تاثل اور اسلم کی لاشوں کا حشر اور بھی خراب ہو رہا تھا۔ دروازے کی طرف اتنا گرد و غبار تھا کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ کہیں کہیں شعلے سے چمک رہے تھے۔ بم نے آگ لگا دی تھی۔ شور کی آواز آ رہی تھی۔ اب میں یہاں رہتا تو پکڑا جاتا۔ دو عدد لاشیں بھی موجود تھیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا۔ اگلے کمرے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہاں فرنیچر اور پردوں کی بہتات تھی۔ اس لیے آگ سرعت سے پھیلی تھی۔

میں نے پلٹ کر کمرے کی کھڑکی کھولی۔ یہ شاید برسوں سے بند تھی اور جام ہو چکی تھی۔ میں نے کرسی اٹھا کر اس کے پٹ پر ماری۔ تیسری ضرب پر کرسی کے ساتھ کھڑکی بھی ٹوٹ گئی۔ میں نے نیچے جھانکا۔ یہ ایک چھجا تھا۔ عقب میں مارکیٹ تھی اور دھماکے کے بعد لوگ جمع تھے۔ وہ سب اوپر ہی

دیکھ رہے تھے۔ زمین کوئی بیس فٹ نیچے تھی۔ میں نے چھجے پر پاؤں رکھا تو وہ ہلنے لگا۔ سال خوردہ لکڑی کمزور ہو گئی تھی۔ میں نے احتیاط سے پاؤں جمائے لیکن چھجا جواب دے گیا۔ میں نے نیچے کی طرف چھلانگ لگائی اور تماشائی جو بروقت ہٹنے میں ناکام رہے تھے۔ میرے کام آ گئے۔ دو نے راستے میں آنے کی حماقت کی اور اپنے دانت اور ناک تڑوا کر انہوں نے مجھے راستہ دے دیا۔

دو گلی بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔ اسے میں نے شاہی مسجد کے سامنے چھوڑ دیا۔ ڈرائیور نے خون کے گھونٹ پی کر ساڑھے دس روپے قبول کیے۔ میٹر نے تمام تیز رفتاری کے باوجود اتنے ہی بنائے تھے۔ وہاں سے میں نے بس پکڑ لی۔ دو اسٹاپ بعد اتر کر میں نے ایک رکشا لیا۔ ڈرائیور نے پوچھے بغیر بیٹھنے کا برا منایا تھا مگر میٹر سے بیس روپے زیادہ لے کر وہ مجھے مزنگ چوک چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس سفر کے دوران میں نے اپنے تعاقب پر خاص توجہ رکھی تھی۔ را کے ایجنٹ کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ میرا تعاقب بھی کر سکتا تھا۔ مزنگ پر اتر کر میں نے ایک پی سی او سے صاعقہ کو فون کیا۔

"میں اس وقت مزنگ میں ہوں کسی کو کار سمیت بھجوا دو۔"

"خیریت......" اس نے تشویش سے کہا۔

"آ کر بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور ریستوران کا پتا بتا کر فون بند کر دیا۔

ریستوران سامنے ہی تھا۔ میں نے ایک میز سنبھالی اور چائے کا کہہ دیا۔ مجھے اسلم کے آخری الفاظ یاد آ رہے تھے اس نے رب نواز اور چندا دونوں کے بارے میں یہی کہا تھا کہ وہ لال حویلی میں ہیں۔ چندا اب تک سلامت ہی تھی۔ اگرچہ کئی دوسرے سوالات بھی ذہن میں آ رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ اسلم نے چندا کو کیسے پہچانا۔ اس نے اس کی مدد کی اور جب اسلم اسے فون کروا سکتا تھا تو اس نے چندا کو فرار کیوں نہیں کروایا۔ اچانک مجھے نقلی ہاشم رضا کی بات یاد آئی۔ اس نے بھی حویلی کے تہ خانے کا ذکر کیا تھا مگر پولیس اور خفیہ ایجنسی والے لال حویلی کے تہ خانے کی بھی پوری طرح تلاشی لے چکے تھے اور انہیں وہاں نہ تو رب نواز ملا تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا فرد۔ آدھے گھنٹے میں صاعقہ کا آدمی کار لے کر آ گیا۔ میں نے بنگلے میں آ کر اسے ساری روداد سنائی۔ اس نے فوری طور پر متعلقہ تھانے فون کیا اور وہاں سے رپورٹ لی پھر مجھے بتایا۔

"حسنہ نامی اس پیشہ ور عورت کے کوٹھے سے دو لاشیں ضرور ملی ہیں لیکن اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ حسنہ اور اس کا ملازم غلام محمد غائب ہیں۔"

"وہ اس نقلی میجر شاہد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔"

"اس سے ظاہر ہے کہ انہیں مقامی طور پر مضبوط لوگوں کی مدد حاصل ہے۔ ورنہ وہ دن دیہاڑے ایسی واردات نہ کر گزرتے۔"

"شکر ہے میں نے اسلم کو اپنا نمبر نہیں دیا تھا۔ ورنہ یہ جگہ بھی ان کی نظروں میں آ جاتی۔"

"اس جگہ وہ پھٹک بھی نہیں سکتا۔" صاعقہ مسکرائی۔

"صاعقہ مجھے نہیں معلوم کہ پولیس اور ایجنسی والوں نے رب نواز کی لال حویلی پر جو چھاپا مارا تھا اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ مجھے اتنا معلوم ہوا ہے کہ رب نواز اور چندا بھی اسی جگہ موجود تھے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی آدمی ملا اور نہ ہی کوئی اور چیز......"

"مجھے...... مجھے شبہ ہے۔ رب نواز نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔ وہ اس حویلی میں موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں وہاں جا کر دیکھوں۔"

"ابھی تو وہاں پولیس کا پہرا ہے لیکن میں کوشش کرتی ہوں ممکن ہے اجازت مل جائے۔"

"اجازت لے کر نہیں جو بھی کرنا ہے خاموشی سے اور چپکے سے کرنا ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بتا کر کام خراب ہی ہوگا۔ پولیس رب نواز سے ملی ہے۔ اس کے تنخواہ داروں کی کمی نہیں ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"پتا نہیں۔" میں نے گہری سانس لی "مجھے بہرصورت چندا کو بچانا ہے اور رب نواز کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔ کہانیوں اور فلموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"حقیقی زندگی میں عام طور سے ہیرو ہی مار کھاتا ہے۔" وہ بولی "ایسا کرتے ہیں اکبر خان سے بات کرتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں زیادہ بہتر مشورہ دے سکے گا۔"

اکبر خان کا نام لیا تھا کہ وہ اندر داخل ہوا۔ "کس نے مجھے یاد کیا ہے؟"

"ہم نے۔" صاعقہ اسے دیکھ کر جس طرح کھلی تھی اس سے مجھے ان دونوں کے درمیان لطیف تعلق سمجھ میں آنے لگا۔ "آؤ بیٹھو۔ ناصر صاحب کو مشورہ چاہیے۔"

میں نے اس کے سامنے ساری صورتِ حال رکھی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا تھا کہ را والے لاہور شہر میں سرگرمِ عمل تھے اور کرنل پر حملہ انہوں نے ہی کیا تھا۔ جبکہ ہم اس کا ذمے دار

رب نواز کو بجھ رہے تھے۔

"یہ سارے ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ کرنل کی موت میں یہ سب ملوث ہیں۔" صاعقہ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ "ہمیں ان سب سے بدلہ لینا ہے۔"

"مجھے یقین ہے رب نواز نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ اس نے بظاہر شکست تسلیم کر لی تھی لیکن اندر اس نے کام جاری رکھا ہے۔ پروفیسر ہاشم اس کے پاس ہے اور وہ ایسا ظاہر کرتا رہا کہ اس نے پروجیکٹ ختم کر دیا ہے لیکن اس پر کام جاری رکھا۔ اس طرح مجھے یہ شبہ بھی ہے کہ اس نے لال حویلی کے معاملے میں بھی کوئی چکر چلایا ہے۔ جب چھاپا مارا گیا تو حویلی خالی ملی مگر رب نواز بھی وہیں ہے اور اس نے چندا کو بھی وہیں رکھا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ ہاشم رضا بھی وہیں اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے ہے۔"

"مگر حویلی خالی ہے۔"

"مجھے اس لمحے ہاشم رضا کے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔ اس نے نچلے تہ خانے کا ذکر کیا تھا۔ اس میں لفظ نچلے اضافی ہے۔ وہ صرف تہ خانے بھی کہہ سکتا تھا۔ اسی طرح اسلم نے بھی مرنے سے پہلے رب نواز اور چندا کے لال حویلی میں ہونے کا بتایا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو رب نواز کے بارے میں جانتے ہیں۔ اسلم کے بارے میں مجھے یقین ہے وہی چندا کو وہاں سے فون پر بات کرنے کی سہولت دیتا تھا۔"

"اگر لال حویلی میں کوئی اور چھپا ہوا تہ خانہ ہے تو وہ بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔" صاعقہ بولی "میرا خیال ہے پہلے اس نظر سے وہاں کا جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ "اب....."

"میں اس کی حمایت نہیں کروں گا۔ تم بھول رہی ہو وہاں چندا بھی ہے۔ رب نواز خطرہ محسوس کرتے ہی سب سے پہلے اسے مار ڈالے گا۔ میں اس کی زندگی کے لیے ایک رسک نہیں لے سکتا۔ ہمیں جو بھی کرنا ہے خاموشی سے کرنا ہے، چپکے سے کرنا ہے۔ کسی کو احساس دلائے بغیر۔"

"اس کے لیے ہم اپنے آدمی استعمال کر سکتے ہیں۔" اکبر نے میری تائید کی۔

"اپنے آدمی نہیں..... ہم خود ....." میں نے کہا "میں اور اکبر اس کام کے لیے کافی ہیں۔"

"نہیں میں بھی چلوں گی۔" صاعقہ بولی۔

"تم یہاں کے حالات دیکھنے کے لیے موجود ہو۔" میں نے کہا۔

"تمہارا جانا ضروری نہیں ہے۔" اکبر نے بھی کہا "تمہارا بیک اپ ہونا ضروری ہے اگر خدانخواستہ ہم پھنس جائیں تو پھر تم ہی ہماری مدد کر سکو گی۔"

صاعقہ ہچکچائی مگر اکبر نے اسے راضی کر لیا پھر اس نے مجھ سے کہا "بہتر ہو گا ہم رات کو ہی نکل جائیں کسی کی نظروں میں آئے بغیر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن بہتر ہو گا آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اس مہم کے لیے تازہ دم اور چوکس ہونا بہت ضروری ہے۔" صاعقہ نے مجھ سے کہا۔

وقت میرے لیے کتنی تیزی سے بدلا تھا۔ کل تک جو میرے دست و بازو اور ساتھی تھے۔ اب وہ مجھ سے دور تھے۔ اور جن کو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ میرے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ رات کا کھانا کھا کر میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ وہاں ڈریسنگ ٹیبل پر مجھے فریال کا ہیئر بینڈ نظر آیا تھا۔ میں اداس ہو گیا تھا۔ انسان چلا جاتا ہے لیکن اس کی نشانیاں رہ جاتی ہیں۔ وہ کتنی تیزی سے میرے نزدیک آئی اور اپنی یادوں کے اَن مٹ نقوش چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے واپس بھی چلی گئی۔ اس ہیئر بینڈ سے ایک انوکھی خوشبو آ رہی تھی۔ شاید یہ فریال کے وجود کی مہک تھی۔ اسے لے کر میں بستر پر دراز ہو گیا۔

رات دو بجے انٹرکام کی بیل نے جگا دیا۔ "ٹائم ہو گیا ہے۔" صاعقہ کی آواز آئی۔

"کافی بھجوا دو۔" میں نے کہا اور اٹھ کر باتھ روم میں آ گیا۔ گرم پانی سے غسل نے میری نیند اور کسل مندی دور کر دی پھر کافی کے دو کپ پی کر میں بالکل تازہ دم ہو گیا تھا۔ گہرے سبز رنگ کی پتلون اور اس کی ہم رنگ جرسی کے ساتھ میں نے اوپر سے سوئٹر لے لیا تھا۔ باہر سردی خاصی زیادہ تھی۔ اکبر ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔ وہ بالکل چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "یاد رکھیے گا۔ ہمارا یہ مشن خاصی حد تک صرف جائزے کے لیے ہے لہٰذا جب تک بے حد ضروری نہ ہو جائے۔ مار دھاڑ سے گریز ہی کرنا ہو گا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

اس نے اعشاریہ اڑتیس کا پستول مع سائلنسر میرے حوالے کیا۔ اس کے ساتھ تین فاضل میگزین بھی تھے۔ ننھا پستول بدستور آستین میں تھا۔ سوئٹر کی وجہ سے اس کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ صاعقہ نے ایک لنچ بکس اور کافی سے بھرا تھرماس ہمارے حوالے کیا۔ اکبر ہنسا "ایسا لگ رہا ہے میں کام پر جا رہا ہوں۔"

باہر ایک عدد چھوٹی فور وہیل ڈرائیو تیار تھی۔ اکبر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ "یاد رکھیے گا ہم زمیندار اللہ بخش کھوکھر کے مہمان ہیں۔"

"یہ کون ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہمارے گروپ کے ہی ہیں۔ کسی زمانے میں کرنل صاحب کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد زمینداری کرنے لگے۔ اب بھی ہمارے کام آتے ہیں۔ کل ہی واپس گئے ہیں کرنل صاحب کی میت میں شرکت کر کے۔"

میں نے سرد آہ بھری۔ "میں شرمندہ ہوں کہ ان کے جنازے میں شامل نہ ہو سکا تھا۔"

"ایسا بہتر ہی ہوا۔ آپ کے شرکت کرنے سے آپ کے لیے بھی خطرہ ہوتا۔ مجھے یقین ہے دشمن ضرور نگرانی کر رہا ہو گا۔" اس نے جیپ کو فیروز پور روڈ کی طرف موڑا۔ رات کے تین بجے سڑکیں بالکل خالی تھیں۔ صرف اِکا دُکا باربرداری کے ٹرک اور دودھ کی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ جیپ کی لائٹس سے سڑک روشن تھی۔ اکبر کی فرمائش پر میں اسے رب نواز کے کرتوتوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اس کا مارے حیرت کے منہ کھل گیا تھا۔

"یہ اتنی گندی مچھلی ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

"اس سے کہیں زیادہ۔" میں نے کہا "رب نواز اس زمین پر شیطان کا اوتار ہے۔ وہ گندگی کی پیداوار ہے اس سے کسی نیکی یا اچھائی کی توقع ایسی ہی ہے جیسے کسی بیل سے دودھ کی توقع کرنا۔"

وہ ہنسا "مثال تو اچھی ہے مگر بعض اوقات بیل سے بھی دودھ مل جاتا ہے۔"

"مگر رب نواز سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو ہم رب نواز کی زمینوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ یہاں سے ملک مہربان کی حویلی بھی پاس ہی تھی لیکن میں نے اس کے پاس نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں ذرا سبز قدم انسان تھا۔ جہاں جاتا تھا۔ خواہ مخواہ بے گناہوں کی شامت آ جاتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اب مزید بے گناہ میری وجہ سے قضائے ناگہانی کا شکار بنیں۔ میں نے اکبر سے کہا "روشنی ہونے سے پہلے ہمیں کہیں پناہ لے لینی چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" اس نے کہا اور چونک کر بریک لگائی۔

سامنے ہی تین افراد کسی کو پکڑے لے جا رہے تھے اور وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر خان کی نگاہیں زیادہ تیز تھیں "یہ کسی عورت کو لے جا رہے تھے زبردستی۔"

"ممکن ہے رب نواز کے گرگے ہوں۔ یہ اسی کا علاقہ ہے اور اس کا خاندان اس قسم کے کاموں کے لیے بدنام ہے۔" میں نے جیپ سے اترتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ بھی جیپ دیکھ کر رک گئے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا وہ بمشکل پندرہ سولہ سال کی لڑکی تھی۔ اس نے اچانک جھٹکا دے کر خود کو چھڑایا اور تیر کی طرح میری طرف آئی۔

"بھرا مینوں بچا لے۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا اور میرے پیچھے ہو گئی۔ "یہ کتے مینوں لے جا رہے نیں گے۔"

"اوئے ہٹ جا سامنے سے۔" ایک نے فلمی اسٹائل میں بڑک ماری اور ہاتھ میں پکڑی لاٹھی اوپر کی۔

"تم لوگ کون ہو؟" میں نے ذرا خوف زدہ انداز میں کہا "میں کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

میرے انداز پر وہ مسکرایا "ملک رب نواز کا نام سنا ہے۔ ہم اس کے کرندے ہیں۔ یہ لڑکی چھوٹے مالک کو پسند ہے۔"

"تمہیں افسوس ہو رہا ہو گا کہ چھوٹے ملک کو تمہاری کوئی بہن کیوں پسند نہیں آئی۔ اسے لے جانا زیادہ آسان ہوتا۔" میں نے سادہ سے انداز میں کہا۔

"اوئے تیری تو....." اس نے بھڑک کر لاٹھی گھمائی۔ جو میں نے بہ آسانی اس سے چھین لی اور پاؤں پر مار کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

"لڑکی مجھے بھی پسند آئی ہے۔" میں نے کہا "ایسا کرتا ہوں پہلے میں لے جاتا ہوں۔ کل تم اسی جگہ آ کر مجھ سے لڑکی لے جا سکتے ہو۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔ ملک کو تیری بے بے پیش کریں گے۔" دوسرے نے للکارنے والے انداز میں کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ ان سے بھڑنا لازمی تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات ہو جس سے رب نواز چوکنا ہو جائے۔ لاٹھی ٹوٹنے سے وہ وقتی طور پر مرعوب ہوئے تھے لیکن بعد انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ جس کی لاٹھی ٹوٹی تھی اس نے چلا کر حملے کا حکم دیا۔ اس کی دو نفری سپاہ مجھ پر ٹوٹ پڑی تھی اور دو منٹ کے اندر وہ تا کارہ بھی ہو گئی۔ ایک کا بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا تھا اور دوسرا اپنی پسلیوں کو رو رہا تھا۔ مضحکہ خیز آواز میں کیوں کہ اس کا جبڑا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ سپہ سالار نے میدانِ جنگ کا نقشہ بدلتے دیکھ کر فرار میں عافیت سمجھی مگر اکبر خان نے اسے راستے میں ہی جا لیا۔ اس نے پہلے اسے اڑنگا مار کر گرایا اور پھر لات مار کر اس کی گردن توڑ دی۔ اسے پھڑپھڑاتے دیکھ کر لڑکی تھرتھر کانپنے لگی تھی۔ میں نے اسے تسلی

دی اور اس سے اس کے گھر کا پوچھا۔ اس نے قریبی گاؤں کا بتایا۔ وہ صبح کھیتوں میں آئی تھی اور موقع کی تاک میں بیٹھے ان بدمعاشوں نے اسے اغوا کرلیا تھا۔ ان کی بدقسمتی کہ وہ جیپ خراب ہوگئی تھی جس پر وہ اسے لے جا رہے تھے اور انہیں پیدل ہونا پڑا۔ مزید بدقسمتی ہماری صورت میں ان کے سامنے آئی تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

''اپنے گھر چلی جاؤ اور اس واقعے کا کسی سے ذکر مت کرنا اپنے گھر والوں سے بھی نہیں ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔''

''نہیں کروں گی جی۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا اور ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔

''ان کا کیا کریں۔'' اکبر خان نے مجھ سے پوچھا۔

''انہیں تو نعمت خداوندی سمجھو۔ جس کام سے آئے تھے۔ وہ خود ہمارے پاس آ گیا۔ اب یہ ہمیں رب نواز کے بارے میں بتائیں گے۔'' میں نے مسرت سے کہا۔

''ایک تو خرچ ہوگیا بلاوجہ......'' اکبر نے مڑ کر دیکھا۔ باقی دو کی حالت خراب تھی میں نے انہیں دیکھا۔ ''یہ بھی خرچ ہو جائیں گے۔ اگر زبان نہ کھولی۔''

''ایک منٹ......'' اکبر خان بولا ''انہیں دیکھو... بلکہ احتیاط سے بھاگ نہ جائیں۔''

''ان کا باپ بھی نہیں بھاگے گا بس روح نکل سکتی ہے جسم سے۔'' میں نے پستول نکال لیا۔

اکبر خان نے مرنے والے کی لاش اٹھائی اور ذرا دور نظر آنے والے درختوں کی طرف بڑھ گیا۔ دس منٹ بعد جسم جھاڑتا ہوا واپس آیا ''بیل کی طرح بھاری تھا۔''

''کیا کیا تم نے اس کا؟''

''ایک درخت پر لٹکا آیا ہوں۔ دو تین دن سے پہلے نہیں ملے گا۔'' اس نے کہا اور ان دونوں کو دھکے دے کر جیپ کے عقبی حصے میں سوار کر دیا۔ ''ان پر نظر رکھنا۔'' اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو۔'' ایک نے تقریباً روتے ہوئے کہا ''مجھے معاف کر دو۔''

''ضرور کریں گے۔'' میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا ''اپنا منحوس منہ بند رکھو۔''

پستول دیکھ کر اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔ میں نے تو پاؤں پر مار کر لاٹھی توڑی تھی اور اکبر خان نے لات مار کر ان کے ساتھی کی گردن ہی توڑ دی تھی۔ اکبر خان نے اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے یہ جگہ زیادہ بہتر رہے گی۔''

سڑک کے بائیں طرف سڑک سے کچھ ہی فاصلے پر درخت نظر آ رہے تھے۔ یہ غیر آباد زمین تھی۔ اکبر خان نے جیپ اس طرف موڑ دی۔ اس وقت سورج نمودار ہونے والا تھا۔ اس نے جیپ درختوں میں گھسا دی۔ یہ خاصا بڑا گھنا جھنڈ تھا۔ اس کے تلے بدستور تاریکی تھی۔ ''میرا خیال ہے پہلے ناشتا کرلیا جائے۔''

میں نے لنچ بکس اٹھایا۔ جس میں رکھے سینڈوچ ابھی تک نیم گرم تھے۔ ان کے ساتھ ابلے ہوئے انڈے تھے۔ انہیں کھا کر کافی نکالی جو خوشبودار اور بدستور گرم تھی۔ اکبر خان خوش مزاج آدمی تھا لیکن وہ فوراً ہی بے تکلف ہونے کے بجائے آہستہ آہستہ کھلنے والوں میں سے تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر اس نے انہیں نیچے اتارا اور الگ الگ درختوں پر باندھ دیا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھے کہ بلا چون وچرا کیے اکبر خان کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے رضاکارانہ طور پر منہ پر ٹیپ بھی لگوالیا۔ ''دیکھو تمہارے زندہ رہنے کا انحصار تم پر ہے۔ اگر ہمارے سوالوں کے درست جواب دیتے ہو تو زندہ رہو گے ورنہ اسی جگہ مر جاؤ گے۔''

انہوں نے سر ہلا کر اور آوازیں نکال کر تعاون کا یقین دلایا۔ اکبر نے ایک کے منہ سے ٹیپ اتار دیا۔

''یہ چھوٹا ملک کون حرامزادہ ہے جس کے لیے لڑکی لے جا رہے تھے؟''

''وہ دلدار ملک کا بیٹا ہے۔''

''دلدار ملک کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رب نواز کا چچازاد بھائی۔''

''اور رب نواز کہاں ہے؟''

''پتا نہیں جی پولیس انہیں تلاش کر رہی ہے۔'' اس نے معصوم بننے کی کوشش کی۔

''اس بے چارے کو پتا ہی نہیں ہے۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' اکبر مسکرایا۔ اس نے چاقو نکالا اور اس کی قمیص کاٹ دی۔ اس نے چاقو کی نوک بازو پر رکھ کر اسے ذرا سی حرکت دی تھی کہ وہ چیخ اٹھا ''درد ہو رہا ہے۔''

''درد تو ہوگا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''نظام...... دین۔'' وہ کراہنے لگا۔ اکبر نے یک دم نوک بازو پر کھینچ دی۔ میں نے اس کا منہ دبا دیا۔ ورنہ اس کی چیخ دور تک سنائی دیتی۔ اکبر ہنسا۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ رب نواز اس میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے اس کے جسم کو کھول کر دیکھنا

پڑے گا۔''

''اس میں خاصی دیر لگے گی۔ ایسا کرتے ہیں آری سے چار پانچ بڑے ٹکڑے کر لیتے ہیں اور آرام سے رب نواز کو تلاش کرتے ہیں۔'' میں نے تجویز پیش کی تو اس کا جسم پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ اکبر خان نے دوسری لکیر کھینچی۔ میں نے کہا ''سنو نظام دین! ہمیں رب نواز کی تلاش ہے۔ کسی اور سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ اس ذلیل انسان کے پیچھے کیوں تکلیف اٹھاتے ہو۔ جو ہمیں معلوم کرنا ہے وہ میں معلوم کر ہی لوں گا۔''

میں نے اس کا منہ چھوڑا تو وہ بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ ''خدا کی قسم...... مجھے نہیں معلوم......''

''پھر کیا معلوم ہے؟'' میں نے اس بار نرمی سے پوچھا۔

''رب نواز دو دن پہلے حویلی میں آیا تھا۔''

''لال حویلی......''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں جی...... اپنی حویلی میں...... پھر وہ چلا گیا۔''

''رب نواز کس چیز پر آیا تھا؟''

''گھوڑے پر......'' اس نے جواب دیا۔

''حویلی آنے کی وجہ؟'' میں نے پوچھا ''جب پولیس اسے تلاش کر رہی ہے تو اسے آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ عورتیں لینے آیا تھا۔''

''عورتیں......'' میں چونکا ''کیسی عورتیں؟''

''پتا نہیں جی سرحد پار سے آئی تھیں۔ بنگالی لگ رہی تھیں۔ رب نواز کے ساتھ ایک اور آدمی آیا تھا۔ شہر سے آیا ہوا ہے۔ اس نے عورتوں کو دیکھا تھا اور پھر انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔''

''اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔'' میں نے کہا ''جواب میں اس نے جو حلیہ بتایا تھا اس نے مجھے شبہے میں ڈال دیا تھا۔ حلیہ خاصی حد تک ہاشم رضا سے ملتا جلتا تھا۔ عورتوں والی بات سے بھی اس شبہے کو تقویت مل رہی تھی۔

''کیا تم لوگوں کو پہلے ہی چھاپے کا پتا چل گیا تھا؟''

اس نے سر ہلایا ''پولیس کے آنے سے ایک گھنٹے پہلے ہی حویلی کے سارے مرد چلے گئے تھے۔''

''پرسوں سے پہلے رب نواز کتنے دن پہلے آیا تھا؟''

''ایک رات پہلے ہی چھاپا پڑا تھا۔'' اس نے کہا ''پھر اپنے بازو کی طرف دیکھا'' مجھے درد ہو رہا ہے۔''

''شکر ہے درد ہو رہا ہے تمہارا ایک ساتھی تو ہر درد اور فکر سے ہمیشہ کے لیے نجات پا چکا ہے۔ کیا تم بھی ایسا ہی چاہتے

ہو؟'' اکبر خان نے سفاک انداز میں پوچھا۔ اس کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔

''نہیں...... نہیں۔'' اس نے گڑگڑا کر کہا۔

''یہ بتاؤ کہ لال حویلی میں کون ہے؟''

''کوئی بھی نہیں......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا بات ہے۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''کچھ نہیں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر جب اکبر نے چاقو اس کے بازو سے لگایا تو اس نے جلدی سے کہا ''بتاتا ہوں کل رات بڑی ملکانی نے کھانا دے کر مجھے لال حویلی والے بیلے کی طرف بھیجا تھا۔ ٹفن میں رب نواز کی پسند کا تیتر کا بھنا ہوا گوشت تھا۔''

''تم نے ٹفن کسے دیا تھا؟''

''وہ مجھ سے بیلے کے باہر ہی ایک شخص نے لے لیا تھا۔ وہ اکثر لال حویلی میں نظر آتا تھا۔ بڑا خونی قاتل ہے۔ بیس پچیس بندے پار کر چکا ہے۔ نام بھی خونی ہے۔''

اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ رب نواز اور اس کے ساتھی بلکہ پروفیسر ہاشم رضا بھی لال حویلی میں موجود تھے اور کسی ایسی جگہ چھپے ہوئے تھے جہاں تلاشی لینے والے نہیں پہنچ سکتے تھے۔

''یہ بتاؤ کہ لال حویلی پر پولیس کا پہرا ہے تو خونی وہاں کیا کر رہا تھا۔'' اکبر خان نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم جی......'' اس نے چونک کر کہا۔

اسی لمحے مجھے کسی کی آواز آئی، کوئی بات کرتا اس طرف آ رہا تھا۔ آواز اس نے بھی سن لی تھی اور اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اکبر خان نے چاقو اس کے منہ میں اتار دیا۔ چیخ کے بجائے اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلی تھی۔ اس کے بعد خون کا فوارہ اچھلا تھا۔ میں بروقت پیچھے ہٹ گیا۔ ورنہ خون مجھ پر بھی آ گرتا۔ اس کے باوجود مجھے کراہت کا احساس ہوا تھا۔ مجھے ابکائیاں آنے لگی تھیں۔ نظام دین کے ساتھی کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ اس کی شلوار گیلی ہو رہی تھی اور اس کا جسم بندھا ہونے کے باوجود لرز رہا تھا۔ جب تک باتیں کرنے والے قریب آتے نظام دین ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس نے خود اپنی قضا کو آواز دی تھی۔

یہ دو دیہاتی تھے جو فارغ ہونے آئے تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ اس طرف نہ آ جائیں اور ہمیں ان سے بھی نمٹنا پڑے۔ میں کسی عام آدمی کو اس جنگ میں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ دوسری طرف سے درختوں میں داخل ہوئے تھے اس لیے جیپ نہ دیکھ سکے۔ ایک ذرا فاصلے

پر درخت کے ساتھ بیٹھ گیا اور دوسرا سیدھا اس درخت کی طرف آیا جس سے نظام دین بلکہ اب تو لاش بندھی تھی۔ وہ دھوتی اوپر کرتے ہوئے درخت کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس سے ذرا فاصلے پر میں ایک درخت کی آڑ میں تھا اور اکبر دوسرے کی گردن پر چاقو۔ لیے کھڑا تھا تاکہ وہ بھی کوئی غلط حرکت نہ کر جائے۔ اس کا جسم ساکت تھا۔ فارغ ہونے والا بے خبر تھا کہ اس سے محض دو فٹ کے فاصلے پر ایک لاش اسی درخت سے بندھی کھڑی ہے۔ برگد کے اس درخت کے متعدد تنے تھے۔ جن کے درمیان میں رسیاں لٹک رہی تھیں۔ اس لیے اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اس کی نظر خون پر نہ پڑ جائے جو اب مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ بھی شاید رات بھر سے ضبط کیے ہوئے تھے اس لیے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ آخر اس کے ساتھی نے آواز دی۔

''اوئے رحمت...... کیا ساری عمر کا کھایا پیا نکال رہا ہے۔''

''آیا یار......'' اس نے اٹھ کر دھوتی درست کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹلا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ دونوں اس طرح باتیں کرتے ہوئے درختوں سے باہر چلے گئے جیسے آئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اکبر نے چاقو اس کی گردن سے ہٹا لیا۔ اپنے ساتھیوں سے عبرت پکڑو اور کوئی حماقت کی کوشش نہ کرنا۔''

اس نے سر ہلایا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا ''جی...... خدا کے لیے مجھے مت مارنا۔'' اس نے گھگھیاتے ہوئے انداز میں کہا۔

''بالکل نہیں ماریں گے اگر تم نے ہمارے سوالوں کے درست جواب دیے۔'' اکبر نے اس کے سامنے چاقو نچاتے ہوئے کہا ''رب نواز کہاں ہے؟''

''لال حویلی میں۔'' اس نے بلاتردد کہا۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کہاں ہے۔ کس جگہ ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم...... خدا کی قسم بالکل بھی نہیں معلوم...... میرا ایک بھائی رب نواز کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ وہ تھانے جاتا رہتا ہے۔''

''اچھا۔ ایس ایچ او ہے...... تھانیدار۔'' میں نے متاثر ہونے کے انداز میں کہا۔

''نہیں جی...... بدمعاش ہے بچپن سے بگڑ گیا تھا۔ چوریاں کرنے لگا تھا۔ دو بار جیل گیا۔ وہاں سے آیا تو رب نواز کے لیے کام کرنے لگا۔''

''کیا کام کرتا ہے؟''

''یہی جی...... مارنے پیٹنے والے...... کبھی کسی کا ہاتھ توڑ دیا...... کسی کو لات ماردی...... کسی کی فصل جلادی۔''

''یا کسی کی بہو بیٹی اٹھالی۔'' میں نے طنز کیا ''تم بھی تو یہی کام کر رہے ہو۔''

وہ کھسیا گیا تھا ''نہیں جی......''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ مارا ''اس لڑکی کو بہن سمجھ کر چھوٹے ملک کی خدمت میں پیش کرنے لے جارہے تھے۔''

''خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''رب نواز لال حویلی میں کہاں ہے؟'' اکبر نے سوال دہرایا۔

''یہ بات میرے بھائی نور علی کو معلوم ہوگی۔'' اس نے کہا ''وہ ہر وقت رب نواز کے ساتھ رہتا ہے۔''

''اور وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رات گھر آیا تھا۔ شاید ابھی گھر میں ہی ہو۔''

اپنی جان بچانے کے لیے اس نے بے دریغ اپنے بھائی کا نام لے دیا تھا۔ میں نے پوچھا ''جب تمہارا بھائی ہر وقت رب نواز کے ساتھ رہتا ہے تو گھر کیسے آیا؟''

''اس نے ابھی ابھی شادی کی ہے۔ اس کی بیوی ایک سال رب نواز کے پاس رہی ہے۔ کتیا پورے خاندان کی رکھیل تھی۔ رب نواز نے کسی بات پر خوش ہو کر نورے کو دے دی۔ اس بے غیرت نے اس سے شادی کر لی۔''

''شادی کرنا بے غیرتی تو نہیں ہوتی۔'' میں نے ایک بار پھر اس کے منہ پر ہاتھ مارا ''گھر کہاں ہے تمہارا؟''

''گاؤں میں...... حویلی سے تھوڑا ہی دور ہے۔ چچا کرم دین کی ہٹی کے پیچھے۔''

میں نے اکبر کو اشارہ کیا اور ہم اس سے ذرا دور ہٹ گئے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا ''کام کا آدمی نور علی ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔''

''یہ بے کار ہے۔'' اس نے کہا ''اسے بھی اس کے ساتھیوں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔''

''نہیں۔ اس نے سب بتا دیا ہے اس کی جان لینا مناسب نہیں ہوگا۔''

اس نے زور دے کر کہا ''تم بھول رہے ہو۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو رب نواز کو ہمارے بارے میں پتا چل جائے گا وہ ہوشیار ہو جائے گا۔ ویسے بھی جو لوگ ایک معصوم لڑکی کو یوں

اٹھا لے جائیں وہ کسی رحم کے مستحق نہیں ہوتے۔'' بات کرتے کرتے وہ چونکا اس نے گھوم کر دیکھا اور اچانک چاقو پھینک کر مارا۔ نورے کے بھائی کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی تھی۔ چاقو اس کی کمر میں دستے تک دھنس گیا تھا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف پھیلے اور وہ اوندھے منہ جا گرا۔ دل میں اتر جانے والے فولاد نے اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ نہ جانے کب اس نے خود کو اس سے آزاد کرا لیا تھا۔ اس کے اچانک مرنے پر کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی گم صم سے ہو گئے تھے۔ اکبر نے جو کیا تھا وہ ایک بے اختیار فعل تھا۔ اسے فرار ہوتا دیکھ کر اس نے اضطراری طور پر چاقو مار دیا۔ یوں تینوں اپنے انجام کو پہنچے تھے۔ اپنی مزاحمت کی وجہ سے مارے گئے۔

''خس کم جہاں پاک سارے۔'' میں نے گہری سانس لی۔

''اب یہاں سے نکل چلو۔'' اکبر نے چاقو اس کی پشت سے نکالتے ہوئے کہا پھر اس نے انہیں بھی اپنے طریقے سے چھپا دیا۔ لاشوں کو رسی سے باندھ کر اوپری شاخ سے گزار کر اس نے لاشوں کو باری باری اوپر کھینچا اور رسی اس طرح شاخوں سے باندھ دی کہ وہ نظر نہ آئے۔ اس کے بعد اس نے زمین پر پڑے خون پر مٹی ڈالی اور پتے بکھیر دیے۔

''اب یہ تین چار دن سے پہلے نہیں ملیں گے۔'' اس نے ہاتھ جھاڑے۔

''یوں لگ رہا ہے جیسے تم گوریلا جنگ کی تربیت لے چکے ہو۔''

''اسپیشل فورس میں انسانوں کو آسان طریقے سے ہلاک کرنا ہی سکھایا جاتا ہے۔'' اس نے تبصرہ کرنے کے انداز میں کہا ''ہمیں قاتل مشینیں بنایا جاتا ہے۔''

ایک لمحے کو مجھے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ سردی خاصی تھی شاید ہم جیپ میں بیٹھ کر باہر آئے تھے۔ اب ہم اللہ بخش کھوکھر سے ملنے جائیں گے۔ ان سے ابھی ہونے والے واقعات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اللہ بخش کو آرمی میں ہونے کی وجہ سے سرحدی علاقے کے پاس ہی زمینیں ملی تھیں اس نے اس پر جدید قسم کا زرعی فارم قائم کر رکھا تھا۔ جس کے گرد خاردار تار کی باڑھ لگی تھی۔ فارم پر اس وقت گندم کی فصل بوئی جارہی تھی۔

فارم کے وسط میں ٹیولپ کے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ اللہ بخش کھوکھر کا مکان جو خوبصورت اور جدید وضع کے بنگلے کی صورت میں تھا۔ اس کے فارم کے ساتھ ہی تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک گودام نما عمارت تھی۔ جہاں غالباً سامان اور اناج رکھا جاتا اور مشرق کی طرف دو ٹریکٹر کی مدد سے زمین ہموار کر کے ایک طرف ریت کی دیوار بنا رہے تھے۔ جو شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر ریت کے ایسے پشتے سیلاب سے بچاؤ کے لیے بنائے جاتے ہیں لیکن یہ پشتہ سرحد کے پاس ہونے کی وجہ سے بنایا جارہا تھا۔ کشیدگی کے وقت سرحد کے دونوں طرف سے فائرنگ جاری ہی رہتی ہے۔ ایسے میں سرحد کے پاس کام کرنے والوں کے لیے زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ ریت کی یہ دیوار شاید سرحد کی طرف سے فائرنگ سے محفوظ رہنے کے لیے بنائی جارہی تھی۔ جو یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔

خاردار تاروں کے ساتھ بنے فولادی گیٹ پر ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے اکبر خان کا نام سن کر اندر رابطہ کیا اور پھر گیٹ کھول دیا۔ ''آپ بنگلے کی طرف جائیں۔ کھوکھر صاحب اسی طرف آ رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ پشتے کی طرف سے ایک معمر لیکن صحت مند شخص تیز قدموں سے چلتا آ رہا تھا۔ جب تک ہم نے جیپ بنگلے کے سامنے بنے لکڑی کے شیڈ تلے روکی، وہ آ چکا تھا۔ تقریباً پچپن برس کا ایک صحت مند اور مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ اس کے سر کے بال سفید تھے لیکن سوا آٹھ بجاتی مونچھیں بالکل سیاہ تھیں۔ اس نے پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ موسم سے بے نیاز اس نے قمیص کی آستین بھی چڑھا رکھی تھی۔

''اکبر خان۔'' اس نے گرم جوشی سے اکبر سے ہاتھ ملایا۔ ''خدا کے بندے آنے سے پہلے اطلاع تو کر دیتے۔''

''بس کرنل صاحب۔ اچانک ہی پروگرام بنا۔ ان سے ملیے ناصر عظیم ہیں۔ کرنل سے ان کی اچھی دوستی تھی۔''

''اچھا اس نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''ہماری دوستی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے پھر کرنل ہی چلے گئے۔''

''ہم فوجیوں کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ کسی وقت بھی اوپر سے بلاوا آ جاتا ہے۔ اندر آ ؤ نا تم لوگ...... بلکہ ایسا کرو کہ جا کر اپنی آنٹی اور بچیوں سے ملو۔ تب تک میں ذرا تھوڑا کام نمٹا کر آتا ہوں۔'' اس نے ہمیں ایک ملازم کے ساتھ اندر بھیج دیا۔ بنگلا اندر سے بھی خوبصورتی مگر سادگی کے ساتھ آباد تھا۔ وہاں پانی بجلی کی سہولت تھی اور مجھے چھت پر کئی عدد ڈش انٹینا بھی نظر آئے تھے۔ بنگلے کے اندر شیڈ میں ایک لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ بیگم کھوکھر حیرت انگیز طور پر جوان اور

خوبصورت خاتون نکلیں۔ انہوں نے شفقت سے استقبال کیا۔

"اکبر...... اتنے دن بعد آئے۔ پتا ہے کرنل صاحب کتنا یاد کرتے ہیں تمہیں اور بچیاں تو ہر روز ہی پوچھتی ہیں کہ اکبر بھائی کب آئیں گے۔"

"بس آنٹی...... زندگی فرصت ہی نہیں دیتی۔ ورنہ دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے۔"

"اور وہ پیاری سی لڑکی کیسی ہے۔ اس کا تو باپ ہی چھن گیا۔"

"ہاں مگر وہ مضبوط اعصاب کی ہے۔ اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔"

"کرنل صاحب تو خبر سنتے ہی چلے گئے تھے۔ مجھے بھی ساتھ نہیں لیا اور اوپر سے فون بھی خراب تھا ورنہ میں خود صاعقہ سے بات کرتی۔ اسے کہنا کہ مجھے بہت افسوس ہے۔"

وہ ہمیں ایک نشست گاہ میں لے آئیں۔ بید کے صوفوں کے ساتھ درمیان میں بڑا سا دبیز قالین تھا۔ ایک کونے میں آتش دان میں دہکتے انگاروں کی وجہ سے کمرے کی فضا خوشگوار حد تک گرم تھی۔

"تم لوگ آرام سے بیٹھو اور سوئٹر وغیرہ اتار دو۔ میں چائے لاتی ہوں۔ ناشتا کیا یا نہیں؟"

"ناشتا تو کر لیا لیکن آپ اپنے ہاتھ سے بنا کر کچھ کھلائیں گی تو ظاہر ہے ہم انکار نہیں کریں گے۔"

"بہت بدمعاش ہو۔" وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

"چلو بھائی آرام سے بیٹھو جاؤ۔" اس نے سوئٹر اور جوتے اتار دیے۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی، ہم قالین پر آتش دان کے سامنے ہی لیٹ گئے۔ اتنی مارا ماری کے بعد یہاں سکون مل رہا تھا۔ اچانک ہی تین عدد بچیاں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ اکبر بھائی...... تینوں نے بیک وقت نعرے لگائے مگر پھر مجھے دیکھ کر جھجک گئیں۔

"آ گئی چڑیلیں۔" اکبر اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا۔ "ان سے ملو۔ تمہارے لیے ایک اور بھائی لایا ہوں تا کہ میری جان چھوڑ دو۔"

تینوں نے ادب سے سلام کیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"جی نہیں۔" ان میں سے جو ذرا بڑی تھی اس نے کہا "ہم آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے اور صاعقہ باجی سے شکایت بھی کریں گے۔"

"خدا کے لیے...... میں غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ہو نا چڑیل...... فوراً آدمی پر حملہ کرتی ہو۔"

تینوں ہی پندرہ سولہ برس کی تھیں۔ جوانی کی حدوں کو چھوتی ہوئیں لیکن اپنے حلیے اور معصومانہ تاثرات سے بچی ہونے کا تاثر ہی دے رہی تھیں۔ ان میں سے دو تو جڑواں لگ رہی تھیں۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ کھوکھر کی یہی تین اولادیں تھیں۔ انہوں نے اکبر کو گھیر لیا تھا اور اسے اپنی تابڑ توڑ باتوں سے زچ کر رہی تھیں۔ اس نے کئی بار مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا مگر میں مسکراتا رہا۔ اس وقت میری مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ جب ان آفتوں نے میری طرف کا رخ کیا تھا۔

"آپ کیا کرتے ہیں ناصر بھائی؟" جڑواں سے بڑی صائمہ نے کہا۔

"میں...... میں تلاش کرتا...... ہوں۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"کسے؟" تینوں اب میری طرف متوجہ تھیں۔ اکبر نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

میں نے گہری سانس لی "بات یہ ہے کہ ایک جن میری پری کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں اسے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔"

تینوں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا "آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

"اپنے اکبر بھائی سے پوچھ لو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "میرا تعلق پرستان سے ہے۔"

"آپ پری زاد ہیں ناں؟" چھوٹی نائمہ نے اشتیاق سے کہا "میں نے بہت ساری کہانیاں پڑھی ہیں۔"

"آپ کی پری کو کون لے گیا ہے؟" اس سے بڑی فاطمہ نے بے صبری سے پوچھا۔

"آپ بے وقوف بنا رہے ہیں۔" صائمہ بولی "یہ سب خیالی باتیں ہیں۔"

"وہ ایک کانا جن ہے۔ جس کی دو آنکھیں فیوز ہو گئی تھیں۔ صرف تیسری ماتھے والی آنکھ کام کرتی ہے۔ میری پری مجھ سے ملنے آئی تھی اس کی نظر پڑ گئی اور وہ اسے لے گیا۔ اب میں اس کی تلاش میں ہوں۔"

"آپ نے اسے مارا کیوں نہیں؟" نائمہ نے اعتراض کیا "کہانیوں میں تو پری زاد جن کو مار دیتا ہے۔"

میں نے تو مذاق کیا تھا لیکن یہ مذاق ہی میرے لیے وبال بن گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آنے لگا کہ کاش میں سچ مچ کا پری زاد ہوتا تو کم سے کم یہاں سے غائب تو ہو سکتا تھا۔ انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر کے میرا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ جب بیگم کھوکھر آئیں تو میری جان چھوٹی۔ انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں خاموش کرایا۔

"شرم آنی چاہیے آپ تینوں کو۔ بھائی اتنی دور سے آئے ہیں۔ ان سے کھانے پینے کا پوچھنے کے بجائے ان کا دماغ کھا رہی ہیں۔"

"ہم تو بھائیوں کو کمپنی دے رہے تھے۔" چالاک نائمہ نے کہا۔

"اور چائے تو آپ بنا لائی ہیں۔" فاطمہ نے لقمہ دیا تو بیگم کھوکھر مسکراہٹ دبانے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ وہ مسلسل موجود رہیں اور بولتی بھی رہیں لیکن جیسے ہی کھوکھر اندر آئے تینوں ہی چپ ہو گئیں۔ باپ سے وہ ذرا دبی رہتی تھی۔ ورنہ ماں کی تو پرواہ ہی نہیں تھی۔ "کیا ہو رہا ہے یہ...... ارے یہ زہر پیا جا رہا ہے۔ بیگم کوئی دودھ لاتیں، ربڑی بنائی تھی وہ کھلاتیں۔"

"وہ بھی کھا لیں گے اور یہ دودھ نہیں پیتے۔ شہری لوگ ہیں۔" وہ ہنسیں "اب آپ ان کے ساتھ بیٹھیں میں دوپہر کے کھانے کا دیکھتی ہوں اور تم تینوں گیسٹ روم دیکھو۔ بھائیوں کے لیے۔"

"ہم ٹھہریں گے نہیں۔" اکبر جلدی سے بولا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولیں "کم سے کم آج تو تم نہیں جا سکتے۔"

"برخوردار تمہاری آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بلکہ فیصلہ کر چکی ہیں اور ان کے فیصلے سے سرتابی کی مجال تو ہمیں بھی نہیں ہے۔" کرنل صاحب بولے۔

بیگم کھوکھر کے جانے کے بعد اکبر نے سنجیدگی سے کہا "کرنل صاحب! اس وقت ہم ایک مشن پر ہیں۔"

"مشن...... کیسا مشن؟" وہ چونکے۔

اکبر نے انہیں رب نواز کے بارے میں بتایا۔ تفصیل سن کر وہ کسی قدر حیران ہوئے تھے۔ "کرنل ان دنوں اسی کیس پر کام کر رہے تھے اور ان کا قتل بھی رب نواز اور را کا گٹھ جوڑ ہے۔ رب نواز روپوش ہے اور ہمیں شبہ ہے کہ وہ اپنی ہی زمینوں پر ہے۔ اس نے را کے مفرور ایجنٹوں کو بھی اپنے پاس پناہ دے رکھی ہے۔"

"یہ نیم حیوانی مخلوق کا کیا چکر ہے۔"

اس بار میں نے انہیں بتایا۔ ہاشم رضا اور اس کی تیار کی ہوئی اس مخلوق کے بارے میں۔ اس میں امریکا، بھارت اور اسرائیل کی دلچسپی کا ذکر بھی کیا۔ "سائی بورگ قسم کی مخلوق ہمیشہ سے انسانوں کا خواب رہی ہے اس مخلوق کو فوجی کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے جو تباہی آئے گی اور انسانیت جن المیوں سے دوچار ہو گی، اس کا بھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔"

دوپہر کے کھانے تک ہم تینوں معروفِ گفتگو رہے تھے۔ میجر شاہد والا معاملہ بھی کرنل کے علم میں تھا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوئے تھے کہ میری کل ہی اس نام نہاد میجر سے خونریز جھڑپ ہو چکی تھی "وہ اب تک یہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ اہم اطلاع ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہماری ایجنسیز کیا کر رہی ہیں۔"

"سیاست دانوں کا تعاقب۔" میں نے سادگی سے بتایا تو کرنل نے بے اختیار تلخ قہقہہ لگایا۔

"ٹھیک کہا تم نے تب ہی غیر ملکی ایجنٹس ہماری سرزمین پر دندناتے پھر رہے ہیں۔"

"اہم رسک اس لڑکی کا ہے۔" اکبر بولا "رب نواز نے ایک طرح سے اسے یرغمال بنا رکھا ہے۔"

"میں اپنے آدمیوں کو استعمال کرتا ہوں ممکن ہے کوئی کام کی بات ہو اور اب تک میری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔" کرنل نے کہا۔

"کھانا تیار ہے۔" بیگم کھوکھر نے آ کر اعلان کیا "سب طعام گاہ میں آ جائیں۔"

کرنل کا ڈرائنگ روم خاصا وسیع تھا۔ اس کی میز پر بیک وقت دو درجن افراد کھانا کھا سکتے تھے۔ اس وقت سب ہی موجود تھے۔ کرنل کا ایک بھتیجا بھی تھا جو چھٹیاں گزارنے آیا تھا اور تین شریر لڑکیاں بھی تھیں۔ کھانا لذیذ تھا اور خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد کرنل صاحب ہمیں اپنے فارم دکھانے لے گئے۔ ان کے پاس شاید ڈھائی سو ایکڑ زمین تھی لیکن انہوں نے اسے سلیقے سے استعمال کیا تھا۔ فارم میں ایک طرف کیٹل فارم تھا۔ اس کے ساتھ ہی پولٹری فارم اور پھر فش فارم تھا۔ کناروں پر درخت لگے تھے اور درختوں تلے شہد کی مکھیوں کے بکس رکھے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا لکڑی کا لمبا سا بیرک نما کمرا تھا۔ یہاں پر موسم سرما میں ریشم کے کیڑے پالے جاتے تھے۔ اس کمرے کے اردگرد شہتوت کے بے شمار درخت لگے تھے جن کے پتے کیڑے کھاتے ہیں۔ فش فارم ایچ کی شکل کا تھا۔ جس کے وسط کی زمین میں بڑے سرخ گلابوں کی جھاڑیاں لگی تھیں۔ یہ گلاب شہر سپلائی کیے جاتے تھے۔

فارم پر بجلی کی سہولت تھی۔ ٹیوب ویل لگا تھا۔ سارے کام جدید قسم کی زرعی مشینری سے ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ پانی بھی اسپرنکلر سے دیا جاتا تھا۔ اس جدید نظام میں گھومنے والے فواروں کی مدد سے فصلوں اور پودوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ ایک ٹریکٹر کے ساتھ ایک چھوٹا تھریشر تھا۔ ایک اسپرے مشین تھی۔

فارم کے آخری حصے میں دو ایکڑ زمین پر اصطبل اور گھوڑوں کے لیے میدان تھا۔ کرنل کو گھوڑے پالنے کا بھی شوق تھا۔ اس فارم پر کوئی تین درجن افراد کام کرتے تھے۔ ان کے لیے ایک طرف مکانات بنے تھے۔ جن میں بجلی کی سہولت بھی تھی۔ کرنل نے اپنے فارم کی ایک انچ زمین بھی فاضل نہیں چھوڑی تھی۔

''کرنل یہ جگہ سرحد کے بالکل پاس ہے۔'' میں نے کہا ''خدانخواستہ جنگ ہو تو.... تو یہ جگہ تو میدانِ جنگ بن جائے گی۔''

''ہاں بالکل بن جائے گی۔'' کرنل نے تسلیم کیا۔

''اور یہ سب برباد ہو جائے گا۔''

''بات یہ ہے ناصر میاں کہ جنگ تو ہوتی ہی تباہی ہے۔ یہاں وہاں سب کو تباہ کر دیتی ہے لیکن اس کے خوف سے تعمیری عمل تو نہیں رکتے ہیں۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ کل جنگ ہوگی تو میں آج کا کام مکمل کروں گا۔ دوسرے دیکھ رہے ہو کہ یہاں پر زیادہ سامان نہیں ہے۔ میں نے اپنے گھر میں بھی صرف ضرورت کا رکھا ہے۔ اسی طرح فارم پر سرمایہ کاری کی ہے۔ اس پر جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے لیے مکانات بنائے ہیں۔ خدا کے فضل سے میرے پاس اتنا ہے کہ میں چاہوں تو اس قسم کا فارم دس بار بنا سکتا ہوں جتنا میں اس پر لگا چکا ہوں اس سے زیادہ تو یہ ہر سال مجھے دیتا ہے۔''

''پھر بھی آپ لوگوں کے لیے خطرہ ہے؟'' میں نے اصرار کیا۔

''خطرہ تو پورے ملک میں ہے۔ ڈر کر ملک کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس دنیا میں رہنا بھی رسک ہے لیکن اس سے گھبرا کر کوئی خودکشی نہیں کرتا۔ ویسے میرے پاس سارے ملازم فوج سے ریٹائرڈ ہیں۔ انہیں جنگ لڑنے کی تربیت دی گئی ہے اور میرے پاس اسلحہ بھی ہے۔ خدانخواستہ ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو ہم آسانی سے مار نہیں کھائیں گے۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کرنے کی تیاری ہم نے کر رکھی ہے۔ میری دو بسیں چلتی ہیں۔ جن کا آخری اسٹاپ قریبی گاؤں ہے۔ رات کو یہ بسیں فارم پر کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک ٹرک ہے جو سامان لے کر شہر گیا ہوا ہے۔ ٹرالی ہے ہمیں منتقل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ رہا سامان تو اس کی اتنی پروا نہیں ہے۔ یہ جان سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔''

سرحد کے پاس بے شمار بڑے آرمی افسران کو زمینیں دی گئی ہیں لیکن ان میں سے چند ایک نے ہی اتنی محنت سے اپنی زمینیں آباد کی تھیں۔ ورنہ اکثر ٹھیکے پر دے کر خود شہروں میں رہ رہے تھے۔ فارم کی سیر سے واپس آئے تو بیگم کھوکھر چائے کے لیے منتظر تھیں۔ چائے کے بعد کرنل چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

''آج رات ہم بھی چکر لگائیں گے لال حویلی کا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' اس نے کہا ''ہم یہ معاملہ صرف کرنل پر چھوڑ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔''

چائے پی کر ہم باہر نکل آئے تھے۔ ابھی چار ہی بجے تھے لیکن سردی کی شدت میں یک لخت اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم ٹہلتے ہوئے پشتوں کی طرف گئے۔ ریت کی دیوار کھڑی کر کے اس پر سفیدے اور پاپلر کے درخت لگائے گئے تھے۔ کرنل کا ذوق ہر معاملے میں بہترین تھا۔ وہ معمولی سی چیز کو بھی خوبصورت بنانے کے فن سے واقف تھا۔ اس طرح یہ پشتہ نہ صرف اس کی زمینوں اور گھروں کو تحفظ دے رہا تھا بلکہ درختوں کی وجہ سے یہ ایک ہری بھری سی دیوار میں بدل گیا تھا۔ میں پشتے پر چڑھا۔ اس کے بعد سامنے دور تک ہموار میدان تھا جس پر گندم کی فصل بوئی گئی تھی۔ یہ کسی اور کی زمین تھی اور اس کے بعد بھارتی سرحد تھی۔ جس پر خاردار باڑھ یہاں سے نظر آ رہی تھی اس کے بعد بھارتی سرزمین پر بھی کھیت ہی تھے۔ سرحد کے دونوں طرف اناج اگتا تھا لیکن جنگ میں یہاں موت اور بربادی کی فصل بوئی جاتی تھی۔

''خوبصورت اور پُرسکون جگہ ہے۔'' اکبر نے تبصرہ کیا ''ممکن ہے شادی کے بعد میں بھی اس جگہ زمین لے کر آباد ہو جاؤں۔ بنیادی طور پر میں بھی کاشت کار ہی ہوں۔''

''کیا صاعقہ یہاں رہ لے گی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا ''تم نے بھی بھانپ لیا۔ ہاں وہ رہ لے گی۔ میرے ساتھ وہ کہیں بھی رہ سکتی ہے۔''

''عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ پانی کی طرح، خود کو ہر پیمانے میں ڈھال لیتی ہے۔ یہ تو ہم مرد ہیں جو چیزوں سے چمٹے رہنا پسند کرتے ہیں۔''

یک لخت سرحد کی طرف سے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ فائرنگ شدید تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چھوٹے پیمانے کی جنگ چھڑ گئی ہو۔ اکبر نے توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے بے پروائی سے کہا ''یہاں یہ معمول کی بات ہے۔ آئے دن فائرنگ ہوتی ہے۔ گولیاں یہاں تک بھی آ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے کرنل نے یہ پشتہ بنوایا ہے۔ اس کا ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ بلکہ معذور ہو گیا۔ اب کرنل اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔''

اسی لمحے ایک گولی ہمارے سروں پر سے سیٹی بجا کر گزری۔ میں نے اکبر کا ہاتھ تھام کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ ہنسا ''گھبراؤ مت وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوگا۔''

''ہاں۔ صرف موت۔ ورنہ کرنل صاحب کے ملازم جیسا حشر بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

جیسے جیسے سورج غروب ہونے کے نزدیک تھا' سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے سردی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ہم واپس آئے تو وہ تینوں منتظر تھیں۔ انہوں نے گھیرا تو میں غسل کا بہانہ کر کے گیسٹ روم میں آ گیا مگر شاندار قسم کا غسل خانہ دیکھ کر میں سچ مچ نہانے گھس گیا۔ سفید ٹائلوں سے آراستہ باتھ روم میں گرم پانی کی لائنیں تھیں۔ غسل کر کے میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں اکبر ان تینوں کے پاس پھنسا رہا۔ حتیٰ کہ کرنل صاحب آ گئے اور اس کی گلو خلاصی ہوئی۔

''تمہارا کام بول دیا ہے میں نے۔ ویسے جو معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ رب نواز کے خاندان کے افراد حویلی میں نہیں ہیں بلکہ وقفے وقفے سے علاقے میں نظر آتے ہیں۔''

''سرحد پر کیا پوزیشن ہے؟''

''حالات معمول کے مطابق ہیں۔ پچھلے دنوں اسمگلروں کی رینجرز سے جھڑپ ہوئی۔ اس میں مارے جانے والے دونوں افراد بھارتی تھے۔''

''ممکن ہے وہ اسمگلر نہ ہوں۔ جاسوس ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لاشیں کچھ بتاتی نہیں ہیں۔'' کرنل مسکرایا ''ممکن ہے وہ جاسوس ہوں۔''

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں قصور سے چالیس میل جنوب مشرق میں را کا ایک اڈا تباہ ہوا تھا۔ وہاں بھاری مقدار میں مہلک اسلحہ ذخیرہ تھا۔''

''ہاں مگر فوج کو وہاں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ سوائے ایک بڑے سے گڑھے کے۔ سب کچھ جل گیا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اسلحے سے پتا چلتا تھا کہ وہ زیادہ تر بھارتی ساخت کا تھا۔''

''چند مقامی غدار ضرور گرفتار ہوئے تھے لیکن ان سے اہم معلومات حاصل نہیں ہو پائیں۔''

''اصل کردار تو بھاگ لیے اور وہ سب رب نواز کے ساتھ ہیں۔ نقلی میجر زخمی ہوا ہے۔ وہ بھی کہیں روپوش ہے۔'' میں نے کہا ''اس کی تلاش ضروری ہے۔ اس کے پاس ہمارے اہم دفاعی راز ہیں۔''

''اس کی تلاش جاری ہے لیکن اعلیٰ حکام اس واقعے کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے ہماری بدنامی ہوتی ہے۔''

''فی الوقت ہمیں بدنامی سے زیادہ ملکی سلامتی کی فکر کرنا چاہیے۔''

مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں اللہ بخش کھوکھر سے مدد حاصل نہیں ہوئی ہے ہمیں جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب میں اور اکبر اپنے کمرے میں آئے تو میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا ہمیں کرنل سے پوچھ کر جانا ہوگا۔''

''نہیں اور نہ ہی وہ پوچھے گا۔'' اکبر نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہم تیار ہوئے جیپ باہر موجود تھی۔ اس میں پیٹرول کم تھا لیکن کرنل کے فارم پر پیٹرول کا خاصا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس نے پہلے ہی جیپ کی ٹنکی فل کروا دی تھی۔ ہم فارم سے نکل کر لال حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ نصف گھنٹے بعد ہم اس جھاڑی والے جنگل میں تھے۔ جہاں میں نے کار چھپائی تھی۔ جب میں اور چندا لال حویلی کی طرف گئے تھے۔ اکبر نے جیپ کو ممکنہ حد تک لال حویلی کے اردگرد پھیلے جنگل کے پاس لے جا کر روکا۔ پیٹرول انجن ہونے کی وجہ سے اس کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس جگہ جیپ روکی وہاں جھاڑیاں گھنی تھیں اور اس کے سیاہ رنگ کی وجہ سے اس کا رات کی تاریکی میں نظر آنا تقریباً ناممکن تھا۔ ہمارے لباس گہرے رنگوں کے تھے۔ اکبر نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا اور اندر سے ایک بیگ نکال کر اپنی پشت پر باندھ لیا پھر ایک دوسرے بیگ سے دو ہیڈ سیٹ نکالے ایک اپنے کان کے اوپر جما کر اس پر سیاہ رنگ کی اونی ٹوپی چڑھا لی۔ دوسرا میری طرف بڑھایا۔ ساتھ ہی ٹوپی بھی تھی۔ میں نے اس سے ہیڈ سیٹ لے کر کان پر لگا لیا اور اوپر سے ٹوپی پہن لی۔ اس سے ہیڈ سیٹ گرنے سے محفوظ تھا۔

''اب ہم دس میٹر کے دائرے میں سرگوشی میں بھی بات کر سکیں گے۔'' اکبر خان نے سرگوشی کی اور ایک عجیب وضع کا پستول مجھے تھما دیا۔ ''ضرورت کے وقت استعمال کرنے سے مت ہچکچانا۔''

''یہ کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اسے ایک طرح سے بے ہوشی کا انجکشن سمجھو۔ اس میں سے ایک سوئی نکل کر انسانی جسم میں پیوست ہو جاتی ہے اور فوراً ہی تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس دوا کے اثر سے آدمی دس پندرہ گھنٹے کے لیے مکمل طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔ اس کا نشان باقی نہیں رہتا۔''

دو عدد پستول میرے پاس تھے۔ اکبر نے دو عدد مختصر سائز

کے دستی بم بھی مجھے تھما دیے۔ "جب بالکل ہی پھنس جاؤ تو اسے استعمال کرنا لیکن احتیاط کے ساتھ یہ دھماکے کے ساتھ زہریلی گیس بھی خارج کرتے ہیں جو دھماکے سے بچ جائیں وہ گیس کی نذر ہو جاتے ہیں۔"

نہ جانے کیوں مجھے اپنے رگ و پے میں سنسنی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آج رات فیصلہ کن معرکہ ہو گا۔ یا تو میں چندا کو چھڑا کر لے جاؤں گا یا رب نواز میری جان لے لے گا۔ آخر میں اکبر نے مختصری دو خودکار رائفلیں نکالیں۔ جن کے ساتھ شولڈر اسٹریپ بھی تھے۔ یہ ہلکی اور پکڑنے میں آسان تھیں۔ اکبر نے دو اضافی میگزین بھی دیے تھے۔ جیپ کے اس خفیہ خانے میں اور بھی بہت کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس نے دروازے بند کر کے جیب سے ایک چھوٹا سا آلہ نکال کر اس کا بٹن دبا دیا۔ "اب کوئی بھی جیپ کو ہاتھ لگائے گا یا اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرے گا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔"

"بہتر ہو گا ہم الگ الگ ہو جائیں۔" میں نے اسے تجویز پیش کی۔

"میں شمال کی طرف سے جاتا ہوں۔ تم جنوب سے جاؤ۔ ہم درمیان میں ملیں گے۔"

میں نے دوڑ کر جنگل اور جھاڑیوں کے درمیان والے میدان کو عبور کیا۔ جہاں ایک بار میں نے کتوں سے دو دو ہاتھ کیے تھے۔ اکبر شمال کی طرف سے گیا تھا۔ "میں جنگل میں داخل ہو گیا ہوں۔" میں نے سرگوشی کی۔

"میں بھی۔" اس نے جواب دیا۔

میں محتاط ہو گیا تھا۔ رائفل میرے شانے پر تھی اور زہریلی سوئی مارنے والا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ رب نواز نے اب اس جنگل میں بھی نگرانی کا کوئی نظام نہ قائم کر دیا ہو۔ آج کل مختصر جاسوسی کے الیکٹرونکس آلات عام دستیاب ہیں۔ طاقت ور مائیکروفون۔ کیمرے جو ہر طرف نظر رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو پیروں اور چار پیروں والے کتوں کا خوف بھی تھا۔ اچانک اکبر کی سرگوشی میرے کان میں گونجی۔ "میں اس وقت شمالی دیوار کے پاس ہوں۔"

"دیوار کے پاس نہ جانا۔" میں نے اسے خبردار کیا "ممکن ہے وہاں کیمرے ہوں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میں کسی درخت پر چڑھتا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں گھنے درختوں تلے سے گزرتا ہوا حویلی کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا پھاٹک مشرق کے رخ پر تھا۔ یعنی میں اس کے عقب کے زیادہ نزدیک تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر پولیس کا پہرا ہوا بھی تو وہ پھاٹک والے حصے میں ہو گی۔ عقبی حصے میں ان کی موجودگی محال تھی۔ میں نے اندازے سے عقبی حصے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اس طرف جا بہ جا برگد کے درخت تھے جن کی لٹکتی ہوئی جڑوں نے خانے خانے سے بنا دیے تھے۔ لٹکتی جڑیں ہٹاتے ہوئے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیتا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو اور میں تنوں سے دور ہٹ کر گزر رہا تھا جہاں کیمرے لگائے جانے کا خطرہ تھا۔ ایسے کیمرے جو رات کی تاریکی میں بھی صاف دیکھ لیتے تھے۔ یہ انفرا ریڈ کی مدد سے گھپ اندھیرے میں بھی کسی جسم کو دیکھ لیتے ہیں۔

درختوں کے اندر سردی ذرا کم تھی مگر تاریکی بے پناہ تھی۔ میں صرف اندازے سے ٹٹولتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے میں اس تاریک جنگل سے نکلا اور مجھے ہلکی چاندنی میں حویلی کا عقبی حصہ نظر آیا۔ اتفاق سے میں اسی جگہ نکلا تھا۔ جہاں میں نے حویلی کے تین نگرانوں کو ایک عورت کو دفناتے دیکھا تھا۔ جو ایک نیم حیوانی بچے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔ اس کی بے نام و نشان قبر اسی جگہ واقع تھی۔ حویلی تاریکی میں آسیب زدہ اور بھوتوں کا ڈیرا لگ رہی تھی لیکن میں جانتا تھا یہاں آسیب سے زیادہ خوف ناک اور بھوتوں سے زیادہ ضرر رساں لوگ موجود تھے اور یہیں کہیں چندا تھی۔ سراپا گل رنگ، وحشی اور سفاک لوگوں کے نرغے میں۔

چندا کا خیال آتے ہی میرا دل تڑپ گیا تھا۔ میں نے حویلی کے اندر جانے کا سوچا کہ شاید میں کوئی سراغ حاصل کر لوں مگر حویلی میں جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کی بیرونی دیوار ہی کوئی دس فٹ بلند تھی۔ سیدھی اور ہموار اس کے اوپر کانچ کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ میرے پاس کوئی ایسی شے نہیں تھی جس کی مدد سے میں اوپر جا سکتا۔ اچانک ہی میری نظر اس درخت پر پڑی جس پر پہلے بھی ایک بار چڑھ کر میں نے حویلی کے اندر جھانکا تھا۔ یہ درخت حویلی کے ایک کونے پر لگا تھا۔ میں اس پر چڑھنے لگا۔ یہ مشکل کام نہیں تھا۔ آج میرے پیروں میں ربر اور کینوس کے بنے ہوئے خصوصی جوتے تھے۔ میں اس شاخ پر چڑھا۔ جو حویلی کی دیوار تک جا رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب شاخ بڑھ کر حویلی کی دیوار کے پار خاصی اندر تک چلی گئی تھی اور کسی کو اسے کاٹنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اس کی مدد سے آسانی سے حویلی میں جایا جا سکتا تھا۔

"اکبر میں حویلی میں جا رہا ہوں۔"

"نہیں۔" اس کی اضطراری آواز آئی "تم پھنس سکتے ہو۔"

"میں خطرہ مول لوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "پلیز مجھے مت روکو۔ میں جنوب مغرب میں واقع ایک درخت کی شاخ سے اندر اتروں گا۔ کوئی خطرہ ہوا تو میں سگنل دوں گا تم فوراً یہاں سے نکل جانا۔"

"نہیں۔ میں تمہیں خطرے میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

"بحث مت کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "تم تو میری مدد کے لیے ہو۔ تم بھی پھنس گئے تو باہر سے مدد کون لائے گا۔"

"او کے لیکن میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے مگر تم اندر نہیں آؤ گے۔"

"ہاں میں باہر ہی رہوں گا۔ تم انتظار کرو میرے آنے تک اندر مت جانا۔ میرے پاس کچھ کام کی چیزیں ہیں۔ اندر کام آئیں گی۔"

میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شمال کی طرف سے نمودار ہوا اور بے آواز چلتا درخت تک آ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی وہاں پتے بکھرے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ بے آواز چل رہا تھا۔ میں نے شکاری جانوروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جب شکار کی طرف جا رہے ہوں تو ان کے پیروں سے ایک خشک پتا نہیں چرمراتا ہے۔ اکبر بھی اسی شکاری درندے کی طرح خاموشی سے آیا تھا۔ جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔ اس نے مجھے درخت پر دیکھ لیا تھا وہ بھی اوپر چڑھ آیا۔ اس کے انداز میں کہیں زیادہ مشاقی تھی۔ اس نے اپنے بیگ سے رسی کا ایک لچھا نکالا۔

"اسے سرے پر باندھ دینا۔ واپسی میں آسانی رہے گی۔"

پھر اس نے سگریٹ کی ڈبیا کے برابر تین آلے سے نکالے "یہ بم ہیں۔ خطرناک اتنے نہیں ہیں لیکن آواز پیدا کرتے ہیں۔ ان سے تم اندر افراتفری پھیلا کر اپنی توجہ ہٹا سکتے ہو۔"

اس نے دھواں پھیلانے والے بم بھی دیے جو سائز میں ٹیبل ٹینس کی گیند کے برابر تھے۔ کیوں کہ میری جیبوں میں یہ سب رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے اس نے بیگ اتار کر میری پشت پر باندھ دیا۔

"محتاط رہنا۔" اس نے آخر میں کہا۔

میں سرکتا ہوا شاخ کے سرے تک گیا۔ یہ حویلی کے اجڑے صحن کے اندر تک گئی تھی۔ میرے بوجھ سے شاخ جھکنے لگی تو میں نے اس سے رسی باندھی۔ جسے میں نے اسی دیوار کے پاس ہی رکھا تھا تا کہ واپسی میں اوپر چڑھنے میں آسانی ہو۔ میں آرام سے نیچے اتر گیا۔ میرے پیر حویلی کی زمین سے لگے تو میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اب میں دشمن کی کچھار میں تھا۔ میں اترتے ہی دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ جہاں تاریکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتا میں مشرقی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ پھاٹک نظر آنے لگا تھا۔ مجھے پھاٹک کے سامنے ہی دو چارپائیاں نظر آئیں جن پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ان کی رائفلیں چارپائیوں کے ساتھ ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ پولیس والے تھے جو نگرانی کرنے کے بجائے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ایسے میں کوئی ان کی گردنیں کاٹ جاتا تو انہیں کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

ایک جگہ جہاں جھاڑیاں زیادہ تھیں میں جھک کر حویلی کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک آڑ سے نکل کر دوسری آڑ تک جاتا۔ اردگرد کی سن گن لیتا تب ہی اگلی آڑ کی طرف جاتا۔ "مجھے شمال میں حرکت محسوس ہو رہی ہے۔" اکبر کی آواز آئی۔

"کس طرف؟"

"حویلی کے ساتھ۔ وہاں دو افراد ہیں۔ وہ تمہاری طرف ہی آ رہے ہیں۔ چھپ جاؤ۔"

میں فوری طور پر ایک جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ اسی لمحے شمالی طرف سے دو افراد نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ کم بخت سیدھے میری طرف ہی آ رہے تھے۔

"جورے کا تو دماغ چل گیا ہے۔ اسے خواب میں بھی لوگ نظر آتے ہیں۔" ایک بولا۔

"اس کے سامنے نہ کہنا۔" دوسرا ہنس کر بولا "کچا چبا جائے گا۔"

"اس کی ماں......" پہلے والے نے ایک فحش گالی دی "خود تو اندر عورت کی بغل میں گھسا ہے اور ہمیں اتنی سردی میں باہر بھیج دیا۔"

"چل یار کام کر ابھی جا کر اسے بتانا بھی ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی سچ مچ آ گیا ہو۔"

"اپنی سمجھ میں یہ الارم شلارم نہیں آتے۔ بلی بھی گزرتی ہے تو کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کتا ہی پال لیتے۔"

"تو ہے نا۔" پہلے والے نے ناراضی سے کہا "بھونکے جا رہا ہے۔ کوئی ہوا بھی تو تیری بک بک سن کر بھاگ گیا ہو گا یا

کہیں دبک گیا ہوگا، تیرا باپ اسے تلاش کرے گا۔"
"باپ کی بات نہ کر۔ میری ماں ملک کی حویلی میں کام کرتی تھی تیری ماں کی طرح۔"
دوسرا والا بے غیرتی سے ہنسا "اس علاقے کی کوئی عورت ان سے بچی ہے چاہے وہ حویلی میں کام کرتی ہو یا نہیں...... چل میرے بھرا کام کر۔"
پہلے والا کھسیا کر جھاڑیوں کو ٹٹولنے لگا۔ وہ میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں نے زہریلی سوئی والا پسٹل نکال لیا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو میں اسے ایک سیکنڈ میں خاموش کر سکتا۔ دوسرا والا ایک طرف جھاڑیاں دیکھ رہا تھا۔ میری طرف آنے والا شاید چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اب میں بالکل ساکت تھا اور ہاتھ اوپر کی طرف ہی رکھا تھا پھر جیسے ہی اس نے اس جھاڑی کو ہاتھ لگایا جس کے عقب میں چھپا تھا' میں نے پسٹل کا ٹریگر دبا دیا۔ بے آواز سوئی نکل کر اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ آواز نکالے بغیر زمین پر گر گیا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر اس کا ساتھی چونکا۔ "کیا ہوا اصغر...... بول۔"
مگر اصغر بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں اس کے ساتھی کے آنے سے پہلے ہی سرک گیا تھا۔ وہ اسے ہلا ہلا کر دیکھ رہا تھا۔ "کیا ہوا تجھے...... کتے کے بچے...... اب بول نا...... کون ہے ادھر......" اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی رائفل بالکل تیار تھی۔ اگر وہ اندازے سے بھی جھاڑیوں پر برسٹ مار دیتا تو میں مارا جاتا یا نہ مارا جاتا مگر اندر والوں تک آواز ضرور پہنچ جاتی۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی کے ساتھ کسی نے کچھ کیا ہے مگر کیا اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اس کی طرف فائر کر دیا کہ شاید سوئی اس تک پہنچ جائے اور جب وہ دھپ سے گرا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اکبر خان نے واقعی یہ کام کا ہتھیار دیا تھا۔
"میں نے دونوں کو بے ہوش کر دیا ہے۔" میں نے سرگوشی میں اکبر خان کو بتایا "اندر کوئی الارم بجا تھا؟"
"ناصر واپس آ جاؤ۔ خطرہ زیادہ ہو گیا ہے۔" اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔
"میں اندر جا رہا ہوں۔"
اکبر خان نے سمجھ لیا تھا کہ میں اس کی نہیں سنوں گا۔ اس لیے وہ خاموش ہو گیا۔ ان دونوں کو وہیں پڑا چھوڑ کر میں جھاڑیوں کی آڑ میں حویلی کے شمالی حصے کی طرف جانے لگا۔ یہ وہیں سے آئے تھے۔ میں احتیاط سے چل رہا تھا اب میرا پاؤں کسی اور الارم وائر سے نہ ٹکرا جائے مگر کونے تک جانے کے باوجود مجھے حویلی میں جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ سارے دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آ رہے تھے۔ میں نے کسی دروازے یا کھڑکی کو چھوا نہیں۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا گھوم کر پھاٹک والے حصے کی طرف آیا۔ یہاں میں نے اکبر خان کے دیے ہوئے بم ایک ایک کر کے تین مختلف جگہوں پر لگا دیے۔ ان میں ایک ایک منٹ کے فرق سے ایک گھنٹے کے بعد کا ٹائم سیٹ کیا ہوا تھا۔ ضرورت کے وقت اس ٹائم کو کم یا زیادہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس کا ڈیجیٹل ٹائمر تھا۔ اس لیے مختصر سی جگہ میں بم بن گیا تھا۔ بم میں نے ایسی جگہوں پر لگائے جو کسی کی نگاہ میں نہیں آ سکتی تھیں۔
میں واپس آیا تو حویلی کے اس حصے میں بدستور سناٹا تھا۔ شاید اندر والے ان دونوں کے حال سے بے خبر تھے۔ میں ایک گھنے پیڑ تلے دبک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی آئے گا اور اندر جانے کا راستہ میری نظر میں آ جائے گا۔ میں نے اکبر کو سچویشن سے آگاہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے نکل جانے کو کہا لیکن میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ "اکبر میں آج کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں چندا کو مزید رب نواز کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے کہا تھا۔
اس وقت بارہ بج کے بیس منٹ ہو رہے تھے۔ میری نظریں دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز تھیں اس لیے جب وہ شخص ایک گوشے سے برآمد ہوا تو میں بری طرح چونکا تھا۔ وہ نہ جانے کس طرف سے آیا تھا۔ وہ حویلی کی چار دیواری کی طرف سے نکلا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ وہ کسی چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ اس کا جسم پھرتیلی حرکات کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مہیب نال والا چینی پسٹل تھا۔ جس کی گولی جسم کو اندر سے تہ و بالا کر دیتی ہے۔ چینی ساختہ یہ پسٹل کسی زمانے میں پولیس کو بھی دیا گیا تھا مگر اس کی ہلاکت خیز گولی کی وجہ سے انسانی حقوق کی تنظیموں نے اس پر احتجاج کیا اور حکومت نے یہ اسلحہ واپس لے لیا تھا۔ اب یہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں دیکھ رہا تھا۔
"اصغرے...... دینے......" اس نے دبی آواز میں پکارا۔ یہ غالباً وہی دونوں تھے جو زہریلی سوئی کے زیر اثر مفلوج پڑے تھے۔ لہٰذا جواب کہاں سے آتا۔ جواب نہ ملنے پر وہ اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور ایک لمحے کو اس کی نظر اسی درخت پر آ کر رکی تھی۔ جس کے عقب میں، میں موجود تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے دیکھ لیا ہو لیکن پھر وہ گھوم کر جنوبی سمت چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں درخت کے عقب سے نکل کر دیوار کے ساتھ ہوتا اس

طرف بڑھا جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ پاس آ کر مجھے دیوار کے نیچے وہ سوراخ نظر آیا جو زمین میں تھا۔ ایک طرف سرخ مٹی کی کچی اینٹیں پڑی تھیں۔ دراصل یہ سوراخ زمین کی ایک پوری پرت سرک جانے سے بنا تھا جس کے اوپر اینٹیں پڑی تھیں اور غالباً کیموفلاج کی وجہ سے ایسا کیا گیا تھا۔ یہ حصہ سرک کر اس سوراخ کو غائب کر دیتا تھا۔
میں نے پہلے چاروں طرف دیکھا اور پھر نیچے جھانکا۔ اندر ہلکی سی روشنی تھی مگر اتنی معمولی کہ اس کا ایک حصہ بھی باہر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پاؤں نیچے لٹکائے اور کود گیا۔ زمین بمشکل پانچ فٹ نیچے تھی۔ سامنے ایک کشادہ راستہ جا رہا تھا۔ جس پر کوئی دس فٹ کے بعد ایک سرخ بلب جل رہا تھا۔ اس کی مدھم سی روشنی سرنگ میں بکھری ہوئی تھی۔ سرنگ آگے جا کر ایک دروازے پر ختم ہو رہی تھی۔ میں اس طرف بڑھا۔ یہاں پر سرنگ پختہ تھی۔ میں نے سرگوشی کی۔ "میں نے اندر جانے کا خفیہ راستہ تلاش کر لیا ہے۔ شمالی دیوار کے سرے پر کچی ہوئی اینٹوں کے تلے ہے۔"
"میں دیکھ رہا تھا۔ محتاط رہو۔ اس نے دونوں بے ہوش افراد کو دیکھ لیا ہے اور واپس آ رہا ہے۔"
میں نے تیزی سے دروازہ کھولا۔ اندر وسیع و عریض راہ داری تھی۔ اس کے دائیں بائیں کمرے اور راستے تھے۔ میں نے اندر گھس کر پہلا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا۔ دوسرا دروازہ بھی لاک تھا۔ البتہ اس کے بعد والا کھلا تھا۔ باہر نکلنے والا کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ میں بلا تکلف اس میں گھس گیا۔ اندر موجود فرد کو میں گہری نیند سلانے کے لیے تیار تھا لیکن اندر موجود شخص ویسے ہی گہری نیند میں تھا۔ یہ بھی شاید اس جگہ کے محافظوں میں سے تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ اس کی رائفل بستر کے ساتھ ہی رکھی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے بھی سوئی والے پسٹل سے بے ہوش کر دوں مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ نہ جانے اس پسٹل میں کتنی سوئیاں تھیں۔ اگر یہ ختم ہو گئیں تو پسٹل بے کار ہو جاتا جبکہ ابھی تک یہ بڑے کام کا ثابت ہوتا آیا تھا۔
اسی لمحے باہر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ "کوئی اندر گھس آیا ہے اور تم سب پڑے سو رہے ہو مُردوں کی طرح، اٹھو حرامیو۔"
یہ وہی تھا جو باہر نکلا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اندر آ گیا تھا اور اب مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بھی اس جگہ کے نگرانوں میں سے تھا اسے بھی اٹھایا جاتا۔ اس کمرے میں میرے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سوائے ایک باتھ روم کے۔ میں نے اندر سے دروازہ کھولا اور خاموشی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے میں نے اس کی رائفل وہیں رکھ دی تھی۔ جیسے ہی میں باتھ روم میں داخل ہوا' کسی نے شدت سے کمرے کا دروازہ بجایا۔
"باہر آ...... ہر وقت پڑا رہتا ہے۔"
کمرے میں سونے والا ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس نے اندر آنے والے سے پوچھا "کیا ہوا سرکار؟"
اس نے ایک ناقابلِ اشاعت بات کی۔ "وہ...... تیری ماں کا یار اندر گھس آیا ہے۔ اسے تلاش کر۔"
وہ اسے ساتھ لے گیا۔ اسے باتھ روم میں دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا لیکن یہ بات طے تھی کہ میں زیادہ دیر اس جگہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ جلد یا بدیر وہ اس طرف کا بھی رخ کرتے۔ میں باتھ روم سے باہر نکلا۔ باہر گیلری میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ "ارے یار تجھے وہم ہوا ہے۔ کوئی نہیں آیا ہے اندر......" کسی نے لہراتی آواز میں کہا۔
"باہر جو دو مرے پڑے ہیں انہیں تیرے باپ نے بے ہوش کیا ہے۔" نورے کی آواز آئی "تلاش کرواسے وہ اندر ہی ہے۔ اگر وہ نہ پکڑا گیا تو ملک ہمیں کتوں کے آگے ڈلوا دے گا۔"

''تلاش کرو اسے۔ ایک ایک جگہ دیکھو۔'' لہراتی آواز والے کو بھی معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ یہ خفیہ اڈا تھا جہاں ہر ایک کا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ رب نواز نے اس جگہ کو بے حد خفیہ رکھا تھا۔ یہیں پر اس نے ہاشم رضا کو رکھا تھا اور چندا بھی اسی جگہ پر تھی۔ اگر اس جگہ کے نگرانوں کی غلطی یا کوتاہی سے کوئی شخص اندر آتا تو رب نواز بچ بچ اسے کتوں کے آگے ڈلوا دیتا۔ تلاش کا آغاز ہوتے ہی میں محتاط ہو گیا۔ میں نے اپنے ہتھیار تیار کر لیے تھے۔ بے ہوش کرنے والا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور بائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ میرے شانے پر خودکار رائفل بھی بالکل تیار تھی۔ حسب توقع وہی شخص اس کمرے میں آیا جو یہاں سو رہا تھا۔ میں نے دروازے کے عقب سے اس کے جسم میں زہریلی سوئی اتار دی۔ اگلے ہی لمحے وہ لہرا کر نیچے گرنے لگا۔ میں نے اسے سنبھالا اور لا کر بستر پر لٹا دیا۔ جیسے ہی گیلری میں ذرا خاموشی ہوئی۔ میں نے باہر جھانکا اور وہاں کسی کو نہ پا کر باہر نکلا اور سامنے والے دروازوں پر طبع آزمائی کی۔ وہ بھی بند تھے۔ میں بائیں طرف والی راہداری میں آیا۔ اچانک سامنے سے کسی کے بات کرنے کی آواز آئی۔ میں پھرتی سے دائیں طرف ایک کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ شاید اس جگہ موجود شخص بھی تلاش کی مہم میں شامل ہو گیا تھا۔

میں اسی طرح چھپتا رہتا تو جلد یا بدیر پکڑا ہی جاتا۔ میرا باہر نکلنا اور چندا کو تلاش کرنا ضروری تھا مگر میں باہر نکلتا تو فوراً ہی نظر میں آ جاتا۔ معاً میری نظر بلب پر پڑی۔ اس جگہ روشنی تھی یعنی کہیں سے بجلی آ رہی تھی۔ امکان تھا کہ اندر ہی کہیں جنریٹر لگا تھا۔ میں نے کمرا اندر سے بند کر کے سوئچ آف کیا۔ میرے پاس انگلی کے برابر ٹارچ تھی۔ اسے جلا کر میں نے دانتوں میں پکڑا اور خوش قسمتی سے اپنے پاس موجود پچاس پیسے کا سکہ بلب ہولڈر میں رکھ کر اس پر بلب لگا دیا پھر جیسے ہی میں نے سوئچ آن کیا جھماکے سے فیوز اڑ گیا۔ میں نے باہر جھانکا گیلری تاریک تھی۔ میں باہر نکل آیا۔

تاریکی ہوتے ہی شور کی آواز آنے لگی تھی ''ارے...... یہ بجلی کو کیا ہوا؟''

''جنریٹر دیکھ جا کر۔'' کوئی چلایا۔

''ٹارچیں لاؤ۔'' کسی تیسرے نے فریاد کی۔

میں راہداری میں آگے بڑھتا رہا۔ ٹارچ جلا رکھی تھی لیکن جیسے ہی کوئی آنے لگتا' میں ٹارچ بجھا دیتا۔ ایک میرے پاس سے لالٹین لے کر گزرا۔ شکر ہے اس نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ ورنہ مجھے اس کی طرف توجہ دینی پڑتی۔ آگے جا کر گیلری دائیں طرف گھوم گئی، میں حیران تھا کہ یہ خفیہ تہ خانہ کتنا بڑا تھا۔ مزید آگے جا کر یہ گیلری سیڑھیوں پر ختم ہوئی جو مزید آگے جا رہی تھی۔ یہاں پر سکوت تھا۔ شور شرابے کو میں پیچھے ہی چھوڑ آیا تھا۔ یہاں پر بھی تاریکی تھی لیکن سیڑھیوں سے نیچے کہیں روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ میری چھٹی حس کہنے لگی کہ اس جگہ پر ہاشم رضا اپنے تجربات کر رہا تھا۔ مجھے نقلی ہاشم رضا کے الفاظ یاد آ گئے اس نے نچلے تہ خانے کا ذکر کیا تھا یعنی تہ خانے کے نیچے بھی کوئی تہ خانہ تھا۔ یہ وہی جگہ تھی۔

میں نے احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ ٹارچ جلا رکھی تھی۔ انگوٹھے تلے بٹن کو دبانے سے یہ جلتی تھی اور دباؤ ختم ہوتے ہی آف ہو جاتی تھی۔ میں پوری طرح تیار تھا۔ نیچے رب نواز سے بھی سامنا ہو سکتا تھا اور ہاشم رضا سے بھی۔ سیڑھیاں کوئی پندرہ فٹ کی گہرائی میں جا کر ختم ہوئی تھیں۔ یعنی یہ خاصا وسیع تہ خانہ تھا۔ روشنی ایک موم بتی سے پھیل رہی تھی جو دیوار کے ساتھ ہی طاق میں رکھی تھی۔ یہ گودام نما کوئی جگہ تھی جہاں گتے کے بے شمار پیک کارٹن پڑے تھے۔ ان کے درمیان سے راستہ تھا۔ میں دبے قدموں گزرنے لگا۔ اچانک، اس طرف سے کسی کے بولنے کی آواز آئی میں سن ہو گیا۔ اس آواز کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ رب نواز کی منحوس آواز تھی۔

''پروفیسر...... میں دیکھتا ہوں...... سارے ہی حرامزادے ہیں، مرے پڑے ہیں۔''

''ملک صاحب جلدی کچھ کریں۔'' ہاشم رضا کی جھلائی ہوئی آواز آئی۔ ''میری ساری محنت برباد ہو جائے گی اگر مشین کو بجلی نہ ملی۔''

رب نواز تیز قدموں سے اس طرف آ رہا تھا۔ میں کارٹنوں کے درمیان ایک خالی جگہ میں دبک گیا۔ رب نواز عجلت میں دیکھے بغیر میرے پاس سے گزر گیا۔ اتنے قریب سے کہ میں چاہتا تو ہاتھ مار کر اس کی مجرب گردن توڑ سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں دوبارہ آگے کی طرف بڑھا۔ جس طرف سے ہاشم رضا کی آواز آئی تھی یہاں پر کارٹن ختم ہو رہے تھے۔ وہاں ایک لیب تھی۔ میزوں پر سائنسی تجربات کے لیے مخصوص سامان، شیشے کے جارز، مکسچر اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میزوں پر موم بتیاں جل رہی تھیں اور پروفیسر ایک جگہ کسی مشین پر جھکا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''میرے خدا سب برباد ہو جائے گا۔''

''اگر اللہ نے چاہا تو سب بربادی ہو گا۔'' میں نے اس کے عقب سے کہا تو وہ اچھل پڑا تھا۔ اس سے پہلے وہ گھومتا۔

میں نے اس کی گردن پر بازو جما لیا تھا۔ ''آواز مت نکالنا، ورنہ مر جاؤ گے۔''

میری گرفت اتنی سخت تھی کہ اس نے بمشکل سر ہلا کر بتایا وہ بولے گا نہیں۔ میں نے گرفت ذرا کم کی ''چندا کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں...... معلوم۔'' اس نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے؟'' میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا ''بتاؤ ورنہ مار ڈالوں گا۔''

''مار ڈالو۔'' اس نے جسم یک دم ہی ڈھیلا چھوڑ دیا ''کیا اس سے تمہیں چندا واپس مل جائے گی؟''

میری گرفت جیسے خود بہ خود ڈھیلی ہو گئی۔ وہ میرے بازو سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا ''شاہ عالم تم دیوار سے سر ٹکرا رہے ہو۔''

''بکواس مت کرو۔'' میں نے غرا کر کہا ''مجھے بتاؤ کہ چندا کہاں ہے؟''

''اسے رب نواز نے کہیں اور رکھا ہے۔'' اس نے کہا پھر چونک کر میرے عقب میں دیکھا ''لو رب نواز آ گیا اس سے معلوم کر لو۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا ''اتنی گھٹیا کوشش مت کرو۔''

مگر جب میری کھوپڑی سے کوئی سخت شے ٹکرائی تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ہاشم رضا نے مجھے کامیابی سے بے وقوف بنایا تھا۔ کوئی خاموشی سے میرے پیچھے آیا تھا اور اس نے میری توجہ اپنی طرف رکھنے کے لیے اس انداز میں کہا جیسے میری توجہ خود پرے ہٹانا چاہتا ہے اور میں اس کے جھانسے میں آ گیا۔ وار سخت تھا۔ میں زمین پر گرا اور بتدریج میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ کامیابی کے نزدیک آ کر یک دم ہی میں بہت دور ہو گیا تھا۔ رب نواز نے مجھ پر قابو پا لیا تھا۔ اب بروز قیامت ہی آنکھ کھلے۔ میں نے تاریک ہوتے ذہن میں سوچا۔

کسی نے میرے منہ پر یخ پانی پھینکا تو میں ہوش میں آنے لگا۔ میرا سر اس طرح دکھ رہا تھا جیسے اس پر سے کوئی روڈ رولر گزر گیا ہو۔ میں کسی کرسی پر بیٹھا تھا اور جب میں نے ہلنے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بمشکل کوشش کر کے سر اٹھایا۔ سامنے ہی رب نواز لبوں پر شیطانی مسکراہٹ سجائے موجود تھا۔

''ہوش آ گیا شاہ جی؟'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''کہاں...... میں تو سوچ رہا تھا کہ اب جنت میں آنکھ کھلے گی۔ حوریں ہوں گی۔'' میں نے کراہ کر کہا ''مگر یہاں تو میں جہنم میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''ابھی کہاں سے جہنم میں چلے گئے۔ ابھی تمہیں بھیجا جائے گا اور حور کی بات ہے تو اس کا بندوبست بھی کر دیتے ہیں۔ ذرا لانا تو اس کی محبوبہ کو۔''

میرا دل زور سے دھڑکا۔ چندا...... وہ چندا کی بات کر رہا تھا۔ کتنے دن بعد اسے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیسی تھی پھر وہ میرے سامنے آ گئی۔ اپنے پسندیدہ سفید لباس میں۔ حسن و دلکشی کا مجسمہ لیکن مجسمے کی طرح ہی چپ۔ اس کے چہرے پر خاموش سے تاثرات تھے اور آنکھوں میں انوکھی دھندلائی ہوئی چمک۔ وہ میرے سامنے آ کر بھی خاموشی اور سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کسی دوا کے زیر اثر تھی۔ ہوش میں نظر آنے کے باوجود بے ہوش ہی تھی۔ رب نواز پھر زہریلے انداز میں ہنسا۔

''پہچانا اسے یا بھول گئے؟''

''چندا کو اور تمہیں میں مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ یہ میری محبت ہے تو تم میری نفرت ہو۔''

اس نے تالی بجائی ''ڈائیلاگ اچھے بولنے لگے ہو ہیرو صاحب اور ابھی اور بھی بولو گے۔'' یک لخت اس کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا ''شاہ عالم تمہاری وجہ سے مجھے بہت سارے نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔ میرا بیٹا تمہاری وجہ سے مارا گیا۔ تمہاری مدد سے میری بیوی گھر سے بھاگ گئی۔ میری بہو اور پوتے کو تم نے اغوا کیا اور اب وہ نہ جانے کہاں ہیں۔ تمہیں بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔''

اس کے لہجے سے مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میری سب سے بڑی کمزوری چندا اس کے پاس تھی اور مجھے اذیت پہنچانے کے لیے وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ بے ہوشی کے دوران میں میرے جسم سے ہر شے اتار لی گئی تھی مگر میں نے ہاتھ کو حرکت دی تو یہ جان کر مجھے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی تھی کہ آستین تلے بندھا ننھا سا پستول موجود تھا۔ دوسرے میرے سر کی ٹوپی تلے ہیڈ سیٹ بھی بدستور موجود تھا۔ تلاشی لینے والوں نے ان دو چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اکبر ہماری باتیں سن رہا ہو گا۔ اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں اندر پھنس گیا تھا۔ وہ کیا کر رہا تھا بلکہ سوال یہ تھا کہ وہ اکیلا میری مدد کیا کر سکتا تھا۔ میں نے رسی ڈھیلی کرنے کی کوشش کی مگر باندھنے والے نے بہت سختی سے باندھی تھی۔ بہرحال میں نے کلائیوں کو حرکت دینا شروع کر دی۔

''رب نواز اس لڑائی کا فائدہ۔'' میں نے پرسکون لہجے

میں کہا" حالانکہ میں تمہارے قابو میں ہوں۔ میرے ساتھ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ اسی طرح چندا بھی تمہارے پاس ہے۔ اس کو بھی تم اپنی پسند کی تکلیف دے سکتے ہو مگر اس کا تم کو کیا فائدہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ذہنی تسکین۔ جب کہ تم سچ سچ بھی بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو۔"

"تم شاید ان ثبوتوں کی بات کر رہے ہو۔" رب نواز کے لہجے میں حقارت تھی۔ "لیکن مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج رات میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کرلوں گا۔ اس کے بعد میں یہاں رہوں گا ہی نہیں۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں بہت دولت جمع ہو جائے گی۔ میں یورپ چلا جاؤں گا۔"

"اپنے سارے خاندان سمیت۔" میں نے طنز کیا "ساری رشتے داریاں چھوڑ کر؟"

"مجھے ان لوگوں کی فکر نہیں ہے۔ بس اپنی فکر ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا "ویسے بھی ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ یہاں رہ سکتے ہیں۔ بعد میں حالات سازگار ہوئے تو میں بھی واپس آ سکتا ہوں لیکن تم......" اس نے میری طرف انگلی اٹھائی "آج رات کو تمہاری کہانی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ تمہارے ساتھی تمہیں تلاش کرتے رہ جائیں گے اور تم انہیں کبھی نہیں ملو گے۔ بعد میں ان سے بھی ایک ایک کر کے نمٹ لیں گے۔"

"رب نواز تم کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو۔ کیا تم نے مجھے اکیلا سمجھ رکھا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں تمہارے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ میں اکیلا کر رہا ہوں۔"

"اس کرنل کا انجام دیکھ کر بھی تمہیں خیال نہیں آیا۔" رب نواز نے طنزیہ لہجے میں کہا "کتے کی موت مارا گیا۔ اب تمہاری باری ہے۔ اس کے بل پر اکڑ رہے تھے نا؟"

"میں نے صرف اپنے خدا پر بھروسا کیا ہے اور تم بھی جن غیر ملکی آقاؤں کے بل پر اکڑ رہے ہو، کام نکلنے کے بعد وہ تمہیں کتے کی موت مار دیں گے۔"

وہ ہنسا "رب نواز بے وقوف نہیں ہے۔ پکا کام کیا ہے۔ پہلے رقم میرے اکاؤنٹ میں آئے گی اور پھر میں ہاشم رضا کو ان کے حوالے کر دوں گا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "تمہاری عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ رقم جمع کرا سکتے ہیں ان کے لیے نکلوانا کیا مشکل ہے۔ اپنے مفاد کے لیے یہ حربے استعمال کر سکتے ہیں۔ تم ان کے لیے ایک معمولی تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔"

"میرے ساتھ جو بھی ہو تم اپنی خیر مناؤ۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "ابھی تمہارے ساتھ جو ہوگا۔ اسے تم مرتے دم تک نہیں فراموش کر سکو گے۔ بلکہ اسے دیکھ کر شاید تم مرنے کی آرزو کرنے لگو۔"

"میں نے کہا نا تم کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہو مگر تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"شاہ عالم میں تم سے انتقام لینے کے لیے اتنا بے چین ہوں اگر تم اپنی جان بچانے کے لیے مجھے ساری دنیا کی بھی دولت دے دو تب بھی اپنی جان نہیں بچا سکتے۔"

اس بار میں مسکرایا "رب نواز میں تم سے مانگنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ شیطان سے مانگ لوں۔ میں تمہاری فطرت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم کسی کو کچھ دے ہی نہیں سکتے سوائے بربادی کے۔"

"تم نے اب مجھے جان لیا ہے۔" وہ ہنسا۔ اسی دوران میں غیر محسوس جدوجہد جاری تھی۔ کلائیوں کو مسلسل حرکت سے وہ چھل گئی تھیں اور ان میں شدید درد ہو رہا تھا مگر مجھے اتنی کامیابی ہوئی تھی کہ میں نے اس کو معمولی سا ڈھیلا کر لیا تھا۔ وہاں رب نواز اور چندا کے علاوہ ایک شخص اور بھی تھا۔ اس نے ہاتھ میں مشین گن تھام رکھی تھی جس کا رخ میری طرف تھا۔ یک دم رب نواز نے دھاڑ کر کہا "جیرے...... شامی اندر آؤ۔" فوراً ہی دو مسٹنڈے اندر آ گئے۔ رب نواز نے چندا کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے دیوار کے ساتھ باندھ دو اور اس کے کپڑے اتار دو۔" اس کے انداز میں شیطان بول رہا تھا۔

"رب نواز ذلیل انسان...... ایک لڑکی پر ظلم کرتے ہو۔ مرد ہو تو مجھ سے مقابلہ کرو۔" میں نے چلا کر کہا اور یوں بازوؤں کو حرکت دیے لگا جیسے رسیاں توڑنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میرے اچھے بھی اس رسی کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ میری بے چینی دیکھ کر رب نواز نے قہقہہ لگایا۔

"بڑا خیال ہے اس کا۔ کیا لگتی ہے یہ تیری۔"

"رب نواز اگر اسے ذرا بھی نقصان ہوا تو میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔" میں نے مزید غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا۔ رب نواز کے کتوں نے چندا کو پکڑ لیا اور اسے باندھنے کے لیے دیوار کی طرف لے جانے لگے۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی لیکن یہ ایک معمولی سی مزاحمت تھی۔ کمزور مزاحمت...... اگر وہ ہوش میں ہوتی تو یہ اسے چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے منہ سے احتجاجی آوازیں نکل رہی تھیں۔ انہوں نے اسے دھکیل کر دیوار سے باندھ دیا۔ دیوار میں کلپ کی طرح بند ہو جانے

والے کنڈے نصب تھے۔ چندا کے ہاتھ اس میں باندھ دیے گئے تھے۔ اس دوران میں، میں بظاہر چیخ چیخ کر اپنی دیوانگی کا اظہار کر رہا تھا مگر میری ساری توجہ ہاتھ کی رسی ڈھیلی کرنے پر مرکوز تھی۔ ابھی وہ اتنی ڈھیلی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس میں سے اپنے ہاتھ نکال سکتا۔ جب انہوں نے چندا کو باندھ دیا تو میں نے سمجھ لیا کہ ابھی مجھے اور بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ جب چندا کو باندھ دیا تو رب نواز فاتحانہ انداز میں اس کے پاس پہنچا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور چندا کا لباس سامنے سے پھٹتا چلا گیا۔ وہ چیخی اور میں بھی چلانے لگا تھا۔ رب نواز کے کتے ہوس زدہ نظروں سے چندا کے شفاف بدن کو دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ مشین گن بردار کا دھیان بھی اس کی طرف تھا۔ رب نواز کے مکروہ ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ اس کا لباس پھٹتا جا رہا تھا۔ چندا رو رہی تھی۔ سر پٹخ رہی تھی لیکن وہ اتنی ہی بے بس تھی جتنا کہ میں تھا۔ میں نے رب نواز کو فحش ترین گالیاں دیں، اسے بے معنی دھمکیوں سے نوازتا رہا لیکن وہ اس سے یوں محظوظ ہو رہا تھا جیسے شائقین فلموں کی بیک گراؤنڈ میوزک سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چندا دوا کے زیر اثر تھی اس لیے اسے اصل صورت حال کا احساس نہیں تھا لیکن اس کے اندر کی عورت توہین محسوس کر کے رو رہی تھی۔ اسے بے لباس ...... ہوتا دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر آنکھ بند کر کے بھی تصور وہ سب دکھا رہا تھا جو چندا کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کی سسکیوں کے درمیان رب نواز کی زہریلی پھنکار گونجی۔

"شاہ عالم ذرا دیکھو...... کتنا شفاف جسم ہے لیکن اسے پامال کر کے میں اپنے کتوں کے آگے ڈالوں گا۔ تم تو اس کی بچی لاش پہچان بھی نہیں سکو گے۔"

"رب نواز میں تجھے ہاتھوں سے ٹکڑے کر دوں گا۔"

میرے جسم میں جیسے خون کی جگہ آگ دوڑ رہی تھی۔ میں رسی کو مسلسل ڈھیلا کرنے میں مصروف تھا۔ ورنہ میرا دل کر رہا تھا کہ کسی طرح ایک ہی جھٹکے سے اسے توڑ دوں۔ اگر میرا ایک ہاتھ بھی آزاد ہوتا تو میں سب سے پہلے رب نواز کی کھوپڑی میں سوراخ کرتا بے شک اس کے بعد رب نواز کا آدمی مجھے چھلنی کر دیتا۔ اچانک چندا کی چیخ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے شانے پر گہری خراش سے خون چھلک رہا تھا۔ رب نواز حیوانیت دکھا رہا تھا میں بے بسی سے سر جھکائے آنکھیں بند کیے رسی ڈھیلی کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اب میں دونوں کلائیوں کے بجائے ایک ہی کلائی کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک آزاد ہو جاتی تو دوسری خود بخود نکل جاتی۔ رب نواز چندا کے جسم پر اپنے حیوانی ہاتھوں سے خراشیں ڈال رہا تھا۔ اپنا اصل شیطانی کھیل شروع کرنے سے پہلے وہ اس طرح اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کر رہا تھا۔

اچانک یہ محسوس کر کے میرا دل زور سے دھڑکا کہ میری کلائی آزاد ہونے کے قریب تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے بازوؤں سے حرکت نمایاں نہ ہو۔ کیوں کہ جذبات انگیز منظر کے باوجود مشین گن بردار میری طرف سے غافل نہیں تھا۔ وقفے وقفے سے وہ میری طرف نظر ڈال رہا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو میری ساری کوشش رائگاں جاتی۔ مسلسل کلائی کو بل دینے سے خون رس رہا تھا اور کلائیوں میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ آخر رسی اتنی ڈھیلی ہوئی کہ میں نے اپنا ہاتھ نکال لیا۔ میں نے ہاتھ کو جھٹکا دیا تو ننھا سا پسٹل نکل کر میری ہتھیلی میں آ گیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ میں موجود رسی کو ہاتھ میں ہی لپیٹ لیا۔ اب میں منتظر تھا کہ کب مشین گن بردار رب نواز کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو چندا کی طرف متوجہ تھا۔ مشین گن بردار کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے التجائیہ انداز میں رب نواز سے کہا "چندا کے ساتھ ایسا مت کرو۔"

جیسے ہی مشین گن بردار نے رب نواز کی طرف دیکھا۔ میرا ہاتھ سامنے آیا۔ میں نے لگاتار کئی گولیاں اس پر چلا دیں اور اٹھ کر رب نواز کی طرف جھپٹا۔ اسی لمحے اعصاب شکن دھماکا ہوا تھا اور رب نواز کی طرف لپکتے میرے قدم لڑکھڑا گئے میں گرا اور میرے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر رب نواز کے قدموں میں جا گرا تھا۔

دھماکے کی شدت نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مشین گن بردار تو چار گولیاں کھا کر خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا لیکن ابھی رب نواز کے دو کتے باقی تھے، جو اس کے اشارے پر مجھ پر جھپٹنے کو بے تاب تھے۔ دھماکا شاید تہ خانے کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا، پہلا بم میں نے حویلی کی دیوار میں بنے ایک سوراخ میں ڈال دیا تھا۔ یہ سوراخ شاید اس جگہ ہوا کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بم نے اندرونی دیواروں کو نقصان پہنچایا تھا اوپر سے ملبا اور گرد و غبار بھی گرا تھا۔

میری بدقسمتی کہ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر رب نواز کے قدموں میں جا گرا تھا۔ اس کے اعصاب نے دھماکے کے صدمے کو آسانی سے جھیل لیا تھا جب تک میں اٹھتا، اس نے پستول اٹھا لیا تھا۔

"بس شاہ عالم!" اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا "رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

میں ایک بار پھر بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ صورتِ حال پر قابو پا کر میں نے ایک بار پھر شکست کھائی تھی مگر رب نواز کے ایک چمچے نے میری مدد کی، وہ خواہ مخواہ غراتا ہوا میری طرف لپکا "تیری تو......" اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا، میں نے زمین پر گرتے ہوئے اس کے پیروں میں پیر پھنسا کر اسے گرایا اور اسے اسی کی طرف اچھال دیا جو مشین گن اٹھا کر سیدھا ہو رہا تھا۔ وہ اس سے ٹکرایا تو گن کا لیور خود بخود کھنچ گیا اور میری طرف آنے والا مارا گیا۔ اس کے ساتھی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے ہی ساتھی کو گولی مار دے گا۔ رب نواز نے دھاڑ کر اس کی اور اس کی ولدیت کو غلط ملط کرتے ہوئے کہا۔

"جب...... اس کی ماں کو چلانا نہیں آتا تو اٹھایا کیوں تھا، کتے کے بچے!" اس نے طیش کے عالم میں میری طرف دیکھا "شاہ عالم! اب تو مرنے کو تیار ہو جا۔"

اس نے پستول میری طرف کیا تو میری آنکھوں کے سامنے موت ہی آ گئی تھی۔ اتنی سی جگہ میں اور اتنے قریب سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رب نواز کے انداز سے لگ رہا تھا، وہ مجھے مار دینے کا فیصلہ کر چکا ہے مگر ابھی میری موت نہیں آئی تھی۔ اس بار مدد چندا کی طرف سے آئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب دوا کے اثر سے نکل آئی۔ اس نے عقب سے رب نواز کے پستول والے ہاتھ پر لات ماری۔ یہ ایک کمزور سی لات تھی لیکن اس نے میری طرف آنے والی گولی کا رخ بدل دیا۔ رب نواز کا ہاتھ اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں نے جست لگائی اور رب نواز پر جا گرا۔

"اوئے...... اوئے، میں گولی مار دوں گا" مشین گن بردار نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا لیکن اتنے نزدیک سے وہ مجھے گولی مار ہی نہیں سکتا تھا، میرے ساتھ رب نواز کے جاں بحق ہو جانے کا پورا امکان تھا۔ میرے لیے رب نواز سے پستول چھین لینا مشکل نہیں تھا لیکن گرتے ہوئے پستول والا ہاتھ اس کے جسم کے نیچے دب گیا تھا اور میں بھی اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ کو نکلتے ہی قابو کر لیتا اور وہ مجھے فوراً گولی مار دیتا۔ اس لیے میری کوشش تھی کہ اس کا ہاتھ جسم تلے ہی دبا رہے۔ رب نواز نے مجھ سے زور آزمائی کرتے ہوئے اپنے گرگے کو ایک بار پھر نازیبا الفاظ میں یاد کرتے ہوئے اسے حرکت میں آنے کا حکم دیا۔ وہ ہماری طرف آیا تو میں نے کروٹ بدلتے ہوئے رب نواز کو اوپر کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پستول والا ہاتھ آزاد ہو گیا۔ اب میں اس قابل تھا کہ اس سے پستول چھین سکوں۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ ڈالا تو پستول کا رخ اسی کی طرف ہو گیا، اس نے زور لگا کر میری طرف کرنے کی کوشش کی اور اس کشمکش میں گولی چلی تو ہمیشہ کی طرح ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک مارا گیا۔ گرگے نے مشین گن ایک طرف پھینکی اور زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔

"تم نے ایک اور قتل کر دیا۔" رب نواز سے میں نے پستول چھینتے ہوئے کہا اور اسے دور پھینک دیا۔

میں زمین سے کھڑا ہوا تو چندا کی حالت دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ اس کا اوپری لباس تار تار ہو گیا تھا اور جسم پر جا بجا رب نواز کے حیوانی ہاتھوں سے بنے خراشوں کے نشانات نمایاں تھے۔ پستول میں ابھی ایک گولی باقی تھی جو میں نے رب نواز کے جسم میں اتار دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس کی طرف پستول اٹھایا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے گھگیا کر کہا "مجھے...... مت مارو...... شاہ عالم!"

"کاش کہ میرے پاس وقت ہوتا تو میں تمہیں یوں نہ مارتا۔ بلکہ قسطوں میں قتل کرتا۔ اتنے عذابوں کے ساتھ تم خود موت کی بھیک مانگتے اور میں تمہیں نہ دیتا لیکن تم جیسے موذی کو مہلت دینا بے وقوفی ہوگی۔"

بے وقوفی میں کر رہا تھا، تقریر کرنے کے بجائے میں فوری طور پر گولی مار کر اس کا قصہ پاک کر سکتا تھا مگر جیسے ابھی میری زندگی باقی تھی، اسی طرح ابھی اس کی زندگی بھی باقی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں گولی چلاتا، دوسرے بم کا دھماکا ہوا، ایک لمحے کو میری توجہ ہٹی اور رب نواز نے غوطہ مارا۔ اگلے ہی

لمحے وہ کمرے سے باہر تھا۔ میں دروازے کی طرف جھپٹا پھر چندا کی کراہ سن کر رک گیا۔ واپس آ کر میں نے اس کے ہاتھ آزاد کیے اور اسے اپنی جیکٹ اتار کر پہنا دی۔ اس کی قمیص ستر پوشی کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھی۔ وہ آزاد ہوتے ہی میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی۔

"ناصر......!" اس نے سرگوشی کی۔

"ہاں، میری جان!" میں نے بے تابی سے اس کی سرگوشی ہونٹوں میں جذب کر لی۔

"یہاں سے نکلو، اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے" چندا نے ابھی سانسوں کے درمیان کہا تو جیسے مجھے ہوش آیا۔ اس کا ریشمی وجود بانہوں میں لے کر میں سب کچھ چند لمحے کے لیے بھول گیا تھا۔ اسے جیکٹ پہناتے ہوئے میں نے کہا۔

"چندا! کیا اب تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں" اس نے کہا "انہوں نے مجھے کوئی دوا دی تھی جس کے اثر سے ذہن سن ہو گیا تھا۔"

میں نے پستول اور میگزین اسے تھمائے اور خود مشین گن اٹھا لی۔ اس کے دو فاضل کلپ مرنے والے کی کمر میں لگے تھے۔ ایک کے پاس سے ریوالور نکلا تھا "چندا ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ جو بھی راستے میں آئے بے دریغ اڑا دو" پھر میں نے ہیڈ سیٹ پر اکبر کو آواز دی مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید وہ دو سو گز کی حد سے باہر تھا۔

"کسے آواز دے رہے ہو؟" چندا نے پوچھا۔ اس نے پستول سنبھال لیا تھا۔ خان جی نے ہمیں صرف جسمانی تربیت ہی نہیں دی تھی بلکہ اسلحہ چلانا بھی سکھایا تھا اور چندا اس معاملے میں بھی مجھ سے آگے تھی۔ اس کا نشانہ مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ اسی لمحے باہر گیلری کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔

"میں اپنے ساتھی اکبر سے رابطہ کر رہا تھا مگر جواب نہیں ملا۔" میں نے ٹوپی کھسکا کر اسے ہیڈ سیٹ دکھایا "باہر کوئی ہے، ہوشیار رہو۔"

میں نے ایک لاش اٹھا کر اسے دروازے سے باہر پھینکا۔ فوراً ہی کئی گولیاں آ کر اس کے مردہ جسم میں پیوست ہو گئیں۔ فائر کم سے کم دو ہتھیاروں سے ہوئے تھے یعنی وہاں کئی افراد تھے۔ میں نے ہاتھ نکال کر اس طرف کئی فائر کیے جواب میں ایک دل خراش چیخ نے دل خوش کر دیا۔ "اب نکلنا ہے یہاں سے، میرے پیچھے ہی رہنا" میں نے دوسری لاش اٹھا لی جو نسبتاً دبلے پتلے شخص کی تھی، اسے ڈھال بنائے میں باہر نکلا۔ چندا میرے پیچھے تھی۔ فوراً ہی اس طرف سے کئی گولیاں آ کر لاش میں پیوست ہو گئیں اور جب میں نے مشین گن کا برسٹ مارا تو دو اور راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ یہ پتلی سی گیلری کا آخری حصہ تھا۔ یہاں سے مجھے وہی گودام نما جگہ نظر آ رہی تھی جہاں ہاشم رضا نے مجھے باتوں میں لگا کر مروا دیا تھا۔ اسی گودام کے ایک حصے میں اس کی لیب بھی تھی۔ روشنی بتا رہی تھی کہ انہوں نے کس طرح جنریٹر دوبارہ آن کر لیا تھا۔ لاش ایک طرف پھینک کر میں نے ذرا سا باہر جھانکا۔ ایک طرف اوپر تک گتے کے کارٹن تھے۔ اس طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ البتہ دوسری طرف سے تھا۔ چندا میرے عقب میں بالکل ساتھ لگی کھڑی تھی۔ میں نے پستول سے گودام میں اس حصے کے اوپر روشن بلب کو اڑا دیا۔ اس حصے میں تاریکی ہوتے ہی میں باہر نکلا اور کارٹن کی آڑ میں دبک گیا۔ اس طرف شاید کوئی اور نہیں تھا مگر فوراً ہی میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ کسی نے سامنے سے کارٹن پر اوپر تلے کئی گولیاں برسائیں۔ نہ جانے کارٹن میں کیا تھا، جس کی وجہ سے میں محفوظ رہا تھا۔ میں نے جواب میں مشین گن کا برسٹ مارا مگر کوئی آواز نہیں آئی۔ دوسرا آدمی بہت چالاک تھا یا آواز نکالے بغیر مر چکا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اوپر سے ایک کارٹن ہلایا اور اسے نیچے گرا دیا۔ فوراً اس کی طرف سے فائر ہوئے، اس بار میں نے درست نشانہ لے کر مشین گن کا بقیہ کلپ اس پر خالی کر دیا۔ اس نے بیل کی سی آواز نکالی اور پرشور آواز سے فرش پر جا گرا۔ وہ ذرا روشنی والے حصے میں تھا اور اس کے جسم سے ابلتا ہوا خون فرش پر پھیلتا نظر آ رہا تھا۔

"چندا!" میں نے آواز دی تو وہ لپک کر آئی۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں" میں نے مشین گن کا کلپ بدلا "اس کا پستول اٹھا لو۔ ہمیں ہتھیاروں کی اشد ضرورت ہے۔"

چندا نے اس کا پستول اٹھا لیا اور میرا دیا ہوا ننھا سا پستول اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے اس کے لباس سے میگزین بھی نکال کر چندا کو تھما دیے۔ اچانک گودام کے ایک حصے سے روشنی سی جھلکنے لگی۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ وہاں آگ لگ گئی تھی۔ شاید کسی قسم کا کیمیکل تھا، جسے گولی لگی اور اس نے آگ پکڑ لی۔ اسی گودام میں نہ جانے کس کس طرح کے کیمیکل اور خطرناک مادے تھے۔

"چندا، یہاں سے نکلو" میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔ ہم سامنے والے حصے کی طرف دوڑے، جیسے ہی اوپر جانے والی سیڑھیوں تک پہنچے، عقب میں ایک اور دھماکا ہوا۔ مجھے اب تک تیسرے ٹائم بم کا دھماکا سنائی نہیں دیا تھا۔ شاید وہ ناکارہ نکلا تھا۔ دھماکے کے ساتھ ہی گودام میں بھڑکنے والی

آگ شدت اختیار کر گئی۔ میں اور چندا دوڑنے لگے۔ ایک شامت کا مارا اچانک راستے میں آیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ ہم اس طرح دوڑتے اس کے سر پر پہنچ جائیں گے، اس بار چندا بازی لے گئی، اس نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا تھا۔ وہ پیٹ سے گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ راستہ گھوم کر ہم اوپر والے تہ خانے کے سامنے آ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ رب نواز کی وفادار فوج یہاں ہمارا راستہ روکنے کے لیے تیار ہوگی۔

ہم جس کمرے سے نکلے، اس کی چھت کو دو بڑے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ کمرا خالی تھا لیکن اس سے آگے کسی کے چلا چلا کر بولنے کی آواز آ رہی تھی "اس لڑکی نے نیچے آگ لگا دی ہے۔ اگر بارود کو آگ لگ گئی تو حویلی اڑ جائے گی۔"

"بھاگو ادھر سے" کوئی اور چلایا۔

"کوئی نہیں جائے گا" میں نے رب نواز کی دھاڑ سنی "اس کتے کے بچے کو تلاش کرو، نیچے جا کر۔"

"میں کیوں جاؤں؟" کسی نے ترش لہجے میں کہا "کوئی جانے والا باہر آیا ہے، سارے مارے گئے، تم خود......"

سرکش کی آواز چیخ میں بدل گئی۔ رب نواز نے اسے گولی مار دی تھی اور پھر گرج کر بولا "کسی اور نے بغاوت کی تو اس کا بھی یہی انجام ہوگا۔ جاؤ، اسے تلاش کرو اور کتے کی موت مار دو۔"

"چندا!" میں نے سرگوشی کی "دوسرے ستون کے عقب میں رہو اور جیسے ہی وہ کمرے میں آئیں، فائر کر دینا۔ رکنا مت۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور دوسرے ستون کے عقب میں ہو گئی۔ ستون اتنے بڑے تھے کہ ہم آسانی سے ان کے عقب میں چھپ گئے تھے۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا "ادھر کوئی نہیں ہے۔"

"ستونوں کے پیچھے تیرا باپ دیکھے گا؟" مجھے اس کی آواز آئی جو حویلی کے صحن میں خفیہ راستے سے نکلا تھا۔ وہ بے حد چالاک آدمی تھا۔ وہ یقیناً رب نواز کے اہم آدمیوں میں سے تھا۔ اس کے منہ سے ستونوں کا لفظ سنتے ہی میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے مشین گن سیدھی کی اور ستون کے عقب سے نکل آیا۔ سب سے پہلے وہ قربانی کا بکرا مارا گیا جسے دھکا دے کر کمرے میں بھیجا گیا تھا۔ میں نے دروازے پر مسلسل فائرنگ کی۔ دروازہ چھلنی ہو گیا، اس کے عقب میں موجود لوگ مارے گئے تھے۔ ایک جنون کے عالم میں، میں نے مشین گن کا پورا کلپ ختم کر دیا تھا اور پھر چندا نے میری جان بچائی، جیسے ہی وہ شخص دروازے پر نمودار ہوا، چندا نے اس پر فائرنگ کر دی اور وہ مجھے مارنے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے سدھار گیا۔

"تم بہت بے پروا ہو گئے ہو" چندا نے ڈانٹ کر کہا۔

میں دوبارہ ستون کی آڑ میں آ گیا تھا۔ میں نے مشین گن میں آخری کلپ لگایا۔ اس دوران میں دروازے کی طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ لوگ اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ دروازے کے نزدیک آئے بغیر فائرنگ کر رہے تھے پس منظر میں رب نواز کے منہ سے مغلظات کا طوفان جاری تھا۔

"رب نواز...... تیرا منصوبہ تو ناکام ہو گیا۔ میں نے ہاشم رضا کی لیب تباہ کر دی ہے" میں نے چلا کر کہا۔

میرے الفاظ کی تصدیق نیچے سے آنے والے زوردار دھماکوں نے کی۔ اس کے بعد ملبا گرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں جن سے ظاہر تھا کہ دھماکوں سے حویلی کا وہ حصہ منہدم ہو رہا تھا جس کے نیچے لیب تھی۔ رب نواز کی آواز بھی دھماکوں میں دب گئی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے فائرنگ روک دی تھی۔ جب شور ذرا کم ہوا تو رب نواز نے نئے سرے سے مجھے گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔

"شاہ عالم! اس جگہ تیری قبر بنے گی۔ تجھے یہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔ میں تجھے اسی جگہ بند کر کے جا رہا ہوں۔"

"رب نواز! تمہیں باہر جانا نصیب ہوگا تو مجھے بند کرو گے۔ باہر بھی میرے ساتھی ہیں۔ یہ دھماکے کس نے کیے تھے؟" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"ملک صاحب، یہاں سے نکلیں" میں نے رب نواز کے دست راست کی تکلیف زدہ آواز سنی۔ شاید اسے بھی گولی لگی تھی۔ "بارود پھٹ گیا تو پوری حویلی بیٹھ جائے گی۔"

اسی اثنا میں نیچے سے آنے والے دھماکوں کی آوازیں بڑھنے لگی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گولہ بارود کے اس ذخیرے کو آگ لگ گئی تھی جس کا وہ ذکر کر رہے تھے۔ میں نے چندا کی طرف دیکھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رب نواز بلف کر رہا ہو۔ وہ یا اس کا کوئی پالتو توپ لیے وہاں موجود ہو اور میں جیسے ہی دروازے پر نمودار ہوں، دھائیں کر کے وہ مجھے ناپید کر دے۔ دوسری طرف تہ خانے کے دھماکوں سے بھی خطرہ تھا۔ شعلے سیڑھیوں تک آ گئے تھے اور اس بات کا پورا امکان تھا

کہ رب نواز کی پیش گوئی کے مطابق یہ تہ خانہ ہمارا مقبرہ ثابت ہو۔ "چندا!" میں نے سرگوشی میں کہا "مجھے خطرہ مول لینا ہوگا۔"

"نہیں" وہ اضطراب سے بولی "اس طرف وہ لوگ ہیں۔"

"دوسری صورت میں ہم یہاں مارے جائیں گے۔" میں نے سیڑھیوں کی طرف سے لپکتے شعلوں کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو۔"

چندا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اسی لمحے ایک دھماکے کے بعد بلب بجھ گئے۔ شاید جنریٹر نشانہ بن گیا تھا۔ میں نے فرش پر بیٹھ کر رینگنا شروع کر دیا۔ پہلے دیوار تک اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے تک۔ اگر دوسرے کمرے میں کوئی موجود بھی تھا تو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی طرح میں بھی اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ میری آہٹ سن لیتا تو ضرور گولی چلاتا۔ میں نے ذرا پیچھے آ کر فرش ٹٹولا۔ اس شخص کی لاش کمرے کے وسط میں پڑی تھی، اس کی تلاشی لے کر میں نے اس کی جیب سے سکے نکالے اور دوسرے کمرے کی طرف اچھال دیے۔ جیسے ہی چھناکے سے سکے فرش پر گرے، کسی نے بے اختیار اسی طرف فائرنگ کی۔ میں نے کمرے کے فرش پر گرتے ہوئے، اسی طرف مشین گن کا برسٹ مارا۔ اس کی چیخ سنائی دی مگر مرنے سے پہلے اس نے فائر کیے تھے، اس وقت تو مجھے احساس نہیں ہوا لیکن جب میں نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی تو دائیں پہلو میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ اسے ضبط کرتے کرتے بھی میری کراہ نکل گئی تھی، جسے چندا نے سن لیا، اس نے چیخ ماری "ناصر!" اور اندھیرے میں مجھ سے آ لپٹی۔ اس کے ہاتھ بے تابی سے مجھے ٹٹول رہے تھے۔ "تم ٹھیک تو ہو......" پھر اس کے ہاتھ نے خون محسوس کر لیا۔ اس نے دوسری چیخ ماری۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"معمولی زخم ہے، فکر نہ کرو۔"

"نہیں، دیکھو کتنا خون ہے" اس نے روتے ہوئے احمقانہ بات کی۔ اندھیرے میں مجھے کہاں نظر آتا کہ کتنا خون ہے؟ میں نے زخم ٹٹولا، گولی نے پیٹ اور سینے کے درمیانی حصے میں اپنی راہ بنائی تھی۔ زخم سے خون بدستور ابل رہا تھا۔ چندا تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے الگ ہوئی پھر میں نے کپڑا پھٹنے کی آواز سنی۔ وہ اپنی تار تار ہو جانے والی قمیص پھاڑ کر اس سے پٹیاں بنا رہی تھی۔ اس نے میری قمیص اوپر کی اور پٹیاں زخم پر باندھنے لگی۔ اس نے ایک پیڈ سا بنا کر زخم پر رکھ دیا تھا۔ ابتدائی درد کی لہر کے بعد میں بہتری محسوس کر رہا تھا۔

زخم پر پٹی باندھ کر اس نے پھر سے جیکٹ پہنی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کا نرم و گداز جسم مجھ سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ میرے لیے خود کو بھی بھول گئی تھی۔

جری نیچے کر کے میں نے مشین گن سنبھالی اور چل پھر کر دیکھا۔ درد ہو رہا تھا لیکن یہ فی الوقت قابلِ برداشت تھا۔ چندا نے مشین گن مانگی لیکن میں نے اسے اپنے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ "چندا! تم مجھے کور دینا، مشین گن کی وجہ سے میں فوری طور پر فائر نہیں کر سکوں گا۔"

"میں آگے رہوں گی" اس نے کہا "تم مجھے کور دینا۔ بڑا ہتھیار ویسے بھی تمہارے پاس ہے۔"

سیڑھیوں کی طرف سے بڑھتے ہوئے شعلوں کے انعکاس کی وجہ سے یہ حصہ اب کسی قدر روشن تھا۔ سامنے والی گیلری نظر آ رہی تھی۔ چندا آگے جانے لگی، ہم دیوار سے چپک کر چل رہے تھے۔ ذرا آگے جاتے ہی دوبارہ اندھی تاریکی مسلط ہو گئی مگر دیوار ہمیں راستہ بتانے کے لیے موجود تھی۔ چندا مجھ سے ایک قدم آگے تھی اور میرا ہاتھ اس کے نرم شانے پر تھا۔ عقب میں دھماکے جاری تھے مگر اس بار ایسا دھماکا ہوا کہ میں اور چندا فرش پر جا گرے۔ ایسا گرنا ہمیں بچا گیا تھا کیونکہ کسی نے سامنے سے برسٹ مارا تھا۔ گولیاں اوپر سے گزر گئی تھیں۔ چندا نے بے اختیار چیخ ماری۔ گرنے سے درد کی خوفناک لہر اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے مسلسل فائرز کی آواز سنی۔ چندا جوابی فائرنگ کر رہی تھی۔ ایک اور برسٹ آیا لیکن اس بار بھی گولیاں اوپر سے گزر گئی تھیں۔ مارے تکلیف کے میری آنکھوں کے آگے تاریکی چھا رہی تھی، جب چندا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

"ناصر، نکلو یہاں سے، حویلی تباہ ہو رہی ہے۔"

"وہ کمینہ......"

"مارا گیا" اس نے کہا اور مجھے سہارا دے کر آگے لے جانے لگی۔ اس کی لاش سے پیر ٹکرایا تو مجھے خیال آیا "چندا! اس کی مشین گن اور کلپس لے لو۔ میری مشین گن میں چند ہی گولیاں رہ گئی ہیں۔"

چندا نے مجھے چھوڑا اور لاش ٹٹولنے لگی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ زیادہ خطرناک زخم نہیں ہے لیکن گرنے کے دوران میں جتنا جان لیوا درد ہوا تھا اس سے مجھے لگا، زخم میرے اندازے سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ گولی ابھی اندر ہی تھی۔ میں وقفے وقفے سے اکبر کو پکار رہا تھا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ چندا نے مرنے والے کی رائفل اور اس کے اضافی میگزین لے لیے تھے۔ میں نے مشین گن وہیں پھینک

دی اور پستول نکال لیا۔ اب رائفل چندا کے پاس تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم اس گیلری سے گزر رہے تھے، جس کے دائیں طرف سے راستہ باہر جانے والے خفیہ دروازے پر نکلتا تھا۔ میں نے چندا سے کہا ''دائیں طرف باہر جانے والا راستہ ہے، اس کا خیال کرنا۔''

''میں دیکھ رہی ہوں'' اس نے کہا ''ایک منٹ، تم اسی جگہ رکو۔''

''ہرگز نہیں'' میں نے بے تابی سے کہا ''تم مجھ سے الگ مت ہونا۔ اس تاریکی میں کسی وجہ سے بچھڑ گئے تو پھر ملنا مشکل ہوگا۔''

''میں صرف راستہ دیکھ کر آتی ہوں، تم آرام کرو'' وہ بولی۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ گرنے اور پھر مسلسل حرکت کرنے کی وجہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں دانت دبا کر درد برداشت کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خون سے گدی اور اس کے اوپر بندھی ہوئی پٹی خون سے تر ہو چکی تھی۔ میں چندا کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے پاس ہی آہٹ محسوس ہوئی۔ ''چندا! تم آ گئیں؟''

مگر چندا کی آواز کے بجائے مجھے کسی کی حیوانی غراہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی جسیم بدن نے مجھ پر جست لگائی۔ میرے منہ سے چیخ نکل۔ آنے والا بے پناہ وزنی تھا۔ میں نے اسے دور دھکیل دیا۔ اس کے منہ سے پھر غراہٹ نکلی۔ اس سے پہلے کہ میں پستول سیدھا کرتا، اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میرا پستول والا ہاتھ پہلو میں دبا ہوا تھا اور میں کوشش کے باوجود ہاتھ نہیں گھما پا رہا تھا۔ ورنہ ایک ہی گولی اس کے لیے کافی ہوتی۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ وہی پروفیسر ہاشم رضا کی تخلیق کردہ کوئی نیم حیوانی مخلوق تھی۔ اس کی گرفت میں آنے سے میرا زخم دبا تو میں درد سے پاگل ہونے لگا۔ میں نے دیوانہ وار اس کے منہ پر سر سے ٹکریں ماریں، اس پر بس اتنا اثر ہوا کہ گرفت ذرا ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ذرا ہاتھ اوپر کیا اور فائر کر دیا۔ اس کے منہ سے حیوانی چیخ نکلی اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے اندازے سے دوسرا فائر کیا مگر اس بار گولی اسے نہیں لگی تھی۔ میں آہستہ سے آگے سرکنے لگا۔ درد کے باوجود خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔ زخمی ہو کر وہ اور بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ تاریکی میں مجھے اس کی ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے اسی سمت فائر کیا مگر جواب میں کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ مجھے چندا کی فکر بھی لاحق تھی۔ وہ واپس آ گئی تو یہ تاریکی میں اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ میں اسے آوازیں دینے لگا۔ ''چندا! تم کہاں ہو...... اس طرف مت آنا...... یہاں وہ حیوانی مخلوق ہے۔''

اسی لیے مجھے بائیں طرف سے آہٹ محسوس ہوئی، میں نے ہاتھ اسی طرف گھمایا مگر اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا، کوئی سخت سی چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی اور پستول میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے اندھی لات گھمائی جو اس کے جسم پر لگی۔ وار نے اس پر اثر کیا تھا ورنہ وہ غراتا نہیں۔ اس نے بھی ہاتھ گھمایا اور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ درد کی ایک تازہ لہر نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ میرا سر دیوار سے لگا کہ چکر سا آ گیا تھا اور وہ دوبارہ مجھ پر آ پڑا تھا۔ میں نے اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی مگر ایک تو گولی کا زخم اور چکر آنا اور پر سے اس کا بے پناہ وزن میری کوشش ناکام بنا رہا تھا۔ اس نے میرا گلا دبانے کی کوشش کی مگر میں اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ اگر ایک بار میری گردن اس کے ہاتھ میں آ جاتی تو اس حالت میں، میں مزاحمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا۔ وہ مرد ہی تھا۔ اگرچہ نام نہاد ہی تھا کیونکہ پروفیسر کی بنائی ہوئی یہ حیوانی مخلوق افزائش نسل کی صلاحیت سے عاری تھی۔

اس نے گردن قابو میں نہ آتے دیکھ کر دوسرا حربہ استعمال کیا اور میرا سر زمین سے ٹکرانے کی کوشش کرنے لگا تاکہ میرے رہے سہے حواس بھی جواب دے جائیں اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی رہا تھا۔ دوسری بار سر زمین سے ٹکرایا تو میری آنکھوں کے آگے سچ مچ کی تاریکی آ گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری گردن دباتا، چندا آ گئی۔ اس نے پیشہ ورانہ قسم کی لات اس کی گردن پر ماری۔ اس کی مضبوط گردن ٹوٹی تو نہیں لیکن اس کے مہرے ضرور ہل کر رہ گئے تھے۔ وہ مجھ پر سے لڑھک گیا تھا۔ جیسے ہی وہ مجھ سے الگ ہوا، چندا نے اس کے سر میں گولی اتار دی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھے دیکھا۔ چہرہ تھپک کر اور سہلا کر مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔

میرے حواس بیدار ہوئے تو روشنی میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ نرمی اور گداز ی نے بتایا کہ میں چندا کی آغوش میں تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسی طرح لیٹا رہوں۔ بے شک پھر موت آ جائے لیکن خطرہ چندا کے لیے بھی تھا۔ اس لیے مجھے ہوش میں آنا پڑا۔ ''خدا کے لیے یہ روشنی ہٹاؤ میرے منہ سے'' میں نے کہا۔

''شکر ہے!'' چندا کی آواز آئی اور اس نے ٹارچ دور

کر لی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ پہلو میں درد کی لہر اٹھی۔ اسے برداشت کر رہا ہی تھا ''اب نکل چلو یہاں سے'' چندا بولی۔ ''مجھے یہ بیگ ملا ہے اس میں بہت ساری چیزیں ہیں۔''

میں نے جھپٹ کر بیگ لیا۔ یہ وہی بیگ تھا جو مجھے اکبر خان نے دیا تھا۔ اس میں کئی طرح کے بم تھے ''اس کے ساتھ ایک گن بھی تھی۔''

''وہ نہیں ملی، یہ بھی میں نے راستے میں ملنے والے ایک احمق سے حاصل کیا ہے، جس نے مجھے لڑکی سمجھ کر ہاتھوں سے قابو کرنا چاہا تھا۔''

''ہاں، اسے کیا پتا کہ تم کیا بلا ہو'' میں نے بیگ میں سے دو خطرناک قسم کے دستی بم نکالے۔ ''پھنس جانے کی صورت میں نکلنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں ہوگا'' چندا نے خفگی سے کہا۔

''اچھا تو میں بلا ہوں۔''

''تم بلا ہو، قہر ہو'' میں نے درد دباتے ہوئے کہا ''اب اس سے پہلے کہ حویلی گر جائے اور اس کے ملبے میں مع اپنی حسرتوں کے دفن ہو جائیں، یہاں سے چلو۔''

''ایک منٹ، دستی بم مجھے دے دو۔ تم زخمی ہو، اتنی پھرتی سے نہیں پھینک سکو گے۔''

میں نے اس کی بات مان لی۔ دستی بم اس نے جیکٹ کی اوپر والی جیب میں رکھ لیے۔ رائفل بھی چندا کے پاس تھی۔ میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ ہم شاید غلط راستے پر چلے گئے تھے۔ گیلری آگے جا کر بند ہو گئی تھی۔ ہم واپس پلٹے۔ چندا بولی۔

''کہیں انہوں نے راستہ بند کر دیا ہو؟''

''یہ وہ جگہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، اس سے اگلی والی گیلری پر باہر جانے والا راستہ ہے۔''

اب یہ واضح تھا کہ رب نواز اور اس کے گرگے دھماکوں سے خوف زدہ ہو کر یہاں سے جا چکے تھے اور غالباً راستہ بھی بند کر دیا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا۔ راستہ نہ بھی کھلا تو اسے بم سے اڑا کر کھولا جا سکتا تھا۔ چندا نے بیگ حاصل کر کے کارنامہ انجام دیا تھا۔ بالآخر ہم اس جگہ پہنچے۔ جہاں سے ایک مختصری سرنگ کے آخر میں باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ چندا نے ٹارچ دائیں ہاتھ میں تھامی رائفل کے اوپر لگا رکھی تھی۔ اس طرح اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔

''یہ راستہ باہر جاتا ہے'' میں نے اسے آگاہ کیا اور گہرے سانس لے کر درد دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا بہت درد ہو رہا ہے؟'' چندا کے لہجے میں تشویش تھی۔

''نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا لیکن چندا ہاتھ سے زخم ٹٹول چکی تھی۔

''یہ تو پھر خون بہہ رہا ہے، ایک منٹ'' اس نے میری جری اوپر کی اور پٹی کھولی۔ نیچے لگی گدی پوری طرح خون میں تر ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی قمیص کے بچے کھچے ٹکڑوں سے دوسری گدی بنائی۔ اسے زخم پر رکھ کر اوپر سے دوبارہ پٹی باندھ دی۔ درد میں کمی تو نہیں ہوئی لیکن اس کے ہاتھوں کے لمس نے مجھے سکون دیا تھا۔ وہ میرے پاس ہی تھی۔ میں نے اسے چوم لیا ''شکریہ چندا!''

''ایسی حالت میں بھی باز نہیں آتے؟'' وہ شرما کر بولی۔

غالباً رب نواز اور اس کے ساتھی سب بارود کی ذخیرے کے پھٹنے سے خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔ وہ اتنا خطرناک نہیں تھا۔ اس کے پھٹنے سے حویلی کا کچھ حصہ ضرور تباہ ہوا تھا لیکن ساری حویلی تباہ نہیں ہوئی تھی۔ اس صورت میں تہ خانے کا یہ حصہ بھی محفوظ نہ رہتا۔ ہم سرنگ کے راستے گزر کر باہر نکلنے والے خفیہ دروازے تک آئے۔ حسب توقع وہ بند تھا۔ ہم نے آس پاس کوئی ایسی شے تلاش کی جس سے یہ دروازہ کھلتا ہو لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ معاً ایک شدید دھماکے نے زمین ہلا کر رکھ دی تھی۔ ابھی بارود کا مزید ذخیرہ باقی تھا۔ میں چندا سے ٹکرایا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور ہم دیوار سے جا لگے۔ سرنگ کا کوئی حصہ گرا تھا۔ گرد و غبار کے بادل نے ٹارچ کی روشنی کو بھی دھندلا دیا تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''چندا! دستی بم مارو۔ ورنہ ہم بھی اسی جگہ دفن ہو کر رہ جائیں گے۔''

اس نے اوپر دروازے کی طرف دیکھا۔ ''ناصر! یہ جگہ مختصری ہے۔ ہمیں دھماکے سے پہلے دور جانا ہوگا۔ تم پیچھے جاؤ۔''

میں پیچھے ہٹا۔ میں نے بیگ سے پنسل ٹارچ نکال لی تھی مگر ذرا پیچھے ملبے نے گر کر راستہ بند کر دیا تھا۔ اب ہم ایک بیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی جگہ قید ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے چندا کو بتایا ''پیچھے جانے کا راستہ بند ہو چکا ہے۔''

اس کا چہرہ زرد ہو گیا ''ناصر اب کیسے نکلیں گے؟''

''دیکھتے ہیں'' میں نے ملبے کی طرف روشنی کی۔ تلاش بسیار کے بعد ایک چھوٹا سا خلا نظر آیا، جس میں بہ مشکل ایک آدمی سما سکتا تھا لیکن دستی بم مار کر فوری طور پر اس خلا میں گھسنا

دشوار تھا۔ میں نے ہیڈ سیٹ پر اکبر کو پکارا۔ اگر وہ پاس ہوتا تو ہمارے لیے راستہ کھول سکتا تھا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ''ناصر، ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہوگا'' چندا بولی۔

''ہاں'' میں نے سرد آہ بھری ''بہت سارے کام ہیں جو ہم ہی کر سکتے ہیں۔''

وہ جھینپ گئی ''بس تمہارا ذہن اسی طرف کام کرتا ہے۔''

''کس طرف؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ اس دوران میں میرے ذہن میں ایک ترکیب آرہی تھی لیکن اس کے لیے ایک لمبی رسی کی ضرورت تھی۔ میں نے بیگ دیکھا، خوش قسمتی سے اس میں پتلی رسی کا لچھا موجود تھا۔ میں نے اسے نکالا ''تم جا کر اس خلا میں گھس جاؤ۔ اپنے جسم کی لچک سے فائدہ اٹھاؤ، اتنی جگہ بنا لو کہ میں بھی آسکوں۔''

چندا میرا مقصد بھانپ گئی تھی ''یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں، تم پہلے ہی زخمی ہو۔''

''نہیں، یہ کام میں کرلوں گا جو تم سے کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ وقت کم ہے'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو چندا خاموشی سے جا کر اس خلا میں لیٹ گئی۔ میں نے دستی بم دروازے کے پاس ایک دیواری رخنے میں پھنسایا۔ دروازے میں اسے پھنسانے کی کوئی جگہ نہیں تھی ورنہ یہ زیادہ بہتر رہتا۔ اسی کی پن سے رسی کا ایک سرا باندھا پھر اسے کھینچ کر اطمینان کیا کہ دستی بم رخنے سے باہر تو نہیں آرہا ہے لیکن وہ رخنے میں یوں پھنس گیا تھا کہ نکل نہیں سکتا تھا۔ میں رسی لیتا خلا تک آیا۔ چندا خلا میں یوں سکڑ سمٹ کر لیٹ گئی تھی کہ خلا میں محسوس بھی نہیں ہورہی تھی۔ میں بقیہ خلا میں گھس گیا۔ میں نے خود کو ممکنہ حد تک خلا میں کرلیا۔ اس موقع پر چندا نے بے پناہ صبر سے کام لیا۔ پتھریلے ملبے اور میرے درمیان اس کا نازک سا بدن پس کر رہ گیا تھا لیکن اس کے منہ سے آہ بھی نہیں نکلی تھی بلکہ اس نے میرے گرد ہاتھ لپیٹ کر میرا سر اپنے شانوں کے درمیان رکھ لیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے میرا سر چھپالیا تھا۔

''چندا! حوصلہ رکھنا۔ سانس روک لو'' میں نے رسی کھینچنے سے پہلے کہا ''اس بم سے زہریلی گیس بھی نکلتی ہے۔''

میں نے اللہ کا نام لے کر رسی کھینچی اور خود کو ممکنہ حد تک نیچے دبالیا۔ اس کے باوجود جب دھماکا ہوا تو برستے پتھروں کے کئی ٹکڑے میری پشت سے ٹکرائے تھے۔ چندا نے چیخ ماری، جب سنگریزوں کی برسات ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا، خلا سے جھانکتی تاروں کی روشنی دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر چندا کو کھینچ کر کھڑا کیا۔ وہ اپنا ہاتھ جھٹک رہی تھی۔ تارچ کی روشنی میں اس پر خون نظر آرہا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا۔ پشت سے کھال ادھڑ گئی تھی۔

''پتا نہیں۔ دھماکے کے وقت کوئی چیز آ کر لگی تھی'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ اس کا یہ ہاتھ عین میری گدی پر تھا۔ اگر ہاتھ نہ ہوتا تو لگنے والی چیز اتنی شدت سے میری گدی پر لگتی، میں نے اس کی قمیص کے ایک بچے ٹکڑے سے خون صاف کرکے اوپر سے پٹی باندھ دی۔ اس نے رائفل سنبھالی ''پہلے میں باہر جاؤں گی۔''

''نہیں۔ اگر کوئی چھپا ہوا ہوگا تو ہم آسانی سے اس کا نشانہ بن جائیں گے'' میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک گول سا اور انسانی سر سے مشابہ پتھر اٹھا کر دیوار سے گرنے والے ملبے پر بیٹھ کر احتیاط سے یہ پتھر یوں اوپر کیا جیسے کوئی سر نکال کر باہر جھانک رہا ہو۔ فوراً ہی ایک سنسناتی گولی آ کر پتھر سے لگی۔ میں نے پتھر نیچے گرادیا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ باہر والے کو گولی لگنے کی آواز سے ہی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس کا نشانہ انسانی سر نہیں بلکہ پتھر تھا۔ گولی اس درخت کی طرف سے آئی تھی جس کے عقب میں، میں چھپا تھا جب اس خفیہ راستے سے نورا نکلا تھا۔

''اکبر!'' میں نے ذرا واضح الفاظ میں پکارا کہ یہ کہیں اکبر نہ ہو لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ رب نواز کا کوئی چیلا تھا اس سے تو امید نہیں تھی کہ وہ بذاتِ خود یہاں موجود ہوگا۔ وہ کسی کو مامور کرگیا تھا کہ ہم باہر آ بھی جائیں تو ہمیں مار کر ہی آنا۔ گولی کسی پستول سے چلائی گئی تھی۔ گویا اس کے پاس رائفل یا اس قسم کا کوئی اور بھاری ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ اسے استعمال کرتا۔ عین ممکن تھا کہ اسے پستول استعمال کرنے میں آسانی محسوس ہوتی ہو۔ کم بخت ہر قدم پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ تھی، میں جتنی جلدی یہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا، اتنی ہی دیر ہورہی تھی۔ چندا میرے پاس ہی تھی۔

''اب کیا کریں؟'' اس نے پوچھا۔

''انتظار!'' میں نے جواب دیا ''مجھے حیرت ہے، یہ حرام خور پولیس والے کہاں گئے؟ بے شک وہ سو رہے تھے لیکن یہ دھماکے تو کسی مردے کو بھی جگا سکتے ہیں۔ ان کی طرف سے اب تک کوئی ردِعمل نہیں آیا ہے۔''

''وہ سب سے پہلے فرار ہوئے ہوں گے اور اس وقت تک نہیں رکیں گے جب تک انہیں یقین نہ ہوجائے کہ وہ محفوظ ہیں'' چندا آہستہ سے بولی پھر ہنسی، میں نے ایک بازو

اس کے گرد حمائل کردیا۔

''چندا! جب تک تم نہیں ملیں، میں ہر پل تمہارے لیے فکرمند رہا تھا'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی ''رب نواز نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟''

''نہیں لیکن تفصیل بعد میں بتاؤں گی، ابھی تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔ مجھے تمہارے زخم کی فکر ہے۔''

''کیسے نکلیں گے، باہر فرشتۂ اجل کا نمائندہ ہے، ہمیں فوت کرنے کے لیے۔''

''یہی دستی بم پھینکتے ہیں جب اس کی توجہ ہٹے گی تو میں باہر نکل کر اسے شوٹ کردوں گی۔''

ترکیب تو اچھی ہے میں نے سوچا لیکن ذرا بہتر انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ میرے پاس گیس کے بم بھی ہیں۔ میں نے بیگ سے ٹینس کی گیند کے سائز کے گیس بم نکالے ''یہ اسے اس کی کمین گاہ سے نکلنے پر مجبور کردے گا، اب تم اس جگہ کا نقشہ سمجھ لو'' میں نے اسے تفصیل سے خفیہ راستے کے اردگرد کے جغرافیے سے آگاہ کیا ''یہاں سوائے اس درخت کے کوئی آڑ نہیں ہے۔ جو خفیہ راستے سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر ہے۔''

''میں سمجھ گئی'' اس نے رائفل نیچے رکھ کر پستول تھام لیا ''میں باہر نکلوں گی اور اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے سے اس پر فائر کردوں گی۔''

''بالکل درست...... تم تو بہت عقل مند ہوگئی ہو'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''میں ہمیشہ سے عقل مند تھی'' اس نے خفگی سے جواب دیا۔

میرے ذہن میں درخت کا نقشہ واضح تھا۔ میں نے بم کی پن نکالی اور تین تک گن کر اسے باہر اچھال دیا۔ جیسے ہی بم گرا، پھوٹنے جیسی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی بھاپ کی سی سنسناتی آواز آئی۔ بم سے گیس خارج ہورہی تھی۔ کسی نے چلا کر گالی دی اور اس کے ساتھ ہی چندا اسپرنگ کی طرح اوپر کی طرف اچھلی، ایک لمحے کو اس کے دونوں پیر خلا کے کناروں پر ٹکے۔ اگلے ہی لمحے وہ اچھل کر پیچھے کی طرف جا چکی تھی جہاں میں نے اینٹوں کا ڈھیر دیکھا تھا۔ ابھی میں اس کی پھرتی پر انگشتِ بدنداں تھا کہ مسلسل فائرنگ کی آواز آئی، میں نے رائفل باہر نکالتے ہوئے درخت کی طرف نیم دائرے میں برسٹ مارا۔ اگرچہ اس عمل میں مجھ پر قیامت سی گزر گئی تھی مگر فائر کے جواب میں ایک مردانہ چیخ سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا تھا۔

''بس ہتھیار پھینک دو'' میں نے چندا کی سرد آواز سنی۔ وہ دروازے پر سے پھلانگ کر اس شخص کی طرف بھاگی تھی، اس کی عقل مندی پر کچھ کہنے کے بجائے میں نے بھی باہر نکلنا مناسب سمجھا۔ بیگ باہر رکھ کر میں نے رائفل ایک ہاتھ سے تھامی اور اچک کر کنارے پر بیٹھ گیا۔ اوپر سے ملبا گرنے سے فرش کی اونچائی بڑھ گئی تھی۔ درد کی شدت میں اب اضافہ ہورہا تھا اور جہاں گولی لگی تھی، وہاں اب زخم دکھنے لگا تھا۔ شاید انفیکشن ہورہا تھا۔ چندا اس شخص کے سر پر کھڑی تھی جو زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

میں حویلی کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر امریکا نے بمباری کردی ہو، اس کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا اور جا بہ جا شعلے بلند ہورہے تھے۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں میں لگی آگ دیکھ کر کون ٹھہر سکتا ہے۔ میں پہلو دبا کر چندا کے پاس پہنچا ''ذرا اس کا چہرہ تو دکھاؤ۔''

''سیدھے ہوجاؤ'' چندا نے اسے لات ماری ''ہاتھ سر پر ہی رکھنا۔''

وہ سیدھا ہوا تو مجھے اس کی صورت دیکھ کر خوشی ہوئی، وہ نورا تھا۔ رب نواز کا گرگا خاص اور اس کا ذاتی محافظ۔ میری رائفل کے برسٹ نے اس کی دائیں ٹانگ میں کئی سوراخ کردیے تھے اور اس وقت وہ زمین پر چت پڑا کراہ رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا جسم ٹٹولتے ہوئے پوچھا ''وہ حرام کا تخم کہاں ہے، تم سب کا مشترکہ باپ...... رب نواز! کیا وہ جہنم رسید ہونے سے بچ گیا؟'' اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

''مجھے نہیں پتا'' اس نے ضدی لہجے میں کہا ''تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کرسکتے۔''

''اچھا!'' میں ہنسا ''صرف دس منٹ رک جاؤ پھر تم سب اگلو گے۔''

میں نے رسی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور اسے کھینچ کر درخت کے عقب میں لے آیا۔ تارچ میں نے ایک جگہ ایسے رکھی کہ روشنی اس پر آتی رہے پھر میں نے بیگ سے خوفناک چاقو نکالا۔ یہ کمانڈو چاقو تھا۔ آپ نے اکثر ریمبو فلموں میں ریمبو کے پاس دیکھا ہوگا اور اس کا ایک کان تھامتے ہوئے پوچھا۔

''رب نواز کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم'' اس بار اس کے لہجے میں تشویش تھی ''اوئے یہ کیا......'' اس کی بات چیخ میں بدل گئی۔

میں نے بے دریغ کان کاٹ کر دوسرا پکڑا "رب نواز کہاں ہے؟"

وہ مچلنے لگا، برداشت کی کوشش کے باوجود اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں "بتاؤ......" میں نے سفاک انداز میں چاقو اس کے کان پر رکھا۔

"وہ چلا گیا ہے۔" اس نے جواب دینے میں عافیت سمجھی۔

رب نواز کے بچنے کا سن کر مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی "کہاں گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم......" ابھی اس کا جملہ منہ میں ہی تھا، میں اس کا دوسرا کان بھی کاٹ چکا تھا۔ کانوں کے بغیر خون اگلتا اس کا چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کے منہ سے رونے کے انداز میں چیخیں نکل رہی تھیں۔

"نورے...... میں جانتا ہوں۔ تم رب نواز کے دست راست ہو اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے وہ کہاں گیا ہے؟ اب تمہاری ایک آنکھ کی باری ہے۔ میں نے چاقو کی نوک اس کی دائیں آنکھ کے گوشے پر رکھ دی "کان کٹ جانے کے بعد بھی آدمی سن سکتا ہے لیکن آنکھ نکل جائے تو دیکھ نہیں سکتا۔"

"خدا کے واسطے!" وہ بلبلایا۔

"خدا کے واسطے نہ دو ذلیل آدمی!" میں نے چاقو ذرا چبھویا "اس حویلی میں کتنے ہی لوگوں نے تمہیں خدا کے واسطے دیے ہوں گے، تم نے بھی سنے۔"

"میں نہیں جانتا، رب نواز...... کہاں گیا ہوگا۔ وہ اپنی جان بچا کر بھاگا ہے، کہیں بھی جا سکتا ہے۔"

"پروفیسر ہاشم رضا کہاں ہے؟"

"وہ بھی اس کے ساتھ تھا" نورے نے ایک اور مایوس کن انکشاف کیا۔

"نورے! اگر تم نہیں جانتے تو یہ تمہاری بدقسمتی ہے۔ میں ایک ایک کر کے تمہاری دونوں آنکھیں نکال دوں گا پھر تمہاری ناک کاٹوں گا۔ اس کے بعد تمہارے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک ایک کر کے کاٹوں گا۔ میں ماروں گا نہیں...... بس تمہیں زندگی کے لیے بوجھ بنا کر چھوڑ جاؤں گا۔"

اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ "یقین کرو...... مجھے نہیں معلوم۔ ہاں، ایک بار رب نواز نے فیروز پور روڈ پر سرحد کے پاس کسی ڈاک بنگلے کا ذکر کیا تھا، ممکن ہے وہ وہیں گیا ہو۔"

"نورے! یہ بات غلط نکلی تو میں پھر آؤں گا" میں نے چاقو ہٹا لیا "مجھے تمہارا گھر بھی معلوم ہے۔ اس بے کار ہو جانے والی ٹانگ کے ساتھ تم کہیں نہیں جا سکتے ہو" میں کھڑا ہو گیا۔

"رکو" چندا نے کہا اور اچانک اس کے دائیں ہاتھ پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کی کہنی پر لگا تار کئی فائر کیے۔

"یاد ہے نا، ایک روز تو نے مجھے ہاتھ لگایا تھا۔ میں اس وقت بے بس تھی، آج میں نے بدلا اتار دیا۔"

چندا کی بات سے واضح تھا، اشتعال کی ایک لہر سی اٹھی تھی لیکن چندا اسے قرار واقعی سزا دے چکی تھی۔ اب اس کا یہ ہاتھ جسم سے الگ ہی ہو سکتا تھا، کوئی سرجن اسے دوبارہ نہیں جوڑ سکتا تھا۔ اسے تڑپتا پھڑکتا چھوڑ کر ہم حویلی کے اس حصے کی طرف آئے جہاں میں نے درخت سے بندھی رسی چھوڑی تھی۔ رسی اپنی جگہ موجود تھی اور اکبر بدستور غائب تھا۔ وقفے وقفے سے پکارے جانے کے باوجود اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اب مجھے اس کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی تھی۔

"ناصر، تم اس پر نہیں چڑھ سکو گے" چندا نے درخت کی اونچائی دیکھ کر کہا "تمہارا زخم ویسے ہی خراب ہو رہا ہے، ہم آگے سے نکلتے ہیں۔"

"اس طرف آگ لگی ہے" میں نے حویلی کے دائیں بائیں کے حصوں کو دیکھا "اور ممکن ہے وہاں ہمارا کسی سے سامنا ہو جائے۔"

"ناصر، تم نہیں چڑھ سکو گے" اس نے زخم دیکھا "خون رک گیا ہے، پھر بہنے لگے گا۔"

"پھر تم نکل جاؤ اس طرف سے، میں گھوم کر آتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں" اس نے فیصلہ کن لہجے میں میری تجویز مسترد کر دی "اب ہم ساتھ رہیں گے، ایک بار پہلے میں تم سے الگ ہو کر ہی بچھڑی تھی۔"

مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی تھی۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ حویلی کے اگلے حصے کی طرف بڑھے۔ یہ حصہ بالکل ہی تباہ ہو چکا تھا۔ ماضی کی دہشت یہ لال حویلی اب قصۂ پارینہ بن چکی تھی لیکن رب نواز اور ہاشم رضا نکل گئے تھے، وہ کسی بھی جگہ کو لال حویلی بنا کر اپنے مکروہ جرائم کی تکمیل کر سکتے تھے۔ ان کو تلاش کر کے جہنم رسید کرنا زیادہ ضروری تھا۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ وہ سرحد پار ہی فرار نہ ہو جائیں۔ اس صورت میں وہ نہ صرف ہاتھ سے نکل جاتے بلکہ ہاشم رضا بھی بھارتیوں کے ہاتھ لگ جاتا اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر انسانیت کے

خلاف اس پروجیکٹ کو مکمل کر لیتے۔ جنگی جنون میں مبتلا اس ریاست کے ہاتھ ایک اور تباہ کن ہتھیار ہاتھ لگ جاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس کے ہر تباہ کن ہتھیار کا اولین نشانہ پاکستان ہی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں اور چندا حویلی کے سامنے والے حصے سے باہر آ گئے۔ حسبِ توقع پولیس والے غائب تھے۔ اچانک میرے کان میں ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ اکبر کی آواز آئی۔

"ناصر...... تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں یار! مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" میں نے خوش ہو کر کہا۔ اکبر کو سلامت پا کر مجھے سچ مچ مسرت ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ میرے بہت نزدیک آ گیا تھا۔

"میں وہیں تھا۔ جیسے ہی تم اندر گئے میرا تم سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا پھر میں رب نواز کے پیچھے گیا مگر وہ نکل گیا۔ اس کے ساتھ ایک پروفیسر ٹائپ شخص بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔"

"ہاشم رضا" میں نے کہا "افسوس کہ وہ پھر بچ گیا۔ اکبر، یہ شخص دس رب نوازوں سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ بس ایک لمحے کی تاخیر ہوئی ورنہ میں نے اس کی کھوپڑی اڑا دی ہوتی۔ خیر تم کہاں ہو؟"

"حویلی کے سامنے والے حصے میں" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"میں آ رہا ہوں۔"

ذرا سی دیر میں اکبر دائیں طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور دستی سرچ لائٹ تھی۔ اس نے فوراً ہی میرا زخم تاڑ لیا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا "یہ کیا ہوا؟"

"گولی لگی ہے" میں نے بتایا "ابھی اندر ہی ہے لیکن زخم خطرناک نہیں ہے۔"

"خون رک گیا ہے، اس کا مطلب ہے کسی اعضا کو نقصان نہیں ہوا ہے لیکن گولی نکلنا ضروری ہے۔ یہ یقیناً چندا ہے" اس نے چندا کی طرف دیکھا "جیسا سنا تھا، اس سے بڑھ کر ہے۔"

"تھینک یو" چندا مسکرائی "اب چلو اس سے، پہلے کہ کوئی آ جائے۔"

"تم لوگ جنگل کے کنارے تک پہنچو۔ میں جیپ لے کر آتا ہوں" اکبر نے کہا اور دوبارہ تاریکی میں غائب ہو گیا۔

میں نے چندا کا ہاتھ تھاما اور برگد کے جھنڈ سے گزرنے لگا۔ ٹارچ چندا کے پاس تھی اور میرے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ہم دوسرے کنارے پر پہنچے جس کے بعد وسیع میدان تھا۔ اس کی ریت تاروں کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اب ہمیں اکبر کا انتظار تھا۔ خاصا خون بہہ جانے کے بعد میں نقاہت محسوس کر رہا تھا۔

"چندا، تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"پتا نہیں" اس نے سر میرے بازو سے ٹکا دیا "کسی نے اچانک میرے منہ پر کپڑا رکھ دیا تھا، اس سے تیز بو اٹھ رہی تھی۔ میں فوراً ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش آیا تو حویلی کے تہ خانے میں تھی۔ مجھے تمہاری فکر تھی پھر پتا چلا کہ تم بچ گئے ہو۔"

"چندا، تمہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... ورنہ چندا تمہیں زندہ نہ ملتی" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ میں نے سکون کی طویل سانس لی تھی۔ "لیکن انہوں نے میرے سامنے بے حد شرمناک ڈرامے کیے تھے۔ مجبور اور بے بس عورتوں کو......" وہ کہتے کہتے رک گئی لیکن میں نے باقی بات سمجھ لی تھی۔ رب نواز کے چیلے شیطانیت میں شیطان کے چیلوں سے کم نہیں تھے۔ کسی وجہ سے وہ چندا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر رہے تھے لہٰذا اسے اس طرح سے اذیت دیتے تھے۔ چندا رونے لگی تھی۔ اتنے دن اس نے حالات کا حوصلے سے مقابلہ کیا تھا مگر میرا سہارا ملتے ہی وہ پھر سے ایک لڑکی بن گئی تھی جو اپنے محبوب کی مضبوطی میں پناہ تلاش کرتی ہے۔

"خدا کی قسم اگر میں بے بس نہ ہوتی تو ان درندوں کی ہڈیاں توڑ دیتی۔ سب سے کمینہ یہ نورا تھا۔ رب نواز نے انہیں سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ میری عزت کو نقصان نہیں ہونا چاہیے لیکن ایک روز اس نے بے بس کر کے مجھے ہاتھ لگایا تھا۔ میں وہ لمحے کبھی...... نہیں بھول سکتی۔"

"وہ وقت بھی گزر گیا" میں نے اس کے ریشمی بالوں کو چوما "اور وہ شیطان بھی ساری عمر اپنے کیے کی سزا پاتا رہے گا۔"

"ان درندوں میں بس ایک ہی انسان تھا۔ اس نے میری بہت مدد کی تھی۔"

"اسلم!" میں نے کہا۔ مجھے اس کی دردناک موت یاد آ گئی۔ اپنے خاندان کے بدلے کی آگ میں جلتا وہ رب نواز کو نقصان پہنچانے کی حسرت لیے اس دنیا سے ہی چلا گیا تھا۔

"ہاں۔ اس نے کئی بار مجھے فون کرنے کا موقع بھی دیا لیکن وہ اتنی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ مجھے فرار کرا سکے۔"

"مجھے حیرت ہے، رب نواز اس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا اور وہ اس کے آدمیوں میں شامل ہو کر اس کے خفیہ ٹھکانے تک آ گیا تھا۔"

"اس نے رب نواز سے معافی مانگ لی تھی" چندا بولی "اور رب نواز نے اسے لال حویلی میں بھیج دیا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ اسلم اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

"اور اس کی خوش فہمی اسے لے ڈوبی۔ میں اسلم کی وجہ سے ہی لال حویلی تک پہنچا تھا۔ آج رب نواز پچھتا رہا ہوگا۔ لال حویلی کے ساتھ اس کا پروجیکٹ بھی تباہ ہو گیا۔"

"لیکن ہاشم رضا نکل گیا ہے۔ جب تک یہ شخص زندہ ہے حیوانی افراد کی پیدائش جاری رہے گی۔ لال حویلی کے اندرونی حصے میں ایسے ایک درجن سے زیادہ بچے پرورش پا رہے تھے اور اتنی ہی عورتوں پر ہاشم رضا نے تجربات کیے تھے، وہ سب...... حاملہ تھیں" چندا نے انکشاف کیا "میں نے کل ہی دیکھی تھیں۔"

"اس کا مطلب ہے وہ سارے حیوانی بچے اور حاملہ عورتیں ماری جا چکی ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی جان بچانے کی پڑی تھی۔ ان بچوں اور عورتوں کا خیال کیسے آتا" میں نے تلخی سے کہا "کاش کہ یہ رب نواز اور ہاشم رضا میرے ہاتھ آئیں تو میں......" میں کہتے کہتے رک گیا۔ سامنے سے روشنی لہرائی پھر جھاڑیاں چیرتی اکبر کی جیپ برآمد ہوئی۔ لمحوں میں وہ ہمارے پاس تھا۔ اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

"ہری اپ! میرا خیال ہے پولیس پارٹی اسی طرف آ رہی ہے۔"

چندا اندر گھسی اور عقبی حصے میں چلی گئی۔ میں اکبر کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً جیپ گھمائی اور میدان پار کر کے جھاڑیوں میں گھسا دی۔ اب وہ مختلف راستہ اختیار کر رہا تھا "ٹائر نہ پنکچر ہو جائیں" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو" یہ اسپیشل قسم کے ٹائر ہیں، ان پر گولی اثر نہیں کرتی ہے۔ پنکچر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے بے دردی سے جھاڑیوں کو روندنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

"بدقسمتی سے وہ گھوڑے پر تھے اور میں پیدل۔ میں نے ان پر فائر کیے۔ پروفیسر کو میں نے اوندھے منہ گھوڑے پر گرتے دیکھا تھا لیکن اس کے بعد جب میں جھاڑیوں تک پہنچا تو وہ غائب ہو چکے تھے۔"

"قسمت ان پر مہربان ہے" میں نے زخمی پہلو دباتے ہوئے کہا۔ گولی کے زخم میں آگ کا سا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

"تم بھی خوش قسمت ہو۔ میرا اندازہ ہے، گولی پسلیوں کے نچلے حصے میں پھنس گئی ہے۔ یہ ذرا سی نیچے لگتی تو جگر یا معدے کو نقصان پہنچاتی۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" چندا نے پوچھا۔

"کرنل اللہ بخش کے فارم پر" اکبر بولا "ناصر کا علاج وہیں ممکن ہے، مسز کھوکھر ڈاکٹر بھی ہیں۔"

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ وہ پیاری اور مہربان سی خاتون ڈاکٹر بھی تھیں "حیرت ہے، انہوں نے اپنا پروفیشن چھوڑ کر اس ویرانے میں رہنا قبول کیا۔"

"نہیں، وہ یہاں پر ایک کلینک چلا رہی ہیں، قریبی گاؤں میں۔ روزانہ شام کے اوقات میں دو گھنٹے وہاں بیٹھتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کسی کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ بلا جھجک فارم تک چلا آتا ہے" اکبر نے بتایا۔ اس دوران میں جیپ جھاڑیوں سے گزر کر سڑک پر آ چکی تھی اور اب اکبر نے رفتار بڑھا دی تھی۔ کچے میں جھٹکوں سے میرے درد میں اضافہ ہو گیا تھا بلکہ اب میں ہلکی سی حرارت بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ باہر غضب کی سردی تھی مگر جیپ کے ہیٹر نے اندر کی فضا کو گرم کر دیا تھا۔ بیس منٹ بعد ہم فارم کے سامنے تھے۔ فولادی گیٹ پر کھڑے مستعد محافظ نے اکبر خان کی صورت دیکھ کر ہی دروازہ کھولا تھا۔ جیپ بنگلے کے سامنے رکی۔

"ناصر، باہر آؤ" اکبر نے کہا۔ میں اترا تو مجھے ہلکا سا چکر آ گیا۔ اکبر نے مجھے سنبھال لیا اور اندر لے آیا۔ مسز کھوکھر میری حالت سے ہی سمجھ گئی تھیں، وہ فوری طور پر اپنا میڈیکل بکس لے آئیں۔ اکبر نے مجھے فرشی نشست گاہ کے دبیز قالین پر آتش دان کے سامنے لٹا دیا۔ مسز کھوکھر نے شوہر سے کہا "کسی سے گرم پانی لانے کو کہیے۔"

اس دوران میں چندا نے میری جرسی اتار دی تھی۔ دوسری پٹی اور کپڑے کی گدی بھی خون میں تر ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے مسز کھوکھر نے گرم پانی میں روئی بھگو کر میرے زخم کو صاف کیا "گولی ابھی اندر ہی ہے۔"

"آپریشن کرنا ہوگا؟" چندا نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو چندا بولی "میں آپ کو اسسٹ کر سکتی ہوں، میں نے نرس کے طور پر کام کیا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے" وہ خوش ہو گئیں "آپریشن کے لیے مجھے ایک مددگار کی ضرورت تو ہے۔"

انہوں نے اب کہ جراثیم کش محلول سے زخم صاف کیا۔ ضبط کے باوجود میری کراہیں نکل گئی تھیں۔ جراثیم کش تیزاب کی طرح لگتی تھی۔ اس کے بعد وہ جا کر سرجیکل بکس لائیں اور

اس میں سے آلات جراحی نکال کر انہیں جراثیم کش محلول سے صاف کر کے ایک اسٹیل کی ٹرے میں رکھنے لگیں۔ چندا ان کی ہدایات کے مطابق چیزیں سجا رہی تھی۔ جب انہوں نے انجکشن تیار کیا تو میں بول اٹھا "میں بے ہوش نہیں ہوں گا، آپ ایسے ہی گولی نکالیں۔"

"میں بھی تمہیں بے ہوش نہیں کر رہی" وہ مسکرائیں "یہ سن کرنے کا انجکشن ہے ورنہ تم ہلو گے تو زخم خراب بھی ہو سکتا ہے" انہوں نے انجکشن زخم سے ذرا اوپر گھونپ کر دوا جسم میں خالی کر دی۔ فوراً ہی مجھے جسم کے اس حصے میں بے حسی محسوس ہونے لگی۔ درد غائب ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے آلات جراحی سنبھالے تو میں نے آنکھیں بند کر لیں، مجھے اعتراف ہے کہ اپنے جسم کی چیر پھاڑ دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی لیکن چیرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، مسز کھوکھر نے چمٹی سے پکڑ کر اندر پھنسی گولی نکال لی۔

"آنکھیں کھولو ینگ مین!" وہ ہنسیں "گولی نکال لی ہے۔"

میں نے آنکھیں کھولیں۔ چندا جراثیم کش سے ایک بار پھر زخم صاف کر رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے زخم خشک کرنے والا پاؤڈر بھر کر اوپر سے پٹی رکھی اور اسے سرجیکل ٹیپ سے چپکا دیا "بس اتنی سی بات تھی۔"

"یو آر اے لکی مین!" مسز کھوکھر نے کہا۔

"ہاں واقعی، میں لکی ہوں" میں نے غور سے چندا کی طرف دیکھا تو وہ سرخ ہو گئی۔ فوراً ہاتھ صاف کرنے کے بہانے کھسک گئی۔ مسز کھوکھر کی ہنسی نے اسے اور بھی خفیف کر دیا تھا۔

"اس لحاظ سے بھی تم لکی ہو لیکن میرا اشارہ گولی کی طرف ہے۔ یہ اگر ذرا سی بھی نیچے ہوتی تو...... خیر اللہ نے بچت کر دی۔"

"کیا کچھ کھانے کو اور پھر بلیک کافی مل سکتی ہے، ویری ہاٹ اینڈ ویری اسٹرانگ۔"

"کوئی کافی نہیں، میں سوپ بھیج رہی ہوں، وہ پیو اور اس کے بعد ایک گلاس دودھ" انہوں نے اب کے میرے بازو میں دوا انجکشن لگائے۔ "اس کے بعد آرام کرو، تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔"

چندا مسکراتی ہوئی واپس آئی، میری جرسی تو خراب ہو گئی تھی۔ مسز کھوکھر نے کرنل کی ایک پوری آستین کی قمیص لا دی۔ اسی دوران میں چندا نے جیکٹ اتار کر مسز کھوکھر کی ہی قمیص پہن لی تھی جو اسے ذرا ڈھیلی تھی کیونکہ وہ اس کی نسبت دبلے جسم کی تھی۔ اس جگہ گھر کا سا آرام تھا۔ درد کش دوا اور اینٹی بایوٹک انجکشن نے میری تکلیف میں خاصی حد تک کمی کر دی تھی۔ کرنل کا ایک ملازم بڑے سے پیالے میں سوپ لے آیا جس میں چکن کے ٹکڑے اور سبزیاں تیر رہی تھیں۔ سوپ جیسی چیزیں مجھے زیادہ پسند نہیں ہیں لیکن بھوک اور سردی کے عالم میں یہ مزہ دے گئی تھیں۔ اس کے بعد ایک بڑا گلاس دودھ جو اصل میں ذرا ہلکی قسم کی بالائی تھی، زبردستی مجھے پلایا گیا۔

"اب تم آرام کرو" مسز کھوکھر نے یہ ظلم کرنے کے بعد کہا "صبح تک تمہاری حالت بہت اچھی ہو جائے گی۔ میں جا کر کمبل اور تکیے بھیجتی ہوں، تم تو میرے ساتھ ہی آ جاؤ، بچیوں کے کمرے میں سو جانا۔"

مسز کھوکھر نے اگرچہ خلوص سے ہمیں حکم دیا تھا لیکن فی الوقت میرا ذہن رب نواز میں الجھا ہوا تھا، اس لیے میں نے ذرا خشک لہجے میں کہہ دیا "ابھی تو ہم ذرا بات کریں گے اور جب نیند آئے گی تو سو جائیں گے۔"

"اچھا" وہ بولیں "کسی چیز کی ضرورت ہو تو ملازم سے کہہ دینا" وہ چلی گئیں۔

"تمہیں ایسا رویہ نہیں رکھنا تھا" ان کے جانے کے بعد چندا نے ملامت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، وہ ہم پر مہربان ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا شروع کر دیں۔ دودھ پیو...... اب سو جاؤ۔"

اکبر مسکرا رہا تھا "برا مت ماننا بھائی! ان کی عادت کچھ ایسی ہے کرنل صاحب کے ساتھ رہ کر حکم چلانے کی عادت آ گئی ہے۔"

"اکبر......! مجھے معلوم ہے کہ رب نواز فیروز پور روڈ پر سرحد کے پاس کسی ریسٹ ہاؤس میں روپوش ہے۔"

وہ اچھل پڑا "یہ بات تم اب بتا رہے ہو۔ اس علاقے میں صرف ایک ہی ریسٹ ہاؤس ہے۔ روڈ سے ذرا ہٹ کر نہر کے کنارے ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ نورے نے مجھے بس اتنا ہی بتایا تھا۔"

اکبر نے نورے کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے تفصیل سے تہ خانے میں ہونے والی معرکہ آرائی کی داستان سنا دی۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "میرے خدا، لگ رہا ہے تم کسی بانڈ فلم کی کہانی سنا رہے ہو۔"

"ہاں، ان کے ساتھ تو ہر معرکہ بانڈ فلم بن جاتا ہے"

میں نے چندا کی طرف دیکھا۔

"پٹڑی سے اترنے کی ضرورت نہیں ہے" وہ جھینپ گئی۔

"بس، اللہ نے کرم کیا جو صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ تہ خانے میں بارود کا بہت بڑا ذخیرہ بھی تھا جو دھماکے سے پھٹ گیا تھا مگر خوش قسمتی سے تہ خانے کا وہ حصہ تباہ ہونے سے محفوظ رہا، جہاں ہم تھے۔ ان خاتون نے میری جان بھی بچائی تھی، یہ جو ہاتھ کی پشت پر پٹی دیکھ رہے ہو، یہ زخم اگر میرے سر پر آتا تو میں آنجہانی ہو چکا ہوتا لیکن خوش قسمتی سے یہ ہاتھ میرے سر پر تھا۔"

"ہاتھ سر پر کیوں تھا؟" اکبر نے غور فرمایا تو چندا نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

"میں جا رہی ہوں" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "پہلے ہی مسز کھوکھر کی بات مان لیتی۔"

"کافی بھجوا دینا" میں نے پیچھے سے آواز دی اور اس کے جانے کے بعد بولا "چلو، یہ بھی ٹلی۔"

"تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے؟" اکبر نے ہنس کر کہا "اسی وجہ سے اسے یہاں سے بھگایا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا، اس لیے مذاق کر گیا۔"

"اکبر...... یاد رکھنا...... ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ بہ ظاہر ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن ہمارا تعلق رشتوں سے بڑھ کر ہے۔ ہم مذاق کرتے ہیں اور برا نہیں مناتے۔ اب تم بھی میرے ساتھی ہو۔ اس لیے آئندہ اس قسم کی باتوں کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اس اعتماد کا شکریہ!" وہ بولا۔

"اکبر، میں چاہتا ہوں کہ رب نواز کو مہلت نہ دی جائے۔ ہم آج رات بلکہ ابھی اسی ریسٹ ہاؤس کی طرف جائیں گے۔" میری بات سن کر وہ پریشان نظر آنے لگا۔

"لیکن تمہاری حالت۔ ابھی تمہارا آپریشن ہوا ہے۔ گولی نکلی ہے تمہارے لیے حرکت کرنا ٹھیک نہیں ہے اور رب نواز سے نمٹنا تو اور بھی خطرناک ہوگا۔"

"مجھے اپنی اتنی پروا نہیں ہے۔ زخم بھی معمولی ہے۔ بس ذرا تکلیف ہوئی اور میں رب نواز کے گندے وجود سے اس دنیا کو پاک کرنے کے لیے مرنے کو بھی تیار ہوں۔"

"مگر کرنل صاحب، اجازت نہیں دیں گے اور پھر چندا......!"

"ہمیں کرنل صاب کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور رہی چندا تو اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ ہم خاموشی سے نکلیں گے۔ ریسٹ ہاؤس یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"کوئی تیس پینتیس کلومیٹر ہوگا لیکن ہمیں خاصا گھوم کر جانا پڑے گا۔ اس لیے فاصلہ زیادہ بھی ہوسکتا ہے لیکن میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں نے صاعقہ سے کہہ کر ایک ٹیم منگوالی ہے۔ بہتر ہے، ہم ان کی آمد کا انتظار کریں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرسکتا۔ اگر اس لمحے کی تاخیر سے رب نواز یا پروفیسر ہاتھ سے نکل گئے تو مجھے مر کر بھی اس کا افسوس رہے گا۔ اکبر، ہمارے پاس گنوانے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔"

اس نے سمجھ لیا کہ میں نہیں مانوں گا۔ "جیسے تمہاری مرضی...... میں ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"شکریہ۔ تم نے مخالفت نہیں کی۔ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں وہاں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ رب نواز نے بھیڑ بھاڑ سے گریز کیا ہوگا۔ اس کے باقی ساتھی ادھر ادھر فرار ہوئے ہوں گے۔"

"میرے سامنے حویلی سے۔ چند ہی افراد نکلے تھے۔ علاوہ پولیس والوں کے جو پہلے دھماکے کے ساتھ ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے۔ میرا خیال ہے، زیادہ تر اندر ہی مارے گئے۔ دس بارہ تو تم لوگوں نے ہی مار دیے۔ کتنے ہی دھماکوں اور اس کے بعد آگ کی نذر ہو گئے ہوں گے۔"

"کاش، ان میں وہ نام نہاد میجر بھی ہو، بیٹے کی اولاد۔" میں نے کہا۔

اس اثنا میں ملازم کافی لے آیا تھا۔ کافی پینے کے دوران میں ہم نے ریسٹ ہاؤس پر حملے کی تفصیل طے کی۔ اکبر نے مجھے ہتھیاروں کے بارے میں بتایا "ہمارے پاس اب ایک آٹومیٹک رائفل اور ایک یوزی سب مشین گن ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دستی بم کچھ گیس کے بم اور ایک پورٹیبل راکٹ لانچر ہے۔"

"کافی ہیں یہ ہتھیار۔" میں نے کہا "مجھے تو اس پستول کا افسوس ہے، زہریلی سوئی والے، بہت کام کی چیز تھی۔"

"ایسا ہی ایک اور بھی ہے" اکبر مسکرایا۔

کافی پی کر میری رہی سہی کسل مندی بھی دور ہو گئی تھی۔ ابھی پین کلر انجکشن کا اثر تھا اس لیے درد بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مسز کھوکھر نے مجھے گولیاں دی تھیں کہ اگر مجھے درد محسوس ہو تو یہ گولیاں لے لوں۔ وہ میں نے جیب میں رکھ لیں۔ اب مجھے فکر تھی کہ باہر سردی کے لیے میں قمیص کے اوپر کیا لوں، اکبر نے کہا۔

"میں اس کا بندوبست کرتا ہوں" وہ گیا اور ذرا سی دیر

میں ایک سیاہ لیدر کی جیکٹ لے آیا "کرنل کی ہے، کل معذرت کر لیں گے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم خاموشی سے باہر نکلے۔ اکبر نے جیپ میں پیٹرول کی پوزیشن دیکھی اور گیراج میں رکھے کین سے ٹینکی فل کر لی۔ خاموش پیٹرول انجن کی وجہ سے ہم بنگلے میں کسی کو جگائے بغیر باہر آگئے۔ فارم کے گارڈ نے ہمیں نہیں روکا، وہ جانتا تھا کہ ہم کرنل صاحب کے خاص مہمان تھے۔ ذرا دور جا کر اکبر نے جیپ روکی "ذرا چیزیں نکال لیں۔"

وہ نیچے اترا اور عقبی دروازہ کھولا "ارے......!" اس کے منہ سے نکلا "......تم......!"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ چندا تھی جو ایک کمبل تلے دبکی ہوئی تھی "تم...... کیوں آئی ہو" میرے انداز میں برہمی تھی۔

"بس آئی ہوں...... تم کس لیے نکلے ہو آدھی رات کو۔"

وہ نیچے اتری تو میں بھی باہر آگیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا "چندا، تم واپس جاؤ۔ اس مشن پر تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ میں اور اکبر واپس آجائیں گے۔"

"تمہیں شاید میری ضرورت نہ ہو" اس نے بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا "لیکن مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"چندا، پلیز سمجھنے کی.........."

"مجھے کچھ نہیں سمجھنا۔ کچھ نہیں سننا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اور تم جانتے ہو، میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔"

"میرا خیال ہے مس چندا درست کہہ رہی ہیں" اکبر میرے پاس آیا "دو سے تین اچھے ہوتے ہیں، ہم انہیں بیک اپ میں رکھ سکتے ہیں، کہیں پھنس جائیں تو یہ باہر سے ہماری مدد کر سکتی ہیں۔"

"اب جمہوریت کے تحت تم دونوں کی رائے ایک ہو گئی ہے تو مجھے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔"

"سیاست دانوں والی باتیں نہیں کیں" چندا ہنسی۔

"یہ ہے مشین گن اور یہ ہے سوئی والا پستول۔ یاد رکھنا، اس میں تین سوئیاں ہوتی ہیں۔ یہ ری چارج نہیں ہوتا۔ اس کے اندر سوئیاں ڈائنٹروجن جیکٹ کے درمیان رہتی ہیں کیونکہ ذرا سی حرارت سے یہ ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔" اس نے اپنی پشت پر حسب سابق ایک بیگ باندھ رکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمیں ویسے ہی ہیڈ سیٹ دیے جو ایک ہی فریکوئنسی پر دو سو گز کے دائرے میں کام کرتے تھے۔ میں نے اور اکبر نے سر پر سیاہ اونی ٹوپیاں پہن لی تھیں اور چندا کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہیڈ سیٹ اس کے بالوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اکبر نے اسے ایک سائلنسر لگا اعشاریہ اڑتیس کا پستول دیا۔ دستی بم اور گیس کے بم بھی اس کے حوالے کیے تھے۔

"ایسا میں نے انگلش موویز میں ہوتے دیکھا ہے" چندا نے تبصرہ کیا۔

"چلو دیکھ تو لیا ہے" اکبر ہنسا اور ہمیں میگزین تھمانے لگا۔ یوزی کے تین کلپ اور تھے۔ جبکہ چندا کو بھی تین میگزین دیے۔ آخر میں اس نے ایک چھوٹا سا لانچر نکال کر پشت پر لٹکایا۔ جس کے ساتھ چار عدد راکٹوں کا ایک میگزین فٹ تھا۔ "مس چندا، اب ڈرائیو آپ کریں گی" اس نے کہا "ستائیسویں سنگ میل پر نہر کے فوراً بعد جیپ روک لیجیے گا۔ پہلے میں جاؤں گا اور صورت حال دیکھ کر آپ لوگوں کو کال کروں گا۔"

"یس سر!" چندا بولی "بس سیلیوٹ مارنے کی کسر رہ گئی ہے۔ ورنہ میں خود کو فوجی محسوس کر رہی ہوں۔"

میں چندا کے برابر میں بیٹھ گیا اور اکبر عقبی حصے میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم مطلوبہ مقام پر تھے۔ اکبر خاموشی سے اتر کر چلا گیا۔ میں اور چندا خاموش بیٹھے تھے پھر چندا نے سرگوشی کی "ناصر! اگر رب نواز ہاتھ لگ گیا تو تم اس کے ساتھ کیا کرو گے؟"

"وہ نہیں کروں گا جو سکندر اعظم نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے کم سے کم جہنم رسید ضرور کروں گا۔"

"ناصر، میں اس کے ہاتھ کاٹ دینا چاہتی ہوں جن سے اس نے میرے جسم کو چھوا تھا" چندا کی آواز آئی۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ویسے بھی یہ میرا فرض ہے۔" میں نے اس کا شانہ ہلایا جہاں رب نواز نے خراش ڈالی تھی۔ اس نے میرے شانے سے سر لگا دیا تھا۔

"خدا کے واسطے اردگرد بھی نظر رکھو۔" اکبر کی آواز ابھری "لیلیٰ مجنوں مت بنو۔"

میں اور چندا جھینپ کر سیدھے ہو گئے تھے۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ تاریکی میں کہیں نقل و حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس نہر سے ذرا فاصلے پر درختوں کے درمیان تھا۔ "یہاں تاریکی ہے" اکبر نے سرگوشی کی۔ "بہ ظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"کوئی گارڈ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے لیے ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی طرف جانا پڑے گا" اس نے کہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بتایا "نہیں، یہاں کوئی گارڈ بھی نہیں ہے، اس طرف بھی تاریکی ہے۔ ایسا

لگ رہا ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔"

"یہ کیموفلاج بھی ہوسکتا ہے۔ تاریکی کر کے انہوں نے خود کو چھپایا ہوا ہے" میں بولا "میں آرہا ہوں۔" پھر چندا سے کہا "تم ہوشیار رہنا اور کسی بھی صورتِ حال میں گولی پہلے چلانا۔"

"میں سمجھتی ہوں" اس نے جیکٹ سے پستول نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔

میں جیپ سے اترا تو پہلو میں درد کی ہلکی سی لہر اٹھی لیکن جب چلا تو یہ لہر دم بہ دم بڑھنے لگی۔ زخم کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ معمولی سہی لیکن بہت تکلیف دہ تھا۔ اس وجہ سے پین کلر انجکشن کا اثر اتنی جلدی زائل ہوگیا تھا۔ میں جھاڑیوں اور پھر درختوں سے گزر کر ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے میں پہنچا۔ "اکبر، میں آ گیا ہوں۔"

"میں مہندی کی باڑھ کے عقب میں ہوں" اس نے کہا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔

"کوئی حرکت نہیں؟"

"ٹھیک" اس نے جواب دیا "ہمیں اندر جانا ہوگا۔"

"عام طور سے اس قسم کے ریسٹ ہاؤس یوں تاریک نہیں ہوتے۔ کیونکہ ٹھہرنے کے لیے کوئی بھی آ سکتا ہے۔ چوکیدار تو ہوتا ہی ہے لیکن اس وقت کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ ریسٹ ہاؤس متروک تو نہیں ہے؟"

"اس کی حالت سے تو ایسا نہیں لگ رہا ہے۔ دیکھو صفائی بھی ہوئی ہے اور باغ کی تراش خراش بھی باقاعدگی سے کی جاتی رہی ہے" اس نے اپنے بیگ سے ایک دوربین نما عینک نکال کر آنکھوں پر لگالی "میں روشن دان سے اندر جاؤں گا۔"

اس کا اشارہ کھپریل کی چھت سے ذرا نیچے چھجے کے اوپر بنے روشن دانوں کی طرف تھا۔ "یہ کیا ہے دوربین؟"

"نائٹ وژن" اس نے جواب دیا اور خاموشی سے باغ میں رینگ گیا۔ اس نے اتنی خاموشی سے حرکت کی کہ میں پہلے سے نہ واقف ہوتا تو اس کی نقل و حرکت کا بالکل بھی پتا نہیں چلتا۔ وہ اچھل کر چھجے سے لٹکا اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ایک نسبتاً بڑے روشن دان کا گھومنے والا پٹ کھولا اور جسم لٹکا کر اندر غائب ہوگیا۔ ایک تناؤ کے عالم میں، میں اس کی طرف سے کسی ردِ عمل کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر رب نواز اندر موجود ہوتا تو مقابلہ لازمی تھا۔ وہ ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اکبر کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"اکبر!" میں نے اسے پکارا۔

"شش......" اس کی آواز آئی اسی لمحے کسی نے پکارا "کون ہے؟" میرے کانوں نے برست کی آواز سنی۔ چیخ بھی سنائی دی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیا اکبر کو گولی لگی ہے؟ میں مہندی کی باڑھ کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگا۔

"چندا، ریسٹ ہاؤس کے سامنے والے حصے کی طرف آؤ لیکن اندر مت آنا اور کسی کو نکلنے بھی مت دینا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں آرہی ہوں۔" اس کی آواز آئی۔ اسی لمحے ایک سایہ پچھلے حصے سے نکل کر بھاگا۔ اس کے انداز سے ہی ظاہر تھا کہ وہ اکبر نہیں تھا۔ میں نے بے دریغ اس کے پیروں پر فائر کیا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس نے ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے تھے اور چیخ چیخ کر معافی مانگ رہا تھا۔ وہ رب نواز یا پروفیسر نہیں تھا۔ یقیناً ان کا کوئی آدمی تھا۔ میں اپنی جگہ سے نہیں نکلا۔ "اکبر کیا ہو رہا ہے، جواب دو؟" میں نے بے تابی سے پوچھا "تم ٹھیک ہو نا؟"

"میں ٹھیک ہوں" اس نے جواب دیا "ایک راستے میں آیا تھا، مارا گیا ہے۔"

اس بار فائرنگ کی آواز ریسٹ ہاؤس کے سامنے والے حصے سے آئی تھی پھر چندا کی آواز آئی "میں نے بھی ایک کو جہنم رسید کر دیا ہے۔ یہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

اکبر بولا "ناصر، ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کے دائیں طرف والے کارنر کے کمرے میں کوئی ہے، میں نے کسی عورت کے رونے کی آواز سنی ہے۔"

میں نے کان لگائے تو مجھے بھی آواز آرہی تھی اور یہ جس کونے میں، میں کھڑا تھا، اس کے مخالف سمت والے کارنر کے کمرے سے آرہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس ایل شکل کا تھا میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں ایل کی دونوں لکیریں ملتی ہیں۔ میں مہندی کی باڑھ کی آڑ لیتا، اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں سے عورت کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ جیسے ہی میں اس کے نزدیک پہنچا، میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی "چپ کر جا کتیا! ورنہ تیری......" آگے کے الفاظ ناقابلِ اشاعت تھے اور آواز پروفیسر کی تھی جو اپنی علمیت کو بالائے طاق رکھ کر اس عورت سے مخاطب تھا۔

"مجھے جانے دو" عورت مقامی لہجے میں کہہ رہی تھی "ورنہ میں بھی ماری جاؤں گی۔"

تھپڑ کی آواز کے ساتھ عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔

"باقی ریسٹ ہاؤس میں کوئی نہیں ہے، تین افراد تھے جو مارے جا چکے ہیں۔"

"میرا والا ابھی تک تو زندہ تھا" میں نے باغ کے وسط میں پڑے شخص کی طرف دیکھا جو چیخ و پکار مچا رہا تھا۔

"کیا خیال ہے، اندر حملہ کیا جائے؟" میں نے دریافت کیا۔

لیکن اس سے پہلے ہی پروفیسر نے چلا کر کہا "اگر کسی نے اندر آنے کی کوشش کی تو میں اس عورت اور اس کی بچی کو گولی مار دوں گا۔"

"بچ تم پھر بھی نہیں سکتے" میں جواباً چلایا "پروفیسر بہتر ہوگا ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔"

"شاہ عالم! تو کتے کے بچے!" وہ دیوانہ وار گالیاں دینے لگا "تیری وجہ سے میری تین برس کی محنت تباہ ہوگئی۔ میں برباد ہوگیا، حرام زادے۔"

"ابھی کہاں، ابھی تو تم زندہ ہو۔ ابھی میں تمہیں کتے کی موت ضرور ماروں گا۔"

"خبردار! کوئی اندر نہ آئے ورنہ میں ان دونوں کو مار دوں گا" پروفیسر کی آواز میں دیوانگی تھی۔

"یہ سچ مچ ان ماں بیٹی کو مار دے گا" اکبر نے سرگوشی کی۔

"میں اسے باتوں میں لگاتا ہوں، تم کسی طریقے سے کمرے میں جانے یا اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرو۔"

"اس کے لیے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، میں روشن دان سے گیس کا بم اندر پھینک دوں گا تو یہ خود مردہ کتے کی طرح ہاتھ آ جائے گا لیکن اسے ذرا سا موقع مل گیا تو یہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا اسے مارنا یا قابو کرنے کے لیے ان ماں بیٹی کی قربانی دی جا سکتی ہے؟"

اکبر کے سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ دونوں ماں بیٹی انسان تھیں اور ان کی جان بھی اہم تھی۔ محض پروفیسر کو کیفرِ کردار پہنچانے کے لیے ان کی جان نہیں لی جا سکتی تھی۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ اگر پروفیسر نکل جاتا تو نہ جانے کتنے لوگ اس کے تجربوں کی بھینٹ چڑھ جاتے، وہ انسانیت کش تجربات کا مجرم تھا۔

"اوکے پروفیسر......! کوئی اندر نہیں آئے گا لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک یوں اندر محصور رہو گے؟"

"بس کوئی اندر نہ آئے۔ میں نے ان ماں بیٹی کو باندھ دیا ہے، ایک ہی گولی سے ان کا کام تمام کر دوں گا۔" پروفیسر نے دھمکی دی۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ اندر دو عورتیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بول......" پروفیسر نے ایک ناقابلِ بیان لقب کے ساتھ عورت سے کہا۔

"میں ہوں جی ارم" عورت نے بے بسی سے کہا "میری بیٹی بھی ہے۔ میں چوکیدار کی بیوی ہوں۔"

"سن لیا تم نے شاہ عالم!" پروفیسر چلایا۔

"ہاں اور تمہارا باپ کہاں ہے، رب نواز؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر شام سے غائب ہے حرام زادہ" خوف سے پروفیسر کی ذہنی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس نے کسی کو تھپڑ مارا "چپ کر کتیا، روئے جا رہی ہے۔"

"میری بچی کو نہ مارو" عورت نے التجا کی۔ جواب میں پروفیسر نے اسے بھی مارا، اس کی زبان سے مسلسل گالیاں نکل رہی تھیں۔ اس کے اندر کا حیوان باہر آیا ہوا تھا۔

"کہیں یہ انہیں مار ہی نہ دے؟" اکبر بولا "اس کی ذہنی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

"میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کرے گا۔ کتنا ہی پاگل ہو رہا ہو، اسے احساس ہے کہ یہ ماں بیٹی اس کی زندگی کی ضمانت ہیں۔"

"میں کوشش کروں؟" چندا بولی۔

"تم کیا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے سامنے کی طرف سے باتوں میں لگاؤں گی، تم لوگ عقبی حصے سے کارروائی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ رب نواز واپس آ جائے۔"

چندا کی بات قابلِ غور تھی۔ پروفیسر کسی وجہ سے ہی اندر رہنے پر مصر تھا ورنہ وہ ان عورتوں کو ڈھال بنا کر فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ شاید رب نواز یا اس کے ساتھی آنے والے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے ہی اسے قابو کرنا ضروری تھا۔ مسئلہ عورت اور اس کی بچی کا تھا۔ یہ کمرا اندر کی طرف سے صرف ایک دروازہ رکھتا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ باہر دو کھڑکیاں کھلتی تھیں، یہ بھی بند تھیں۔ ان کے پٹ اندر سے بند تھے۔ چھجے کے اوپر روشن دان تھا لیکن اس سے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ اسی اثنا میں چندا میرے پاس آ گئی "تم سامنے رہو۔ کوئی اس طرف سے نہ آ جائے" میں نے کہا۔

"ناصر، ہمیں یہاں رکنے کے بجائے ہاشم رضا کو قابو کر کے نکل جانا چاہیے۔ رکنے میں خطرہ ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں" اس نے چھجے کے اوپر روشن دان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سردی کے باعث روشن دان بند تھا "میں اس پر مورچا لگاتی ہوں۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے آئے گا، میں

اسے شوٹ کردوں گی۔"

"روشن دان بند ہے" میں نے کہا "تم کھولوگی تو وہ ہوشیار ہوجائے گا۔"

"میں کوشش کرتی ہوں" اس نے کہا اور اس سے پہلے میں اسے روکتا، وہ جھکے جھکے دوڑ کر باغ کو عبور کر کے ریسٹ ہاؤس کی دیوار تک پہنچی۔ اس نے اچھل کر چھجا پکڑا اور اوپر چڑھ گئی۔ اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ اس کے بعد وہ چھجے پر چلتی اس روشن دان تک گئی جس کے نیچے پروفیسر دو مجبور یرغمالیوں کے ساتھ موجود تھا۔ پروفیسر کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے اس سے کہا "پروفیسر، تم انسانیت کے مجرم ہو۔ تم بچ کے نہیں جاسکو گے۔"

"انسانیت!" اس نے ہذیانی سا قہقہہ مارا "اس نام کی کوئی شے دنیا میں باقی رہی ہے؟ میں نے کچرے سے چن کر کھایا ہے۔ رات کو دولت مندوں کے دروازوں پر لگی روشنی میں پڑھا ہے۔ ہر کام کیا ہے۔ بھیک مانگی ہے۔ تب کہیں جاکر اپنی تعلیم مکمل کرسکا اور جب میں پی ایچ ڈی کر کے آیا تو مجھے بتایا گیا، میرے لیے کوئی نوکری نہیں ہے...... سنا تم نے، اس ملک میں پی ایچ ڈی کے لیے کوئی نوکری نہیں ہے پھر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی صلاحیتیں مجرموں کو بیچ دیں۔ انہوں نے مجھے اتنا دیا کہ میری ساری عمر کی محرومیاں دور ہوگئیں۔ تم مجھے انسانیت کا مجرم قرار دیتے ہو۔ میں سرے سے انسانیت سے انکار کرتا ہوں۔ اس دنیا میں صرف دو طاقتیں ہیں، ایک دولت اور ایک ہتھیار۔ یہ جس کے پاس ہوں، سب اس کی مانتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "پروفیسر، تمہارے جیسے تعلیم یافتہ شخص کے منہ سے ایسی باتیں سن کر افسوس ہوتا ہے۔ اگر زمانے نے تمہارے ساتھ برا کیا تو اس میں عام انسانوں کا کیا قصور جو تم انہیں اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھاتے رہے ہو؟"

"شاہ عالم! میرے سامنے کتابی باتیں مت کرو" وہ چلایا "میرے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"روشن دان سختی سے بند ہے" چندا کی آواز آئی "میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو پروفیسر ہوشیار ہوجائے گا، ایسا کرو کوئی بہانہ کر کے ایک برسٹ چلاؤ۔"

"ٹھیک ہے لیکن جیسے ہی روشن دان کھلے گا، پروفیسر کو موقع دیے بغیر شوٹ کردینا۔"

"میں تین تک گنوں گی جیسے ہی تین کہوں تم فائر کرنا۔"

"میں تیار ہوں" میں نے کہا۔ جیسے ہی چندا نے ایک کہا، میں چلایا "کون ہے ادھر، سامنے آؤ۔ میں گولی ماردوں گا۔" اور چندا کے تین کہتے ہی میں نے برسٹ چلایا۔ رات کے سناٹے میں، سب مشین گن کی آواز زیادہ ہی بھیانک انداز میں گونجی تھی۔ اس دوران میں چندا نے روشن دان کھول دیا تھا۔ پروفیسر بھی چلا رہا تھا۔

"فائر کیوں کررہے ہو، کوئی چالاکی......" اس کی آواز یک لخت غائب ہوگئی۔

"میں نے اسے ماردیا ہے" چندا بولی۔

یہ سنتے ہی اکبر نے دروازے کے کنڈی والے حصے پر فائر کر کے اسے توڑ دیا اور اندر گھس گیا۔ جہاں ماں بیٹی آپس میں لپٹی چلا رہی تھیں۔ اکبر نے کہا "مرا نہیں ابھی زندہ ہے جلدی آؤ۔"

"چندا، تم باہر کا خیال رکھو" میں نے کہا اور تیزی سے گھوم کر ریسٹ ہاؤس کے اگلے حصے سے اندر داخل ہوا۔ رونے کی آواز نے میری رہنمائی کی تھی۔ اندر راہ داری میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا، پروفیسر بستر کے پاس فرش پر چت پڑا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ ایک کونے میں وہ عورت اور اس کی بیٹی سہمے بیٹھے تھے جنہیں پروفیسر نے یرغمالی بنا رکھا تھا۔ کیروسین لیمپ کی ہلکی سی روشنی میں ان کی حالت صاف نظر آرہی تھی۔ وہ تیس بتیس برس کی صحت مند اور قبول صورت عورت تھی، جس کے جسم پر پورا لباس بھی نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا، اسے پروفیسر کی ہوس کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات تھی کہ اس کی تیرہ چودہ سال کی بیٹی بھی اس کی ہوس سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ اس کا پھٹا لباس، خراش خراش چہرہ اور دہشت زدہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس پر کیا گزری تھی، میں نے اشتعال کے عالم میں پروفیسر کو مارنا چاہا لیکن اکبر نے روک لیا "اس سے رب نواز کا پوچھو، وہ کہاں ہے؟"

"ہاشم رضا!" میں اس پر جھک گیا "تم مر رہے ہو۔ جاتے جاتے اپنے گناہوں کا بوجھ کم کرتے جاؤ۔ رب نواز کہاں ہے؟"

وہ اذیت کے عالم میں مسکرایا "میں گناہ ثواب کا قائل ہی نہیں ہوں اور رب نواز کے بارے میں جانتا تو ضرور بتادیتا۔" اس کی آواز دھیمی لیکن مستقل تھی۔

"کوئی اشارہ ہی دو۔ آخر وہ گیا کہاں ہے؟"

"سرحد کی طرف" اس کی سانس تیز ہونے لگی تھی۔ "اس کے ساتھ میجر شاہد بھی تھا۔"

"میجر شاہد!" میں حیران ہوا "کیا وہ بھی لال حویلی میں تھا۔"

اس نے سر ہلایا "وہ بھی تھا اور بھی انڈین تھے، ان کے دو سائنٹسٹ بھی تھے۔ وہ نیچے تہ خانے میں ہی رہ گئے تھے۔"

"کیا رب نواز واپس آئے گا؟"

"ہاں، وہ مجھے نہیں چھوڑ...... سکتا ہے۔" پروفیسر کے چہرے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا۔ "میں اس کے لیے بہت اہم ہوں۔"

"ہو نہیں تھے" میں نے کہا اور اس کی گردن ایک جھٹکے سے موڑ دی۔ کٹ کی آواز کے ساتھ ہی پروفیسر کی آنکھیں بے نور ہوگئی تھیں۔ عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے گھگیاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں نہ مارو۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

"فکر نہ کرو، تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ وہ ملک کے ساتھ گیا ہے" عورت اتنی خوف زدہ تھی کہ اسے اپنی برہنگی کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں نے بستر کی چادر کھینچ کر اس کی طرف پھینک دی۔ جسے اس نے لپیٹ لیا۔

"کہاں گیا ہے؟"

"پتا نہیں۔ ملک کو سرحد کا راستہ دکھانے کے لیے لے گیا ہے" عورت رونے لگی "ان ذلیلوں نے مجھے اور میری بیٹی کو تباہ کردیا ہے۔ کل سے یہ ہماری عزت سے کھیل رہے ہیں۔"

یہ انکشاف افسوس ناک تھا۔ نہ صرف پروفیسر بلکہ رب نواز، میجر شاہد اور ان کے چیلے بھی ان مظلوم عورتوں کی آبرو سے کھیلتے رہے تھے۔ خاص طور سے بچی ان کا نشانہ رہی تھی۔ وہ اتنی معصوم اور کم عمر تھی کہ ابھی اسے جنس کے مفہوم بھی نہیں معلوم تھے اور اسے اس قیامت سے گزرنا پڑا تھا۔ ہم نے پروفیسر کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا تھا لیکن اس سے ان کی لٹی عزت واپس نہیں آسکتی تھی۔ "تمہارے شوہر نے کچھ نہیں کیا؟" میرے لہجے میں تلخی تھی۔

"وہ بے غیرت اپنی جان بچانے کے لیے سب کچھ برداشت کرتا رہا" عورت اب دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔

میں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ اس جاگیردارانہ نظام میں غریب اور مجبور آدمی کے پاس بچانے کے لیے ایک جان ہی رہ گئی تھی۔ رب نواز جیسے جاگیرداروں کے محکوم، عزت اور مال پر بہت پہلے ہی سمجھوتا کرچکے تھے۔ میں نے ہاشم رضا کی طرف اشارہ کیا "تمہارا ایک مجرم تو کیفرِ کردار کو پہنچ چکا ہے۔ باقی بھی اپنی سزا پائیں گے۔ یہ بتاؤ کہ تم لوگ رہتے کہاں ہو؟"

"اس طرف کونے والا کمرا ہمارے پاس ہے۔ گاؤں میں اچھا بھلا رہ رہے تھے، یہ حرامی لالچ میں ہمیں یہاں لے آیا۔ ادھر آنے والے کھاتے کے اچھے پیسے دیتے تھے جو عیاشی کرنے کے لیے عورتیں لاتے تھے" اس کے لہجے میں نفرت تھی۔

"حیرت ہے اتنی فائرنگ ہوئی مگر کسی نے نوٹس نہیں لیا؟" میں نے اکبر سے کہا۔

"اس طرف آبادی نہیں ہے۔ قریب ترین گاؤں بھی دو میل کے فاصلے پر ہے، زیادہ تر کھیت ہیں اور پھر سرحد پاس ہونے کی وجہ سے فائرنگ معمول کی بات ہے، کوئی نوٹس نہیں لیتا ہے اس کا" اکبر بولا "لیکن رب نواز کی پارٹی کا کوئی آدمی آسکتا ہے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"وہ پھر آئیں گے" عورت گھبرا گئی۔ "اس بار تو مار ہی دیں گے۔"

"تم اپنی بیٹی کو لے کر چلی جاؤ۔ تمہاری رہائش کہاں ہے؟" اکبر نے اسے مشورہ دیا۔

"چار کوس پرے گاؤں ہے۔ میں اسے اس حالت میں لے کر کیسے جاؤں؟" عورت نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھی۔ وہ ایسی کلی تھی جسے پھول بننے سے پہلے ہی مسل دیا گیا تھا۔ عورت صحیح کہہ رہی تھی، اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ چند قدم بھی چل سکتی۔ میں نے پوچھا "تمہارا اور کوئی قریبی عزیز رہتا ہے یہاں؟"

"ہاں، پاس ہی گاؤں میں چاچا ہے میرا" اس نے سر ہلایا۔

"تو جلدی سے کپڑے بدلو اور لڑکی کو لے جاؤ، اسے یہ بتانا کہ ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اور تمہارے شوہر کو اغوا کر کے لے گئے۔"

میں نے اسے سمجھایا، اس نے سر ہلایا "ایسا ہی کہوں گی جی!"

"جاکر تیاری کرو" اکبر بولا تو وہ اپنی بیٹی کو سہارا دے کر کمرے سے چلی گئی۔ اکبر وہاں کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے درازیں الٹ دیں اور الماری کھول کر ساری چیزیں باہر پھینک دیں۔ میں نے پوچھا "کس چیز کی تلاش ہے؟"

"پروفیسر اپنے فارمولے اپنے پاس رکھتا ہوگا، میں ان کو تلاش کررہا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میرا نہیں

خیال کہ پروفیسر ایسی عقل مندی کرے گا۔ اس نے اپنی ساری اہم چیزیں اپنے دماغ میں ہی محفوظ رکھی ہیں ورنہ اس کی افادیت ختم ہو جاتی، اگر وہ اپنے تجربات کی اہم باتیں لکھ کر رکھتا، وہ رب نواز کے قبضے میں رہا ہے اور اب تک رب نواز اس سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہوتا لیکن پروفیسر احمق نہیں تھا۔ اس نے رب نواز کو ان فارمولوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی ہوگی۔"

پروفیسر کے پاس ایک چھوٹا کیلیبر کا پستول تھا لیکن چندا نے اسے استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کی گولی نے پروفیسر کی ریڑھ کی ہڈی توڑ کر اس کے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ اکبر قائل نظر آنے لگا لیکن اس نے پروفیسر کی بھی تلاشی لی۔ اس کے کپڑوں سے ایک خاصا وزنی پرس برآمد ہوا، جس میں رقم کے علاوہ کئی انٹرنیشنل کریڈٹ کارڈ تھے۔ ان میں ایک معروف بینک کا گولڈ کارڈ بھی تھا۔ جو صرف کروڑ پتی افراد کو جاری کیا جاتا ہے۔ کام کی کوئی چیز اس میں سے بھی نہیں ملی تھی۔ میں دعا کر رہا تھا کہ پروفیسر نے اپنا کام صرف خود تک محدود رکھا ہو۔ ورنہ یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کوئی اور سائنس داں پروفیسر کے تجربات کی روشنی میں حیوانی مخلوق کی تیاری شروع کر سکتا تھا۔

"چندا! سب ٹھیک ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، سوائے میرے سب ہی ٹھیک ہے۔ سردی سے میری قلفی جم رہی ہے" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

عورت خود اور اپنی لڑکی کو تیار کر کے لے آئی تھی۔ اکبر نے کہا کہ وہ انہیں جیپ پر ان کے چچا کے گاؤں کے باہر تک چھوڑ آئے گا۔ وہ انہیں لے کر چلا گیا۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کے دروازے بند کیے۔ اندر پڑی دونوں لاشیں بستروں کے نیچے کر دی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے جو آدمی چندا کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اسے میں نے گلاب کی جھاڑیوں میں کر دیا تھا اور عقبی باغ میں جو بدنصیب میری فائرنگ کی زد میں آیا تھا، وہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مارا تو میں نے پیروں پر تھا لیکن اس نے عقل مندی کی اور زمین پر گر گیا، نتیجے میں ایک گولی اس کے دائیں پہلو میں پیوست ہو گئی تھی۔ اسے مہندی کی باڑھ کے عقب میں کرتے ہوئے مجھے اپنے پہلو میں شدت سے درد کا احساس ہوا۔ میری کراہ سن کر چندا نے چھجے سے نیچے چھلانگ لگائی اور لپک کر میرے پاس آئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے بے تابی سے کہا۔

"کچھ نہیں" میں نے گہری سانس لے کر درد دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میری جیب میں پین کلر گولیاں تھیں۔ میں نے دو گولیاں منہ میں ڈال لیں۔ چندا ہینڈ پمپ سے مگ میں پانی لے آئی۔ پانی پی کر میں نے ذرا بہتر محسوس کیا تھا "ناصر! تمہاری حالت اچھی نہیں ہے، واپس چلو۔ لعنت بھیجو رب نواز پر...... کبھی نہ کبھی تو ہاتھ آئے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "چندا! وہ ایک اژدہا ہے، ابھی زخمی ہے اس لیے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اسے موقع مل گیا تو وہ دوبارہ ہمارے لیے خطرناک ہو جائے گا۔ تم اس کی فطرت جانتی ہو، یہی وقت ہے جب ہم اس کا سر کچل سکتے ہیں اور میری فکر نہ کرو۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری حالت خود بخود بہتر ہو جائے گی۔ ابھی زخم ہرا ہے پھر اتنا خطرناک بھی نہیں ہے۔"

"لیکن بگڑ تو سکتا ہے" چندا ابھی تک متفکر تھی "ناصر، مجھے میجر شاہد کے بارے میں سن کر فکر ہو رہی ہے۔ وہ بڑا کا تربیت یافتہ کمانڈو ہے اور تم زخمی ہو۔"

"فکر مت کرو۔ وہ بھی بچ کر نہیں جائے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"ناصر پلیز......"

"چندا۔" اس بار میرا لہجہ سخت تھا "بحث مت کرو۔ کیا تم اس لیے آئی تھیں؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ فضا تاریک اور سردی شدید تھی لیکن ہم باہر رہنے پر مجبور تھے۔ اندر جا کے ہم محصور ہو جاتے اور اس بات کا امکان تھا کہ رب نواز اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کی صورت میں ہم گھر جاتے۔ صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ سردیوں کی راتیں طویل ہوتی ہیں۔ اچانک چندا نے کہا "ناصر کوئی آواز آئی ہے اس طرف سے۔" اس نے جنوب مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ یہ علاقہ سرحدی تھا اس لیے مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم تھا کہ پاکستان انڈیا کی سرحد حقیقت میں کس طرف ہے مگر اندازہ اسی طرف تھا جس طرف سے چندا کو آواز آئی تھی۔ میں اس سمت مہندی کی باڑھ کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ اس کے پار دور تک کھلا میدان تھا۔ جس کے پار گندم کی فصل کھڑی تھی۔ اب میں بھی سن رہا تھا۔ یہ بھربھری زمین پر گھوڑے کے دوڑنے کی آواز تھی۔ میں درد بھول کر مستعد ہو گیا۔ اکبر ابھی تک نہیں آیا تھا اور مجھے اس کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اگر یہ رب نواز اور اس کے ساتھی تھے تو ہمیں ایک خونریز مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔

"ناصر یہ جگہ بالکل غیر محفوظ ہے۔" چندا نے سرگوشی کی "ہمیں درختوں کی طرف جانا چاہیے۔"

لیکن درخت اس جگہ تھے جہاں سے ہم آنے والوں پر پوری طرح نظر نہیں رکھ سکتے تھے۔ اگر چندا ساتھ نہ ہوتی تو میں مہندی کی باڑھ میں رہنے کو ترجیح دیتا مگر میں چندا کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ درخت زیادہ تر بائیں طرف تھے۔ ان میں چھپ کر ہم آنے والوں کی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو جاتے مگر اس سے ریسٹ ہاؤس کے سامنے والا حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا آنے والے گھڑ سوار سامنے کے حصے میں ہی آ کر ٹھہرے تھے البتہ ایک جھلک نظر آئی تھی۔ وہ کم سے کم چار افراد تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے پھر کسی کی آواز آئی۔

"اوئے...... رفیق...... مجید کہاں مر گئے تم دونوں۔"

غالباً یہ دونوں وہی تھے جو ریسٹ ہاؤس کے اندر باہر مارے گئے تھے۔ یہ نگران تھے تو مارا جانے والا تیسرا فرد کوئی اہم شخص تھا پھر میں نے رب نواز کی آواز سنی "کوئی گڑبڑ ہے...... یہ سب کہاں مر گئے۔"

میں نے دروازہ کھلنے کی پرشور آواز سنی۔ وہ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے اور ظاہر ہے کہ انہوں نے لاشیں بھی دیکھ لی تھیں۔ ان کے شور اور گالیوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے چندا کی طرف دیکھا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ غائب تھی۔ "چندا۔" میں نے ہانک میں سرگوشی کی "کہاں ہو تم؟"

"میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے کہا "ان کے گھوڑوں کو ناکارہ بنانے جا رہی ہوں۔"

"واپس آؤ۔" میں نے اضطراری آواز میں کہا "یہ خطرناک ہے۔ انہوں نے گھوڑوں کو ایسے ہی نہیں چھوڑا ہو گا۔"

چندا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے کئی بار پکارا پھر میں نے مشین گن سنبھالی اور درختوں سے آگے والے حصے کی طرف آنے لگا۔ اس طرف درختوں کی آڑ کم تھی۔ اسی لمحے میں نے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے ساتھ ایک تیز برسٹ کی آواز سنی تھی۔ میرا دل جیسے رک گیا۔ چندا کے پاس سائلنسر لگا پستول تھا۔ اسی لمحے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو بڑی سی رائفل اٹھائے اگلے والے حصے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑتی میں نے اسے چھلنی کر دیا۔

"چندا۔" میں نے کہا "تم ٹھیک ہو؟" اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے پھر بے چینی سے پکارا۔ "چندا! تم ٹھیک ہو نا؟" میرا دل اندیشوں سے لرز رہا تھا۔

"شش۔" اس کی آواز آئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ "اوپر کوئی چڑھا ہے۔ پلیز آڑ میں ہو جاؤ۔"

میں نے بے اختیار چھت کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے اگر میں زمین پر نہ گر جاتا تو اوپر سے آنے والا برسٹ مجھے چھلنی کر دیتا۔ میں نے جوابی برسٹ چلایا۔ چھت پر موجود شخص تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے موقع مل گیا کہ میں فرش پر رول کرتے ہوئے چھجے کی آڑ میں ہو گیا۔ اس طرف ریسٹ ہاؤس کی چھت سیدھی تھی۔ اسی وجہ سے کوئی اوپر آنے میں کامیاب ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگتے ہی میں تیزی سے کونے والے حصے کی طرف سرکنے لگا۔ جہاں اوپر کھپریل کی چھت تھی۔ اس طرف سے اوپر سے فائرنگ ممکن نہیں تھی۔ اس دوران میں ایک بار پھر مجھے پہلو میں درد اٹھنے لگا تھا۔

"ناصر...... فائر کس نے کیے؟"

"پہلے اوپر سے ہوئے ..... پھر میں نے کیے تھے۔" میں نے سرکتے ہوئے کہا "دونوں ہی بچ گئے۔ تم کہاں ہو؟"

"میں اس طرف ایک درخت کی آڑ میں ہوں۔ میں نے ایک گھوڑے کو گولی ماری باقی خود ہی بھاگ گئے ہیں۔"

"تم پر فائر کس نے کیے تھے؟"

"پتا نہیں اندر سے کیے تھے۔ اس طرف کئی دروازے ہیں۔ میں بم مارنے جا رہی ہوں تم کہاں ہو؟"

"ریسٹ ہاؤس کے جنوبی کونے میں مہندی کی باڑ کے نزدیک۔"

"ٹھیک ہے میں ایک دو تین گنتے ہی بم پھینکوں گی۔ دھماکا ہوتے ہی تم دوبارہ درختوں میں چلے جانا۔ یہ جگہ بالکل محفوظ نہیں ہے۔"

"چندا تم بھی وہاں سے نکل آؤ۔" میں نے کہا "اس طرف درختوں کی آڑ زیادہ نہیں ہے۔"

"میں بم پھینک رہی ہوں۔ ایک...... دو...... تین۔"

میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے۔ اس کے باوجود دھماکے سے میرے کان جھنجھنا گئے تھے۔ [illegible] ساتھ ہی میں عقب میں بھاگ کر [illegible] درختوں میں آ گیا۔ میرے عقب میں رب نواز کی چیخ کی آواز آئی تھی۔ اس وقت تک صبح کی روشنی کافی حد تک نمودار ہو چکی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے [illegible] زمین پر پڑا نظر آیا۔ وہ چھت سے گرا تھا۔ بم نے [illegible] "ایک [illegible]" میں نے چندا سے کہا "تمہارا نشانہ [illegible] ہے۔"

"شکریہ۔ [illegible] ہے۔"

"جیپ کہاں ہے" میں نے [illegible] کی آواز نہیں آئی۔

"میں آ گیا ہوں خاتون۔" اس کی آواز آئی۔

"وہ ذرا پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا "ذرا صورتِ حال کا معائنہ کرنے آیا تھا۔"

میں نے اسے مختصراً حالات بتائے۔ وہ بولا "اچھا میں نے کئی گھوڑے فرار ہوتے دیکھے تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ ایک بم اب اندر پھینکو۔"

"اور میرا مشورہ ہے کہ جیپ لا کر چندا کو اس جگہ سے نکال لو۔ وہ بالکل غیر محفوظ ہے۔" میں نے کہا تھا کہ برسٹ چلنے کی آواز آئی پھر چندا بولی۔

"میرے خدا بال بال بچی ہوں۔ ابھی ان کی ایسی کم تیسی کرتی ہوں۔" اس نے دانت پیسے "ایک...... دو...... تین......" اس نے کہتے ہی بم اچھالا۔ دھماکے کے ساتھ ہی اندر سے ایک چیخ بھی سنائی دی۔

"ایک اور گیا۔" میں نے مسرت سے کہا اور چلا کر بولا "رب نواز ہتھیار ڈال کر باہر آ جاؤ۔ ورنہ چوہے کی طرح اندر ہی مارے جاؤ گے۔"

"شاہ عالم کتے کے بچے......" اس نے اندر سے دیوانہ وار گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ میں نے قہقہہ لگایا۔

"ابھی تو دو بم مارے ہیں۔ دس بارہ اور مارے تو تم جہنم میں ہو گے۔ میں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔"

ایک بار اس نے اندر سے بے تحاشا فائرنگ کی تھی۔ میں چندا کے لیے فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں تھی اور یہ کوئی محفوظ آڑ نہیں تھی اگر دو طرف سے فائرنگ ہوتی۔ تو چندا شدید خطرے میں تھی۔ اسی لمحے میں نے بریکوں کی چرچراہٹ سنی اور پھر اکبر کی آواز آئی۔ "ہری اپ، جلدی سے اندر آؤ۔"

جیپ کی آواز کے ساتھ فائرنگ ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔" چندا بولی "اب جلدی سے نکل چلو۔"

"فکر نہ کرو۔ یہ بلٹ پروف جیپ ہے۔" اکبر نے کہا پھر مجھ سے بولا "ناصر اس جگہ سے دور چلے جاؤ میں راکٹ مارنے والا ہوں۔" اس نے جیپ لے جا کر ذرا دور میدان میں روکی۔ میں نے چندا کی بوکھلائی ہوئی آواز سنی۔

"رک جاؤ ناصر کو تو نکلنے دو۔"

"بی بی اتنی بھی جلدی نہیں کر رہا ہوں۔ ایک منٹ تو لگے گا ہی۔"

میں تیزی سے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے دور جانے لگا۔ ذرا دور جا کر میں ان جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ جو نہر تک چلی جاتی تھیں۔ اب میں ریسٹ ہاؤس سے محفوظ فاصلے پر تھا۔ میں نے چندا سے مخاطب ہونا چاہا لیکن فاصلہ دو سو گز سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لیے ہینڈ سیٹ نے کام نہیں کیا۔ بہر حال میں مطمئن تھا۔ اب مجھے دھماکے کا انتظار تھا۔ میری گھڑی کے مطابق ایک منٹ کا وقت گزر چکا تھا پھر دوسرا منٹ بھی گزرنے لگا۔ نہ جانے اکبر کیا کر رہا تھا۔ صبح کی نمودار ہوتی روشنی میں میری نظریں اب درختوں میں گم ریسٹ ہاؤس کی طرف تھیں۔ جب دوسرا منٹ بھی گزر گیا تو میں نے ذرا قریب جانے کا سوچا تاکہ رابطہ ہو سکے۔ اسی لمحے کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ ریسٹ ہاؤس کی طرف سے شعلے اور دھواں اٹھا تھا۔ اکبر نے اسے تباہ کر دیا تھا پھر شوں کی آواز کے ساتھ دوسرا راکٹ لگا۔ دو بموں نے پہلے ہی ریسٹ ہاؤس کا خاصا نقصان کیا تھا۔ باقی کسر ان دو حملوں نے پوری کر دی۔ ریسٹ ہاؤس ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ "وہ مارا۔" میں نے دل میں سوچا۔ کتنے طویل انتظار کے بعد یہ دن آیا تھا جب رب نواز نامی یہ شیطان اس زمین سے دفع ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ناچوں، گاؤں اور اچھل کود کر کے اپنی خوشی کا اظہار کروں۔ میں جھاڑیوں سے نکلنے والا تھا کہ مجھے اپنے آگے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور اگلے ہی لمحے میری ساری خوشی ملیامیٹ ہو گئی۔ جب میں نے رب نواز کی آواز سنی۔ وہ دبی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ کسی نے آہستہ سے ڈانٹا۔

"چپ رہو احمق...... ان کا ایک ساتھی اس طرف بھی ہے۔ شاید وہی شاہ عالم ہے۔" میں سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا۔ رب نواز زندہ تھا۔ وہ خبیث ایک بار پھر بچ نکلا تھا۔ شاید اکبر نے جو ذرا سی تاخیر کی تھی، اس سے فائدہ اٹھا کر وہ عقبی راستے سے نکل گیا تھا اور نکلنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ یہاں گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جن میں چھپ کر بہ آسانی فرار ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے بمشکل خود کو فائر کرنے سے روکا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ رب نواز اور اس کا ساتھی کس طرف تھے۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بھی مسلح تھے اگر میری فائرنگ سے بچ جاتے تو وہ بہ آسانی میرا کام تمام کر سکتے تھے لیکن میں رب نواز کو اتنی آسانی سے نکلنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں بھی جھاڑیوں میں حرکت کرنے لگا۔ اصل میں، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں سے گزر رہے تھے۔ آخر ایک جگہ مجھے مسلی ہوئی گھاس اور ذرا ہٹی ہوئی جھاڑیاں نظر آئیں اور میں اس کے سہارے ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ چندا اور اکبر کو بتا سکتا۔

صبح کی روشنی اب اتنی ہو چکی تھی کہ مجھے راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ معاً میری نظر خون کے دھبوں پر پڑی۔ رب نواز یا

اس کے ساتھی میں سے کوئی زخمی تھا۔ شاید چندا کے پھینکے دستی بم نے کسی کو زخمی کیا تھا۔ اس سے میرا کام ذرا آسان ہو گیا تھا لیکن خون کی مقدار بتا رہی تھی کہ زخم معمولی نوعیت کا ہے۔ خیر یہ تو ایک اندازہ تھا بعض اوقات خاصے سنگین زخم سے بھی معمولی مقدار میں ہی خون نکلتا ہے اور بعض اوقات سطحی زخم سے بے تحاشا خون ضائع ہو جاتا ہے۔ جیسے مجھے گولی زیادہ گہرائی میں نہیں لگی تھی لیکن میرا خاصا خون ضائع ہو گیا تھا۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ ہر ممکن تیزی سے ان کا تعاقب کروں اور کوئی ایسی آہٹ بھی نہ ہو جو انہیں چوکنا کر دے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریسٹ ہاؤس سے دور نکلنے کے بعد ان کے فرار کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ اب وہ ڈرے بغیر تیزی سے جھاڑیاں ہٹاتے جا رہے تھے لیکن میں ان کے تعاقب میں ایسی آزادی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ کوئی بھی آہٹ انہیں چوکنا کر سکتی تھی۔ میں اس کوشش میں بھی تھا کہ ایک بار ان کی جھلک نظر آ جائے تو میں بے دریغ انہیں اڑا دوں مگر یہاں جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ چند فٹ سے آگے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہی چیز رب نواز کو بچائے جا رہی تھی۔

اچانک آگے سے آتی آوازیں رک گئیں۔ ایسا لگا جیسے وہ رک گئے ہوں مگر کیوں۔ کیا انہیں اپنے تعاقب کا شبہ ہو گیا تھا۔ میں بھی رک کر جھاڑیوں میں دبک گیا۔ میرے کان کسی آہٹ پر لگے تھے اور وہاں اتنی خاموشی تھی کہ پن بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ اچانک ہی پرندوں کا شور بلند ہوا تو میں جھنجلا گیا۔ اب کوئی آہٹ سننا ممکن نہیں تھا۔ ذرا سی دیر میں فضا پرندوں کی آوازوں سے گونجنے لگی تھی لیکن جس طرح مجھے ان کی آہٹ نہیں آ رہی تھی اسی طرح انہیں بھی میری آہٹ سنائی نہیں دیتی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ میں احتیاط سے جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے راستہ بنا رہا تھا۔ کچلی مسلی ہوئی گھاس میری رہنمائی کر رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں مشین گن ایک سیکنڈ میں فائر کرنے کے لیے تیار تھی اور میں اس وقت ہکا بکا رہ گیا۔ جب اچانک ہی جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ ان سے آگے کوئی ایک فرلانگ تک کوئی صاف شدہ کھیت تھا جس کے عقب میں گندم کی فصل تھی۔ رب نواز اور اس کا ساتھی اسی فصل میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے مشین گن سیدھی کی لیکن پھر رک گیا۔ اتنے فاصلے سے درست نشانہ لینا مشکل تھا اور وہ میری فائرنگ کی حد سے باہر تھے۔ کاش میرے پاس کوئی رائفل ہوتی۔ میرے مغالطے سے فائدہ اٹھا کر وہ خاصا آگے جا چکے تھے۔ جیسے ہی وہ فصل میں داخل ہوئے میں بھی جھاڑیوں سے نکل کر ان کے پیچھے لپکا۔ گندم کے پودے بمشکل تین فٹ بلند ہوئے تھے اور اگر وہ پلٹ کر دیکھ لیتے تو میں انہیں بہ آسانی نظر آ جاتا مگر اتنا دور نکل آنے کے بعد وہ مطمئن تھے کہ دشمن اب تعاقب میں نہیں ہے۔ اسی لیے وہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ ہر ممکن تیزی سے میں گندم کے پودوں تک جا پہنچا۔ اب میں زمین پر بیٹھ کر ان کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن اس تیز رفتاری نے درد کے عفریت کو پھر جگا دیا تھا۔ میں نے گہری سانسیں لے کر درد کے سانپ کو واپس اس کے بل میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ اگلا مرحلہ زیادہ دشوار ثابت ہوا تھا۔ مجھے سر اٹھائے بغیر ان کا تعاقب کرنا تھا۔ اگرچہ فصل کی وجہ سے ان کی رفتار کم تھی اس کے باوجود وہ خاصا آگے نکل چکے تھے۔ میں چاروں ہاتھوں پیروں سے ان کے بنائے راستے پر سفر کر رہا تھا لیکن یہ نہایت مشکل ہو رہا تھا۔ مشین گن جو میں نے سامنے کی ہوئی تھی، بار بار میرے پیروں اور ہاتھوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اسے میں پشت کی طرف نہیں کر سکتا تھا کہ فوری استعمال کی ضرورت پڑتی تو اسے آگے لانے میں ایک دو ثانیے لگ جاتے اور زندگی اور موت کی اس جنگ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر شکست کا باعث بن جاتی ہے۔

اس طرح چاروں ہاتھوں پیروں سے چلنے سے زخم پر بھی دباؤ پڑ رہا تھا اور اس میں رہ رہ کر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں وقفے وقفے سے سر اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بھی اتنا آگے تھے کہ مشین گن کی گولی ان تک نہیں پہنچ پاتی۔ کھیتوں کے دائیں طرف مجھے ایک گاؤں نظر آ رہا تھا لیکن رب نواز اور اس کے ساتھی کا رخ اس طرف نہیں تھا بلکہ وہ جنوب مشرق کی طرف سفر کر رہے تھے۔ نہ جانے ان کی منزل کیا تھی۔ میں نے ان پر لعنت بھیجی۔ ان کی وجہ سے مجھے اس بے ہودہ انداز میں سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ نسبتاً زیادہ رفتار کی وجہ سے مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اب خطرہ تھا کہ وہ غائب ہی نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ ذرا آگے مجھے باغات نظر آ رہے تھے۔ رب نواز کے ساتھی کے شانے سے ایک رائفل لٹکی تھی اور رب نواز کے پاس بظاہر کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن اس کا کسی پستول یا ریوالور سے مسلح ہونا یقینی تھا۔ ایک فرلانگ کے بعد کھیت ختم ہو گئے۔ میں اس وقت وسط میں تھا جب وہ فصل سے باہر نکل چکے تھے اس وقت بھی وہ مجھ سے کوئی تین سو گز آگے تھے۔ مجھے ایک بار پھر رائفل کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ یوزی سب مشین گن بے شک موثر ہتھیار تھا لیکن اس کی موثر حد دو سو گز سے زیادہ نہیں تھی۔ درد کی وجہ سے مجھے بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ جب بھی درد کی لہر اٹھتی تھی، میں

رک جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے میں فصل سے نکلا۔ اس وقت وہ دونوں ایک باغ کے کنارے نالے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان کی نگاہوں سے بچنے کے لیے مجھے دائیں طرف کے ایک باغ کے درختوں کی آڑ لینی پڑی۔ یہ کینو کا باغ تھا۔ فصل اترنے کے بعد اس کی رکھوالی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ورنہ مجھے کم سے کم کتوں سے ضرور واسطہ پڑتا۔

میں تیز قدموں سے چل کر ان کے نزدیک جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار میں نے درختوں کی قطار سے جھانکا تو وہ غائب تھے۔ ایک لمحے کو میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ اتنی خاموشی سے کہاں غائب ہو گئے تھے.. اس پگڈنڈی کے دونوں طرف باغ ہی تھے۔ وہ اسی باغ میں آتے تو مجھے درختوں کی اس طرف کی قطار میں صاف نظر آتے۔ وہ یقیناً دوسری طرف کے باغ میں داخل ہو گئے تھے۔ میں باغ سے نکل کر اب پگڈنڈی پر آ گیا تھا۔ مشین گن میرے ہاتھ میں تھی اور نظریں زمین پر مرکوز تھیں۔ آخر مجھے مطلوبہ شے نظر آ گئی تھی۔ یہ زمین پر خون کا دھبا تھا۔ صبح کی تیز روشنی میں یہ معمولی دھبا واضح تھا۔ ساتھ ہی میں جوتوں کے نشان دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پگڈنڈی تو سخت زمین کی تھی لیکن باغ کے کنارے کی زمین بھربھری تھی۔ اس کی باقاعدگی سے گوڈی کی جاتی تھی تاکہ زمین اچھی رہے اور اس پر فاضل جڑی بوٹیاں نہ اگیں۔ اس نے میرا کام آسان بنا دیا تھا۔ مجھے ایک جگہ دو افراد کے پیروں کے نشان باغ میں جاتے نظر آ گئے تھے۔ رہا سہا شک خون کے دھبے نے دور کر دیا تھا۔ باغ میں جانے والے رب نواز اور اس کا ساتھی ہی ہو سکتے تھے اور شاید یہ باغ ان کی پناہ گاہ تھی۔ یہ جگہ ریسٹ ہاؤس سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنے نزدیک ہونے کے باوجود رب نواز نے پروفیسر کو الگ ریسٹ ہاؤس میں کیوں رکھا تھا جب کہ وہ اس کے لیے اہم ترین فرد تھا۔

میں احتیاط سے باغ میں داخل ہوا اور درختوں کی آڑ لے کر پیروں کے نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ اب تک مجھے اس حصے میں کوئی آواز آئی تھی اور نہ ہی کوئی فرد نظر آیا تھا۔ اس کے باوجود میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس جگہ کو بغیر نگرانی کے نہیں چھوڑا گیا ہوگا۔ [illegible] سے یقین تھا کہ یہ [illegible] کے ایجنٹوں کی پناہ گاہ [illegible] زخمی حالت میں یہاں موجود تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے آگے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اور عقل کا تقاضا تھا کہ ابھی یہاں سے چلا جاؤں اور کبیر اور چندا کے ساتھ واپس آؤں۔ یوں میں موثر طور پر ان لوگوں سے نمٹ سکتا تھا مگر رب نواز کے لیے دیوانگی نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اثر ڈالا تھا اور میں بے دریغ اس باغ میں گھس گیا تھا۔

میں درختوں کی آڑ لیتا آگے بڑھ رہا تھا اور زیادہ تر گھنے درختوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ جن کے نیچے ابھی تک اندھیرا تھا لیکن اب تک مجھے نہ تو رب نواز یا اس کے ساتھی کی جھلک نظر آئی تھی اور نہ ہی کوئی اور قابل توجہ شے نظر آئی تھی۔ ہر طرف درخت تھے اور سناٹا تھا۔ باغ کے ایک حصے میں کینو کے درختوں کی قطار ختم ہو رہی تھی اور اس کے پار کچھ جھاڑی نما پودے لگے تھے۔ ان کے درمیان جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک لمحے کو حیران رہ گیا۔ کسی باغ میں اس قسم کے پودوں کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میری سمجھ میں ذرا دیر سے آیا کہ یہ کیموفلاج تھا۔ اس کے اندر جانے کا یقیناً کوئی راستہ تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ذرا سا آگے جا کر مجھے وہ مختصر سا راستہ مل گیا جو بالکل پاس جا کر ہی نظر آتا تھا۔ رب نواز اور اس کا ساتھی اسی طرف سے اندر گئے تھے مجھے ان کے پیروں کے نشان یہاں بھی نظر آئے تھے۔ میرے اندر ایک گرمی سی لہرائی تھی۔ میرا دشمن میرے پاس ہی تھا۔ جس نے ہمیشہ مجھے شدید نقصانات پہنچائے تھے۔ جس کی کوشش تھی کہ مجھے صفحۂ ہستی سے نابود کر دے مگر زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے راستے پر قدم رکھا۔ دونوں طرف جھاڑیاں اتنی تنگ تھیں کہ گزرتے ہوئے ان سے جسم ٹکرا رہا تھا لیکن ذرا آگے جا کر راستہ ذرا سا کشادہ ہو گیا تھا۔ ایک جگہ اس نے یکدم موڑ لیا تھا۔ سامنے جھاڑی پر ایک تختی لگی تھی جس پر تیر سے راستہ واضح کیا گیا تھا۔ میں اس طرف گھوم گیا اور اچانک کھٹ کے ساتھ کسی شے نے میرا بایاں پاؤں جکڑ لیا۔ میں نے نیچے دیکھا اور میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ میرا پاؤں ایک شکنجے میں جکڑا تھا۔ [illegible] دندانے مگرمچھ کے دانتوں سے مشابہ تھے اور اس نے میرے ٹخنے کو پکڑ لیا تھا۔

[illegible] درد کی لہر [illegible] تھا۔ خوش قسمتی سے [illegible] ذرا اونچے تھے۔ شکنجے [illegible] پاؤں پکڑا تھا۔ ورنہ اس کی گرفت [illegible] ٹخنہ ٹوٹ گیا ہوتا۔ اب بھی صورت حال [illegible] شکنجے [illegible] تھا اور گوشت میں پیوست ہو رہے تھے۔ [illegible] چیخ

روکی تھی۔

کتنی سادہ سی ترکیب تھی کسی کو بغیر اجازت اندر گھسنے سے روکنے کے لیے۔ تیر والا بورڈ ایک دھوکا تھا۔ اصلی راستہ اس کے مخالف سمت میں تھا۔ جو اتنا تنگ تھا کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ میں ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اگر کوئی اس طرف آ نکلتا تو میں کسی چوہے کی طرح گرفتار ہو جاتا۔ میں نے پیر کو جھٹکا دینے کے بجائے بیٹھ کر اس شکنجے کا معائنہ کیا۔ یہ لاک ہو جانے والا شکنجہ تھا جسے چابی سے یا توڑ کر ہی کھولا جا سکتا تھا۔ میرے پاس چابی تھی اور نہ ہی میں اسے توڑ سکتا تھا۔ شکنجے کا نچلا حصہ زمین میں دفن تھا۔ میں نے احتیاط سے اردگرد سے مٹی ہٹائی اور یہ دیکھ کر میرے ماتھے سے پسینہ پھوٹ آیا تھا کہ شکنجے کے نچلے حصے میں ایک بارودی سرنگ بھی فٹ تھی۔ اگر میں شکنجے کو جھٹکا دیتا تو یہ پھٹ جاتی اور میں رب نواز کو جہنم رسید کرنے کی حسرت لیے مرحوم ہو جاتا۔ صورت حال یک لخت سنگین سے سنگین تر ہو گئی تھی۔ میں نے اردگرد سے مزید مٹی ہٹائی تو شکنجہ زمین سے نکل آیا۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور نہ ہی دو ڈھائی کلو سے زیادہ وزنی تھا لیکن بارودی سرنگ کی وجہ سے بے حد خطرناک ہو گیا تھا۔ میں نے مشین گن کی نال پھنسا کر شکنجے کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ یہ بے حد سخت فولاد کا بنا ہوا تھا جسے ذرا سا ہلانا بھی ناممکن تھا۔ اس کے تالے کی ساخت بھی بتا رہی تھی کہ اسے کھولنا آسان کام نہیں ہے۔

میں رب نواز کو شکار کرنے آیا تھا اور خود پھنس گیا تھا۔ اس ریچھ کی طرح جو شکاری کا تعاقب کرتے کرتے پھندے میں جا پھنسے۔ میں نے احتیاط سے پاؤں اوپر کیا۔ ہاتھ سے شکنجے کو سہارا دیا۔ ورنہ وہ ہل جاتا اور بارودی سرنگ کے پھٹنے کا خطرہ تھا۔ بارودی سرنگ لگانے کا مقصد یہ تھا کہ پھنسنے والا اسے توڑ نہ سکے۔ ظاہر ہے بارودی سرنگ کی موجودگی میں کوئی اسے ہتھوڑے یا آری سے کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے مٹی واپس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی برابر کر دی اور ہر ممکن طور پر جھاڑی میں دبک گیا۔ خوش قسمتی سے یہاں اتنی روشنی نہیں تھی۔ ساتھ ہی میں نے زہریلی سوئی والا پستول نکال لیا تھا۔ اگر آنے والے کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو اس کی کسی کارروائی سے پہلے میں اسے بے حس کر سکتا تھا۔ آنے والا جھاڑیوں کو ہلاتا اسی طرف آ رہا تھا اور وہ اندر کی طرف سے آ رہا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ رب نواز ہوتا کہ میں اسے جہنم رسید کر سکوں مگر آنے والا کوئی اور تھا اور پھر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی لیکن اس سے پہلے وہ اپنے شانے سے لٹکی رائفل اتارتا یا حلق سے کوئی آواز نکالتا، میں اسے زہریلی سوئی کا نشانہ بنا چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر آ گرا۔

اس کے حلیے اور لباس سے ظاہر تھا کہ وہ اسی جگہ کے پہرے داروں میں سے ہے۔ اس کے شانے سے ایک سیون ایم ایم رائفل لٹکی تھی اور اس کے میگزین اس کی کمر سے بندھی بیلٹ میں اٹکے ہوئے تھے۔ میں احتیاط سے گھسٹ کر اس کے پاس گیا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے لباس میں پرس کے علاوہ چابیوں کا ایک گچھا بھی تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا اور اس امید میں کہ شاید اس میں کوئی چابی اسی شکنجے کے لاک کی ہو جس نے میرا پاؤں جکڑ رکھا تھا۔ میں نے چابیوں کا معائنہ کیا اور ان میں سے ایک مناسب نظر آنے والی چابی کو تالے میں لگایا۔ چابی اس میں فٹ آ گئی تھی لیکن یہ اس تالے کی چابی نہیں تھی۔ میں نے دوسری نظر آنے والی چابی کو تالے میں لگایا لیکن وہ اندر ہی نہیں گئی۔ تیسری سے بھی تالا نہیں کھلا تو میں مایوس ہونے لگا۔ شاید اس کے پاس شکنجے کے تالے کی چابی تھی ہی نہیں لیکن میں نے یکے بعد دیگرے چابیوں کی آزمائش جاری رکھی تھی اور اچانک ہی ایک چابی لگاتے ہی تالا کھٹ سے کھل گیا تو مجھ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ تالا کھلتے ہی شکنجہ پاؤں سے نرم پڑ گیا تھا۔ میں نے بہ آسانی اس کے بے رحم دانتوں کو دور کر دیا۔ اس کے پیر سے ہٹتے ہی مجھے بے پناہ سکون ملا تھا۔ میں نے پیر کا معائنہ کیا۔ شکنجے کے دانتوں نے اوپری کھال کو نقصان پہنچایا تھا مگر گوشت اور ہڈی محفوظ تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر دیکھا۔ پاؤں میں تکلیف تھی لیکن میں چل پھر سکتا تھا۔ شکنجے کے ساتھ میرے دل سے وہ خوف بھی نکل گیا تھا جس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میں نے پہرے دار کی تلاشی لی مگر اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے اس کی رائفل اور میگزین نکال لیے پھر اسے کھینچ کر اس راستے پر ذرا آگے ڈال دیا اور شکنجے کو جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ اب اس جگہ سے گزرنے والے کسی شخص کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر اس طرف بڑھا جہاں سے یہ پہرے دار آیا تھا۔ اس مختصر سے راستے سے جو مشکل سے نظر آتا تھا، اس بار میں پوری طرح محتاط تھا۔ ممکن ہے آگے ایسے اور ٹریپ بھی ہوتے۔ مشین گن یا رائفل کے بجائے میں نے ہاتھ میں زہریلی سوئی والا پستول رکھا تھا جو اس مختصر سی جگہ میں زیادہ کارآمد تھا۔ راستے کو دانستہ طور پر کئی جگہوں سے گھمایا گیا تھا

لیکن بالآخر میں اس بھول بھلیوں کی جگہ سے نکل آیا۔ اندر ہی اس میں کئی ایسے راستے تھے جو آگے جا کر ختم ہو جاتے تھے یا ان پر کوئی نہ کوئی ٹریپ تھا۔ یہ جگہ بڑی مہارت سے اور دانستہ طور پر بنائی گئی تھی اور اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ یہ جگہ ان کے مستقل ٹھکانوں میں سے تھی اور یہاں غیر افراد کے داخلے کو روکنے کے لیے اس قسم کے غیر معمولی حفاظتی انتظام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ راستہ ایک مختصر سے میدان میں ختم ہوا جس کے چاروں طرف یہی جھاڑیاں تھیں۔

اس کے وسط میں دو بیرک نما عمارتیں تھیں۔ جو لکڑی کے موٹے تختوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کے اوپر لکڑی کی ہی چھت تھی۔ فی الوقت وہاں کسی سرگرمی کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف ایک سکوت سا طاری تھا۔ میں راستے سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں میں ایک طرف دبک گیا تھا... تاکہ کوئی آئے تو میں بے خبری میں مارا نہ جاؤں۔ جب مجھے کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آئی تو میں جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ اس میدان کے گرد گھومنے لگا۔ دونوں عمارتیں میدان کے وسط میں تھیں اور دس بارہ گز کا خالی حصہ تھا۔ مجھے اس جگہ بھی شکنجوں کا خطرہ تھا۔ اس لیے میں جھاڑیوں کے بالکل ساتھ ساتھ ہو کر چل رہا تھا۔ اس جگہ کسی ایسی چیز کا امکان کم ہی تھا۔

میں نیم دائرے میں گھومتا اس طرف آ گیا جہاں سے مجھے دوسری بیرک صاف نظر آنے لگی تھی۔ دونوں بیرکوں کے درمیان بھی کوئی نہیں تھا۔ یہ جگہ بالکل ہی سنسان نظر آ رہی تھی لیکن نہیں...... ایسا نہیں تھا۔ میں نے کوئی آواز سنی تھی کوئی اس طرف تھا۔ آواز دوسری بیرک سے آ رہی تھی۔ میں اس کی پشت کی طرف والے حصے کی طرف بڑھا۔ اس طرف صرف دو کھڑکیاں تھیں۔ باہر آنے جانے کا راستہ دوسری طرف تھا۔ میں نے ایک کھڑکی سے کان لگایا تو دوسری طرف سے رب نواز کی آواز سن کر خود کو اچھلنے سے بہ مشکل روکا۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔

''ہاں میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں نہ'' وہ بول رہا تھا پھر دوسرے آدمی کی آواز آئی جو بے حد مدھم تھی۔ میں اس کے الفاظ سننے سے قاصر تھا۔ آواز بھی کچھ عجیب سی تھی۔ کچھ گنگناتی، کچھ لہراتی۔ رب نواز نے کہا ''جلدی کرو۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے...... ایک آدمی...... وہ ایک بھی کم خطرناک نہیں ہے، اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے اور کتے کی طرح میرے پیچھے پڑا ہے...... تم کیا کر رہے ہو...... پہلے بزدلوں کی طرح فوج سے بھاگ گئے......'' رب نواز چلانے لگا ''اور اب تم سے اتنا سا کام نہیں ہو رہا ہے...... دو دن ہو گئے تمہیں...... سرحد میرے باپ کی بھی نہیں ہے...... میں ہر صورت آج رات نکل جانا چاہتا ہوں...... بارودی سرنگیں......'' رب نواز نے ایک فحش گالی دے کر کہا ''تم کب آ رہے ہو...... دوپہر تک...... ہاں اس نے ہاشم رضا کو بھی مار دیا ہے اچھا کیا...... وہ ویسے ہی بیکار ثابت ہو رہا تھا...... بوجھ بن گیا تھا...... اسے لے جاتا تو کوئی دوسرا چھین لیتا...... تمہارے حکمران اتنے شریف ہیں...... بیٹوں کا ہمیں بھی تجربہ رہا ہے۔''

رب نواز کی یہ ساری گفتگو قسطوں میں ہو رہی تھی اور درمیان میں اس آدمی کی غیر واضح آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

وہ ریڈیو پر بات کر رہا تھا۔ فوج سے بھاگنے کی بات نے میرے کان کھڑے کر دیئے۔ یقیناً میجر شاہد تھا۔ وہی بھاگا تھا اور اسے بھی سرحد پار جانا تھا۔ مجھے ہاشم رضا کے بارے میں رب نواز کے تبصرے سے حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس کے لیے بے حد قیمتی تھا اور اس کے مرنے پر کتنی بے پروائی سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے بیکار ہی تھا۔ میجر شاہد بھی اس جگہ آ رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر ابھی میں رب نواز کا کام تمام کر دیتا تو میجر شاہد یہاں نہیں آتا اور شاید فرار ہو جاتا۔ ابھی تو وہ رب نواز کی وجہ سے یہاں آنے پر مجبور تھا۔ میں دوبارہ جھاڑیوں میں آ گیا۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ میرے زخم میں تکلیف پھر سے بڑھنے لگی تھی۔ میں نے دو گولیاں اور نگل لیں۔ رات کا کھایا پیا کب کا ہضم ہو چکا تھا اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر ابھی یہ قابلِ برداشت تھی۔ میں چار پانچ گھنٹے بہ آسانی گزار سکتا تھا۔ جھاڑیوں کے درمیان خاصی جگہ تھی۔ میں آرام سے یہاں رہ سکتا تھا لیکن معاً مجھے اس پہرے دار کا خیال آیا جسے میں بے ہوش کر کے چھوڑ آیا تھا۔ اس کے دریافت ہوتے ہی میری تلاش شروع ہو جاتی اور یہ ایسی جگہ تھی جہاں مجھے تلاش کر لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس صورت میں سب سے اچھی جگہ کوئی کیبن ہو سکتا تھا۔ میں باہر نکلا اور دوبارہ رب نواز والی بیرک کی طرف بڑھا۔

تلاش کے بعد مجھے ایک جھری مل گئی میں نے اندر جھانکا۔ یہ ایک خالی بیرک تھی۔ جہاں فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا اور مجھے کوئی شخص بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ممکنہ طور پر رب نواز اندر اکیلا ہی تھا۔ سنانے سے بھی یہ بات واضح تھی۔ میں تقریباً پندرہ بیس منٹ اندر کی سن گن لیتا رہا مگر کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا اور گھوم کر بیرک

کے دروازے پر آیا۔ میں نے دستک دی تو رب نواز نے اندر سے پوچھا ''کون ہے؟''

''میں ہوں جی۔'' میں نے آواز بدل کر کہا ''پری طرف کا نگران غائب ہے۔''

''کیا؟'' رب نواز نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف آیا اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، میں نے سب مشین گن اس کے سینے سے لگا دی۔ پہلے تو اس کی آنکھوں میں حیرت جیسے جم گئی اور پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں اندر داخل ہوا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر لیا۔ اس دوران میں میری نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نہیں ہٹی تھی۔ اس کے چہرے سے جیسے نفرت ٹپک رہی تھی۔ اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کاش میں نے تجھے بہت پہلے قتل کر دیا ہوتا۔''

''موت اپنے وقت سے پہلے جان کی خود حفاظت کرتی ہے۔'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا ''تم دونوں ہاتھ دیوار پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

مشین گن کے آگے بڑے بڑوں کی نہیں چلتی۔ رب نواز تو ویسے بھی بزدل آدمی تھا۔ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ ایک ریوالور اس کی جیب سے نکلا تھا اور ایک ننھا سا پستول اس کی شلوار کے نیفے سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا لیکن میں نے تفریحاً اسے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا ''کپڑے اتروا کر کیا کرو گے؟''

میں نے سب مشین گن کی نال اس کی کنپٹی پر ماری تو وہ چکرا کر گر گیا۔ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن اسے تارے ضرور نظر آ گئے تھے۔ بمشکل وہ دوبارہ اٹھا اور خاموشی سے کپڑے اتارنے لگا۔ اس جیسے ضمیر فروش اور وطن فروش کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اپنے مفاد کے لیے وہ کپڑے اتار کر بھرے بازار میں بھی دوڑ سکتا تھا۔ انڈر ویئر اتارتے ہوئے وہ جھجکا تھا لیکن جب میں نے مشین گن کو حرکت دی تو اس نے اسے بھی اتار پھینکا۔ مارے طیش کے اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا ''رب نواز کیا عبرت کا مقام ہے۔ ساری عمر دوسروں کا لباس اتروانے والا آج خود اپنے ہاتھوں ننگا ہونے پر مجبور ہو گیا ہے۔''

''تم...... تم اس وقت جو چاہو کر سکتے ہو اور جو چاہو کہہ سکتے ہو۔'' اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''ہاں۔'' میں نے اس کی تائید کی ''کیونکہ طاقت میرے ہاتھ میں ہے۔ اور میں تم سے جو چاہوں کروا سکتا ہوں۔ جیسے میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم یہاں چاروں ہاتھوں پر چلتے ہوئے آؤ میرا پاؤں چاٹو...... یہ دیکھو...... تمہاری بچھائی ایک مائن اور شکنجے نے میرے پاؤں کو زخمی کر دیا ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے مجھے نفرت سے جلتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ میں نے جیب سے زہریلی سوئی والا پستول نکالا ''اسے دیکھ رہے ہو رب نواز۔ یہ گولی والا پستول نہیں ہے۔ اس سے ایک زہریلی سوئی نکلتی ہے اور بندہ سیکنڈ سے بھی پہلے مر چکا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے ڈرانے کے لیے غلط بیانی کی۔

اس کے چہرے پر خوف نظر آیا ''تم بکواس کر رہے ہو۔ مجھے ڈرا رہے ہو۔''

''تم نے شاید پوٹاشیم سائنائیڈ کا نام نہیں سنا ہے۔ یہ اتنا مہلک زہر ہے کہ زبان پر رکھتے ہی آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آج تک اس کا ذائقہ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ اس پستول سے نکلنے والی سوئی سائنائیڈ میں بجھی ہوئی ہے۔''

میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا ''اگر مرنا نہیں چاہتے تو میرے حکم کی تعمیل کرو۔''

وہ بدستور اپنی جگہ رہا تو میں نے پستول کو یوں حرکت دی۔ جیسے فائر کرنے جا رہا ہوں۔ وہ جلدی سے بولا ''نہیں میں...... میں تمہارا حکم مان رہا ہوں۔'' میں فاتحانہ انداز میں مسکرا دیا۔

رب نواز بادلِ ناخواستہ چاروں ہاتھوں پیروں پر جھکا اور چلتے ہوئے میرے پاس آیا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے مسکراتے ہوئے پستول اس کی گردن سے لگا دیا۔ اس کا برہنہ بے ڈول جسم عجیب لگ رہا تھا۔ نہ جانے کس دل سے اس نے زبان نکال کر جوتوں پر سے میرے پاؤں چاٹے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ چاٹنے کے بجائے مجھے کاٹ بھی سکتا تھا۔ ذلت کی ایسی انتہا اس نے شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔

''کاش میرے پاس کوئی کیمرا ہوتا تو میں تمہاری یہ تصویر محفوظ کر لیتا۔ دورِ جدید کا فرعون اپنے مرتبے سے گر کر کسی پالتو کتے کی سطح پر آ گیا ہے۔'' میں نے طنز کیا ''بس کرو اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاؤ۔''

رب نواز نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہزاروں مظلوموں کو خون کے آنسو رلانے والا ذرا سی ذلت برداشت نہیں کر سکا تھا۔ جو دوسروں کو انتہائی حد تک ذلیل

کرنے کا شوقین تھا۔ آج اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھ کر خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ میں نے بیرک کا جائزہ لیا۔ ایک طرف میز پر ناؤ نوش کے لوازمات سجے تھے۔ ان کے ساتھ ہی سادہ پانی بھی تھا۔ میں نے چند گھونٹ پانی لیا۔ اتنا کہ بس میری پیاس بجھ گئی۔ ورنہ زیادہ پانی پینے کے بعد اسے خارج کرنے کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا اور فی الوقت میں کہیں جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا "شاہ عالم تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو۔" اس نے اچانک کہا "مجھے مار کر چلے جاؤ۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے سفاکی سے کہا "میں تمہیں آسان موت نہیں دے سکتا رب نواز۔ ورنہ یہ کام تو میرے لیے کبھی بھی مشکل نہیں رہا ہے۔"

"پھر تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو۔ اگر میرے ساتھیوں کو پتا چل گیا تو تم بچ نہیں سکو گے۔ اس باغ میں تمہاری لاش کہیں دبا دی جائے گی۔"

"مرنے کے بعد مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری لاش کہاں دبائی جائے گی۔ رب نواز تمہارے ساتھیوں کو بتائے گا کون..... کیا تم..... نہیں جو بھی آئے گا تم اسے دفع ہو جانے کا حکم دو گے سوائے میجر شاہد کے۔ مجھے اسی کا انتظار ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت کے آثار نظر آئے تھے "تمہیں کیسے پتا چلا..... اچھا..... اچھا تم نے میری بات سن لی ہوگی۔"

"وہ ریڈیو کہاں ہے جس پر تم بات کر رہے تھے؟"

اس نے میز پر رکھے ایک ریموٹ کنٹرول نما آلے کی طرف اشارہ کیا "یہ ہے وہ ریڈیو۔"

میں نے اس کا معائنہ کیا۔ یہ ایک ذرا طاقت ور ایف ایم موڈ پر کام کرتے والا ریڈیو تھا لیکن اس قسم کے مواصلاتی آلات زیادہ فاصلے پر کام نہیں کرتے ہیں۔ گویا میجر شاہد کہیں پاس ہی تھا "میجر شاہد کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم!" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

میں نے اچانک ریڈیو اس کے منہ پر کھینچ کر مارا۔ بچنے کی کوشش کے باوجود آلہ اس کے منہ پر لگا اور زمین پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ اسے خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس نے ہونٹ سے خون صاف کیا "رب نواز مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ میں صرف وقت گزاری کے لیے پوچھ رہا ہوں ورنہ مجھے خاص فرق نہیں پڑتا کہ میجر شاہد کہاں ہے۔ آنا تو اسے یہیں ہے نا۔"

اس نے آہستہ سے جواب دیا "وہ..... وہ ایک مقامی اسمگلر کے پاس گیا ہے جو لوگوں کو سرحد بھی عبور کراتا ہے۔"

"حیرت کی بات ہے، را کے ایک ایجنٹ کو سرحد عبور کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔" میں نے طنز کیا "وہ اب دوسروں کے سہارے کا محتاج ہے۔"

"آج کل ہماری طرف سے سرحد کی نگرانی سخت ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے وہ مقامی بندے کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہے۔" رب نواز نے جواب دیا۔

میں سکون سے کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس کے علاوہ وہاں پر ایک بستر اور ایک میز تھی۔ گویا یہ جگہ ایک عارضی ٹھکانے کے طور پر استعمال ہو رہی تھی مگر اس کی حفاظت اور کیموفلاج کرنے کے لیے نیا شان دار طریقہ استعمال کیا گیا تھا "یہ جگہ تمہارے مستقل ٹھکانوں میں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں کل اس جگہ پہلی بار آیا تھا۔ یہ میجر شاہد....."

"اس خبیث کو اس نام سے مت پکارو۔" میں نے اسے ٹوک دیا "اس کا کوئی اور نام بھی ہوگا۔"

"ہاں ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔" رب نواز کے لہجے میں تلخی تھی "اسے اپنے بارے میں زیادہ ہی خوش فہمی ہے۔"

"ہر ظالم کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ اسی طرح ظلم کرتا رہے گا اور اس کا حساب لینے والا کوئی نہیں ہوگا جیسے کہ تم..... تم نے نام نہیں بتایا۔"

"اشوک..... اشوک کمار..... ایک عظیم فنکار کے نام پر اس کا نام ہے۔"

"وہ ایک فنکار تھا جو اپنے فن سے لوگوں کو محظوظ کرتا تھا۔ یہ ایک دہشت گرد ہے۔ دونوں کو مت ملاؤ۔"

"کیا میں اپنے کپڑے پہن سکتا ہوں؟" اس نے ملتجی انداز میں کہا۔

"اگرچہ جانوروں کو کپڑوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے لیکن تم مجھے بھی اس طرح اچھے نہیں لگ رہے ہو اس لیے کپڑے پہن لو۔" میں نے اجازت دے دی اور اس نے پھرتی سے اپنے کپڑے پہن لیے۔

"یہ بتاؤ کہ سرحد پار کر کے تم کہاں جاتے؟"

"میرے پاس برٹش پاسپورٹ ہے، میں کہیں پر بھی جا سکتا تھا۔" اس نے انکشاف کیا۔

"جہنم جانے کے لیے تمہیں کسی پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے

کہا۔ میز پر ایک لفافہ رکھا تھا۔ میں نے پہلے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اب اسے دیکھا تو اس میں نان کباب دیکھ کر مجھے وہی خوشی ہوئی جو دو دن کے بھوکے کو بریانی اور قورمے سے سجے دستر خوان کو دیکھ کر ہو سکتی ہے۔ نان کباب باسی اور ٹھنڈے تھے لیکن میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ان سے پیٹ بھرا۔

"مجھے دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے کہ بھنے تیتر بٹیر کھانے والے کو اب نان کباب پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے اور بان کی چارپائی پر سونا پڑ رہا ہے۔ کل اپنی زمین پر راج کرنے والا بھارتی آقاؤں کے جوتے چاٹ رہا ہوگا۔ بشرطیکہ زندہ رہا۔"

"تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔" رب نواز نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ آخری نوالہ کھا کر میں نے ڈکار لی۔

"رب نواز اب تم خاموشی سے کرسی لے کر بیٹھ جاؤ۔"

میں نے کرسی اس کی طرف کھسکا دی۔ بارہ بجنے والے تھے اور میرے خیال میں اشوک کمار کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہاں اور کتنے آدمی ہیں؟"

"دو ہیں۔" رب نواز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "کیا میں شراب لے سکتا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تم میرے سامنے یہ حرام شے نہیں پی سکتے۔"

"ایک زمانے میں تم بھی اس کے رسیا تھے۔ شاہ عالم....." اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں چاہوں تو خود پیوں اور تمہیں چھونے بھی نہ دوں۔ اس وقت طاقت کا توازن میرے حق میں ہے۔" میں نے پستول لہرایا "اس لیے میں جو کہہ رہا ہوں تمہیں وہی کرنا پڑے گا۔ اب اپنی زبان بند رکھنا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور خود پلنگ پر آ بیٹھا تھا۔ وہاں ایسی کوئی شے نہیں تھی جس سے میں اپنا زخم صاف کر سکتا۔ اس لیے میں نے دل کڑا کر کے شراب سے پاؤں کا زخم دھویا۔ اس میں مرچیں سی لگی تھیں لیکن سیپٹک کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اس کے بعد پانی سے پاؤں دھو کر میں نے بستر کی چادر پھاڑ کر زخم پر پٹی اور اوپر سے دوبارہ جوتا پہن لیا۔ میں بستر پر ایسی جگہ بیٹھ گیا کہ باہر سے آنے والے کسی فرد کو آسانی سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ویسے بھی کھڑکیاں دروازے بند تھے اس کے باوجود میں محتاط تھا۔ آنے والا را کا ایک گھاگ ایجنٹ تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر سکتی تھی۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ باغ کے دونوں نگران مختلف سمتوں میں پہرا دیتے تھے اس لیے ابھی تک بے ہوش ہونے والے پہرے دار کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

"شاہ عالم..... تمہارے لیے بہتر یہی ہے مجھ سے سمجھوتا کر لو۔" رب نواز نے اچانک کہا۔

"کیسا سمجھوتا؟" میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر امید سی لہرائی "سنو میرے پاس پاکستان کے بینکوں میں بے حساب پیسہ ہے۔ کم سے کم ایک ارب روپیہ ہے۔ میں یہ سب تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

میں دل میں ہنسا "یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"میں تمہیں ان اکاؤنٹس کے بلینک چیک دے دوں گا۔ تم ان سے رقم نکلوا لینا۔"

"رب نواز کیا میں تم کو شکل سے الو نظر آتا ہوں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا میں تمہیں چیک لے کر جانے دوں گا۔"

"یہ تصدیق شدہ چیک ہیں۔ تم انہیں آسانی سے کیش کرا سکتے ہو۔"

"فرض کرو میں چیک لے کر بھی تمہیں مار دوں تو؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" اس نے یقین سے کہا "میں نے تمہیں وعدے کا پابند پایا ہے۔"

میں اٹھ کر ٹہلتا ہوا اس کے پاس گیا اور اچانک پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر کرسی سے گرنے سے بچایا اور اسے سیدھا بٹھاتے ہوئے اس کے کان میں کہا "یہ ہے میرا جواب!"

میں واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رب نواز دس بارہ منٹ میں صحیح ہو گیا۔ اس نے اپنا سر ٹٹولا اور مجھے بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا "رب نواز۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آج تم مجھے پوری دنیا کی دولت دینے کی بات کرو تب بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتے۔ ہاں تقدیر کی طرف سے تمہاری قضا کا فیصلہ نہ ہوا ہو تو الگ بات ہے۔"

"شاہ عالم!" اس نے اپنا سر دباتے ہوئے کہا "تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اگر میرا داؤ چلا تو میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔"

"میں تم سے رعایت کی توقع رکھوں گا بھی نہیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "اس سے بہتر ہے میں شیطان سے

انسانیت کی توقع کرلوں۔"

ایک بجنے والا تھا اور ابھی تک اشوک کمار عرف میجر شاہد کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ عیار آدمی نہ جانے کہاں تھا۔ ایسا نہ ہو کہ اسے شک ہوجائے۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ رب نواز کی پروا کیے بغیر اس بیرک کو باہر سے بند کرکے آگ لگا سکتا تھا لیکن اس نے آگ نہیں لگائی، وہ کیا جو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں مسلسل بھاگ دوڑ پھر گولی کے زخم نے میرے جسم پر اثر ڈالا تھا۔ میں شدت سے آرام کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔ بستر کی نرمی نے مجھ پر اثر ڈالا تھا اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ کب میرے اعصاب پر بے حسی سی طاری ہوگئی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو یک لخت انکشاف ہوا کہ میرا جسم مفلوج ہوگیا تھا۔ ایسا ہی ایک تجربہ مجھے پہلے بھی ہوچکا تھا۔ جب اشوک کمار نے مجھے دھوکے سے کافی میں کوئی دوا دی تھی۔ جس کے اثر سے میرا جسم بے حس ہوگیا تھا لیکن حواس جاگتے رہے تھے۔ اب بھی ایسا ہوا تھا لیکن میں نے تو سوائے پانی اور نان کباب کے کچھ نہیں کھایا پیا تھا اور انہیں بھی کھائے خاصی دیر ہوچکی تھی۔ میں نے کوشش کرکے رب نواز کی طرف دیکھا کیا اسے میرے مفلوج ہونے کا احساس ہوگیا تھا لیکن وہ کرسی پر اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یک لخت مجھ پر انکشاف ہوا کہ رب نواز کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ وہ بھی مفلوج تھا اس کا ایک بازو کرسی کے ساتھ جھول رہا تھا۔ اگر وہ ذرا سا ترچھا نہ بیٹھا ہوتا تو کب کا زمین پر گر چکا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی دروازے پر کھٹر پٹر ہوئی۔ کوئی باہر تھا۔ اس نے اندر ہمیں مفلوج کردیا تھا اس کا ایک ہی طریقہ تھا۔ گیس...... یہ کوئی بے رنگ اور بے بو گیس تھی جس نے آناً فاناً ہمارے اعصاب مفلوج کردیے تھے۔ دروازہ جب نہیں کھلا تو باہر موجود شخص نے فائر کرکے کنڈی والا حصہ ہی توڑ دیا۔ میں نے اشوک کمار کو مسکراتے ہوئے اندر آتے دیکھا۔

"ہاؤ آر یو شاہ عالم!" اس نے کہا اور رب نواز کے پاس گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور اس کا ڈھکن کھول کر رب نواز کے نتھنوں سے لگادیا "سوری ملک۔" پھر شیشی واپس جیب میں رکھ لی۔ میں نے رب نواز کے سر کو جنبش کرتے دیکھا۔ گویا یہ گیس کا توڑ تھا پھر اشوک کمار میری طرف آیا۔ اس نے میری آنکھیں دیکھیں اور مطمئن ہوگیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں دبا پستول لیا اور اس کا معائنہ کرکے بے پروائی سے اسے ایک طرف ڈال دیا۔

"غالباً تم سوچ رہے ہوگے کہ مجھے کیسے پتا چلا۔" اس نے کہا "جب میں نے سامنے والے پہرے دار کو غائب پایا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا اور پھر میں نے آکر کیبن میں دیکھا۔ تم نظر نہیں آئے لیکن رب نواز کے انداز سے مجھے پتا لگ گیا تھا۔ اس کے بعد سارا کام اس نے کردیا۔" اس نے مجھے ایک چھ انچ لمبا سلینڈر دکھایا۔ "اس میں وہی گیس ہے۔ جو میں نے تمہیں دوا کی صورت میں دی تھی۔ ہوا میں اس کی معمولی سی مقدار بھی آدمی پر اثر کرجاتی ہے۔"

بازی نے ایک بار پھر پلٹا کھایا تھا اور میں بظاہر فاتح ہوتے ہوئے بھی مفتوح ہوگیا تھا۔ میں دو کے چکر میں ایک سے بھی گیا تھا بلکہ خود میری زندگی اب ان کی مٹھی میں آگئی تھی۔ اشوک نے ایک ہتھکڑی برآمد کرکے اسے میرے ہاتھ پیچھے کرکے لگادیا۔ اس دوران میں رب نواز ٹھیک ہوچکا تھا۔ گیس جتنی زود اثر تھی اس کا توڑ بھی اتنا ہی موثر تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا، اس نے بے دریغ مجھے مکوں سے نوازا ساتھ ہی اس کی زبان غلاظت اگل رہی تھی۔ گیس کے اثر سے میرے اعضا بے حس ہوگئے تھے اس لیے مجھے پتا بھی نہیں چلا اس مار پیٹ کا۔ اشوک آرام سے کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ رب نواز نے میرا سر بالوں سے پکڑ کر وحشیانہ انداز میں چارپائی کی پٹی سے ٹکرایا تو میری آنکھوں تلے اندھیرا سا آگیا۔ جب حواس ذرا بحال ہوئے تو اشوک اسے روک رہا تھا۔

"اس پر بھڑاس نکالنے کے بجائے اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھو۔ اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو تم نے مجھے بھی مروا دیا تھا۔ یہ یہاں تک آیا کیسے؟"

"مجھے کیا پتا۔" رب نواز ڈھٹائی سے مکر گیا "میں نے اپنے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔"

"مہتا کہاں ہے اور وہاں کیا ہوا تھا؟"

"یہ حرامی پہلے سے مورچا لگائے بیٹھے تھے۔" رب نواز نے شعلہ فشاں نظروں سے میری طرف دیکھا "پروفیسر اور وہاں موجود افراد کو پہلے ہی مار چکے تھے پھر جب ہم ریسٹ ہاؤس میں محصور ہوگئے تو انہوں نے بموں سے حملہ کیا، اس میں مہتا مارا گیا۔"

"مہتا مارا گیا۔" اس نے چلا کر کہا "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

"مجھے ہوش نہیں تھا۔" رب نواز جھنجلائے انداز میں بولا۔

"لعنت ہو، پتا ہے اسے ہی ہمارے یہاں سے نکلنے کے پلان کا علم تھا وہی آگے ہماری رہنمائی کرتا۔"

"تم کس قسم کے ایجنٹ ہو، اپنے ہی ملک کی سرحد عبور کرنے کے لیے دوسروں کا سہارا تلاش کرتے پھر رہے ہو۔"

رب نواز کے لہجے میں طنز تھا۔

"بکومت! تم کو ان معاملات کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ خفیہ ایجنٹس اپنے ملک میں بھی چھپتے ہیں۔ یہ بی ایس ایف والے اعلیٰ درجے کے حرامی ہیں۔ میں ان پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ ان سے را کی ٹسل چل رہی ہے اور پچھلے ایک سال کے دوران میں ہمارے چار ایجنٹس سرحد پار کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں۔"

"میرے ساتھ صرف بھگت آیا تھا۔ نرمل بھی مارا گیا۔"

"لعنت ہو۔" اس نے ہاتھ پر مکا مارا "تمہارے چکر میں ہمارے قیمتی آدمی مارے جارہے ہیں۔"

"اتنے ہی قیمتی ہیں تو انہیں گھر میں رکھنا تھا۔" رب نواز کے لہجے میں طنز تھا "یہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اشوک نے اچانک رب نواز کا گلا دبوچ لیا "مجھ سے بات کرتے وقت ذرا ہوش میں رہا کرو۔ میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں تو تمہارے اپنے ملک والے تمہیں کتے کی موت ماردیں۔"

تکلیف کے باوجود رب نواز بولنے سے باز نہیں آیا "کیا مجھے چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ میں تمہارے ملک کا ساتھی ہوں اور تم محض ایک نوکر ہو۔ اپنی حکومت کے ملازم...... اور بس۔"

میں اشوک کمار کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا جو اس ذلت پر سیاہ پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ رب نواز کی گردن ہی توڑ دے گا لیکن پھر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے رب نواز کی گردن چھوڑ دی۔ وہ کھانستے ہوئے اپنی گردن مسلنے لگا تھا۔ اشوک بے چین جانور کی طرح ٹہلنے لگا پھر اس کی نظر ٹوٹے ریڈیو پر پڑی۔

"اسے کیا ہوا؟"

"اس نے توڑ دیا۔" رب نواز نے میری طرف اشارہ کیا۔

رب نواز نے بہت قوت سے میرا سر چارپائی کی پٹی سے مارا تھا اور شاید میرا سر پھٹ گیا تھا۔ حالانکہ مجھے درد اور خون کی چپچپاہٹ محسوس نہیں ہورہی تھی۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا کہ سر پھٹ گیا ہو۔ اشوک کمار نے اپنی جیب سے دیا سی ایک ریڈیو نکالا اور اس پر کسی کو کال کرنے لگا "اٹ از فالکن...... اٹ از فالکن......" پھر اسے دوسری طرف سے جواب ملا "ہمیں یہاں سے فوری طور پر نکالنے کی کوشش کرو۔ حالات خراب ہوتے جارہے ہیں۔ مہتا اور نرمل بھی مارے جاچکے ہیں۔ ہاں میں باقی کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ وہ سب قیمتی لوگ ہیں۔ جو کرنا ہے اب تم نے ہی کرنا ہے۔ مجھے دو گھنٹے کے اندر مطلع کرو۔ آج رات ہمیں لازماً نکل جانا ہے۔" اس نے ریڈیو بند کرکے جیب میں رکھ لیا اور میرے سوئی والے پستول کا معائنہ کرنے لگا۔

"میں نے اسے دیکھا تو ہے لیکن ہاتھ میں پہلی بار لے رہا ہوں۔" اس نے میری طرف دیکھا "اس تحفے کے لیے تمہارا شکریہ۔" پھر وہ رب نواز کی طرف گھوما "کیا خیال ہے جاتے ہوئے اسے لٹکا نہ جائیں۔ مجھے ایک طریقہ آتا ہے آدمی کی جان دو تین گھنٹے سے پہلے نہیں نکلتی ہے۔"

رب نواز اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اشوک کی بات پر اس نے کہا "میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔ ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

"اس میں خطرہ ہے۔" اشوک کے لہجے میں بدمزگی تھی "میرے تو خیال میں اس کا قصہ ابھی پاک کردیتے ہیں۔ پستول اٹھا کر اسے گولی ماردو۔ اگر تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے ہو تو اس کے جوڑوں پر فائر کردو اور اگر اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتے ہو تو اس کا گلا گھونٹ دو۔" اشوک اتنے سکون سے کہہ رہا تھا جیسے میرے قتل کی تجویزیں نہ پیش کررہا ہو بلکہ کوئی معمول کی بات کررہا ہو۔ میں اسے دل ہی دل میں گالیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

"ہم اسے سرحد پار لے جاکر واپس پاکستانی علاقے کی طرف بھیجیں گے۔" رب نواز نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ درست ہے۔ اتنی دور اسے اس لیے لے جارہے ہو کہ وہاں سے واپس بھیج دو۔"

رب نواز کی مسکراہٹ میں خباثت بھی شامل ہوگئی "میں اسے اس میدان سے واپس بھیجوں گا جہاں پر بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔"

"یہ بچ بھی سکتا ہے۔"

"یہ اس کی قسمت۔ میں اسے ایک منٹ کی مہلت دوں گا کہ یہ رائفل کی مار سے باہر نکل جائے۔ ایک منٹ بعد میں اس پر فائر کروں گا۔ تم جانتے ہو میرا نشانہ کتنا اچھا ہے۔"

اشوک کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی "تجویز تو اچھی ہے تمہاری۔ وہ میدان پورا ہی بارودی سرنگوں سے بھرا ہے اور کوئی اسے صحیح سلامت عبور نہیں کرسکتا ہے۔ کسی بھی سرنگ پر پاؤں پڑتے ہی اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے اور اس کے گوشت سے چیل کوے دعوت اڑائیں گے۔"

"لیکن ہم نکلیں گے کب؟" رب نواز کے لہجے میں بے چینی تھی "تم نہیں جانتے اس زمین پر ایک ایک لمحہ مجھ پر کس

قدر بھاری گزر رہا ہے۔"

"اپنی ہی سرزمین کے بارے میں یہ خیال ہے۔" اشوک کے لہجے میں طنز تھا۔

"طنز کرنے کی کوشش نہ کرو۔" رب نواز کے لہجے میں ناگواری تھی "مجھے دوسروں کی پروا نہیں ہے لیکن یہ اور اس کے ساتھی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" اس نے کھا جانے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ اب کیچوا بن چکا ہے۔"

"یہ کیچوا۔" اس بار رب نواز کے لہجے میں طنز تھا "ایک بار تمہاری گرفت سے نکل چکا ہے اور اس نے تمہارے اہم ترین اڈے کی ایسی کم تیسی کر دی تھی۔"

"ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی یہ میری تحویل میں نہیں تھا۔" اشوک نے ڈھٹائی سے کہا "لیکن اتفاق بار بار نہیں ہوا کرتے ہیں۔"

رب نواز نے نفی میں سر ہلایا "تم بدستور اس کے بارے میں خوش فہمی کا شکار نظر آ رہے ہو۔ یہ بہت ہی مکار اور چالاک آدمی ہے۔ ذرا تمہاری نظر چوکی اور اس نے کام دکھا دیا ہے۔"

اشوک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا اور مجھے خوف تھا کہ کہیں رب نواز کی باتوں کی وجہ سے وہ اپنا فیصلہ بدل کر مجھے فوری طور پر جاں بحق کرنے پر نہ تل جائے۔ میں اس وقت بے بسی اور بے دست و پائی کی جس کیفیت میں تھا۔ کسی بکری کے بچے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو را کا پیشہ ور اور گھاگ ایجنٹ تھا جو نہ جانے کتنے اقسام کے ہتھیاروں سے ہمہ وقت مسلح رہتا تھا۔ جیسے کہ اس کے پاس یہ خطرناک گیس تھی اور اس کا توڑ بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مجھے بے بس بنا کر اپنا قیدی بنا لیا تھا۔

"اس گیس کا اثر کتنی دیر رہے گا؟" رب نواز نے میری طرف دیکھا۔

"کم سے کم دس گھنٹے۔" اشوک کمار نے جواب دیا "میں نے کہا نا تم اس کی فکر مت کرو۔"

رب نواز نے کہا "تم اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ یہ آدمی نہیں، شیطان ہے۔" پھر وہ میرے پاس آیا "شاہ عالم جب تیرے جسم سے تیری روح نکل جائے گی تب مجھے چین آئے گا اور وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے پھر جیسے ہی حالات معمول پر آئے میں واپس آؤں گا اور تجھ سے متعلق ایک ایک فرد کو چن چن کر کتے کی موت ماروں گا اور ان دونوں کنجریوں کو بیچ بازار میں ....." اس کی گفتگو اب ناقابلِ اشاعت مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ چندا اور نیلم کا کیا حشر کرے گا۔ میں مجبور تھا، کان بھی نہیں بند کر سکتا تھا۔ رب نواز کا منہ تو بالکل نہیں بند کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس کی ساری غلاظت کان کے راستے اپنے وجود میں اترتے دیکھتا رہا۔ آخر میں رب نواز اشتعال کے عالم میں چلانے لگا۔ اس نے دل نواز کا حوالہ دیا۔ وہ اس کی موت نہیں بھولا تھا۔ بکواس کے دوران میں اس نے مجھے مارا بھی۔ آخر اشوک اسے کھینچ کر لے گیا "خود پر قابو رکھو۔ تمہارے جیسے آدمی پر یہ جذباتیت اچھی نہیں لگتی۔"

"میں اس کتے کا خون پی جانا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں اس کا موقع ملے گا۔" اشوک نے اسے تسلی دی اور پھر اسے کیبن سے لے گیا۔ اب میں وہاں اکیلا تھا۔ اشوک کو اتنا اعتماد تھا کہ وہ جاتے ہوئے میری مشین گن اور سیون ایم ایم رائفل وہاں ہی چھوڑ گیا تھا۔ حد یہ کہ وہ شیشی بھی میرے سرہانے رکھ گیا تھا۔ جس میں گیس کا توڑ تھا۔ یہ مجھ سے دس انچ کے فاصلے پر میز کے کنارے پر ہی رکھی تھی۔ اشوک کو معلوم تھا کہ میں انگلی ہلانے پر قادر نہیں ہوں۔ اس لیے ان سب چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ مجھے مفلوج بنے پڑے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی چھانے لگی تھی۔ باہر پرندوں کا شور بتا رہا تھا کہ سورج غروب ہو رہا ہے۔

شاید وہ سرحد عبور کرنے کے انتظامات کرنے گئے تھے۔ میرے بارے میں رب نواز کا منصوبہ خوفناک تھا لیکن اس کی وجہ سے مجھے مہلت مل گئی تھی۔ کمرے میں کوئی چیز روشن نہیں تھی اس لیے اندر جلدی تاریکی چھا گئی تھی۔ کچھ رخنوں سے معمولی سی روشنی آ رہی تھی۔ اچانک مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا کوئی اندر تھا۔ میں اس زاویے سے پڑا تھا کہ میرا منہ کمرے کے وسط کی طرف تھا مگر دوسری ہستی مجھے نظر نہیں آ رہی تھی اور پھر معاً ایک بلی اچھل کر چارپائی پر چڑھی۔ وہ میرے جسم سے رگڑ کھاتی میز پر چڑھ گئی۔ غالباً اسے کھانے پینے کی کسی شے کی تلاش تھی اس کے انداز اور بے باکی سے ظاہر تھا کہ وہ پہلے بھی آتی رہی تھی۔ میں نے حسرت سے اس سیاہ و سفید بلی کو دیکھا۔ وہ کتنی آزادی سے گھوم پھر رہی تھی اور میں یوں بندھا پڑا تھا۔ بے بس تھا۔

بلی نے چیزوں کو ادھر ادھر کیا اور پھر اس کی دم کی رگڑ سے وہ شیشی چارپائی پر گر گئی۔ جس میں گیس کا توڑ تھا۔ شیشی عین میرے چہرے کے سامنے گری تھی۔ میرے

منہ سے بمشکل دو انچ کے فاصلے پر تھی۔ اگر شیشی کھلی ہوتی تو اس کے اندر موجود دوائی جو گیس کا اثر زائل کر سکتی تھی لیکن میں اتنا بے بس تھا کہ بالکل منہ کے پاس پڑی اس شیشی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میری حالت صحرا میں پیاسے پھرنے والے ایسے مسافر کی سی تھی جس کے سامنے چشمہ آئے اور وہ اس سے پانی پینے کے قابل نہ ہو۔

بلی آرام سے میز سے کودی اور دم لہراتی میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ وہ جس راستے سے آئی تھی اسی سے واپس چلی گئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں شیشی کی چمک محسوس کی۔ میں نے سر ہلانے کی کوشش کی لیکن سر میں معمولی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔ میں نے کوشش جاری رکھی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ تاریکی پوری طرح چھا گئی تھی۔ معاً میں نے اپنے سر کو ہلتے محسوس کیا، بہت معمولی سا۔ یک لخت میرے دل کی رفتار تیز ہو گئی۔ اشوک نے کتنے دعوے سے کہا تھا کہ دس گھنٹے سے پہلے میں اپنے جسم کو ہلا بھی نہیں سکوں گا لیکن اس سے پہلے ہی مجھے اپنے سر کو ہلانے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ ابھی دوا کے اثر کے خاتمے میں چار گھنٹے باقی تھے۔ مسلسل جدوجہد کے بعد میں سر کو اس حد تک ہلانے میں کامیاب رہا کہ میرا منہ شیشی سے جا ٹکا تھا پھر میں نے لب کھول کر اس کا ڈھکن پکڑنے کی کوشش کی۔ آغاز میں تو مجھ سے نہیں پکڑا جا سکا مگر لگاتار جدوجہد کے بعد میں نے اس کا ڈھکن دانتوں سے پکڑ لیا۔ یہ دبا کر بند ہونے والا ڈھکن تھا۔ میں نے دانتوں سے اسے دبا کر کھولنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس حالت میں جبکہ میرے لیے ذرا سی طاقت استعمال کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ چھوٹا سا ڈھکن کھولنا بھی کوہ ہمالیہ سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ میرے دانتوں کی گرفت نہ ہونے کے برابر تھی مگر تھوڑا تھوڑا کر کے میں اسے ڈھیلا کرتا رہا تھا۔ آخر کٹ کی آواز آئی تو مارے خوشی سے میرا دل اچھل سا گیا تھا۔ ڈھکن کھل گیا تھا۔ میں نے اسے شیشی سے الگ کر دیا اور شیشی بستر پر گر گئی۔ اتنی سی کوشش نے جیسے میری ساری توانائیاں سلب کر لی تھیں اور سانس ہموار انداز میں چل رہی تھی۔ اس لیے تھکن اترنے میں ذرا سی دیر لگی تھی۔ میں نے کوشش کر کے ناک کو شیشی کے پاس کرنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے مجھے باہر کسی کے بولنے کی آواز آئی۔

"میرے خدا!" میں نے سوچا "کامیابی کے اتنے نزدیک آ کر مجھے ناکام نہ بنانا۔"

آواز سے لگ رہا تھا کہ بولنے والا اسی کیبن کی طرف آ رہا ہے۔ میں نے کوشش تیز کر دی۔ میری ناک شیشی سے ٹکرائی تھی مگر یہ اس کے پیندے والا حصہ تھا۔ میں نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ ناک سے اس قسم کا کوئی کام لینا کس قدر مشکل ہے۔ شیشی تھوڑی تھوڑی کر کے رخ بدل رہی تھی۔ بولنے والا نزدیک آ گیا تھا۔ شاید کیبن کے دروازے پر اور کسی لمحے بھی دروازہ کھول کر اندر آ سکتا تھا۔ آواز سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون ہے۔ رب نواز یا اشوک بھی ہو سکتا تھا اور ان کا کوئی چیلا بھی۔ بالآخر میں نے شیشی کا رخ اپنی ناک کی طرف کر لیا۔ پہلے تو مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ ایک عجیب سی بو دماغ پر چڑھتی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے میری سانس کی رفتار تیز ہوئی یعنی مجھے اپنے پھیپھڑوں پر قابو حاصل ہو رہا تھا۔ سانس کی رفتار بڑھنے سے دوا کی بو بھی زیادہ تیزی سے میرے دماغ تک پہنچنے لگی تھی۔

یوں لگا جیسے کسی حبس سے پُر کمرے میں تازہ ہوا کا جھونکا آہستہ آہستہ آ رہا ہو۔ میرے جسم کے بند کھلنے لگے تھے۔ بے حسی ختم ہو رہی تھی۔ بولنے والا ابھی تک اندر نہیں آیا تھا پھر میں نے اشوک کی آواز سنی "اس کو بھی لے کر جانا ہے۔"

"بہت مشکل ہے۔ ان دنوں علاقے کی سخت نگرانی ہو رہی ہے اور بندہ خود سے چل بھی نہیں سکتا۔"

"تمہیں پیسے کس بات کے دیئے جا رہے ہیں۔" اشوک نے برہمی سے کہا "اسے لے جانا لازمی ہے بس اسے سرحد کے پار تک پہنچا دو اس کے بعد تمہاری ذمے داری ختم۔"

"اس کے الگ سے دس ہزار ہوں گے۔" آنے والا اسمگلر بھی پکا کاروباری تھا۔

"اوہ یار لے لینا۔" میں نے رب نواز کی آواز سنی پھر اس نے اشوک کمار سے کہا "اتنا اوکھا نہ ہو بعد میں اسے بھی تسلی دے دیں گے۔" اس نے لفظ تسلی پر زور دیا تو مجھے لگا کہ اسمگلر نے اپنی موت پر دستخط کر دیئے ہیں اسے زندہ واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔ رب نواز جیسے لوگ خود کو بلیک میل کرنے والے کو آسانی سے معاف نہیں کرتے ہیں۔

اس وقت میں دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ میرا جسم اپنی توانائی اور حرکت واپس حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا تو میرا ذہن اشوک کمار، رب نواز اور اس شخص کی باتوں میں لگا تھا جو انہیں سرحد عبور کرانے کے لیے آیا تھا۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو میرا دل جیسے ڈوب گیا۔ ابھی میں حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا اور جب اشوک کمار اندر آ کر بستر پر پڑی کھلی شیشی کو دیکھتا تو کھٹک جاتا اور مجھے دوبارہ وہی بے حس کرنے والی دوا دے دیتا۔ یہ بات طے تھی کہ وہ مجھے

سرحد تک بے بس ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اشوک کے اندر آنے سے پہلے میں نے سر اور جسم کو سابقہ پوزیشن میں کرلیا تھا۔ اس نے اندر آ کر لائٹر جلایا اور وہاں موجود کیروسین لیمپ کو روشن کرنا چاہا پھر جھلائے انداز میں بولا۔

''یہ کیا۔ اس میں تیل ہی نہیں ہے۔''

''مجھے کیا پتا۔'' رب نواز نے بے پروائی سے کہا ''کل رات تک تو تھا۔''

اتنے میں ایک تیسرا فرد سامنے آیا۔ لائٹر کی مدھم سی روشنی میں اس نے میرا معائنہ کیا اور پلٹ کر اشوک کمار سے کہا۔

''یہ تو ہوش میں ہے۔''

''ہاں ہوش میں تو ہے لیکن اپنی مرضی سے انگلی بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس وقت یہ کیچوے کی طرح بے بس ہے۔'' اشوک کے لہجے میں غرور تھا ''اسے ایسے ہی لے جانا ہے۔''

''اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہیں۔'' وہ بولا۔

''اسے کھول دیتے ہیں۔'' اشوک نے کہا اور چابی اس کی طرف اچھال دی ''بس جلدی کرو وقت کم ہے۔ ہمیں نصف رات سے پہلے سرحد عبور کرنا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے چابی سے میری ہتھکڑی کھولی۔ نہ جانے کیوں اشوک نے بے بس کرنے کے بعد بھی مجھے ہتھکڑی پہنا دی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر وہ مجھ سے خوف زدہ تھا۔ ہتھکڑی کھول کر اس نے آٹے کی بوری کی طرح مجھے اپنے کندھے پر لاد لیا تھا۔ میرا وزن کسی طرح ایک سو اسی پونڈز سے کم نہیں تھا اور وہ جسامت میں خاص نہیں لگتا تھا لیکن اس نے جس طرح آسانی سے مجھے اٹھالیا تھا، اس سے ظاہر تھا اس کے جسم میں بہت جان ہے۔ اشوک کمار باہر نکلا، اس کے پیچھے رب نواز اور سب سے آخر میں مجھے اٹھائے ہوئے وہ شخص تھا۔ اشوک کے پاس میرا پستول تھا اور رب نواز بھی یقینی طور پر مسلح تھا۔ یہ شخص جس نے مجھے اٹھایا تھا۔ جرائم پیشہ تھا اور اس کے پاس کسی ہتھیار کی موجودگی عین ممکن تھی۔ میرے ہاتھ اس کے پہلوؤں میں جھول رہے تھے۔ بظاہر بے اختیار لیکن درحقیقت جان بوجھ کر میں اس کے پہلوؤں پر ہاتھ مارنے لگا۔ میرا مقصد اس کے پاس کسی ہتھیار کی موجودگی کا اندازہ لگانا تھا۔ مجھے اس کے کرتے کے دائیں طرف موجود جیب میں کسی سخت سی شے کا احساس ہوا جو ذرا لمبی سی تھی۔ دوسری مرتبہ میں نے ذرا تفصیل سے محسوس کیا۔ یہ ایک کوئی چھ انچ لمبی اور ذرا گول سی شے تھی جو بظاہر دھات کی بنی لگ رہی تھی۔ یہ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کے پاس کم سے کم پہلوؤں کی حد تک کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اس لمبی اور گول شے کا معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ مجھے لیے جھاڑیوں والے راستے میں گھسا تو مجھے موقع مل گیا اور میں نے آسانی سے اس کی جیب سے وہ چیز نکال لی۔ ہاتھ میں آنے پر اندازہ ہوا کہ یہ درحقیقت بند ہو جانے والا چاقو تھا۔ بٹن دبانے پر اس کا پھل باہر آ جاتا تھا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر میں نے اسے اپنی قمیص کی آستین میں کرلیا تھا۔ اوپر جیکٹ ہونے کی وجہ سے اس کی موجودگی محسوس نہیں کی جا سکتی تھی۔ اب مجھے موقع کا انتظار تھا۔

اس وقت تک میرے ہاتھ پیروں کی حرکت کرنے کی قوت رفتہ رفتہ واپس آ رہی تھی لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان سے لڑ کر ان پر قابو حاصل کرسکتا۔ ابھی میرے ہاتھ پیر قابو میں نہیں آئے تھے اور میں مناسب وقت کا انتظار کرنے پر مجبور تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم جھاڑیوں سے نکل آئے اور اس شخص نے مجھے آٹے کی بوری کی طرح اس کھلی جیپ کے عقبی حصے میں پٹخ دیا ''بہت وزنی ہے کم بخت!'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں بہت غلط زاویے سے گرا تھا۔ ایک ٹانگ جسم تلے دب گئی تھی اور شانوں کے درمیان کوئی شے چبھ رہی تھی۔ میں خود کو سیدھا بھی نہیں کرسکتا تھا اور یہ پوز بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ دونوں اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے اور رب نواز پیچھے آ گیا۔ اس نے مزید ستم کرتے ہوئے اپنے دونوں پیر میرے سینے پر رکھ لیے اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا ''یہ تمہاری زندگی کا آخری سفر ہے اسے انجوائے کرلو پھر تم کو موقع نہیں ملے گا۔'' بدبخت آدمی اپنی ہاتھی جیسی ٹانگیں رکھ کر سفر کو انجوائے کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے بے شمار گالیوں سے نواز ڈالا۔

جیپ وہی اسمگلر چلا رہا تھا اور یہ غالباً اسی کی جیپ تھی پھر اس نے اچانک ایک ناہموار راستے پر جیپ تیزی سے گھمائی تو میری مشکل آسان ہوگئی۔ میں اچھلا اور میری ٹانگ جسم تلے سے نکل گئی اور اس بار میں پشت کے بجائے پہلو کے بل گرا تھا۔ اس طرح مجھے پشت میں ہونے والی چبھن سے بھی نجات مل گئی تھی۔ رب نواز ایک لمحے کے لیے میری حرکت سے بوکھلایا تھا۔ شاید وہ سمجھا کہ میں نے خود سے حرکت کی ہے (وہ درست ہی سمجھا تھا) پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ جیپ کے اچانک گھماؤ کی وجہ سے میرا جسم حرکت میں آ گیا تھا۔ اپنے خوف پر اس کے لبوں پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''سنبھل کر۔'' اشوک نے کہا ''دیکھنا یہ فرار نہ

ہو جائے۔'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''تم بے فکر رہو۔ آج اس کے جسم سے روح ہی فرار ہو سکے گی۔'' رب نواز نے جواب دیا۔

جیپ ناہموار راستوں سے گزر رہی تھی۔ آسمان پر چاند نمودار ہو چکا تھا۔ شاید بارھویں یا تیرھویں کا چاند تھا۔ اس لیے سارا ماحول ہی چاندنی سے روشن تھا۔ اس کے ساتھ ہی سردی بھی شباب پر تھی۔ ہوا نہیں چل رہی تھی لیکن جب جیپ فراٹے بھرتی تو سرد ہوا جیکٹ سے گزر کر جسم کو کاٹتی تھی۔ میں نے بمشکل خود کو لرزنے سے روکا تھا۔ رب نواز میرے لرزنے کو نوٹ کرلیتا تو میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ جیپ کی حرکت سے فائدہ اٹھا کر میں اپنے جسم کو حرکت دے رہا تھا۔ تاکہ میرے جوڑ کھل جائیں جو چھ سات گھنٹے سے ایک ہی طرح پڑے پڑے اکڑ گئے تھے۔ دوسرے میں دیکھ رہا تھا کہ میرا جسم کس حد تک میرے اختیار میں آیا ہے۔

اچانک جیپ رک گئی۔ اسمگلر نے سرگوشی میں کہا ''ہمیں ایک گھنٹا اسی جگہ رکنا پڑے گا۔ جب تک آگے سے سگنل نہ ملے۔'' اس نے جیپ ایک جھنڈ میں روک دی تھی۔ اس سے ذرا آگے جھاڑیاں تھیں اور اس سے پہلے کھیت تھے۔ یہ جگہ سرحد کے پاس ہی لگ رہی تھی۔

''سگنل کون دے گا۔'' رب نواز نے پوچھا۔

''یہ دے گا۔'' اسمگلر نے جیب سے کچھ نکال کر دکھایا۔

''فون! اس پر تمہیں کہاں سے اطلاع ملے گی۔ اس علاقے میں موبائل کام ہی کہاں کرتے ہیں۔'' رب نواز کے لہجے میں حیرت محسوس کر کے وہ ہنسا۔

''یہ انڈیا کا موبائل فون ہے۔ ان کا نیٹ ورک یہاں تک کام کرتا ہے۔ اس پر میرا بندہ مجھے بتائے گا کہ راستہ کلیئر ہے یا نہیں۔''

''یہ اچھا طریقہ ہے۔'' اشوک بولا ''مجھے خیال ہی نہیں آیا اس کا۔''

''بس جی جو بات ہم پاکستانی آج سوچتے ہیں اس پر بھارتی دس دن بعد سوچتے ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''تب ہی تم لوگوں کا یہ حال ہے۔'' اشوک کے لہجے میں زہر تھا۔

''بس کیا کریں جی۔ ہم میں اعتماد نہیں ہے ورنہ انڈیا تو کیا امریکا بھی ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہے۔''

اس نے سگریٹ سلگائی ''ہاں یہ تو ہے میں نے بھی دیکھا ہے اور سچی بات ہے مجھے تمہاری فوج کے ڈسپلن اور تربیت نے متاثر کیا ہے۔ تم لوگ اچھے لڑاکا ہو لیکن تمہاری قیادت نااہل ہے۔''

''بس جی اسی وجہ سے تو ہم ہر جگہ مار کھاتے ہیں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اشوک اتر کر میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے ہلا جلا کر دیکھا اور پھر اچانک سلگتی سگریٹ میری گردن سے لگا دی۔

شاید میں ذہنی طور پر اس کی جانب سے ایسی کسی کارروائی کے لیے تیار تھا اس لیے میں نے اپنے جسم کو بے حس رکھا۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور جاتے جاتے خبیث نے دوبارہ پلٹ کر وہی حرکت کی۔ اسے تیزی سے حرکت کرتے دیکھ کر میں ہوشیار ہوگیا تھا اسی لیے میں ایک بار پھر کامیاب رہا۔

''یہ بہت بڑا ایکٹر ہے۔'' رب نواز نے اسے خبردار کیا ''میرا مشورہ ہے اسے پھر وہی دوا سنگھا دو۔''

''گیس ختم ہوگئی تھی اور ابھی اس کے ہلنے جلنے میں بھی دو گھنٹے باقی ہیں اور اس کے کوئی دو گھنٹے بعد یہ اس قابل ہو سکے گا کہ بھاگ سکے۔''

رب نواز نے جھک کر میری طرف دیکھا۔ اوپر درختوں سے جھانکتے چاند کی روشنی میں اس کے چہرے پر پھیلی نفرت مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے زہریلے انداز میں کہا ''شاہ عالم تیرا وقت قریب ہے، کتنے عرصے بعد میں سکون کی نیند سو سکوں گا۔''

''ممکن ہے تم ہمیشہ کی نیند سو جاؤ۔'' میں نے سوچا۔

اسی لمحے ایک عجیب سی گنگناتی آواز آئی اور میں نے اسمگلر کی آواز سنی ''جی جناب...... ہاں بندے تیار ہیں...... آپ حکم فرماؤ...... جی ہم تو آپ کی خدمت کر رہے ہیں...... بس جی...... آپ حکم کریں...... ہو جائے گا......''

اس نے پھر اشوک اور رب نواز سے کہا ''تیار ہو جائیں جی۔ ایک گھنٹے کا وقت ہے۔''

''یہاں والے کوئی گڑ بڑ تو نہیں کریں گے۔'' رب نواز کے لہجے میں شک تھا۔

''بس جی...... سب سے سیٹنگ ہے اپنی...... آپ فکر ہی نہ کرو جی۔''

جیپ ایک بار پھر اسٹارٹ ہوئی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ خستہ حالی کے باوجود اس کا انجن جاندار اور بے آواز تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ جیپ کو اسمگلنگ کے لیے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ اب جیپ تنگ راستوں اور جھاڑیوں سے گزر رہی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے جیپ روک کر ارد گرد کی

ین گن لیتا تھا۔ بعض اوقات تو جیپ چیونٹی کی رفتار سے رینگنے لگتی تھی۔ میں نے رب نواز کو کہتے سنا "سرحد ابھی کتنی دور ہے۔"

"ہم سرحد پر ہی ہیں جی مگر بعض اوقات سرحد عبور کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ بڑا نازک کام ہے جی...... ذرا سی بے احتیاطی بندے کو موت کے منہ میں ڈال دیتی ہے۔"

وہ سب ہی خاموش تھے۔ ان سب کے اعصاب کشیدہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ اشوک کمار اور رب نواز نے پستول نکال لیے تھے۔ کسی بھی وقت وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ اسمگلر نے ان سے کہا "پستول رکھ لیں جی۔ خدانخواستہ رینجرز یا بی ایس ایف کے کسی دستے سے سامنا ہو گیا تو وہ ہتھیار دیکھتے ہی فائر کر دیں گے۔ آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ انہیں رکھ لیں۔"

"تم اپنا کام کرو۔" اشوک نے سخت لہجے میں کہا "ہمیں مشورہ مت دو۔"

"لیں جی ہم نے سرحد پار کر لی ہے۔" اس نے اعلان کیا "اب آپ بھارت ماتا کی گود میں ہو۔"

"بکواس نہ کرو۔" اشوک نے اس کی گردن دبوچ لی۔

"لو جی۔ میں نے کون سی گالی دے دی۔" اس نے اپنی گردن چھڑائی۔

"آگے چلو۔ ابھی ہم خطرے میں ہیں۔" رب نواز نے کہا۔

"چلتا ہوں مگر یوں میری گردن تو نہ پکڑیں جی۔" اس نے برا ماننے کے انداز میں کہا۔

"ہمیں بارودی سرنگوں والے میدان کے اس پار جانا ہے۔" اشوک نے اسے کہا۔

"نہ جی اس طرف جانا تو موت کو دعوت دینا ہے۔ اس طرف تو خود بھارتی فوجی نہیں جاتے۔ پچھلے دنوں ایک گاڑی اڑ گئی تھی۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم چل رہے ہو یا میں تمہیں تمہارے خدا کے پاس بھیج دوں۔" اشوک نے پستول اس کے سر سے لگا دی۔

اس نے اندازہ لگا لیا کہ انکار کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ لہٰذا اس نے گہری سانس لی "اچھا جی اگر آپ مرنا ہی چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔"

اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اشوک اس وقت بے حد خراب موڈ میں تھا لیکن میں بہت برے حال میں تھا۔ ایک ہی انداز میں لیٹے لیٹے میرے جسم میں درد ہونے لگا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ احتیاط پر لعنت بھیج کر جسم کو حرکت دے ہی دوں لیکن اس صورت میں اشوک مجھے فوراً ہی شوٹ کر دیتا۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کے کوئی دس بج رہے تھے اور مجھے اس طرح مفلوج پڑے کوئی دس گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت میں نے جو اذیت برداشت کی، آج بھی اس کا تصور کر کے کانپ جاتا ہوں۔

"یہ دیکھیں جی دائیں طرف۔ یہ جو میدان ہے اس میں بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔ اس کے ایک طرف پاکستان کی سرحد ہے اور دوسری طرف انڈیا کی۔"

"جیپ روک دو۔" اشوک نے کہا "اب ہم پیدل چلیں گے۔"

"نہیں جی میں جیپ نہیں چھوڑ سکتا اور آپ کے ساتھ بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے واپس جانا ہے۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ اس مردے کو اٹھا کر۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ کھٹ کے ساتھ ہی اس کی ہلکی سی چیخ گونجی "میرا کان......"

"ابھی ایک کان سے محروم ہوئے ہو۔ اب کے انکار کیا تو زندگی سے ہی محروم ہو جاؤ گے۔"

میرا منہ جیپ کی سائیڈ کی طرف تھا۔ اس لیے میں یہ سب نہیں دیکھ سکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے کھینچ کر اپنے کندھے پر ڈالا اور چلنے لگا۔ اس بار اشوک اس کے پیچھے تھا اور رب نواز سب سے پیچھے تھا۔ وہ وقفے وقفے سے کراہ رہا تھا، اس کے کان سے خون بہہ رہا تھا۔ جسے وہ وقفے وقفے سے ہاتھ میں پکڑے رومال سے صاف کرتا تھا۔ وہ زیرِ لب اشوک کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ نہیں سن رہا تھا لیکن وہ سن رہا تھا "بکواس بند کرو۔" اس نے للکارا "ورنہ دوسرا کان بھی اڑا دوں گا۔"

میری آستین میں پھنسا چاقو نیچے کی طرف پھسل رہا تھا۔ میں دوسرے ہاتھ سے اسے بار بار اوپر کر رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اشوک میری اس حرکت کو تاڑ نہ جائے۔ اس دوران میں ہم میدان کے کنارے کنارے سفر کرتے جا رہے تھے۔ اس میں کئی جگہوں پر گڑھے پڑے تھے۔ بالآخر ایک جگہ اشوک نے اسے حکم دیا "اسے نیچے ڈال دو۔" اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور پھر اشوک نے مجھ سے کہا "شاہ عالم اب مکاری ختم کرو اور اٹھ جاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ تم ٹھیک ہو۔"

غالباً میرے کان پر کوئی بم بھی پھٹ جاتا تب بھی میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ وہ خبیث تاڑ گیا تھا کہ میں اداکاری کر رہا ہوں لیکن اب یہ اداکاری فضول ہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا "تم نے کیسے جانا؟" میں نے لباس جھاڑتے ہوئے کہا۔

درحقیقت میں اندازہ کر رہا تھا کہ اگر میں چاقو استعمال کرنا چاہوں تو اس کا کتنا امکان ہو سکتا ہے جواب خاصا مایوس کن تھا۔ اشوک مجھ سے پوری طرح چوکنا تھا اور میری ذرا سی حرکت بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہتی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ مجھے گولی مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔

"جب میں نے بستر پر کھلی شیشی دیکھی تو تب ہی سمجھ گیا تھا۔" وہ مسکرایا "لیکن تم نے بھی کمال کی اداکاری کی۔ جب سگریٹ لگانے پر بھی حرکت نہ کی تو میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔"

رب نواز اب تک دم بخود تھا پھر وہ اشوک پر بری طرح برس پڑا "تم جانتے تھے یہ حرام زادہ ٹھیک ہے۔"

"ہاں۔" اس نے بے پروائی سے سگریٹ ایک طرف اچھال دیا "میں جانتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

یہاں اشوک کا اندازہ غلط تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہو جاتا کہ وہ میری اداکاری کے بارے میں جان گیا ہے تو میں بہت پہلے ہی کچھ نہ کچھ کر چکا تھا لیکن موقع کی تلاش میں وقت ہی گنوا تا رہا تھا۔

"دیکھو نا اگر یہ ٹھیک نہ ہوتا تو اس میدان میں کون دوڑتا۔" اشوک رب نواز سے کہہ رہا تھا۔

اسمگلر نے بیزاری سے کہا "صاحب اب ہم کو جانے کی اجازت دو۔"

"ہاں جاؤ۔" اشوک نے کہا اور اچانک ہی فائر کر دیا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کے سینے میں سوراخ ہو گیا اور وہ آنکھوں میں حیرت لیے منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ دل میں اترنے والی گولی نے اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ وہ گرتے ہی ساکت ہو گیا تھا۔ میں چیخ اٹھا۔

"یہ کیا کیا تم نے...... بلاوجہ مار دیا اسے۔"

اشوک سفاک انداز میں مسکرایا "بھارت ماتا کا تمسخر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری فوج میں میں نے تین آدمی اسی لیے مارے تھے۔"

رب نواز مسکرا رہا تھا۔ میں نے مشتعل ہو کر اسے بے شمار گالیوں سے نوازا مگر وہ بے غیرتی سے مسکراتا رہا "شاہ عالم اس کتے کے بجائے اپنی فکر کر۔ تیرا اس سے بھی برا حال ہو گا۔"

"اب کھڑے ہو جاؤ۔" اشوک نے مجھے حکم دیا "اور اس میدان کی طرف دوڑنا شروع کر دو۔ تمہارے پاس صرف تین سیکنڈ ہیں اس دوران میں تم میری حد سے باہر نہ نکلے تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" اس نے اپنے لباس سے ایک لمبی نال والا پستول نکال لیا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے حرکت نہیں کی تھی۔ اس نے گننا شروع کر دیا "ایک...... دو...... تین......"

"بھاگو...... شاہ عالم......" رب نواز نے قہقہہ مار کر کہا "آج میرے سینے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔"

میں نے سوچا۔ اگر میں نہ بھاگتا تو اشوک مجھے گولی مار دیتا اور بھاگتا تو اس بات کا امکان تھا کہ کسی بارودی سرنگ پر چڑھ جاتا لیکن اس میں بچنے کا امکان تو تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ فائر کی آواز آئی۔ میں رک گیا۔ چند لمحے تو میں نے یہ محسوس کرنے میں گزار دیے کہ گولی مجھے لگی کہاں ہے پھر پے در پے گولیوں کی آواز سن کر میں پلٹا۔ اشوک زمین پر پڑے اسمگلر پر گولیاں چلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا پستول تھا اور اشوک کے بائیں شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ صرف زخمی ہوا تھا اور موقع پاتے ہی اس نے اپنے جسم میں چھپائے ہوئے پستول سے اشوک پر گولی چلا دی۔ بدقسمتی سے اس کا نشانہ چوک گیا تھا اور اس بار اشوک نے اسے سچ مچ مار دیا۔ ایک گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ اشوک خوف کے عالم میں اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ اس کی توجہ میری طرف نہیں رہی تھی اور میں احمق ہوتا جو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ چاقو نکالتا۔ پستول اشوک کے ہاتھ میں تھا اور اسے میری طرف کرنے میں ایک لمحہ لگتا۔ میں نے اس لمحے کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ اس نے پستول میری طرف کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پہلے ہی میں اس پر جا گرا تھا۔ میرے بوجھ تلے دب کر اس کا زخمی شانہ اور بھی مضروب ہوا تھا۔ اس نے چیخ ماری اور پستول میری طرف کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا پستول والا ہاتھ تھاما اور دائیں ہاتھ سے پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا، دوسری ضرب نے اس کی بھوں پھاڑ دی۔ ذرا سی دیر میں اس کا چہرہ خون آلود ہو کر بھیانک لگنے لگا تھا۔ عقب سے میں نے رب نواز کی آواز سنی "شاہ عالم چھوڑ دے اسے۔ میں گولی مار دوں گا۔"

میں اشوک کے اوپر تھا وہ مجھے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں تیزی سے فرش پر گھوما اور اب اشوک میرے اوپر تھا۔ اس کی ساری توجہ اس پر تھی کہ کسی طرح پستول کا رخ میری جانب

ہو جائے۔ گھومنے کے دوران میں اس کا گھٹنا میرے پیٹ کے زخم پر لگا تو مجھ پر جیسے قیامت سی گزر گئی تھی۔ سویا ہوا درد آتش فشاں کی طرح جاگ گیا تھا اور چند ثانیے کو جیسے میں بے دم ہو گیا تھا مگر اشوک کا پستول والا ہاتھ میں نے اپنی طرف آنے نہیں دیا تھا۔ اگر ایک بار وہ پستول میری طرف کر دیتا تو سارا کھیل لمحوں میں ختم ہو جاتا۔ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے پہلے اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا اور پھر اس کے شانے کے زخم پر مکے مارنے لگا۔ ان ضربوں سے وہ چیخ اٹھا تھا مگر وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھا، اس نے اپنی کوشش میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ میں دیوانہ وار اپنے دائیں ہاتھ کو جھٹکنے لگا۔ کسی طرح چاقو باہر نکل آئے لیکن وہ ذرا ترچھا ہو کر آستین میں پھنس گیا تھا۔ کسی صورت نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"شاہ عالم...... تو بچ نہیں سکتا۔" اس نے کسی خون آشام بھیڑیے کی غراہٹ کے ساتھ کہا۔ چاندنی میں اس کا خون میں نہایا چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ میں نے جواب میں ایک بار پھر گھٹنا اس کی رانوں کے درمیان مارا۔ اس کی گرفت ذرا کمزور ہوئی تھی۔ اسے میرے زخم کا علم نہیں تھا ورنہ وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھاتا لیکن جب میں نے گھٹنا چلایا تو درد ایک بار پھر شدت سے اٹھا کہ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور جب یہ اندھیرا چھٹا تو اشوک پستول کی مہیب نال میرے سر تک لانے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کا فائر میرے سر کو چھوتا گزر گیا۔ میں نے پوری طاقت سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر اپنے سر سے دور کر دیا۔ اس دوران میں میرا دایاں ہاتھ اس کے جسم پر پھر رہا تھا اور پھر مجھے مطلوبہ شے مل گئی۔ اس دوران میں اشوک اپنی طاقت کو آخری حدوں تک استعمال کرتے ہوئے پستول کی نال ایک بار پھر میرے سر تک لے آیا تھا۔ اس نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔

ایک دھماکا ہوا اور رب نواز نے اضطراری آواز میں کہا "اسے ختم کر دو۔ کوئی اس طرف آ گیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

دوسرے دھماکے کے ساتھ ہی اشوک کا پستول والا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا تھا "کتے ...... تجھے کرنل یاد ہے ناں ...... تجھے اسلم یاد ہے نا......" میں نے تیسرا فائر کیا۔ اس کا دوسرا پستول جو اس نے کمر سے لگا رکھا تھا، میں نے وہ نکال لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ فائر کرتا میں نے اس کے سینے پر تین فائر کر دیے تھے۔ مرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نفرت سی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا "ہاں یاد ہیں ...... لیکن تو باقی ہے۔"

"میں نہیں تو مرے گا۔" میں نے چوتھا فائر اس کے دل پر کیا اور پیروں سے اسے رب نواز کی طرف اچھال دیا جو ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ اس کے منہ سے احمقانہ آوازیں نکلیں اور وہ اشوک کے نیچے دب گیا۔ جو دراصل ایک لاش تھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور اس سے پہلے رب نواز اس کے نیچے سے نکل پاتا، میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"بس اب حرکت نہ کرنا۔" میں نے پستول اس کے سر سے لگا دیا "ورنہ تمہارے سر میں بھرے سارے شیطانی خیالات بھیجے کے ساتھ بہا دوں گا۔" میں نے لات مار کر اشوک کی لاش اس پر سے ہٹا دی اور دوسری لات مار کر اس کے ہاتھ سے پستول اڑا دیا۔ اس نے گالی دے کر اپنا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے بے دردی سے اسے اوندھے منہ گرا دیا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کی شلوار کے نیفے سے ایک اور پستول برآمد ہوا تھا۔ یہ زیادہ نفیس قسم کا لیوگر تھا جو پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ میں نے اپنا پستول جو اشوک سے لیا تھا جیب میں رکھ لیا اور اس کا لیوگر اس پر تان لیا۔ اشوک کا لمبی نال والا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ زیادہ طویل فاصلے پر مارنے والا ہتھیار تھا لیکن بدحواسی کے عالم میں اشوک نے اسے خالی کر دیا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لے کر اپنا زہریلی سوئی والا پستول بھی نکال لیا۔

"رب نواز اسے اپنے شانے پر اٹھاؤ!" میں نے اسمگلر کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ جسے میں جانتا بھی نہیں تھا لیکن اس نے اشوک پر فائر کر کے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میری جان بچائی تھی۔ میں اس کی لاش غیر سرزمین پر چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

وہ رب نواز سے کہیں بہتر انسان تھا اور سب سے بڑھ کر غدار نہیں تھا۔ صرف ایک مجرم تھا۔ رب نواز نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تم پاگل ہو۔ یہاں اتنی فائرنگ ہو چکی ہے۔ اس کی آواز دور تک گئی ہوگی اور تم اسے بھی لے جانے کا کہہ رہے ہو۔ ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے اسے لات رسید کی اور وہ دور جا گرا "جو کہا جا رہا ہے وہ کرو ورنہ کتے کی موت مار دوں گا۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔

وہ لرزتے قدموں سے اٹھا۔ اس نے اسمگلر کی لاش اٹھائی۔ رب نواز تنومند آدمی تھا لیکن خوف نے اس کی حالت خراب کر دی تھی۔ وہ بمشکل اسے اٹھائے چل رہا تھا۔ میں اس سے چھ سات گز پیچھے تھا۔ اگرچہ ہم اس راستے پر چل رہے

تھے جس سے واپس آئے تھے لیکن اس جگہ کا کوئی پتا نہیں تھا کہ یہاں کہاں بارودی سرنگ ہے اور کہاں نہیں ہے۔ چاند افق پر جھکنے سے چاندنی ذرا پھیکی پڑ گئی تھی اور سائے طویل ہونے سے دور کی چیزیں غیر واضح ہو گئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ گزشتہ چند گھنٹوں میں میری زندگی نے کتنے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ میں رب نواز پر غالب آیا پھر اشوک نے مجھے قابو کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اسے جہنم رسید کر دیا اور صورت حال ایک بار پھر میرے ہاتھ میں تھی۔ نہ جانے آگے کیا ہوتا لیکن جسم میں آنے والی ایک ناخوشگوار تھکن بتا رہی تھی کہ معرکہ ختم ہو گیا ہے۔ میں خیر تو نہیں تھا لیکن میں نے اچھے مقاصد کے لیے شر پر فتح پالی تھی۔ ایسا سکون محسوس ہو رہا تھا جیسا گھنٹوں طوفان سے لڑ کر فتح یاب ہونے والے کپتان کو محسوس ہوتا ہے۔

نیم دائرے میں گھومتے ہوئے ہم ایک فرلانگ دور پاکستانی حد میں آ گئے۔ اس کا پتا مجھے پتھر پر کندہ الفاظ سے ہوا۔ جس پر لکھا تھا "یہاں سے پاکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

"بس رب نواز!" میں نے اسے روکا "اسے نیچے لٹا دو۔ یہ اس سرزمین کا فرزند تھا اس لیے اس مٹی پر اس کا حق ہے اور تم یہ حق بہت پہلے فروخت کر چکے تھے۔"

"تم...... تم کیا چاہتے ہو؟" اس کے انداز میں خوف نمایاں تھا۔

"رب نواز تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے لیکن تم نے میرے ساتھ جو کیا ہے صرف اسی پر تمہیں موت کی سزا دے دی جائے تو یہ عین انصاف ہوگا لیکن میں تمہیں ایک موقع دوں گا۔"

"کیسا موقع؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"جو تم نے مجھے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بارودی میدان دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کے دوسرے کنارے تک صحیح سلامت پہنچ گئے تو میں تمہیں نہیں ماروں گا۔"

"نہیں......" وہ کانپنے لگا "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ شاہ عالم مجھے معاف کر دو۔"

میں ہنسا "شاہ عالم۔ تمہیں معاف کر دے۔ رب نواز یہ لفظ تمہارے منہ سے کتنا عجیب لگتا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی پر ترس کھایا ہے، کسی کو معاف کیا ہے۔"

اس نے یک دم دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ میں کتنے بزدل شخص کو اپنا دشمن سمجھتا رہا تھا یہ صرف کمینگی سے واقف تھا۔ دشمنی نبھانا الگ بات ہے اور رب نواز کی طرح کمینگی دکھانا الگ بات ہے۔ وہ بھیڑیے کی طرح مکار سفاک اور گیدڑ کی طرح بزدل تھا۔ جب اپنی جان پر بنی تو رونا شروع کر دیا۔ میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا "رب نواز تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔ اس دوران میں تم نے یہ میدان پار کر لیا تو بچ جاؤ گے۔"

"میں نہیں جا سکتا۔" اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے میدان کی طرف دیکھا "میں مر جاؤں گا۔"

"اور نہیں جاؤ گے تب بھی مر جاؤ گے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور گنتی گننا شروع کر دی "ایک...... دو......"

"نہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے لات مار کر پیچھے دھکیل دیا "تین...... چار...... پانچ......"

رب نواز اس بار پاگلوں کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ میں نے بے رحمی سے اسے مکا مارا۔ وہ پھر زمین پر جا گرا تھا۔ اس دوران میں، میں نے گنتی جاری رکھی "رب نواز ممکن ہے قسمت تمہارا ساتھ دے اور کوئی بارودی سرنگ تمہارے پاؤں تلے نہ آئے لیکن یہاں تم میری گولی سے نہیں بچ سکو گے، میں خالی ہاتھ سے بھی تمہاری گردن توڑ سکتا ہوں۔"

"بیس...... اکیس......"

رب نواز اٹھ کر آہستہ سے میدان کی طرف بڑھا جیسے بکرا مذبح خانے کی طرف جاتا ہے۔ اس نے لرزتے قدموں سے میدان میں قدم رکھا۔ میں نے اسے سنانے کے لیے اونچی آواز سے گنتی شروع کر دی "پچیس...... چھبیس...... بھاگو رب نواز!"

ساتھ ہی میں نے اسے ڈرانے کے لیے اس کے سر کے اوپر فائر کیا۔ جب گولی اس کے سر پر سے سیٹی بجاتی گزری تو اس نے بے اختیار دوڑ لگا دی۔ اس وقت میری کیفیت بھی کچھ جنونی ہو رہی تھی۔ میں قطعی فراموش کر چکا تھا کہ اس وقت میں دنیا کی حساس ترین سرحد پر کھڑا تھا۔ جہاں مجھے بلا تکلف گولی بھی ماری جا سکتی تھی۔ میں بلند آواز سے چیخ چیخ کر گنتی گنتا رہا۔ رب نواز بھاگ رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی تک اس کا پیر کسی بارودی سرنگ پر نہیں پڑا تھا۔ میں گنتی گن رہا تھا "اکیاون...... باون......"

ایک منٹ پورا ہونے کو کہا تھا اور میں مایوس ہو رہا تھا۔ رب نواز زندہ تھا۔ قدرت اسے ڈھیل دینے پر آمادہ تھی ابھی اس کی رسی دراز تھی۔ جیسے ہی میں نے ساٹھ کہا۔ رب نواز رک گیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ہذیانی انداز

میں چلانے لگا "شاہ عالم...... کتے کے بچے...... تو میری جان نہیں لے سکا...... میں نہیں مروں گا...... تیرے جیسے کیڑے مجھے مار بھی نہیں سکتے......" وہ گالیوں پر اتر آیا تھا۔ میں نے اس کی طرف پستول اٹھایا پھر نیچے کرلیا۔ میں اس سے وعدہ کرچکا تھا پھر شاید وہ اس پستول کی حد سے باہر ہی تھا۔

"رب نواز مجھے تسلیم ہے۔ قدرت ابھی تمہیں زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ شاید زیادہ عبرت ناک انجام کے لیے۔ رب نواز یہ معافی صرف ابھی تک کے لیے ہے۔ آج کے بعد میں نے تجھے جہاں بھی پایا مار دوں گا۔"

"شاہ عالم...... میں نے بھی آج کے بعد تجھے نہیں چھوڑنا۔ بس یہ آخری ملاقات ہے۔ اب تجھے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ کب تجھ پر موت نازل ہوئی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ تجھے اور تیرے ایک ایک جاننے والے کو چن چن کر ماروں گا۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ رو رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا۔ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور جیسے ہی اسے یقین ہوا وہ میری پستول کی رینج سے باہر ہے، اس نے کینچلی بدلی اور اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اب وہ گالیاں دے رہا تھا۔ دھمکیوں سے نواز رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی بکواس سنتا رہا جب وہ بول بول کر تھک گیا تو میں نے کہا۔

"رب نواز ذرا اپنے اردگرد دیکھو۔ تم ابھی تک موت کے میدان میں ہی کھڑے ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم جو اگلا قدم اٹھاؤ گے، وہ کسی بارودی سرنگ پر نہیں پڑے گا۔"

یہ سنتے ہی رب نواز کی زبان رک گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا "بکواس کرتے ہو تم۔ ...... بھونکتے ہو کتے...... مجھے ڈرا رہے ہو لیکن رب نواز کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں ابھی یہ میدان پار کرکے دکھاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے پلٹا۔ اس نے ایک قدم اٹھایا...... پھر دوسرا...... پھر تیسرا...... کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا "دیکھا موت بھی رب نواز سے ڈرتی ہے۔"

اس نے پلٹ کر چلنا شروع کیا اور دفعتاً میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ دھماکے سے پہلے میں زمین پر گر چکا تھا۔ یہ طاقت ور سرنگ تھی جس نے بالآخر رب نواز کے مغرور ذہن کو اس کے جسم کے ساتھ اجزا میں بکھیر دیا تھا۔ اسے اگلا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ چاروں طرف دھول، مٹی اور پتھروں کے ساتھ رب نواز کے جسم کے ٹکڑوں کی بھی بارش ہو رہی تھی۔ ایک ٹکڑا میرے سامنے آ کر گرا۔ غور سے دیکھنے پر یہ رب نواز کا دستِ راست ثابت ہوا تھا جس سے اس نے شاید ہی کبھی کوئی اچھا یا نیکی کا کام لیا۔ آج بے شمار لوگوں کی روحیں خوش ہوں گی۔ جو اپنی زندگی میں رب نواز کے مظالم کا شکار رہے تھے یا جو رب نواز کی وجہ سے زندگی سے محروم ہوگئے تھے۔

میں کھڑا ہوا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ تھوڑا سا افسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس بات پر کہ ابھی صرف ایک رب نواز مرا تھا۔ جبکہ اس ملک میں ہزاروں رب نواز زندہ تھے۔ جو اس ملک کے عوام کے لیے خدا بن کر بیٹھے تھے۔ ایک رب نواز کے مرنے سے ممکن ہے چند سو یا چند ہزار لوگ عارضی طور پر سکھ کا سانس لیں لیکن جلد ان پر کوئی دوسرا رب نواز مسلط ہوجائے گا۔ بات رب نواز کی موت کی نہیں، مسئلہ اس جابرانہ سسٹم کی موت کا ہے جس نے رب نواز کو پیدا کیا ہے۔ جب تک یہ سسٹم ختم نہیں ہوگا۔ رب نواز پیدا ہوتے رہیں گے۔

میں نے اسمگلر کی لاش کی طرف دیکھا اور ذرا سے تذبذب کے بعد اسے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ پاکستان کی سرزمین پر تھا اور جلد یا بدیر سرحدی محافظ اسے دیکھ لیتے۔ عزت احترام سے نہ سہی اس کو اسلامی طریقے سے آخری رسومات ضرور مل جاتیں۔ میں اس سمت میں بڑھ گیا جس طرف جیپ کھڑی تھی پھر مجھے چابی کا خیال آیا۔ میں پلٹ کر واپس آیا، لاش کی تلاشی لی اور اس کی جیب سے چابی نکال لی۔ دوسری جیب میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ اس رقم کے لالچ میں اس نے ہمیں سرحد پار کرائی تھی اور خود زندگی کی سرحد سے پار ہوگیا تھا۔ جیپ واقعی شاندار تھی اتنی سردی میں بھی اس کا انجن پہلی کوشش میں اسٹارٹ ہوگیا۔ میں نے لائٹ نہ جلانے کا فیصلہ کیا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس خاصی طاقت ور تھیں اور دور سے دیکھ کر سرحد کے محافظ دوڑے چلے آتے۔ میں نے جیپ جھاڑیوں میں گھسا دی۔ مسلی اور کچلی ہوئی جھاڑیاں میری راہ نمائی کررہی تھیں۔ میں اسی راستے پر جیپ چلا رہا تھا جس سے جیپ آئی تھی۔ مجھے بس ایک ڈر تھا کہ کہیں ٹائر پنکچر نہ ہوجائے۔ اس آخری معرکے کے بعد میرے پیٹ کا درد جاگ اٹھا تھا اور اسے دبانے کے لیے میں نے بچی ہوئی دونوں پین کلرز بھی حلق سے اتار لی تھیں۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور ہلکی سی حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جھاڑیوں سے نکلتے نکلتے میرا سر چکرانے لگا تھا اور زخم کے مقام پر پھر جلن کا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید پھر سے میرے انفیکشن ہو رہا تھا۔ مجھے جو اینٹی بائیوٹک انجکشن لگایا گیا تھا، اس کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ ٹخنے پر سوجن آ گئی تھی اور درد شدت اختیار کررہا تھا۔

جھاڑیوں سے نکل کر میں نے اندازے سے اس طرف کا رخ کیا جہاں سے ہم آئے تھے لیکن ذرا آگے جا کر ایک دم ہی میری حالت خراب ہوگئی۔ سر چکرانے لگا اور دنیا نگاہوں کے آگے گھومنے لگی۔ میں نے بمشکل جیپ روکی اور اسٹیئرنگ سے سر ٹکا دیا اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو طبیعت میں اتنا سکون اور ٹھہراؤ تھا جیسے میں بہت دیر تک بھرپور نیند کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں ایک خوبصورت سجے سجائے کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر میری نظریں کرسی پر خوابیدہ چندا پر آ کر ٹھہر گئیں۔ حسبِ معمول سفید لباس اور آف وائٹ سوئٹر میں وہ الگ ہی لگ رہی تھی۔ سر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور لمبی پلکیں سبج رخساروں پر سایہ فگن تھیں۔ بالوں کی ایک لٹ چہرے پر جھول رہی تھی۔ نہ جانے کب وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی میرے جسم پر صاف ستھرا پاجامہ اور جرسی تھی۔ اوپر سے گرم اور ملائم کمبل تھا۔ میں نے زخم کے مقام پر ہاتھ لگایا۔ وہاں نئی پٹی بندھی تھی۔ جسم میں درد کے بجائے ایک قسم کی تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے یاد تھا کہ میں رات بارہ بجے سے ذرا پہلے بے ہوش ہوا تھا۔ اتنی جلدی مجھے تلاش بھی کرلیا گیا تھا۔

دروازہ کھلا اور مسز کھوکھر مسکراتے ہوئے اندر آئیں "اب کیسے ہو؟" انہوں نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھیک ہوں۔ کیا میں رات بھر بے ہوش رہا؟"

"رات بھر۔" وہ ہنسیں "تمہیں پورے چوبیس گھنٹے بعد ہوش آیا تھا اور میں نے تمہیں خواب آور دوا دے کر سلا دیا تھا۔ زخم کی تکلیف سے بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔" پھر انہوں نے چندا کی طرف دیکھا "پاگل لڑکی...... میں نے کہا بھی تھا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے سو جائے لیکن ضد کرکے تمہارے پاس بیٹھی ہے۔ پرسوں سے شاید چند گھنٹے کے لیے سوئی ہو۔ کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟"

انہوں نے پوچھا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مجھے شدید قسم کی بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کراہ کر کہا "اف کیا یاد دلا دیا۔ جی چاہ رہا ہے سب کھا جاؤں...... ناشتے میں کیا کچھ ہے۔"

"بہت کچھ۔" وہ ہنسیں۔ انہیں اپنی دلکش ہنسی کا احساس تھا اس لیے بات بے بات ہنستی تھیں "میں بھجواتی ہوں۔"

وہ چلی گئیں تو میں اٹھ کر باتھ روم میں آیا۔ مجھے نہ تو چکر آئے اور نہ ہی کمزوری کا احساس ہوا شاید مجھے ڈرپ یا انجکشن کے ذریعے طاقت ور دوائیں دی گئی تھیں۔ میں فارغ ہوکر آیا تو چندا جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو بہت عرصے بعد مجھے محسوس ہوا کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ ہر خوف اور خطرے سے آزاد۔ اس دنیا میں رب نواز اور اشوک جیسے لوگ نہیں رہے تھے لیکن چندا بھی تھی اور میرے بہت سارے ساتھی تھے۔ میں نے بازو پھیلائے تو وہ بے اختیار میرے پاس آ گئی۔ سکون اور طمانیت کا ایک اور احساس میرے اندر تک اتر گیا۔

"چندا میں زندہ ہوں؟" میں نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" اس نے جوابی سرگوشی کی "میں بھی زندہ ہوں۔"

"ساری دنیا زندہ ہے اور کتنی خوبصورت ہے۔"

"ہاں اس لیے کہ ہم زندہ ہیں ہمارے پیارے زندہ ہیں۔"

"چندا میری بنو گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں تو ہمیشہ سے تمہاری تھی۔" اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

"اونہوں...... میں شادی کی بات کررہا ہوں۔"

اس کا سر میرے سینے سے ٹک گیا۔ "اسی خواب نے تو مجھے زندہ رکھا۔"

"بس اب ہم زیادہ دیر نہیں کریں گے۔" میں نے جذباتی ہوکر کہا اسی لمحے مسز کھوکھر ناشتے کی ٹرے لے کر اندر آئیں تو چندا تڑپ کر میری بانہوں سے نکلی اور کمرے سے بھاگ گئی۔ مسز کھوکھر ہنسنے لگیں۔

"سوری...... ناوقت ڈسٹرب کیا...... چلو اب ناشتا...... دل میں برا بھلا بعد میں کہہ لینا مجھے۔"

میں جھینپ گیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں اور آپ نے کیوں زحمت کی...... کسی کے ہاتھ بھجوا دیا ہوتا۔"

"تم میرے مہمان ہو...... کسی اور کے نہیں۔"

"اکبر کہاں ہے؟"

"وہ تو کل ہی واپس چلا گیا تھا۔ میں چندا کو بھیجتی ہوں تمہارے ساتھ ناشتا کرلے۔ اس نے پرسوں سے بہت کم کھایا ہے۔" وہ جاتے جاتے رکیں "تم لکی ہو...... اتنی پیاری لڑکی...... اتنی شدت سے تمہیں چاہتی ہے۔ اسے ہمیشہ خوش رکھنا، یہ تمہاری زندگی کو جنت بنا دے گی۔"

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد چندا بھی اپنا ناشتا لے کر آ گئی، وہ ابھی تک جھینپی ہوئی تھی۔ ناشتے میں سنکے ہوئے توس تھے۔ ابلے ہوئے انڈے تھے۔ دودھ میں سیریل تھا...... سنگترے کا جوس تھا اور کافی تھی۔ میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ دو دن کے فاقے کے بعد معدہ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے بے تاب تھا۔ چندا نے بھی صحیح سے ناشتا کیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم کافی لے کر باہر لان میں آ گئے۔ کرنل کی تین آفت بیٹیاں اسکول جا چکی تھیں اور مسز کھوکھر کام کروا رہی تھیں۔ خود کرنل زمین پر تھا۔ ہم لان میں رکھی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ مشرق سے طلوع ہونے والے سورج کی نرم کرنیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ چندا نے گرم چادر لے رکھی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''کوئی چیز پہن لو۔ سردی بہت ہو رہی ہے۔''

''نہیں، ایسے اچھا لگ رہا ہے۔ دیکھو ناں کافی ہے گرم گرم...... سورج کی کرنیں ہیں اور تم ہو...... اتنی ساری چیزوں کے ہوتے مجھے سردی کہاں لگ سکتی ہے۔''

وہ جھینپ گئی ''بس ایسے ہی بولتے رہتے ہو۔''

''اب تو ساری عمر ایسی ہی سننا پڑے گی۔ وقت ہے اب بھی سوچ لو۔''

''سوچ لیا ہے۔'' وہ شوخی سے بولی ''کیا سوچے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔''

''بات یہ ہے جان کہ سوچنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمہارے پاس ہے ہی کہاں۔''

''جبھی تو تمہیں چنا ہے۔'' وہ خفگی سے بولی ''ورنہ اس دنیا میں کوئی کمی ہے اچھے لڑکوں کی۔''

''خبردار جو غیر لڑکوں کا نام لیا۔ شریف بی بیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ شوہر پرست......''

''منہ دھو کر رکھو۔'' وہ ہنسی ''ابھی سے کہاں کے شوہر۔''

''چلو ہونے والا سہی۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''چھوڑو...... کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ شرمائی۔

''دیکھ لے...... بلکہ میں سوچ رہا ہوں آواز دے کر سب کو جمع کر دوں اور بتاؤں کہ یہ ہاتھ میرا ہے۔''

وہ میری بات پر ہنستی رہی، شرماتی رہی لیکن ہاتھ نہیں چھڑایا جو اس بات کا صریح اعلان تھا کہ اس نے یہ ہاتھ میرے حوالے کر دیا ہے پھر اچانک مسز کھوکھر سامنے آئیں تو میں نے بوکھلا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

''غالباً ہاتھ کی لکیریں دیکھی جا رہی تھیں۔'' وہ بولیں۔

''خاتون آپ نے قسم کھا رکھی ہے۔ غلط موقع پر انٹری دینے کی۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''یہ تو ایسے ہی فضول باتوں کے ماہر ہیں۔'' چندا نے جلدی سے کہا۔

''آپ دونوں باتیں کریں اور اگر اجازت ہو تو میں لاہور کچھ کالز کر لوں۔''

''اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ بولیں ''تمہاری خوش قسمتی ابھی کل ہی فون درست ہوا ہے۔''

میں نے اندر جا کر سب سے پہلے صاعقہ کے بنگلے کا نمبر ملایا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہو گئی تھی۔ ''ناصر آپ کہاں ہیں...... کیسے ہیں۔ یہ اکبر کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔ جب سے آیا ہے مصروف ہے۔''

''اب کیا مصروفیات ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا ''ساری مصروفیات رب نواز کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔''

''پاپا کے قاتل کے مارے جانے سے مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔''

''کرنل کے قاتل کو میں نے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کیا ہے۔ البتہ رب نواز کو قدرت نے سزا دی۔ اس کے غدار جسم کو نہ اس ملک کی سرزمین ملی ہے اور نہ اس ملک کی جس کے لیے وہ اپنے ملک سے غداری کر رہا تھا۔ بارودی سرنگ نے اس کے جسم کو ہزاروں ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔''

''لیکن صرف رب نواز کے مرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی اس کے کئی رشتے دار ہیں اور بے شمار ساتھی اور حامی ہیں۔ اکبر ان سے نمٹنے کی پلاننگ کر رہا ہے۔''

''ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''جی نہیں...... ابھی آپ آرام کریں گے اور ایک ہفتے بعد آپ کی لندن کے لیے فلائیٹ ہے۔ میں اس کے لیے سارے انتظامات کر لوں گی۔''

''ٹھیک ہو صاعقہ...... یہ بتاؤ کہ اکبر کہاں ملے گا۔''

''ابھی تو میں کہہ نہیں سکتی۔ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے لیکن جیسے ہی اس سے رابطہ ہو گا میں اس سے کہہ دوں گی کہ آپ سے بات کر لے۔''

صاعقہ کا شکریہ ادا کر کے میں نے فون بند کر دیا پھر کمال کا نمبر ملایا۔ وہاں قمر نے فون اٹھایا ''بھائی آپ...... کہاں غائب ہیں...... کیا مجھ سے ناراض ہیں؟''

''میری بہنا، ایک تو ہی تو ہے جس سے میں کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ یہ بتا کیسی ہے۔ سب خیریت ہے نا...... کمال کہاں ہے؟''

''وہ اسپتال میں ہیں اور سب ٹھیک ہے اور ایمل بولنے لگا ہے۔ میں نے اسے ماما بولنا سکھایا ہے۔ ابھی آپ کو سناتی ہوں۔'' وہ بھاگ کر اپنے بچے کو لے آئی جو کچی نیند سے جاگا تھا۔ لہٰذا اس نے ماما کہنے کے بجائے ریں ریں شروع کر دی۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''بس میں نے سن لیا۔ ہو سکتا ہے میں دو تین دن میں لاہور آ جاؤں۔''

''نہیں بھائی۔ دشمن یہاں تمہاری تلاش میں ہیں۔ تم یہاں مت آؤ بلکہ ملک سے باہر چلے جاؤ۔ میں تم سے دوری برداشت کر سکتی ہوں مگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جائے، یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔''

میں نے اسے تسلی دی اور کمال کا نمبر لے کر وہ ملایا ''ابے الو کے پٹھے...... ڈاکٹرز کی دم۔'' میں نے رابطہ ملتے ہی چلا کر کہا۔ کمال نے میری آواز پہچانتے ہی جوابی ارشادات عالیہ سے نوازا تھا۔

''سور کے بچے...... ابھی زندہ ہے...... میں تو تیرا جہلم کرانے کی سوچ رہا تھا۔''

''کرا لے...... اس بہانے کچھ غریبوں کا بھلا ہو جائے۔ اگر تو قورمہ اور بریانی کھلانے کا وعدہ کرے تو میں اپنے جہلم میں آنے کے لیے تیار ہوں اور اپنا تو کام ہوتے ہوتے رہ گیا...... وہ تھے اپنے چوہدری ملک رب نواز۔ میری بلا انہوں نے اپنے سر لے لی۔''

''یعنی چندا سے عقد فرما لیا۔''

''بکواس نہ کر الو کے پٹھے...... اس کا نکاح اب دوزخ میں ہو گا۔ کسی آدم خور حبشی سردار سے۔''

میں نے کمال کو مختصراً رب نواز کے انجام سے آگاہ کیا۔ وہ اچھل پڑا تھا ''مر گیا مردود...... نہ فاتحہ نہ درود۔''

''بس یہی سمجھ لے۔ میں ایک دو دن میں لاہور آ رہا ہوں۔ تیرے پاس چندا کا پاسپورٹ ہے اس پر برطانیہ کا ویزا لگوا دے۔ سنا ہے کونسلر تیرے اسپتال کے سرپرستوں میں شامل ہے۔''

''ہو جائے گا یہ کام تو فکر نہ کر اور وہ چاندنی بانو کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ باہر ہماری میزبان خاتون سے گپ شپ کر رہی ہے۔'' میں نے بتایا اور اسے کرنل کا فون نمبر دے کر فون بند کر دیا۔ اس سے پہلے میں باہر جاتا مسز کھوکھر اندر آ گئیں۔

''چلو اب تمہاری ڈریسنگ اور آرام کا وقت ہو گیا ہے۔''

''میں نے بہت آرام کر لیا۔'' میں نے احتجاج کیا ''اور بالکل نہیں کروں گا۔''

لیکن چندا اور مسز کھوکھر زبردستی مجھے اندر لے آئے۔ میرے زخم کی نئی ڈریسنگ کی۔ زخم حیرت انگیز تیزی سے بھرا تھا۔ اس پر کھرنڈ آنے لگی تھی۔ پاؤں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ڈریسنگ کر کے مسز کھوکھر نے مجھے کھانے کے لیے گولیاں دیں اور نہ کھانے کی صورت میں انجکشن لگانے کی دھمکی دی۔ بادل ناخواستہ مجھے گولیاں کھانا پڑیں۔

''بس اب تم آرام سے سو جاؤ۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چلا کر کہا ''اتنا بڑا دھوکا...... ایک یتیم مسکین سے...... لوگوں میں خوف خدا نہیں رہا۔''

مسز کھوکھر ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ چندا نے مجھے کمبل اوڑھایا تو میں نے اسے بھی اپنے پاس کھینچ لیا۔ چندا نے مزاحمت کی۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے چھوڑو مجھے...... ابھی باجی آ جائیں گی۔''

''تمہاری باجی کی ایسی کم تیسی...... ظالم سماج بن کر رہ گئی ہیں۔''

اس نے مزاحمت کر کے میرے سینے پر سر رکھ دیا ''ناصر مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''مجھ سے۔'' میں نے اس کے بال سہلائے۔

''نہیں، خود سے۔''

''بس کچھ دن کی بات ہے۔ اب سارے خوف دور ہو جائیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

وہ اٹھ بیٹھی اپنا دوپٹا درست کیا۔ ''اب سو جاؤ۔ جتنا آرام کرو گے۔ اتنی جلدی اچھے ہو جاؤ گے۔''

''تم رہو نا میرے پاس جب تک نیند نہیں آ جاتی۔''

''اچھا بابا۔'' اس نے ہار ماننے کے انداز میں کہا اور میرے سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کی نرم و نازک سی انگلیاں میرے بالوں میں گردش کرنے لگی تھیں۔ اس کے سرور انگیز لمس سے میری آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں اور نہ جانے کب میں سو گیا۔ اس میں کچھ دخل خواب آور دوا کا بھی تھا پھر میری آنکھ شام کو کھلی۔ کھلی کھڑکی سے سورج کی مدھم پڑتی کرنیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور باہر سے کھلکھلاتی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ چندا آنکھوں پر دوپٹا باندھے کرنل کی تینوں بچیوں کے ساتھ چور سپاہی کھیل رہی تھی۔ وہ تینوں ہنستی کھلکھلاتی اس کے پاس آ گئیں اور جب وہ انہیں پکڑنے کی کوشش کرتی تو دور بھاگ

جاتیں۔ ہلکی گلابی شلوار قمیص میں چندا کے بدن کی ساری نزاکتیں ابھر کر سامنے آ گئی تھیں۔ میں مبہوت رہ گیا تھا پھر حسبِ معمول مسز کھوکھر نے مجھے چونکا دیا۔ وہ عقب سے کھنکاریں تو میں چونکا۔ وہ چائے لے کر آئی تھیں۔

''کیا دیکھا جا رہا ہے؟'' انہوں نے شرارت سے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے جلدی سے کھڑکی کے پاس سے ہٹتے ہوئے کہا لیکن انہوں نے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔

''ہاں منظر تو کچھ ایسا ہی ہے۔''

''کیسا؟'' میں نے چائے لیتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

''ایسا کہ آدمی سحر زدہ ہو جائے۔'' انہوں نے بستر کی چادر ٹھیک کی اور کمبل تہ کر کے رکھ دیا ''میرا خیال ہے اب تمہیں تھوڑی بہت چہل قدمی کرنا شروع کر دینی چاہیے۔''

''زخم کتنے دن میں ٹھیک ہو جائے گا؟''

''اب تک ٹھیک ہو چکا ہوتا اگر تمہاری بھاگ دوڑ نے اسے تھوڑا خراب کر دیا ہے۔ دو تین دن اور لگیں گے۔''

''میں کل لاہور جانا چاہتا ہوں۔''

''تم جا سکتے ہو۔ بشرطیکہ ڈرائیونگ سے گریز کرو۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چندا ماہر ڈرائیور ہے۔ میرا خیال ہے ہم بس سے چلے جائیں گے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اکبر جیپ چھوڑ گیا ہے تمہارے لیے۔ یہ سوئٹر لے لو...... چندا نے تمہارے لیے بُنا ہے اپنے ہاتھ سے۔'' وہ پھر ہنسیں ''جب تم سو رہے تھے اس نے تمہاری پیمائش لے لی تھی۔''

میں سوئٹر پہن کر باہر آ گیا۔ چندا بے چاری اب تک چور بنی ہوئی تھی۔ یعنی ان شریر لڑکیوں میں سے کوئی اس کے قابو میں نہیں آئی تھی۔ مسلسل بھاگ دوڑ سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ میں آہستہ سے چلتا اس کے پاس گیا۔ اس نے میرا سوئٹر پکڑا اور چلائی ''پکڑ لیا۔''

''ہاں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا ''اب کبھی چھوڑنا مت۔''

لڑکیاں ہنسیں تو اس نے بوکھلا کر آنکھوں سے دوپٹا اتار دیا اور مجھے پاس دیکھ کر اس کی تمتماتی رنگت اور بھی سرخ ہو گئی ''یہ کیا حرکت ہے؟'' اس نے جلدی سے سوئٹر چھوڑ دیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا

''کیوں لڑکیوں......''

''اور کیا...... لیکن اب آپ چور بنیں۔'' سب سے بڑی بولی۔

''میں...... جی نہیں...... مجھے چور بننا نہیں آتا۔''

''جھوٹے کہیں کے۔'' اس بار چندا نے سرگوشی میں کہا ''چور تو ہو۔''

''ڈرو مجھ سے، کہیں تمہیں ہی چرا کر نہ لے جاؤں۔'' میں نے جوابی سرگوشی کی پھر لڑکیوں نے کہا ''اب تم لوگ اندر جاؤ اور اپنی امی کا ہاتھ بٹاؤ اچھی بچیوں کی طرح۔''

وہ منہ بسورتی اندر چلی گئیں۔ ''چلو آؤ ہم ذرا گھوم کر آئیں۔ کسی گوشۂ تنہائی میں دو باتیں کر لیں یہاں تو یہ خاتون دو منٹ سے زیادہ اکیلے رہنے کا موقع نہیں دیتی ہیں۔''

''ہاں......'' وہ ہنسی ''لیکن ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتی ہیں۔ ان کی عادت ہے۔ دیکھا نہیں کئی نوکروں کے ہوتے اکثر کام خود کرتی ہوں۔''

میں اور چندا ٹہلتے ہوئے دور نکل گئے۔ سورج بھی غروب ہونے والا تھا اور ہوا میں یک لخت بے پناہ خنکی آ گئی تھی۔ دور افق سے نمودار ہوتے گہرے رنگ کے بادل بتا رہے تھے کہ آج رات بارش ہو گی۔ میں اور چندا مٹی کے پشتے تک گئے۔ جس کے پار دور تک لہلہاتی گندم کی فصل اپنی ہریالی کے سبب بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے پار دور کہیں رب نواز کا کردہ جسم ٹکڑوں میں بٹا پڑا تھا یا شاید اب تک چیل کوے اسے کھا پی کر ہضم بھی کر چکے ہوں گے۔ جب تاریکی کے ساتھ سردی بڑھی اور بادل بھی سر پر آ گئے تو میں اور چندا لوٹ آئے۔ کرنل گھر پر ہی تھا۔

''کیا حال ہیں ینگ مین؟'' اس نے پوچھا ''نظر تو ٹھیک آ رہے ہو۔''

''بس سمجھ لیں، میں ٹھیک ہوں۔ آپ کی بیگم کسی کو بیمار رہنے ہی کہاں دیتی ہیں۔''

''ہاں بھائی یہ تو نزلہ زکام بھی نہیں ہونے دیتی ہیں کہ آدمی دو دن گھر میں گزار لے۔'' اس نے سرد آہ بھری پھر اپنے فارم کے بارے میں بتانے لگا۔

سات بجے رات کا فرشی کھانا کھایا۔ مسز کھوکھر نے خاص اہتمام کیا تھا۔ کھانا کھا کر ہم دیر تک گپ شپ کرتے رہے پھر گیارہ بجے سونے کے لیے اٹھ گئے۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے ان سے اجازت طلب کی جو کسی قدر انکار کے بعد مل گئی۔ چندا نے تیاری کی۔ ہماری مختصر سی چیزیں اور چند جوڑے ایک بیگ میں پیک کر دیے گئے۔ میں نے اشوک سے حاصل ہونے والا لمبی نال کا پستول کرنل کو تحفے میں دے دیا وہ اسے پا کر بے حد خوش تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے لیگر اور زہریلی سوئی والا پستول

اپنے پاس رکھا تھا، وہ اکبر کی امانت تھی۔ اس کی جیپ کی کرنل نے صفائی اور ٹیوننگ کرا دی تھی۔ اس کے پاس مکینک بھی تھے۔ ٹینکی فل کرنے کے ساتھ ایک جیری کین الگ سے دیا تھا۔ رخصت کرتے وقت مسز کھوکھر اچھی خاصی جذباتی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے چندا کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا تو وہ بھی رو دی تھی۔ ان کی تین شوخ و چنچل بیٹیاں بھی افسردہ نظر آ رہی تھیں۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے وہ اسکول نہیں گئی تھیں۔ ہم کوئی دس بجے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور میں نے ڈرائیونگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسز کھوکھر نے جاتے جاتے ہدایت کی۔

''لاہور جا کر اپنا ایکس رے کروا لینا۔ بعض اوقات زخم اوپر سے تو بھر جاتا ہے لیکن اندر کی جانب سے پھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس سے غفلت اچھی نہیں ہو گی۔''

''میں چیک اپ کروا لوں گا۔'' میں نے ان کی تسلی کے لیے یقین دلایا۔

''یہ کہاں کرائیں گے۔'' چندا نے مجھے گھورا ''میں کراؤں گی۔''

''نہیں تم خود کر لینا۔'' میں نے جل کر کہا تو سب ہنس دیے۔

راستے میں ہم مستقل پلاننگ کرتے رہے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم لندن جا کر شادی کریں گے جہاں نیلم تھی، رئیس تھا، یتنی اور عاقل تھے۔ ہم کمال اور قمر کو بھی بلوا لیں گے۔ سب ایک ساتھ رہیں گے تو صحیح مزہ آئے گا اس زندگی کا۔ وہ سن کر ہنستی اور شرماتی رہی اور جب میں نے بعد کی زندگی کے چند عزائم سے آگاہ کیا تو وہ خفا ہو کر منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے خاص طور پر کرکٹ ٹیم کی پلاننگ سے سخت اختلاف تھا۔ راوی کا پل کراس کرتے ہوئے سخت جھڑپ کے بعد ہمارے منہ بچ بچ سوجے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے قمر کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ حسبِ معمول ہم اسپتال کے عقبی دروازے سے اندر گئے۔ جیپ میں نے اسپتال کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کی۔ جب ہم قمر کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ شیشے کی ایش ٹرے توڑنے پر اپنے لختِ جگر کی گوشمالی کر رہی تھی۔ چندا نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا کہ تمہاری بہن سے ایک ہی نہیں سنبھالا جا رہا ہے اور تم درجن بھر کی بات کرتے ہو۔

مجھے دیکھ کر قمر مجھ سے آ کر لپٹ گئی اور اس کا لختِ جگر چندا سے۔ ''بھائی تم سخت بے مروت ہوتے جا رہے ہو؟'' اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ میں نے سر کھجایا۔

''میری بہن! بات یہ ہے کہ میں جہاں سے آ رہا ہوں وہاں کے لوگ چاکلیٹ کے بارے میں جانتے ہی نہیں ہیں۔''

''میں چاکلیٹ کی بات تھوڑی کر رہی ہوں۔ پرسوں میری سالگرہ تھی اور میں تمام دن انتظار کرتی رہی کہ تمہاری طرف سے کوئی پیغام آئے۔''

''پرسوں تو مجھے ہوش نہیں تھا۔'' میں نے سرد آہ بھری ''اس الو کے پٹھے کو آنے دو۔ ساری روداد ایک ساتھ سنا دوں گا۔''

''اچھا تم آرام کرو۔ میں کھانا بناتی ہوں۔''

''تم بھی کسی دن ایسی عبرت ناک قسم کی چیز بن جاؤ گی۔'' میں نے قمر کے جانے کے بعد چندا سے کہا تو وہ واک آؤٹ کر گئی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے وہاں پڑا آج کا اخبار اٹھا لیا اور پہلی خبر نے میری توجہ کھینچ لی۔ سبحان شاہ کو اس کے خاندانی بزرگوں نے اس کی حرکتوں کی وجہ سے گدی نشینی سے خارج کر دیا تھا اور اس کی جگہ اس کے بھائی انعام شاہ کو سجادہ نشین بنا دیا تھا۔ سبحان شاہ نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ میں ہنسا۔ قدرت خود میرے راستے صاف کر رہی تھی۔ اب سبحان شاہ ہی میرا ایک مخالف باقی رہ گیا تھا لیکن حالات بتا رہے تھے کہ اسے اپنے مسائل سے نمٹنے کی فرصت نہیں ملے گی جو وہ میری طرف توجہ دے۔

کمال دوپہر کے کھانے کے وقت آیا۔ کھانے کے بعد میں نے اسے اپنی داستان سنائی۔ کمال بے چین تھا۔ رب نواز کے عبرت ناک انجام کے بارے میں جاننے کے لیے۔ چندا سارے حالات سے پہلے ہی واقف تھی اس لیے وہ چائے اور کافی لاتی رہی۔ کمال خوش ہو گیا تھا۔ اسے غصہ تھا رب نواز نے اس کے اسپتال کے باہر دھماکا کرا کے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا تھا ''ایک مہینے تک تو لوگ ڈر کے آئے ہی نہیں۔ اسپتال میں ایڈمٹ بہت سارے مریض بھاگ گئے تھے اور ایک تو اپنا آپریشن ہی کروائے بغیر نکل لیا تھا۔'' کمال کی اس بات پر ہنستے ہنستے ہمارا برا حال ہو گیا تھا۔

''کمال تم اس کا چیک اپ کرو۔ گولی کا زخم اندر سے ٹھیک ہے نا۔''

''میں نے کوئی چیک اپ نہیں کرانا۔'' میں نے فوراً کہا۔ میری ایک نہ سنی گئی۔ کمال نے اسپتال لے جا کر میرا معائنہ کرایا اور ایکس رے لیا۔ اس کا اسپتال اب خاصی ترقی کر گیا تھا۔ اس کے دو بلاک اور بھی بن کر تیار ہو چکے تھے اور اگلے مہینے ان کا افتتاح ہونے والا تھا۔ اسپتال کے اسٹاف میں بھی خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور کمال کا ارادہ تھا کہ نچلے

درجے کے اسٹاف کے لیے اسپتال کے عقبی حصے میں ایک عمارت بنائی جائے جس میں چھوٹے فلیٹ ہوں۔ اسپتال کے اکثر ڈاکٹر اور ماہرین اعزازی طور پر کام کر رہے تھے۔

''یار میں چاہتا ہوں کہ اب اپنے چائلڈ ہوم کے منصوبے کو شروع کر دوں۔ اس کے لیے مجھے زمین چاہیے۔''

''زمین بہت ہے۔ اسپتال کے ساتھ ایک مخیر شخص نے ہزار گز کا پلاٹ عطیہ کیا ہے تو اس پر بنا سکتا ہے۔ میں بورڈ آف ڈائریکٹرز سے اجازت لے لوں گا۔''

اس رات میں نے تلافی کے طور پر باہر ڈنر دیا پھر ہم نیلم ہاؤس گئے۔ خالہ بانو ہمیں دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔ فریال کا بیٹا اب ان سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ انہیں ہی اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے فریال یاد آئی اور میں افسردہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ چندا بچے کو پسند نہیں کرے گی لیکن اس نے اسے گود میں لے کر پیار کیا تھا اور وہ بھی خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ''ناصر ہم اسے بھی ساتھ لے چلیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''اتنی جلدی ممکن نہیں ہے پھر ہم سب کچھ عرصے بعد واپس آ جائیں گے۔ تب یہ ہمارے پاس ہی رہے گا۔''

''معاف کرنا میاں۔'' خالہ بانو جو سن رہی تھیں، بولیں ''تم بھول رہے ہو تم نے اسے میرے حوالے کر دیا تھا۔ اب یہ میرا بیٹا ہے۔ ساری عمر اولاد کو ترستی رہی۔ اللہ نے تیمور کی صورت میں بیٹا دے دیا ہے۔''

''معاف کیجیے گا خالہ میں واقعی بھول گیا تھا۔ آپ ہی اس کی ماں ہیں اور اس کے فیصلوں کا اختیار آپ کو ہے۔''

''ہاں مگر تم بھی اس کے بڑے ہو۔'' خالہ نے فراخ دلی سے کہا ''انہوں نے اپنا حق جتا دیا۔ جسے میں نے مان لیا تھا۔ خالہ نے اصرار کر کے ہمیں روک لیا۔ میں نے یہیں سے لندن رابطہ کیا۔ اس بار رئیس نے کال ریسیو کی۔

''رئیس میں آ رہا ہوں۔''

''آ رہا ہے سچ مچ......'' وہ چلایا۔

''ہاں...... وہ منحوس جہنم رسید ہو گیا ہے۔ میرا مطلب ہے رب نواز ہمارے راستے کے سارے کانٹے دور ہو گئے ہیں۔''

''رب نواز مر گیا۔'' اس نے زیادہ چلا کر کہا۔ یہ سنتے ہی سب بھاگے چلے آئے اور میں نے باری باری سب کو داستانِ رب نواز سنانے کے بجائے لندن آ کر ایک ہی نشست میں سب کو بھگتانے کا اعلان کیا۔ جس پر سب نے حسبِ توفیق مجھے برا بھلا کہا پھر چندا سے بات ہوئی۔ میرے آنے کا سن کر سب ہی بے تاب ہو گئے تھے۔

اگلے روز صاعقہ نے مجھے بتایا کہ تین دن بعد پی آئی اے کی ایک پرواز میں میرے اور چندا کے لیے نشستیں بک ہو گئی ہیں۔ میرا ناصر عظیم والا پاسپورٹ تیار تھا۔ اس پر برطانیہ کا ویزا لگ گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر پاسپورٹ کی تصویر والا حلیہ بنایا۔ چندا نے حسبِ معمول زنانہ عادت کے مطابق لاہور سمیت کر لندن لے جانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کے باوجود کوئی چھ سوٹ کیس اور چار بیگ تیار تھے۔ ان میں سے اکثر میں تحفے تحائف تھے۔ میں نے سر تھام لیا۔ ''چندا یہ سب لے جانے کی کیا ضرورت ہے وہاں سب ملتا ہے۔''

''جی نہیں...... جو بات لے جانے میں ہے وہاں سے لے کر دینے میں نہیں ہو گی پھر وہ خود بھی لے سکتے ہیں اور اس میں سے بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو وہاں ملتی ہی نہیں ہیں۔''

''بابا لندن میں شاہی قلعے والے کھسے سے لے کر پیڑوں والی مسی تک سب ملتا ہے۔'' میں نے اسے بتایا لیکن وہ مان جاتی تو عورت ہی کیوں کہلاتی۔

اس دوران میں میری اکبر سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پولیس اور خفیہ ایجنسی کے ساتھ جھڑپوں میں رب نواز کا رشتے کا بھائی اور دو بھتیجے مارے جا چکے ہیں۔ کوئی درجن بھر افراد گرفتار ہیں۔ اس کے ساتھی بھی روپوش ہیں لیکن جلد ہی وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ اس خاندان کے نئے نئے جرائم سامنے آ رہے تھے۔ جو جو ان کی زیادتیوں کا شکار ہوئے اور خوف سے خاموش رہے وہ اب سامنے آ رہے ہیں۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''اگر یہ لوگ پہلے ہی اسٹینڈ لے لیتے تو شاید یہاں تک نوبت نہ آتی۔''

☆☆☆

لندن کا روشنیوں سے چمکتا دمکتا ائرپورٹ ویسا ہی تھا۔ اس کی گہما گہمی میں اضافہ ہوا تھا کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ باہر برف پڑ رہی تھی اور درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے تھا مگر ٹرمنل میں اتنی خوش گوار حرارت تھی کہ لوگ ٹی شرٹ میں گھوم رہے تھے۔ ہم کسٹم اور امیگریشن کے مرحلے سے بہ آسانی گزر گئے تھے۔ کوئی درجن بھر سوٹ کیسوں کی سرسری سی تلاشی لی گئی تھی۔ شاید چندا کی حسین دلکش شخصیت اور چوڑی دار پاجامے کرتے نے انہیں بھی مرعوب کر دیا تھا۔ البتہ میرے مختصر سے دستی بیگ کی دلجمعی سے تلاشی لی گئی تھی اور امیگریشن افسر نے بھی ایک دو بے تکے سوال کیے تھے۔

''یہ ہوتا ہے لڑکی ہونے کا فائدہ۔'' میں نے ان مراحل سے گزرنے کے بعد چندا سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''مسٹر شاہ عالم!'' کسی نے عقب سے پکارا۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا لیکن ٹھٹک ضرور گیا تھا اور یہی میری غلطی بن گئی۔ عقب سے آ کر ایک سیکیورٹی افسر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اس نے پھر کہا ''مسٹر شاہ عالم۔''

''میرا نام ناصر عظیم ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا ''پھر تم رکے کیوں تھے؟''

''میری ساتھی کا بیگ لوز ہو گیا تھا وہ رکی تو میں بھی رک گیا۔'' میں نے چندا کی طرف اشارہ کیا۔

''پاسپورٹ پلیز۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے طوعاً بادلِ ناخواستہ پاسپورٹ اس کے حوالے کیا۔ اس صورتِ حال نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ شاہ عالم کی شناخت میں پیچھے پاکستان میں چھوڑ آیا تھا لیکن اس نے لندن میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا۔ آخر اس سیکیورٹی افسر کو کیسے شک ہوا۔ میرے چہرے پر تو نہیں لکھا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ ''آخر مسئلہ کیا ہے۔ مجھے اس طرح بلا جواز کیوں روکا گیا ہے۔''

''جواز ہے مسٹر۔'' اس نے کہا ''ہمیں تمہاری تلاش ہے۔ تم لندن میں ایک قتل کی واردات میں ملوث ہو اور تمہارے بارے میں ہمارے پاس وارننگ موجود ہے۔''

''جہنم میں گئی وارننگ۔'' میں نے برہمی کا مظاہرہ کیا ''جب میں شاہ عالم ہوں ہی نہیں تو مجھے اس طرح کیوں روکا جا رہا ہے۔''

''ابھی سب پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہا ''تم میرے ساتھ چلو۔''

''آفیسر! میں ایک معزز بزنس مین ہوں اور پہلی بار لندن آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں اس انداز میں میرا استقبال ہو گا۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔''

''پلیز...... سر۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ اس کا ہاتھ اپنی کمر پر بندھے پستول کے دستے تک چلا گیا تھا۔

''آل رائٹ۔'' میں نے گہری سانس لی ''لیکن تمہیں اپنے رویے کے بارے میں جواب دینا ہو گا۔ میں اس کی رپورٹ اپنی ایمبیسی کو کروں گا۔''

''بعد میں تمہیں جو چاہے کرنا۔ ابھی تو تم میرے ساتھ چلو اور لیڈی تم بھی آؤ۔ تم اس کی ساتھی ہو۔''

''صرف سفر کی حد تک۔'' میں نے جلدی سے کہا ''طیارے میں ہماری جان پہچان ہو گئی تھی۔ تم اسے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔''

اس نے کچھ دیر غور کیا ''آل رائٹ تم جا سکتی ہو۔''

''ناصر۔'' چندا نے اردو میں کہنا چاہا۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔

''تم جاؤ اور باہر دوسرے آئے ہوں گے۔ ان کو بتاؤ...... جاؤ۔''

''یہ تم لوگ کس زبان میں بات کر رہے ہو؟'' آفیسر نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''ہماری مادری زبان ہے۔ کیا اس پر بھی پابندی ہے۔'' میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

چندا نے موقع کی نزاکت بھانپ لی تھی اور وہاں سے چلی گئی اس کا سامان آگے آ رہا تھا۔ آفیسر مجھے لے کر امیگریشن والے حصے کے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں بیٹھ جاؤ۔''

اس بار میں نے نرم لہجے میں پوچھا ''آفیسر میرا قصور تو بتاؤ یا مجھے بلاوجہ روک رکھا ہے۔''

''بات یہ ہے کہ شاہ عالم نامی یہ شخص...... لندن میں ایک قتل میں ملوث رہا ہے...... اور پھر یہ فرار ہو گیا...... ہمارے ریکارڈ میں اس کی تصویر ہے اور ائرپورٹ پر لگے کیمرے سے تمہاری لی جانے والی تصویر اس سے میچ کر رہی ہے۔ ہم نے ایک شخص کو بلایا ہے وہ تمہیں دیکھ کر بتائے گا کہ تم شاہ عالم ہو یا نہیں۔''

''کوئی شخص فیصلہ کرنے والا کون ہوتا ہے۔'' میں نے تیز آواز میں کہا ''اور کون ہے وہ شخص؟''

''جب وہ آئے گا تو تم دیکھ لینا۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لندن آتے ہی ایک پرانا قصہ میرے گلے پڑ جائے گا۔ میں اس کالے ایڈگر کا قتل بھولا نہیں تھا جو اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن آنے والا کون تھا۔ سیکیورٹی آفیسر میرے سامنے بیٹھا مزے سے کافی پیتا رہا اور میری پریشانی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی مجھے کافی کے لیے نہیں پوچھا تھا۔ ایک دوسرا افسر ایک شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے چلا کر کہا۔

''یہی ہے وہ...... حرامزادہ...... شالوم...... اس نے میرے بیٹے کو قتل کیا تھا۔''

میرے سامنے ایڈگر کا شرابی باپ کھڑا تھا۔

سور نما جسم اور بل ڈاگ جیسے چہرے والا ایڈگر کا باپ کسی جنگلی بھینسے کی طرح اندر آیا تھا اور اس نے چلا کر کہا
''یہی ہے میرے بیٹے کا قاتل!''
میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لندن آتے ہی یہ کیس میرے گلے پڑ جائے گا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ لندن کی پولیس سال بھر پرانے اس کیس پر بھی اتنی مستعدی سے کام کر رہی ہوگی اور انہوں نے مجھے لندن وارد ہوتے ہی پکڑ لیا تھا۔ مجھ پر ایڈگر کے قتل کا الزام تھا جسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کے علاوہ میری وجہ سے لندن میں جو قتل و غارت گری ہوئی تھی اس میں بے شمار افراد مارے گئے تھے۔ ایڈگر اپنے ہی بھائی کا نشانہ بنا تھا۔ اس نے لوہے کے وزنی پائپ کا وار تو مجھ پر کیا تھا لیکن قضا ایڈگر کی آئی تھی۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی تھی اور وہ فوراً ہی آنجہانی ہو گیا تھا۔ ان مکار باپ بیٹوں نے اس قتل کا سارا ملبہ مجھ پر ڈال دیا۔ حالانکہ میرے لیے خود ان کے عزائم مجرمانہ تھے۔ میں نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔
''یہ کالا پیل کون ہے آفیسر۔'' میں نے گورے پولیس افسر سے پوچھا ''اس کی منحوس صورت میں نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہے اور اس کے کس بیٹے کو میں نے قتل کیا۔ اسے یقین ہے قتل ہونے والا اس کی اولاد تھا۔''
ایڈگر کا باپ جس کا نام شاید ولیم تھا کسی باؤلے کتے کی طرح غراتا میری طرف لپکا تھا لیکن پولیس والے نے اسے راستے میں ہی روک لیا تھا ''اے ای مین۔ تمہیں صرف شناخت کے لیے بلایا گیا ہے کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے تمہارے بیٹے کو قتل کیا تھا۔''
''میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ یہ وہی حرامی ہے۔ اگر یہ قاتل نہیں ہے تو میں بھی اپنے باپ کا نہیں ہوں۔''
''اس بارے میں مجھے یقین ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ولیم ایک بار پھر آپے سے باہر ہونے لگا۔
''سنو مسٹر ناصر!'' پولیس افسر نے مجھے خبردار کیا ''اپنی زبان کو قابو میں رکھو تم پہلے ہی مشکل میں ہو۔''
''کیسی مشکل میں؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا ''کیا اس کالے کتے کے کہنے پر میں اس کے کسی حرامی پلے کا قاتل ہو جاؤں گا۔ اس کے اعمال تو اس کی مکروہ صورت پر لکھے ہیں۔ یہ خود جرائم پیشہ ہے۔''
''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ جرائم پیشہ ہے۔'' پولیس افسر چونک گیا تھا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ میں جوش میں زیادہ ہی بول رہا تھا لیکن میں نے گھبرائے بغیر اسے جواب دیا۔
''اس کی صورت دیکھو۔ مار پیٹ کے نشان ہیں۔ کیا شریف آدمیوں کی صورت ایسی ہوتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ سارے کالے ایسے ہوتے ہیں۔ میں نے بہت سارے مہذب اور شریف صورت کالے بھی دیکھے ہیں۔''
''او کے تم یہاں بیٹھو۔ تا کہ میں اسے چھوڑ آؤں اور ہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فرار کی کوئی کوشش تمہیں نقصان پہنچائے گی۔'' پولیس افسر نے مجھے خبردار کیا اور ولیم کو کھینچ کر لے گیا جو مجھے نظروں ہی نظروں میں قتل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد پریشانی کے عالم میں اس مختصر سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ میں نے جا کر اس میں اپنی صورت دیکھی۔ بظاہر میں نے اپنا حلیہ شاہ عالم سے بالکل مختلف بنا لیا تھا لیکن میں اپنے چہرے کے ان خد و خال کو نہیں بدل سکتا تھا۔ جو بدبخت اور مرحوم شاہ عالم سے اتنے ملتے تھے کہ ہم آمنے سامنے کھڑے ہوتے تو دونوں کو آئینے کا گمان ہوتا۔ وہ اپنے حصے کے مزے کر کے دنیا سے چلا گیا تھا اور اپنے حصے کی ساری بدبختیاں میرے حصے میں ڈال گیا تھا۔ گزشتہ تین سال سے میں جن مصائب و آلام سے گزر رہا تھا اس کا واحد ذمے دار بھی شخص تھا جسے میں نے اپنی ساری زندگی میں ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ سیاست پر عروج کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور نہ کسی نے شاہ عالم سے میری غیر معمولی مشابہت کی طرف توجہ دی تھی۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ اس قسم کے کمروں میں لگے آئینے دراصل شیشے ہوتے ہیں۔ جن کے ایک طرف تو صاف نظر آتا ہے اور دوسری طرف وہ آئینے بن جاتے ہیں۔ اس آئینے کے پیچھے سے یقیناً میرا مشاہدہ کیا جا رہا ہوگا۔ میں پریشان لیکن معصوم سی صورت بنا کر واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔ میرے تاثرات ایسے شریف آدمی کے سے تھے جو کسی غلط چکر میں بلاوجہ آ گیا ہو۔
اگرچہ ایڈگر کے قتل کا کوئی واضح ثبوت نہیں تھا اور نہ ہی میرے خلاف ان باپ بیٹوں کے علاوہ کوئی گواہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں خاصی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ لندن پولیس سے تو یہ بات بعید تھی کہ وہ میرے خلاف الزام ثابت کرنے کے لیے کسی غیر قانونی حربے سے کام لے لیکن ولیم اور اس کے بیٹوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا پھر ان کالوں میں برادری کا تاثر زیادہ ہی تھا۔ کسی کو بچانے یا کسی کالے کے کام کے لیے یہ سب آپس میں متحد ہو جاتے تھے۔ ان سے تو حکومتیں ذرا ڈرتی ہیں۔ اگر کالے ایڈگر کے قتل کو انا کا مسئلہ بنا لیتے تو

میرے خلاف درجن بھر گواہ سامنے آ جاتے جو بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مجھے ایڈگر پر وار کرتے اور اسے قتل کرتے دیکھا تھا۔ اس قسم کی جھوٹی گواہیوں سے میں مشکل میں پڑ جاتا۔
چندا اب تک ان لوگوں کے پاس پہنچ چکی ہوگی اور وہ حالات سے باخبر ہو گئے ہوں۔ رحیم اور نیلم یہاں کے شہری نہیں تھے لیکن عاقل سے مجھے امید تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا اور مجھے قانونی مدد کے ساتھ دوسرے ذرائع سے بھی میری مدد کرے گا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ مجھے ایڈگر کے وارثوں سے تصفیہ کر لینا چاہیے تھا۔ ورنہ میرے لیے ناقابل بیان مصائب کھڑے ہو سکتے تھے مگر فی الوقت میں کسی بھی قسم کا پیغام پہنچانے پر قادر نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مدد جلد آئے گی اور مجھے اس وقت تک سکون سے انتظار کرنا ہوگا۔ کچھ دیر میں میرا سامان بھی اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جو ایک بریف کیس اور ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔ چندا البتہ سامان بھر کر لائی تھی جو کہ آتے ہوئے نیلم نے چھوڑ دی تھی۔ وہ اس نے پوری کر دی تھی۔ سامان میں اس کے بے شمار جوڑے، تحفے تحائف اور آنے والے بچی کے مہمان کے لیے لاتعداد کپڑے اور کھلونے تھے۔ آنے سے دو دن پہلے اس نے قمر کے ساتھ مل کر دھواں دھار قسم کی شاپنگ کی تھی۔
میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔ خود کو پریشان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ائرپورٹ پولیس کے افسر کے ساتھ ایک دوسرا سادہ لباس شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے بالوں کے انداز اور اس کی عقابی نگاہوں سے ہی ظاہر تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے ہے میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''مسٹر ناصر عظیم...... میں انسپکٹر ڈیری ترمین۔''
''شکریہ۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا ''شرف ملاقات بخشنے کا۔'' میرے لہجے میں طنز محسوس کر کے وہ مسکرا لیا تھا۔
''مسٹر ناصر عظیم یقین رکھو تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔''
''اتنا یقین تو مجھے بھی ہے لیکن اس دوران میں مجھے جو بھگتنا ہوگا اس کی تلافی کون کرے گا۔ میں لندن اپنے پیاروں سے ملنے آیا ہوں اور اب میں قید میں ہوں۔ اس لیے کہ میری صورت کسی شاہ عالم سے ملتی ہے جو لندن میں کوئی قتل کر کے مفرور ہے۔ اسے آپ نے گرفتار کیا نہیں۔ مجھے پکڑ لیا۔ یہ ہے آپ کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی کارکردگی۔''
''آرام سے مسٹر!'' اس نے جیب سے سگار نکال کر سلگایا ''میرا خیال ہے تمہیں میری تمباکو نوشی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
''اگر میں اعتراض کروں تو کیا تم اس سگار کو بجھا دو گے۔''
''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا ''ہمارے ہاں ایک ملزم کے بلکہ ایک مجرم کے حقوق بھی ہوتے ہیں۔''
''میں حقوق کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم شوق سے سگار پیو اور یہ بتاؤ کہ اب میرے ساتھ کیا ہوگا۔''
''کچھ نہیں۔'' اس نے سگار کا گہرا کش لیا ''ہم تمہارے بارے میں تفتیش کریں گے۔ اگر تم بے گناہ ہوئے تو آزاد ہو جاؤ گے ورنہ تمہارا کیس عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔''
''اور اس دوران میں مجھے قید میں رہنا ہوگا۔''
اس نے سر ہلایا ''کم سے کم ابتدائی تفتیش کی حد تک اس کے بعد ممکن ہے تمہیں ریلیف مل جائے۔''
''کیا اسکاٹ لینڈ یارڈ نے اس کیس کی ابتدائی تفتیش خود کی ہے یا مقامی پولیس نے کی ہے۔''
''تمہیں سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔''
''میں وکیل کا مطالبہ کرتا ہوں۔''
''تمہارا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے گا لیکن پولیس اسٹیشن چل کر۔''
''میں اپنے سفارت خانے کو بھی اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ حکومت پاکستان میری اس بلاجواز گرفتاری پر احتجاج کرے گی۔'' میں نے بات کو طول دینے کے لیے کہا۔
''میں حکومت پاکستان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہوں۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا ''میں تمہیں ہتھکڑی نہیں پہنا رہا ہوں۔ امید ہے تم شرافت سے رہو گے۔ دوسری صورت میں مجھے اس گن کو استعمال کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔'' اس نے اپنا کوٹ ذرا سا ہٹا کر گن دکھائی۔
''میں شرافت سے رہوں گا۔'' میں نے یقین دہانی کرائی۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ بظاہر دوستانہ رویے کے باوجود وہ میرے خلاف ہتھیار استعمال کرتے ہوئے ذرا سا بھی ہچکچائے گا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا اور مضبوط جسامت کا چہرے سے اچھے اور شریف خاندان کا فرد نظر آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ملازمت دیتے ہوئے امیدوار کے خاندانی پس منظر کو بھی مدنظر رکھا جاتا تھا تا کہ ادارے میں اچھے اور اعلیٰ کردار کے افراد آئیں۔ یہی وجہ ہے

اس ادارے کی دنیا بھر میں ایک ساکھ ہے اور جب اسکاٹ لینڈ یارڈ کسی کیس کی تفتیش کا بیڑا اٹھا لے تو اسے حل شدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دفاتر میں ایسی فائلوں کی تعداد بہت کم ہے جن پر نا قابلِ حل لکھا ہو۔

میں نے اپنا سامان خود اٹھایا۔ ائرپورٹ کے باہر تک دو سیکیورٹی افسران ہمارے ساتھ گئے۔ یہ مجھے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حوالے کرنے کی رسمی کارروائی تھی۔ باہر سیاہ رنگ کی کار ہماری منتظر تھی۔ یہ عام پولیس کار سے ذرا مختلف تھی۔ یعنی اس میں درمیانی جالی نہیں تھی اور نہ ہی چھت پر روشنیاں لگی تھیں۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ ایک شخص اور بھی تھا اس نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر ڈیری نرمین کی طرف دیکھا اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ غیر معمولی طور پر چوکنا نظر آنے لگا تھا۔ انہوں نے مجھے کار کے عقبی حصے میں اس طرح بٹھایا کہ میرے ایک طرف انسپکٹر ڈیری تھا اور دوسری طرف دوسرا شخص تھا۔ ابھی مجھ پر صرف شک تھا۔ الزام ثابت نہیں ہوا تھا اس کے باوجود ان کی غیر معمولی احتیاط قابلِ توجہ اور قابلِ داد تھی۔ وہ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

جب کار نے کنگسٹن کے علاقے کا رخ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس پولیس اسٹیشن میں لے جایا جا رہا ہے جس کی حد میں ایڈگر کا قتل ہوا تھا۔ میرا اندازہ درست ہوا جب کار کے باہر فٹ پاتھ پر چلنے والے افراد میں سیاہ فاموں کا تناسب بڑھ گیا تھا۔ پولیس اسٹیشن کی عمارت باہر سے سادہ سی تھی۔ اندر ایک صحت مند قسم کے پولیس والے نے میرا چارج سنبھالا اور سب سے پہلے میرے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے میری تلاشی لی اور میری ساری چیزیں اپنے قبضے میں کرلیں۔ میں نے کہا "میں اس کی ہائی کمیشن میں رپورٹ کروں گا۔"

"شوق سے کرنا۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور میرا سارا سامان جو جیبوں سے نکلا تھا۔ اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا۔

انہوں نے صرف کپڑے اور جوتے میرے جسم پر رہنے دیئے تھے اور مجھے ایک لاک اپ میں دھکیل دیا۔ یہ صاف ستھرا چھ بائی آٹھ کا کمرا تھا جس کے تین طرف سلاخیں تھیں اور عقب میں دیوار تھی۔ جس میں واش بیسن اور کموڈ لگا تھا۔ لندن میں صبح نمودار ہونے والی تھی اور میرے نصیب میں رات ہی تھی۔ چندا کے ساتھ اسلام آباد سے روانہ ہوتے ہوئے میں کسی قدر خوش تھا ایسا لگ رہا تھا مصائب اور مشکلات بھری وہ زندگی پیچھے رہ گئی تھی۔ جس کا آسیب گزشتہ مسلسل تین سال سے میرا تعاقب کر رہا تھا مگر لندن میں اترتے ہی میری ساری خوش فہمی دور ہوگئی تھی۔ سکون اب بھی میرے نصیب میں نہیں تھا۔ اگرچہ رب نواز اور بھارتی ایجنٹوں سے جنگ کے مقابلے میں یہ مشکل خاص نہیں تھی مگر ناگہانی طور پر نازل ہوئی تھی اس لیے زیادہ لگ رہی تھی۔ جیسے طوفان سے بچ کر ساحل پر آتے ہوئے کشتی کے پیندے میں اچانک سوراخ ہوجائے۔

طیارے میں مجھے سونا کم نصیب ہوا تھا۔ زیادہ تر وقت میں اور چندا اپنے مستقبل کی خاک گری کرتے رہے تھے۔ لہٰذا میں نے اس موقع پر غنیمت سمجھتے ہوئے سونے کا فیصلہ کیا۔ بستر آرام دہ تھا اور لاک اپ اندر سے گرم تھا بلکہ یہ پوری عمارت ہی سینٹرلی ائر کنڈیشنڈ تھی۔ بستر کے ساتھ ہلکے سبز رنگ کا صاف ستھرا کمبل بھی رکھا تھا۔ میں نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ذرا دیر سے سہی لیکن مجھے نیند آگئی تھی پھر دس بجے کسی نے لاک اپ کا دروازہ بجایا۔ میں نے سر سے کمبل ہٹایا۔ کوئی ایک چھوٹی سی درز سے اندر ٹرے میں ناشتا رکھ کر جاچکا تھا۔ ناشتے میں دو ابلے ہوئے انڈے، دو توس سکے ہوئے اور ایک بڑا مگ سیاہ کافی کا تھا۔ ساتھ میں انڈوں پر چھڑکنے کے لیے نمک اور مرچ دانی بھی تھی۔ لندن کی سرکار کی طرف سے مہیا کردہ اس ناشتے کو دیکھ کر مجھے بے اختیار وطنِ عزیز کی حوالاتوں میں فراہم کیا جانے والا ناشتا یاد آگیا۔ جسے بمشکل ہی انسانی خوراک قرار دیا جاسکتا ہے۔ ورنہ اسے جانور بھی منہ نہ لگانا پسند نہ کریں۔

میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ واش بیسن میں لگے آئینے میں دیکھ کر بال سنوارے اس کے نیچے لگے ٹشو رول سے ٹشو لے کر منہ خشک کیا اور ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ ابھی ناشتا ختم کیا ہی تھا کہ ایک پولیس والے نے آکر لاک اپ کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کوٹ پہنا اور باہر آگیا۔ اس کی رہنمائی میں میں ویسے ہی ایک کمرے میں پہنچا جیسے کمرے میں مجھے ائرپورٹ پر روکنے کے لیے بٹھایا گیا تھا۔ اس سادہ سے کمرے میں سوائے سینٹر ٹیبل اور اس کے گرد رکھی کرسیوں کے کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف آئینہ لگا تھا جس کے عقب میں دوسرے کمرے سے یہاں ہونے والی تفتیش پر نظر رکھی جاتی ہوگی۔ یہاں پر یقیناً مائیک اور کیمرے بھی نصب تھے۔ کمرے میں انسپکٹر ڈیری نرمین کے علاوہ ایک گورا اور ایک سانولا شخص موجود تھے۔ سانولا سو فیصد پاکستانی تھا اس نے بادلِ نخواستہ اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"میرا نام سفیر اللہ ہے۔" اس نے روکھے لہجے میں کہا

"میں پاکستانی ہائی کمیشن کی طرف سے آیا ہوں۔"

"جزاک اللہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں وکیل الفریڈ ہچکاک ہوں۔ میرا تعلق بھی ہچکاک کے خاندان سے ہی ہے۔" دوسرے شخص نے خوش دلی سے کہا۔

"اور میں وہ بدنصیب ہوں جسے جمہوری انگلستان میں اترتے ہی ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں داخلِ حوالات کردیا گیا۔" میں نے خوش مزاجی سے اپنا تعارف کرایا۔

سفیر اللہ نے ناگواری سے میری طرف دیکھا "پلیز سنجیدگی اختیار کریں ناصر عظیم صاحب آپ پر ایک سنگین الزام ہے۔" "اگر میرے سنجیدہ ہونے سے کہیں پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے تو میں سنجیدہ ہوجاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سر مسٹر ناصر عظیم پر الزام ہے کہ انہوں نے ایڈگر نامی ایک سیاہ فام برطانوی شہری کو قتل کیا اور برطانیہ سے فرار ہوگئے۔"

"ایک منٹ!" وکیل الفریڈ ہچکاک نے دخل اندازی کی "ابھی تم نے بتایا تھا کہ قتل کا الزام شاہ عالم نامی شخص پر ہے جو پاکستانی شہری ہے۔ وہ پاکستانی پاسپورٹ پر لندن آیا۔ جبکہ میرے موکل کے پاس پاسپورٹ بے شک پاکستانی ہے لیکن اس پر اس کا نام واضح طور پر ناصر عظیم لکھا ہے۔ لہٰذا آپ اس پر ایڈگر نامی شخص کے قتل کا الزام لگانے سے پہلے اس کا شاہ عالم ہونا ثابت کریں۔"

"شاہ عالم ہمارے ملک کا ایک معروف سیاست دان رہا ہے۔" سفیر اللہ نے کہا۔

"اور میں ناصر عظیم ہوں۔ میرا لاہور میں بزنس ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"ہماری دلچسپی کی وجہ ان کی شاہ عالم سے غیر معمولی مشابہت ہے۔" انسپکٹر ڈیری نرمین نے محتاط انداز میں کہا "سر کیا آپ ناصر عظیم کے پاسپورٹ کی تصدیق کریں گے۔" اس نے سفیر اللہ کی طرف دیکھا۔

سامنے میز پر میرا سبز پاسپورٹ پڑا تھا۔ سفیر اللہ نے لاپروائی سے اسے دیکھا اور بولا "لگتا تو اصلی ہی ہے مگر تصدیق کے لیے پاکستان وزارتِ داخلہ سے رابطہ کرنا پڑے گا۔" "انسپکٹر...... ایک ذمے دار پاکستانی سفارتی افسر میرے موکل کے پاسپورٹ کو اصلی قرار دے رہا ہے اس لیے اسے بلا جواز حراست میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ دوسری صورت میں بارہ گھنٹے کے اندر میرے موکل کو کسی برطانوی عدالت میں پیش کرنا ضروری ہے۔ اس کی گرفتاری کو آٹھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔"

"ہمیں بھی قانونی تقاضوں کا احساس ہے لیکن ہم کسی ضمانت کے بغیر مسٹر ناصر عظیم کو نہیں چھوڑ سکتے۔" انسپکٹر ڈیری نرمین نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ڈیئر انسپکٹر برطانیہ عظمیٰ میں دس لاکھ افراد غیر قانونی طور پر روپوش ہیں۔" الفریڈ ہچکاک کے لہجے میں طنز تھا "کیا تم نے ان میں سے کسی سے ضمانت طلب کی ہے۔"

"وہ دوسرا معاملہ ہے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے تحت نہیں آتا۔" انسپکٹر نے پہلو بدلا۔

"ایک اخباری رپورٹ کے مطابق ان میں سے تمیں فیصد افراد کسی نہ کسی طرح جرائم میں ملوث ہیں۔" الفریڈ ہچکاک نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"اوکے۔ کیا تمہارا مطلب ہے کہ اگر برطانیہ میں دس لاکھ غیر قانونی تارکینِ وطن ہیں تو ان میں تمہارے ایک موکل کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مسٹر ناصر عظیم کی رہائی سے برطانیہ عظمیٰ کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ جبکہ ایک میڈیا رپورٹر اور اخبار کے مالک مسٹر عاقل خان ان کی ضمانت بھی لینے کے لیے تیار ہیں۔"

"یہ بات تم اب بتا رہے ہو۔" انسپکٹر ڈیری نرمین کے لہجے میں ناگواری تھی "کہاں ہے یہ تمہارا صحافی؟"

"میرے ساتھ آیا ہے۔ باہر ہے اجازت ہو تو اسے بلالوں۔"

"کیا مسٹر ناصر عظیم اس سے واقف ہیں؟"

میں نے سر ہلایا "ہاں عاقل خان سے میری پرانی واقفیت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد عاقل اندر آیا۔ اس نے خلافِ توقع سنجیدگی سے سب سے ہاتھ ملایا اور انسپکٹر ڈیری نرمین سے کہا۔ "میں اردو اخبار نوائے ایشیاء کا مالک اور فری لانس میڈیا رپورٹر ہوں۔" اس نے اپنا کارڈ دکھایا "مسٹر ناصر عظیم سے میرے پرانے تعلقات ہیں۔ میں ان کی ہر طرح سے ضمانت لینے کو تیار ہوں۔"

انسپکٹر ڈیری نرمین میری طرف دیکھ کر مسکرایا "مسٹر ناصر عظیم آپ کی خوش قسمتی ہے کہ برطانیہ میں آپ کے دوست موجود ہیں۔ ورنہ ہمیں آپ کو اپنے پاس رکھنا پڑتا۔"

"اس کا مطلب ہے میں جاسکتا ہوں۔"

"ہاں لیکن آپ کا پاسپورٹ ہماری تحویل میں رہے گا

اور ہاں آپ بغیر اجازت لندن سے [illegible]
انسپکٹر نے خبردار کیا اور عاقل سے بولا "مسٹر عاقل آپ اپنے ایڈریس سے مجھے آگاہ کریں۔ تاکہ جب بھی مسٹر ناصر عظیم کی ضرورت ہو ہم آپ سے رابطہ کرسکیں۔"

"یہ میرا کارڈ ہے۔" اس نے اپنا کارڈ انسپکٹر کے حوالے کیا "اس میں میرے دفتر اور گھر دونوں کے فون نمبر ہیں۔"

انسپکٹر ڈیری نرمین نے کارڈ لے لیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میرا پاسپورٹ کب تک تمہارے پاس رہے گا؟"

"جب تک ہماری تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی۔" پھر اس نے عاقل کو خبردار کیا "مسٹر عاقل اب مسٹر ناصر کی تمام ذمے داری آپ پر ہے۔ کسی قسم کے حالات میں آپ جواب دہ ہوں گے۔"

اس کا مطلب واضح تھا اگر میں فرار ہو گیا تو عاقل پکڑا جائے گا۔ اس سے ضمانت نامے پر سائن حاصل کیے گئے تب مجھے اس کے ساتھ جانے کی اجازت ملی۔ باہر عاقل کی سفید رولز رائس کھڑی تھی میں نے رشک سے کہا "برخوردار تم نے خاصی ترقی کرلی ہے۔ عینی تمہارے لیے خوش قسمتی کا باعث ہے۔"

"غالباً یہ غلط فہمی آپ کو کار دیکھ کر ہوئی ہے۔ یہ محترمہ قائم مقام ساس صاحب کی ہے۔"

"اتنا لمبا نام لینے کی کیا ضرورت ہے نیلم کہہ دینا کافی ہے۔" میں ہنسا۔

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "میں نے ایسی گستاخی کا سوچا بھی تو ان سے پہلے عینی نے میرا حشر نشر کر دینا ہے۔"

"تم لوگوں کو چندا نے بتایا ہوگا۔"

"چندا...... اچھا...... وہ خاتون کیا خوب ہیں۔"

"وہ تمہاری ساس نمبر دو ہوگی۔" میں نے اسے خبردار کیا "اور نیلم سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"حضرت آپ کی تقدیر پر رشک آتا ہے۔ ہمیشہ کسی حسین و جمیل خاتون سے واسطہ پڑتا ہے۔" اس نے کار قطار سے نکال کر سڑک پر لاتے ہوئے کہا "سنا ہے وہاں بھی آپ کے لیے جان سے گزر گئیں۔"

اس کا اشارہ آفرین کی طرف تھا۔ میرے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ وہ پیکرِ رنگ و خوشبو اب خاک ہو چکا تھا۔ بس اس کا ذکر ہی باقی رہ گیا تھا "ہاں کیا خوب تھی وہ۔" میں نے گہری سانس لی "خیر یہ بتاؤ ابھی کہاں کا قصد ہے؟"

"فی الوقت تو میں اپنے دفتر جاؤں گا۔ وہاں چھوٹا سا

[illegible] خانہ بنا ہوا ہے۔ سارے ہی ماں باپ سے محروم ہیں۔"

"ذرا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو آنے والا بھی شفقت پدری سے محروم ہو جائے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔

"مجھے بھی آثار کچھ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے جب تک محترمہ قائم مقام ساس صاحبہ میری زندگی پر مسلط ہیں۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"عاقل کیا بات ہے۔ میں نوٹ کر رہا ہوں۔ تم نیلم سے بیزار ہوتے جا رہے ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے کار لندن کے رواں ٹریفک میں شامل کر دی "دیکھیے صاحب...... میں نے شادی کی تھی گھر کے سکون کے لیے۔ بیوی کے لیے جو مجھ پر توجہ دے اور میں اس پر توجہ دوں لیکن گزشتہ دو مہینے سے یہ ہو رہا ہے کہ میں جاب سے تھک کر جب گھر آتا ہوں تو عینی نیلم صاحبہ کے ساتھ نکلی ہوتی ہے۔ کسی شاپنگ ٹور پر یا کسی تفریح کے لیے اور جب وہ واپس آتی ہیں تب بھی عینی میرے پاس نہیں آنے پاتی ہے۔ انہوں نے عینی پر یوں قبضہ کر لیا ہے کہ میں بیوی کے لیے ترس کر رہ گیا ہوں۔" اس کا لہجہ تلخ سا ہو گیا تھا۔

"[illegible] اگر تمہیں ہمارے رہنے پر اعتراض ہے تو ہم آج ہی کہیں اور منتقل ہو جاتے ہیں۔"

"کم سے کم آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی "آپ میرا مسئلہ سمجھنے کے بجائے جذباتی ہو جائیں گے۔ آپ شاید بھول رہے ہیں یہ غریب خانہ آپ کے تعاون سے خریدا گیا تھا۔"

"اس کے لیے تمہیں میرا زیرِ بار ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے عینی کو ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے اور اسے یہ گفٹ کیا تھا۔ اب تمہاری بیوی ہونے کے ناتے مکان بھی تمہارا ہے۔"

"بخدا مجھے مکان سے کوئی غرض نہیں۔" وہ جھلا گیا تھا "پہلے بھی لندن میں رہ رہا تھا۔ میں عینی کی بات کر رہا ہوں وہ میری بیوی ہے اس لیے اسے میری بات ماننا چاہیے۔ نہ کہ نیلم صاحبہ کے اشاروں پر چلنا چاہیے۔"

"دھیرج رکھو برخوردار!" میں نے اسے سمجھایا "عینی ایک خاص مرحلے سے گزر رہی ہے اور اس موقع پر اسے کسی عورت کی توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"معاف کیجیے گا۔ نیلم صاحبہ کو ویسے تو بہت تجربہ ہے لیکن ماں بننے کا انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

اس کی بات کڑوی تھی لیکن سچی تھی۔ اچانک مجھے احساس

ہوا کہ عاقل کو سب سے زیادہ اعتراض نیلم کے فلم ایکٹریس ہونے پر تھا۔ اس کے خیال میں وہ کوئی پاکباز عورت نہیں تھی۔ یہ خیال درست بھی تھا۔ نیلم کا ماضی زیادہ اچھا نہیں تھا لیکن اب وہ ایک شریف عورت تھی جو شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی تھی۔ عاقل برسوں لندن جیسے شہر میں رہنے کے باوجود ابھی تک روایتی مشرقی ذہنیت کا مرد تھا جو اپنی عورت کے معاملے میں بے حد حساس ہوتا ہے۔ عاقل نہیں چاہتا تھا کہ عینی نیلم سے زیادہ گھلے ملے یا اس کے اثرات قبول کرے۔ اس سے اپنی آئندہ زندگی بے سکون ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔

"اوکے۔ میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں اور میں اسے سلجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"لیکن ابھی تو آپ خود مسائل سے دوچار ہیں۔" اس نے عقبی آئینے میں دیکھا "مجھے شبہ ہو رہا ہے بلیک ڈاج جس میں دو کالے بیٹھے ہیں پولیس اسٹیشن سے ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

میں چونکا "اگر یہ ہمارے تعاقب میں ہیں تو ان کا تعلق یقیناً ولیم اینڈ سنز سے ہوگا۔"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" اس نے کار تیزی سے ایک ذیلی سڑک میں گھما دی۔ چند لمحے کے وقفے کے بعد سیاہ ڈاج بھی اس سڑک پر مڑتی نظر آئی "وہ ہمارے پیچھے ہی آ رہے ہیں۔ ان کے عزائم درست نہیں لگتے۔ ذرا سنبھل کر بیٹھیں۔"

اس نے کہتے کہتے رولز رائس کا ایکسی لیٹر دبایا۔ یک لخت کار کی رفتار میں بے پناہ تیزی آ گئی تھی۔ رولز رائس اپنے انجن کی وجہ سے مشہور ہے۔ پچپن کلومیٹر فی گھنٹے سے ایک سو کلومیٹر فی گھنٹے تک پہنچنے میں کار کو بمشکل چند سیکنڈ لگے تھے۔ ڈاج ذرا پیچھے ہوئی لیکن رفتار کے معاملے میں ڈاج بھی کم نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ ہمارے پیچھے آتی نظر آئی۔ عاقل نے رولز رائس کے بہترین انجن اور ٹائروں کی روڈ گرپ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے گلیوں میں چکرانا شروع کر دیا لیکن ڈاج والے بھی مستقل مزاجی سے پیچھے لگے رہے۔

"ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔" میں نے مڑ کر دیکھا۔

"اپنا پاکستان ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا لیکن یہ لندن ہے۔ ذرا سی قانون کی خلاف ورزی کرو پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ ہم پہلے ہی ان سڑکوں پر رفتار کی حد کی ایسی کم تیسی کر چکے ہیں۔"

"بھاڑ میں گئی پولیس!" میں نے بھنا کر کہا "اگر ان کالوں نے مشین گن کا برسٹ چلا دیا تو لندن کی پولیس ہمیں نہیں بچائے گی بلکہ اس وقت پولیس کا ہمارے پیچھے لگنا بہتر رہے گا۔"

"جو حکم جناب کا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "آج کل بندہ ویسے ہی حکم کا غلام بنا ہوا ہے۔"

اس نے رولز رائس کو بیچ بیچ بھگانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاج کہیں پیچھے رہ گئی۔ اس نے فوراً رفتار کم کر کے کار ایک پارکنگ میں گھسا دی۔ گیٹ پر کھڑے شخص نے ٹکٹ دے کر ہمیں پارکنگ کی اجازت عنایت فرما دی۔ یہ کئی منزلہ کار پارکنگ تھی جس کی دو زیرِ زمین منزلیں بھی تھیں۔ عاقل نے اوپر جانے کے بجائے نچلی منزل میں اترنے کو ترجیح دی۔ میں نے کہا "یہ بظاہر تو دفاتر نظر نہیں آ رہے پھر اتنی بڑی پارکنگ کس لیے؟"

"آپ نے غور کیا۔ اس علاقے میں چار منزلہ عمارتیں ہیں۔ جن میں پارکنگ کی گنجائش نہیں ہے۔ اردگرد رہنے والے اپنی گاڑیاں یہیں پارک کرتے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا "یہاں رکنے کا مقصد؟"

"ممکن ہے وہ لوگ ان گلیوں کے چکر لگا رہے ہوں۔ یہ ساری سیدھی گلیوں والا علاقہ ہے۔ وہ ایک سڑک سے گزرتے ہوئے ہر گلی کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ جب تک وہ دفع نہیں ہو جاتے ہم یہیں پناہ گزین رہیں گے۔"

میں نے کار سے اتر کر ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ لندن میں شدید سردی کا موسم تھا لیکن پارکنگ اندر نارمل حد تک سرد تھی۔

شاید دو تین دن پہلے برفباری ہوئی تھی جس کی باقیات ابھی تک کہیں کہیں نظر آ رہی تھیں۔ عاقل بھی باہر نکل آیا۔

"نوادرات کہاں محفوظ ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میرے دفتر کے پاس ہی ایک دفتر کرائے پر لے کر اس میں رکھے ہیں لیکن میں سوچ رہا ہوں تھوڑے تھوڑے کر کے انہیں لاکرز میں محفوظ کر دوں یہاں مختلف ادارے معقول کرائے پر مختلف سائز کے لاکرز فراہم کرتے ہیں۔ نوادرات کا اکثر سامان ان لاکرز میں آ جائے گا۔ جو ان لاکرز میں نہیں آ سکتا ہے اسے میں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ آفس میں ایسی چیزیں رکھنا صحیح نہیں ہے یہاں آئے دن دفتروں میں چوریاں ہوتی ہیں۔ چور عموماً چھوٹا موٹا سامان، کمپیوٹر اور دفتری آلات پر چرا کر لے جاتے ہیں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ کچھ دیر بعد جب اسے

محسوس ہوا کہ اب باہر خطرہ نہیں ہے اس نے کار پارکنگ سے باہر نکالی اور اپنے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا" کیا اس کار کی مدد سے وہ تمہارا سراغ نہیں لگا سکتے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نیلم صاحبہ نے کار اپنے نام سے لی ہے اور اس کی رجسٹریشن میں پتا اپنے لندن کے نواحی ولا کا دیا ہے۔"

"نیلم نے یہاں مکان لے لیا ہے؟"

اس نے سر ہلایا "اور بڑا شان دار قسم کا ہے۔ فرنش لیا ہے بالکل نیا ہے اور سامان بھی زیادہ استعمال شدہ نہیں ہے جو لارڈ بیچ رہا تھا۔ نیلم کے فلم ایکٹریس ہونے کا سن کر اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی اس نے مکان مارکیٹ سے بھی کم قیمت پر دیا ہے۔"

"انگریز فنکاروں کی صحیح قدر کرتے ہیں۔" میں نے کہا "ورنہ ہمارے ہاں تو انہیں بھانڈ اور میراثی سمجھا جاتا ہے۔"

"فنکاروں نے بھی اپنی عزت کا خیال کہاں رکھا ہے۔" عاقل نے اختلاف کیا "ان کا پہلا مقصد پیسہ ہوتا ہے۔"

"یہ تو پوری قوم کا مرض ہے۔" میرا لہجہ تلخ ہوگیا تھا "صرف فنکاروں کو الزام دینا درست نہیں ہوگا۔"

عاقل چپ ہوگیا۔ ذرا سی دیر میں اس کا دفتر آ گیا۔ اس عمارت میں زیادہ تر اخبارات اور رسائل کے دفاتر تھے جن کا اظہار وہاں لگے بورڈز سے بھی ہو رہا تھا۔ عاقل کا دفتر چوتھی منزل پر تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر خاصا شان دار قسم کا تھا۔ وہاں سات آٹھ افراد کا عملہ کام کر رہا تھا۔ عاقل کا دفتر ایک خوب صورت سے کیبن پر مشتمل تھا۔ اس نے کافی کا کہا اور کسی مشتاق کے بارے میں پوچھا۔ مشتاق باہر گیا تھا۔

"یہ مشتاق کون ہے؟" میں نے اس کے کمرے میں میز کے ایک طرف کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اخبار کا رپورٹر ہے۔ سمجھ لیں کہ مرحوم شرلاک ہومز کی روح اس میں ہے خبریں یوں نکال کر لاتا ہے جیسے دلہا باراتیوں کے بیچ سے دلہن نکال لاتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اسے ولیم کے پیچھے لگا دوں۔ اگر اس کی کوئی کمزوری ہاتھ آ گئی تو اس سے تصفیہ کرنا آسان ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے یہ سارا پیسے کا چکر ہے ورنہ اس بات سے تو وہ بڈھا بھی واقف ہے کہ اس کا بیٹا جارج کے ہاتھوں مارا گیا ہے میں نے ایڈگر کی صرف ایک کلائی توڑی تھی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ان کو رقم کی پیشکش کرنا بھوکے بھیڑیوں کو گوشت دکھانے کے مترادف ہے۔ ان کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوگی۔"

"بس یار ایک بار اس چکر سے نکل جاؤں تو لعنت ہے دوبارہ اس ملک میں آؤں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "آپ پاکستان واپس نہیں جا سکتے اور اگر لندن سے فرار ہوئے تو یہ انٹرپول کے ذریعے پورے یورپ بلکہ ساری مہذب دنیا میں داخلہ بند کر دیں گے۔ لہٰذا جو کرنا ہے قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا ہے۔"

اس اثناء میں مہکتی ہوئی گرم کافی آ گئی۔ عاقل نے دو تین جگہوں پر فون کیا اور مشتاق کے بارے میں معلوم کیا مگر وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ عاقل نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا "مردود یقیناً کسی گرل فرینڈ کی بغل میں گھسا ہوگا۔ زبان کا تیز ہے منٹوں میں لڑکیوں کو شیشے میں اتار لیتا ہے۔ لندن کے ہر علاقے میں اس کی کوئی نہ کوئی گرل فرینڈ رہتی ہے۔"

"یعنی بوقتِ ضرورت موصوف کی بازیابی کے لیے درجن بھر پتوں کو کھنگالنا پڑے گا۔" میں ہنسا۔

"دو درجن کا عدد درست رہے گا۔ اپنا گھر بھی نہیں ہے جس علاقے میں رات ہو جائے وہیں کسی گرل فرینڈ کے گھر سو جاتا ہے۔"

"لگتا ہے میرا ذکر ہو رہا ہے۔" ایک نوجوان نے دفتر میں قدم رکھا۔ وہ دبلا پتلا اور سانولے رنگ کا تھا۔ قد ذرا لمبا تھا چہرے کے نقوش معصومانہ اور آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس کے لمبے بال شانوں تک آ رہے تھے۔

"کہاں دفع ہو جاتے ہو تم بتائے بغیر۔" عاقل نے خفگی سے کہا۔

"جانا کہاں ہے۔ آپ کے ہی کام سے گیا۔ لارڈز کے میچ میں گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایک تماشائی کے چاقو لگا ہے۔ خبر اندر ہی دبا دی گئی ہے کیونکہ تماشائی آسٹریلیا کا تھا۔" اس نے ایک کاغذوں کا پلندہ عاقل کے سامنے رکھ دیا "اور اب اجازت ہو تو جاؤں۔ گلوریا سے ملنا ہے۔"

"گلوریا کون۔ وہ جو بانڈ اسٹریٹ پر رہتی ہے۔" عاقل نے کاغذات الٹتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو جولیا رہتی ہے۔ گلوریا کنگسٹن کے علاقے میں رہتی ہے بڑے باپ کی بیٹی ہے۔"

"تمہیں ایڈگر مرڈر کیس یاد ہے۔" عاقل نے پوچھا۔

"رائٹ یاد آ گیا۔" اس نے چٹکی بجائی "میں یاد کر رہا تھا یہ شاہ عالم ہیں۔ جنہیں اس مرڈر کا ملزم قرار دیا گیا تھا لیکن یہ اس سے پہلے ہی پاکستان کے لیے پرواز کر گئے تھے۔" اس نے ہاتھ سے جہاز کا اشارہ کیا۔

"میں شاہ عالم نہیں ہوں۔" میں نے متانت سے کہا "میرا نام ناصر عظیم ہے۔ میں اس سے مشابہت کی بنا پر مارا گیا ہوں۔"

اس نے سیٹی بجائی "اتنی مشابہت۔ میں نے شاہ عالم کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ لندن کے اس ہوٹل میں دو سال کام کیا ہے جہاں شاہ عالم ہر مہینے آیا کرتا تھا۔"

"بہرحال تم اس کیس میں ایڈگر کے باپ ولیم کے پیچھے لگ جاؤ۔ وہ ناصر عظیم کے خلاف جعلی گواہ پیدا کر کے انہیں پھنسانا چاہتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی کوئی کمزوری تلاش کرو لیکن خود بلیک میل کرنے مت لگ جانا۔"

"میں ایک شریف صحافی ہوں میں نے آج تک کسی کو بلیک میل نہیں کیا۔" اس نے احتجاج کیا "ابا حضور کو بھی نہیں جو خاندانی نواب ہیں اور برسٹل میں ہوٹل چلا رہے ہیں۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔" عاقل نے اشارہ کیا۔

"یعنی گلوریا...... بے چاری انتظار کرتی رہ جائے گی۔" اس نے سرد آہ بھری اور رخصت ہوگیا۔

"ایک نمبر کا عاشق مزاج ہے لیکن اپنے کام کے سلسلے میں انتہائی سنجیدہ ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ بہت ترقی کرے گا۔"

عاقل نے کچھ ضروری کام نمٹائے۔ اس دوران میں میں نے اس کے گھر فون کر کے باری باری سب سے بات کی۔ وہ سب میری رہائی کا سن کر خوش تھے۔ خاص طور سے عینی اتنی بے تاب تھی کہ عاقل کے دفتر آنے کے لیے تیار ہوگئی تھی میں نے اسے ڈانٹا "کوئی ضرورت نہیں ہے گھر سے نکلنے کی۔ لندن آ کر تم دیدہ ہوائی ہوگئی ہو۔ جب فون کرو محترمہ سو رہی ہوتی ہیں یا باہر نکلی ہوتی ہیں۔"

"یہ انہوں نے بھڑکایا ہوگا۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"کسی نے نہیں بھڑکایا۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔"

جب ہم جانے کے لیے نکلے تو میں نے عاقل سے کہا "مجھے نوادرات والا دفتر بھی دکھا دو۔"

"ہاں۔ یہ اچھا خیال ہے۔ بالکل پاس ہی ہے۔ ویسے بھی میں دن میں ایک آدھ بار چکر لگا لیتا ہوں۔ تاکہ کوئی دفتر کو بالکل ہی لاوارث نہ سمجھے۔"

عاقل نے دفتر اپنے دفتر کی عمارت سے دوسری بلڈنگ میں لیا تھا۔ یہ فرسٹ فلور پر لیکن عقبی سمت میں تھا۔ ہم عقبی حصے سے اندر گئے۔ جہاں سے آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے کسی نے ہم پر توجہ بھی نہیں دی۔ عاقل نے دفتر کا دروازہ کھولا۔ روشنیاں جلائیں۔ یہ ایک ہی ہال پر مشتمل دفتر تھا۔ جس میں وہ سارے کارٹن سلیقے سے رکھے تھے۔ جن میں کروڑوں بلکہ شاید اربوں روپے مالیت کے نوادرات محفوظ تھے۔ لارڈ جیمز نے ان کی قیمت ساڑھے چھ لاکھ برٹش پاؤنڈز لگائی تھی۔ جو پاکستانی کرنسی میں کوئی چھ کروڑ بنتے ہیں مگر افسوس اس ڈیل سے نہ تو اسے کچھ ملا اور نہ ہی جمی کو۔ نوادرات میں نے حاصل کر لیے اور ساڑھے تین لاکھ پاؤنڈز کی رقم بھی میرے حصے میں آئی تھی ایک ہارٹ اٹیک سے مر گیا اور دوسرا جیل میں خودکشی کر کے حرام موت مر گیا۔ یہ دولت اور نوادرات اسی طرح پڑے رہ گئے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور عاقل سے کہا "چلو یار یہاں سے مجھے ان سے وحشت ہو رہی ہے۔"

"مجھے خود بھی اچھے نہیں لگتے نہ جانے کتنے انسانوں کا خون ان کے پیچھے بہایا گیا ہوگا۔" اس نے دفتر کی روشنیاں بند کیں۔ دروازے کو لاک لگایا۔ یہ معمولی سا لاک تھا جسے کوئی اچکا آسانی سے کھول سکتا تھا۔ مجھے وہاں پر کوئی الارم بھی نظر نہیں آیا تھا۔ عاقل نے میرے اندازے کی تصدیق کی "الارم میں نے خود نہیں لگایا۔ چوری کی صورت میں پولیس آ جاتی تو میں اسے کیا بتاتا کہ میں نوادرات کہاں سے لایا تھا۔ چور تو بعد میں پکڑا جاتا میں پہلے پکڑ لیا جاتا۔ ویسے دن میں کوئی یہ کام کر نہیں سکتا ہے۔ ایک آدھ چیز لے جانا الگ بات ہے مگر اتنے ڈھیر سارے نوادرات لے جانا دن دہاڑے کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"تم بھول رہے ہو۔ ہم نے بھی یہ نوادرات اسی طرح چرائے تھے۔"

"ہاں لیکن وہ ایک عام سی عمارت تھی۔ یہ ایک کمرشل بلڈنگ ہے جس کی حفاظت بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ اس کے داخلی راستوں پر کیمرے نصب ہیں جو ہر آنے جانے والے کی تصویر لیتے ہیں یہاں سے کچھ چرانا ویسے ہی دشوار ہے اور رات کو یہ عمارت بند ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں نوادرات کی حفاظت سے مطمئن نہیں ہوں۔ ذرا یہ عینی والا معاملہ نمٹ جائے تو میں انہیں تھوڑا تھوڑا کر کے مختلف لاکروں میں منتقل کر دوں گا۔"

میں چونکا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ننھا مہمان کب تک آ رہا ہے اور نیلم ہماری تھی لڑکا ہے۔"

وہ شرما گیا "بس جناب تشریف لانے ہی والے ہیں جنوری کے پہلے ہفتے میں۔"

"یعنی ابھی پندرہ بیس دن باقی ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "برخوردار خوش قسمت ہوں گے پیدائشی طور پر برطانیہ کے شہری ہوں گے۔ ہمیں تو خاصے پاپڑ بیلنے

پڑے تھے۔"

باتوں میں راستہ کٹا مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب عاقل کا فلیٹ آ گیا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ دروازے پر دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سب ہی دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ سب سے آگے رئیس تھا وہ ہی مجھ سے چمٹ گیا اس نے مجھے مکے مارے اور وہ ساری گالیاں دیں جو وہ ایک زمانے میں مجھے بے تکلفی سے دیا کرتا تھا مگر نیلم خفا ہو گئی۔

"یہ کیا بے ہودہ زبان استعمال کر رہے ہو۔"

"ناصر سے اپنی ایسی ہی زبان بولیں گے۔" اس نے اعلان کیا "چاہے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔"

رئیس نے چھوڑا تو عینی چمٹ گئی۔ پھس پھس کر روتے ہوئے اس نے مجھے ظالم اور بے وفا کے خطابات سے نوزا۔

"پاکستان جا کر آپ بھول ہی گئے کہ آپ کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔"

"پگلی تجھ سے دور جانے کا مطلب تجھے بھول جانا تو نہیں ہے۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے ڈانٹا "تو سخت کام چور اور نکمی ہے۔ میں سوچ رہا تھا یہاں کوئی مجھے ماما جی کہنے والا موجود ہو گا مگر یہاں تو ایسی منحوس صورتیں نظر آ رہی ہیں۔" میں نے رئیس کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔" رئیس نے خفگی سے کہا۔

"ایسا نہ کہو۔ بڑی بڑی حسینائیں مرتی ہیں۔" میں نے چندا کی طرف دیکھا جو سب سے پیچھے کھڑی تھی۔

"جی اور بعض تو سچ مچ مر جاتی ہیں۔" نیلم نے طنز کیا "یہ آفرین کا کیا چکر تھا۔"

"بابا چھری تلے دم تو لینے دو۔ ابھی آیا ہوں چائے پانی کا پوچھو بلکہ کھانے کا پوچھو۔ طفریہ سوالات کا سیشن کھانے کے بعد ہو گا۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

"کھانا تیار ہے بھیا۔" عینی بولی "میں نے اپنے ہاتھ سے مرغ پلاؤ بنایا ہے۔"

"خدا خیر کرے بی بی۔" میں نے ڈرنے کی اداکاری کی "جب تمہیں چھوڑ کر گیا تھا تو تمہیں سوائے ہاتھ اور زبان چلانے کے کچھ نہیں آتا تھا۔ یہ چکن پلاؤ کیسے سیکھ لیا اور اسے کھائے گا کون؟ عاقل کے سوا ظاہر ہے، اس میں انکار کی مجال نہیں ہے۔"

"جی نہیں۔ سب کھائیں گے اور تعریف بھی کریں گے۔" عینی نے اعلان کیا۔

"چلو تمہارے لیے یہ بھی منظور ہے لیکن پہلے احتیاطاً میں ڈاکٹر کو ایمبولینس کا کہہ دوں۔"

عینی نے واک آؤٹ کیا اور کچن میں چلی گئی۔ اس کی نازک سی کمر اب پھیل کر کمرے سے ہال بن گئی تھی لیکن چہرے پر ویسی ہی معصومیت اور تازگی تھی جو شادی سے پہلے تھی۔ عاقل نے واضح طور پر اسے بے حد خوش رکھا تھا لیکن وہ نیلم کی آمد سے بالکل خوش نہیں تھا۔ ہم سب اس کے مکان کے لیونگ روم میں آ گئے اسے مشرقی انداز میں سجایا گیا تھا۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ میں قالین پر دراز ہو گیا۔ چندا اور نیلم عینی کا ہاتھ بٹانے کچن میں چلے گئے تھے۔ لہٰذا میں نے رئیس کو موقع پا کر لاہور کے وہ حالات بتا دیے جو میرا نیلم کو بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس سے صرف اس کے دل کو ٹھیس لگتی کہ میں اس سے جھوٹ بول کر اور بے وقوف بنا کر لاہور میں رک گیا تھا۔ رئیس خاموشی سے سنتا رہا۔ رب نواز کے خاتمے کی خبر نے اسے زیادہ خوش نہیں کیا تھا۔

"ناصر ابھی اس خاندان کے بے شمار دوسرے لوگ باقی ہیں۔ انہیں رب نواز سے کم نہ سمجھ۔ یہ سب خشم مزاج اور ذلیل فطرت کے لوگ ہیں جس کے دشمن بن جائیں اس کی نسلوں تک کو مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔"

"فکر نہ کر میرے یار جب رب نواز سے نمٹ لیا ہے تو ان سے بھی نمٹ لیں گے۔ ویسے میرے لندن آنے کے باوجود وہاں کام جاری ہے۔" میں نے اسے اکبر کے بارے میں بتایا "بہت ہی اچھا اور مخلص آدمی ہے۔ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن۔ تم ملو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

"یہ بے ایمانی ہے۔" نیلم نے اندر جھانکا "ہماری غیر موجودگی میں پاکستان کی کوئی بات نہیں ہو گی۔"

"ہم پاکستان کی بات کب کر رہے ہیں۔" عاقل نے معصومیت سے کہا۔

"اور کیا یہ تو لیموں کی بات کر رہا تھا۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"کیا؟" دروازے پر عینی نمودار ہوئی "کس کی بات کر رہے تھے؟" اس نے کھا جانے والی نظروں سے عاقل کو دیکھا۔

"کسی کو نہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا "ہم لیموں کی بات نہیں کر رہے تھے۔"

"ہاں ہم گوریوں کی بات کر رہے تھے۔" رئیس نے ایک بار پھر اسے مروا دیا۔

عینی نے آتش فشاں نظروں سے اسے دیکھا اور پیر پٹختی

چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد عاقل نے نقش فریادی بن کر کہا "مروا دیا۔ حالات تو پہلے ہی میرے لیے اچھے نہیں ہیں۔"

"ابھی کہاں مروایا۔" میں نے خلوص سے کہا "ابھی مروائیں گے۔"

کھانے تک عینی کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس نے چکن بریانی کے ساتھ بہاری کباب اور سویٹ ڈش میں زردہ بنایا تھا۔ حیران کن طور پر سب ہی لذیذ تھا لیکن میں نے سب سے زیادہ کھانے کے باوجود یہی ظاہر کیا کہ بادلِ نخواستہ محض اس کا دل رکھنے کے لیے کھا رہا ہوں اور کھانے کے بعد پیٹ پکڑ کر ہیضہ ہونے کی اداکاری کی۔

"عینی کی بچی۔ کس جنم کا بدلہ لیا ہے۔ آہ..... چندا اگر میں فوت ہو گیا تو تم میرا بدلہ ضرور لینا۔ عاقل سے!"

"مجھ سے کیوں؟" اس نے اعتراض کیا۔

"تمہاری بیوی ہے نا۔ ہوتی میری بہن اور ایسا کھانا بناتی تو میں ہوٹل میں جا کر کھا لیتا۔"

"بس بس بھائی......" عینی خفا ہو گئی "اب اتنا بھی خراب نہیں بنایا ہے۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "چلو تم نے اعتراف تو کیا۔ یعنی کچھ خراب بنایا تھا۔"

عینی ناراض ہو کر جانے لگی تو مجھے اسے اٹھ کر منانا پڑا اور کھانے کی تعریف کرنے کے ساتھ سو پاؤنڈ ٹپ بھی دیے۔ تب جا کر اس کا موڈ اچھا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد مجھ پر خمار طاری ہونے لگا۔ میں کمبل لے کر لیونگ روم میں ہی دراز ہو گیا اور ان لوگوں کی باتیں سنتے سنتے جانے کب سو گیا تھا پھر جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ عینی نے میری نیند میں خلل کی وجہ سے لیونگ روم کی روشنیاں نہیں جلائی تھیں۔ میں تقریباً چھ گھنٹے سویا تھا۔ کسی کمرے سے ان لوگوں کے بات کرنے اور چندا کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں انگڑائی لے کر اٹھا۔ باہر آیا۔ پہلے غلط کمرے میں چلا گیا۔ یہ عینی اور عاقل کا بیڈ روم تھا۔ اب وہاں ہر طرف آنے والے مہمان کے کپڑے اور سامان بھرا تھا۔ اس کے لیے بھرپور جذبے اور جوش و خروش سے شاپنگ کی گئی تھی۔

وہ لوگ دوسرے بیڈ روم میں تھے۔ یہ نیلم کا بیڈ روم تھا۔ رئیس ظاہر ہے لیونگ روم میں سوتا ہو گا۔ وہ سب جہازی سائز بستر پر چڑھی ہوئی سر جوڑے باتیں کر رہی تھیں اور مسلسل ہنسے جا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

"یہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو کیوں بتائیں ہماری آپس کی باتیں ہیں۔"

"یعنی خواتین کی باتیں۔" میں نے سر ہلایا "مت بتاؤ مجھے لیکن ایک اور فرد بھی یہ ساری باتیں سن رہا ہو گا۔"

"کون؟" ان کے چہرے پر سوالیہ نشان نمودار ہوا پھر مجھے ہنستا دیکھ کر سب سے پہلے عینی اٹھ کر فرار ہوئی اور چندا منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ نیلم نے خفگی سے کہا "بے ہودہ کہیں کے۔"

"نہ چائے نہ پانی بس خطابات شروع۔ تین تین عورتوں کا کیا فائدہ؟"

"تین کہاں یہاں تو صرف ایک عورت ہے۔" چندا معصومیت سے بولی۔

"اچھا بابا لڑکیاں ہی سہی لیکن کوئی چائے تو لا دے۔" میں نے فریاد کی "سر اور جسم بھاری ہو رہا ہے۔"

"ایسا کرو جب تک چائے بنتی ہے نہا لو۔" نیلم نے مشورہ دیا اور چندا سے بولی "دیکھو اس کا کوئی سوٹ نکال دو۔"

چندا نے فرمانبرداری سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میرے احتجاج کے باوجود کہ اتنی سردی میں نہیں نہاتا ہے۔ نیلم نے زبردستی مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا "یہاں گرم پانی آتا ہے۔"

واقعی گرم پانی کے ٹب اور خوشبودار پانی نے ذہن اور جسم کا سارا بھاری پن دور کر دیا تھا۔ میں باتھ روم سے تازہ دم نکلا تو چندا چائے لیے میری منتظر تھی "یہ دونوں کہاں ہیں؟"

"کچن میں۔" اس نے کہا۔

"میں رئیس اور عاقل کا پوچھ رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کی۔

"وہ دونوں شام سے کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔" چندا بولی۔ کل سفر کے دوران اس نے سادہ سی شلوار قمیص پہنی تھی لیکن اس وقت وہ کچھ اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا کرتا اور پاجامہ پہن رکھا تھا جو اس کی خوب صورت ٹانگوں پر پھنسا ہوا تھا۔ جالی دار دوپٹے میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ میرے دیکھنے سے وہ شرما گئی۔

"ایسے مت دیکھا کرو۔"

"پھر کیسے دیکھا کروں۔ پاس سے آ کر۔" میں اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے بچنا چاہا لیکن پھر ہتھیار ڈال کر سر میرے سینے سے لگا دیا "ناصر ہماری آزمائش کے دن کب ختم ہوں گے۔" اس نے آزردگی سے کہا۔

"بہت جلد میری جان!" میں نے اس کے بالوں پر

بٹ رکھ دیے۔
''ناصر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں کی پولیس بہت سخت ہے۔ اگر انہوں نے معلوم کر لیا کہ تم شاہ عالم بن کر آئے تھے تو حالات خراب ہو جائیں گے۔''
''وہ نہیں معلوم کر سکیں گے۔'' میں نے یقین سے کہا ''میرا ناصر عظیم کا مکمل پس منظر ہے۔ میرے پاس اصلی پاسپورٹ ہے اس کی تصدیق پاکستانی سفارت خانہ کر دے گا۔''
''پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' مجھ سے لگا اس کا نازک بدن لرز اٹھا تھا۔
''چندا ہم اس سے بھی برے حالات سے گزرے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ خدا نے ہماری مدد کی۔ آنے والا وقت بھی اچھا ہی ہوگا۔ مجھے اپنے بے گناہ ہونے کا یقین ہے۔ خدا ضرور میری مدد کرے گا۔''
اسی لمحے نیلم دروازے پر نمودار ہوئی تو چندا جلدی سے مجھ سے الگ ہو کر آنکھیں صاف کرنے لگی۔ میں نے خفیف ہو کر نیلم کی طرف دیکھا جو مسکرا رہی تھی ''تم نے بھی ابھی ہی آنا تھا۔''
''سوری...... اصل میں فون آیا ہے...... کسی انسپکٹر گوالے کا۔''
''ڈیری ٹرمین۔'' میں نے جلدی سے کہا ''ابھی آیا!'' اور پھر نیلم کی پروا کیے بغیر چندا کے آنسو صاف کیے ''پریشان مت ہو۔ میرے ہوتے ہوئے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''
فون راہداری میں تھا ''ہیلو۔'' میں نے کہا ''ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔''
''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔'' اس نے کہا ''پاکستانی ہائی کمیشن نے تمہارے پاسپورٹ کی تصدیق کر دی ہے۔''
''اب میرا خیال ہے تمہاری تسلی ہو گئی ہے۔''
''ہاں...... لیکن پوری طرح نہیں۔ ابھی اس کیس کے کئی پہلو تصفیہ طلب ہیں۔ آخر دلیم اور اس کے بیٹے تمہارے خلاف ہی کیوں ہیں؟''
''شاہ عالم کے خلاف ہیں۔'' میں نے تصحیح کی ''اور بدقسمتی سے میری صورت شاہ عالم سے ملتی ہے۔ پاکستان میں بھی اسی وجہ سے مجھے کئی بار مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے پھیلائے بکھیڑے لندن میں بھی میرے منتظر ہوں گے۔''
''میں نے اس کی کیس ہسٹری دیکھی ہے۔ شاہ عالم واقعی ایک معروف شخص تھا۔''
''میرے بھی کئی حوالے ہیں اگر تم چاہو تو پاکستان سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہو۔ وہاں کے معتبر اور معروف لوگ میرے بارے میں گواہی دیں گے۔ ان میں دو ڈاکٹرز ہیں۔ ایک وکیل ہے، ایک معروف فلمی اداکارہ ہے۔ یہ سب میرے نزدیکی جاننے والے ہیں جو میری زندگی کے ایک ایک لمحے کے گواہ ہیں۔ وہ اس بدمعاش اور اس کے بیٹوں سے کہیں زیادہ معتبر لوگ ہیں۔''
''میں سب دیکھوں گا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم جی اور لارڈ جیمز نامی شخص سے واقف ہو۔''
''نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''میں پہلی بار یہاں کے حوالے سے یہ نام سن رہا ہوں۔''
''ممکن ہے آج شام ہیڈ کوارٹر میں تمہیں بلایا جائے کونٹیکٹ میں رہنا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔
عینی کے کمرے میں آیا تو چندا اپنا لایا سامان بھی سوٹ کیسوں سے نکال کر وہاں پھیلا رہی تھی۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا ''بابا آنے والے کے لیے بھی کچھ جگہ چھوڑ دو۔''
''اس کے لیے بہت جگہ ہے۔'' نیلم ہنسی ''اپنی مما کی گود میں۔''
''وہ یہ سب استعمال کرے گا۔'' میں نے کنگ سائز بھالو دیکھا جو اصلی بھالو سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ پورا کمرا کھلونوں سے سجا تھا ''بے چارے عاقل کو یہاں سے بے دخل ہونا پڑے گا۔''
''تو کیا ہوا وہ لیونگ روم میں سو جائے گا۔'' نیلم نے لاپروائی سے کہا۔
''تم لوگ اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔'' میں نے افسوس سے سر ہلایا ''وہ عینی کا شوہر اور اس گھر کا باس ہے۔ تم لوگوں نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے۔''
عینی خاموش رہی لیکن نیلم نے ناگواری سے کہا ''ہم نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ اسے عینی کی پروا ہی نہیں ہے۔ سارا دن غائب رہتا ہے۔ رات کو دیر سے آتا ہے۔''
''وہ مرد ہے باہر کا کام کرتا ہے کما کر لاتا ہے۔ یہ اس کا فرض ہے عیاشی کرتا نہیں پھرتا۔''
''ہمیں کیا پتا......'' نیلم نے کہنا چاہا۔
''نیلم پلیز!'' میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا ''تم میاں بیوی کے معاملات میں زیادہ ہی انٹر فیئر کر رہی ہو۔ اپنے حق کو ناجائز طور پر استعمال کر رہی ہو۔''

''بھائی آپ......'' عینی نے کہنا چاہا۔ میں نے اس کی بات بھی کاٹ دی۔
''عینی...... نیلم...... میں اور چندا...... ہم سب عارضی طور پر یہاں ہیں کل چلے جائیں گے۔ تمہیں ساری عمر عاقل اور بچوں کے ساتھ رہنا ہے۔ تمہیں عاقل کا خیال رکھنا چاہیے۔''
''بھیا۔ وہ بھی تو میرا خیال نہیں رکھتے۔'' اس نے منہ بنایا۔
''تم اسے موقع تو دو۔'' میں بولا ''نیلم کے آنے سے پہلے وہی تمہارا خیال رکھتا تھا...... یا نہیں رکھتا تھا۔''
''جی رکھتے تھے...... بلکہ اب بھی رکھتے ہیں۔'' عینی شرمندہ نظر آنے لگی۔
''دیکھو، شوہر جب باہر سے تھکا ماندہ آتا ہے تو اسے کھانے اور دیگر ضروریات سے زیادہ بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اسے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ کیا اس نے کبھی اس حوالے سے دباؤ ڈالا کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھا کرو۔''
''نہیں۔'' عینی آہستہ سے بولی ''وہ تو کھانا بھی خود نکال کر کھا لیتے ہیں۔''
''تمہارے خیال میں اس کی وجہ میں ہوں۔'' نیلم بگڑے ہوئے انداز میں بولی۔
''میں تمہیں الزام نہیں دے رہا ہوں۔ دیکھو بے شک عینی تمہارے لیے بہن کی طرح ہے لیکن اب یہ اپنے گھر کی ہو چکی ہے۔ ماں بھی بننے والی ہے۔ اس کی توجہ کا اصل حق دار اس کا شوہر اور اس کا گھر ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کا نمبر آتا ہے اور برا مت ماننا کیا تم اپنے اور رئیس کے نجی معاملات اور اپنی طرز زندگی میں کسی فرد کی مداخلت پسند کرو گی۔ میرا خیال ہے بالکل بھی نہیں۔''
نیلم کی خاموشی میرے اندازے کی تصدیق کر رہی تھی۔ میں نے پھر کہا ''عینی کم عمر ہے اور نادان بھی ہے۔ میرا خیال ہے اسے ابھی تک گھریلو اور شوہر کی ذمے داریوں کا درست طور پر احساس بھی نہیں ہے۔ بڑی بہن کی حیثیت سے تمہارا فرض بنتا ہے کہ اسے ان ذمے داریوں کا احساس دلاؤ۔ الٹا تم اسے ان ذمے داریوں سے دور لے جا رہی ہو۔''
''میں نے ایسا کیا کیا؟'' نیلم چلائی ''میں تو یہ سب عینی کی محبت میں کر رہی ہوں۔''
''تم اپنی محبت میں اس کا گھر برباد کر رہی ہو۔ اپنی خوشی کا خیال رکھ رہی ہو لیکن تمہیں عینی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہے۔''
''ناصر...... کمینے......'' نیلم پھوٹ پڑی تھی اسے روتے دیکھ کر عینی نے پر ملامت نظروں سے میری طرف دیکھا۔
''بھیا۔ میں آپ کو اتنا سنگ دل نہیں سمجھتی تھی۔''
''عینی...... تم نہیں جانتیں عاقل اس صورت حال سے کس قدر برگشتہ ہے۔ یہ تم دونوں کا پہلا بچہ ہے۔ ان خوب صورت لمحات کو وہ تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے لیکن تم اسے وقت ہی نہیں دیتی ہو۔ ابھی بھی وقت ہے تم عاقل سے ایکسکیوز کر لو۔ اس پر توجہ دو۔ یہ چند دن اس کے ساتھ گزارو۔ ہم نیلم کے خریدے ہوئے مکان میں منتقل ہو رہے ہیں۔ وہاں سے تم سے ملنے آتے رہیں گے اور جب وقت آئے گا تو نیلم اور چندا تمہارے پاس آ جائیں گے۔''
میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں نے عینی کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی موقع تھا کہ وہ اپنی غلطیوں کی تلافی کر کے عاقل کا دل دوبارہ جیت سکتی تھی۔ بشرطیکہ اسے عاقل کے ساتھ اکیلے میں رہنے کا موقع ملتا۔ ہم سب کے ہوتے یہ موقع ملنا محال تھا اسی وجہ سے میں نے اس کے گھر سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عینی آزردگی سے بولی۔
''بھیا میں اکیلی رہ جاؤں گی۔''
''کہاں پگلی۔ ہم میں سے روز کوئی نہ کوئی آتا رہے گا۔ جب عاقل دفتر گیا ہو تو تم فون کر کے ہمیں بلا سکتی ہو۔''
نیلم کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے یہ سب پسند نہیں آ رہا ہے۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا ''میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ عینی کو میری ضرورت ہے۔''
''عینی کو اس کے شوہر کی ضرورت ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''اگر تم اپنے گھر نہیں جانا چاہتیں تو لندن میں ہوٹل کم نہیں ہیں۔ مجھے کرائے پر مکان بھی مل سکتا ہے۔''
''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں اس حالت میں عینی کو نہیں چھوڑ سکتی۔''
''عینی کی حالت بالکل درست ہے اور خدا نخواستہ ضرورت پڑی تو یہاں ایک کال پر دس منٹ میں ایمبولینس مع ڈاکٹر کے آ جاتی ہے۔ عینی کے لیے نرس بھی رکھی جا سکتی ہے۔''
نیلم میرے لہجے سے سمجھ گئی کہ میں نہیں مانوں گا۔ اس نے اٹھ کر خاموشی سے اپنا اور رئیس کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔
چندا اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ عینی یہ سب دیکھ کر روہانسی ہو رہی تھی ''بھیا یہ کیا ہو رہا ہے۔ ابھی تو ہم اس قدر خوش تھے۔ نہیں نیلم باجی اس طرح نہیں جائیں گی۔''
''تم فکر نہ کرو۔ کل تک اس کا موڈ درست ہو جائے گا۔

تم صرف عاقل کی فکر کرو۔ بات یہ ہے کہ تم دونوں کو پرائیویسی چاہیے جو ہماری موجودگی میں ممکن نہیں ہوگی۔"

عاقل اور رئیس رات دس بجے آئے تھے۔ ہمیں تیار دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ عاقل نے کہا "قائم مقام سسر صاحب کدھر کی تیاری ہے۔"

"بس میاں تم جانتے ہو۔ بیٹی کے گھر سے پانی پینا بھی وضع دار لوگوں کے لیے حرام ہوتا ہے۔"

"لیکن تو نے تو کھانا پانی سب حلق تک بھر لیا تھا۔" رئیس نے اعتراض کیا۔

"وہ کیا ہے کہ......" میں نے سر کھجایا "بھوک پیاس کے عالم میں ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں پھر بوقتِ ضرورت تو حرام بھی حلال ہوتا ہے۔"

عاقل تاڑ گیا اس کی غیر موجودگی میں کوئی بات ہوئی ہے۔ موقع پا کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا "لگتا ہے آپ نے میری بات کا زیادہ ہی اثر لیا ہے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔"

"میں بھی جانتا ہوں یار۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا "یہاں سے جانے کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ تم لوگ یہ لمحات آپس میں شیئر کرو۔ ایسا موقع زندگی میں صرف ایک بار آتا ہے۔ ہر چیز نئی اور پہلی بار ہوتی ہے۔ میرا مشورہ ہے دفتر سے چھٹی کر کے سارا وقت ہی عینی کے ساتھ گزارو اور اسے نرمی سے سنبھالنا۔ ہمارے جانے سے وہ تھوڑا ڈسٹرب ہوگی۔ دوسری وجہ جو زیادہ اہم بھی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم لوگوں پر کوئی آنچ آئے۔ ولیم اینڈ کمپنی میرے پیچھے پڑی ہے۔ میرا تم دونوں سے دور رہنا ضروری ہے پھر پولیس بھی بار بار انکوائری کے لیے فون کرے گی یا خود آ دھمکے گی۔ میں نہیں چاہتا عینی کو یہ سب چیزیں ڈسٹرب کریں۔"

اس نے لاجواب ہو کر کہا "پھر بھی اس طرح اچانک روانگی اچھی نہیں لگ رہی۔"

"برخوردار کوئی ساری عمر تو تمہارے پاس رہنا نہیں ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ پاس ہی نیلم کا گھر ہے جب دل چاہے گا آ جائیں گے یا تم عینی کو لے کر آ جانا۔"

"عینی کو اکیلا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔" اس نے نقطہ اٹھایا۔

"اکیلی کہاں۔ تم ہو گے اس کے ساتھ۔" میں نے اسے یاد دلایا "اور اگر تم کہیں گئے تو ہم میں سے کوئی بھی عینی کے پاس چلا آئے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ بس عینی کو دیکھو۔"

عینی چلی آئی "بھیا صبح بھی تو جا سکتے تھے۔"

"نہیں...... جب فیصلہ کر لیا تو اس پر جلدی عمل کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

اتنی تسلی دینے کے باوجود جب ہم وہاں سے نکلنے لگے تو عینی نیلم اور چندا سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ جیسے ہم واپس پاکستان جا رہے ہوں۔

"خدا کے لیے عینی۔" میں نے اسے ڈانٹا "کیا ہم دنیا سے جا رہے ہیں؟"

"خدا نہ کرے۔" اس نے جلدی سے کہا اور آنسو صاف کرنے لگی۔

عاقل نیچے تک چھوڑنے آیا۔ میں نے رخصتی سے پہلے سرگوشی میں اس سے کہا "اگر تم کسی قسم کی شرمندگی محسوس کر رہے ہو تو اس کی تلافی کی بہترین صورت یہی ہے کہ عینی کو اتنی توجہ اور پیار دو کہ وہ یاد نہ کرے۔"

ہم نیلم کی سفید رولز رائس میں روانہ ہوئے تھے۔ اس نے عینی اور عاقل کو کار تحفے میں دی تھی۔ راستے میں خاموشی رہی تھی جسے نیلم نے توڑا "سوری ناصر...... میں جذباتی ہوگئی تھی۔"

"بس اسی وجہ سے میں نے اس لہجے میں تمہیں ٹوک دیا۔ عینی اب بچی نہیں ہے۔ اسے اس کی ذمے داری اٹھانے دو۔"

"تم نے سو فیصد درست کام کیا۔" رئیس بولا "میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ عاقل اس صورتِ حال سے بیزار رہنے لگا ہے۔"

"تو کہا کیوں نہیں۔ تیرا دھیان کس طرف رہتا تھا۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"تو جانتا ہے یار۔" رئیس نے نیلم کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی تھی۔

میں نے سرد آہ بھری "خدا کی قسم نہ جانے کیا مقناطیس فٹ ہے ان میں کہ قطب نما کی طرح ساری حسیات کی سوئیاں انہی کی طرف رہتی ہیں۔"

"بکومت!" نیلم بولی۔ وہ اور چندا جھینپ گئے تھے۔

نیلم نے خوب صورت گھر لیا تھا۔ رات کے باوجود اس کی خوب صورتی نمایاں تھی۔ سامنے وسیع باغ تھا۔ گھر کا دروازہ ریموٹ کنٹرول لاک سے کھلتا تھا۔ یہ سرخ اینٹوں کا بنا دومنزلہ مکان تھا۔ جس میں باہر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر خاصی تعداد میں کمرے ہوں گے۔ کار کورڈ گیراج میں کھڑی کر کے ہم نے اپنے سوٹ کیس اٹھائے بلکہ مجھے اور رئیس کو ہی اٹھانے پڑے تھے۔ نیلم نے مکان کے درمیان میں لکڑی کا دو بڑے پٹ والا دروازہ کھولا۔ باہر جتنی غضب کی سردی تھی مکان اندر سے بھی اتنا ہی سرد تھا۔ دروازہ بند کر کے نیلم نے

لائٹس جلائیں اور اندر جا کر سینٹرل ائر کنڈیشنگ سسٹم کو آن کیا۔ یہ وسیع و عریض نشست گاہ ایک منٹ میں گرم ہوگئی تھی۔ میں نے سوٹ کیس رکھ کر کوٹ اتارا اور صوفے پر دراز ہوگیا "خادم کو تو بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کا بندوبست کیا جائے۔"

نیلم جل کر بولی "خادم صاحب کو وہاں سے بھاگنے کی اتنی کیا جلدی تھی۔ کھانا بھی تیار کر لیا تھا۔"

"ہاں...... چائنز سوپ تو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔" چندا بولی۔

میں نے رئیس سے کہا "بس بھیا۔ ہر کام میں قدرت کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ وہاں ہوتے تو سوپ پینا پڑتا۔"

اس بار چندا خفا ہوگئی "تو رہو اب ساری رات بھوکے۔ ہم سونے جا رہے ہیں۔"

دونوں ویسے ہی اس عجلت پر غصے میں تھیں۔ سچ مچ سونے کے لیے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد رئیس نے سر کھجایا۔

"یار تو نے واقعی جلدی کی۔ بھوک زور کی لگ رہی ہے۔ کھانا تو کھانے دیتے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "ابے انہی حربوں سے تو یہ عورتیں ہم آزاد مردوں کو غلام بناتی ہیں۔ آ کچن میں دیکھتے ہیں شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔"

باورچی خانہ مکان کے عقبی حصے میں تھا۔ اس کا گلاس ڈور عقبی باغ میں کھلتا تھا۔ کچن خاصا وسیع و عریض تھا اس کے کنگ سائز فریج میں دودھ کے پیک ڈبے اور انڈے ضرور تھے لیکن اس کے علاوہ کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہم نے انڈے ابلنے کے لیے رکھے اور دودھ گرم کر کے اس میں چاکلیٹ ملا کر پینے لگے۔ جو نہ رئیس کو پسند تھی اور نہ مجھے مگر خالی دودھ کے مقابلے میں بہتر تھا۔ انڈے حلق سے اتار کر کافی بنائی۔ رئیس نے تجویز پیش کی کہ کافی عقبی باغ میں ٹہل کر پی جائے۔ میں نے اسے گھورا "تیرا دماغ درست ہے۔ سردی کا پتا ہے۔ قلفی جم جائے گی۔"

"ابے کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی سردی بھی نہیں ہے۔"

"بیٹے یہ لاہور نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا لیکن وہ مجھے کھینچ کر باہر لے گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب سے نیلم اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ بدل گیا تھا۔ پہلے خوب صورتی سے زیادہ لطف اندوزی اس کا مطمع نظر ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ چیزوں میں خوب صورتی تلاش کرتا تھا۔ ہم کافی لے کر باہر آئے۔ غضب کی سردی تھی۔ شکر ہے ہوا نہیں چل رہی تھی۔ ورنہ باہر کھڑے رہنا بھی ناممکن ہوتا۔ ایسے میں گرم کافی سچ مچ اچھی لگی۔ یہ خالص انگریزی طرز کا باغ تھا۔ موٹی گھاس کے ساتھ وہاں چیری اور کینو کے پودے لگے تھے۔ ممکن ہے یہ کینو سے ملتا جلتا درخت ہو کیونکہ اس پر فی الوقت کینو نہیں تھے۔ پودے دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ یہ موٹے پتھروں سے بنی دیوار تھی جو تمام گھروں میں عقبی حصے میں مشترک تھی۔ یہ کوئی آٹھ یا نو فٹ اونچی تھی۔ ہم ٹہل رہے تھے اچانک عقبی دیوار کی طرف سے کھٹک کی آواز آئی۔ ہم رک گئے دیوار پر کوئی چیز گری تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اور یک دم رئیس کو کھینچتے ہوئے ایک چیری کے پودے کی آڑ میں ہوگیا۔ دیوار پر گرنے والی شے ایک ہک تھا جو ہلکی سی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے سرے پر یقیناً کوئی رسی بندھی تھی۔ جلد ہی ایک سر دیوار پر نمودار ہوا۔ سر کالا تھا کیونکہ اس پر ایک عدد موزہ چڑھا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ تھوڑے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے اندر جھانکا پھر اطمینان سے دیوار پر چڑھ کر باہر کسی کو اشارہ کیا۔ اندر کودتے ہی اس نے اپنی جیکٹ سے ایک خوفناک سا پستول نکال لیا تھا۔ میں جو اس کی گردن دبانے کا سوچ رہا تھا وہیں رکنے پر مجبور ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد دیوار سے دوسرا سر نمودار ہوا تھا۔ رئیس نے حرکت کرنا چاہی مگر میں نے ہاتھ دبا کر اسے روک دیا۔ ہم بالکل نہتے تھے۔ وہ آرام سے ہمیں گولی مار دیتا۔ دوسرا فرد نیچے آیا اس سے پہلے اس نے رسی اس طرف پھینک دی تھی۔ یعنی وہ دو ہی تھے۔ اس نے بھی نیچے اترتے ہی گن نکال لی تھی۔

"وہ اندر ہیں۔" پہلے والے نے اونچی آواز میں کہا۔ دوسرے نے اسے گھورا تھا۔

"تم کتیا کے بچے ہو...... کیا یہ بات بھونک کر بتانا ضروری ہے!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"سوری۔" پہلے والے نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔ اس کی جسامت کسی بل ڈاگ کی سی تھی۔ چھوٹا لیکن گٹھا ہوا جسم۔ دوسرا ذرا طویل قامت تھا۔ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے لیکن لہجہ انگریزوں کا سا نہیں تھا۔

"ابے یہ تو کالے ہیں۔" رئیس نے میرے کان میں گھس کر کہا "ان کی طرح ہی بول رہے ہیں۔"

رئیس کئی مہینے سے لندن میں تھا اس لیے اسے یہ فرق فوراً ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ درست کہہ رہا تھا، یہ دونوں کالے ہی تھے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اب تک میں انہیں عام سے چور اچکے سمجھ رہا تھا مگر رئیس کی بات سے مجھے شبہ ہونے لگا ان کا تعلق ولیم اینڈ کمپنی سے ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں

محتاط انداز میں مکان کی طرف گئے اور ان کے لیے دروازہ ہم پہلے ہی کھلا چھوڑ آئے تھے یعنی کچن کا عقبی گلاس ڈور۔ طویل قامت نے جاتے ہی اسے چیک کیا اور دروازہ کھلا پا کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"کھلا ہے۔"

"ڈیئس گڈ!" بل ڈاگ نے پھر بلند آواز سے اظہار خیال کیا۔ طویل قامت نے ایک بار پھر اس کی والدہ محترمہ کو یاد کیا۔ بل ڈاگ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا۔ غالباً اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی یا وہ اپنی والدہ کے بارے میں طویل قامت کے تبصروں سے متفق تھا۔ طویل قامت نے اسے کہا۔

"تم یہاں ٹھہرو میں اندر دیکھتا ہوں جا کر اور کوئی آ جائے تو گولی مت چلا دینا فوراً۔"

بل ڈاگ نے اس بار آواز نکالے بغیر سر ہلایا لیکن جیسے ہی طویل قامت اندر گیا وہ بھی باورچی خانے کی طرف لپکا میں نے اسے فریج سے چاکلیٹ نکالتے ہوئے دیکھا "رئیس تو دیوار کے ساتھ باورچی خانے کے دروازے تک جا' لیکن ہوشیار رہنا یہ بل ڈاگ مجھے موٹی عقل کا لگتا ہے۔ فوراً گولی چلا دے گا۔"

رئیس سر ہلا کر دیوار کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں ہوتا ہوا مکان کی طرف چلا گیا۔ میں عقبی دیوار کی طرف آیا اور اس سے لگی رسی کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ رسی آنکڑے سمیت اندر آ گری تھی۔ اسے میں نے ایک جھاڑی میں ڈال دیا۔ جہاں سے اسے تلاش کر لینا بے حد مشکل تھا۔ اس کے بعد میں دوسری طرف سے ہوتا کچن کے گلاس ڈور تک آیا۔ رئیس پہلے ہی دوسری طرف کھڑا تھا۔ میرے عقب میں آتش دان میں جلانے والی موٹی لکڑی کے ٹکڑے سلیقے سے جمے رکھے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک ٹکڑا نکالا۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا اور پانچ انچ چوڑا تھا۔ میں نے اشارے سے رئیس سے کہا کہ وہ اسے یعنی بل ڈاگ کو گلاس ڈور سے اپنی شکل دکھا کر دوسری طرف بھاگے۔ تاکہ بل ڈاگ بے اختیار باہر نکلے۔ اتفاق سے دروازہ بھی رئیس والی سمت سے کھلتا تھا۔ یعنی بل ڈاگ باہر آتا تو اس بات کا امکان نہیں تھا کہ میں فوری طور پر اس کی نظروں میں آ جاتا۔ رئیس نے شیشے کو بجایا اور جیسے ہی بل ڈاگ اس کی طرف متوجہ ہوا وہ دوسری طرف بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر بل ڈاگ حسب توقع بے اختیار باہر آیا اور جیسے ہی وہ باہر نکلا میں نے اس کے سر پر لکڑی آزمائی۔ اتفاق سے اس کا سر بھی کسی بل ڈاگ کی طرح خاصا مضبوط تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی لیکن وہ گرا نہیں۔

دوسری ضرب میں وہ گرا اور تیسری ضرب نے اسے اثنا غفیل کر دیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گن نکالی یہ تھرٹی فائیو ایم ایم کی نفیس سی گن تھی۔ جس کا سائز کم تھا لیکن اس کی ہلاکت خیزی عام پستول سے زیادہ ہی تھی۔ رئیس تیزی سے واپس آیا۔ اس نے بل ڈاگ کے چہرے سے کپڑا اتارا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ اگرچہ ایک سال ہو گیا تھا لیکن مجھے ایڈگر کے اس سب سے چھوٹے بھائی کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی جو ذرا فاتر العقل تھا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ دوسرا جارج تھا۔ جو ایڈگر کا اصل قاتل بھی تھا۔

"یہ اسی کتے کے بچے ولیم کا پلا ہے۔" میں نے رئیس سے کہا "اندر جانے والا یقیناً جارج ہے۔ اسے باندھ دے۔ رسی ان جھاڑیوں میں ہے۔ میں اندر جا کر اسے دیکھتا ہوں۔ مجھے نیلم اور چندا کی بھی فکر ہے۔"

"تو جا۔ میں اس دنبے کو باندھ کر آتا ہوں۔" رئیس بولا۔

میں احتیاط سے اندر گھسا۔ اگرچہ امید تھی کہ جارج کو باہر ہونے والی کارروائی کا علم نہیں ہو سکا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا وہ سب جان کر خاموشی سے ہمارے اندر آنے کا انتظار کر رہا ہو۔ تاکہ ہماری ادھوری کامیابی کو اپنی مکمل فتح میں بدل سکے۔ چندا اور نیلم اوپر والے بیڈ روم میں تھیں۔ اس مکان میں اوپر تین اور نیچے تین بیڈ روم تھے۔ اس کے علاوہ دو عدد ڈرائنگ روم اور ایک ڈائننگ روم تھا۔ مکان کے نیچے وسیع و عریض تہ خانہ تھا۔ جس میں جمنازیم اور تفریحی انڈور کھیلوں کی سہولیات تھیں۔ نچلی منزل کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں پانچ چھ فٹ نیچے کھڑا ہو کر سن گن لیتا رہا لیکن مجھے کوئی آہٹ نہیں سنائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ جارج اوپر جا چکا تھا۔ اس خیال نے مجھے فکرمند کر دیا۔ جارج میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اگر مجھے ایڈگر کے قتل کے الزام میں پھانسی نہ ہوتی تو جارج کو ہوتی اس لیے بہت ضروری تھا کہ اپنے سر پر لٹکی خطرے کی یہ تلوار جلد از جلد ہٹا دے۔

مجھے حیرت تھی کہ ان لوگوں نے اتنی جلدی نیلم کے اس مکان کا سراغ لگا کیسے لیا۔ اس کے بارے میں صرف عینی اور عاقل کو معلوم تھا۔ مجھے ان کی عافیت کے بارے میں بھی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اگر یہ لوگ پہلے عاقل کے ہاں گئے تھے اور ان سے ہمارا پتا حاصل کیا تھا تو یہ خطرے کی علامت تھی مگر فی الوقت اس وقت تو اپنی فکر کرنا تھی۔ میں محتاط قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ میں نے جوتے اتار دیئے تھے ورنہ لکڑی کی سیڑھیوں پر وہ آواز ضرور کرتے۔ اوپر نیچے

مکانیت یکساں ہی تھی۔ ایک فرق کے ساتھ کہ جس حصے میں نیچے کچن اور ڈائننگ روم تھا۔ اوپر وہاں ٹیرس تھا۔

ابھی تک کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی۔ یہ سر درد جارج کہاں تھا اور اب تک اتنی خاموشی سے کیا کر رہا تھا۔ راہداری میں نیلم اور چندا کے بیڈ روم کا کھلا دروازہ مجھے دور سے نظر آیا۔ کیا جارج اس کمرے میں تھا۔ میں نے آہستہ سے جا کر اندر جھانکا۔ جارج مجھے بستر کے دوسری طرف آئینے میں نظر آیا۔ نیلم اور چندا سہمی ہوئی ایک دوسرے سے لپٹی بیٹھی تھیں۔ معاً جارج ہنسا "تم دونوں بہت خوب صورت ہو۔ وہ حرامی تو ملا نہیں۔ کیوں نہ آج رات میں تم دونوں کے ساتھ گزاروں۔ تم کبھی اس رات کو فراموش نہیں کر سکو گی۔"

"بکو مت!" چندا نے غصے سے کہا۔ جارج کی بات سن کر ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ ان کے ردِعمل پر جارج کو مزہ آیا اور وہ مزید فحش بکواس کرنے پر اتر آیا تھا "میرا خیال ہے میں اپنے بھائی کو بھی بلا لوں۔ اسے سفید چمڑی والی لڑکیں پسند ہیں۔"

"ہم سفید فام نہیں ہیں۔" نیلم نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

جارج یک دم اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے پستول کی نال نیلم کے جسم سے لگا دی "تم اس سے زیادہ حسین ہو اور تمہارے تجربات بھی زیادہ ہوں گے۔ تم مجھے خوش کر سکتی ہو اور یہ مغرور بلی میرے بھائی کو پسند آئے گی۔"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ بدبخت جارج کی گندی بھری کھوپڑی میں پانچ چھ گولیاں اتار دوں مگر اس نے اپنے پستول کی نال نیلم کے بدن سے لگا رکھی تھی۔ اگر وہ مرتے مرتے ٹریگر دبا دیتا تو...... نہیں میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نیلم صبر سے اس کی بے ہودگی برداشت کر رہی تھی اور چندا بھی خود کو کمزور سی لڑکی ظاہر کر رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا ذرا سا موقع ملتا تو وہ جارج کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی۔ اس کی مردانگی کا سارا غرور لمحوں میں بہا کر رکھ دیتی۔

"دور ہٹو!" نیلم نے کہا۔ وہ خود پیچھے ہٹ رہی تھی لیکن جارج پستول کی نال اس کے جسم سے الگ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ نیلم جتنا پیچھے ہٹتی وہ اتنا ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ چندا نیلم کے عقب میں تھی۔ وہ بھی سرکتی جا رہی تھی۔ اچانک نیلم نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ اس نے مسکرا کر جارج کی طرف دیکھا۔

"اتنے جنگلی پن سے پیش نہ آؤ۔ اسے دور کرو۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"سوئٹی۔ میں تمہاری ساری تکلیفیں دور کر دوں گا۔" جارج کھل گیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ نیلم اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔

"پہلے اسے تو ہٹاؤ نا۔" وہ ادائے دلبری سے بولی۔ وہ بھانپ گئی تھی کہ جب تک منحوس جارج کی پستول کی یہ نال اس کے بدن سے چپکی رہے گی میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ اس نے کچھ جرات سے کام لیتے ہوئے جارج کا پستول والا ہاتھ ذرا پیچھے دھکیلا۔ چندا اس کے لہجے کی تبدیلی پر حیران تھی۔ اس نے اردو میں کہا "تم اس خبیث صورت سے ایسے کیوں بات کر رہی ہو۔"

"دروازے پر ناصر ہے۔" نیلم نے اسے آگاہ کیا۔

"اے کیا بات کر رہی ہو تم دونوں۔" جارج غرایا "صرف انگلش میں بات کرو۔ ورنہ چپ رہو۔" اس نے پستول ذرا پیچھے کر لیا تھا لیکن ابھی بھی اس کی نال نیلم کی طرف تھی اتنے نزدیک سے فائر ہونے کی صورت میں گولی نیلم کے ساتھ چندا کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ نیلم نے اس کی توجہ خود پر رکھنے کے لیے قیامت خیز قسم کی انگڑائی لی۔

"کیا تم سچ مچ آج رات رکو گے؟"

جارج اسے دیکھ کر سحر زدہ سا رہ گیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری "تم کہو تو میں ہمیشہ کے لیے رک جاتا ہوں۔"

اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ وہ میرے لیے آیا تھا اور ان کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس کی حریص نظریں نیلم اور چندا پر پھسل رہی تھیں۔ بالآخر اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جیب سے ایک آلہ نکال کر اس کا بٹن دبایا "ہیری ادھر آ جاؤ۔ اوپر...... یہاں دو خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ عیش کریں گے۔"

ہیری پہلے ہی عیش کر رہا تھا۔ میں نے اسے بے ہوش کیا تھا اور رئیس نے اسے باندھ کر کسی جھاڑی کے پیچھے ڈال دیا ہوگا۔

ظاہر ہے وہ کہاں سے جواب دیتا۔ جارج نے اسے کئی بار پکارا اور پھر فکرمند نظر آنے لگا۔ اس نے خوفناک نظروں سے نیلم اور چندا کی طرف دیکھا "اے...... اس مکان میں اور کون ہے؟"

"تم دیکھ چکے ہو بس ہم دو کمزور سی لڑکیاں ہیں اور کوئی نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" جارج کی عقل دوبارہ کام کرنے

گئی تھی" جب ہم آئے تو کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ کوئی اور بھی ہے اس مکان میں۔ دیکھو مجھے بتادو ورنہ میں گولی ماردوں گا۔" اس نے پستول دوبارہ نیلم کے جسم سے لگادیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ اس قسم کے حالات کا سامنا کرنے والی عورت نہیں تھی۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"پلیز اسے دور کرو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ابھی صرف ڈر لگ رہا ہے۔ جب یہ چلے گا تو تمہارے خوب صورت بدن سے روح نکل جائے گی۔ مجھے بتاؤ اس مکان میں اور کوئی ہے۔ یہ حرامی ہیری کہاں مرگیا ہے۔"

"مجھے کیا پتا؟" نیلم نے روہانسی ہونے کی اداکاری کی۔

"رومت کتیا۔" جارج نے اسے اچانک تھپڑ مارا تھا "اٹھ جا۔" اس نے نیلم کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگادی تھی "اگر تیری بات غلط نکلی تو بھیجا اڑا دوں گا۔"

نیلم لرز رہی تھی۔ جارج کے لہجے سے لگ رہا تھا وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے سے گریز نہیں کرے گا۔ وہ اسے دروازے کی طرف لانے لگا۔ اس نے چندا کو حکم دیا "تم ہمارے آگے چلو اور بھاگنے کی کوشش کی نا......" اس کی دھمکی ایسے حالات میں یک دم ہی بدل گئی تھی۔ جارج میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اگلا دروازہ مقفل تھا بلکہ اس راہداری کے سارے ہی دروازے مقفل تھے۔ میرے پاس سوائے نیچے اتر جانے کے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ جارج نیلم اور چندا سمیت دروازے پر نمودار ہوتا میں نیچے جاچکا تھا۔ میں نے پہلے سیڑھیوں کے عقب میں پناہ لینے کا سوچا لیکن یہ جگہ میرے لیے چوہے دان بھی ثابت ہوسکتی تھی اس لیے میں نشست گاہ میں آ گیا تھا۔ جو سیڑھیوں کے بالکل سامنے تھی۔ یہاں میں تاریکی میں آرام سے روپوش رہ کر جارج پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سیڑھی والے حصے میں روشنی تھی۔ میں نے ایک بڑے گلدان کے عقب میں جگہ سنبھالی اور جارج کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جس قدر چالاک ثابت ہورہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے کوئی موقع نہیں دینا۔ کیا فائدہ مرنے سے پہلے نیلم یا چندا کو بھی نقصان پہنچادے اس سے بہتر تھا میں اسے بلا تاخیر شوٹ کردیتا۔ پہلا موقع ملتے ہی۔

مگر وہ میری توقع سے زیادہ محتاط بھی تھا۔ وہ بے حد خاموشی سے نیچے آیا۔ اس نے چندا اور نیلم کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ ذرا سی حرکت پر وہ نیلم کو ماردیتا۔ وہ سیڑھیوں سے اس طرح اترا کہ اس کا جسم نیلم کے عقب میں تھا اور ذرا آگے چندا تھی۔ پستول اس نے نیلم کے سر کے عقب میں لگا رکھا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "تم جو کوئی ہو سامنے آجاؤ ورنہ میں اس کو گولی ماردوں گا۔"

میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں اس کی دھمکی کے جواب میں سامنے آتا تو نہ صرف میں مارا جاتا بلکہ وہ نیلم اور چندا کو بھی ماردیتا۔ انہیں چھوڑنے کا مطلب تھا اپنے خلاف عینی گواہ چھوڑنا۔ میں اپنی جگہ دبکا رہا۔ اس نے دو تین بار وارننگ دی اور پھر اچانک پستول کا دستہ نیلم کے شانے پر مارا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ ضرب طاقت ور تھی اور نازک جگہ لگی تھی۔ چندا سخت مشتعل نظر آرہی تھی۔ درد کی شدت نے نیلم کو تڑپا دیا تھا لیکن جارج نے اس پر اپنی گرفت نرم نہیں کی تھی۔ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ جارج نے پرسکون آواز میں کہا "اگر تم سامنے نہیں آئے شاہ عالم تو میں ان دونوں لڑکیوں کو اسی طرح اذیت دیتا رہوں گا اور جب اس کھیل سے میرا دل بھر جائے گا تو انہیں شوٹ کردوں گا۔ سامنے آؤ ذلیل آدمی۔"

میرے دل میں آئی کہ اس کا سر اڑادوں مگر وہ بے حد چوکنا تھا۔ ایک لمحے میں نیلم کو گولی مار سکتا تھا۔ اس نے پہلے کی طرح نیلم کے مضروب شانے پر چوٹ لگائی۔ وہ چیخی تو جارج نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "سامنے آؤ۔ بزدل شاہ عالم۔"

نیلم تڑپ رہی تھی۔ اس کے منہ سے دبی دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ "نہیں...... نہیں" بھی کہہ رہی تھی یعنی مجھے سامنے آنے سے منع کررہی تھی۔ جارج کا انداز وقت کے ساتھ ساتھ جارحانہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ تشدد پسند اور اذیت پسند شخص تھا۔ مجھے یاد تھا اپنے بھائی کو مارنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر ذرا سا تاسف نظر نہیں آیا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ میں کیوں نہیں مارا گیا۔

"میں دس تک گنوں گا۔" اس نے اعلان کیا "اور تم سامنے نہ آئے تو اسے ماردوں گا۔ اس کے بعد دوسری لڑکی کی باری آئے گی...... ایک!"

اس نے گننا شروع کیا۔ مجھے قطعی شبہ نہیں تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا۔ اس سے قطعی بعید نہیں تھا وہ کچھ بھی کرسکتا تھا "چار...... پانچ......" میرے پاس فیصلے کے لیے چند لمحے تھے۔ یہ تو طے تھا کہ میں نیلم کو مرتے یا ذرا سا نقصان پہنچتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا "سات...... آٹھ!" میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگا پھر ٹھٹک کر رہ گیا۔

"یہاں صرف میں ہوں۔" میں نے رئیس کی آواز سنی

"شاہ عالم یہاں نہیں ہے۔" وہ ہاتھ اٹھائے سامنے آ گیا تھا۔

"میرا بھائی کہاں ہے؟" اس نے غرا کر کہا۔

"وہ جہاں بھی ہے محفوظ ہے۔" رئیس نے اطمینان سے کہا "تم ان لڑکیوں کو چھوڑ دو۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"بکو مت!" اس نے مشتعل ہوکر نیلم کے مضروب شانے پر تیسری ضرب لگائی۔ وہ سسکی تو رئیس مشتعل ہوکر آگے بڑھا۔ نیلم نے سسکی کے درمیان "نہیں" کہا۔ رئیس رک گیا۔

"تمہارا بھائی بھی ایسی ہی تکلیف سے گزر سکتا ہے۔" رئیس نے اسے دھمکایا۔

"وہ کہاں ہے۔" جارج نے نیلم کا گلا پکڑ کر کہا "فوراً بتاؤ ورنہ میں اسے ماررہا ہوں۔"

"وہ باغ میں ہے۔ بے ہوش ہے۔" رئیس کو بتانا پڑا تھا۔

"اس کی گن کہاں ہے؟"

"وہ میں نے تمہارے سامنے آنے سے پہلے ہی پھینک دی تھی کہ تم ڈر کر گولی نہ چلادو۔" رئیس نے سادگی سے کہا "تم کہو تو میں جا کر اٹھالاتا ہوں۔"

"نہیں!" وہ غرایا "مجھے دکھاؤ کہاں پھینکی ہے۔" وہ رئیس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا تم اس حد تک بزدل ہو۔ شاہ عالم نے کن نامردوں سے دشمنی کی ہے جو سامنے آنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے۔"

"فضول بکواس مت کرو۔" وہ مشتعل ہوگیا تھا۔ اس نے نیلم کو ایک طرف دھکیلا اور رئیس کی طرف پستول کیا۔ اس کا ارادہ رئیس کو شوٹ کرنے کا تھا۔ میں بھی صبر سے اسی موقع کا انتظار کررہا تھا۔ میرے ہاتھ میں دبے پستول سے شعلہ نکلا اور اس کے سینے میں اتر گیا۔ دوسری گولی اس کے پستول والے بازو پر لگی تھی۔ اس نے بھی فائر کیا لیکن اس کی گولی نہ جانے کہاں گئی۔ نیلم اور چندا پہلے ہی فرش پر گر چکے تھے۔ رئیس مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ ہاتھ پر گولی لگنے کے بعد جارج نے چلا کر گالی دی اور بائیں ہاتھ سے پستول تھامنے کی کوشش کی مگر سینے میں اترنے والی گولی اپنا کام کرچکی تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور اوندھے منہ زمین پر جاگرا۔ رئیس نے لات مار کر اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا اور اسے اٹھانے جارہا تھا کہ میں نے منع کردیا۔

"اسے ہرگز مت چھونا۔"

نیلم اور چندا زمین سے اٹھ گئے تھے "تکلیف سے نیلم کا رنگ سفید ہورہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے شانہ دبا رکھا تھا۔ رئیس اس کے پاس گیا "کیا بہت درد ہورہا ہے۔"

"ہاں۔" نیلم نے کراہ کر کہا۔

"چندا...... تم نیلم کو اندر لے جاؤ اور رئیس پولیس کو کال کرو۔" میں نے جارج کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔

"یار مجھے نمبر نہیں پتا ہے۔"

نیلم نے درد کے باوجود جاتے جاتے اسے نمبر بتایا۔ میں نے ایمبولینس لانے کے لیے بھی کہا۔ رئیس ایک منٹ میں فون کرکے آ گیا۔ میں نے اسے ہیری کو اندر لانے کو کہا "بدبخت باہر سردی سے مرگیا تو اس کے قتل کا الزام بھی ہم پر آئے گا۔"

"کیا یہ مرگیا؟" رئیس نے پوچھا۔

"نہیں ابھی زندہ ہے لیکن اس کی حالت درست نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

حسبِ توقع پولیس اور ایمبولینس پندرہ منٹ کے اندر آ گئے تھے۔ سب سے پہلے پیرا میڈک نے اپنا کام شروع کیا۔ انہوں نے جارج کو آکسیجن لگا کر ایمبولینس میں منتقل کیا اور لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ آنے والے ڈاکٹر نے نیلم اور بے ہوش ہیری کا معائنہ بھی کیا اور انہیں بھی اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر ایمبولینس میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں دوسری ایمبولینس میں لے جانے کا مشورہ دیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر پولیس نے تفتیش کی طرف توجہ دی۔ سب سے پہلے میرا بیان ہوا۔ میں نے بلا کم و کاست سارے واقعات بیان کردیے "یہ چوروں کی طرح آئے اور ہمیں مارنے کی کوشش کی۔ اپنی جگہ جان بچانے کے لیے مجھے گولی چلانا پڑی۔"

مقامی پولیس اسٹیشن سے آنے والے انسپکٹر نے بنا کسی اعتراض کے میرا بیان سنا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرا نام سن کر وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے بارے میں فیصلہ نہیں کرپا رہا ہے بالآخر اس نے گہری سانس لے کر کہا "مسٹر شاہ عالم، لندن پولیس کو آپ کے بارے میں خبردار کردیا گیا ہے۔ کسی بھی مسئلے میں ملوث ہونے کی صورت میں آپ کو فوری طور پر حراست میں لینے کی ہدایت کی ہے۔ میں آپ کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مگر کیوں۔ میں نے صرف اپنے دفاع کا حق استعمال کیا ہے۔ ان دونوں نے میرے گھر میں گھس کر مجھ پر حملہ کیا۔ میری ہونے والی بیوی اور دوست کو یرغمال بنایا۔ اس میں کہیں

بھی میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں آپ پر کوئی الزام نہیں لگا رہا لیکن میں اوپر سے آنے والے احکامات سے مجبور ہوں۔"

انسپکٹر شریف آدمی تھا اور سچ مچ مجبور تھا۔ اس نے مجھے ہتھکڑی لگائے بنا۔ پولیس کار میں بٹھایا۔ رئیس میری اس گرفتاری سے سخت پریشان تھا چندا کو پتا چلا تو وہ بھی اوپر سے اتر کر نیچے آ گئی۔ میں نے انہیں تسلی دی اور عاقل اور عینی کی خیریت معلوم کرنے کا کہا" مجھے ان کے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔ یہ خبیث شاید ان کے ہاں سے ہی ہمارے پیچھے لگے تھے اور میرے وکیل کو بھی میری گرفتاری کے بارے میں بتا دینا۔ وہ کل کسی کورٹ میں میری گرفتاری کو چیلنج کر دے۔"

"تو فکر نہ کر۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"ناصر...... میں نے کہا تھا نا...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" چندا سہمے ہوئے انداز میں بولی" انہوں نے پھر تمہیں گرفتار کر لیا۔"

"بس کل تک چھوٹ کر آ جاؤں گا۔" میں نے' سے تسلی دی" پولیس کے پاس مجھے حراست میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔" میں نے کہہ تو دیا مگر مجھے خود یقین نہیں تھا۔ ابھی تک مجھ پر صرف ایڈگر کے قتل کا الزام تھا کہ میرے شاہ عالم ثابت ہونے کی صورت میں ہی اس کیس میں جان پڑتی لیکن اب جارج کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ہی آنے والا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ میں نے اسے اپنے دفاع میں مارا تھا۔ وہ جارج تھا اور میرے گھر میں موجود تھا مگر برطانوی پولیس چاہتی تو اس سے بے شمار ضمنی سوالات پیدا کر سکتی تھی۔ میں ایک غیر ملکی تھا اور جارج ایک برطانوی باشندہ اس کے حقوق یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ تھے۔ مجھے سفارت خانے کی حمایت حاصل ہو سکتی تھی لیکن سفیر اللہ صاحب کا رویہ دیکھ کر مجھے اب سفارت خانے سے مدد کی خاص امید نہیں رہی تھی۔ بیرونِ ملک ہمارے سفارت خانوں کا رویہ قطعی طور پر سفارتی امور کے مطابق نہیں ہے۔

لندن جیسے بڑے شہر کے ایک اہم اور پوش علاقے کا یہ پولیس اسٹیشن اتنا سادہ اور چھوٹا تھا کہ پولیس اسٹیشن لگتا ہی نہیں تھا۔ مجھے ایک افسر کی ڈیسک کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ مجھ سے میرے بیان پر دستخط لیے گئے۔ غالباً میرے بارے میں فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس بنا پر مجھے حوالات میں بند کرنے کے بجائے اس جگہ بٹھایا گیا تھا۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا جسے پلائی کے تختوں سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مرد اور خواتین پولیس والے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور رات کے اس پہر بھی وہاں خاصی رونق لگی تھی۔ ملزمان آ رہے تھے۔ ان کے بیانات جاری تھے ایک طرف ایک زخمی پولیس والے کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ اسے کسی جھگڑے میں چوٹ آئی تھی۔ پٹی کرواتے ہوئے وہ روانی سے ملزمان کے شجرۂ نسب پر روشنی ڈال رہا تھا اور انہیں سوائے ان کے باپوں کے ہر انسان اور جانور سے منسوب کر رہا تھا۔ یہ پورا ہال پولیس اسٹیشن کی عمارت کے برابر تھا۔ میں حیران تھا کہ حوالات اور تھانے کے دیگر لوازمات (بشمول ڈرائنگ روم کے) کسی جگہ پر تھے تھوڑی دیر بعد یہ راز بھی کھل گیا۔ دراصل ہال کے نیچے تہ خانہ تھا۔ لاک اپ بھی وہیں تھے۔

ایک گھنٹے بعد ایک جانی پہچانی صورت ہال میں داخل ہوئی یہ انسپکٹر ڈیری نرمین تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ اس نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا جھک کر کہا۔

"مسٹر ناصر عظیم ابھی تمہیں لندن آئے چوبیس گھنٹے ہوئے ہیں اور تم ایک اور کیس میں ملوث ہو چکے ہو۔"

میں نے شانے ہلائے" میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا اور نہ ہی ولیم کے ان بلوں کو دعوت دی تھی اپنے گھر آنے کی۔"

اس نے آنکھیں سکیڑیں" تم کو کیسے پتا چلا کہ وہ ولیم کے بیٹے اور ایڈگر کے بھائی ہیں۔"

"ان میں سے جو گولی کا شکار ہوا اس نے خود بتایا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ بے ہوش ہے اور آئی سی یو میں داخل ہے۔ اس کا بچنا مشکل نظر آتا ہے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں اگر وہ بیان دیے بغیر مر گیا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"اس کے لیے میں سوائے اپنی قسمت کے اور کسے موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا" اگر پاگل کتا مجھے کاٹنے کی کوشش کرے تو کیا میں اپنی مدافعت میں لات بھی نہ چلاؤں۔"

انسپکٹر ڈیری کے چہرے پر کسی قدر نرمی آئی تھی" یہی بات تمہارے دفاع میں جاتی ہے۔"

"کیا مجھے پھر گرفتار کر لیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے حفاظتی تحویل میں کہوں گا۔" اس نے ملائمت سے کہا" تمہارا آزاد پھرنا تمہارے اور تمہارے دوستوں کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے تم پولیس کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہو گے۔"

"میرا خیال اس کے برعکس ہے لیکن ظاہر ہے تم میری

بات نہیں مانو گے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا" یو آر دی باس لیکن کل صبح میرا وکیل میری حراست کی وجہ عدالت میں ضرور دریافت کرے گا۔"

"اسے عدالت میں ہی جواب دے دیا جائے گا۔" انسپکٹر ڈیری نے بے پروائی سے جواب دیا" فی الوقت تو ایک شخصیت تم سے ملنے آئے گی۔ لندن میں وہ شاہ عالم کو قریب سے جاننے کی دعوے دار ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔

"تم دیکھ لو گے۔" وہ بولا" لو وہ آ گئی۔"

میں نے مڑ کر دیکھا اور پھر جولی کو دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ جمی کی سابقہ بیوی اور اب کی بیوہ جولی پہلے سے زیادہ قیامت خیز ہو گئی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی اپنے جسم سے فرکوٹ اتار کر کوٹ ہینگر پر ٹانگ دیا تھا۔ نیچے اس نے روایتی مغربی طرز کا مختصر سا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے حشر ساماں بدن کو چھپانے کے بجائے نمایاں کر رہا تھا۔ وہ مسحور کن چال چلتی ہماری طرف آئی۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر انسپکٹر ڈیری کو دیکھا" ہائے انسپکٹر تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔"

"ایک خاص کام تھا۔" انسپکٹر ڈیری نے معنی خیز انداز میں کہا" لیکن لگتا ہے۔ مسٹر ناصر عظیم تم سے پہلے سے واقف ہے۔"

میں چونکا" نہیں مجھے تو مادام کے حسن نے مسحور کر دیا۔ لندن میں ایسے چہرے کم دیکھنے میں ملتے ہیں۔"

"صرف چہرہ!" جولی کے لہجے میں سوال تھا۔

"نہیں آپ تو مجسم حسن ہیں۔" میں نے مرعوب لہجے میں کہا" افسوس ہے پہلے آپ سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی۔"

"تو تم مادام جولی سے واقف نہیں ہو؟" انسپکٹر ڈیری نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بہت دکھ کے ساتھ کہہ رہا ہوں...... نہیں۔"

"یہ شاہ عالم سے بہت ملتے ہیں۔" جولی نے بغور مجھے دیکھا" پہلی بار دیکھ کر میں بھی چونک گئی تھی۔"

"تو اب آپ کا شبہ دور ہو گیا۔" انسپکٹر نے اسے دیکھا۔ جولی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک تھی۔ میں نے بے اختیار اس سے نظریں چرا لیں۔ آخر اس نے کہا" ہاں۔ یہ شاہ عالم نہیں ہے۔ میں اسے بہت قریب سے جانتی ہوں۔" اس نے لفظ "قریب" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ مادام!" انسپکٹر ڈیری نرمین نے گہری سانس لی" مجھے امید ہے تم نے ٹھیک کہا ہے۔"

"مجھے تم سے غلط بیانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" جولی کے لہجے میں ناگواری تھی پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اسی طرح لچکتی بل کھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

"انسپکٹر اب تو تمہارے ملک کی ایک شہری نے بھی میرے حق میں گواہی دے دی ہے۔" میں نے کہا" اب مجھے رہا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ تمہارا کچھ عرصے پولیس کی تحویل میں رہنا تمہارے اپنے مفاد میں ہے۔ مجھے شک ہے کہ سیاہ فام اس واقعے کو بہانہ بنا کر ہنگامہ آرائی پر نہ اتر آئیں۔"

"اور یہ مدت کتنی ہو گی؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا" کہیں مجھے ساری عمر ہی تمہارے پاس نہ رہنا پڑے۔"

"ایسا بھی ممکن ہے اگر تم پر ایڈگر کے قتل کا الزام ثابت ہو گیا تو......" وہ ہنسا تھا۔

"کیا مجھے اس پولیس اسٹیشن میں رہنا ہو گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا" نہیں...... تمہیں ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا جائے گا۔ میں ایک اور کام سے جا رہا ہوں۔ ورنہ میرے ساتھ ہی چلتے۔ بہرحال ایک پولیس کار تم کو لے جائے گی۔"

انسپکٹر ڈیری نرمین چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون پولیس آفیسر نے فون میری طرف بڑھایا" تمہارا فون ہے۔"

"تھانے میں کس نے یاد کر لیا۔" میں نے ریسیور لیا۔ دوسری طرف نیلم تھی۔

"ناصر تم ٹھیک ہو نا؟" اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"نہیں۔ مجھے ڈرائنگ روم میں الٹا لٹکا کر چھترول کی جا رہی ہے۔ بابا...... یہ لندن کا ایک پولیس اسٹیشن ہے۔ یہاں میرے ساتھ قانون سے ہٹ کر کچھ نہیں ہو گا۔"

"میں نے اپنے وکیل سے بات کی ہے۔" وہ بولی" وہ کل عدالت میں تمہاری رہائی کی درخواست کرے گا۔"

"شکریہ...... لیکن تم آرام کرو۔" میں نے اسے مشورہ دیا" تمہارے شانے کا درد کیسا ہے۔ میں نے اس حرام زادے کو دو ہی گولیاں ماری تھیں۔ میرا دل کر رہا تھا۔ اسے چھلنی کر دوں۔ کیسے تم پر اور چندا پر للکار رہا تھا۔ بندر کی اولاد۔"

"شکر ہے تم لوگ تھے ورنہ وہ نہ جانے ہمارا کیا حشر کرتا۔"

"عاقل اور عینی ٹھیک ہیں نا۔"

"ہاں۔" وہ بولی "رئیس نے فون کر کے بتایا تھا۔ عاقل شاید پولیس اسٹیشن آ رہا ہے۔"

"چندا کیا کر رہی ہے؟"

"وہ ڈپریس تھی۔ میں نے اسے زبردستی نیند کی گولی دے کر سلا دیا ہے۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تم بھی اب آرام کرو۔"

"ڈاکٹر نے درد کش انجکشن لگایا تھا۔ آرام ہے۔ شکر ہے فریکچر نہیں ہوا۔"

فون بند کر کے میں نے واپس پولیس آفیسر کی طرف بڑھا دیا "شکریہ!" میں نے کہا تھا۔ اسی لمحے مجھے عاقل اندر آتا نظر آیا۔ ایک پولیس والے نے اس سے پوچھا تو اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ اسے آنے کی اجازت مل گئی۔

"جناب۔" اس نے آتے ہی فریادی لہجے میں کہا "یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ میرے گھر سے نکل کر چند گھنٹے بھی سکون سے نہیں گزارے۔ یعنی نے میرا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ آدھی رات کو بستر سے اٹھ کر دوڑنا پڑا ہے۔"

"احمق ہو تم اسے اکیلے کیوں چھوڑا؟"

"اکیلے کہاں؟" وہ ہنسا "رئیس، نیلم صاحبہ اور چاندنی بیگم سب ایک بار پھر غریب خانے پر ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان بدبختوں نے اتنی جلدی ہمارا سراغ لگا کیسے لیا۔"

"یہ بات تو میں بھی سوچتا آیا ہوں۔ اگر میرے گھر سے پیچھے لگے تھے تو انہوں نے وہاں آنے کی زحمت کیوں نہیں کی۔"

"میں نے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔" میں بولا "اس کے باوجود ہمارے وہاں پہنچنے کے دو گھنٹے کے اندر وہاں آ دھمکے تھے۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے۔"

"قائم مقام سر محترم صاحب ایسا صرف ایک صورت میں ممکن ہے کہ آپ کا کوئی واقف کار ان لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہو۔"

"لندن میں واقف کار تم ہو یا روشنی اور اس کی بہن۔"

"اس کے علاوہ بھی اور لوگ ہوں گے جو آپ کے بارے میں جانتے ہیں۔" عاقل سوچ میں پڑ گیا تھا "مجھے تو یہ بھی نو وارداتِ والے چکر کا ایک حصہ لگ رہا ہے۔"

"عاقل اب تم اپنی اور باقی لوگوں کی حفاظت کا انتظام کرو۔ پولیس سے مدد طلب کرو یا پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈ سے لو مگر اس معاملے میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ ولیم اور اس کے ساتھی جرائم پیشہ ہیں۔ آج کے واقعے کے بعد بپھر کر وہ کوئی بھی کارروائی کر سکتے ہیں۔"

"میں خیال رکھوں گا۔" اس نے کہا "اچھا میرے لائق کوئی خدمت۔ ضمانت کے لیے درخواست تو صبح ہی دی جائے گی۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا "یہاں کے پولیس اسٹیشن بھی آرام دہ ہیں۔"

عاقل چلا گیا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ مجھے اس رات میں پولیس ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا جائے گا۔ اس کے جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد دو پولیس والوں نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور کھڑا کر دیا "مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"پولیس ہیڈ کوارٹر!" انہوں نے جواب دیا۔

مجھے پولیس کار کے عقبی حصے میں بٹھایا۔ ایک پولیس والے نے ڈرائیونگ سنبھالی اور دوسرے نے اس کے برابر والی نشست۔ رات کے دو بجے اور غضب کی سردی کے باوجود لندن کی سڑکوں پر رونق کم نہیں تھی۔ شاہراہیں جگمگا رہی تھیں۔ پولیس کار اچانک ایک نسبتاً سنسان راستے پر مڑ گئی۔ وہ ہیڈ کوارٹر کی طرف ہی جا رہی تھی لیکن یہ شارٹ کٹ تھا۔ میں سوچنے میں مگن تھا۔ عاقل کی بات قابلِ غور تھی۔ ولیم اینڈ کمپنی کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ میرے خلاف لندن پولیس کو استعمال کر سکتے یہ کوئی اور ہی تھا اس پر وہ فنکاری میں۔ معاً دھچکے سے میں چونکا۔ سڑک کے سامنے ایک ٹرک اس طرح کھڑا تھا کہ اس نے پوری سڑک ہی بلاک کر دی تھی۔

"ٹرک ہٹاؤ!" ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔

"ٹائر بدل رہے ہیں۔" ایک گنوار قسم کے شخص نے جواب دیا۔ وہ پولیس کار سے قطعی مرعوب نظر نہیں آ رہا تھا۔

دوسرا پولیس آفیسر اتر کر ٹرک والے کی طرف بڑھا۔ وہ اس شخص سے بات کر ہی رہا تھا کہ ٹرک کے عقب سے ایک دوسرے شخص نے نکل کر اس کے سر پر کچھ مارا پولیس والا جس طرح تیورا کر گرا تھا صاف ظاہر تھا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے اس جہانِ فانی سے کوچ ہی کر گیا ہو۔ دوسرا جو ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر اس نے تیزی سے پستول نکالا اور کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے باہر سے اسے کچھ مارا اور وہ فوراً ہی بے جان ہو کر گر گیا۔ مارنے والا کار کی سائیڈ میں چھپا تھا۔ فوراً ہی عقبی دروازہ کھلا اور ایک گن میری طرف جھانکنے لگی "حرکت نہ کرنا!" کسی نے سرد لہجے میں کہا۔

ٹرک کے سامنے بے ہوش ہونے والے پولیس آفیسر کو لا کر اس کی نشست پر ڈال گیا۔ دوسرے کو بھی اس کی سیٹ پر

[illegible] بٹھا دیا [illegible]
جنہوں نے مہارت [illegible] سے یہ سب کیا تھا۔ وہ [illegible] لگتے تھے اور ان کا معاندانہ رویہ بتا رہا تھا کہ وہ میرے دشمن نہیں تھے تو دوست بھی نہیں تھے۔ بادلِ نخواستہ میں کار سے نکلا۔ فوراً ہی ان میں سے ایک پولیس کار میں گھس گیا۔ اس نے دروازے بند کیے۔ میں نے یکے بعد دیگرے گھٹے ہوئے دھماکے سنے۔ اس نے کار کے اندر فائر کیے تھے اور یقیناً دونوں پولیس افسران کو مار ڈالا تھا۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" میں نے چلا کر کہا۔ جواب میں ایک نے میرے سر پر اپنی گن کا دستہ مارا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

میں یوں ہوش میں آیا تھا جیسے بٹن دبانے سے یک دم ٹی وی آن ہو جاتا ہے۔ سر میں درد ہو رہا تھا لیکن قابلِ برداشت تھا۔ دکھتا ہوا بازو بتا رہا تھا کہ مجھے انجکشن لگایا گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے ہوش میں آتے ہوئے میں اپنی حالت کو خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں ایک بستر پر پڑا تھا۔ یہ میلا کچیلا بستر کسی گودام نما جگہ تھی اور خاص بات یہ تھی کہ میرا ایک ہاتھ زنجیر سے بندھا تھا جو دیوار میں پیوست تھی۔ میں اس زنجیر کی لمبائی کے برابر ہی حرکت کر سکتا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے دو تین افراد یاد آ رہے تھے۔ دو تینوں گورے تھے۔ اس لیے مجھے شبہ ہوا کہ یہ کارروائی ولیم اینڈ کمپنی کی نہیں بلکہ کسی اور کی ہے۔

گودام وسیع و عریض تھا اس میں جا بجا کارٹن اور لکڑی کے بکس رکھے تھے۔ جن پر مختلف کمپنیوں کے نام اور مونوگرام پرنٹ تھے۔ یہ شاید کسی ہول سیلر کا گودام تھا اور ان میں اکثر صارفین کی اشیاء تھیں۔ میں جس حصے میں تھا یہ بمشکل دس یا چھ فٹ کا تھا۔ اس کے دو طرف کنکریٹ کی دیوار تھی اور دو طرف پیٹیوں سے دیوار کھڑی کی ہوئی تھی۔ ان میں ایک پتلی سی راہداری نظر آ رہی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ہاتھ کو زنجیر سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ یہ ہتھکڑی تھی جو میری کلائی میں پڑی تھی۔ میں نے جیبیں ٹٹولیں کہ شاید کچھ مل جائے جس سے میں اس ہتھکڑی کو کھول سکوں لیکن کم بختوں نے پرس اور کلائی کی گھڑی سمیت سب نکال لیا تھا۔ زنجیر خاصی موٹی تھی۔ لہٰذا میں نے دیوار جہاں یہ پیوست تھی زور آزمائی کی اور بعد میں واضح ہو گیا کہ اسے توڑنا یا دیوار سے نکالنا کسی ہرکولیس کے بس کی بات ہو تو ہو۔ میرے بس کی ہرگز نہیں تھی۔ تھک ہار کر میں بستر پر بیٹھ گیا۔ یہ فوم کا دبیز گدا تھا جس پر ایک میلا سا کمبل اور ایک عدد تکیہ پڑا تھا۔ سردی کی معمولی شدت ظاہر کر رہی تھی

ابھی تک یہاں [illegible] مکمل خاموشی تھی۔ [illegible] قسم کی کوئی آواز نہیں تھی پھر دور کہیں دروازہ کھلنے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں قریب آ رہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ قریب آ رہے تھے۔ وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میں ذہنی طور پر آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے اس طرح اغوا کر کے جانوروں کی طرح قید کرنے والوں کے عزائم درست نہیں ہو سکتے تھے۔ مقصد مجھے قتل کرنا بھی نہیں تھا۔ ورنہ یہ کام تو وہ پولیس کار میں بھی کر سکتے تھے۔ ایک گولی خرچ کرنا پڑتی لیکن انہوں نے لمبی چوڑی پلاننگ کی۔ ان کے مخبر پولیس اسٹیشن تک میں کام کر رہے تھے اور انہوں نے مجھے مکمل معلومات حاصل کر کے ہی اغوا کیا تھا۔ اس واردات میں دو پولیس آفیسر مارے گئے تھے اور یہ معمولی بات نہیں تھی۔

وہ لوگ اچانک سامنے آئے تھے۔ ان میں ولیم کو دیکھ کر مجھے معمولی سی حیرت ہوئی تھی۔ وہ دو سفید فاموں کے ساتھ تھا۔ اس نے اس سردی کے عالم میں ہلکی سی شرٹ کے اوپر بغیر آستین کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس کے ساتھ کے دو افراد نے نفیس قسم کے سوٹ پہن رکھے تھے اور ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق زیرِ زمین دنیا سے ہے۔ سفاکی اور بے حسی ان کے انداز سے ٹپک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ولیم کے سیاہ چہرے پر نفرت کی تاریکی چھا گئی تھی۔ وہ غراتا ہوا میری طرف آیا اس کا ارادہ بیئر کی بوتل میرے سر پر توڑنے کا تھا لیکن اس کے نزدیک آنے سے پہلے ہی میں نے فرش پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے لات گھمائی وہ اچھل کر زمین بوس ہو گیا۔ بیئر کی بوتل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ سفید فام سکون سے یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن جب میں نے اسے قابو کرنا چاہا تو ان میں سے ایک نے ریوالور نکال لیا "بس اب حرکت نہ کرنا۔"

میں ساکت ہو گیا۔ میرا تجربہ تھا اس قسم کے سرد مہر لوگ گولی مار کر بھی افسوس نہیں کرتے۔ ان کے اندر احساسات کی کمی ہوتی ہے۔ ولیم گالیاں دیتا اٹھا۔ دوسرے سفید فام نے اس سے کہا "کام کی بات کرو اس سے۔"

"میرا ایک بیٹا اس کی وجہ سے مارا گیا ہے...... دوسرا اسپتال میں پڑا ہے میں اس سے......"

"تمہارے وہ حرامی بلے اپنے اعمالوں کے باعث انجام کو پہنچے۔ تم جانتے ہو ایڈگر کو جارج نے قتل کیا تھا اور وہ مجھے مارنے کے لیے میرے گھر میں گھسا تھا۔"

"بکواس کرتا ہے۔" ولیم کے گندے منہ سے مغلظات کا طوفان اٹھا تھا۔

"سنو مسٹر شاہ عالم۔ ہمیں تم سے صرف اتنی غرض ہے کہ تم وہ نوادرات ہمارے حوالے کر دو جو تم نے جمی اور لارڈ جیمز کو دھوکا دے کر حاصل کیے تھے۔" سیاہ چشمے والے نے کہا۔

"میرے پاس کوئی نوادرات نہیں ہیں اور نہ میں شاہ عالم ہوں۔"

"انکار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہاری کمر پر سرخ رنگ کا پنس کے سکے کے برابر نشان ہے۔ جو صرف شاہ عالم کی کمر پر ہے۔ تم شاہ عالم ہو۔"

میں نے بد بخت شاہ عالم کو کوسا۔ یہ میری پیدائشی نشانی کو شاہ عالم کے کھاتے میں ڈال کر مجھے شاہ عالم ثابت کرنا چاہ رہے تھے۔ بہرحال میرا اندازہ درست تھا۔ ولیم اور اس کے ساتھی معمولی درجے کے اچکے تھے۔ وہ اتنا منظم پلان بنا کر مجھے اغوا نہیں کر سکتے تھے۔ ولیم ان کے ساتھ تھا اور یہ جگہ غالباً اس نے ہی فراہم کی تھی لیکن سارا پلان ان لوگوں کا تھا جو کسی زیر زمین مافیا کے نمائندے لگتے تھے۔ ریوالور والے نے کہا۔

"شاہ عالم، خود کو مشکل میں مت ڈالو۔ نوادرات کا پتا بتاؤ اور اپنی جان چھڑا لو۔"

میں نے گہری سانس لی "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ نوادرات کے بارے میں جان جانے کے بعد تم اور میرے خون کا پیاسا یہ ولیم مجھے جانے دے گا۔"

"اس کا معاملہ ہم پر چھوڑ دو۔" اس نے جلدی سے کہا "ہم گارنٹی دیتے ہیں کہ پھر یہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

میں ہنسا "مجھے تم لوگوں پر اعتبار ہی نہیں ہے اور نہ ہی تمہاری گارنٹی کی میرے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔"

"تم جیسی چاہو ہم ضمانت دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں نے کہا نا۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا اور نہ ہی میرے پاس وہ نوادرات ہیں۔ وہ جمی کی تحویل سے چوری ہوئے تھے اور بعد میں ثابت ہو گیا کہ جمی ہمیں ڈبل کراس کر رہا تھا۔ نوادرات اس نے غائب کیے اور اب تک تو وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ جمی نے کسی پارٹی سے ان کا سودا بھی کر لیا ہوگا۔"

"وہ نوادرات اب تک مارکیٹ میں نہیں آئے ہیں۔ ہم نے معلوم کر لیا ہے۔ نہ ہی کسی ڈیلر نے خریدے ہیں۔"

"تب تم جمی کی خوش قسمت بیوہ جولی سے دریافت کرو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"ہمیں تم بتاؤ گے۔" ریوالور والے کا لہجہ یک لخت بدل گیا تھا۔ اس نے ولیم کی طرف دیکھا اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

ولیم لپک کر گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چمڑے کا کوئی چھ فٹ لمبا ہنٹر تھا۔ اس نے آتے ہی بے دریغ مجھ پر چلانا شروع کر دیا۔ میں مداخلت بھی نہ کر سکا تھا۔ ولیم ہنٹر چلانے کا ماہر لگ رہا تھا۔ جب تک میں سنبھلتا وہ مجھ پر چار پانچ وار کر چکا تھا۔ میرے جسم پر جینز کی پتلون اور اوپر موٹی جیکٹ تھی اس لیے اوپری جسم پر ہنٹر کا اثر معمولی درجے کا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ میرے چہرے کو نشانہ بنائے۔ اس کا ایک وار اچٹتا ہوا میری گردن کے عقبی حصے میں پڑا تھا۔ میری گردن پر جیسے کسی نے گرم سلاخ پھیر دی تھی۔ وہ اتنی تیزی اور مہارت سے پینترے بدل کر وار کر رہا تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا پھر اس کا ایک وار میرے رخسار کی کھال ادھیڑ گیا۔ میں زمین پر گرا اور سر ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اب وہ کھل کر مجھ پر وار کرنے لگا تھا۔ معاً ہنٹر رک گیا۔

"اٹھو شاہ عالم!" ریوالور والے کی آواز آئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ ولیم ایک طرف کھڑا کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے ہنٹر ہاتھ پر لپیٹ رکھا تھا۔ ریوالور والا میرے پاس آ بیٹھا تھا "کیا فائدہ تم اپنی کھال اتروا لو۔ یہ نوادرات تمہاری اور تمہارے دوستوں کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ جیسے ہم تمہیں لائے ہیں اسی طرح انہیں بھی لا سکتے ہیں۔"

میں تڑپ گیا تھا "نہیں!" میں نے بے اختیار کہا "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ہم ایسا نہیں کریں گے بشرطیکہ تم ہمیں ان نوادرات کے بارے میں بتا دو۔"

میں نے گہری سانس لی "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم نوادرات لے کر مجھے جانے دو گے اور بعد میں بھی مجھے یا میرے کسی ساتھی کو نہیں چھیڑا جائے گا۔"

"تم کیا ضمانت چاہتے ہو؟" وہ بولا "ہم لندن کی کسی معتبر شخصیت کی ضمانت دلوا سکتے ہیں۔"

"کیا تم مادام جولی کی ضمانت دلوا سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" اس نے بلا تاخیر کہا "ہم مادام جولی کی ضمانت بھی دلوا سکتے ہیں۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم بھول رہے ہو۔ یہ نوادرات اس کے شوہر کے پاس سے غائب ہوئے تھے اور

اس طرح سے یہ اس کا براہ راست نقصان تھا کیا وہ اتنی احمق ہے کہ اپنی چیز چرانے والے کی ضمانت دے گی۔"

"یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اگر مادام جولی خود آ کر ضمانت دے تو میں بتانے پر غور کر سکتا ہوں۔"

"ہم کوشش کریں گے لیکن یہ آسان کام نہیں ہے۔"

"تو ایسا کرو مجھے اس کے پاس لے چلو۔" میں نے دوسری پیشکش کی۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" اس نے سوچا "لیکن پہلے ہمیں اس سے بات کرنا پڑے گی۔"

"ضرور کرو اور اس منحوس شخص کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔" میں نے گال کا زخم چھوا۔ جہاں اب خون جم رہا تھا اور سوجن آنے لگی تھی۔ وہ تینوں چلے گئے۔ ولیم کے تیوروں سے لگ رہا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ کچھ دیر بعد ریوالور والے نے ایک میڈیکیٹڈ پٹی لا کر دی۔ جو زخم کو صاف بھی کرتی تھی اور خشک بھی۔ میں نے یہ پٹی اپنے گال اور گردن کے زخم پر لگا لی۔ ساتھ ہی وہ کاغذ کے کپ میں بھاپ اڑاتی کافی بھی لایا تھا۔

"افسوس کہ کرئی چین کلر نہیں ہے۔"

"تمہاری اتنی مہربانی بھی بہت ہے۔" میں نے اس سے کپ لیا۔

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی غلط حرکت کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔ اس جگہ سے نکلنا ایک ہی صورت میں ممکن ہے تمہاری روح جسم سے نکل جائے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کافی پی۔ لندن آنے کے بعد سے حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ حالات کسی تیز رفتار دھارے کی طرح مجھے بہائے لیے جا رہے تھے۔ میں ہاتھ پاؤں مارنے سے بھی قاصر تھا۔ کافی ختم کرتے کرتے میں غنودگی محسوس کرنے لگا انہوں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے کافی کے نام پر بے ہوشی کی دوا دے دی تاکہ میں مزاحمت کے قابل نہ رہوں۔

☆☆☆

اس بار آنکھ کھلی تو میں ایک سجے سجائے کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا تھا۔ ذہن پر ابھی بھی ہلکی سی غنودگی تھی۔ لہٰذا میں اٹھنے کے بجائے لیٹے لیٹے کمرے کا جائزہ لیتا رہا تھا اور سوچتا رہا کہ میرے غائب ہونے سے میرے پیاروں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پولیس نے میرے اغوا سے کیا نتائج اخذ کیے ہوں گے۔ میری تلاش کے لیے کیا کارروائیاں ہو رہی ہوں گی۔ اس بات کا کم ہی امکان تھا کہ پولیس مجھے تلاش کر سکے۔ جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا انہوں نے اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا ہوگا۔ ان جیسے پروفیشنل لوگوں سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

معاً دروازہ کھلا اور جولی اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اس سے پہلے میں سنبھلتا وہ والہانہ انداز میں آ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کا انداز اتنا پُرجوش تھا کہ میں بمشکل اسے دور کر سکا۔ اس نے حسب معمول ہوش ربا قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے اسے دور دھکیل کر اپنا چہرہ صاف کیا اور خفگی سے بولا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"اسے محبت کہتے ہیں۔" وہ پھر مجھ سے پیر تسمہ پا کی طرح چمٹ گئی۔ اس کی پیش قدمی اتنی جارحانہ تھی کہ مجھے اپنے مفتوح ہو جانے کا ڈر ہونے لگا۔ اس بار میں نے زیادہ درشتی سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"میرے نزدیک یہ صرف ہوس ہے۔"

دوسری بار دھکیلنے پر اس کا جوش و خروش ذرا دھیما پڑ گیا۔ اس نے بستر کے سرہانے رکھے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگا لی اور دھواں مجھ پر چھوڑا۔ "تم کچھ زیادہ ہی سنگ دل ہو گئے ہو۔"

"جولی میں جن حالات سے گزر رہا ہوں۔ میرے لیے یہ سب بے معنی ہے۔ میں تم تک کیسے پہنچا۔"

وہ اپنے بے ترتیب ہو جانے والے لباس سے بے پروا تھی۔ اس کا حسن جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا اور اسی وجہ سے میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ بلاشبہ اس کا حسن بلاخیز کسی بھی مرد کو مسحور کر سکتا تھا لیکن میں ایک بار اس سے دھوکا کھا چکا تھا اور اب وہ میرے لیے ایک خود غرض اور مفاد پرست عورت کے سوا کچھ نہیں تھی۔

"مجھے کچھ لوگوں نے...... کچھ شرائط کے تحت تمہیں میرے حوالے کیا ہے۔"

"شرائط کیا ہیں؟"

اس نے سر ہلایا "پہلے تو میرے لیے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ جمی کے چرائے جانے والے نوادرات تمہارے پاس ہیں۔"

"ان لوگوں سے چھٹکارے کے لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔" میں نے رخسار کے بھر جانے کے مرحلے میں موجود زخم پر ہاتھ پھیرا "ورنہ میرا اس سے بھی برا حشر ہو سکتا تھا۔"

"تو وہ نوادرات تمہارے پاس نہیں ہیں۔" اس کا لہجہ

ذرا سا بدلا تھا۔

میں نے سر ہلایا "ظاہر ہے ورنہ میں اب تک بیچ کر ان کی رقم کھری کر چکا ہوتا۔"

"دیکھو شاہ عالم...... میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ ان کا مطالبہ پورا ہوگا۔ اگر تم ایسا نہ کر سکے تو مجبوراً مجھے تم کو واپس ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"بے شک کر دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا "نوادرات میرے پاس ہیں ہی نہیں تو میں دوں کہاں سے۔"

"پلیز شاہ۔" وہ بے تکلفی سے میرے قریب چلی آئی "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے تم نے جمی کو ڈبل کراس کیا۔ اس نے بھی یہی سوچا تھا لیکن پہلے کام تم کر گئے لیکن مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"تمہارا شکریہ جولی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "لیکن میری تقدیر میں اگر نقصان اٹھانا لکھا ہے تو میں اس سے نہیں بچ سکوں گا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" اس نے نزدیک سے نزدیک تر آنے کی کوشش جاری رکھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ مرد جلد یا بدیر ان کی پیش قدمی کے آگے ہتھیار ڈال دے گا۔ "انسان تقدیر کی آڑ لے کر کوشش سے بچتا ہے۔ شاہ عالم یہ لوگ بے حد سفاک ہیں۔"

"جولی، تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے کیا اس معاملے میں تمہارا بھی کوئی کمیشن ہے۔" میں نے اس کی پیش قدمی کا ہلکا سا جواب دیا۔ اسے جھٹکا سا لگا تھا اور میرے چہرے کی رنگت زرد پھیکی پڑ گئی تھی۔

"شاہ عالم میرے خلوص کا ایسا جواب تو مت دو۔"

میں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا "جولی...... مجھے بے وقوف مت بناؤ...... تم اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہو بلکہ مجھے تو شبہ ہے کہ یہ سب تمہارے اشارے پر ہی ہو رہا ہے۔ جمی کے پالتو کتے جو تمہارے پیر چاٹتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے اغوا کیا ہے اور نام نہاد مافیا کے نمائندے ہونے کا تاثر رچا رہے تھے۔"

"ایسا نہیں ہے شاہ عالم۔" جولی کے چہرے پر خوف نظر آیا تھا۔ اس نے غیر محسوس طور پر مجھ سے دور ہونا چاہا لیکن اس بار میں نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"جولی...... یہ بتاؤ کہ انہیں کیسے معلوم ہوا میری کمر پر سکے کے برابر سرخ نشان ہے۔ پورے لندن میں سوائے تمہارے کوئی بھی میرے اتنے نزدیک نہیں آیا جتنا کہ تم آئی تھیں اور تم ہی اس نشان سے واقف ہو سکتی ہو۔"

"پلیز شاہ عالم میری نیت پر شک مت کرو۔" اس نے سرگوشی کی۔ اس نے مزاحمت ترک کر کے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

"میں تمہاری نیت بالکل درست جان گیا ہوں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" وہ بولی "میں نے تمہیں اغوا ضرور کرایا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ مجھے ان نوادرات کی ضرورت ہے۔ جمی کی معذوری کے سبب اس کے آدمیوں نے خوب لوٹ مار مچائی تھی۔ کاروبار تباہی کے کنارے پر ہے اور اسے پھر سے اٹھانے اور نئے سرے سے آرگنائز کرنے کے لیے بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ رقم میرے پاس نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس یہ حسین جسم ہے اسے کیش کرا لیتیں۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"بکومت۔ میں کوئی طوائف نہیں ہوں۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"تم طوائف سے بھی بدتر چیز ہو۔" میں نے اس کا گلا پکڑ لیا "اب میں تمہیں جہنم رسید کر دوں تو مجھے کون روکے گا۔"

"شاہ...... تم ایسا کر کے بچ نہیں سکو گے۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "تم مجھے مار کر بھی یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔" اس کا ہاتھ بیڈ کے کنارے پر رینگ گیا تھا۔ مجھے ذرا تاخیر سے علم ہوا تھا جب تک میں اس کا ہاتھ کھینچتا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ اس کی معمولی سی چٹخنی ٹوٹ گئی تھی۔ اندر آنے والے وہی دونوں تھے۔ "مافیا" کے پراسرار نمائندے۔ ایک نے ریوالور اور دوسرے نے مشین پسٹل اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے نشانے پر رکھ لیا۔

"شاہ عالم مادام کو چھوڑ دو۔"

میں نے جولی کو جکڑ کر اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔ "شوق سے گولی چلاؤ پہلے تمہاری مادام کتیا مرے گی۔"

"شاہ عالم حماقت مت کرو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" جولی گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی بھی کوئی کسر ہے۔" میں نے رخسار کے زخم کو چھوا "اپنے ان کتوں کو حکم دو کہ باہر جائیں۔ ورنہ......" میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ "تمہاری گردن بہت نازک ہے آسانی سے ٹوٹ جائے گی۔ اس کے بعد یہ مجھے چھلنی بھی بنا دیں تب بھی تمہاری زندگی واپس نہیں ملے گی۔ امنگوں سے بھرپور حسین بدن خاک میں مل جائے گا۔"

خلافِ توقع اس نے میری بات مان لی اور انہیں واپس

جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے اور جاتے جاتے دروازہ بھی بند کر گئے لیکن میں نے جولی کو چھوڑا نہیں۔ یہ تو واضح تھا کہ اس کمرے سے باہر نہ صرف ہمیں دیکھا جا رہا تھا بلکہ ہماری آواز بھی سنی جا رہی تھی۔ اگر میں جولی کو آزاد کر دیتا تو وہ دوبارہ اندر گھس آتے اور مجھے مزاحمت سے پہلے ہی چھلنی کر دیتے۔ ہاں میں نے گرفت ذرا ڈھیلی کر دی تھی۔ جولی نے گہرے سانس لیے اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"بہت ظالم ہو تم۔"

"میں اس سے بھی زیادہ ظالم بن سکتا ہوں۔"

"شاہ عالم تمہیں مجھ سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا ہے۔"

"معاف کرنا میں شاید صورت سے احمق نظر آتا ہوں لیکن ہوں نہیں۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ میری رہائی کی کیا صورت ہوگی۔"

"کوئی صورت نہیں ہے۔" اس نے سر میرے سینے پر رکھ دیا پھر سرگوشی میں بولی "شاہ...... کیا ان حسین لمحات کو ایک بار پھر نہیں دہرا سکتے۔ میں اس وقت کو یاد کر کے تڑپ جاتی ہوں۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ مجھے یہاں سے نکلواؤ اگر مرنا نہیں چاہتی ہو۔"

"او کے۔" اس نے گہری سانس لی "شاہ عالم اگر تم ایسا چاہتے ہو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گا۔" میں نے اسے خبردار کیا "کوئی بھی خطرہ محسوس کرتے ہی تمہاری نازک سی گردن توڑ دوں گا۔ یاد رکھنا مجھ سے پہلے تم مرو گی۔"

"کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔"

بستر سے اٹھ کر میں نے اپنی جیکٹ پہنی۔ پیروں میں جوتے ڈالے۔ اسی دوران میں، میں نے جولی پر سے ایک لمحے کو نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اس جیسی عورت سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کب کیا کر گزرے لیکن جیسے ہی میں نے قدم بڑھایا۔ دروازہ دوبارہ دھماکے سے کھلا اور وہی یاجوج ماجوج اندر آئے اس بار ان کے تیور جدا تھے۔ ریوالور والے نے سخت لہجے میں جولی سے کہا۔

"مادام یہ شخص نوادرات کا پتا بتائے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا ہے۔"

"بکومت۔ باس میں ہوں تم نہیں۔" جولی نے بھی اسی انداز میں کہا۔

وہ دونوں بیک وقت ہنسے۔ "مادام باس وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو اور اب طاقت ہمارے پاس ہے۔ گروپ کے اکثر لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ تمہاری سربراہی دن ختم ہوئے اب ہم مزید تمہیں برداشت نہیں کر سکتے۔"

جولی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا "رابرٹ کتے کے بچے بھونکتے ہو تم۔ میرے آدمی اب بھی میری بات مانتے ہیں۔"

رابرٹ ہنسا "ہاں جو تمہاری بات مانتے تھے وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ تمہاری طرف سے انہیں حکم سنایا گیا تھا کہ چھاپا پڑنے والا ہے اس لیے سب روپوش ہو جائیں۔"

"تمہاری یہ جرات۔" جولی بپھر گئی تھی۔ "کل تک تم جمی کے تلوے چاٹا کرتے تھے تمہیں اس مقام تک میں نے پہنچایا ہے۔"

"میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میں نے جولی کی گردن پر گرفت سخت کر دی۔ "میرے ساتھ ڈراما مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سب ملے ہوئے ہو۔"

"اچھا۔" رابرٹ مسکرایا "تمہارے خیال میں ہم ڈراما کر رہے ہیں کیوں نہ تمہارا خیال غلط ثابت کرنے کے لیے میں اس حسین ناگن کا سر اڑا دوں لیکن سوچ لو کہ اس سے تمہیں بھی نقصان ہو سکتا ہے۔" اس نے ریوالور جولی کے سر کی طرف اٹھایا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی۔

"رابرٹ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو تم نے جمی کے ساتھ کیا تھا۔" رابرٹ بولا "شاہ عالم تم بے شک اس کی گردن توڑ دو لیکن ہماری سلامتی کی واحد شرط نوادرات کا پتا ہے۔"

"اور اب تم مجھے کس کی ضمانت دو گے۔ مرحوم جمی کی۔" میں نے تلخی سے کہا "مجھے نوادرات کا پتا معلوم ہوتا تو نہیں بتاتا۔"

"یہ ہمارا کام ہے تم دیکھنا کہ ہم کیسے تم سے اگلواتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے تمہاری ہر ہڈی کو ریزہ ریزہ کرنا پڑے اور گوشت کے ریشے ریشے کرنے پڑیں۔ یقین کرو نوادرات کا پتا بتائے بغیر تم مرو گے نہیں۔" اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔ رابرٹ نے اچانک گولی چلائی تو میں سمجھا اس نے جولی کو مار دیا ہے۔ خود جولی کے منہ سے بھی چیخ سی نکلی تھی لیکن رابرٹ نے ذرا سا بچا کر فائر کیا تھا۔ "اب کے گولی اس کے سر میں لگے گی۔ شاہ عالم اس سے الگ ہو جاؤ۔"

میں نے حالات کا تجزیہ کیا۔ وہ ہر طرح سے بالا دست تھے اور جولی کے بارے میں ان کے عزائم صحیح نہیں تھے واقعی اس کا تختہ الٹا جا چکا تھا۔ اسے ڈھال بنا کر میں بچ نہیں سکتا

تھا۔ میں نے بادلِ نخواستہ جولی کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ مجھ سے ذرا دور ہٹتے ہوئے بولی "شکریہ رابرٹ...... تم نے واقعی اچھی پلاننگ کی۔"

"ہاں پلاننگ اچھی ہے۔" اس نے کہا اور اچانک جولی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ الٹ کر دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ اسے چکر آ گئے تھے۔ بمشکل دیوار کے سہارا لے کر وہ کھڑی ہوئی۔

"کتیا یاد ہے جب میں نے تجھے چھوا تھا تو تو نے میری کمر کی کھال اتروا دی تھی۔ میں ذرا اس سے فارغ ہو جاؤں تو پھر اس وقت کی ایک ایک تکلیف کا بدلا لوں گا۔"

"رابرٹ پاگل نہ بنو۔" جولی خوف زدہ ہو گئی۔ "محض چند ہتھیاروں اور ساتھیوں کے بل پر تم میرے اقتدار پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ کیا میں اتنی احمق ہوں کہ اپنے سارے پتے تمہارے سامنے رکھ دوں گی۔ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔" جولی نے لبوں سے رس آنے والا خون صاف کیا۔

"اسے لے جاؤ۔" رابرٹ نے بلند آواز سے کہا۔ فوراً ہی کمرے میں ایک گرانڈیل شخص گھس آیا۔ جس کا جسم ریسلرز جیسا تھا اور اس نے جسم کی نمائش کا خاطر خواہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے صفاچٹ سر پر بچھو کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے دانت نکالتے ہوئے جولی کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر شانے پر ڈالا۔ جولی اسے گالیاں دینے اور مارنے لگی لیکن اس جیسے گینڈے پر جولی کے نرم و نازک ہاتھ پیروں کا کیا اثر ہوتا۔ وہ اسے لے کر کمرے میں چلا گیا۔ رابرٹ نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

"اب تم بھی چلو...... یہاں بہت عیش کر لیے۔"

وہ مجھے لے کر باہر آئے۔ یہ کسی عمارت کے اندر کا حصہ تھا۔ ایک جگہ سے سیڑھیاں اتر کر ہم تہ خانے میں آئے۔ جہاں پر کچن تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم جولی کے نائٹ کلب میں تھے۔ اس وقت کچن سونا پڑا تھا یعنی دن کا وقت تھا۔ ایک دو جگہ کچھ افراد مصروف نظر آئے انہوں نے سرسری نظروں سے ہمیں دیکھا اور اپنے کام میں لگے رہے۔ جیسے ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔ کچن سے گزر کر ہم ایک راہداری میں آئے جس کے دونوں طرف دروازے تھے۔ رابرٹ کے ساتھی نے ایک فولادی دروازہ کھولا اور بولا "اندر جاؤ۔"

دروازہ کھلتے ہی اندر سے سردی کی یخ بستہ لہر سی نکلی تھی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹا "یہ کیا ہے؟"

"فریزر۔" رابرٹ نے کہا اور اچانک مجھے عقب سے لات ماری۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اندر گیا۔ عقب سے دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔

اندر بے پناہ یخ بستگی تھی یہ گوشت محفوظ رکھنے والا کمرا تھا۔ اسے بڑے سائز کا فریزر کہیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ یہاں پر بے شمار گوشت کا ذخیرہ تھا۔ سالم دنبے، بکرے، گائے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اور ایک طرف سور کے ٹکڑے بھی رکھے تھے۔ اندر ہر طرف برف تھی جس سے کہر سی اٹھ رہی تھی۔ میرے منہ سے سانس نکلتے ہی بھانپ بن جاتی اور جب میں سانس اندر کھینچتا تو ایسا لگتا جیسے ہوا کی جگہ برف میرے پھیپھڑوں میں جا رہی ہے۔ وہ مجھے اس برف خانے میں قید کر گئے تھے۔ جہاں میرے لیے شاید ایک گھنٹا بھی زندہ رہنا محال تھا۔ چند لمحے بعد سردی سے میرا جسم لرزنے لگا تھا۔ بھاری اور گرم کپڑوں کے باوجود ٹھنڈک جیسے رگ و پے میں گھسی جا رہی تھی۔ میں دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر بیٹھ گیا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس طرح تو سردی آسانی سے مجھ پر قابو پا لے گی۔ لہٰذا میں نے اچھلنا شروع کر دیا۔ اس سے جسم ذرا گرم ہوا۔ ساتھ ہی میرا ذہن بچنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر مجھے دیوار پر ایک جالی نظر آئی۔ اس سے ٹھنڈک نکل کر اس کمرے کو فریز کر رہی تھی۔ میں نے جالی کو بلاک کر دیا۔ وہ دیوار میں مضبوطی سے نصب تھی لیکن چند زوردار جھٹکوں نے اسے اکھاڑ دیا۔ اس کے عقب میں فریزر کا منجمد کرنے والا نظام جس میں کمپریسر اور گیس کی لائنیں تھیں لگا ہوا تھا۔ کمپریسر کام کر رہا تھا اور گیس کمرے کو سرد کرنے کے لیے یخ بستہ ہوا مہیا کر رہی تھی۔ میں نے غور کیا اگر کسی طرح کمپریسر کو اس کے کام سے روک دیا جاتا تو فریزر اپنا کام بند کر دیتا لیکن اس مضبوط قسم کے فریزر کو میں کس طرح کام سے روکتا۔ اس میں گیس کی باریک لائنیں بھی تھیں جن میں ہیلیم گیس بھری ہوئی ہے۔ اگر گیس لیک کر جاتی تو میں سردی سے نہیں تو دم گھٹ کر مر جاتا۔

میں نے ایک گائے کی جم کر پتھر کی طرح سخت ہو جانے والی ران اٹھائی اور اس سے کمپریسر پر ضرب لگائی۔ کمپریسر لرزا لیکن اس نے اپنا کام نہیں روکا تھا۔ میں نے لگاتار ضربیں جاری رکھیں۔ اس کے دو فائدے تھے ایک تو رفتہ رفتہ سہی لیکن کمپریسر اپنی بنیادوں سے لرز رہا تھا اور دوسرے میری ورزش ہو رہی تھی اس سے سردی کا احساس کم ہونے لگا۔ سب سے تکلیف دہ بات گائے کا یخ گوشت تھا جو میرے ہاتھوں کو بھی منجمد کیے دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میری انگلیاں جم کر ٹوٹ جائیں گی۔ ہر ضرب کے بعد مجھے ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کرنا پڑتا تھا۔ آخر کار ایک پرشور آواز کے ساتھ کمپریسر اپنی

جگہ سے سرکا اور بند ہو گیا۔ فریزر میں یخ آنا بند ہو گئی۔ اگرچہ اس سے فوری طور پر درجہ حرارت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا لیکن میں نے نفسیاتی طور پر سکون محسوس کیا تھا۔ ذرا سی محنت نے مجھے تھکن سے چور کر دیا تھا۔ میں فرش پر بیٹھا تو سردی ایک بار پھر میرے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ میں وقفے وقفے سے اچھل کود کر کے جسم کو گرم کر رہا تھا لیکن کب تک۔ میرے اندر توانائی کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ میں تھکن محسوس کر رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ کر آنکھیں بند کر لوں لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں نے ایسا کیا تو ہمیشہ کی نیند سو جاؤں گا۔ جاگتے رہنے میں ہی میری زندگی تھی۔ نیند مجھے ہمیشہ کے لیے سلا دیتی۔

جب تک جسم اجازت دیتا میں حرکت کرتا اور جب ہمت جواب دی جاتی تو میں گر جاتا۔ نہ جانے اس طرح کتنا وقت گزر گیا پھر مجھے لگا جیسے دروازے کے باہر کوئی ہے۔ میں نے ہینڈل گھومنے اور تالا کھلنے کی آواز سنی۔ بے اختیار میرے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ میں نے خود سے کہا اسی طرح بے بسی سے مرنے کے بجائے میں اگر کچھ کر کے مروں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اپنی بچی کچی ہمت جمع کر کے میں اٹھا۔ میں نے گائے کی ران اٹھائی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا میں ران سمیت اس کی طرف دوڑا۔ دروازے کے سامنے رابرٹ کا ساتھی کا چہرہ تھا۔ مارے حیرت کے وہ اپنی جگہ سے ہٹا بھی نہیں لیکن اس کے ہاتھ میں موجود پستول خودکار انداز میں چل گیا گولی ران میں اتر گئی۔ میری نہیں بلکہ گائے کی منجمد ران میں۔ اس نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں توپ کے گولے کی طرح ران سمیت رابرٹ کے ساتھی سے ٹکرایا اور راہداری میں جا گرا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میرا وجود اتنی سی کوشش سے بے جان ہو رہا تھا۔ میں اس کے اوپر ہی گر گیا۔ عقب سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ میں نے بمشکل سر گھمایا تو ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ سامنے جولی کسی مشاق فائٹر کی طرح رابرٹ کی مرمت لگا رہی تھی اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا تھا اور وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش میں مسلسل پٹ رہا تھا۔ ایک بار جولی نے پاؤں پر گھومتے ہوئے دوسری لات اس کے منہ پر ماری۔ میں نے کھٹ کی آواز سنی اور رابرٹ منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا۔ جولی نے جھپٹ کر اس کا ریوالور اٹھا لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ رابرٹ کے سر میں سوراخ کرتی راہداری کے سرے کی طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ فائر اور ہنگامے کی آواز سن کر لوگ اس طرف آ رہے تھے اور ظاہر ہے آنے والے رابرٹ کے ہی حامی ہو سکتے تھے۔ میں بمشکل اٹھا اور جولی سے کہا۔

"یہاں سے نکلو ورنہ مارے جائیں گے۔"

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور دوسری طرف بھاگی۔ اس سے پہلے میں نے رابرٹ کے ساتھی کا پستول اٹھا لیا تھا۔ جولی مجھے کھینچتے ہوئے راہداری کے دوسرے سرے تک لے گئی اس نے کونے کا دروازہ کھولا تو کسی نے فائر کیا۔ ہولناک دھماکے کے ساتھ گولی میرے سر پر سے گزری تھی۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جولی نے کھٹ سے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور دیوانوں کی طرح وہاں رکھا سامان ایک طرف پھینکنے لگی۔ میں دیوار سے لگ کر گہری سانسیں لینے لگا۔ میری حالت بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"راستہ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے کہا "ایک بار جمی نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا لیکن یہ پرانی بات ہے۔ مجھے صحیح سے یاد بھی نہیں ہے۔"

"اگر راستہ نہ ملا؟" میں نے پوچھا۔

"تو مارے جائیں گے۔" جولی کے لہجے میں مایوسی تھی "اگر تم ذرا رک جاتے تو میں اس مردود کے سر میں سوراخ ضرور کر دیتی۔"

"غالباً تم میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگی تھیں۔ مجھ میں تو بھاگنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔"

"نہیں ہے راستہ۔" اس نے دیوار کے ساتھ رکھا آخری کارٹن بھی اتار کر پھینک دیا۔ "شاید مجھے صحیح سے یاد بھی نہیں ہے۔"

"جولی باہر آ جاؤ۔ تم اس کمرے میں نہیں بچ سکتیں۔" باہر سے رابرٹ کے ساتھی کی آواز آئی۔

"دفع ہو جاؤ۔" جولی نے دانت پیسے "تم لوگوں کے پاس آنے سے بہتر ہے میں خود کو گولی مار لوں۔"

میری حالت اب اتنی بہتر ہو گئی تھی کہ میں اس کے ساتھ کمرے میں خفیہ راستے کی تلاش میں لگ گیا۔ جولی ساتھ ساتھ انہیں بلند آواز سے خبردار کر رہی تھی کہ کوئی دروازے کے پاس نہ آئے ورنہ وہ اسے گولی مار دے گی۔ اس کے جسم پر معمولی سا لباس تھا۔ یعنی منی اسکرٹ جو گھٹنوں سے خاصی بلندی پر ختم ہو رہا تھا اور بلاؤز جس کا گریبان کشادگی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس سردی کے عالم میں اس لباس کی وجہ تسمیہ پوچھی تو اس نے کہا

"مجھے بھی تمہارے پاس قید کرنے لا رہے تھے۔ میرے سارے گرم کپڑے اتروا لیے تھے۔ میں اچھی لگ رہی ہوں نا؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ اس عالم میں بھی باز نہیں آئی تھی جب کہ ہمارے خون کے پیاسے کمرے کے باہر مورچے لگائے بیٹھے تھے اور فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جولی نے ایک کارٹن گرایا تو اس میں سے ٹن پیک نکل کر فرش پر لڑھک گئے۔ ان میں آلوؤں کے تلے ہوئے قتلے تھے پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے گزشتہ سولہ گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک سے میرا برا حال تھا لیکن ان حالات میں جب جان کے لالے پڑے ہوں تو بھوک کی پروا کون کرتا ہے۔ میں نے ٹن کھول کر آلو کھانے شروع کر دیے۔ بھوک کے عالم میں یہ ٹھنڈے آلو بھی مزہ دے رہے تھے۔ تھک ہار کر جولی ایک کارٹن پر بیٹھ گئی اور جمی کو کوسنے لگی جس نے اس سے غلط بیانی کی تھی۔ "یہاں کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے۔"

"ممکن ہے کسی اور کمرے میں ہو۔" میں نے کہا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"جمی نے اس کمرے کا کہا تھا جس میں سامان رکھا جاتا ہے ایک طرح سے یہ گودام بھی ہے۔ اس راہداری میں کوئی اور کمرا اس کام کے لیے مخصوص نہیں ہے اور نہ ہی ان میں کوئی خفیہ راستہ ہو سکتا ہے۔"

چند گھنٹے پہلے میری دشمن جولی اب میرے ساتھ تھی کیوں کہ ہم دونوں کی جان کا دشمن مشترک تھا۔ میں غور کر رہا تھا کہ اس مشکل سے کیوں کر نکلا جائے۔ آلو کے قتلے کھا کر میری جان میں جان آئی تھی پھر میں نے اورنج جوس کا ایک ڈبا پیا تو میری توانائی ذخیرہ کرنے والی بیٹری مکمل طور پر چارج ہو گئی۔ مجھے جولی کی فائٹ کا منظر یاد آ گیا۔

"تم نے کمال کر دیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مارشل آرٹ کی ماہر ہو گی۔ تم نے اس وقت بھی ظاہر نہیں کیا جب میں نے تم کو یرغمال بنا لیا تھا۔"

وہ مسکرائی "مجھے تم سے خطرہ نہیں تھا اور پھر میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ ورنہ میں چاہتی تو تمہاری گرفت سے نکل سکتی تھی۔ وہ بدبخت مجھے فریزر میں ڈالنے کے لیے لا رہے تھے مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم بھی وہیں ہو جب تم نکلے اور جارڈن سے ٹکرائے تو مجھے پتا چلا۔ رابرٹ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اسے درست حالت میں ملو گے۔ اس کے خیال میں تو تم اندر جمے ہوئے پڑے ہو گے۔ اس کی حیرت سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ افسوس کہ صرف جبڑا ٹوٹا تھا۔ میں اس کی گردن توڑ دینا چاہتی تھی۔"

جولی ایک کارٹن پر پاؤں رکھے خاصے قاتلانہ قسم کے پوز میں بیٹھی تھی۔ اچانک باہر سے کسی نے دروازے پر فائر کیا۔

گولی سوراخ کرتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان سے گزری۔ ہم دونوں ہی اچھل کر دیوار کے ساتھ جا کھڑے ہوئے تھے۔ جواب میں میں نے بھی باہر کی طرف ایک فائر کیا۔ میں نے ذرا ترچھا فائر کیا تھا اور ایک عدد چیخ سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں باہر سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی لیکن دروازے کے ساتھ دیوار سے لگے ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ تھے۔ جولی بھی فائر کرنے جا رہی تھی۔ میں نے اسے روک دیا۔ "گولیاں مت ضائع کرو۔ ہمارے پاس یہی ہتھیار ہیں۔"

"یہ کتے کے بچے ہمیں گھیر کر مار دیں گے۔" جولی متفکر لگ رہی تھی۔

اچانک ہی میری نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ گولیوں نے اس میں بھی سوراخ کر دیے تھے ایک جگہ جہاں گولی لگی تھی مجھے دیوار پر لکیر سی نظر آئی جو عمودی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ہوتے ہوتے اس لکیر تک گیا اسے ناخن سے واضح کیا۔ تب انکشاف ہوا کہ دیوار کے اس حصے میں الگ سے ایک چوکور بلاک لگا تھا۔ کھرچتے کھرچتے میں، میں نے بلاک کی آؤٹ لائن واضح کر لی۔ دو ضرب دو مربع فٹ کا بلاک تھا۔ جسے دیوار میں لگا کر چونے کی تہہ اور پھر رنگ سے چھپا دیا گیا تھا۔ یہ کام کرتے ہوئے مجھے مسلسل دروازے کی طرف بھی دھیان رکھنا پڑا تھا۔ وہ پھر فائر فائرنگ کرتے تو میں بالکل سامنے تھا۔ آؤٹ لائن واضح کر کے میں نے بلاک ہلایا اس میں جنبش ہوئی تھی میں نے اشارے سے جولی کو اپنی طرف بلایا کہ وہ بلاک نکالنے میں میری مدد کرے۔ اسے بھی خطرہ تھا لیکن جان بچانے کے لیے حرکت تو کرنا تھی۔ بادل نخواستہ وہ آگے آئی۔ ایک طرف سے میں نے انگلیاں پھنسائیں اور دوسری طرف سے اس نے۔ ہم نے مل کر زور لگایا پھر بلاک آہستہ آہستہ باہر آنے لگا تھا اور اچانک ہی دھماکے سے فرش پر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اور جولی نے واپس دیوار کی طرف چھلانگ لگائی۔ ورنہ باہر سے کی جانے والی فائرنگ ہمیں چاٹ جاتی۔

جولی بڑے بے ڈھنگے پن سے گری تھی اس طرح اس کا منی اسکرٹ اپنی رہی سہی افادیت بھی کھو بیٹھا تھا۔ اس کی کمر میں چوٹ آئی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ باہر سے کوئی چلایا۔

"انہوں نے خفیہ راستہ کھول لیا ہے۔"

میں نے جولی کی طرف دیکھا "یہ کس قسم کا خفیہ راستہ ہے۔ جس سے سب ہی واقف ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ جمی نے اور کسے اس راستے کے بارے میں بتایا تھا۔"

"اس سے پہلے کہ وہ اندر آئیں یہاں سے نکل لو۔ میں تمہیں کور دیتا ہوں میرے ایک دو تین کہتے ہی بھاگ کر اس سرنگ میں گھس جانا۔" میں نے دھیمی آواز میں اسے سمجھایا اس نے سر ہلایا "اپنا ریوالور بھی مجھے دے دو۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ بولی "اس طرح تو میں پھنستی رہ جاؤں گی۔"

"یہ اس سے تو بہتر ہوتا کہ تم بھرے ریوالور کے ساتھ مر جاؤ۔" میں نے جھنجلا کر کہا "اگر ریوالور نہیں دیتی ہو تو جاؤ خود کوشش کرو۔ میں تمہیں کور نہیں دوں گا۔"

اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کرتے ہوئے ریوالور میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے کیچ کیا اور ایک دو تین کہا۔ اس کے ساتھ ہی جولی بھاگی میں نے دروازے پر ترچھی طرف سے مسلسل فائر کیے۔ باہر سے بھی فائر ہوئے لیکن ان میں سے دروازے پر کم ہی لگے تھے۔ جولی بحفاظت سرنگ میں گھس گئی تھی۔ اس کا لوچ دار جسم باآسانی اس مختصر خلا سے گزر گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر گئی میں اٹھ کر دوڑا جولی کا دیا ریوالور خالی ہو گیا تھا اسے پھینک کر میں نے اپنے پستول سے دروازے پر مسلسل فائر کیے اور الٹے قدموں سرنگ کی طرف بھاگا۔ قریب آتے ہی میں فرش پر گر کر اس میں رینگ گیا۔ اپنے چوڑے جسم کی وجہ سے مجھے ذرا مشکل ہوئی تھی مگر شکر ہے کہ عقب سے چلائی جانے والی کوئی گولی نہیں لگی تھی۔ میں رینگ رینگ کر آگے جا رہا تھا۔ عقب سے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میں سرنگ میں مڑ گیا۔ اب میں فوری طور پر محفوظ تھا۔ آگے جولی مجھ سے خاصی دور تھی وہ رکے بغیر بھاگ رہی تھی اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ تقریباً دس گز کے بعد سرنگ اتنی کشادہ ہو گئی تھی کہ میں اس میں جھکے انداز میں کھڑا ہو سکتا تھا اور دوڑ بھی سکتا تھا۔ میں جولی کے پیچھے لپکا سرنگ تنگ تھی۔ اندر روشنی کا بندوبست تھا۔ جولی نے پہلے ہی بٹن دبا کر سرنگ میں روشنی کر دی تھی۔ معاً مجھے چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں بھاگتے بھاگتے گر گیا۔ گولیاں پھر سے میرے اوپر سے گزری تھیں۔ سرنگ کے موڑ والے حصے میں بھی ایک شخص کھڑا مجھ پر اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اگر وہ ذرا سنبھال کر فائر کرتا تو اتنی مختصر جگہ میں میرے بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے دو گولیاں چلائیں اور وہ گر گیا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میرے پستول میں ایک ہی گولی رہ گئی تھی اگر کوئی آ جاتا تو اس بار میرے مارے جانے کے امکانات روشن تھے۔ جولی میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ اس سیدھی سرنگ میں کہاں چلی گئی تھی اس کا راز اس وقت کھلا جب میرے پیروں تلے سے اچانک زمین نکل گئی۔ زمین میں ایک گول سوراخ تھا۔ میں اس میں گر گیا پھر میں اسی گول پائپ سے نکل کر پانی میں جا گرا۔ یہ زیر زمین کوئی نالہ تھا جس میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ پانی نہ ہوتا تو اتنی بلندی سے گر کر میری ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹ جاتی۔

میں ہاتھ پاؤں مار کر کنارے کی طرف آیا۔ جہاں جولی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پانی نے اس کے مختصر لباس کو بھگو کر نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور میں اسے تھام کر باہر نکل آیا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"یہاں سے نکل چلو۔ وہ پیچھے آ رہے ہوں گے۔"

میں نے اس سرنگ کی طرف دیکھا۔ جس کے وسط میں چار فٹ چوڑا نالہ بہہ رہا تھا اور دونوں طرف دو دو فٹ کا راستہ تھا "کس طرف جائیں اور کہاں جائیں؟"

"مجھے بھی نہیں پتا۔" اس نے دونوں ہاتھ جسم پر لپیٹ لیے سردی سے اس کی حالت بری تھی۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ "اپنا بلاؤز اتار کر اسے پہن لو۔ یہ بالکل بھیگ گیا ہے۔"

لیدر جیکٹ پر پانی کا اتنا اثر نہیں ہوا تھا اور اس کی وجہ سے میری قمیص بھی بھیگنے سے بچ گئی تھی۔ اس نے بلاتکلف بلاؤز اتار کر میری جیکٹ پہن لی۔ میں جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے اوپر سے آنے والے پہلے دشمن کو دیکھ لیا تھا جیسے ہی اس نے پانی سے سر نکالا میں نے اپنی پستول کی آخری گولی اس کی نذر کر دی۔ وہ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو ہاتھ سے کنارے پر کھینچ لیا اس کے پاس ایک عدد بریٹا دیکھ کر مجھے ازحد خوشی ہوئی تھی۔ اس کے پاس نہ صرف پستول تھا بلکہ اس کی جیکٹ میں کئی میگزین بھی تھے۔ اس کی اون سے بنی ہوئی جیکٹ بھیگ گئی تھی ورنہ میں اسے بھی لے لیتا۔ اسے واپس پانی میں دھکیل کر میں نے پستول صاف کر کے پانی میں پھینک دیا اور جولی کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے جوتے بھی گر گئے تھے اسی لیے وہ ننگے پیر ہی چل رہی تھی۔ میں نے تہذیبِ مغرب پر افسوس کیا جس نے اپنی عورتوں کو برہنگی کا اس حد تک عادی بنا دیا تھا کہ مغرب کی عورت سخت ترین سردی میں بھی ناکافی سے بھی کم لباس

پہنتی ہیں۔ وہ موسم کی سختی برداشت کرلیتی ہیں مگر اپنے بدن پر اضافی لباس برداشت نہیں کرتی ہیں۔ جیکٹ سے اس کا اوپری جسم سردی سے محفوظ ہوگیا تھا لیکن ٹانگیں کھلی تھیں۔

خطرے کے احساس نے ہماری رفتار کو خود بخود تیز کردیا تھا۔ بس مجھے ایک ہی خوف تھا کہ کہیں آگے جاکر یہ راستہ بند نہ ہوجائے۔ اس قسم کے ڈرینج سسٹم کو لوہے کے جنگلوں سے تحفظ دیا جاتا ہے تاکہ جرائم پیشہ افراد انہیں آمدورفت کا ذریعہ نہ بنالیں۔ جمی نے فرار کے اس راستے کو کچھ سوچ کر ہی استعمال کیا ہوگا۔ یعنی اس طرف سے باہر نکلنے کا راستہ تھا لیکن یہ راستہ کس طرف تھا ابھی ہم اس سے لاعلم تھے۔ میں بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا اور جولی بار بار مڑ کر مجھے تیز چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی لمبی ٹانگیں اسے تیز دوڑنے میں مدد دے رہی تھیں۔ میری پانی سے بیگ کی بھاری ہو جانے والی جیز کاوٹ بن رہی تھی۔ جیکٹ اتارنے کے بعد سردی نے دوبارہ حملہ کیا تھا۔ بھاگنے کی وجہ سے جسم گرم تھا ورنہ میری حالت اور بھی خراب ہوجاتی۔

ایک جگہ سیڑھیاں اوپر جاتی نظر آئیں۔ جولی چلائی "یہی ہے راستہ۔"

"آہستہ بولو۔ تم پیچھا کرنے والوں کو آواز دے کر بلا رہی ہو۔" میں نے خفگی سے کہا "اوپر چڑھو۔"

وہ لپک کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یہ راستہ خاصا طویل ثابت ہورہا تھا ہم اب تک کوئی سوفٹ اوپر آچکے تھے اور میں حیران تھا کہ ہم زمین کے کتنے نیچے تھے۔ ایک بالکونی میں یہ سیڑھیاں ختم ہوئیں۔ یہاں زمین سے کوئی پانچ فٹ اوپر چھت تھی جس میں مین ہول بنا ہوا تھا۔ جولی نے نیچے جھانکا اور بال بال بچی۔ گولی اس کے سنہرے بالوں کو چھیڑ کر گزر گئی تھی۔ میں نے ہاتھ نیچے کرکے پورا میگزین خالی کردیا۔ کسی کی خوفناک چیخ گونجی اور پھر دھپ سے گرنے کی آواز آئی۔ اتنی بلندی سے گر کر بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جولی کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔

"ایک اور دشمن کم ہوگیا۔" میں نے خوش دلی سے کہا اور مین ہول کا ڈھکن اٹھایا اور باہر جھانکا مگر فوراً ہی سر نیچے کرنا پڑا تھا۔ مین ہول ایک سڑک کے وسط میں تھا اور میں نے جیسے ہی سر نکالا تھا سامنے سے ایک دیوہیکل ٹرک کے ڈبل وہیل آتے نظر آئے تھے۔ وہیل عین ہول کے اوپر سے گزرے تھے۔ میں بال بال بچا تھا۔ اس بار میں نے زیادہ احتیاط سے باہر جھانکا اور جب کوئی گاڑی اس طرف آتی نظر نہیں آئی تب باہر سر نکالا۔ میں نے جولی سے کہا۔

"دیکھ کر بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے کیا یہاں سے ہمارا نکلنا مناسب ہوگا؟"

وہ نیچے جھانک رہی تھی۔ "اب تو نکلنا پڑے گا ہی...... سارے حرامی پیچھے لگے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میں نے ڈھکن ایک طرف کیا اور اچک کر باہر آگیا۔ میں نے ہاتھ نیچے کیا اور جولی کو باہر گھسیٹا اس کی ران مین ہول کے کنارے سے رگڑ کھا گئی تھی جس پر اس نے گھورا اور زیر لب بولی "وحشی۔"

گاڑی والے مین ہول سے ایک جوڑے کو نکلتے دیکھ کر پریشان ہورہے تھے۔ اب ہمیں اس جگہ سے نکل جانا تھا اس سے پہلے کہ جولی کے دشمن ہمیں آلیتے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ کر سامنے سے گزرتی ہوئی ٹرام میں سوار ہوگیا۔ جولی اس حرکت پر مجھے برا بھلا کہتی رہ گئی۔ ٹرام کے اندر بھی بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی میں نے اوپر جانے کو ترجیح دی۔ جولی اس پر بھی جز بز تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے سردی سے پہلے ہی جان نکل رہی ہے۔"

"اتنی سی سردی ہے تم مروگی نہیں۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی لیکن جان کے دشمنوں نے نیچے دیکھ لیا تو ضرور ماری جاؤ گی۔"

"تمہیں کیا پتا میری کیا حالت ہورہی ہے۔" اس نے اپنا منی اسکرٹ ٹانگوں پر نیچے کرنے کے بعد جدوجہد کرتے ہوئے کہا "کس نے کہا تھا کہ اس موسم میں ایسا لباس پہنو۔" میں نے عقب میں دیکھا ابھی تک ایسی کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی تھی کہ کوئی ہمارے عقب میں آرہا ہو۔ میں غور کررہا تھا کہ جولی کو یہاں سے خدا حافظ کہوں اور اپنی راہ لوں مگر ساتھ ہی میں فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ مجھے کس طرف کا رخ کرنا چاہیے۔ گھر کا یا پولیس اسٹیشن کا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اغوا کو میرا فرار بنا کر مارے جانے والے دونوں پولیس آفیسر کو بھی میرے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ اس صورت میں پولیس کے پاس جانا پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لینا تھا۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے میں عاقل سے حالات کے بارے میں جان لینا چاہتا تھا۔

اس قیامت کی سردی میں ٹرام کے اوپری حصے میں ہم دو ہی بیٹھے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو جولی کو اس عجیب وغریب حلیے میں دیکھ کر نہ جانے کیا سوچتا۔ منی اسکرٹ کے اوپر اس نے محض صرف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میرے لیے اسے لیے پھرنا تماشا بننے کے مترادف تھا۔ معاً جولی نے خوفزدہ سی آواز

نکالی۔ "میرے خدا...... وہ دیکھو۔" وہ عقب میں اشارہ کر رہی تھی۔

"کیا ہے؟" میں نے عقب میں آتے ٹریفک کو دیکھا۔

"نیلے رنگ کی ویگن کو دیکھو۔ یہ رابرٹ کی ہے۔ اس میں وہی ہوگا۔"

نیلی ویگن بڑی تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔ میں نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ واضح طور پر دشمن جان چکا تھا کہ ہم ٹرام میں سفر کررہے ہیں۔ اوپر سے ویگن کی فرنٹ سیٹ پر دو افراد نظر آرہے تھے۔ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے شخص کے ہاتھ میں ایک خوفناک سی گن صاف نظر آرہی تھی۔ انہیں نزدیک آنے کا موقع دینے کا مطلب تھا کہ ہم خودکشی کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ ویگن میں موجود افراد مہلک اسلحے سے لیس تھے اور ان کے عزائم قاتلانہ تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں قریب آنے کا موقع نہیں دینا۔ میں اٹھا تو جولی نے گھبرا کر کہا۔

"یہ کیا کررہے ہو۔ اس طرح چلتی شاہراہ پر فائرنگ کرنا سنگین جرم ہوگا۔"

"تو کیا کروں انہیں قریب آنے کا موقع دوں۔ وہ آئیں اور ہمیں چھلنی کردیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

میں ٹرام کے عقبی حصے میں دو فٹ اونچی دیوار کے عقب میں دبک کر ویگن کی ونڈ شیلڈ کا نشانہ لینے لگا۔ اس پر گولی لگتی تو وہ گھبرا کر رک جاتے یا ویگن حادثے کا شکار ہوجاتی۔ میرے فائر کے ساتھ ہی ونڈ شیلڈ بکھر گئی تھی مگر میں نے کوشش کی تھی کہ گولی کسی کو نہ لگے۔ جیسے ہی ونڈ شیلڈ بکھری ویگن لہرائی مگر اس کے ڈرائیور نے فوراً ہی اسے قابو کرلیا تھا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ میں کہاں تھا۔ اگلی نشست پر بیٹھے شخص نے اپنی گن باہر نکال کر بلاتکلف مجھ پر برسٹ مارا تھا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اس علاقے میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ عورتوں کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ ٹرام کے مسافر بھی چلا رہے تھے۔ فائرنگ ٹرام پر ہی کی گئی تھی۔

"یہ کیا کررہے ہیں؟" جولی کا چہرہ سفید ہوگیا تھا۔

"فائرنگ۔" میں نے جواب دیا اور ذرا اوپر ہوتے ہوئے ویگن پر لگاتار فائر کیے۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح ویگن ناکارہ ہوجائے تاکہ وہ ہمارا تعاقب نہ کرسکیں۔ خطرہ محسوس کرکے ٹرام کے ڈرائیور نے اس کی رفتار بڑھادی۔ میری ساری ہی گولیاں بے کار ہوگئی تھیں۔ میگزین ختم ہوگیا تھا میں نے دوسرا میگزین بدلا اس وقت چاروں طرف سے پولیس سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ ایک اور مصیبت تھی۔ میں فی الوقت پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ سائرن کی آواز سنتے ہی ویگن کی رفتار میں بھی کمی آئی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے دوبارہ ویگن پر فائر کیے۔ اس بار ایک فائر کارگر رہا۔ ویگن کا اگلا پہیہ دھماکے سے پھٹا اور ویگن گھوم کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ ایک دکان کا شیشہ توڑتے ہوئے اندر گھس گئی تھی۔

"وہ مارا۔" میں نے نعرہ لگایا۔ اسی لمحے ایک ذیلی سڑک سے پولیس کار نمودار ہوئی۔ میں فوراً نیچے ہوگیا تھا۔ جب ٹرام سڑک پر موڑ مڑ رہی تھی تو میں نے پولیس کار کو دکان کے سامنے رکتے دیکھا تھا جس میں ویگن محاورے کے مطابق بیل کی طرح گھس گئی تھی۔ اتفاق سے دکان شیشے کے سامان کی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو جولی غائب تھی۔ وہ نہ جانے کب نیچے اتر گئی مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ میں بھی تیزی سے نیچے گیا جولی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ شاید وہ مجھے مصروف دیکھ کر خاموشی سے فرار ہونا چاہتی تھی مگر ٹرام کی تیز رفتاری کی وجہ سے اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے منہ پر کھسیانی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا "شکر ہے ان سے پیچھا چھوٹا۔"

"لیکن مجھ سے پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھڑا سکو گی۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا اور اس سے لگ کر کھڑا ہوگیا "جولی یہ پستول ہے جو تمہاری پسلی میں چبھ رہا ہے۔ امید ہے تم کوئی حماقت نہیں کروگی اور ہاں ذرا مسکراؤ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا لیکن اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ غالباً دل میں پچھتا رہی تھی کہ چلتی ٹرام سے چھلانگ کیوں نہیں لگادی۔ بادل نخواستہ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف گھوم گئی تھی۔

"اتنا فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے چہرہ ذرا پیچھے کیا "بس لگے رہنا کافی ہے۔"

"میں تو ساری عمر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"لیکن مجھے تمہارے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ جمی کا انجام میرے سامنے ہے۔"

"جمی سے اپنا موازنہ مت کرو۔ وہ صرف ایک نام نہاد سا شوہر تھا۔ جس کو میرے دل تک رسائی بھی نہیں ملی تھی۔ تم تو......"

"مجھے تمہارے دل تک رسائی میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے چلو اترو۔" میں نے اس کا بازو پکڑا اور ٹرام رکتے ہی نیچے اتر گیا۔ مجھے عاقل کو فون کرنا تھا۔ انگلینڈ میں پبلک فون

بوتھس کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے دور دراز کے علاقوں میں بھی پبلک بوتھ دیکھے ہیں۔ مسئلہ کال کرنے کے لیے سکے کا تھا۔ میری جیبیں بالکل خالی تھیں۔ میں نے جولی سے جیکٹ کی جیبیں دیکھنے کو کہا۔ اس نے بادل نخواستہ جیبیں دیکھیں۔
"نہیں ہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
میں اسے ایک جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ چکا تھا میں نے اس پر ہاتھ مارا تو مجھے اندر کچھ محسوس ہوا اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر یہ سکہ نکال لیا۔ سکہ ایک پونڈ کا تھا۔ جولی جھلا کر دبی زبان میں مجھے گالیاں دینے لگی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا کہ اس کے شہر میں ہوں، مجھے گالیاں بھی بری نہیں لگ رہی ہیں۔ چھوٹے سکے حاصل کرنے کے لیے میں نے وہیں ایک مشین سے گرم کافی کا کپ نکالا۔ جولی نے گرسنہ نظروں سے کپ کی طرف دیکھا۔ "پلیز ایک کپ مجھے دو۔"
ایک کپ کافی اس کے لیے لے کر بھی میرے پاس اتنی رقم بچی کہ میں نے عاقل کو فون کرلیا۔ فون بوتھ میں ہم دونوں ذرا دقت سے سہی لیکن فٹ آ گئے تھے۔ جولی موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے چپک گئی جیسے لوہا مقناطیس سے جپٹ جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے عاقل گھر پر تھا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ میرے ساتھ جولی ہے جو میری بے گناہی کی گواہی دے سکتی ہے۔ عاقل نے مجھے بتایا "یہاں خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ پولیس والوں کو مار کر فرار ہونے کا الزام تم پر آ رہا ہے۔"
"اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہی مجھے اس الزام سے بری کرا سکتی ہے۔"
"مشکل ہے وہ پولیس کے سامنے صاف مکر جائے گی بلکہ موجودہ صورت حال میں تمہیں اغوا کے الزام میں پھنسا دے گی۔ مجھے سوچنے دو اور تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟"
میں نے اسے اپنی لوکیشن بتائی۔ وہ مشرقی لندن کے کہیں آس پاس تھا۔ "میں سمجھ گیا مجھے آنے میں تقریباً دو گھنٹے لگیں گے اس دوران میں اس آفت کی پرکالہ کو قابو میں رکھنا۔"
"اتنی دیر کیوں؟"
"بس ہو جائے گی اور ہاں اس پر مت ظاہر کرنا کہ میں دیر سے آؤں گا۔"
جولی جگہ کی تنگی کے بہانے میرے گلے لگ کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں اور عاقل اردو میں بات کر رہے تھے ظاہر ہے اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ تلملا کر کہا کہ ہم انگلش میں بات کریں۔
"یہ ہماری باتیں سن رہی ہے۔" عاقل نے مشکوک لہجے میں کہا "اتنے قریب ہے۔"
"یار بوتھ میں ہے تم جانتے ہو اس میں کتنی گنجائش ہوتی ہے۔"
"یک قلب دو جان ہو جاتا ہے آدمی۔" وہ ہنسا "میرے آنے تک مزے کریں قائم مقام سسر صاحب۔"
"باقی سب کو تسلی دے دینا۔" میں نے کہا اور فون رکھ دیا جولی مجھے گھور رہی تھی۔
"کیا بات کر رہے تھے تم اپنی زبان میں؟"
"تمہیں بتانا ضروری نہیں ہے۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا "باہر نکلو۔"
"یہاں رہنے میں کیا حرج ہے۔" وہ بولی "باہر سردی لگ رہی ہے۔"
"اور مجھے یہاں گرمی لگ رہی ہے۔" میں نے اسے بوتھ سے باہر دھکیلا۔ سب آنے جانے والے ہمیں گھور رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو میرا ایشیائی رنگ و روپ تھا۔ اگر میری جگہ کوئی گورا ہوتا تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دوسری اور اہم وجہ جولی کا بلاخیز اور جامے سے باہر ہو جانے والا حسن تھا۔ مجھے خفت ہو رہی تھی۔ مجھے باہر کی سرد فضا میں رہنا گوارا تھا بہ نسبت جولی کے ساتھ فون بوتھ میں رہنے کے۔
"کیا کہہ رہا تھا تمہارا یہ جاننے والا؟"
"کچھ نہیں۔ پولیس کو ہماری تلاش ہے۔ وہ ہمیں محفوظ مقام تک لے جانے کے لیے آ رہا ہے۔"
"میرے پاس بے شمار ایسی جگہیں ہیں جہاں تم با آسانی مہینوں تک چھپ کر رہ سکتے ہو۔"
"بات صرف میری نہیں تمہاری بھی ہے۔ میرا یہ واقف کار پولیس سے تعلق رکھتا ہے اور اسے اپنے خصوصی ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ پولیس کو تمہاری تلاش ہے۔ تم پر کلب میں ہنگامہ آرائی کے دوران میں دو افراد کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔"
اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "اتنی جلدی الزام بھی عائد کر دیا۔"
"اسکاٹ لینڈ یارڈ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے مشہور ہے۔ اب میری اور تمہاری پوزیشن ایک جیسی ہے۔ میں تم پر قطعی بھروسا نہیں کر سکتا۔"
"میں کر سکتی ہوں تم پر؟" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔
"کیوں نہیں اول تو تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مجھے تم سے ہے اور اس وقت تم مجبور ہو۔ لہٰذا جو میں کہوں تمہیں وہ کرنا ہی ہوگا۔" وقت گزاری کے لیے ہم ایک کیفے میں آ بیٹھے تھے یہاں سے ہم سڑک پر نظر رکھ سکتے تھے۔ عاقل آتا یا جولی کے دشمن دونوں ہمیں نظر آ جاتے پھر کیفے اندر سے گرم تھا۔ ایک پاؤنڈ کا سکہ اتنا بابرکت ثابت ہوا تھا کہ ہم نے اس کی ریزگاری سے ایک ایک کپ کافی اور پی۔
"تم میرا کیا کرو گے؟" اس نے سنجیدگی سے کہا "مجھے جانے دو تم اپنے راستے جاؤ۔"
"فی الوقت میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر تم نے مستقبل کے بارے میں میرے خدشات دور کر دیے تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اتنا اطمینان رکھو میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"
"اچھا۔" اس کے لہجے میں معنی خیز سوال تھا۔
میں اسے دھوکا دے رہا تھا۔ دلاسے دے رہا تھا تاکہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ اگر اس بھرے پرے ریستوران میں وہ ہنگامہ کرتی تو میرے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ میں اسے گولی بھی نہیں مار سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دھمکا سکتا تھا۔ اس لیے بے دریغ جھوٹ بول کر اس کو رام کر رہا تھا۔ وہ بے حد شاطر عورت تھی۔ اس نے جمی جیسے گرگ باراں دیدہ کو تسخیر کر لیا تھا اور اپنی ذہانت سے رفتہ رفتہ اس کے کاروبار کا پورا اسکوپ سمجھ لیا اور پھر موقع پاتے ہی اسے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ ایسی عورت سے ڈرنا چاہیے۔ میں باتوں سے اس کا دل بہلا رہا تھا اور اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار جانے کی بات کرتی اور میں کبھی نرمی اور کبھی گرمی سے اس کی درخواست مسترد کر رہا تھا۔ اچانک اس نے واش روم جانے کو کہا۔
"چلو۔" میں نے کہا "میں بھی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"
وہ کسی قدر مایوسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے اکیلے جانے کی اجازت دے دوں گا۔ اسی لمحے میری نظر کیفے کے باہر رکنے والی پولیس کار پر پڑی۔ اس میں سے انسپکٹر ڈیری نزمین برآمد ہوا تھا۔ میں نے جولی کو عجلت میں گھسیٹا اور واش روم کی طرف چل دیا۔ وہ گڑبڑا گئی تھی "کیا ہوا؟"
"پولیس کیفے کے باہر موجود ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا تھا اس نے میری کہانی پر یقین کر لیا تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ اس کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ راہداری میں دو طرف واش روم تھے ایک مردانہ اور دوسرا عورتوں کے لیے تھا۔ جولی تیزی سے عورتوں کے لیے مخصوص واش روم میں چلی گئی۔ اس نے اتنی تیزی دکھائی کہ میں اسے روک بھی نہیں سکا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا اس لیے مردانہ واش روم میں چلا گیا۔ جب میں راہداری میں آیا۔ تو جولی اب تک واش روم سے باہر نہیں نکلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دے کر اسے آواز دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میرے ذہن میں گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں نے دروازے پر زور دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر جھانکتے ہی میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ واش روم کے عقب میں بڑا سا روشن دان تھا اور کھلا تھا۔ جولی اس سے نکل گئی تھی اور میں ذرا آگے گیا تھا کہ مجھے کھائی سے نکل کر کنویں میں گرنے والا محاورہ عملی طور پر نظر آ گیا۔ جولی کو دو نوعمر لیکن ہٹے کٹے بدمعاشوں نے گھیر لیا تھا۔ یہ اسکن ہیڈز کہلاتے ہیں اور آج کل برطانیہ میں عام تھے۔ ان کا دل پسند مشغلہ ایشیائیوں کو لوٹنا اور مارنا ہے لیکن موقع ملنے پر یہ اپنے ہم رنگ سفید فاموں پر ہاتھ صاف کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جولی دبی دبی زبان میں ان سے رحم کی اپیل کر رہی تھی اگر اسے مجبوری نہ ہوتی تو وہ کھل کر ان لفنگوں کو بتاتی کہ وہ کون ہے اور ممکن ہے ان کی پتلونیں یہ سن کر گیلی ہو جاتیں لیکن فی الوقت وہ جولی کی اپیلوں سے زیادہ اس کے ہوش ربا بدن کی خوشہ چینی میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ ان کے ہاتھ آزادی سے جولی کے جسم پر حرکت کر رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چاقو تھا جو اس نے بے پروائی سے جولی کی گردن سے لگا رکھا تھا۔ اس کو قطعی احساس نہیں تھا کہ چاقو کی نوک جولی کی گردن میں اتر رہی تھی اور اس کی گردن سے خون چھلک رہا تھا۔ غالباً اس چاقو نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ ورنہ رابرٹ کا جبڑا توڑ دینے والی اتنی آسانی سے ان کے قابو میں نہیں آتی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گہری سانس لی اور اس بار بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔
"منے بچوں اب بس کرو۔ تمہارا باپ آ گیا ہے۔"
دونوں نے بیک وقت پلٹ کر مجھے دیکھا اور کتے کی طرح غراتے ہوئے میری طرف آئے لیکن میرے ہاتھ میں پستول دیکھتے ہی پالتو بن گئے تھے۔ بس دم ہلانے کی کسر رہ گئی تھی۔ ورنہ ان کے تاثرات کچھ اسی طرح کے تھے۔ چاقو والے نے اپنا چاقو رضاکارانہ طور پر بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ میرا ارادہ انہیں دفع ہو جانے کا اشارہ کرنے کا تھا۔ ایک طرح سے وہ میرے ہی کام آئے تھے۔ اگر وہ نہ روکتے تو

جولی نکل چکی ہوتی مگر جولی اب انہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ انہوں نے جو اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس سے تو وہ لطف اندوز بھی ہوئی ہو گی اصل غصہ اسے اپنے فرار میں ناکامی کا تھا۔ اس نے ہوا میں اچھل کر دونوں پیر ایک کی پشت پر مارے تو وہ سامنے رکھے کچرے دان میں جا گرا۔ دوسرا پلٹا تھا لیکن جولی بجلی بن گئی تھی۔ دوسرا اسے چھو بھی نہ سکا وہ مار کھا کر اپنے ساتھی پر ہی جا گرا تھا۔ پہلے والے کا سر کچرے دان کے فولادی ڈھکن سے ٹکرایا تھا۔ اس کے حواس گم ہو گئے تھے۔ دوسرے نے بھی بے ہوش ہونے میں عافیت جانی۔

''بس اب رک جاؤ۔'' میں نے پستول سے اشارہ کیا ''اپنی جیکٹ کے بٹن بند کرو۔''

وہ غصے کی شدت سے ہانپ رہی تھی۔ اس نے بٹن بند کرنے کے بجائے اتار کر میری طرف پھینک دی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو۔'' میں نے بوکھلا کر کہا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے ان لفنگوں میں سے ایک کو کھینچ کر زمین پر ڈالا اس کی جیکٹ اتاری پھر قمیص اتار کر پہن لی اور آخر میں اس کی جیکٹ چڑھا لی۔ جوتے کسی قدر ڈھیلے تھے مگر اس نے وہ بھی پہن لیے۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''تم ایشیائی مرد پاگل ہوتے ہو۔ کوئی برٹن ہوتا تو مجھے اس طرح دیکھ کر پاگل ہو جاتا اور تم نظریں چرا رہے تھے۔''

''ہمیں پاگل پن ہی بھلا لگتا ہے۔'' میں نے رکھائی سے کہا ''اب چلو۔''

ہم نکل کر سامنے سڑک پر آئے اور دوبارہ اس کیفے میں جا بیٹھے۔ کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا کہ میرے ساتھ زنانہ حلیے میں آنے والی اچانک اس قسم کے مردانہ حلیے میں کہاں سے آ گئی۔ جولی نے کافی کے ساتھ برگر سینڈوچ کا آرڈر بھی دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ساری عیاشی اس لفنگے کے مال پر ہو رہی تھی۔ عاقل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس سے بات ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا اور وہ آنے ہی والا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ جب میں جولی کے ناکام فرار کی داستان کا آخری حصہ سن رہا تھا۔ عاقل کی پرانی کورٹینا آ کر ہمیں کیفے کے سامنے رکی۔ اس نے کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر کیفے میں جھانکا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرایا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور جولی سے بولا۔

''بس اب اٹھ جاؤ اور میں پھر خبردار کر رہا ہوں۔ کسی قسم کی چالاکی کا انجام تمہاری جواں مرگی کی صورت میں نکلے گا، تم یقیناً اس پر آسائش دنیا سے کسی معمولی سی غلطی کی بنا پر جانا پسند نہیں کرو گی۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' اس نے ٹشوز سے منہ صاف کیا۔ وہ ذرا سی دیر میں چار عدد بھاری بھرکم سینڈوچ کھا گئی تھی۔ اس کے نازک نظر آنے والے جسم سے قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنا کھاتی ہے۔ عاقل نے تحسین کی نظروں سے اسے دیکھا اور کار کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ میں بھی جولی کے برابر میں بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کر کے عاقل سے کہا۔

''ہمیں کہاں جانا ہے..... تمہارے غریب خانے۔''

''حضرت وہاں جانے کا انجام سوائے میری وفات کے کچھ نہیں ہوگا۔ عینی ان خاتون کو دیکھ کر میرے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوگی۔ ہم ایک اور جگہ جا رہے ہیں۔''

''عینی بھی پاگل ہے اتنی سی بات پر شوہر کو قتل کر دے گی۔''

''یہ ساری خواتین کچھ اس قسم کی خونخوار ہوتی ہیں۔ مرد کے پاس سے بھی کسی غیر عورت کی بو آ جائے تو مرنے مارنے پر تل جاتی ہیں۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''بدقسمتی سے آج صبح ایک خاتون کا فون آ گیا جو پرانی واقف کار تھیں اور میری شادی سے بھی بے خبر ہیں۔ انہوں نے عینی سے میرے بارے میں نہ جانے کیا کہا کہ اس کا منہ پھولا ہوا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی ''اس معاملے سے نمٹ لیں پھر عینی کا موڈ بھی درست کر لیں گے۔''

''تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟''

''میرے دوست کی بیوی کا موڈ خراب ہے۔'' میں نے اسے بتایا ''بے چارہ اسی وجہ سے پریشان ہے۔''

''جناب پر بھی کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آئے گا۔'' عاقل نے سرد آہ بھری۔

اس نے کار ایک گودام نما جگہ کے سامنے روکی۔ جولی کسی قدر خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔ ''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''تم سے ذرا کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔'' میں نے کار سے اترتے ہوئے کہا ''تم بھی ذرا نیچے آ جاؤ۔''

وہ اترنے پر آمادہ نہیں تھی میں نے بازو سے پکڑ کر کھینچا تو اس نے وحشیانہ انداز میں اپنا دایاں ہاتھ گھمایا جو اس نے اب تک اپنے عقب میں کر رکھا تھا۔ چمک محسوس کرتے ہی میں بے اختیار پیچھے ہٹا جو چاقو میرے بائیں پہلو میں دل کے مقام پر پیوست ہوتا تھا۔ اس نے میری آستین اور بازو کو کاٹ دیا۔ ایک تیز آگ میرے بازو میں بھر گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دوسرا وار کرتی میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے کرگالی دی۔ میں نے پستول والا ہاتھ اس کے منہ پر مارا لیکن

یہ خیال رکھا کہ اسے مہلک چوٹ نہ آئے پھر بھی وہ چکرا گئی تھی۔ عاقل تیزی سے آیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے میرا بازو دیکھا ''اوہو..... خون بہہ رہا ہے۔''

''معمولی زخم ہے۔'' میں نے جولی کا چاقو بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ یہ اسے لفنگے کے لباس کے ساتھ ہی ملا تھا۔ اس وقت میں نے غور نہیں کیا تھا اس نے چاقو والے کا ہی انتخاب کیا تھا اور اس کا لباس اتار کر پہن لیا تھا۔ اس میں چاقو بھی تھا۔ عاقل نے اسے کھینچ کر کار سے اتارا اور دھکے دیتا ہوا اندر لے جانے لگا۔ ''احتیاط سے یہ لڑنے کی ماہر ہے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ وہ ہنسا۔

''فکر نہ کریں جناب۔ کچھ ہاتھ میں بھی دکھا سکتا ہوں۔''

گودام اندر سے کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا اسے کسی باقاعدہ مصرف میں نہیں لایا جاتا تھا۔ عاقل نے کہیں سے ایک کرسی برآمد کر کے جولی کو بیٹھنے کے لیے پیش کی پھر میرا بازو دیکھا۔ چاقو کی نوک جیکٹ کے ساتھ کھال کو بھی چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ عاقل نے اپنا رومال زخم پر باندھا اور میں نے جیکٹ پہن لی۔ جولی اب بے پروا نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔ ''مس جولی۔ اب بتاؤ کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟''

''چکر تم کو پتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم تک نوادرات والی خبر کیسے پہنچی؟''

اس نے جواب دیا ''جمی نے مرنے سے پہلے مجھے ایک خط لکھا تھا اس میں اس نے قسم کھا کر کہا تھا کہ نوادرات کا اسے کچھ نہیں پتا اور نہ ہی اس نے لارڈ جیمز کی دی ہوئی رقم چرائی تھی۔ جمی مرتے وقت جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔''

''تو تم نے اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا کہ نوادرات اور رقم میں نے چرائی ہے۔''

''دو اور دو چار کر کے۔ یہ کام لارڈ جیمز نے بھی نہیں کیا تھا وہ جس مرتبے کا آدمی تھا ایسا کام نہیں کر سکتا تھا۔ باقی بس تم رہ جاتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تم نے دونوں کو ڈبل کراس کیا ہے۔ جعلی ڈکیتی میں رقم خود چرائی اور پھر جمی کی تحویل میں موجود نوادرات بھی اسی طرح غائب کر دیے۔ شاہ عالم تم نے چالاکی کی انتہا کر دی۔ جمی اور لارڈ جیمز ایک دوسرے کو الزام دیتے رہ گئے تھے۔ تمہارے پاس رقم تو ساڑھے تین لاکھ پاؤنڈز کی آئی لیکن وہ نوادرات اس سے کہیں زیادہ مالیت کے ہیں گزشتہ ایک سال میں ان کی قیمت دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ کم سے کم دس لاکھ پاؤنڈز کے ہیں اب وہ نوادرات۔''

''اوہ۔'' میرے ہونٹ سکڑ گئے ''تو یہ وجہ تھی کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا۔ مجھے پولیس کی تحویل سے اغوا کرا دیا اور دو پولیس آفیسر مار دیئے۔''

''ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

عاقل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''مس جولی تمہیں ڈر نہیں ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں تمہاری ساری ہی عمر جیل میں گزرے گی۔''

''یہ کام رابرٹ نے کیا ہے۔'' جولی مسکرائی ''اور رابرٹ خود میرا دشمن ہو رہا ہے۔ میں نے شاہ عالم کو پولیس کی تحویل سے اغوا کر کے فرار کیا تھا لیکن پولیس آفیسروں کو اس نے خود قتل کیا تھا۔''

''جولی تمہاری حالت ہمارے ایک محاورے کے مطابق دھوبی کے کتے کی سی ہو گئی ہے جو نہ گھر کا ہوتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔ تم نے مجھے اغوا کر کے نوادرات حاصل کرنا چاہے اور خود اپنے ہی لوگوں سے بچتی پھر رہی ہو۔''

''اس کی وجہ تم جانتے ہو۔ رابرٹ کام نکلنے کے بعد تمہیں قتل کر دینا چاہتا تھا اور میں ایسا نہیں چاہتی تھی اسی وجہ سے وہ میرا بھی دشمن ہو گیا۔''

میں ہنسا ''بلاوجہ مجھ پر احسان مت دھرو۔ یہ کہو کہ ان نوادرات کے لالچ میں تم دونوں کی آپس میں ٹھن گئی۔ وہ پہلے ہی گروہ پر قبضے کے خواب دیکھ رہا ہوگا اور اس وقت اسے موقع مل گیا کہ وہ تمہارے خلاف بغاوت کر دے۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اب تم چھپتی پھر رہی ہو اور وہ مزے کر رہا ہو گا۔ جبڑا بھی کچھ دن میں ٹھیک ہو جائے گا مگر تمہارے مقدر مجھے ٹھیک ہوتے نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

جولی شکست خوردہ نظر آنے لگی تھی۔ ''ہاں..... ابھی میرے ستارے گردش میں ہیں لیکن رابرٹ کے لیے یہ سب اتنا آسان نہیں ہو گا۔ میرے وفادار ہیں جو مزاحمت کریں گے۔''

''کتنے دن۔ بلکہ مجھے شبہ ہے کہ تمہارا کوئی وفادار ہو گا بھی یا نہیں..... اس دنیا میں وفاداری صرف طاقت سے ہوتی ہے یا پیسے سے..... تم ان دونوں چیزوں سے محروم ہو۔''

''شاہ عالم اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''حالانکہ تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی اور میں شاہ عالم نہیں ہوں۔''

وہ ہنسی "تم شاہ عالم ہو...... سر سے پاؤں تک میں نے تمہیں نزدیک سے دیکھا ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ "میں تمہیں پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتی۔"

"تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب میں شاہ عالم نہیں ہوں تو میں کیسے تسلیم کرلوں۔"

"اگر تم شاہ عالم نہیں ہو تو پھر کون ہو؟" جولی کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"میرا نام ناصر عظیم ہے اور میں بھی اتفاق سے پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک عام سا کاروباری ہوں۔ اپنے عزیزوں سے ملنے آیا تھا کہ اس چکر میں پھنس گیا۔"

"یہ کہانی کسی اور کو سنانا۔" وہ ہنسی "مجھے یقین ہے تم شاہ عالم ہو۔"

"مجھے بھی یقین ہے۔" اچانک کسی نے گودام کے دروازے کی طرف سے کہا۔ آواز عجیب سی تھی اور جب رابرٹ سامنے آیا تو وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ جبڑا ٹوٹا ہونے کی وجہ سے وہ درست طور پر بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن اس کے گرگوں کے ہاتھ میں مشین گنیں تھیں۔ لہٰذا میرا پستول والا ہاتھ خود بخود جھک گیا۔

"تم یہاں تک کیسے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے آدمی تم دونوں کا مسلسل پیچھا کر رہے تھے۔" رابرٹ بولا "میرا خیال ہے وہ نوادرات اسی گودام میں ہیں۔"

وہ احمق ابھی تک نوادرات کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کے آدمیوں نے ہمیں پہلے نہیں چھیڑا تھا۔ اس نے جولی کی طرف دیکھا۔ "مادام افسوس کہ اب تم زندہ نہیں رہو گی لیکن مرنے سے کیا پہلے میرے ساتھ کچھ یادگار لمحات گزارنا پسند نہیں کرو گی۔"

"اس کے بجائے میں موقع ملنے پر تمہارا منہ ایک بار پھر توڑنا پسند کروں گی۔" جولی نے اطمینان سے کہا تو رابرٹ کا چہرہ نفرت سے مسخ ہونے لگا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"تم نے اب تک پسٹل نہیں چھوڑا؟"

میں نے پسٹل ایک طرف بے پروائی سے پھینک دیا۔

"افسوس کہ ایک عورت ہی تمہارا جبڑا توڑ چکی ہے۔ گروہ کی سربراہی کا یہ آغاز تمہارے لیے نہایت منحوس ثابت ہوا ہے۔"

"بکو مت۔" اس نے غرا کر کہا "ایسا نہ ہو۔ میں نوادرات ملنے سے پہلے ہی تمہیں مار دوں۔"

"رابرٹ تم بھی نہیں بچ سکو گے۔" جولی بولی "تم نے پولیس والے مار کر اسکاٹ لینڈ کو اپنی راہ پر لگا لیا ہے۔ جلد یا بدیر وہ تم تک پہنچ جائیں گے۔"

"تب تک میں نوادرات اور یہ سارا بزنس بیچ کر یہاں سے جا چکا ہوں گا۔" وہ بولا۔

عاقل بے چارہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ مار دھاڑ والا آدمی نہیں تھا۔ اگر اس کی جگہ اس وقت رئیس میرے ساتھ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ میں نے رابرٹ سے کہا "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"نوادرات۔ تم تکلیف اٹھانے سے پہلے بتا دو انہیں کہاں رکھا ہے؟"

میں ہنسا "کیا تمہارے خیال میں دس لاکھ پاؤنڈز مالیت کے وہ نوادرات اس غیر محفوظ گودام میں ہوں گے؟"

"میرے خیال میں تو یہ جگہ ان کے لیے بہت محفوظ ہے۔" اس نے چاروں طرف دیکھا "کسی کے بھی ذہن میں نہیں آئے گا کہ وہ قیمتی نوادرات یہاں پر چھپائے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے شانے ہلائے "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تم تلاش کرلو۔"

"تو پھر تمہارا کیا فائدہ۔" یک لخت اس کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ "کیوں نہ میں تمہیں اڑا دوں۔" اس نے ریوالور میری طرف کیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس کے عزائم سچ مچ خطرناک نظر آ رہے تھے۔ جولی اچانک بول اٹھی۔

"ایک منٹ رابرٹ کیا ہم ڈیل نہیں کر سکتے؟"

"کیا تم ڈیل کی پوزیشن میں ہو؟" رابرٹ نے طنزاً کہا۔

"کیوں نہیں۔" جولی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "تم نے طاقت کے بل پر گروپ پر قبضہ کرلیا لیکن یہ بھول گئے کہ ہر گروپ کے کچھ راز ہوتے ہیں جن سے صرف گروپ کا باس ہی واقف ہوتا ہے۔ ہر ایرا غیرا ان کے بارے میں نہیں جان سکتا تو رابرٹ پیارے تم بھی ان سے ناواقف ہو۔ ان کے بارے میں صرف میں جانتی ہوں۔ کاروبار کیسے ہوتا ہے۔ ادائیگی کس طرح کی جاتی ہے۔ خفیہ بینک اکاؤنٹس کے نمبر اور اس طرح کی بے شمار باتیں ہیں جن سے صرف ایک باس ہی واقف ہوتا ہے۔ کیا تم ان کے بارے میں جانتے ہو؟" جولی کے لہجے میں اس کے لیے چیلنج تھا۔

"نہیں...... لیکن میں جان جاؤں گا۔" اس نے ہچکچا کر کہا "اور پھر گروپ میرا مقصد بھی نہیں ہے۔ مجھے صرف نوادرات سے غرض ہے۔ وہ میں حاصل کرلوں گا۔"

"کیسے؟" میں بولا "جب کہ وہ یہاں ہیں ہی نہیں۔

میں نے ایک اور جگہ رکھے ہیں۔"

رابرٹ نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا "تم بلف کر رہے ہو۔"

"چلو ایسا کرو ہمیں گولی مار دو اور اطمینان سے گودام کی تلاشی لو۔ اگر نوادرات مل جائیں تو لے جانا۔"

رابرٹ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ عاقل نے گھبرا کر کہا "یہ کیا مشورہ دے رہے ہو۔ انہوں نے گولی مار دی تو۔ ابھی تو میں والد صاحب بھی نہیں بنا۔"

"فکر نہ کرو۔ یہ اتنے احمق نہیں ہیں کہ نوادرات حاصل کیے بنا ہمیں ہلاک کر دیں۔"

"جناب یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ آدمی کو چیونٹی کی طرح مار دیتے ہیں۔"

"اوکے۔" رابرٹ نے گہری سانس لی "اب تم بتاؤ کہ نوادرات کہاں ہیں؟"

"یعنی اب ڈیل ہو سکتی ہے۔" میں ہنسا "رابرٹ دیکھو تم اپنے کام سے کام رکھو یعنی نوادرات حاصل کرو اور ہمیں جانے دو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً مان گیا۔ "اگر مجھے نوادرات مل گئے تو میں تم سب کو چھوڑ دوں گا۔"

"باس یہاں کوئی اور بھی ہے۔" اچانک رابرٹ کا ساتھی بولا۔ وہ چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے یہاں؟" اس نے ہمیں دیکھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ بس یہی لوگ ہیں جو تمہارے سامنے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

معاً گودام کی تاریک گوشوں سے روشنی کا سیلاب سا آ گیا تھا۔ کسی نے چلا کر کہا "پلیز...... کوئی حرکت...... نہ کرے۔ یہاں پولیس ہے۔"

رابرٹ کے کسی ساتھی نے مشین گن کا برسٹ مارا۔ ہم سب بے اختیار زمین پر گر گئے اور آڑ میں ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ دوسری طرف سے بھی گولیاں چلنے لگی تھیں۔ رابرٹ اور اس کے ساتھی بھی آڑ میں ہو گئے تھے۔ جولی کا پتا نہیں تھا لیکن میں اور عاقل ایک ناکارہ روڈ رولر کے فولادی بیلن نما پہیے کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے کہا "یہ پولیس کہاں سے آ گئی؟"

"خاکسار ہی لایا ہے۔" اس نے سر نیچے کر کے کہا "آپ کی بچت کے لیے۔ ان میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا انسپکٹر ڈیری نرمین بھی ہے۔ میں نے اس سے رابطہ کر کے بڑی مشکل سے اسے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔"

مجھے کیفے کے باہر ڈیری نرمین کا کار سے اترنا یاد آیا گویا وہ وہاں عاقل کی بات کی تصدیق کرنے کے لیے آیا تھا۔

"برخوردار تم نے ایسا کام کیا ہے کہ تم لڑکی ہوتے تو تمہارا منہ چوم لیتا۔"

"اتنا قصور تو نہیں ہے میرا۔" اس نے کہا "ویسے بھی اس منہ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔"

پولیس والے ظاہر ہے زیادہ تھے اور ان کے پاس اسلحے کی بھی کمی نہیں تھی۔ رابرٹ کے ساتھ بس یہی دو ساتھی تھے۔ اگر اس کا کوئی ساتھی باہر تھا بھی تو وہ اب تک فرار ہو چکا ہوگا۔ انسپکٹر ڈیری چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا پھر رابرٹ کا ایک ساتھی کام میں آ گیا۔ اس کی مشین گن کا کلپ ختم ہو گیا تھا اور دوسرا کلپ لگانے کی کوشش میں وہ ذرا سی اوٹ سے باہر آ گیا تھا کسی ماہر نشانچی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔ وہ پٹ سے زمین پر گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ ایک ساتھی کے مرتے ہی دوسرے کا حوصلہ خود بخود جواب دے گیا اور وہ چیخ چیخ کر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کرنے لگا لیکن جیسے ہی وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ ایک گولی اس کی زندگی بھی چاٹ گئی۔ یہ گولی کسی پولیس رائفل سے نہیں بلکہ رابرٹ کے ریوالور سے نکلی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈالنے کے جرم میں اپنے ہی ساتھی کو مار دیا تھا۔ وہ اب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں اور عاقل جس روڈ رولر کے نیچے دبکے تھے۔ وہ میدان جنگ کے ذرا بائیں طرف کاٹھ کباڑ کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہاں ہم گولیوں سے محفوظ تھے لیکن ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے بمشکل گردن گھمائی اور یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ رابرٹ میرے عین عقب میں تھا۔ اس نے اپنا خون سے تر دایاں پہلو بائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔ دائیں ہاتھ میں دبے ریوالور کا رخ عین میرے سر کی طرف تھا اور اس کے ارادے اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

"گڈ بائے شاہ عالم۔" اس نے دانت بھینچ کر کہا اور ٹریگر دبا دیا۔ میں نے تیزی سے سر پیچھے کیا تھا لیکن ایک دھماکا ہوا میرے سر پر اور پھر ہر سو تاریکی چھا گئی تھی۔ رات کی سی تاریکی۔ شاہ عالم بننے والے ناصر عظیم کی داستان جو ایک یتیم خانے سے شروع ہوئی تھی لندن کے اس صنعتی علاقے کے ایک گودام میں ناکارہ کھڑے روڈ رولر تلے ختم ہوئی تھی۔ ملک الموت کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم یہیں پر تھا۔

☆☆☆

چندا سفید لباس میں میرا سوگ منا رہی تھی۔ نیلم پر سکتہ طاری تھا۔ جینی دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ رئیس بکھرا ہوا تھا۔ میرے پیارے میری لاش پر بین کر رہے تھے اور میں خاموش ان کو دیکھ رہا تھا۔ میں سوائے دیکھنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ میرا وجود روح سے خالی ہو گیا تھا پھر میرا جنازہ اٹھا۔ آسمان بھی سوگوار تھا۔ کالے سیاہ بادل برسنے کو تیار تھے۔ میرے منہ پر کفن لپیٹ دیا گیا تھا۔ جنازہ...... لے جانے والا ڈولا کاندھوں پر سوار مجھے میری آخری منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہلتے جلتے۔ کلمہ شریف پڑھتے ہوئے میں جیسے تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ میرا وجود ہل رہا تھا۔ ڈول رہا تھا اور پھر مجھے ہوش آ گیا۔ میں ایک سفید کمرے میں تھا۔ یہاں ہر شے سفید تھی۔ سفید دیواریں، سفید بستر، سرہانے رکھا سفید ہی ریک، سامنے چھوٹی سی الماری، کمرے میں سفید ہی روشنی بھی پھیلی تھی۔ میرا وجود سوچ سے خالی تھا پھر رفتہ رفتہ سوچ کا دائرہ پیدا ہو کر پھیلنے لگا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح اپنے کسی اچھے عمل کی وجہ سے اس پرسکون مقام پر ہے۔ معاً دروازہ کھلا اور ایک حور جیسی صورت اندر آئی اس نے بھی سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے قریب آ کر اپنا نرم گرم ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا اور شیریں لہجے میں بولی۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

میں نے حیرت سے سوچا کہ کیا حوریں بھی انگریزی بولتی ہیں۔ اس کی سفید رنگ کی ٹوپی سے سنہرے بال جھانک رہے تھے۔ دلکش نقوش کے ساتھ اس کی ہلکی نیلی آنکھیں دیکھنے والے پر سحر طاری کر دیتی تھیں۔ گلابی رنگت اور نیچے شفاف لمبی سی گردن۔ جس کے نیچے چست یونیفارم نما لباس میں اس کا خوبصورت جسم قید تھا۔ میرے غور سے دیکھنے سے وہ شرما گئی تھی ''کیا میں زندہ ہوں؟'' میں نے اس سے سوال کیا تو وہ تھوڑی سی پریشان ہو گئی۔

''آف کورس سر۔'' اس نے میری نبض دیکھی۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں کسی اسپتال میں تھا اور سفید لباس والی یہ حور اصل میں نرس تھی مگر میں زندہ کیسے رہا۔ رابرٹ نے دو فٹ کے فاصلے سے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میرے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گولی میرے سر پر لگی تھی اور دھماکے کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا پھر میں کیسے بچ گیا۔ میں نے اپنا سر ٹٹولا۔ وہاں پر کوئی نشان نہیں تھا سوائے کنپٹی کے دائیں جانب ایک گومڑ کے۔

''مجھے گولی نہیں لگی تھی؟'' میں نے احمقانہ انداز میں دریافت کیا تو نرس کے حسین چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے میرا ہاتھ چھوڑا اور لپک کر چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ واپس آئی اس نے بظاہر عام سے لیکن ایسے سوال کیے جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔ میں نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔

''کیا میرے سر پر گولی نہیں لگی تھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ خود بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کے سر پر ایک معمولی سا زخم ہے۔''

''یعنی گولی میرا سر چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا ''آپ کے سر پر کوئی بھاری چیز لگی تھی۔ آپ کو جلد ہوش آ گیا تھا لیکن احتیاطاً ہم نے نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟''

''بہت اچھا......'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ''ایسا لگ رہا ہے جیسے ساری تھکن اتر گئی ہو۔''

''اگر آپ خود کو بہتر محسوس کر رہے ہیں تو کیا میں انسپکٹر ڈیری زمین کو بلا لوں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں چونکا۔ انسپکٹر ڈیری زمین ہی مجھے صحیح بات بتا سکتا تھا۔ جب رابرٹ مجھے آنجہانی کرنے میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا۔ تو میں کیسے بچا۔ میں نے ڈاکٹر کو اجازت دے دی۔ چند لمحے بعد انسپکٹر ڈیری زمین مسکراتا ہوا اندر آیا۔

''ہیلو۔ اب کیسے ہو تم؟''

''ناٹس انسپکٹر۔'' میں نے جواب دیا ''کیا میں زیر حراست ہوں؟''

''وہ بھلا کیوں؟'' اس نے حیرت سے کہا ''جولی کے بیان اور رابرٹ کی وجہ سے تمہاری پوزیشن کلیئر ہو گئی ہے۔''

''یعنی دونوں گرفتار ہو گئے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں دونوں فرار ہو گئے ہم سے بچ کر۔''

''فرار ہو گئے۔'' میں تقریباً چلا اٹھا تھا ''یہ کیسے ممکن ہے۔ وہاں تو ہر طرف تمہارے آدمی تھے۔''

انسپکٹر زمین نے گہری سانس لی۔ ''ہاں وہ پھر بھی فرار ہو گئے تھے۔''

اس کے لہجے سے میرا ماتھا ٹھنکا ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ دونوں......''

اس نے سر ہلایا ''ہاں...... رابرٹ کو جولی نے گولی مار دی۔ ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو رابرٹ تمہیں مار چکا ہوتا اور پھر جولی نے سب کے سامنے تمہیں اغوا کرنے اور پولیس

آفیسر کو مارنے کی ذمے داری قبول کر کے خودکشی کر لی۔ وہ اپنی ساری عمر جیل میں نہیں گزارنا چاہتی تھی۔''

میں گم صم رہ گیا تھا۔ جولی نے دولت کے لیے ایک عمر میں بڑے اور مفلوج شخص سے شادی کی اور اس خود قبول کی ہوئی قید میں اپنی جوانی کے بیش قیمت سال جلا ڈالے پھر اس نے جس سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور سب کچھ اس کا ہو گیا تھا تو اس پر بھی آزادی نہیں مل سکی۔ رابرٹ جیسے غدار اس کے خلاف سازشوں میں لگ گئے اور ان کی وجہ سے وہ بالآخر نامراد و ناکام اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ نہ صنم ملا نہ وصال۔ جاتے جاتے وہ میری جان بچا کر مجھ پر احسان بھی کر گئی اور اب اپنی اس حرکت کی تلافی بھی جو اس نے اپنے اندر بھڑکتے جوانی کے جذبات سے مجبور ہو کر کی تھی۔

''کیا تمہیں اس کی موت کا دکھ ہو رہا ہے؟''

میں نے سر ہلایا ''ظاہر ہے وہ مرتے مرتے بھی میرے لیے بچاؤ کا انتظام کر گئی۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا ''جولی نے مرنے سے پہلے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ اس کے کلب میں لڑائی میں مارے جانے والے سارے افراد اس نے ہلاک کیے تھے۔''

گویا جولی نے یہ الزام بھی اپنے سر لے لیا تھا حالانکہ کلب میں لڑائی اور وہاں سے فرار ہوتے ہوئے، مارے جانے والے سارے ہی لوگ میرا نشانہ بنے تھے۔ میں نے سر ہلایا'' وہ ماہر نشانہ باز تھی اور ایک ایسے گروہ کی سربراہ بھی تھی اس کے لیے مار دھاڑ کوئی نئی بات نہیں تھی۔''

''خیر تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ یہ گند کس نے پاک کی۔ جس نے بھی یہ کام کیا سمجھو اس نے ہمارا ہی کام کیا ہے۔''

''میرا ساتھی کہاں ہے وہ خیریت سے ہے نا؟''

اس نے سر ہلایا ''وہ اپنی بیوی کے ساتھ اسی اسپتال میں ہے۔''

''کیا۔'' میں چلایا'' یعنی اس اسپتال میں ہے کیوں؟''

''یہ اس کی بیوی کا نام ہے نا...... ظاہر ہے وہ کس لیے ہو سکتی ہے۔'' انسپکٹر ہنسا ''ویسے تم ایک پیارے سے بچے کے انکل بن گئے ہو۔''

انسپکٹر کے جاتے ہی اس کا ایک نائب نازل ہو گیا تھا۔ اس نے تفصیل سے میرا بیان لیا۔ میں نے احتیاط سے بیان دیا۔ میرے اس بیان کی تردید کرنے والا کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا دامن بچاتے ہوئے ایسا بیان دیا کہ میں پولیس کی گرفت میں نہ آؤں۔ میں پہلے ہی چارج والے کیس میں ملوث تھا اور اس سے پہلے ایڈگر قتل کا کیس میرے گلے پڑا ہوا تھا۔ پولیس کے پاس پہلے ہی کافی سے زیادہ وجوہات تھیں کہ وہ بصد اصرار مجھے سرکاری مہمان بنا لے۔ نائب نے کافی سوال کیے اور مجھے راہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن میں اپنے بیان پر ڈٹا رہا تھا۔ بادل نخواستہ اس نے بیان مکمل کر کے اس پر میرے دستخط لیے اور کہا کہ وہ اس کی ٹائپ شدہ کاپی لے کر آئے گا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا مجھے نقل و حرکت کی آزادی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں پولیس کی تحویل میں تو نہیں ہوں۔''

''نہیں۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا ''خوش قسمتی سے ابھی تم آزاد ہو اور کوشش کرنا تمہاری یہ آزادی برقرار رہے۔'' اس نے رخصت ہوتے ہوئے خبردار کیا۔

اس کے جاتے ہی میں بستر سے اٹھا۔ میرے جسم پر اسپتال والا لباس تھا لیکن میرے کپڑے اور دوسری چیزیں سلیقے سے تہ کی ہوئی الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کپڑے بدلے۔ جوتے پہنے اور باہر نکل آیا۔ ایک نرس نے زچہ وارڈ تک میری رہنمائی کی۔ باقی رہنمائی نیلم کی آواز نے کی۔ وہ تتلا تتلا کر بات کر رہی تھی۔

''کتنا...... پالا ہے۔''

میں نے کمرے میں جھانکا۔ جہاں سب ہی جمع تھے۔ سوائے چندا کے۔ وہ نہ جانے کہاں تھی۔ اصولاً تو اسے میرے پاس ہی ہونا چاہیے تھا۔ ''ہیلو۔'' میں نے اندر قدم رنجہ فرماتے ہوئے کہا'' وہ سب اچھل گئے۔ سب سے آگے عاقل تھا۔

''سر محترم آپ کا نواسا دنیا میں آ گیا ہے۔''

میں نے اسے گھورا۔ ''برخوردار ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے اور جینی میری بہن ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ اسے میری بھانجی قرار دے سکتے ہو۔''

جینی کے چہرے پر وہ رنگ بکھرے تھے جو ماں بن کر ہی ایک عورت کے چہرے پر آتے ہیں۔ میں نے جا کر اس کے سر پر پیار کیا۔ ''اس نالائق شوہر کے بعد اتنا پیارا سا بچہ مبارک ہو۔''

''شکریہ بھائی۔'' وہ شرمائی۔ میں نے اس کے پہلو میں لیٹے اس گل کوتھنے کو دیکھا۔

''نقوش کے لحاظ سے یہ ماں پر گیا ہے۔'' میں نے اعلان کیا'' اور ذہانت یقیناً ماموں کی آئی ہو گی۔''

''تو میرا کیا شیئر ہوا اس میں؟'' عاقل نے منہ بنایا۔

''فکر نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ خراب عادتیں بھی آئیں گی اس میں۔'' میں نے اسے تسلی دی تو سب نے قہقہہ لگایا۔ رئیس اور

نیلم ایک طرف کھڑے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے بچے کو گود میں اٹھالیا تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور مسکرانے لگا۔ بچی نے کہا "بھیا..... اس کا نام آپ رکھیے۔"

"میں۔" میں چونکا "نہیں بھئی یہ تم دونوں کی کوشش ہے اس کا نام بھی تم تجویز کرو۔"

"جی نہیں۔ بہت پہلے فیصلہ ہوگیا تھا۔" نیلم بولی "اس کا نام بھی تم نے رکھنا ہے اور اس کے کان میں اذان بھی تم نے ہی دینی ہے۔"

ایک مسرت اور خوشی کے عالم میں، میں نے نومولود کے کان میں اذان دی۔ یہ بچہ ہمارے خاندان میں ایک نیا اضافہ تھا۔ اس خاندان میں جس میں لوگوں کا آپس میں خون کا رشتہ نہیں تھا۔ میں نے بچے کا نام ذیشان تجویز کیا۔ "اللہ نے چاہا تو یہ بڑی شان والا نکلے گا۔ حالانکہ باپ کے نام سے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے۔" عاقل عاجزی سے بولا "آپ میری ٹانگ کھینچنا بند کردیں۔ اب میں ابا جان بن گیا ہوں۔"

"او کے..... اگر تم مجھے قائم مقام سسر کے عہدے سے ریٹائرڈ کردو تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"منظور ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"یہ چندا کہاں ہے؟" میں نے چاروں طرف دیکھا۔

"سو رہی ہے۔" نیلم بولی "بچی جب سے اسپتال میں جاگ رہی تھی۔ چار گھنٹے پہلے میں اسے زبردستی گھر لے گئی تھی۔"

"او کے..... اب میں بھی گھر جارہا ہوں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے جناب۔" عاقل بولا "یہاں قاضی آسانی سے نہیں ملتا۔ قاضی کم ہیں اور نکاح کے خواہش مند بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ ابھی آپ کے سر کا اسکین ہو گا۔ آپ نے سر خاصی زور سے رولر کے پہیے پر مارا تھا بالکل ایسی آواز آئی تھی۔ جیسے ٹین کا خالی ڈبا بجانے سے آتی ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے وہ مجھے روکتے میں وہاں سے نکل چکا تھا۔ نیلم کے عالی شان مکان میں سکون آمیز سناٹا طاری تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو ایک بٹلر ٹائپ شخص نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی کہا "ناصر عظیم صاحب..... تشریف لائیے۔"

"تم نے مجھے کیسے پہچانا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں اس گھر کا بٹلر ہوں رچرڈ نیل۔ نیلم مادام نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔"

"چندا..... میرا مطلب ہے چاندنی بیگم کہاں ہے؟" میں نے اندر آکر پوچھا۔

"وہ اوپر بیڈ روم میں آرام کر رہی ہیں۔" اس نے ادب سے بتایا۔

میں اوپر پہنچا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ بیڈ روم میں داخل ہوا۔ سامنے چندا بستر پر سینے تک کمبل اوڑھ کر سو رہی تھی۔ میں آہستہ سے اس کے پاس گیا۔ بستر کے کنارے بیٹھ کر میں نے نرمی سے اس کے چہرے پر بکھرے بال ہٹائے۔ اس کی ہلکی سی سوجی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی تھی میرے لیے..... میں نے جھک کر ان آنکھوں کو ہونٹوں سے چھوا پھر رخساروں کو چوما اور وہ جاگ گئی۔ مجھے اتنی نزدیک پاکر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

"چندا آنکھیں کھولو۔" میں نے التجا کی۔

"نہیں..... تم پھر غائب ہو جاؤ گے۔ میں خواب دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہوں۔"

"یہ خواب نہیں ہے میری جان۔" میں اسے یقین دلا رہا تھا۔ اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ناصر..... تم کیوں بار بار مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہو۔ اب مت جانا..... ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

"خدا نہ کرے..... میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آگیا ہوں۔"

"مگر ناصر ابھی جارج کا کیس باقی ہے۔"

"مجھے اللہ پر بھروسا ہے۔ مجھے بے گناہ سزا نہیں ہوگی۔" اس نے میرے سینے پر سر چھپالیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "دیکھو..... پولیس نے مجھے دوبارہ گرفتار نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے انہیں میری بے گناہی کا یقین آرہا ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اپنے بکھرے بال سمیٹ کر اس نے ڈھیلا سا جوڑا باندھا۔ سوئی سوئی آنکھوں میں خمار تھا اور لب کھلے کھلے سے تھے۔ میری محویت دیکھ کر وہ شرما گئی۔ میں نے اسے دوبارہ سمیٹنا چاہا لیکن وہ میرا ارادہ بھانپ کر تیزی سے دور ہوگئی۔

"جی نہیں..... اتنی جلدی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

"جلدی کہاں۔" میں نے سرد آہ بھری "یہاں تو تاخیر پر تاخیر ہوتی جارہی ہے۔"

"کوئی ایسی تاخیر بھی نہیں ہوئی۔" وہ جھینپ گئی۔

"ہوئی ہے نا..... دیکھو ہمارے ساتھ کے سب ہی لوگ اب شادی شدہ اور بال بچوں والے ہوگئے ہیں اور ایک ہم ہیں اب تک ایسے ہی گھوم رہے ہیں۔"

"جی نہیں..... حالات ہی اجازت نہیں دے رہے تھے۔"

"تو اب حالات نے اجازت دے دی ہے۔ میں آج ہی قاضی پکڑ لاتا ہوں۔" میں نے کہا "کیا خیال ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے کہا اور اتر کر باتھ روم میں گھس گئی۔

"جلدی سے باہر آؤ مجھے بھوک لگی ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔

جب وہ نہا کر آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ شفاف سنہری جلد پر موتی کی طرح قطرے ڈھلک رہے تھے۔ رخسار پر گیلے بال چپکے ہوئے تھے۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"کاش کہ میں بتا سکتا لیکن ابھی مجھے لائسنس نہیں ملا۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

وہ میری بات سمجھ کر سرخ ہوگئی تھی۔ "بس ہر وقت ایسی ہی باتیں۔"

"کیا اب باتیں بھی نہیں کروں؟" میں نے اس کی بات کاٹی "کیا کچھ کھانے کو ملے گا؟"

"کچن میں دیکھتے ہیں۔" اس نے کہا۔

رچرڈ نیل نے اپنی خدمات پیش کرنا چاہیں لیکن میں نے شاہانہ انداز میں کہا "ہم اس وقت مادام کے ہاتھ سے کچھ کھانا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ کھانے کے قابل ہو یا نہ ہو۔"

"اب میں اتنا بھی برا نہیں بناتی۔" چندا خفگی سے بولی۔

جب چندا پراٹھے ڈال رہی تھی تو رئیس اور نیلم آگئے۔ رئیس نے شور مچایا "دیکھا..... کیسے چوری چوری عیش ہو رہے ہیں۔"

"اے، تو کیوں جلتا ہے اگر نیلم کو سیدھی روٹی بھی بنانا نہیں آتی۔"

"جی نہیں..... مجھے سب آتا ہے۔" نیلم نے چندا کے ساتھ شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"تجھے ایک باؤلا سا گورا پولیس والا تلاش کر رہا تھا۔" رئیس نے مجھے بتایا "وہ کسی بیان پر تیرے سائن لینے کے لیے بے چین تھا۔"

"ہاں وہ انسپکٹر ڈیری نرمین کا نائب ہے۔ اسے یہاں کا پتا نہیں دینا تھا۔"

"نہیں یار وہ خود تلاش کر لے گا۔" رئیس نے پہلے پراٹھے پر حملہ کیا اور گرم ہونے کے باوجود بے صبری سے کھانے لگا۔ نیلم اسے ڈانٹتی رہ گئی۔ چندا اس کی بے صبری پر ہنس رہی تھی۔ کتنے قیمتی تھے یہ لمحات ہر پریشانی، ہر فکر سے آزاد۔ کتنے برسوں بعد مجھے یہ لمحات ملے تھے۔ ان لمحوں میں مجھے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ ابھی مجھے ایک اور مسئلے کا سامنا ہے۔ انگریز پولیس کا بنایا کیس آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ہم نے ہنستے مسکراتے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد نیلم نے سب کے لیے کافی بنائی۔ اس نے رچرڈ نیل کے بارے میں بتایا کہ اسے ایک مقامی ایمپلائی ایجنسی نے اس کے پاس بھیجا تھا اس سے پہلے وہ جس لارڈ کے پاس کام کرتا تھا اسے جوئے بازی کی لت نے تباہ کردیا تھا۔ رچرڈ نیل خاندانی قسم کا بٹلر تھا اور اس کے خاندان کے لوگ صرف اعلیٰ درجے کے افراد کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ ہم نچلے لیونگ روم میں آگئے۔ بٹلر نے پہلے ہی آتش دان جلا دیا تھا اگرچہ بجلی کے ہیٹر تھے لیکن جلتی لکڑی کے اس آتش دان کا مزہ ہی الگ تھا اس کے سامنے بیٹھ کر حرارت کا لطف آتا تھا۔ رات ہوچکی تھی اور لندن کے آسمان پر جمے ہوئے بادل بتا رہے تھے کہ رات برف باری کا امکان تھا۔ معاً کال بیل بجی اور تھوڑی دیر بعد رچرڈ نیل نے سنہری طشتری پر انسپکٹر ڈیری نرمین کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے ان لوگوں کو وہیں رکنے کو کہا اور خود اس سے نشست گاہ میں ملا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اس نے بلاتمہید کہا۔

"کیا مجھے گرفتار کیا جارہا ہے۔" طمانیت کا احساس یک لخت غائب ہوگیا۔

"میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔" اس نے رکھائی سے کہا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"ایک منٹ میں اپنے ساتھیوں کو بتا دوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن جلدی۔" اس نے گھڑی دیکھی "وقت کم ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ واپس آکر انہیں اس بارے میں بتایا۔ نیلم اور چندا کے چہرے اتر گئے تھے۔ بلکہ چندا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ دیکھا میں نے کہا تھا نا۔ میں انہیں تسلی دے کر واپس آیا۔ رئیس میرے ساتھ آیا۔ وہ میرے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں یار..... تیری یہاں ضرورت ہے۔ تو نیلم اور چندا کو دیکھ۔ وہ عورتیں ہیں جلد گھبرا جاتی ہیں۔ انسپکٹر مجھے لے

جا کر پھانسی نہیں لگا دے گا اور نہ ہی اس نے ابھی کوئی الزام لگایا ہے۔ یہاں الزام لگائے بغیر کسی کو گرفتار کرنے کا رواج نہیں ہے۔ مجھے یہ کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔"

انسپکٹر ڈیری زمین بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر اس کی اسکواڈ کار کھڑی تھی جسے ایک پولیس والا ہی چلا رہا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی کار روانہ ہوگئی۔ میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"انسپکٹر کیا میں اس اچانک آنے اور مجھے لے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس نے سگار نکال کر سلگایا۔ کار کی محدود فضا میں ہوانا برانڈ کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ اس نے چند گہرے کش لیے اور بولا "آج دوپہر میں ولیم کی لاش جمی کے کلب کے پاس ہی ایک گٹر لائن سے برآمد ہوئی ہے۔"

"میں ولیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ ویسے مجھے اس خبیث آدمی کے اس انجام سے خوشی ہوئی تھی۔

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہا۔" اس نے سر ہلایا "صرف اطلاع دے رہا تھا۔ تمہارے خلاف اہم ترین کیس کا مدعی اب دنیا میں نہیں رہا۔"

"پھر مجھے اس طرح لانے کی وجہ؟"

اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ "خاص بات یہ ہے کہ ولیم کے سر سے برآمد ہونے والی گولی اس ریوالور سے چلائی گئی تھی جو رابرٹ کے پاس تھا اور جس سے اس نے اپنے ایک ساتھی کو قتل کیا تھا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "اس کا مطلب ہے ولیم کو بھی رابرٹ نے قتل کیا ہے۔"

"بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا "ہمیں پاکستان کے دفتر خارجہ سے کچھ معلومات ملی ہیں۔ تمہارے ناصر عظیم کے پاسپورٹ اور اس کے پس منظر کی تصدیق کی گئی ہے۔"

"تو اب تمہیں یقین آ گیا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ شاہ عالم نہیں۔"

اس نے سگار دوبارہ سلگایا۔ "بات میرے یقین کرنے کی نہیں ہے۔ یہ معاملہ عدالت میں جائے گا اور وہی تمہارے شاہ عالم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے گی۔"

میں نے سر ہلایا "اب یہ سسپنس بھی ختم کرو آخر اتنی سردی میں مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ذرا صبر کرو ابھی سب تمہارے سامنے آ جائے گا۔"

کچھ دیر میں اسکواڈ کار ایک اسپتال کے سامنے رکی۔ باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ہم باہر نکلے۔ انسپکٹر ڈیری زمین مجھے ساتھ لیے شعبۂ حادثات میں آیا۔ ایک کمرے کے شیشے سے اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ سیاہ فام جارج بستر پر لیٹا تھا اس کی ناک سے آکسیجن کی نلکی لگی تھی۔ وہ آہستگی سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر وہ ہوش میں ہی تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اس کے بچنے کا امکان کم ہے۔ ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کی ہے۔ یہ مرنے سے پہلے تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے کیسے پتا چلا کہ یہ مرنے والا ہے۔" میں نے جارج کی طرف دیکھا۔

اس نے شانے ہلائے "بس ہر انسان کے اندر ایک حس ہوتی ہے جو اسے بتاتی ہے کہ وہ زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔"

"کیا تم نہیں چلو گے اندر؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس نے اکیلے میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔"

میں اندر آیا۔ عقب میں شیشے کا دروازہ بند کر دیا۔ آہٹ سن کر جارج نے میری طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر وہ خالی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا "شاہ عالم......"

میں اس کے پاس چلا آیا۔ اگرچہ انسپکٹر ڈیری زمین نے بھی کہا تھا کہ جارج مجھ سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا لیکن میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے اس نے کمرے میں کوئی آلہ لگا رکھا ہو جو یہاں ہونے والی گفتگو کہیں نشر کر رہا ہو۔

"جارج اس بحث کو چھوڑو کہ میں شاہ عالم ہوں یا نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں پہلی بار چمک آئی "تم شاہ عالم یا جو کوئی بھی ہو...... صاف گو آدمی ہو۔ میں بھی دوٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ...... تمہیں اس کیس سے جان چھڑانے سے دلچسپی ہے؟"

میں نے سر ہلایا "کیوں نہیں...... اگرچہ کیس میں کوئی جان نہیں ہے لیکن اس نے مجھے پریشان ضرور کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے میں برطانیہ میں رکنے پر مجبور ہوں۔ جب کہ میں یہاں کا شہری نہیں ہوں۔"

"میرا ایک بیان...... تمہیں اس مشکل سے نکال سکتا ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہا "بس میری ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے؟"

"قریب آؤ۔" اس نے آواز کو اور کم کر دیا۔ میں اس کے پاس چلا آیا لیکن پوری طرح محتاط تھا۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا وہ مرتے مرتے میرے خلاف کوئی حربہ استعمال کرنا چاہتا ہو مگر اس نے کہا "شاہ عالم! میری ایک بیوی اور دو بچے ہیں۔ میں چاہتا ہوں میرے مرنے کے بعد وہ اچھی زندگی گزاریں۔ ایک لاکھ پاؤنڈ اچھی زندگی کے لیے کافی ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے گہری سانس لی "تم چاہتے ہو کہ میں ایک لاکھ پاؤنڈز تمہارے بیوی بچوں کو دے دوں اور اس کے بدلے تم ولیم کے اتفاقی قتل کا اعتراف کر لو گے۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا "تم درست سمجھے۔"

میں نے کہا "جارج تم یہ توقع کیسے کر رہے ہو کہ میں تم سے کیا وعدہ پورا کر دوں گا؟"

"تم کر لو گے۔" اس نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔ اپنا وعدہ پورا کر دو گے۔"

"ایسی کون سی ضمانت ہے تمہارے پاس۔"

اس نے بمشکل سر گھمایا اور ایک کونے میں رکھے ڈبے کی طرف اشارہ کیا "یہ اٹھاؤ۔"

"اس میں کیا ہے؟" میں نے ڈبے کو غور سے دیکھا یہ کتاب رکھنے والے بکس کی طرح تھا۔

وہ مسکرایا "ذرا دیکھو...... اس میں تمہاری مقدس کتاب ہے۔"

"قرآن پاک۔" میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

اس نے سر ہلایا "ہاں...... میں نے خاصی مشکل سے اسے حاصل کیا ہے۔ تم اس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بعد تم میرے بیوی بچوں کو ایک لاکھ پاؤنڈز ادا کر دو گے۔"

میں نے سرد آہ بھری۔ "تم نے ٹھیک کیا۔ میں بہت گناہ گار مسلمان ہوں لیکن اس کتاب کو گواہ بنا کر کیا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔" میں نے کتاب ہاتھ میں اٹھالی۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور بولا "جارج اگر تمہارے بیان سے مجھے رہائی مل گئی تو میں قرآن کریم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے بیوی اور بچوں کو ایک لاکھ پاؤنڈز ادا کر دوں گا۔"

اس کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ "اب مجھے یقین ہے...... تم یہ کام ضرور کرو گے۔ مجھے امید ہے تم میری مجبوری کو معاف بھی کر دو گے۔ انسان بیوی بچوں کے معاملے میں بہت خود غرض ہو جاتا ہے۔"

"جارج...... میں خوشی سے یہ رقم تمہارے بیوی بچوں کو دوں گا۔" میں نے اس کے پاس جھکتے ہوئے کہا "تم مجھے ایک بڑی مشکل سے نکالو گے اور ممکن ہے اس رقم کے سہارے تمہارے بچے اچھی پرورش پا کر معاشرے کے اچھے رکن بن سکیں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں انہیں جارج نہیں بنانا چاہتا۔" اس نے کہا پھر دھڑکتی سانسوں کے ساتھ بولا "پلیز انسپکٹر کو بلاؤ میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔ میں بیان دے کر مرنا چاہتا ہوں۔"

"شکریہ جارج...... اور ہاں کیا...... میں یہ قرآن پاک لے جا سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں...... یہ کتاب تم کو یاد دلاتی رہے گی کہ تم نے مجھ سے کیا وعدہ کیا ہے۔"

"وہ اس کے بغیر بھی میرے ذہن میں رہے گا۔" میں نے اسے تسلی دی "گڈ بائی جارج۔"

"گڈ بائی دوست۔" اس کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

باہر نکل کر مجھے ایسا لگا جیسے میں جیل کی کال کوٹھری سے باہر آ گیا ہوں۔ میں نے انسپکٹر ڈیری زمین کو جارج کا پیغام دیا۔ وہ فوراً اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اسپتال کا ایک فرد ایک ریکارڈر لیے جارج کے کمرے میں گیا۔ ریکارڈر اس کے سرہانے رکھ کر اس کا بیان لیا جانے لگا۔ میں باہر ہی کھڑا تھا۔ جارج وقفے وقفے سے مجھے دیکھتا تھا اور میں اسے مسکرا کر تسلی دیتا۔ قرآن پاک میرے سینے سے لگا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے تک جارج کا بیان جاری رہا۔ جیسے ہی بیان ختم ہوا انسپکٹر ڈیری زمین بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو بلا لیا۔ اسپتال کے ہی ایک کمپیوٹر ٹائپسٹ نے اس بیان کو لکھا۔ اس کی کاپی نکالی۔ اسی دوران میں جارج کا وکیل بھی آ گیا۔ اسے اور اسپتال کے ایک ڈاکٹر کو گواہ بنا کر جارج نے اس بیان پر دستخط کیے۔ جب صبح کے چار بج رہے تھے تو کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ اس دوران میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے بظاہر کتنے سنگین نظر آنے والے مسئلے سے مجھے کتنی آسانی سے نکال لیا تھا۔

"ناصر عظیم۔" انسپکٹر ڈیری زمین نے میرے پاس آ کر کہا "اب اگر تم شاہ عالم بھی ہو تو تجھے تم کو مبارک باد دینی چاہیے۔ جارج نے اپنے بھائی ایڈگر کے اتفاقیہ قتل کا اقرار کر لیا ہے۔"

میں نے سر ہلایا ''اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔''

''یہ کیا ہے؟'' اس نے میرے سینے سے لگے بکس کو دیکھا۔

''یہ قرآن کریم ہے۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب..... بلکہ ساری انسانیت کے لیے مقدس کتاب ہے۔''

''تمہاری جارج سے کیا ڈیل ہوئی ہے؟''

''اطمینان رکھو۔ جارج نے جھوٹ نہیں بولا ہے اور اس نے مجھ سے جو کہا ہے وہ میں اپنے تک ہی رکھوں گا کیوں کہ میں نے اس مقدس کتاب پر..... اس سے عہد کیا ہے۔''

وہ مسکرایا ''اوکے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔''

''چلو شاہ عالم پر سے ایڈگر کے قتل کا الزام تو ہٹ گیا۔ باقی رہا میرے شاہ عالم ہونے کا تعلق تو مجھے امید ہے کہ پولیس مجھے ناصر عظیم تسلیم کر لے گی اور جارج کے کیس کا فیصلہ بھی میرے حق میں ہوگا۔''

''امکان اسی کا ہے۔'' انسپکٹر ڈیری نرمین نے جواب دیا ''لیکن ابھی تمہیں کچھ عرصے برطانیہ میں رکنا پڑے گا۔ جب تک اس تصفیے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔''

''خود میرا ارادہ بھی کچھ عرصے برطانیہ میں رکنے کا ہے۔ تب ہی میں پاکستان جا سکوں گا۔''

''وش یو گڈ لک.....'' اس نے کہا ''آؤ میں تم کو واپس چھوڑ دوں۔''

''تم مجھے اس اسپتال تک ڈراپ کر دو۔ جہاں میں داخل ہوا تھا وہاں میری بہن ہے۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔''

''چلو..... پاس ہی ہے۔'' اس نے کہا۔

انسپکٹر ڈیری نرمین نے مجھے اسپتال کے سامنے اتار دیا۔ اندر ایک نرس نے میری اس کمرے تک رہنمائی کی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ عینی بستر پر نیم دراز عاقل کے شانے پر سر ٹکائے سو رہی تھی۔ عاقل بھی شاید سو رہا تھا اور عینی کے پہلو میں ان کا بیٹا جاگتے ہوئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ کس قدر خوبصورت منظر تھا۔ ایک خاندان کا آغاز تھا۔ مجھے لگا میں اندر جا کر ان کی پرائیویسی میں دخل دوں گا۔ اس لیے میں خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ جس نرس نے میری رہنمائی کی تھی وہ راستے میں ملی۔ اس نے حیرت سے کہا۔

''تم کو تمہاری بہن نہیں ملی؟''

''ملی ہے لیکن سو رہی ہے میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

اسپتال کے باہر سے ایک ٹیکسی لے کر میں واپس نیلم کے گھر تک پہنچا تو صبح کی سفیدی ہلکی سی نمودار ہو رہی تھی رات کو ہلکی سی برف باری ہوئی تھی اور سڑک اور اس اس کے اردگرد کا منظر نیم سفید ہو رہا تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو رئیس نے جھپٹ کر دروازہ کھولا۔ رچرڈ بیل سونے کے لیے جا چکا تھا۔ وہ تینوں نشست گاہ میں ہی موجود تھے۔ رئیس مجھ سے لپٹ گیا۔

''تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں یار.....'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''تو تو ایسے فکرمند ہے جیسے مجھے اپنی پاکستانی پولیس اٹھا کر لے گئی تھی۔''

''یار..... پولیس کہیں کی بھی ہو..... پولیس ہوتی ہے۔ کیا ہوا تھا؟''

''بہت برا۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا ''پولیس کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ میں شاہ عالم ہوں اور ولیم کے جہنم رسید ہونے کا الزام بھی مجھ پر آ رہا ہے۔''

ان کے چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے پھر رئیس نے سب سے پہلے سمجھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر مجھے مکا رسید کیا۔ ''سالے ہم سے چالا کی۔ قسم اللہ کی..... اپن تیری نس نس سے واقف ہیں۔''

چندا اور نیلم نے رئیس کو ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ''اس میں اتنا دانت نکالنے کی کیا بات ہے۔'' چندا نے ناراضگی سے کہا۔

''تم جانتی نہیں ہو یہ بڑا حرامی شخص ہے۔ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس سے پوچھو اگر پولیس کو اس پر اتنا ہی شک ہے تو اسے آنے کیوں دیا۔ سرکاری مہمان بنا کر کیوں نہیں رکھ لیا۔'' اس نے مجھے مکا مارا۔

''نیلم۔'' میں نے فریاد کی ''تمہارا ہونے والا سرتاج آمادہ تشدد ہے اسے روکو..... چندا کو غصہ آ گیا تو۔''

''مجھے بالکل بھی غصہ نہیں آئے گا رئیس بھائی۔'' چندا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''چندا..... تم بھی۔'' میں نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا ''بچ کر آ گیا ہوں۔ چائے پانی پوچھنے کے بجائے مار پیٹ سے خاطر تواضع کی جا رہی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا میں انسپکٹر ڈیری کے ساتھ چلا جاتا۔''

''ناصر..... پلیز بتاؤ نا کیا ہوا اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''قرآن شریف.....'' میں نے کہا ''اس گھر میں بس اس کی کمی رہ گئی تھی۔''

نیلم نے مجھ سے قرآن شریف لے کر شیشے کی الماری کے اندر رکھ دیا ''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''جارج نے دیا ہے۔''

''جارج نے۔'' رئیس بھونچکا رہ گیا ''وہ جسے تو نے گولی ماردی تھی۔''

''ہاں، اس نے دیا ہے۔ بلکہ میں نے اس سے لیا ہے۔''

''ناصر یہ کیا چکر ہے؟'' نیلم جلدی سے میرے پاس آ بیٹھی۔

''بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو شدت سے نیند آ رہی ہے۔'' میں نے جماہی لی۔

''بالکل نہیں..... تم ساری بات بتائے بغیر یہاں سے ہل نہیں سکتے۔'' نیلم نے وارننگ دی۔

''اوکے..... اگر کافی مل جائے تو..... میں داستان سنا سکتا ہوں۔ ورنہ کیا فائدہ بتاتے بتاتے سو جاؤں یا غلط سلط بتا دوں۔''

''میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔'' چندا اٹھتے ہوئے بولی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں جارج سے ملاقات اور اس سے طے ہونے والے معاہدے کی تفصیل بتائی۔ رئیس اچھل پڑا تھا۔

''تم نے اسے ایک لاکھ پاؤنڈز دینے کا وعدہ کیا ہے؟''

''ہاں..... اور میرے خیال میں تو میں سستا ہی چھوٹ رہا ہوں۔ ورنہ یہ کیس میرے گلے کا پھندا بھی بن سکتا تھا۔''

''جارج کے بیان سے کیسے تم چھوٹ جاؤ گے؟'' نیلم نے اعتراض کیا ''اس کیس میں حکومت مدعی ہے۔''

''ہاں..... لیکن اصل خطرہ مجھے ایڈگر کیس ہی سے تھا۔ باقی اگر میں شاہ عالم ثابت ہو بھی جاتا تو ملک برطانیہ زیادہ سے زیادہ مجھے ڈی پورٹ کر دے گی۔''

''یہی تو خطرہ ہے۔'' نیلم زور دے کر بولی ''پاکستان میں شاہ عالم کے خلاف متعدد مقدمات ہیں۔ ایک بار تم وہاں گرفتار ہو گئے تو تمہارے سیاسی دشمن تمہارے خلاف کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن مجھے شاہ عالم ثابت کرنا آسان نہیں ہے۔ خاص طور پر ولیم کے مرنے کے بعد اس کیس میں کوئی جان نہیں رہے گی۔ وہی میرے شاہ عالم ہونے پر اصرار کر رہا تھا۔ باقی برطانوی پولیس بے شک جس طرح بھی چاہے میرے بارے میں تحقیق کرے۔ میری ناصر عظیم کی حیثیت مسلم ہے۔''

''بہرحال خطرہ ہے۔'' رئیس نے کہا ''اور ایک کیس سے جان چھوٹ جائے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ اب تیسری گرفتاری کا امکان نہیں ہے۔ باقی غلط پاسپورٹ پر آنا کوئی اتنا سنگین جرم نہیں ہے۔''

ہم خاصی دیر تک اس پر تبادلۂ خیال کرتے رہے پھر چندا اور نیلم نے ناشتا بنایا۔ میں نے ناشتا کیا اور سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہ نچلی منزل کا ماسٹر بیڈ تھا۔ میرے برابر میں رئیس تھا۔ نیلم اور چندا اوپر ایک ہی کمرے میں تھے۔ میں پڑ کر سویا تو پھر سہ پہر تک سوتا ہی رہا۔ چندا نے آ کر مجھے جگایا۔ اس نے شیشوں سے پردے ہٹائے تو خلاف توقع دھوپ اندر آئی۔ لندن میں سردیوں میں ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں جب لوگوں کو سورج کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ دھوپ میں نہائی چندا نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ شاید اس نے ابھی ابھی غسل کیا تھا۔

''اٹھ جاؤ۔ کھانا تیار ہے پھر عینی کے پاس بھی جانا ہے۔ اس کے پاس کچھ خاص مہمان بھی... ہمارے منتظر ہیں۔''

''اچھا کون؟'' میں اٹھ بیٹھا۔

''دیکھ لینا۔ میں نے باتھ ٹب میں گرم پانی بھر دیا ہے اور سوٹ بھی رکھ دیا ہے۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔''

''تم کو جانے کی اتنی جلدی کیا ہے۔'' میں نے اسے بانہوں میں لینا چاہا لیکن وہ شاخ گل کی طرح لچک کر مجھے دھوکا دے گئی اور دروازے کے پاس جا کر اس نے اپنے انداز میں میرا منہ چڑایا اور جھپاک سے باہر نکل گئی۔ میں مسکراتے ہوئے باتھ روم میں چلا گیا۔ گرم پانی سے غسل نے مجھے بالکل تازہ دم کر دیا۔ میں تیار ہو کر آیا تو میز پر کھانا تیار تھا۔

اسپتال تک انہوں نے خاصا سسپنس پھیلایا تھا اور میں سوچنے میں مصروف تھا کہ عینی اور عاقل کے علاوہ اور کون وہاں میرا منتظر ہو سکتا ہے۔ ذیشان کو میں دیکھ ہی چکا تھا اور جب میں عینی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کمال اور قمر کو دیکھ کر ایک لمحے کو خوشی سے ساکت رہ گیا۔ قمر لپک کر میرے گلے لگ گئی اور حسب عادت آنسو بہانے لگی لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اس سے مل کر روایتی انداز میں کمال سے ملا۔ محبت بھری گالیوں کا تبادلہ ہوا پھر میں نے اس سے پوچھا۔

''الو کے پٹھے تو نے اسپتال کی جان چھوڑ دی یا مریضوں نے تجھے باہر نکال دیا؟''

''ابے بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں صرف تیرے لیے سور کے بچے۔''

''میرے لیے۔''

''ہاں، اب تیرے کرتوت اسکاٹ لینڈ یارڈ تک پہنچ گئے ہیں۔ مجھ سے بھی انکوائری کی گئی تو مجھے بتانا پڑا کہ ہاں

ناصر عظیم میرا دوست ہے۔ بہت پرانی دوستی ہے۔"

"تو اس لیے آیا ہے۔"

"نہیں یار تیرے لیے کون زحمت کرتا اسپتال کا کچھ کام تھا اور میں خاصے عرصے سے قمر کو کہیں لے کر بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے سوچا اس بہانے سیر و تفریح بھی ہو جائے گی۔ پر یار لندن تو فریزر بنا ہوا ہے۔ اتنی سردی ہے۔ میں تو ائر پورٹ پر ہی تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ واپسی کی کوئی فلائٹ نہیں تھی ورنہ اس سے واپس چلا جاتا۔"

"یار ہم سب بھی اسی سردی میں رہ رہے ہیں۔" رئیس بولا۔

"بھیا یہ تو ایسے ہی کہتے رہتے ہیں۔" قمر نے کہا "میں فیصلہ کر کے آئی ہوں۔"

"کیسا فیصلہ؟" میں نے چندا کی طرف دیکھا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔

"یہی کہ میں نے اب تمہیں دولھا بنا دینا ہے۔"

"اور دلہن کون ہوگی؟" میں نے پوچھا تو چندا کمرے سے بھاگ گئی۔ اس پر قہقہہ پڑا تو ایک نرس آ گئی۔

"یہ اسپتال ہے۔" اس نے ناراضگی سے کہا "یہاں اتنا شور درست نہیں ہے۔"

"سوری سسٹر۔" میں نے اس سے معذرت کی پھر وہ سب باتوں میں لگ گئے تو میں چپکے سے باہر آ گیا۔ چندا راہداری میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسو چمک رہے تھے۔ میں اس کے پاس چلا آیا۔

"خان جی یاد آ رہے ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں...... آج وہ ہوتے تو ہم سے بھی زیادہ خوش ہوتے۔"

"وہ ہم سے زیادہ خوش ہوں گے جہاں بھی ہوں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا "اب تم جلدی سے مسکراؤ ورنہ میں کوئی گستاخی کر جاؤں گا۔"

"ہش۔" اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا "یہ اسپتال ہے۔"

"اسپتال میں گستاخی کرنا بالکل منع نہیں ہے۔" میں نے اس کے نزدیک ہونا چاہا لیکن اس نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

"یہاں منع ہے۔" اس نے کہا اور تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا تو سب نے شور مچایا۔

"اچھا جی پروگرام بن رہا تھا۔ تاریخ طے ہو رہی تھی۔"

چندا سرخ ہو گئی "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ناصر تم کیا کہتے ہو؟" نیلم نے پوچھا۔

"جب چندا کہتی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے تو نہیں ہے۔"

"بھیا تو ابھی سے زن مرید ہو گئے ہیں۔" قمر نے چلا کر کہا۔ اس پر نرس دوبارہ آ گئی اور دھمکی دے کر گئی کہ اب ہم نے دوبارہ شور کیا تو وہ سب کو نکال باہر کرے گی۔

اگلے روز عینی کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ نیلم، چندا اور قمر ضد کر کے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ عاقل بے چارہ آ ہیں بھرتا رہ گیا تھا۔ سب کے آنے سے اس بڑے سے مکان میں ہمہ وقت رونق اور گہما گہمی رہنے لگی تھی۔ ذیشان سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ سب کے لیے کھلونا بن گیا تھا۔ اس دن میں نے اپنے اکاؤنٹ سے ایک لاکھ پاؤنڈز نکلوائے۔ عاقل کی مدد سے جارج کی بیوی کا پتا حاصل کیا۔ اب وہ جارج کی بیوہ تھی۔ جارج بیان دینے کے چند گھنٹے بعد مر گیا تھا اور میری مشکل آسان کر گیا تھا۔ میں اور عاقل موقع پا کر اس کی بیوہ کی طرف گئے۔ وہ ایک غریبانہ قسم کے پسماندہ سے علاقے کے ایک خستہ حال سے مکان میں رہتی تھی۔ کال بیل بجانے پر اس نے دروازہ کھولا۔ ایپرن سے لگ رہا تھا وہ کچن میں مصروف رہی تھی۔

"ہم جارج کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہیں۔" میں نے اپنا اور عاقل کا تعارف کرانے کے بعد اس سے کہا۔

"سوری۔ میں جارج کے کسی قرض کی ذمے دار نہیں ہوں۔" اس نے کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ میں نے پاؤں اڑا دیا۔

"اس کے برعکس ہم جارج کی ایک امانت تمہارے سپرد کرنے آئے ہیں۔"

"جارج کی امانت؟" وہ رک گئی تھی۔

میں نے سر ہلایا "کچھ رقم ہے۔"

اس نے سوچا اور دروازہ کھول دیا "کل سے تم پہلے فرد ہو جو جارج کے سلسلے میں کوئی اچھی بات لے کر آئے ہو۔ ورنہ اب تک سب ہی اس کے قرض خواہ آئے تھے۔"

وہ ہمیں اندر ایک نشست گاہ میں لے آئی۔ دو بچے قالین پر لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے، اس نے انہیں اپنے بیڈ روم میں جانے کا حکم دیا۔ بچے بادل نخواستہ اٹھ کر چلے گئے گھر کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے مکینوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ یہ ایک غربت کا مارا روایتی سیاہ فام گھرانا تھا۔ جہالت اور جرائم نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ جارج کی بیوی کسی قدر صاف رنگ کی اور دلکش نقوش و خدوخال والی

تیس برس کی عورت تھی لیکن غربت نے اس کے چہرے کو ماند کر دیا تھا۔ وہ متوقع نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کھنکار کر کہا۔

"مجھے جارج کی موت کا افسوس ہے۔"

"لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" اس نے میری بات کاٹی "وہ اس انجام کا مستحق تھا۔ جلد یا بدیر اسے یہ انجام ملنا ہی تھا۔ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے ہاتھوں زخمی ہوا تھا اور مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے؟" میں دنگ رہ گیا تھا۔

اس نے سر ہلایا "لیکن مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تم نہ ہوتے کوئی اور ہوتا تب بھی جارج مارا جاتا۔"

"او کے۔ میں کام کی بات کرتا ہوں۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ مجھ پر شاہ عالم ہونے کا الزام لگایا گیا تھا جس نے تمہارے دیور ایڈگر کو مارا تھا۔ جارج نے ایڈگر کے اتفاقیہ قتل کا اعتراف کر لیا ہے اور اس کے بدلے اس نے مجھے کہا کہ میں تمہیں ایک لاکھ پاؤنڈز دے دوں۔"

"اور تم مجھے ایک لاکھ پاؤنڈز دینے آئے ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور جیکٹ سے کرنسی کا بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا "اس میں پورے ایک لاکھ پاؤنڈز ہیں۔ تم گن لو۔"

اس بار وہ دنگ رہ گئی "تم...... تم سچ مچ ایک لاکھ پاؤنڈز دو گے؟"

"یہ رکھے ہیں تمہارے سامنے گن لو۔" میں نے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

ایک سحر کے سے عالم میں اس نے پیکٹ کھولا اور ایک لاکھ پاؤنڈز کے نوٹ دیکھنے لگی "کیا...... یہ سب میرے ہیں؟"

"تمہارے اور تمہارے بچوں کے۔" میں نے جواب دیا "مرتے وقت جارج کو احساس تھا کہ تم اور بچے اچھے حالات میں زندگی نہیں گزار رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے مجھ سے یہ معاہدہ کیا۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا "مجھے جتنی حیرت جارج پر ہے اس سے زیادہ تم پر ہے۔ تم ایک مرے ہوئے آدمی سے کیے جانے والے معاہدے کو پورا کرنے کے لیے ایک لاکھ پاؤنڈز کی رقم دے رہے ہو۔"

"بات رقم کی نہیں معاہدے کی تھی۔"

"کیا اس نے تم سے تحریری معاہدہ کیا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تحریری نہیں...... زبانی تھا لیکن میں نے جس مقدس شے کی قسم کھائی تھی اگر میں اپنی ساری دولت دینے کی بات کر چکا ہوتا تو سب تمہارے حوالے کر دیتا۔ خیر یہ ایک غیر متعلقہ بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے جارج سے کیا وعدہ پورا کر دیا۔ ایک لاکھ پاؤنڈز تم تک پہنچا دیے ہیں اب یہ تم پر ہے کہ ان لاکھ پاؤنڈز کو اپنی زندگی اور اپنے بچوں کی اچھی تعلیم پر خرچ کرتی ہو جیسا کہ جارج کی خواہش تھی یا اسے عیاشی میں اڑا دیتی ہو۔"

"ایک منٹ میں کافی لے کر آتی ہوں۔" اس نے کہا اور میرے روکنے سے پہلے ہی اٹھ گئی تھی۔ عاقل خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ اچھی عورت ہے اس رقم کا اچھا استعمال کرے گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

کافی تیار تھی۔ وہ جلد لے کر لوٹ آئی۔ اس بار اس کے انداز میں سرد مہری کے بجائے اپنائیت تھی۔ کافی پینے کے دوران میں اس نے بتایا کہ وہ اپنے بچوں کو کسی اچھے اسکول میں تعلیم دلانا چاہتی تھی لیکن غربت کی وجہ سے مجبور تھی۔ اب وہ انہیں اچھے اسکول میں داخل کرا سکے گی۔ کافی پی کر ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر آ گئے۔ وہ ہمیں رخصت کرنے آئی تھی۔ جب میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے اچانک لپک کر میری پیشانی چوم لی۔

"شکریہ برادر!"

"یہ قصہ بھی ختم ہوا۔" کار میں بیٹھتے ہوئے عاقل نے کہا۔

"ایک مسئلہ ابھی بھی باقی ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا "نوادرات والا......!"

"یہ بھی حل ہو جائے گا۔" وہ بولا "میں بتانا بھول گیا تھا۔ پرسوں پاکستانی ہائی کمیشن کی جانب سے ان نوادرات کے بارے میں برطانیہ سے درخواست کی گئی ہے کہ برطانیہ اسمگل کر کے لائے جانے والے پاکستان کے اس تاریخی ورثے کو واپس کیا جائے۔ ظاہر ہے حکومت برطانیہ یہی کہے گی کہ نوادرات اگر برآمد ہوئے تو پاکستان کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں کس طریقے سے اب انہیں بازیاب کرا ہی دوں۔"

"لیکن ہاتھ پیر بچا کر!" میں نے اس کی تائید کی "ایسا نہ ہو کہ اس چکر میں تم بھی کسی مسئلے میں آ جاؤ۔"

"اجی حضرت ہمیں نہ سکھائیں احتیاط۔ اس میدان کے

پرانے کھلاڑی ہیں۔"

"اکثر پرانے کھلاڑی ہی مات کھا جاتے ہیں۔"

"آپ جیسے!" اس نے قہقہہ مارا "اب تک شادی نہیں کر سکے ہیں۔"

میں جھینپ گیا "برخوردار باپ بن کر تم زیادہ ہی چہکنے لگے ہو۔"

اس نے کار نیلم کے گھر کے سامنے روکی۔ جہاں پرانی زندگی اور اس کے سارے ساتھی میرے منتظر تھے۔

☆☆☆

پورے ایک برس بعد لاہور کے انٹرنیشنل ائر پورٹ پر میں نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا، اس کی ہواؤں میں سانس لی۔ ائر پورٹ کی مخصوص بو کے پس منظر میں وطن کی مہک بھی محسوس ہوئی تھی۔ جو صرف برسوں بعد وطن آنے والوں کو ہی محسوس ہوتی ہے۔ لندن کی بے پناہ سردی کاٹتی تھی لیکن لاہور کی سردی خوش آمدید کہتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ناصر!" عقب سے چندا کی آواز آئی "اسے سنبھالیں بہت تنگ کر رہا ہے۔"

میں نے پلٹ کر ننھے اقبال کو گود میں لے لیا۔ یہ میرا اور چندا کا بیٹا ہے۔ جس نے اپنے باپ کے وطن کو پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ صرف دو مہینے کا ہے۔ مجھے دے کر چندا نے اپنا بیگ درست کیا۔ میری گود میں آتے ہی اس نے حسب معمول میرے بال پکڑنے کی کوشش کی۔ عقب میں رئیس اور نیلم تھے۔ ایک نومولود نیلم کی گود میں بھی تھا۔ یہ اس کا بیٹا تھا۔ ایک برس جیسے خواب کی طرح گزر گیا تھا اور اب پھر ہم اپنے وطن میں تھے۔

"میرے خدا...... ہم سچ مچ لاہور میں ہیں۔" نیلم نے کہا اور رونے لگی تھی۔ چندا نے بھی خواتین کے اس پسندیدہ مشغلے میں اس کا ساتھ دیا۔ میں اور رئیس کسٹم کرانے لگے۔ امیگریشن سے نمٹ کر ہم باہر آئے۔ جہاں استقبال کرنے والوں میں کمال، قمر، عباسی اور درخشی کے ساتھ بانو خالہ بھی تھیں اور ان کی گود میں آفرین کا بیٹا عدنان بھی تھا۔ کمال اور عباسی مجھ سے اور رئیس سے اور خواتین خواتین سے لپٹ گئے۔ رونے دھونے کا غلغلہ ایک بار پھر بلند ہوا۔ خدا خدا کر کے ائر پورٹ سے نکلنے کا موقع ملا۔ اچانک ایک شخص تیزی سے میرے پاس آیا۔

"آپ...... آپ شاہ عالم ہیں نا...... مجھے پہچانا؟"

"بالکل نہیں۔ میں ناصر عظیم ہوں۔" میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔